میری زندگی

MY LIFE

لیون ٹراٹسکی

LEON TROTSKY

ترجمہ: جاوید شاہین

---

www.struggle.com.pk

ترتیب:

پیش لفظ

یانوفکا

ہمارے ہمسائے اور میرا ابتدائی سکول

اڈیویسہ ۔ میرا خاندان اور میرا سکول

کتابیں اور ابتدائی تصادم

گاؤں اور شہر

ٹوٹ پھوٹ

میری پہلی انقلابی تنظیم

میری پہلی قید

میری پہلی جلاوطنی

میرا پہلا فرار
ایک مہاجر
پارٹی کانگریس اور پھوٹ
روس واپسی
1905 کا سال
مقدمہ جلاوطنی، فرار
میری دوسری غیر ملکی جلاوطنی
نئے انقلاب کی تیاریاں
جنگ کا آغاز
پیرس سے میرا اخراج
براستہ سپین
نیویارک
ایک اذیت گاہ میں
پیٹرگراڈ میں
بہتان تراشیوں کے بارے میں
جولائی سے اکتوبر
فیصلہ کن رات
ٹراٹسکی ازم 1917 میں
اقتدار میں آنا
ماسکو میں
برست _ لٹووسک مذاکرات

امن

سوی یازسک میں ایک ماہ

ٹرین

پیٹروگراڈ کا دفاع

فوجی حزب اختلاف

جنگی حکمت عملی پر اختلافات

لینن سے میرے تعلقات

لینن کی علالت

کم رتبہ لوگوں کی سازش

لینن کی وفات

پارٹی کے اندر جدوجہد کا آخری زمانہ

جلاوطنی

ملک بدری

ویزے کے بغیر سیارہ

پیش لفظ

ہمارا عہد تحریری یادداشتوں کے حوالے سے بہت زرخیز ہے۔ اتنا زرخیز کہ شائد اس سے پہلے کسی عہد کو ایسی سعادت نصیب نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بتانے کو بہت کچھ ہے۔ کوئی عہد تبدیلی کے حوالے سے جتنا زبردست اور جتنا زیادہ ڈرامائی ہوتا ہے، حالیہ تاریخ میں دلچسپی کی شدت بھی اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے۔ منظر کشی کا فن صحرائے اعظم میں شائد کبھی جنم نہ لے سکتا۔ دو عہدوں کا سنگم جیسا کہ موجودہ دور ہے، گزرے ہوئے کل کو سرگرم عمل شرکاء کی نظر سے دیکھنے کی خواہش کو جنم دیتا ہے۔ وہ کل جو پہلے ہی ماضی

بعید کا حصہ لگتا ہے۔ گذشتہ جنگ عظیم کے بعد سے یاداشتوں اور آپ بیتیوں پر مشتمل ادبی تحریروں کے بے پناہ فروغ کی وجہ یہی ہے شاید اس سے موجودہ کتاب کو ضبط تحریر میں لانے کا جواز بھی فراہم ہو سکے۔

اس کے عالم وجود میں آنے کی وجہ ہی مصنف کی سرگرم سیاسی زندگی میں آنے والا عارضی وقفہ ہے۔ قسطنطنیہ (موجودہ استنبول) کی حیثیت میری زندگی میں ایک ایسے پڑاؤ کی ہے جو غیر متوقع تو ضرور ہے لیکن حادثاتی ہرگز نہیں۔ میں یہاں خیمہ زن ہوں ...اور یہ پہلی بار نہیں ہے...اور صبر وسکون سے آئندہ پیش آنے والے حالات کا منتظر ہوں۔ ایک خاص حد تک ''راضی بہ رضا'' ہوئے بغیر کسی انقلابی کے لئے زندگی گذارنا ناممکن ہو جائے۔ کسی نہ کسی طور پر قسطنطنیہ میں قیام کا وقفہ میرے لئے اس حوالے سے انتہائی مناسب ثابت ہوا ہے کہ اس سے پہلے کہ حالات مجھے رخت سفر باندھنے کی اجازت دیں اور میں عمر رفتہ پر ایک نظر ڈال سکوں۔

پہلے پہل میں نے اخبارات کے لئے اپنی آپ بیتی کے سرسری سے خاکے تحریر کئے اور سوچا کہ یہی کافی رہے گا۔ اور میں یہاں یہ کہنا چاہوں گا کہ اپنی پناہ گاہ کے اندر سے میں یہ دیکھنے سے قاصر تھا کہ وہ خاکے کس شکل میں عوام تک پہنچے ہیں۔ لیکن ہر کام کی اپنی منطق ہوتی ہے۔ جب میرے کام میں نکھار آنے لگا تو اس وقت تک یہ مضامین کم وبیش مکمل ہو چکے تھے۔ تب میں نے ایک کتاب لکھنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے جس پیمانے کا اطلاق کیا وہ مختلف اور انتہائی وسیع تھا اور اس کے لئے تمام کام نئے سرے سے کیا۔ ان ابتدائی اخباری مضامین اور موجودہ کتاب میں واحد قدر مشترک یہ ہے کہ دونوں ایک ہی موضوع سے بحث کرتے ہیں۔ باقی ہر حوالے سے وہ دو مختلف چیزیں ہیں۔

میں نے سوویت انقلاب کے دوسرے عہد کے بارے میں خصوصی طور پر تفصیل سے لکھا ہے جس کی شروعات لینن کی بیماری اور ''ٹراٹسکی ازم'' کے خلاف مہم سے ہوتی ہیں۔ جیسا کہ میں ثابت کرنے کی کوشش کروں گا حصول اقتدار کے لئے نقالوں کی طرف سے کی جانے والی جدوجہد محض شخصیات کے درمیان جدوجہد نہیں تھی۔ بلکہ یہ

ایک نئے سیاسی عہد کی غمازی کرتی تھی اکتوبر انقلاب کے خلاف ردعمل اور رجعت کے دور کی تیاری۔ یہاں سے ہمیں اس سوال کا جواب فطری طور پر فراہم ہو جاتا ہے۔ جو مجھ سے اکثر پوچھا جاتا ہے: ''تم اقتدار سے محروم کیسے ہوئے؟''

ایک انقلابی سیاست دان کی آپ بیتی ناگزیر طور پر ان نظریاتی سوالات کے پورے سلسلے کا احاطہ کرتی ہے جو روس کے اور جزوی طور پر بحیثیت مجموعی بنی نوع انسان کے سماجی ارتقا سے جڑے ہوئے ہیں لیکن خصوصی طور پر ان فیصلہ کن ادوارے سے بھی جنہیں انقلابات کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ میں ان اوراق میں پیچیدہ نظریاتی مسائل کے جوہر کا تنقیدی جائزہ نہیں لے سکا۔ نظریہ مسلسل انقلاب، جس نے میری ذاتی زندگی میں اتنا بڑا کردار ادا کیا ہے اور زیادہ اہم بات یہ کہ مشرق کے ممالک میں ایک دل خراش حقیقت بن کر ابھر رہا ہے، اس کتاب میں پس پردہ مقصدی غنایئے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر قاری اس سے مطمئن نہیں ہے تو میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ انقلاب کے مسئلے کا گہرائی سے جائزہ لینے کے لئے ایک علیحدہ کتاب کی ضرورت ہوگی جس میں میں گذشتہ عشروں کے تجربات سے حاصل شدہ بنیادی اور اہم نظریاتی نتائج کو واضح شکل دینے کی کوشش کروں گا۔

بہت سے ایسے قارئین ہوں گے جنہیں اس کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے معاملات اس روشنی میں نظر نہ آئیں جسے وہ اپنے یا اپنی پارٹی کے لئے منتخب کرتے اور بہت سوں کو یہ بھی محسوس ہوگا کہ میں نے خود کو اس قدر الگ تھلگ کر کے چیزیں بیان نہیں کی ہیں جس حد تک ضروری تھا۔ یہاں تک کہ اخبارات میں شائع ہونے والے اقتباسات نے بھی بعض حلقوں کو تردیدی بیانات دینے پر ابھارا ہے۔ یہ ناگزیر ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر میں نے کوئی سطحی قسم کی آپ بیتی بھی تحریر کی ہوتی..اور میرا ایسا کرنے کا ہرگز کوئی ارادہ نہیں تھا...تو اس کتاب میں بیان کردہ تصادموں کے مواقع پر جن بحثوں نے جنم لیا تھا، ان کی بازگشت ضرور پیدا ہوتی۔ تاہم یہ کتاب میری زندگی کی جذبات سے عاری تصویر نہیں بلکہ اس کا ایک جزو ہے۔ ان صفحات میں بھی میں نے

وہ جدوجہد جاری رکھی ہے جس کے لئے میری ساری زندگی وقف ہے۔ وضاحت کرتے میں خصوصیات بھی بتاتا ہوں اور پرکھتا بھی ہوں۔ واقعات کی تفصیلات بیان کرتے وقت میں اپنا دفاع بھی کرتا اور اکثر اوقات جارحانہ رویہ بھی اپناتا ہوں۔ میرے نزدیک یہی وہ واحد طریقہ ہے جس کے ذریعے آپ بیتی کو ایک اعلیٰ تر سطح پر معروضی کیفیت کا حامل بنایا جا سکتا ہے۔ یعنی اسے شخصیت، حالات اور عہد کا موزوں اور مناسب ترین اظہار عطا کیا جائے۔

معروضیت سے مراد وہ پرتصنع بے اعتنائی نہیں جس کے ذریعے سکہ بند منافقت دوستوں اور دشمنوں کا ذکر کرتے وقت بالواسطہ طور پر قاری کو ان کے بارے میں ایسی باتیں سمجھاتی ہے جن کا براہ راست ذکر اس کے لئے آسان نہیں ہوتا۔ اس قسم کی معروضیت روایتی چال بازی کے سوا کچھ نہیں۔ میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ چونکہ میں اپنے بارے میں لکھنے کی ضرورت کو تسلیم کر چکا ہوں... اور آج تک کوئی بھی شخص ایسی آپ بیتی لکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکا جس میں خود اس کا ذکر ہو... اس لئے ایسی کوئی وجہ نہیں کہ میں اپنی ہمدردی یا تنفر اور اپنی محبت یا نفرت کو چھپاؤں۔

اس کتاب میں مباحثے ہیں۔ یہ اس سماجی زندگی کی حرکیات کی عکاسی ہے جس کا سارا تانا بانا ہی تضادات سے بنا ہوا ہے۔ استاد سے شاگرد کا گستاخانہ رویہ ڈرائنگ روم میں مہذبانہ رویوں کے نقاب میں چھپے رشک ورقابت کے تیر، مستقل تجارتی ومعاشی مسابقت، خالص اور اطلاقی سائنس، فنون لطیفہ اور کھیلوں کے تمام شعبوں کے درمیان مجنونانہ رقابت، پارلیمان میں ہونے والی جھڑپیں جو مفادات گہرے تضاد کے آشکار کرتی ہیں، روزناموں میں روزمرہ بنیادوں پر جاری غیض وغضب سے بھرپور جدوجہد، محنت کشوں کی ہڑتالیں، مظاہروں میں شریک ہونے والوں پر گولیوں کی بوچھاڑ، دھماکہ خیز مواد پر مشتمل بنڈل جو مہذب ہمسائے فضائی راستے سے ایک دوسرے کو ارسال کرتے ہیں، خانہ جنگی کی شعلہ بار زبان جو ہمارے سیارے پر کبھی بھی پوری طرح نہیں بجھی... یہ تمام چیزیں سماجی مباحثوں یا مناظروں کی ہی مختلف ہئیتیں

ہیں۔اگران سب کا احاطہ کیا جائے تو ان میں سے کچھ اپنی شدت کے باوجود مستقل ہیں اور معمولی کا حصہ تصور کی جاتی ہیں جنہیں ان کی شدت کے باوجود کم وبیش نظرانداز کر دیا جاتا ہے جب کہ جنگیں اور انقلابات غیر معمولی، دھماکہ خیز اور آتش بار ہوتے ہیں۔ ہمارا عہد کچھ اسی قسم کا ہے۔ ہم سب نے اسی میں آنکھ کھولی ہے۔ ہم اسی میں سانس لیتے ہیں اور اسی میں جیتے ہیں۔ اگر ہم اس دور کے تقاضوں سے عہدہ برآں ہونا چاہتے ہوں تو ان مباحث سے فرار کیوں کر ممکن ہوسکتا ہے؟

لیکن اس کے علاوہ ایک اور بھی زیادہ بنیادی نوعیت کی کسوٹی موجود ہے جس کا تعلق باضمیر طور پر حقائق بیان کرنے سے ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے تلخ ترین انقلابی جدوجہد میں بھی وقت اور جگہ کو صحت کے ساتھ بیان کرنا ضروری ہوتا ہے اسی طرح انتہائی شدید مباحثوں اور مناظروں کے دوران بھی اسی تناسب کا خیال رکھنا ازبس ضروری ہوتا ہے جو اشیا اور انسانوں کے درمیان موجود ہوتا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ مین نے اس کا خیال نہ صرف بحیثیت مجموعی بلکہ جزیات میں بھی رکھا ہے۔

بعض جگہوں پر ...اگرچہ وہ بہت زیادہ نہیں ہیں... میں نے بہت عرصہ پہلے مکالموں کی شکل میں ہونے والی گفتگو کا حوالہ دیا ہے۔کوئی بھی یہ تقاضہ نہیں کرے گا کہ مدتوں پہلے ہونے والی گفتگو کو حرف بحرف پیش کیا جائے۔ نہ ہی اس قسم کی درستگی کا دعویدار ہوں۔ان میں سے کچھ مکالمے قدرے علامتی نوعیت کے کردار کے حامل ہیں۔تاہم ہر کسی کی زندگی میں ایسے لمحات ضرور آتے ہیں جب کوئی مخصوص مکالمہ اس کے ذہن پر ان مٹ نقوش چھوڑ جاتا ہے۔ ہم عام طور پر اس قسم کی گفتگو اپنے ذاتی یا سیاسی دوستوں کے سامنے دہراتے ہیں جس کی وجہ سے یہ ہماری یادداشت کا مستقل جزو بن جاتی ہے۔ بلاشبہ میں بنیادی طور پر سیاسی نوعیت کے مکالموں کو پیش نظر رکھ کر یہ بات کہہ رہا ہوں۔

یہاں میں یہ بات ضرور کہنا چاہوں گا کہ میں اپنی یادداشت پر اعتماد کرنے کا عادی ہوں۔اس بار حقائق کی تصدیق کرنا پڑی ہے اور اس کی شہادت اس امتحان پر

پوری اتری ہے۔لیکن ایک تحفظ کا اظہار بھی ضروری ہے۔اگر میری یادداشت مقام نگاری اورموسیقی کے حوالے سے کمزور ہےاورمشاہدہ وزبان دانی کے حوالے سے اوسط درجے کی ہےتو جہاں تک نظریات اورتصورات کاتعلق ہےتو وہ اوسط سے کافی بلند ہے علاوہ ازیں اس کتاب میں نظریات ،ان کے ارتقاءاوران نظریات کے لئے انسانوں کی جدوجہدکوانتہائی اہم مقام حاصل ہے۔

یہ بجا ہے کہ یادداشت کوئی خودکار معیارنہیں ہے۔سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ کبھی بھی بے غرض نہیں ہوتی۔اکثر اوقات یوں ہوتا ہے۔کہ وہ ایسے واقعات کوتاریک کونوں کھدروں میں دھکیل دیتی ہے جسے اس پر غلبہ رکھنے والی جبلت، جو بالعموم جاہ طلبی ہوتی ہے،موزوں خیال نہیں کرتی۔لیکن یہ نافدانہ تحلیل نفسی کے شعبے سے متعلق ہے جو بعض اوقات اچھوتی اورسبق آموز چیزیں سامنے لاتی ہےلیکن اکثر اوقات بے قاعدہ اورصوابدیدی ہوتی ہے۔

یہاں یہ کہنا غیرضروری ہوگا کہ میں نے اپنی یادداشت کوتسلسل کے ساتھ دستاویزی شواہد کے ذریعے آزمایا ہے۔جن حالات میں مجھے کام کرنا پڑا ہےوہ خاصے دشوار تھے۔تاہم میں کتب خانوں میں محفوظ تاریخی دستاویزی مواد سے اہم حقائق اور تاریخوں کی تصدیق کے لئے درکارمعلومات حاصل کرنے میں کامیاب رہا ہوں۔

میں نے بنیادی طور پرقلم کے ہتھیارلڑائی کی ہے۔جس کی شروعات 1897 میں ہوئی تھیں۔لہٰذا میری زندگی میں رونما ہونے والے واقعات نے تواتر سے اپنے نشانات چھوڑے ہیں جوگذشتہ تیس برسوں پرمحیط ہے۔ 1903 میں پارٹی کےمختلف دھڑوں کے درمیان جو جدوجہدشروع ہوئی تھی اس میں ذاتی وشخصی واقعات نے بھی بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔میری طرح میرے حریفوں نے بھی وار کرنے میں کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرنہیں کیا۔اس لڑائی کے دوران آنے والے تمام زخموں کے نشانات تحریری شکل میں موجود ہیں۔اکتوبر انقلاب کے بعد سے انقلابی تحریک کی تاریخ کو نوجوان سوویت عالموں اور پورے پورے اداروں کےتحقیقی کام میں نمایاں حیثیت

حاصل رہی ہے۔ اس ضمن میں دلچسپی کا تمام مواد انقلاب کی تاریخ دستاویزات اور زار شاہی کے محکمہ پولیس کا ریکارڈ سے حاصل کر کے حقائق پر مبنی تفصیلی تبصروں کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ اولین سالوں میں، جب کسی شے کی پردہ پوشی کی ضرورت نہیں تھی، اس کام کو انتہائی دیانت داری کے ساتھ سرانجام دیا گیا تھا۔ لینن کا تحریر کردہ مواد اور کچھ میری تحریریں بھی سٹیٹ پبلشنگ ہاؤس نے شائع کیں۔ ان میں سے ہر کتاب میں مصنفین کی سرگرمیوں اور متعلقہ عہد میں رونما ہونے والے واقعات کے حوالے سے بیش بہا معلومات درجنوں صفحات پر پھیلی ہوئی ہوتی تھیں۔ بلا شبہ اس سے میرے کام میں آسانی پیدا ہوئی اور مجھے تاریخی واقعات کی ترتیب درست کر کے کم از کم سنجیدہ نوعیت کے حقائق سے متعلق غلطیاں درست کرنے میں مدد ملی۔

میرے لئے اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ میری زندگی اس ڈگر پر نہیں چلی جسے معمولی کی زندگی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کی کیا وجوہات ہیں اس کا راز میری بجائے اس عہد کے حالات میں پنہاں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ میں نے برا یا بھلا جو بھی کام کیا اس کے لئے بعض مخصوص ذاتی رجحانات کی موجودگی بھی ضروری تھی۔ لیکن مختلف تاریخی حالات مین یہ ذاتی خصائص ہو سکتا ہے۔ کہ مکمل طور پر خوابیدہ رہتے جیسا کہ بہت سے دیگر جذبات و میلانات کے ساتھ ہوتا ہے جن سے سماجی ماحول کوئی تقاضا نہیں کرتا۔ دوسری جانب ہو سکتا ہے۔ آج کئی دیگر خوبیاں سامنے آ رہی ہوں جنہیں یا تو دبا دیا گیا تھا۔ یا پس پردہ دھکیل دیا گیا تھا۔ لیکن پھر موضوع سے بلند تر ہو کر معروضی ابھرتا ہے۔ اور آخری تجزیئے میں معروض ہی فیصلہ کن اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔

میری زندگی میں فکری اور عملی سرگرمیوں کی شروعات سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں ہوئیں جن کا مقصد مخصوص نظریات و افکار کے لئے مستقل جدوجہد رہا ہے۔ میری ذاتی زندگی میں ایسے واقعات رونما نہیں ہوئے جو بذات خود عوامی توجہ کے مستحق ہوتے۔ میری زندگی میں جو بھی غیر معمولی واقعات ہیں ان کا تعلق انقلابی جدوجہد سے ہے اور اسی سے ان کی اہمیت ہے۔ اس آپ بیتی کے لئے محض یہی ایک جواز کافی ہے۔ لیکن یہی

سر چشمہ مصنف کے لئے بہت ہی دشواریاں بھی پیش کرتا ہے۔ میری زندگی کے حقائق کا تانا بانا تاریخی واقعات کے ساتھ یوں الجھا ہوا ہے کہ انہیں جدا کرنا دشوار ثابت ہوا ہے علاوہ ازیں یہ کوئی بالکل ہی تاریخی کتاب نہیں ہے۔ یہاں واقعات کو ان کی معروضی اہمیت کے مطابق نہیں لیا گیا بلکہ اس حوالے سے لیا گیا ہے کہ وہ میری ذاتی زندگی کے حقائق کے ساتھ کس طرح جڑے ہوئے ہیں۔ اس لیے یہ بالکل فطری بات ہے کہ مخصوص واقعات اور پورے پورے ادوار کے بیان میں اس تناسب کا فقدان نظر آتا ہے جس کا تقاضا اس صورت میں کیا جا سکتا تھا اگر موجودہ کتاب محض تاریخ کے بارے میں ہوتی۔ مجھے آپ بیتی اور انقلاب کی تاریخ کو جدا کرنے والی لکیر کی تلاش میں ٹامک ٹوئیاں مارنی پڑی ہیں۔ اپنی زندگی کی کہانی کو ایک تاریخی مقالے میں گم کئے بغیر قاری کو سماجی ارتقا کے حقائق بنیاد سے آگاہ کرنا بھی ضروری تھا۔ ایسا کرتے وقت میں نے یہ فرض کیا ہے کہ قاری عظیم واقعات کے بنیادی خدوخال سے بخوبی آگاہ ہے اور اسے محض تاریخی حقائق اور ان کی ترتیب کی مختصراً یاددہانی کرانا ہی کافی ہے۔

اس کتاب کے شائع ہونے تک میں پچاس برس کا ہو جاؤں گا۔ میری سالگرہ کی تاریخ بھی وہی ہے۔ جو اکتوبر انقلاب کی ہے۔ علم الاعداد کے ماہرین اور صوفی حضرات اس سے جو نتائج چاہیں اخذ کر سکتے ہیں۔ بذات خود مجھے اس عجیب وغریب اتفاق کے بارے میں علم انقلاب کے تین سال بعد ہوا۔ نو سال کی عمر میں ایک دور افتادہ چھوٹے گاؤں میں رہتا تھا۔ آٹھ برس تک میں نے سکول میں تعلیم حاصل کی۔ پہلی بار میں سکول چھوڑنے کے ایک سال بعد گرفتار ہوا۔ اپنے دور کے بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح میں نے بھی سائبیریا، جیل اور جلاوطنی جیسی یونیورسٹیوں سے تعلیم حاصل کی۔ میں دوبارہ گرفتار ہوا اور زار کی جیل میں چار سال گزارے۔ زار کی عنائت کردہ جلاوطنی میں پہلی بار دو سال گذارے اور دوسری بار چند ہفتے۔ سائبیریا سے دو بار فرار ہوا۔ اپنی بارہ سالہ جلاوطنی میں نے امریکہ کے علاوہ یورپ کے مختلف ممالک میں گذاری۔ دو سال 1905 کے انقلاب سے پہلے اور کم وبیش دس سال اس انقلاب کی

شکست کے بعد۔ جنگِ عظیم کے دوران 1915 میں ہونزولرن میں مجھے جرمنی میں میری غیر حاضری میں جیل کی سزا سنائی گئی۔ اگلے برس مجھے فرانس اور سپین سے نکالا گیا۔ کچھ عرصہ میڈرڈ جیل میں گذارا اور پھر ایک ماہ مجھے کادیز میں پولیس کی نگرانی میں رکھنے کے بعد جبراً امریکہ بھیج دیا گیا۔ فروری انقلاب کے وقت میں وہیں تھا۔ نیویارک سے واپسی پر مجھے برطانویوں نے گرفتار کر لیا اور ایک مہینہ مجھے کینیڈا کے مشقتی کیمپ میں گذارنا پڑا۔ میں نے 1905 اور 1917 کے انقلابات میں حصہ لیا اور دونوں بار میں میں سینٹ پیٹرز برگ کی نمائندگان کی سوویت کا چیئر مین تھا۔ میں نے اکتوبر انقلاب میں بھرپور حصہ لیا اور سوویت حکومت کا رکن بھی بنا۔ امور خارجہ کے عوامی کیسار کی حیثیت سے میں نے برست لیتوفسک میں جرمنی، آسٹریا۔ ہنگری، ترکی اور بلغاریہ کے نمائندوں کے ساتھ مذاکرات کئے۔ بری اور بحری افواج کے عوامی کیسار کی حیثیت سے میں نے سرخ فوج کو منظّم کرنے اور سرخ بحریہ کو بحال کرنے کے لئے پانچ برس صرف کئے۔ 1920 میں ملک کے غیر منظّم ریلوے نظام کو راہ راست پر لانے کی ذمہ داری بھی مجھے سونپی گئی۔

تاہم خانہ جنگی کے سالوں کے علاوہ میری زندگی کا مرکز ومحور پارٹی اور علمی وادبی سرگرمی رہی ہے۔ 1923 میں ریاستی ادارہ اشاعت نے میری تحریروں کا مجموعہ شائع کرنا شروع کیا۔ وہ تیرہ جلدس شائع کرنے میں کامیاب رہا جن میں عسکری موضوعات لکھی گئی پانچ جلدیں شامل نہیں ہیں۔ 1927 میں ''ٹراٹسکی ازم'' پر عتاب کی شدت میں اضافہ ہونے کے بعد اس سلسلے کو منقطع کر دیا گیا۔

جنوری 1928 میں موجودہ سوویت حکومت نے مجھے جلاوطن کر دیا۔ ایک سال میں نے چینی سرحد پر گزارا پھر فروری 1929 میں مجھے ترکی جلاوطن کر دیا گیا اور یہ سطور میں قسطنطنیہ میں بیٹھا لکھ رہا ہوں۔

اس مختصر سے خاکے میں بھی آپ دیکھ سکتے ہیں کہ میری زندگی یکسانیت سے عبارت نہیں ہے۔ اس کے برعکس اگر اس میں آنے والے اتار چڑھاؤ اچانک رونما

ہونے والے واقعات اور شدید تصادم مدنظر رکھے جائیں تو کہا جا سکتا ہے کہ میری زندگی ''مہمات'' سے بھری پڑی ہے۔لیکن میں یہاں یہ ذکر کرنا ضروری خیال کرتا ہوں کہ فطری رجحان کے حوالے سے مہم جوئی کے شائقین میں سے نہیں ہوں۔ میں قدرے کتاب پرست اور عادات کے حوالے سے قدامت پسند واقع ہوا ہوں۔میں نظم ضبط پسند کرتا ہوں اور اس کی قدر کرتا ہوں۔ میں کوئی تضاد نہیں بلکہ ایک حقیقت بیان کر رہا ہوں اور یہ کہنا بھی ضروری خیال کرتا ہوں کہ میں بدنظمی یا بربادی برداشت نہیں کرسکتا۔ میں کام کو درست طور پر سرانجام دینے والا ایک محنتی اور مستعد طالب علم تھا اور میں نے تمام عمران دونوں خوبیوں سے استفادہ کیا ہے۔خانہ جنگی کے دوران میں نے ریل میں اتنا سفر کیا ہے جو زمین کے گرد کئی چکر لگانے کے برابر ہوگا۔اس دوران مجھے جب بھی کہیں تازہ کٹے ہوئے درختوں کے تختوں کی باڑ دکھائی دیتی میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہتا۔لینن میرے اس شوق سے واقف تھا اور دوستانہ انداز میں مجھے تنگ بھی کیا کرتا تھا۔ایک اچھی کتاب جس میں آپ نئے خیالات مل سکیں اور ایک اچھا قلم جس سے آپ دوسروں تک اپنے خیالات پہنچا سکیں میرے لئے ہمیشہ کی طرح آج بھی کلچر کی انتہائی قابل قدر اور دوستانہ پیداوار ہیں۔مطالعے کی خواہش نے کبھی میرا پیچھا نہیں چھوڑا اور زندگی میں کئی بار میں نے محسوس کیا کہ انقلاب میرے منظّم کام میں رخنہ اندازی کررہا ہے۔اس کے باوجود میری شعوری زندگی جو ایک تہائی صدی پر محیط ہے مکمل طور پر انقلابی جدوجہد سے عبارت ہے۔اور اگر مجھے یہ زندگی دوبارہ بسر کرنا ہو تو میں بلا ہچکچاہٹ یہی راستہ دوبارہ منتخب کروں گا۔

یہ سطور میں ایک جلاوطن کی حیثیت سے تحریر کررہا ہوں۔ یہ میری زندگی کی تیسری جلاوطنی ہے جب کہ میرے قریب ترین دوست یا تو جلاوطن کیے جارہے ہیں۔ یا اس سوویت جمہوریہ کی جیلوں کو رونق بخش رہے ہیں جس کی تخلیق میں انہوں نے فیصلہ کن کردار ادا کیا تھا۔ان میں سے کچھ متذبذب ہیں کچھ پیچھے ہٹ رہے ہیں اور کچھ دشمن کے سامنے جھک گئے ہیں۔

اس کی وجوہات یہ ہیں کہ کچھ اخلاقی لحاظ سے تہی دست ہو چکے ہیں، کچھ حالات کی بھول بھلیوں میں راستہ تلاش نہیں کر پا رہے اور کچھ مادی نوعیت کی انتقامی کارروائیوں کے دباؤ کا سامنا نہیں کر سکتے۔ میں اس سے پہلے بھی دو ایسے مواقع دیکھ چکا تھا جب اکثریت نے انقلاب کے جھنڈے کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ پہلی بار 1905 کے انقلاب کی ناکامی کے بعد اور دوسری بار جنگ عظیم کے آغاز پر۔

لہٰذا میں ذاتی تجربے کی بنیاد پر تاریخ کے مدوجذر سے بخوبی آگاہ ہوں۔ وہ اپنے ہی قوانین کے تابع ہیں۔ محض بے صبری ان میں سے کسی تبدیلی کو جنم نہیں دے سکتی۔ میں تاریخی تناظر کو اپنی ذاتی تقدیر کے حوالے سے نہ دیکھنے کا عادی ہو چکا ہوں۔ ہمیں واقعات میں علت و معلول کی ترتیب کو سمجھنا اور اس ترتیب میں کہیں اپنی جگہ تلاش کرنا چاہیئے۔ یہ ہر انقلابی کا اولین فریضہ ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ اس شخص کے لئے عظیم ترین ذاتی تسکین کا سبب ہے جو اپنے فرائض کو موجودہ عہد تک محدود نہیں کرتا۔

ٹراٹسکی

پرنکی 1929

یافونکا

بچپن زندگی کا انتہائی پر مسرت دور خیال کیا جاتا ہے۔ کیا یہ بات ہمیشہ درست ہوتی ہے؟ ایسا نہیں ہے، محض چند لوگ ہی پر مسرت بچپن گزارتے ہیں۔ بچپن کو مثالی بنا کر پیش کرنے رواج مراعات یافتگان کے پرانے ادب سے شروع ہوا۔ ایک محفوظ، خوشحال اور فکر و غم سے آزاد بچپن۔ موروثی دولت اور اعلیٰ تہذیب و ثقافت کے مالک گھرانے میں شفقت سے بھرپور کھیل کود میں گذرنے والا بچپن ہمیں زندگی کے سفر کے آغاز پر ایک ایسی ہری بھری چراہ گاہ کی طرح محسوس ہوتا ہے۔ جس پر سورج کی چمکیلی کرنوں کی برسات ہو رہی ہو۔ ادب کے اعلیٰ منصب داروں کی عظمت کا دم بھرنے والے کم مرتبہ حضرات نے بچپن کے بارے میں اس نقطہ نظر کو کم و بیش قانون فقہ کا درجہ

دے دیا ہے حالانکہ یہ خالصتاً اشرافیہ کا نقطہ نظر ہے۔ اس کے برعکس لوگوں کی اکثریت اگر پیچھے مڑ کر دیکھنے کی زحمت کرتی بھی ہے۔ تو اسے تاریکی، بھوک اور محتاجی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ زندگی کمزور کو نشانہ بناتی ہے اور ایک بچے سے زیادہ کمزور کون ہوتا ہے؟

میرا بچپن سردی اور بھوک سے ناآشنا تھا۔ میرا خاندان میری پیدائش کے وقت ہی مقابلے کے دوڑ میں اپنا مقام پا چکا تھا۔ لیکن وہ لوگ ابھی سخت مسابقت کی کیفیت میں تھے جو ان لوگوں کا خاصہ ہوتی ہے جو ابھی غربت سے پیچھا چھڑا رہے ہوتے ہیں اور ان کا آدھے رستے میں رکنے کا کوئی ارادہ نہیں ہوتا۔ جسم کے ہر پٹھے پر کام کے بوجھ کے ساتھ ہر فکر کام اور بچت پر مرکوز تھی۔ ایسا گھریلو معمولی بچوں کے لئے بہت کم گنجائش چھوڑتا ہے۔ کوئی احتیاج بھی نہیں تھی لیکن ہم زندگی کی فراخدلیوں اور التفات سے ابھی ناآشنا تھے۔ مجھے اپنا بچپن چمکیلی دھوپ میں نہلائی ہوئی چراہ گاہ جیسا نہیں لگتا جیسا کہ ایک محدود اقلیت محسوس کرتی ہے۔ لیکن وہ بھوک، تشدد اور محرومی کا تاریک غار بھی محسوس نہیں ہوتا جیسا کہ وہ اکثریت کے لئے ہوتا ہے۔ میرا بچپن نچلے درمیانے طبقے سے تعلق رکھنے والے بچے کا نیم تاریک بچپن تھا جو روس کے ایک گمنام کونے میں آباد گاؤں میں گذرا۔ یہاں فطرت وسیع اور نقطہ نظر، آداب اور مفادات تنگ اور گھٹن زدہ تھے۔

وہ روحانی ماحول جس میں میرے ابتدائی سال گذرے اور جس میں میری بعد کی شعوری زندگی گزری، دو مختلف دنیاؤں سے تعلق رکھتا ہے۔ اسے صرف عشروں پر محیط وقت اور دور دراز کے ممالک ہی جدا نہیں کرتے بلکہ اسے عظیم واقعات پر مشتمل سلسلہ ہائے کوہ اور وہ داخلی زلزلے اور ٹوٹ پھوٹ بھی الگ کرتی ہے۔ جو بظاہر زیادہ نمایاں نہیں ہوتی لیکن انسان کی انفرادیت کے لئے بھرپور اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ جب میں نے موجودہ آپ بیتی تحریر کرنا شروع کی تو مجھے اکثر یوں ہوا کہ میں نے اپنے بچپن کے بارے میں نہیں بلکہ مدتوں پہلے کے کسی دور دراز ملک کے سفر کی داستان رقم کر رہا ہوں۔ میں نے اپنی کہانی صیغہ واحد غائب میں تحریر کرنے کی بھی کوشش کی۔ لیکن اس

روایتی ہیئت سے قصہ کہانی کا تاثر بآسانی قائم ہو جاتا ہے۔ جس سے میں ہر قیمت پر بچنا چاہتا ہوں۔

ان دونوں دنیاؤں کے درمیان تضاد کے باوجود شخصیت کی اکائی پوشیدہ راستوں سے ایک سے دوسری دنیا کا سفر طے کرتی ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ لوگ اسی لئے ایسی شخصیات کی سوانح حیات اور آپ بیتیوں میں دلچسپی لیتے ہیں جنہیں کسی نہ کسی سبب سے سماج کی زندگی میں قدرے وسیع جگہ ملی ہوتی ہے۔ لہٰذا میری کوشش ہوگی کہ میں اپنے بچپن کی کہانی کو من وعن یوں بیان کروں کہ اس پر مستقبل کی پرچھائیں نہ ہو یعنی پہلے سے تصور کردہ عمومی اصولوں کی مناسبت سے حقائق کا انتخاب کئے بغیر... جو کچھ رو پذیر ہوا اسے محض یوں بیان کروں گا جس طرح وہ میری یادداشت میں محفوظ ہے۔

بعض اوقات مجھے یوں محسوس ہوا کہ گویا مجھے اپنی ماں کی چھاتیوں سے دودھ پینا بھی یاد ہے۔ غالباً جو کچھ میں نے چھوٹے بچوں میں دیکھا ہے اس کا محض خود پر اطلاق کر دیتا ہوں۔ ایک مدہم سی یاد اس وقت کی بھی ذہن میں آتی ہے جب میں محض ڈیڑھ برس کا تھا۔ یہ منظر باغ میں سیب کے درخت کی چھاؤں سے متعلق ہے مگر اس یاد کو بھی مشکوک کہا جا سکتا ہے۔ ایک اور واقعہ مجھے زیادہ بہتر طور پر یاد ہے۔ میں اپنی ماں کے ساتھ 'ز' خاندان کے ہاں مہمان تھا جو بوبرنیتز میں رہائش پذیر تھا۔ ان کی ایک بچی تھی جس کی عمر دو یا تین سال ہوگی۔ میں دلہا بنا تھا اور وہ لڑکی دلہن۔ ہم سب بچے دیوان خانے کے رنگ کیے ہوئے فرش پر کھیل رہے تھے۔ اب اس لڑکی کا خاکہ دھندلا پڑ جاتا ہے۔ چھوٹا لڑکا اب ایک الماری کے پاس خوفزدہ اور حیران پریشان کھڑا ہے۔ اس کی ماں میزبان خاتون کے ہمراہ اندر داخل ہوتی ہے۔ ماں ایک نظر اس لڑکے پر ڈالتی ہے اور پھر ایک نظر اس کے قریب موجودہ جوہڑ پر اور پھر وہ دوبارہ لڑکے کو دیکھ کر سر ہلاتی ہے اور ملامت بھرے انداز میں کہتی ہے "تمہیں شرم نہیں آتی؟" لڑکا کبھی اپنی ماں کو دیکھتا ہے کبھی اپنے آپ کو اور کبھی اس جوہڑ کو۔ گویا اس کا اس سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔

میزبان خاتون کہتی ہے "کوئی بات نہیں بچے بہت دیر سے کھیل رہے ہیں۔"

چھوٹے لڑکے کو نہ تو شرم محسوس ہو رہی ہے اور نہ ہی اسے ندامت کا کوئی احساس ہے۔اس وقت اس کی عمر ہوگی؟ تقریباً دو سال یا شاید تین سال۔

انہی دنوں کی بات ہے کہ اپنی دایہ کے ساتھ باغ میں گھومتے ہوئے میرا سامنا ایک زہریلے سانپ سے ہوگیا۔ وہ گھاس میں ایک چمکیلی سی چیز کی طرف اشارہ کر کے چلائی۔ دیکھو☆ لیوا! کسی نے نسوار کی ڈبیہ زمین میں دبائی ہوئی ہے۔ یہ کہہ کر دایہ نے ایک چھڑی اٹھالی تاکہ ڈبیہ کو زمین میں سے کھود نکالے۔ اس کی اپنی عمر بھی سولہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اتنی دیر میں نسوار کی ڈبیہ نے اپنے بل سیدھے کیئے اور پھنکارتے ہوئے سانپ کی شکل اختیار کر کے گھاس میں رینگنے لگی۔

میری دایہ نے چیخ ماری اور میرا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے دوڑ لگا دی۔ میری ٹانگیں اس کی تیز رفتاری کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ بعدازاں میں نے نہایت جوش وخروش سے بتایا کہ ہم نے گھاس میں نسوار کی ڈبیہ پڑی دیکھی جو دیکھتے ہی دیکھتے سانپ بن گئی۔

☆ ٹراٹسکی کا پورا اور اصل نام لیو ڈیوڈووچ برنسٹائن تھا اور اس کے والد کا نام ڈیوڈ لیونسٹائیو چبرنسٹائن تھا۔ لیوا لفظ لیو کی بدلی ہوئی شکل ہے جس کے حقیقی معنی شیر ہیں۔ انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں ٹراٹسکی لیون کے نام سے مشہور تھا جب کہ جرمن زبان میں اسے لیو کہا جاتا تھا اور کئی ایک سابقہ تحریروں میں اسے لیو ڈیوڈووچ لکھا گیا تھا۔ جب کہ اس کی بیوی کے رسالے کی اقتباسات میں اسے ایل، ڈی لکھا گیا۔مترجم

اس ابتدائی زمانے کا ایک اور منظر مجھے یاد ہے جو ہمارے بڑے باورچی خانے کا ہے۔ میرے والدین گھر پر نہیں تھے۔ باورچی، ملازمہ اور ان کے کچھ مہمان وہاں موجود تھے۔ میرا بڑا بھائی الیگزینڈر چھٹیوں میں گھر آیا ہوا تھا اور اوٹ پٹانگ حرکتیں کرتا پھر رہا تھا۔ وہ ایک لکڑی کے پھاوڑے پر کھڑا مٹی کے فرش پر یوں ناچ کود رہا تھا گویا برف پر پھیلنے والی تختیوں پر کھڑا ہو۔ میں نے اس کی بہت منت سماجت کی کہ وہ لکڑی کا پھاوڑا مجھے دے دے۔ پھر میں نے اس پر سوار ہونے کی کوشش بھی کی لیکن نیچے

گر پڑا اور رونے لگا۔ میرے بھائی نے مجھے گود میں اٹھا کر چوما اور بازوؤں میں بھر کر باورچی خانے سے باہر سے گیا۔

میں تقریباً چار سال کا تھا جب کسی نے مجھے ایک بڑی سی گھوڑی کی پیٹھ پر بٹھا دیا جو بھیڑ جیسی نرم مزاج تھی۔ اس پر نہ کاٹھی تھی اور نہ لگام بلکہ محض ایک رسی اس کے گلے میں پڑی ہوئی تھی۔ میں نے ٹانگیں پھیلا کر اس کی گردن کے بال دونوں ہاتھوں سے خوب زور سے پکڑ لیے۔

گھوڑی مجھے اٹھائے ہوئے چپ چاپ چل دی اور ناشپاتی کے درخت کے نیچے سے گزری جس کی ٹہنی میری چھاتی پر لگی۔ میں گھوڑی کے اوپر سے پھسلتا ہوا سیدھا گھاس پر گرا۔ مجھے چوٹ تو نہ لگی مگر میں حیران و پریشان ضرور تھا۔

میرے پاس بنا بنایا کوئی کھلونا نہیں ہوتا تھا۔ ایک دفعہ میری ماں کارکوف سے میرے لیے ایک گیند اور گتے کا بنا ہوا گھوڑ لائی۔ میری بہن اور میں گھر میں بنائی ہوئی گڑیاؤں سے کھیلتے تھے۔ میری دونوں پھوپھیاں فینا اور ریئسہ ہمارے لیے کپڑوں سے گڑیا بناتی تھیں۔ اور پھوپھی ریئسہ پنسل سے اس کا منہ، ناک اور آنکھیں تیار کرتی تھی۔ مجھے آج بھی اس کا گڑیا بنانا یاد ہے۔ ایک سردیوں میں ہمارے کاریگر ایوان وسیلائی وچ نے گتے سے ہمارے لئے ریل کار، پہیے اور کھڑکیاں بنائیں اور پھر انہیں آپس میں جوڑ دیا۔ میرا بڑا بھائی جو چھٹیوں میں گھر آیا ہوا تھا' اس نے اعلان کیا کہ ایسا تو وہ بھی ایک پل میں کر سکتا تھا۔ اس نے میری ریل کار کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ پھر وہ قینچی، رولر، اور پنسل لے کر بیٹھ گیا اور دیر لکیریں کھینچتا رہا۔ لیکن اس نے جو ڈرائنگ بنائی تھی، جب اسے کاٹا گیا تو وہ ریل کار نہ بن سکی۔

ہمارے رشتے دار جان پہچان کے لوگ کبھی الزوٹ گراڈ یا نکولوشیف جاتے تو مجھ سے پوچھ لیتے کہ وہ میرے لیے کیا لیتے آئیں۔ اس وقت میری آنکھوں میں چمک آ جاتی۔ میں کیا منگواؤں؟ پھر وہ خود ہی میری مدد کرنے لگتے۔ کوئی گھوڑے کا کھلونا تجویز کرتا، کوئی کتاب، کوئی رنگوں کا ڈبہ اور کوئی سکیٹنگ کا جوڑ الانے کے لئے کہتا۔

''مجھے سکیٹنگ کا جوڑا چاہیے۔''میں اپنے بھائی کی نقل کرتے ہوئے چیخ کر کہتا۔لیکن یہ سب لوگ گھر کی دہلیز پار کرتے ہی اپنے وعدے بھول جاتے۔ میں کئی ہفتے امید پر زندہ رہتا اور پھر ایک طویل مایوسی کا شکار ہو جاتا۔

شہد کی مکھی باغ میں سورج مکھی کے پھول پر بیٹھی ہے۔ اسے پکڑنے کے لئے احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں کٹا گھاس ہاتھ میں لے کر مکھی کو دو انگلیوں کے درمیان پکڑ لیتا ہوں۔ اچانک میں ایک ناقابل برداشت درد سے چیخ اٹھتا ہوں۔ اور صحن میں بھاگ ہوا ورک شاپ کی طرف چلا جاتا ہوں جہاں ایوان وسیلائی وچ مکھی کا ڈنگ نکال کر میری انگلی پر کوئی تیل مل دیتا ہے۔

ایوان وسیلائی وچ کے پاس سورج مکھی کے تیل کا بھرا ہوا ایک برتن تھا جس پر مکڑیاں تیر رہی تھیں۔ یہ تیل مکھی کے ڈنگ کا بہترین علاج سمجھا جاتا تھا۔ وکٹر گرٹو پانوف اور میں مکڑیاں پکڑتے رہتے تھے۔ ایسا کرنے کے لئے ہم ایک دھاگے کے ساتھ موم لگا کر مکڑیوں کے گھروں میں پھینک دیتے تھے۔ مکڑیاں موم کو اپنے جبڑوں پکڑتی تھیں۔ اور پھر اس کے ساتھ چپک جاتی تھیں۔ ہم دھاگے کو آرام کھینچ کر مکڑیوں کو ماچس کی خالی ڈبیا میں بند کر دیتے تھے۔ مکڑیوں کے شکار کا یہ کھیل بعد کی عمر میں بھی جاری رہا۔

مجھے سردیوں کی ایک طویل شام میں اپنے بزرگوں کی وہ باتیں یاد ہیں جب چائے پر یہ موضوع زیر بحث تھا کہ یانوفکا کب خریدا گیا تھا اور اس وقت فلاں فلاں بچے کی کیا عمر تھی اور ایوان وسیلائی وچ کب ہمارے پاس کام کرنے کے لئے آیا تھا۔ میری ماں نے چور آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔''ہم لیوا کو فارم سے بنا بنایا یہاں لے آئے تھے۔''میں نے بحث کرنے کی کوش کی اور بلند آواز میں بولا۔ ''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ میں فارم پر پیدا ہوا تھا؟'' میرے ماں باپ ہنستے ہوئے جواب دیتے''نہیں۔تم یہاں یانوفکا میں پیدا ہوئے تھے۔''

''پھر ماں کیوں کہتی ہے کہ ہم تمہیں بنا بنایا یہاں لائے تھے؟''

''ماں تو مذاق کر رہی تھی۔''

لیکن میری تسلی نہیں ہوتی۔ میں اسے ایک بھونڈا مذاق سمجھتا ہوں۔ بہر حال میں اپنے آپ کو قابو میں رکھتا ہوں۔ میرے بزرگوں کے چہرے پر ایک ایسی مسکراہٹ پھیل جاتی ہے جو مجھے اچھی نہیں لگتی۔ سردیوں کی ایسی ہی شاموں میں چائے پر میرے بڑوں کے درمیان ہونے والی باتوں سے واقعات کا ایک ایسی مسکراہٹ پھیل جاتی ہے جو مجھے اچھی نہیں لگتی۔ سردیوں کی ایسی ہی شاموں میں چائے پر میرے بڑوں کے درمیان ہونے والی باتوں سے واقعات کا ایک سلسلہ میرے ذہن میں ترتیب پاتا رہا اور میں نے اندازہ لگایا کہ میں 26 اکتوبر کو پیدا ہوا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق میرے والدین 1879 کے موسم گرما یا بہار میں اپنے چھوٹے سے فارم یانوفکا میں نقل مکانی کر کے آئے تھے۔

میری پیدائش کا سال زاریت پر پہلے بڑے حملے کا سال تھا۔ ''عوامی رضا'' نامی دہشت پسند پارٹی میری پیدائش سے دو ماہ پہلے 26 اگست 1879 میں معرض وجود میں آئی تھی اور اس نے زار الیگزینڈر کو سزائے موت سنائی تھی۔ 19 نومبر کو الیگزینڈر دوم کی گاڑی کو دھماکے سے اڑانے کی کوشش کی گئی تھی۔ یکم مارچ 1881 میں الیگزینڈر دوم کے قتل اور ''عوامی رضا'' پارٹی کی بیخ کنی پر ایک خوفناک جدوجہد کا آغاز ہو گیا تھا۔

ایک سال پہلے روس، ترکی کی جنگ ختم ہوئی تھی۔ اگست 1879 میں بسمارک نے آسٹریا۔ جرمنی اتحاد کی بنیاد رکھی تھی۔ اس سال زولا کا ناول ''نانا'' شائع ہوا تھا۔ جس میں پرنس آف ویلز کو میوزیکل کامیڈی کے ستاروں کا بہترین پارکھ کی حیثیت سے متعارف کرایا گیا تھا۔ فرانس۔ پروشیا جنگ اور پیرس کمیون کے انہدام کے بعد رجعت پسندی کی لہر ابھی تک یورپ کی سیاست میں بڑی تیزی چل رہی تھی۔ جرمنی میں سوشل ڈیموکریسی بسمارک من پسند قانون کی زد میں آ چکی تھی۔ 1879 میں وکٹر ہیوگو اور لوئی بلانک نے فرانس کی پارلیمنٹ میں انقلابیوں کو معاف کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔

لیکن فرانسیسی پارلیمنٹ کی بحثوں اور الیگزینڈر دوم کی گاڑی دھماکے سے اڑانے کی آوازیں یانوفکا تک پہنچنے سے معذور تھیں۔ جہاں میں نے پہلے پہل روشنی دیکھی تھی اور جہاں میں نے اپنی زندگی کے ابتدائی نو برس گزارے تھے۔خراساں اور جنوبی روس کا یہ سارا علاقہ وسیع سرسبز میدانوں پر مشتمل جو گندم کی پیداوار اور بھیڑوں کی پرورش کے لئے مشہور تھا۔اس علاقے کے اپنے قانون تھے۔ لامحدود میدانوں اور سڑکوں کی عدم موجودگی کے سبب یہاں سیاست کا داخلہ مشکل تھا۔ وسیع وعریض میدانوں میں چھوٹی چھوٹی بستیاں ان قوموں کا سراغ دیتی تھیں جو ہجرت کر کے یہاں آباد ہوگئی تھیں۔

میرا باپ ایک کسان تھا۔ پہلے چھوٹے درجے کا اور بعد میں بڑے درجے کا۔ ابھی وہ چھوٹا ہی تھا کہ اپنے والدین کے ساتھ پولٹوفا صوبے میں یہودیوں کا قصبہ چھوڑ کر جہاں وہ پیدا ہوا تھا جنوبی روس کے اس میدانی علاقے میں آ گیا تھا۔اس وقت خرساں کے صوبے میں یہودی کاشت کاروں کی کوئی چالیس بستیاں تھیں جن کی آبادی پچیس ہزار افراد سے زیادہ نہیں تھی۔ یہودی کاشت کاروں کو بھی دوسرے کاشتکاروں جیسے قانونی اور ملکیتی حقوق حاصل تھے۔(یہ 1881 سے پہلے کی بات ہے) میرے باپ نے رات دن کی بے تکان محنت اور موسموں کی سختیاں برداشت کرنے کے بعد ناموری حاصل کی تھی۔

گرورموکلی کے قصبے میں واقعات کے اندراج کی کتاب کو زیادہ صحیح طریقے سے نہیں رکھا جاتا تھا۔ بہت سے واقعات کا اندراج ان کے وقوع پذیر ہونے سے بہت بعد میں کیا جاتا تھا۔ جب میرا سکول میں جانے کا وقت آیا تو معلوم ہوا کہ میں ابھی اتنا چھوٹا تھا کہ داخلے کے قابل نہیں تھا۔ پھر میرا سن پیدائش 1879 سے تبدیل کر کے 1878 کیا گیا۔اس طرح میری پیدائش کے دوسال بن گئے۔ایک میرے گھر والوں کا تھا اور دوسرا سرکاری۔

زندگی کے پہلے نو سال میں اپنے گاؤں سے باہر نہ نکل سکا۔ یونوفکا کا نام یہاں

کے جاگیردار یانوفلّی کے نام پر رکھا گیا تھا۔اسی سے لوگوں نے زمینیں خریدی تھیں۔ یانوفلّی نے الیگزینڈر دوم کے زمانے میں حکومت وقت سے تعاون کر کے بڑا عروج حاصل کیا تھا اور اسے خرسان کے صوبے میں ایک ہزار ایکڑ غیر آباد علاقہ دے دیا گیا تھا۔ وہاں اس نے گھاس پھونس اور گارے سے جھونپڑی نما گھر بنایا۔ اپنے مویشیوں کے لئے بھی اس نے اسی قسم کے باڑے بنائے۔لیکن اس کی کاشت کاری ترقی نہ کرسکی اور اس کی موت کے بعد اس کا کنبہ پولٹا وانقل مکانی کر گیا۔ میرے والد نے یانوفلّی سے اڑھائی سو ایکڑ زمین خریدی تھی۔اس کے علاوہ اس نے چار سو ایکڑ زمین کرائے پر بھی حاصل کی تھی۔ مجھے یانوفلّی کی بیوہ اچھی طرح یاد ہے۔وہ چھوٹے قد کی دبلی پتلی خاتون تھی جو ہر سال زمین کی رقم لینے اور یہ دیکھنے آتی تھی کہ معاملات صحیح طور پر چل رہے تھے۔ہم اسے لانے کے لئے اپنی گاڑی سٹیشن بھیج دیا کرتے تھے۔ جب وہ گاڑی سے اترنے لگتی تو اس کے پاؤں نیچے کوئی اونچی چیز رکھ دیتے تھے تاکہ اسے اترنے میں آسانی رہے۔اس کی خوب خاطر تواضع کی جاتی۔ میری بہن کے ہمراہ باغ میں گھومتے وقت وہ باریک اور تیز انگلیوں سے جھاڑیوں سے بیروزہ جھاڑتی جاتی اور اسے بتاتی رہتی کہ اس سے اچھی دنیا میں کوئی سویٹ ڈش نہیں تھی۔

میرے باپ کی فصلیں ثمرہ آور ثابت ہوتی رہیں،مویشیوں اور گھوڑوں کے ریوڑ بڑھتے رہے۔ میرینونسل کی بھیڑوں کی افزائش کی کوشش بھی کی گئی جو کامیاب ثابت نہ ہوئی۔اس کے برعکس سوروں کی افزائش بڑی سودمند نکلی وہ ہر جگہ دندناتے پھرتے۔ انہوں نے باغ تباہ کر دیا۔زمینوں کی حفاظت تو کی جاتی تھی مگر طریقہ کا اندازہ تھا۔نفع یا نقصان فقط آنکھ سے دیکھا جاتا تھا۔اسی باعث باپ کی خوش قسمتی کا اندازکرنا مشکل ہو جاتا تھا۔اس کی ساری پونجی زمین کے اندر تھی یا فصل کی صورت میں زمین سے باہر تھی۔ یا پھر جو کچھ گودام میں ہوتا تھا۔جنس کو باہر بھی بھیجا جاتا تھا۔بعض اوقات چائے یا کھانے کے دوران میں میرا باپ ایک دم بول پڑتا۔''چلو' جلدی سے یہ لکھ لو میں نے کمیشن ایجنٹ سے تیرہ سو روبل حاصل کیے ہیں۔ میں نے چھ سو روبل کرنل یانوفلّی کی بیوہ کو اور

چار سو روبل ڈمبووسکی کو دیے ہیں۔ یہ بھی لکھ لو کہ جب گذشتہ موسم بہار میں میں الزوٹ گراڈ میں تھا تو میں نے ایک سو روبل تھوڈوسیہ کو دیئے تھے۔'' وہ اسی طریقے سے اپنا حساب کتاب رکھتا تھا۔ بہرحال میرا باپ آہستگی اور محنت سے ترقی کی منزلیں طے کرتا رہا۔

ہم کرنل پانوفسکی کے بنائے ہوئے مٹی کے گھر میں دن گزارتے رہے۔ گھاس پھونس کی چھت کے کونے کھدروں میں بے شمار چڑیوں نے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ دیواروں کے بیرونی حصوں میں گہری دراڑیں پڑ چکی تھیں جو کیڑے مکوڑوں کی افزائش گاہیں بن گئی تھیں۔ بعض دفعہ انہیں غلطی سے زہریلے سانپ سمجھ لیا جاتا تھا اور ان پر ابلتا ہوا پانی ڈال دیا جاتا تھا۔ مگر یہ سب بے سود جاتا تھا۔ بھاری بارشوں میں چھتیں ٹپکنے لگتی تھیں۔ خاص طور پر بڑے کمرے کی چھت سے ٹپکتے ہوئے پانی کے نیچے برتن رکھ دیے جاتے تھے۔ کمرے چھوٹے اور کھڑکیاں تاریک تھیں۔ نرسری اور کمروں کے فرش مٹی کے تھے۔ یہاں کیڑوں نے گھر بنا رکھے تھے۔ کھانے کمرے کا فرش خود کو چوبی فرش کہلانے پر فخر کر سکتا تھا۔ اسے ہفتے میں ایک دفعہ زرد ریت سے مانجھا جاتا تھا۔ لیکن بڑا کمرہ جو ہال کہلانے کا دعوے دار ہو سکتا تھا اور آٹھ قدم لمبا تھا، رنگ و روغن سے قدرے خوبصورت بنایا گیا تھا۔ کرنل کی بیوہ یہیں ٹھہرا کرتی تھی۔

گھر کے ارگرد زرد کیکر، سرخ اور سفید گلاب پھیلے ہوئے تھے۔ گرمیوں میں انگور کی بیل گھر پر چڑھ جاتی تھی۔ صحن میں کوئی باڑ نہیں تھی۔ میرے باپ نے ٹائیلوں کی چھت والا مٹی کا جھونپڑا نما گھر خود بنایا تھا، اس میں ورک شاپ، باورچی خانہ اور ملازموں کے کوارٹر تھے۔ اس کے ساتھ لکڑی کا چھوٹا کھلیان اور اس سے پرے بڑا کھلیان تھا۔ پھر ان سے پرے نیا کھلیان تھا۔ یہ سب سرکنڈوں سے بنے ہوئے تھے۔ انہیں پتھروں پر بنایا گیا تھا تاکہ پانی سے اناج خراب نہ ہو۔ گرم اور سرد موسموں میں کتے، سور اور چوزے ان کھلیانوں میں پناہ لیتے تھے۔ انڈے دینے کے لئے مرغیوں کے لئے یہ بڑی عمدہ جگہ تھی۔ میں پتھروں پر پیٹ کے بل گھسٹتا ہوا انڈے اٹھا کر لایا کرتا

تھا۔ ایک جوان آدمی خود کو سکیڑ کر وہاں داخل ہو سکتا تھا۔ ہر سال بگلے بڑے کھلیان کی چھت پر اپنے گھونسلے بنانے آ جاتے۔ وہ کیڑے مکوڑوں اور سپولیوں کو کھاتے وقت اپنی سرخ چونچیں آسمان کی طرف اٹھا لیتے۔ یہ بڑا دلکش منظر ہوتا تھا۔ ان کے جسم سانپوں کے سوراخوں کے اندر چلے جاتے تھے اور یوں لگتا تھا جیسے سانپ بگلوں کو کھا رہے ہوں۔

گھوڑوں کے اصطبل، مویشیوں اور سوروں کے باڑے اور مرغیوں کے ڈربے ہمارے مکان کی دوسری طرف تھے۔ یہ سب مٹی، سرکنڈوں اور کانوں سے بنائے گئے تھے۔ پھر انہیں گارے سے جوڑ دیا گیا تھا۔ گھر سے کوئی سو گز دور اونچی ڈھنکیلی آسمان کی طرف منہ اٹھائے ہوئے تھی۔ اس سے پرے وہ جوہڑ تھا جو کسانوں کے باغوں کو سیراب کرتا تھا چشموں کا پانی ہر سال جوہڑ کے کنارے توڑ دیتا جو گوبر اور تنکوں سے دوبارہ بنانے پڑتے۔ جوہڑ سے پرے پہاڑی پر آٹے کی چکی کی عمارت تھی۔ یہ لکڑیوں کا ایک سائبان تھا جس میں دس ہارس پاور کا انجن لگا ہوا تھا۔ میرے بچپن کے ابتدائی برسوں میں میری ماں زیادہ وقت کام کرتی رہتی تھی۔ یہ چکی ہمارے لئے ہی نہیں بلکہ ہمسایہ بستیوں کے کام بھی آتی تھی۔ کسان دس سے پندرہ میل کا فاصلہ طے کر کے یہاں آٹا پسوانے آتے اور اس کا دسواں حصہ بطور پسوائی دے جاتے۔ گرمیوں میں فصل کی کٹائی کے موقع پر چکی دن رات چلتی رہتی تھی۔ جب مجھے حساب کرنا اور لکھنا آ گیا تو میں گندم کے موقع کا وزن کیا کرتا اور پسوائی کی قیمت نکالا کرتا تھا۔ کٹائی کا موسم ختم ہونے پر چکی بند ہو جاتی تھی۔ بعد میں چکی کی نئی عمارت میں نیا انجن نصب کر دیا گیا۔ ہمارا کچا گھر بھی اینٹوں کے گھر میں بدل گیا جس کی چھت ٹین کی تھی۔ لیکن یہ اس وقت ہوا جب میں سترہ برس کا ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے کی گرمیوں کی چھٹیوں میں میں اپنے نئے گھر کی کھڑکیوں اور دروازوں کی پیمائش اور رسائز نکالنے میں لگا رہا تھا۔ مگر میری لکیریں درست نہیں ہوتی تھیں۔ جب میں اگلی تعطیلات میں آیا تو ہمارے نئے مکان کی بنیادیں بھری جا رہی تھیں۔ اس گھر میں رہنے کا مجھے کبھی نہ ملا اب یہ سوویٹ سکول کے طور پر

استعمال ہوتا ہے۔

کسانوں کو گندم کی پسوائی کے لئے چکی پر ہفتوں انتظار کرنا پڑتا تھا۔ جو نزدیک رہتے تھے وہ اپنی بوری قطار میں لگا کر گھر چلے جاتے تھے۔ دور سے آنے والے اپنی گاڑیوں میں پڑے رہتے تھے اور بارش کے دنوں میں چکی کی عمارت کے اندر سو جاتے تھے۔ ان میں سے ایک کسان کی لگام گم ہوگئی۔ کسی نے قریب ہی ایک لڑکے کو گھوڑا سدھارتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ سارے کسان بھاگتے ہوئے اس لڑکے کے باپ کی گاڑی کے پاس گئے وہاں گھاس ہٹائی تو لگام نکل آئی۔ غریب باپ کو مقامی پنچائت میں پیش ہونا پڑا۔ وہ قسمیں کھاتا رہا کہ اسے چھوٹے شیطان کی چوری کا کوئی علم نہیں تھا۔ لیکن کسی کو باپ کی بات کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس پر باپ نے چرائی ہوئی لگام ہی سے بیٹے کو پیٹنا شروع کر دیا۔ میں بڑوں کے عقب میں چھپ کر یہ تماشا دیکھتا رہا۔ لڑکا چیخا اور قسمیں کھاتا رہا کہ وہ آئندہ ایسا ہرگز نہیں کرے گا۔ لیکن کسان لڑکے کے واویلا سے بے نیاز یہ منظر دیکھتے رہے۔ وہ سگریٹ پی رہے تھے۔ اور ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے کہ باپ صرف دکھاوے کی خاطر بیٹے کو پیٹ رہا تھا۔ ان کا خیال تھا ان کا خیال تھا کہ بیٹے کی بجائے باپ کو مار پڑنی چاہیے تھی۔

کھلیانوں اور مویشیوں کے باڑوں سے پرے دو مزید بڑے بڑے شیڈ تھے جو سو فٹ سے زیادہ لمبے ہوں گے۔ ایک گھاس پھونس کا اور دوسرا کنڈوں سے بنا ہوا تھا۔ ان کی چھتیں دیواروں کے بغیر ستونوں کے سہارے کھڑی کی گئی تھیں۔ تازہ فصل ان کے پیچھے رکھی جاتی تھی۔ برسات کے موسم میں لوگ یہاں چھان اور چھلنی سے کام کرتے رہتے تھے۔ ان شیڈوں سے پرے اناج گاہنے والی جگہ۔ ندی کی دوسری جانب گائیں باندھنے کی جگہ تھی جس کی دیواریں خشک گوبر سے چنی گئی تھیں۔

میرے بچپن کی ساری زندگی کرنل کے کچے مکان اور کھانے کے کمرے میں پڑے ہوئے صوفے سے وابستہ ہے۔ یہ صوفہ سرخ لکڑی جیسا تھا جس پر بیٹھ کر میں چائے پیتا اور دوپہر اور رات کا کھانا کھاتا تھا۔ اسی صوفے پر اپنی بہن کے ساتھ گڑیاؤں کے کھیل

کھیلا کرتا اور بعد میں اسی پر بیٹھ کر میں پڑھا کرتا تھا۔ کرسی کے پاس ہی ایک سوراخ نما جگہ تھی جہاں وسیلائی وچ بیٹھا کرتا تھا۔ اس کے ساتھ میں اور میرے ساتھ میرا باپ بیٹھتا تھا۔ ''اس صوفے کا کپڑا اب بدل دینا چاہیئے۔'' ایوان وسیلائی وچ کہتا رہتا تھا۔

''بہت پہلے بدل دیا جانا چاہیے تھا۔'' میری ماں جواب دیتی ہے۔ ''زار کے مارنے جانے کے بعد سے اب تک اس پر کسی نے توجہ ہی نہیں دی۔''

میرا باپ جواب میں کہتا ہے۔ ''شہر جا کر ہم ادھر اُدھر کے کاموں میں بھاگتے رہتے ہیں، گھر واپس جانے کی پڑی رہتی ہے، اس افراتفری میں صوفے کے لئے کپڑا خریدنا بھول جاتے ہیں۔ یاد ہی نہیں رہتا کہ ہم کس مقصد کے لئے آئے تھے۔''

کھانے والے کمرے کی نیچی چھت کے ساتھ ایک بھدا اور بے رنگ بڑ نگا لگا رہتا تھا جس پر ہر قسم کی اوٹ پٹانگ چیزیں رکھ دی جاتی تھیں۔ مثلاً بلیوں اور چھچھوندروں سے کھانے پینے کی اشیا بچا کر پلیٹوں میں اس پر رکھی رہتی تھیں۔ اس کے علاوہ کاغذ، سیاہی کی دوات اور پن ہولڈر بھی وہاں رکھ دیے جاتے تھے۔ یا نوفکا میں قلم وغیرہ مشکل سے ہی ملتے تھے۔ ہم لکڑی سے اپنے قلم خود بنایا کرتے تھے۔ کھانے والے کمرے کی چمنی میں بلی نے اپنا گھر بنا رکھا تھا۔ وہیں وہ بچے بھی دیتی تھی۔ جب گرمی زیادہ جاتی تو وہ بڑی دیدہ دلیری سے اپنے بچوں کو منہ میں پکڑ کر نیچے فرش پر چھلانگ لگا دیتی۔ اگر کوئی مہمان زیادہ طویل قد کا ہوتا تو کھانے کی میز سے اٹھتے وقت بڑ نگے سے اس کا سر ضرور ٹکرا جاتا۔ ہمیں مہمانوں کو خبردار کرنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ ''جناب اپنے سر کا خیال رکھیں۔''

بڑے کمرے میں سب سے زیادہ قابل توجہ چیز ایک پرانا پیانو تھا جس نے کمرے کا ایک چوتھائی حصہ گھیر رکھا تھا۔ مجھے اس کے گھر لائے جانے کا وقت یاد ہے۔ ایک دیوالیہ جاگیردار کی بیوی جو کوئی پندرہ میل دور رہتی تھی، وہ شہر میں اپنے گھر کا سامان فروخت کرنے کے لئے لائی تھی۔ ہم نے اس سے صوفہ، لکڑی کی تین کرسیاں اور ٹوٹے ہوئے تاروں والا پیانو خریدا تھا۔ میرے باپ نے اس کے سولہ روبل ادا کیے تھے اور

اسے ایک چھکڑے پر لاد کر گھر لایا تھا۔ جب اسے ورکشاپ میں لا کر صاف کیا گیا تو اس میں سے مری ہوئی چوہیوں کا جوڑا نکلا۔ پیانو سردیوں کے کئی ہفتے ورکشاپ میں ہی پڑا رہا۔ ایوان وسیلائی وچ نے اس کی مرمت کی، نئے تار ڈالے، پالش کیا اور اسے بجانے کے قابل بنا دیا۔ اب اس کی آواز بڑے کمرے میں گونجنے لگی تھی۔ اگرچہ یہ کمزور تھی مگر کانوں کو اچھی لگتی تھی۔ ایوان وسیلائی وچ بذات خود اس پر طبع آزمائی کرنے لگا تھا۔ مگر میری بڑی بہن نے اسی پر موسیقی کے سبق لینا شروع کر دیے تھے۔ میرا سب سے بڑا بھائی جو الزورٹ گراڈ میں وائلن بجانا سیکھ رہا تھا، وہ بھی گاہے بگاہے پیانو پر انگلیاں پھیرتا رہتا تھا۔ میں بھی ایک انگلی سے اس کے سروں کو چھیڑنے میں لگا رہتا تھا۔ مجھے اعتراف ہے کہ میرے کان موسیقی کے لئے نہیں ہے۔ اس سلسلے میں میں خود کو بے بس محسوس کرتا ہوں۔

موسم بہار میں ہمارا صحن کیچڑ کے سمندر میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ ایوان وسیلائی وچ نے اس موسم کے لئے لکڑی کی ایک فٹ اونچی کھڑائیں بنا رکھی تھی جسے پہن کر اس کا قد بڑا ہو جاتا تھا۔ وہ ان کھڑاؤں کی مدد سے صحن میں چلتا پھرتا رہتا تھا۔ ایسے موقع پر ایک پرانا گھڑسوار بھی منظر پر نمودار ہو جاتا۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی بھی اس کا نام نہیں جانتا تھا۔ اس کی عمر اسی برس سے زیادہ تھی۔ اس نے نکولاس اول کی فوج میں پچیس سال ملازمت کی تھی۔ اس کا جسم بھاری اور سر اور داڑھی کے بال بالکل سفید تھے۔ وہ اپنے بھاری پاؤں بڑی مشکل سے اٹھاتا ہوا صحن میں اس طرف جاتا جہاں اس نے اپنی ایک ابتدائی نوعیت کی ورکشاف بنا رکھی تھی۔ ''میری ٹانگیں کمزور پڑتی جا رہی ہیں۔'' وہ گذشتہ دس برس سے شکایت کر رہا تھا۔ اس کے برعکس اس کے ہاتھ جن میں چمڑے کی بو آتی تھی، بڑے مضبوط دکھائی دیتے تھے۔ اس کے ناخن پیانو کے سروں سے ملتے تھے اور نوکیلے تھے۔

''میں تمہیں ماسکو دکھانے لے جاؤں؟'' وہ مجھ سے پوچھا کرتا تھا۔ ماسکو دیکھنے کو کس کا دل نہیں چاہتا۔ وہ مجھے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اوپر اٹھا لیتا۔ اس کے خوف

ناک ناخن مجھے چبھنے لگتے اور میں تکلیف سے بلبلا اٹھتا۔ میں اپنی ایڑیاں چلا کر نیچے اترنے کی کوشش کرتا۔ ''اگر تم نے ماسکو نہیں دیکھنا تو تمہاری مرضی۔'' غصے میں ہونے کے باوجود میں وہیں کھڑا رہتا۔ پھر وہ کھلیانوں کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے مجھے مخاطب ہوکر کہتا۔ ''وہ دیکھو اوپر کیا ہے؟'' مجھے شک پڑ جاتا کہ وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ میں وہیں کھڑا رہتا۔ بعد میں مجھے پتا چلا کہ وہاں چکی پر کام کرنے والا کانسٹاٹن اور ہماری باورچن کیٹی ہوتے تھے۔ دونوں بڑے خوش شکل اور محنتی تھے۔ ''تم دونوں کب شادی کررہے ہو؟'' وہ ان سے پوچھتا ''ہم جس حال میں ہیں بہتر ہیں۔'' کانسٹائن جواب دیتا۔ ''شادی پر دس روبل خرچ ہوتے ہیں۔ کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ میں کیٹی کو اس رقم سے جوتوں کا ایک جوڑا لے دوں؟''

میدانی علاقے کا گرم اور تکلیف دہ موسم گرم کے ختم ہونے اور فصل کی کاشت اور کٹائی کی شکل میں اپنی محنت کا پھل پانے کے بعد یا نو فکا میں خزاں شروع ہو جاتی جو تھکے ہوئے جسموں کو سہلانے لگتی۔ سال بھر کی محنت ٹھکانے لگ جاتی۔ اب فصل گاہنے کا موسم اپنے پورے عروج پر ہوتا اور سرگرمیوں کا مرکز فصل گاہنے والی جگہ بن جاتی جو ہمارے گھر سے کوئی ایک چوتھائی میل دور تھی۔ وہاں گردوغبار کا ایک گہرا بادل چھایا رہتا۔ فصل گاہنے والی مشین کی آواز دور تک سنائی دیتی۔ فلپ جو اس عمل انچارج تھا، عینک پہنے وہاں کھڑا رہتا۔ اس کی کالی داڑھی خاکستری گرد سے اٹ جاتی۔ لوگ اناج کے گھٹے ویگن سے اتار کر لاتے رہتے۔ فلپ ان کی طرف دیکھے بغیر نہیں پکڑتا جاتا اور تھریشر میں ایک ایک کر کے ڈالتا جاتا۔ پھر تھریشر کی آواز کتے کے غرانے کی آواز سے ملنے لگتی۔ جیسے اس کے منہ میں ہڈی ہو۔ تھریشر بھوسا ایک طرف پھینکتا جاتا جو ایک پائپ کے ذریعے ایک جگہ ڈھیر ہوتا جاتا۔ میں ایک ڈھیر کے کونے پر پائپ کے رسے کو مضبوطی سے پکڑے کھڑے ہوتا تھا۔ ''دیکھو کہیں گر نہ جانا۔'' میرا باپ آواز لگاتا۔ احتیاط کے باوجود میں گر پڑتا۔ گرد میرے نتھنوں میں گھستی رہتی جس سے مجھے چھینکیں آتی رہتیں ''او فلپ! مشین آہستہ چلاؤ۔'' میرا باپ تھریشر کی آواز زیادہ ہونے پر نیچے سے

آواز لگاتا۔ میں رسے کو زیادہ مضبوطی سے پکڑ لیتا۔ وہ میرے ہاتھ سے پھلسنا شروع ہو جاتا جس سے سارا وزن میری انگلیوں پر آجاتا۔ درد اس قدر شدید ہوتا کہ میرا سر چکرانے لگتا۔ میں ایک طرف سرک جاتا کہ کوئی روتا ہوا نہ دیکھ لے۔ پھر میں گھر بھاگ جاتا۔ میری ماں میرے ہاتھ پر ٹھنڈا پانی ڈالتی اور انگلیوں پر پٹی باندھ دیتی۔ پھر بھی درد کم نہ ہوتا۔ چند دنوں کی تکلیف کے بعد زخم ٹھیک ہو جاتا۔

گندم سے بھری بوریاں کھلیانوں اور شیڈوں میں رکھ دی جاتیں۔ کچھ بوریاں صحن میں رکھ کر ان پر ترپالیں ڈال دی جاتیں۔ میرا باپ خود دانوں کو اکٹھا کرنے اور چھاننی کے ذریعے ان کی صفائی اور بھوسے کو علیحدہ کر کے محفوظ کرنے کے عمل کی نگرانی کرتا۔ تیز ہواؤں سے بچنے کے لئے مزدور کھلیانوں اور شیڈوں کے اندر کام کرتے رہتے۔

اب آڑھتی بڑے بڑے ترازو پکڑے تانبے کے برتنوں کے ساتھ آپہنچتے۔ وہ دانوں کو پرکھتے اور پھر گندم کی قیمت مقرر کر کے میرے باپ کے ہاتھ میں پیشگی رقم تھما دیتے۔ ہم ان کی چائے اور بسکٹوں سے خاطر تواضع کرتے مگر ان کے پاس گندم فروخت نہ کرتے۔ وہ بڑے چھوٹے سوداگر ہوتے تھے۔ میرا باپ کاروبار کے نئے طریقے سیکھ چکا تھا۔ نکولائیف میں اس کے اپنے کمیشن ایجنٹ تھے۔ ''مجھے ابھی اپنا مال فروخت نہیں کرنا۔'' وہ ان سے کہتا۔ ''ابھی دانے تازہ ہیں۔ انہیں میں کچھ عرصہ پڑا رہنے دونگا۔''

پھر تقریباً ایک ہفتے بعد ہی نکولائیف سے کوئی خط یا تار آجاتا جس میں گندم کی قیمت زیادہ بتائی جاتی۔ ''دیکھا ہمیں ایک ہزار روبل زیادہ مل گئے ہیں۔'' میرا باپ کہتا۔ ''یاد رکھو روبل جھاڑیوں میں نہیں لگے ہوتے۔'' بعض اوقات اس کا الٹ بھی ہو جاتا تھا۔ قیمت گر جاتی تھی۔ عالمی منڈی کی خفیہ طاقت یانوفکا میں بھی اپنا اثر دکھاتی تھی۔ پھر میرا باپ نکولائیف سے واپسی پر بڑے غمگین لہجے میں کہتا۔ ''ارجنٹائن نے اس سال زیادہ گندم بھیج دی ہے۔''

موسم سرما ملک میں امن کا عرصہ ہوتا تھا۔اس زمانہ میں بھی ورکشاپ اور چکی چلتی رہتی تھیں۔آگ جلانے کے لئے ملازم گھاس اور دوسرا ایندھن لاتے رہتے تھے۔جب یہ گھاس ایک دم چولہوں میں بھڑک اٹھتی تو یہ دلکش منظر ہوتا تھا۔ایک دفعہ میں اور میری چھوٹی بہن کھانے والے کمرے میں تھے کہ کمرہ ایک دم کوئلے کے دھوئیں سے بھرنے لگا۔میں کمرے میں چکر پر چکر لگا رہا تھا اور مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ میں کہاں تھا۔پھر میں چیخ مار کر چکرا کر گر پڑا اور بے ہوش ہوگیا۔میرے چچا گریگری نے میری چیخ سن لی۔وہ بھاگ کر کمرے میں آیا اور مجھے اٹھا کر لے گیا۔سردیوں کے دنوں میں ہم اکثر گھر میں اکیلے ہوتے تھے۔میرے باپ کی عدم موجودگی میں سارے کام میری ماں پر آپڑتے تھے۔شام پڑتے ہی میں اور میری بہن صوفے پر چڑھ کر بیٹھ جاتے۔ہماری آنکھیں کھلی ہوتیں اور ہم ہلنے جلنے سے ڈرتے رہتے۔

یوں بھی ہوتا کہ ایک دیو جیسا آدمی بڑے بڑے بوٹوں کے ساتھ اندھیرے سے کھانے والے کمرے میں داخل ہوتا۔اس نے بڑا سا اوورکوٹ پہنا ہوتا تھا جس کے کالر اس نے اوپر اٹھائے ہوتے تھے۔اس کے سر پر بڑا سا ہیٹ ہوتا تھا۔اس کے ہاتھ دستانوں میں چھپے ہوتے تھے۔اس کی داڑھی اور مونچھوں پر برف سے جھالریں بنی ہوتی تھیں۔وہ اندھیرے میں اپنی بھاری آواز میں کہتا۔''شام بخیر'' ہم بہن بھائی صوفے میں مزید ایک دوسرے میں گھس جاتے اور جواب دینے سے ڈرتے۔پھر وہ عفریت دیا سلائی جلا کر ہمیں صوفے کے ایک کونے میں گھسا ہوا دیکھ لیتا۔وہ دیو ہمارا ایک ہمسایہ نکل آتا۔بعض اوقات کمرے کی تنہائی ناقابل برداشت ہو جاتی۔پھر سردی کے باوجود میں بڑے کمرے کی طرف بھاگتا۔بڑا دروازہ کھول کر باہر آجاتا، میں بار بار چیختا جاتا ماشکا! ماشکا!۔ماشکا کچن میں یا کسی دوسری جگہ مصروف ہوتی تھی۔ پھر میری ماں چکی سے آجاتی، وہ لیمپ روشن کرتی اور ہمارے پاس سماوار رکھ جاتی۔

ہم شام کو عموماً کھانے والے کمرے میں بیٹھتے تھے اور وہیں ہمیں نیند آجاتی تھی۔ وہیں لوگ آتے جاتے رہتے تھے۔، ماں سے چابیاں لی جاتی تھیں۔اور آنے والے

دن کے کام کا منصوبہ بندی ہوتی تھی ۔ میری چھوٹی بہن اولیا، میری بڑی بہن لنرا، ہماری خادمہ اور میں ایک ایسی زندگی گزار رہے تھے جو دوسروں کی مرہون منت تھی ۔ یعنی ہماری زندگیوں کا دار مدار ہمارے بڑوں کی زندگیوں پر تھا۔ بعض اوقات بڑوں کا کوئی لفظ یا فقرہ ہمارے لئے تذکرے کا خاص سبب بن جاتا ۔

ایسے موقع پر میں اپنی چھوٹی بہن کو آنکھ مارتا ۔ اس کی دبی دبی ہنسی نکل جاتی ۔ ہمارے بڑے غیر حاضر دماغی سے اسے دیکھنے لگتے ۔ میں پھر اسے آنکھ مارتا اور ہنسی کو دبانے کی کوشش میں اس کا سر میز سے جا ٹکراتا ۔ ہنسی کی یہ بیماری کبھی مجھے اور مجھ سے تیرہ برس بڑی میری بہن کو بھی لگ جاتی جو بڑوں اور چھوٹوں کے درمیان پل کا کام کرتی تھی ۔ اگر ہماری ہنسی قابو سے باہر ہو جاتی تو میز کے نیچے سے رینگتا ہوا، بڑوں کے پاؤں کے قریب سے گزر کر نرسری میں چلا جاتا ۔ ایسا کرتے وقت کبھی کبھی میرا پاؤں بلی کی دم پر آ جاتا ۔ مگر کھانے والے کمرے میں آتے ہی ہم سب کو دوبارہ ہنسی کے دورے پڑنے لگتے ۔ ہنسی سے میری انگلیاں اس قدر کمزور ہو جاتیں کہ میرے لئے گلاس پکڑنا مشکل ہو جاتا ۔ میرا سر، میرے ہونٹ میرے ہاتھ، میرے پاؤں حتیٰ کہ میرے جسم کا ایک ایک انچ ہنسی سے لرزنے لگتا ۔ ''تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے؟'' میری ماں پوچھتی ۔ ماں باپ ہمیں سوالیہ نظروں دیکھتے ۔ بعض اوقات ان کی نظریں دوستانہ ہوتی تھیں مگر زیادہ تر ان میں غصہ ہوتا تھا ۔ پھر ہم کھل کر ہنسا شروع کر دیتے ۔ اولیا کا سر ہنستے ہنستے میز کے نیچے چلا جاتا ۔ میں صوفے پر گر پڑتا ۔ لنرا اپنا بالائی ہونٹ کاٹنے لگتی اور خادم لڑکی دروازے سے باہر نکل جاتی ۔

''جاؤ جا کر سو جاؤ'' ماں باپ میں سے کوئی ڈانٹ کر کہتا ۔ لیکن ہم جاتے نہیں تھے ۔ ہم کونوں کھدروں میں چھپ جاتے اور ایک دوسرے سے آنکھ بچاتے رہتے ۔ میری چھوٹی بہن کو پکڑ کر سلانے کے لئے جایا جاتا ۔ میں صوفے پر ہی سو جایا کرتا تھا ۔ پھر کوئی مجھے بازوؤں میں اٹھا کر لے جاتا ۔ یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ میں آدھا سویا ہوا تھا، زور سے چیخ مارتا اور یہ بتانے کی کوشش کرتا جیسے کتوں نے مجھ پر حملہ کر دیا تھا، یا

میرے پیچھے سانپ سرسرا رہے تھے، یا ڈاکو مجھے اٹھا کر جنگل کی طرف جا رہے تھے۔ اس سے میرے ماں باپ پریشان ہو جاتے۔ بستر کی طرف لے جاتے وقت مجھے خاموش کرانے کی کوشش کی جاتی۔ مجھے تھپتھپایا اور چوما جاتا۔ اس طرح میں ہنستا ہوا سو جاتا۔

موسم سرما ہمارے کنبے کے افراد کا مل بیٹھنے کا زمانہ ہوتا تھا۔ ایسے دن بھی ہوتے تھے جب میری ماں اور باپ گھر سے بالکل نہیں نکلتے تھے۔ میرا بڑا بھائی اور بہن کرسمس کی چھٹیوں میں سکول سے گھر آ جاتے تھے۔ اتوار کے دن ایوان وسیلائی وچ قینچی اور کنگھی سے لیس ہو کر ہمارے بال کاٹنے بیٹھ جاتا۔ سب سے پہلے وہ میرے باپ کی حجامت بناتا۔ پھر ساشا کی اور آخر میں میرے بال کاٹتا۔ ساشا اس سے پوچھتا۔

''ایوان وسیلائی وچ کیا آپ میرے بال جدید طریقے سے کاٹ سکتے ہیں؟'' ہر کوئی ساشا کی طرف دیکھنے لگتا۔ پھر وہ وضاحت کرتا کہ الزاورٹ گراڈ میں ایک حجام نے ایک دفعہ اس کے بال انتہائی جدید طریقے سے تراشے تھے جس پر بعد میں اسے اپنے مالک سے زبردست جھاڑ پڑی تھی۔

حجامت کا کام ختم ہونے کے بعد ہم کھانا کھانے بیٹھ جاتے۔ میرا باپ اور ایوان وسیلائی وچ میز کے کناروں پر آمنے سامنے بیٹھتے تھے۔ بچے صوفے پر اور میری ماں ان کے سامنے ایوان اپنی شادی ہونے تک ہمارے ساتھ ہی کھانا کھاتا رہا۔ سردیوں میں ہم کھانا آہستہ آہستہ کھاتے اور کھانے کے بعد دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہتے۔ ایوان وسیلائی وچ سگریٹ سلگاتا اور دھوئیں کے مرغولے بناتا رہتا۔ بعض دفعہ ساشا یا لزا کو کوئی کتاب بلند آواز میں پڑھنے کے لئے کہا جاتا۔ اس دوران میں میرے باپ کو شاید نیند آنے لگتی۔ کئی بار ہم تاش کا کھیل کھیلنے لگ جاتے جس میں جھگڑا بھی ہو جاتا تھا۔ اپنے باپ کو دھوکہ دے کر ہمیں خاص لطف حاصل ہوتا تھا۔ وہ بڑی لاپرواہی سے کھیلتا تھا اور ہارنے پر ہنسنے لگتا تھا۔ اس کے برعکس میری ماں بہتر کھیل کا مظاہرہ کرتی تھی۔ وہ اپنے بڑے بیٹے پر خاص نظر رکھتی تھی کہ وہ اسے دھوکہ تو نہیں دے رہا تھا۔

قریب ترین ڈاک خانہ یا نوفکا سے تیس اور ریلوے سٹیشن پچیس میل دور تھا۔

سرکاری دفاتر، سٹورز اور ثقافتی مرکز اور بھی دور تھے۔ جہاں تک دنیا کا تعلق ہے وہ اپنے بڑے بڑے واقعات کے ساتھ ہم سے بہت دور تھی۔ یانوفکا میں زندگی کھیتوں میں فقط محنت کی تال پر چلتی تھی۔ کسی دوسری چیز کی کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔ صرف عالمی منڈی میں اناج کی قیمتوں پر دھیان رکھا جاتا تھا۔ ہم نے اس زمانے میں کبھی کوئی رسالہ یا اخبار نہیں دیکھا تھا۔ ہائی سکول میں جا کر اخبار کی شکل دیکھی۔ خاص مواقع پر خط لکھے اور وصول کیے جاتے تھے۔ کبھی کبھار ہمارا کوئی ہمسایہ بوبرینٹز جاتا تو وہاں کے ڈاک خانے میں ہمارے نام کا کوئی خط ہوتا تو وہ لے آتا۔ پھر وہ اسے ایک یا دو ہفتے اپنی جیب میں پڑا رہنے دیتا۔ خط کا آنا ایک بڑا واقعہ ہوتا تھا۔ ٹیلی گرام تو ایک بری خبر کی علامت ہوتی تھی۔ کسی نے مجھے بتایا کہ ٹیلی گرام تار کے ذریعے آتی تھی۔ مگر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ایک شخص گھوڑے پر بیٹھا اسے لا رہا تھا۔ اس تار کے عوض میرے باپ کو تار لانے والے کو اڑھائی روبل ادا کرنے پڑے۔ ٹیلی گرام خط کی طرح کاغذ کا پرزہ ہوتا تھا۔ اس پر پنسل سے لفظ لکھے ہوئے تھے مجھے بتایا گیا کہ یہ بجلی کے ذریعے آتی تھی۔ یہ اور بھی بری بات تھی۔ چاچا ابرام نے ایک دفعہ مجھے بتایا تھا کہ ''بجلی کی دو تار کے ذریعے آتی ہے اور ایک ربن پر کچھ نشان چھوڑ جاتی ہے۔'' پھر اس نے مجھے یہ سبق دھرانے کے لئے کہا۔ ''بجلی کی دو تار کے ذریعے آتی ہے اور ایک ربن پر کچھ نشان چھوڑ جاتی ہے۔'' میں یہ جملہ دہراتا رہا۔

''تم سمجھ گئے ہو؟''

''جی ہاں۔ مگر اس سے لفظ کیسے بنتے ہیں؟'' میں نے پوچھا ''لفظ الگ الگ آتے ہیں۔'' چاچا نے جواب دیا۔ لمحہ بھی میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ پھر میں نے پوچھا۔ ''جب ایک آدمی نے گھوڑے پر بیٹھ کر انہیں لانا ہوتا ہے تو پھر بجلی کی کیا ضرورت ہے۔ میرے چاچا کا صبر جواب دے گیا۔

''لفظوں کو گولی مارو'' وہ چلایا ''میں تمہیں ٹیلی گرام کے متعلق بتا رہا ہوں اور تم الفاظ کو لے بیٹھے ہو۔'' اس سے میری تسلی نہ ہوئی۔ میرے نزدیک چاچا کا جواب

ادھوار تھا۔

پولینا پٹرووونا نامی ایک خاتون بوبرینٹز سے ہمارے پاس قیام کرنے آئی۔اس نے کانوں میں لمبی بالیاں پہن رکھی تھیں۔اور بالوں کی ایک لٹ اس کے ماتھے پر لہرا رہی تھی۔ بعد میں میری ماں اسے واپس بوبرینٹز لے گئی۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ جب ہم گیارھویں میل کے نشان پر پہنچے تو ٹیلی گراف تاروں کی ایک قطار دکھائی دی۔ تاروں میں گنگناہٹ ہورہی تھی۔

''ٹیلی گرام کیسے آتی ہے؟'' میں ماں سے پوچھا۔

''پولینا پیٹرووونا سے پوچھو'ماں نے لاجواب ہوکر کہا۔''یہ تمہیں بتائیں گی۔''

پولینا پیٹرووونا وضاحت کرنے لگیں۔

''ربن پر جونشان بنتے ہیں وہ الفاظ کی علامت ہوتے ہیں۔پھرآپریٹرانہیں کاغذ پراتار لیتا ہے اور گھڑسوار کے ذریعے تار کو متعلقہ شخص تک پہنچا دیا جاتا ہے۔'' بات یہاں تک میری سمجھ میں آگئی تھی۔

''لیکن یہ کیسے ہے کہ بجلی کی رو کو کوئی دیکھ نہیں سکتا؟'' میں نے تار کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کرنٹ تار کے اندر ہوتا ہے۔'' پولینا پیٹرووونا نے جواب دیا۔''تمام تاریں چھوٹی چھوٹی ٹیوب ہوتی ہیں۔کرنٹ ان کے اندر دوڑتی ہے۔''

بات میری سمجھ میں آگئی تھی جس سے میں کافی عرصہ مطمئن رہا۔چارسال بعد سکول میں فزکس کے استاد نے جس طرح اس مسئلے کی تشریح کی وہ میرے لئے قابل قبول ثابت نہ ہوسکی۔

میرے باپ اور ماں کی محنت سے بھری زندگی میں لڑائی جھگڑے کے لمحات بھی آتے تھے مگرانہوں نے مجموعی طور پرایک بڑی پرمسرت زندگی گزاری میری ماں کا تعلق ایک شہری کنبے سے تھا جو کسان کو اس کے کھردرے ہاتھوں کی وجہ سے ذرا کم تر نظر سے دیکھتے تھے۔میرا باپ جوانی میں بڑا خوبصورت اور بارعب انسان تھا جس کا چہرہ مردانہ

وجاہت کا نمونہ تھا۔ وہ آمدنی کے اتنے ذرائع جمع کرنے میں کامیاب ہو گیا جس سے اس نے بعد میں یانوفکا میں زمین خرید لی۔ جس نوجوان خاتون کو وہ شہر سے بطور بیوی لایا تھا اس کے لئے شروع میں دیہات کی سخت اور جفاکش زندگی گزارنے میں بے حد کامیاب ثابت ہوئی۔ اس نے پتالیس برس تک محنت سے بالکل جی نہ چرایا۔ اس شادی سے آٹھ بچے پیدا ہوئے جن میں چار زندہ رہے۔ پیدائش کے حساب سے میں پانچویں نمبر پر تھا۔ چار بچے چھوٹی عمر میں پیچش اور سرخ بخار سے فوت ہو گئے۔ زندہ رہنے اور مرنے والے بچوں کی زندگیوں کی اہمیت ایک ہی جیسی تھی۔ دونوں کا کم ہی نوٹس لیا گیا۔ زمین، مویشی، چکی، مرغی خانہ ___ میرے ماں باپ سارا دن انہیں میں گم رہتے۔ کام محبت پر غالب رہتا۔ ہمارے کنبے میں محبت اور نرمی کا اظہار کبھی نہیں کیا جاتا تھا، خاص طور پر میرے ابتدائی برسوں میں۔ لیکن میرے باپ اور ماں درمیان محنت کا رشتہ بڑی مظبوطی سے قائم تھا۔

''ماں کو کرسی دو'' جونہی میری ماں گھر میں دہلیز پر قدم رکھتی میرا باپ اونچی آواز میں کہتا۔ چکی پر کام کرنے سے وہ سر سے پاؤں تک آٹے سے سفید ہوئی ہوتی تھی۔

''ماشکا! جلدی سے سماوار گرم کرو'' میری ماں گھر پہنچنے سے پہلے ہی بلند آواز میں کہنا شروع کر دیتی تھی۔ ''تمہارا مالک کھیتوں سے آنے ہی والا ہو گا'' دونوں جسمانی تھکاوٹ کو بخوبی سمجھتے تھے۔

میرا باپ ذہانت اور کردار دونوں لحاظ سے میری ماں پر برتری رکھتا تھا۔ وہ زیادہ گہرا، زیادہ محتاط اور سوچ سمجھ کر چلنے والا آدمی تھا۔ وہ لوگوں اور چیزوں کو پرکھنے والی غیر معمولی آنکھ اور بصارت رکھتا تھا۔ ہمارے ابتدائی برسوں میں میرے ماں باپ نے بہت کم چیزیں خریدی تھیں۔ وہ بھاؤ کرنا جانتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ کس طرح پیسہ پیسہ جمع کیا جاتا ہے۔ میرے باپ نے کوئی چیز خریدنے میں کبھی غلطی نہیں کی تھی۔ اس نے جو بھی خریدنا ہوتا خواہ وہ کپڑا، جوتے، ہیٹ، گھوڑے یا مشینری ہو، ہر چیز کی صحیح قیمت ادا کرتا تھا۔ ''میں روپے کو پسند نہیں کرتا'' بعد کے برسوں میں اس نے ایک دفعہ

مجھ سے کہا۔ جیسے وہ کنجوس ہونے پر معافی کا خواستگار تھا۔ ''یہ نہ ہو تو مجھے بھی اس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن ضرورت پڑنے پر پیسہ پاس نہ ہو، یہ بہت بری بات ہے۔'' وہ روسی اور یوکرانی ملی جلی زبانیں بولتا تھا مگر لہجہ یوکرانی تھا۔ وہ لوگوں کا اندازہ ان کے آداب، چہروں اور عادتوں سے کرتا تھا اور اس کا اندازہ ہمیشہ درست ہوتا تھا۔

''مجھے تمہارا فلاں طالب علم پسند نہیں ہے۔'' وہ ہمارے کسی مہمان کے بارے میں کہتا۔ ''کیا تمہارے خیال میں وہ احمق نہیں ہے؟'' مہمانوں کے بارے میں باپ کی اس قسم کی رائے سے ہمارے جذبات مجروح ہوتے تھے۔ لیکن ہم دلوں میں جانتے تھے کہ ہمارا باپ ٹھیک کہتا تھا۔ ایک مرتبہ کسی کے گھر جانے اور وہاں سے واپس آنے کے بعد اس نے اس گھر کے افراد اور ان کی بود و باش کا جو تجزیہ کیا وہ بے حد درست تھا۔

اتنے بچے پیدا کرنے اور اس قدر محنت کے بعد میری ماں بیمار پڑ گئی۔ وہ کرکوف میں ڈاکٹر کے پاس گئی۔ یہ ایک غیر معمولی سفر تھا جس کے لئے بڑے جوش و خروش سے تیاریاں کی گئیں۔ پیسے کے علاوہ گاڑی میں بیگ، مکھن بسکٹ، تلا ہوا مرغا، مٹھائیاں اور نہ جانے کیا کچھ رکھا گیا۔ ماں کو بڑے اخراجات دکھائی دے رہے تھے۔ ڈاکٹر نے ہر بار دیکھنے کے تین روبل لینے تھے۔ بعد میں وہ ساری زندگی ان فیسوں کا بڑے فخر کے ساتھ ذکر کرتے رہے۔ ہم بڑی بے چینی اور جذبات کے ساتھ ماں کی واپسی کے منتظر تھے۔ وہ ایک نئے لباس میں واپس آئی جو اس کے بدن پر بڑا خوبصورت لگ رہا تھا۔

جب ہم چھوٹے تھے تو ہمارا باپ ہماری ماں کی نسبت ہم پر زیادہ مہربان تھا۔ اس کا رویہ نرم ہوتا تھا۔ ماں ہم سے باتیں کرتے وقت اکثر غصے میں آجاتی تھی۔ بعض اوقات کسی وجہ کے بغیر ___ پھر وہ باہر اور گھر کا سارا غصہ باپ سے کرتی تھے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ میرے باپ کے مزاج میں ایک سختی آتی گئی۔ اس کی وجہ زندگی کی محنت اور سختیاں تھیں۔ خاص طور پر اسی کی دہائی کا زرعی بحران۔ اس کے علاوہ وہ مایوسی جو اس کے بچوں نے اسے دی تھی۔

میری ماں طویل سردیوں میں مطالعے کو ترجیح دیتی تھی۔ یہ وہ زمانہ ہوتا تھا جب

میدانوں میں برف باری سے ہر شے سفید ہو جاتی تھی۔ برف ہمارے گھر کی کھڑکیوں تک چڑھ آتی تھی۔ وہ کھانے والے کمرے میں ایک تکونی کرسی پر بیٹھ جاتی، اپنے پاؤں سامنے ایک دوسری کرسی پر رکھ لیتی اور کوئی کتاب پڑھنے لگتی۔ یا پھر شام کے وقت وہ میرے باپ کی بازوؤں والی کرسی کو کھڑکی کے پاس لے جاتی اور کسی پرانے ناول کی سطروں پر اپنی پھٹی ہوئی انگلیاں رکھ کر بلند آواز میں پڑھتی رہتی۔ کسی طویل فقرے پر وہ پریشان ہو جاتی اور گڑبڑا کر رہ جاتی۔ پھر کسی ہجے کی طرف سے اس فقرے کی نئی تشریح سے اس کے مطالعے کا لطف دوبالا ہو جاتا۔ وہ بڑی لگن اور محنت سے اپنی پڑھائی میں مشغول رہتی۔ ہمیں اس کے پڑھنے یا خود کلامی کی آواز بڑے کمرے تک آتی رہتی۔

میرا باپ بڑھاپے میں بھی ہجے کر کے میری کتابوں کے نام پڑھا کرتا۔ 1910 میں میں اس کے پیچھے برلن گیا۔ وہاں جرمن سوشل ڈیموکریسی پر میری کتاب وہ بڑی محنت سے پڑھنے میں مشغول رہا۔

اکتوبر انقلاب نے میرے باپ کو بڑا خوش حال بنا دیا۔ میری ماں 1910 میں فوت ہو گئی تھی۔ مگر میرا باپ سوویٹ حکومت دیکھنے تک زندہ رہا۔ خانہ جنگی کے دوران میں جو روس کے جنوبی علاقے میں زیادہ تیز اور سخت تھی اور جس سے ہر روز حکومت بدلتی رہتی تھی، ستر برس کا یہ بوڑھا آدمی سینکڑوں میلوں کا سفر طے کر کے اوڈیسہ میں پناہ حاصل کرنے چلا گیا۔ چونکہ وہ امیر تھا لہٰذا سرخ فوج اس کے لئے ایک عذاب تھی۔ دوسری طرف میرا باپ ہونے کے ناطے رجعتی حکومت اسے تنگ کرتی تھی۔ جب سوویٹ فوج نے جنوبی روس کو ''سفیدوں'' سے آزاد کرا لیا تو میرا باپ ماسکو چلا گیا۔ انقلاب میں اس کا سب کچھ کھو گیا تھا۔ وہ ماسکو کے قریب ایک سال تک ایک ریاستی مل چلاتا رہا۔ اس زمانے میں خوراک کا کومسار زرو پا زرعی موضوع پر میرے باپ سے باتیں کرتا رہتا تھا۔ وہ 1922 کے موسم بہار میں ٹائیفائیڈ سے اس وقت فوت ہو گیا جب میں کمیونسٹ انٹرنیشنل کی چوتھی کانگریس میں اپنی رپورٹ پڑھ رہا تھا۔

یانوفکا میں اہم بلکہ بے حد اہم جگہ ہماری روک شاپ تھی جس میں ایوان وسیلائی

وچ کام کرتا تھا۔ وہ بیس برس کی عمر میں یہاں کام کرنے آیا تھا۔ اسی سال میں پیدا ہوا تھا۔ وہ ہر چھوٹے بڑے بچے کو تم کہہ کر بلاتا تھا۔ ہم اسے عزت سے ''آپ'' کہہ کر پکارتے تھے جب اسے فوجی خدمت کے لئے بلایا گیا۔ تو میرا باپ اس کے ساتھ گیا۔ انہوں نے وہاں کسی کو رشوت دی اور وسیلائی وچ یانوفکا میں رہ گیا۔ وسیلائی وچ خوبصورت اور باہنر انسان تھا۔ اس کی گہری سرخ مونچھیں اور داڑھی فرنچ کٹ تھی۔ اس کا فنی علم بڑا مکمل تھا۔ وہ انجن دوبارہ بنا سکتا تھا، بائلر کی مرمت کرسکتا تھا، گھڑی ٹھیک کرسکتا تھا، پیانو اور فرنیچر کی مرمت کرسکتا تھا۔ اور ٹائروں کے بغیر سائیکل بنانے میں بھی مہارت رکھتا تھا۔ اسی کے بنائے ہوئے سائیکل پر میں نے اس زمانے میں سائیکل چلانی سیکھی تھی۔

جب میں پرائمری اور فرسٹ گریڈ کے درمیان میں تھا۔ وہ جرمن ہمسایوں کے ہر قسم کے زرعی آلات مرمت کر دیتا تھا۔ جب کبھی میرا باپ کوئی تھریشر یا بھاپ سے چلنے والا انجن خریدنے جاتا تو ایوان وسیلائی وچ کو ساتھ لے کر جاتا۔ لوگ میرے باپ کے پاس زرعی مشورے اور وسیلائی وچ کے پاس مشینری سے متعلق مشوروں کے لئے آتے رہتے تھے۔ اس نے ورک شاپ میں اپنے کئی مددگار اور نائب رکھے ہوئے تھے۔ میں بھی ایک طرح سے ان مددگاروں کا شاگرد تھا۔

ورک شاپ میں میں بھی کام کرتا رہتا تھا۔ مجھے کام کرنا پسند تھا کیونکہ اس کا نتیجہ میرے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ میں رنگ وروغن کے مواد کو پیٹتا رہتا، پتھروں کو گڑتا رہتا مگر جلد ہی اس کام سے اکتا جاتا اور پوچھتا رہتا کہ کام کب مکمل ہوگا۔ وسیلائی وچ اپنی انگلی سے گاڑھے مواد کو ہلاتے ہوئے اپنے سر کو جنبش دیتا اور میں اپنا کام کسی مددگار کے حوالے کر دیتا۔

ایوان وسیلائی وچ بعض اوقات کوئی اوزار ہاتھ میں پکڑ کر کام کرنے والے بنچ کے پیچھے کسی چٹائی پر بیٹھ جاتا۔ وہ سگریٹ کا کش لگاتا اور دور فضا میں دیکھنے لگتا، شاید وہ کچھ یاد کر رہا ہوتا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ کچھ سوچے بغیر آرام کر رہا ہوتا۔ ایسے موقع پر میں

اس کے قریب بیٹھ کر اس کی سرخ مونچھوں پر اپنی انگلیاں پھیرتا رہتا۔ یا پھر اس کے ہاتھوں کو دیکھتا رہتا جو ایک ہنرمند کے ہاتھ تھے جن پر پتھر کانٹے سے چھوٹے چھوٹے سیاہ دھبے پڑ چکے تھے۔ اس کی انگلیاں جڑوں جیسی مضبوط مگر سخت نہیں تھیں۔ وہ پوروں سے چوڑی مگر ملائم تھیں۔ اس کا انگوٹھا اس قدر پیچھے کی طرف چلا جاتا کہ محراب بنا دیتا۔ ہر انگلی خود شعور اور باعمل تھی۔ مگر سب مل کر ایک موثر محنت کش اتحاد بنا دیتی تھیں۔ ابھی میں بہت چھوٹا تھا مگر میرا مشاہدہ بتاتا تھا کہ یہ ہاتھ دوسرے ہاتھوں سے بالکل مختلف انداز میں ہتھوڑا یا کوئی دوسرا اوزار پکڑتا تھا۔ اس کے بائیں انگوٹھے پر ایک گہرے زخم کا نشان تھا۔ میری پیدائش والے دن اس کا یہ انگوٹھا ایک کلہاڑی کی ضرب سے تقریباً کٹ گیا تھا، یہ جلد سے لٹکنے لگا تھا۔ وسیلائی وچ اپنے انگوٹھے کو ایک بورڈ پر رکھ کر بالکل کاٹنے ہی والا تھا کہ میرے باپ نے اچانک دیکھ لیا۔ ''ٹھہرو، ٹھہرو'' وہ چیخا۔ ''یہ ٹھیک ہو جائے گا۔''

وسیلائی وچ نے کلہاڑی الگ رکھ دی۔ ''یہ ٹھیک ہو جائے گا'' وہ بڑبڑانے لگا۔ انگوٹھا واقعی ٹھیک ہو گیا اور صحیح طور پر کام کرنے لگا۔ بس اتنا ہوا کہ یہ دوسرے انگوٹھے کی طرح پیچھے کی جانب زیادہ مڑ نہیں سکتا تھا۔

ایک دفعہ ایوان وسیلائی وچ نے ایک پرانی رائفل سے شارٹ گن بنائی اور نشانہ بازی میں اپنی مہارت آزمانے کی کوشش کی۔ پھر باری باری ہر کوئی ایک فاصلے پر رکھی ہوئی موم بتی کو نشانہ بنانے میں لگا رہا۔ مگر کوئی بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ اتفاقاً میرا باپ اس طرف سے گزر رہا تھا۔ جب اس نے گن نشانے پر رکھی تو اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور خود پر اعتماد نہیں تھا۔ لیکن اس نے پہلے نشانے ہی میں موم بتی کو بجھا دیا۔ اس کی آنکھ ہر چیز کے لئے بڑی عمدہ تھی۔ ایوان وسیلائی وچ یہ بات جانتا تھا۔ میرے باپ کی کبھی اس کے ساتھ بحث یا تلخ کلامی نہیں ہوئی تھی حالانکہ وہ دوسرے کاریگروں کے کام میں نقص نکالتا رہتا تھا۔

ورک شاپ میں میرے لیے کام کی کمی نہیں تھی۔ میں ایوان وسیلائی وچ کا کسی نہ

کسی کام میں ہاتھ بٹاتا رہتا تھا۔ وہاں ہونے والی باتیں ایک سے ایک بڑھ کر دلچسپ ہوتی تھیں۔ اس وقت مالک ہونے کا تصور غائب ہو جاتا تھا۔ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ شاپ میں مالک ہونے کا تصور کبھی پایا ہی نہیں گیا تھا۔ وہاں رہ کر میرا ذہنی افق ہر لمحہ وسیع ہوتا رہتا تھا۔ فوما جس جاگیر پر کام کرتا رہا تھا وہ وہاں کی کہانیاں اور مردوں اور عورتوں کے عشق کی داستانیں سناتا رہتا۔ یہ قصے کہانیاں ان لوگوں کے لئے فخر کا باعث ہرگز نہیں تھے۔ چکی پر کام کرنے والا فلپ فوجی زندگی کے قصے شروع کر دیتا۔ ایوان وسیلائی وچ ان سے سوال پوچھتا، دوسروں کو دخل اندازی سے روکتا اور اپنی طرف سے ان میں اضافہ کرتا رہتا۔

فائر مین یاشکا تیس برس کا سرخ بالوں والا ترش مزاج نوجوان تھا جس کی عرصے تک ورک شاپ میں کوئی حیثیت نہیں بن سکی تھی۔ نہ جانے اس کے دماغ میں کیا سماتی کہ وہ بہار یا خزاں میں ایک دم غائب ہو جاتا اور چھ ماہ بعد خود ہی واپس آ جاتا۔ وہ کبھی کبھی شراب پیتا تھا۔ وہ شکار کا بے حد شوقین تھا مگر شراب کی خاطر اس نے اپنی بندوق فروخت کر دی تھی۔ فوما نے بتایا کہ کس طرح یاشکا بوبرینٹز کے ایک سٹور میں ننگے پاؤں داخل ہوا تھا۔ اس کے پاؤں کالے کیچڑ سے لت پت تھے اور اس نے ٹوپیوں کا ایک بکس مانگا تھا۔ پھر اس نے جان بوجھ کر ٹوپیوں کو فرش پر بکھیر دیا تھا اور انہیں دوبارہ اکٹھا کرنے لگا تھا۔ ایسا کرتے وقت اس کے کیچڑے سے بھرے پاؤں بعض ٹوپیوں پر آ گئے تھے۔ مگر وہ انہیں سمیٹ کر باہر نکل گیا تھا۔

''فوما جھوٹ تو نہیں بول رہا؟'' ایوان وسیلائی وچ نے پوچھا۔

''تمہیں یہ کیسے خیال آیا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے؟'' یاشکا نے پوچھا۔ ''میں نے تو ان کا ایک پیسہ بھی ادا نہیں کیا تھا۔''

کوئی چیز کا لینے یہ طریقہ مجھے پسند آیا۔ جو دہرائے جانے کے قابل تھا۔

''ہمارا اگنٹ آ گیا ہے'' خادمہ ماشکا نے ورک شاپ میں داخل ہو کر ہمیں اطلاع دی۔ ''لیکن ڈونکا چھٹیوں پر گھر چلی گئی ہے۔''

ہم فائر مین اگنٹ کو''ہمارا اگنٹ'' کہہ کر کبڑے اگنٹ سے علیحدہ کر لیتے تھے جو تار اس کے آنے سے پہلے ورک شاپ میں ایک بزرگ کی حیثیت رکھتا تھا۔''ہمارا اگنٹ'' فوج میں خدمات انجام دینے کے لئے بلا لیا گیا تھا۔ایوان وسیلائی وچ نے ایک دفعہ اس کے سینے کی پیائش کرتے ہوئے کہا تھا۔''وہ اسے فوج میں ہرگز نہیں لیں گے۔'' معائنہ بورڈ نے اگنٹ کو آزمائش کے لئے ایک ماہ ہسپتال میں رکھا۔ وہاں شہر کے چند مزدوروں سے اس کی آشنائی ہوگئی۔ان کی باتیں سن کر اس نے بھی کسی فیکٹری میں قسمت آزمائی کا فیصلہ کر لیا۔ جب وہ واپس آیا تو اس نے شہری بوٹ اور بھیڑ کی کھال کا کوٹ پہن رکھا تھا جس کے سامنے والے حصے پر رنگین کڑھائی کا کام ہوا تھا۔ وہاں سارا دن اس نے ورکشاپ میں دوسرے لوگوں کو یہ بتانے میں گزار دیا کہ شہر کیسا تھا، وہ کیا کام کرتا تھا، فیکٹری میں مشینری کیسی تھی اور اسے کتنی اجرت ملتی تھی۔

''فیکٹری آخر فیکٹری ہوتی ہے''فوما نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''فیکٹری ورکشاپ ہوتی'' فلپ نے کہا۔ وہ سب کسی سوچ میں ڈوب گئے جیسے ورک شاپ سے پرے کوئی چیز دیکھ رہے تھے۔

''شہر میں بہت مشینیں ہوتی ہیں؟''وکٹر نے اشتیاق سے پوچھا۔

''وہ تو مشینوں کا جنگل ہے''

میں پورے کان کھولے اس کی باتیں سن اور ذہن کی آنکھوں سے ایک ایسی فیکٹری دیکھ رہا تھا جس میں جنگل کے درختوں کی طرح مشینیں ہی مشینیں تھیں۔ دائیں طرف، بائیں طرف، پیچھے، ہر جگہ مشینیں۔اور ان کے درمیان اگنٹ اپنی کمر سے چمڑے کی پیٹی باندھے کھڑا تھا۔اگنٹ شہر سے ایک گھڑی لایا تھا جسے ہر کوئی ہاتھ میں پکڑ کر دیکھ رہا تھا۔شام کو اگنٹ میرے باپ کے ستھ صحن میں ٹہلتا رہا۔ ملازم ان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔میں بھی ان کے ساتھ تھا۔کبھی میں باپ اور کبھی اگنٹ کے ساتھ چلنے لگتا۔

''تم وہاں کیسے رہتے تھے؟''میرے باپ نے پوچھا۔''تم اپنا کھانا خود بناتے تھے؟ کمرہ کرائے پر لے رکھا تھا؟''

''شہر میں ہر شے کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے'' اگنٹ نے کہا۔''لیکن وہاں اجرتیں یہاں جیسی نہیں ہیں''

''یہ تو میں جانتا ہوں۔مگر ساری کمائی کھانے پر خرچ ہو جاتی ہے۔''

''ایسا بھی نہیں ہے''اگنٹ نے برجستہ جواب دیا۔''میں نے چھ ماہ میں اتنی بچت کر لی تھی کہ کپڑے اور گھڑی خرید سکوں۔ یہ رہی گھڑی میری جیب میں''اس نے جیب سے گھڑی نکال کر دکھائی۔اس کی دلیل نے باپ کو لاجواب کر دیا اور وہ خاموش ہو گیا۔تھوڑی دیر بعد باپ نے پھر پوچھا۔

''وہاں تم شراب تو نہیں پیتے رہے؟''

''میں نے تو کبھی واڈکا کو بھی ہاتھ نہیں لگایا تھا۔''

''تم ڈونکا کو ساتھ تو نہیں لے جا رہے؟''میری ماں نے پوچھا۔

اگنٹ ذرا سا مجرمانہ مسکرایا اور کوئی جواب نہ دیا۔

''اچھا میں سمجھ گئی'' میری ماں بولی۔تم نے وہاں کوئی جگہ ڈھونڈ لی ہو گی۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟ بدمعاش کہیں کا۔''

اگنٹ یانوفکا سے دوبارہ چلا گیا۔

بچوں کو ملازموں کے کمرے میں جانے کی ممانعت تھی۔مگر ہمیں کون روک سکتا تھا۔ وہاں کوئی نہ کوئی نئی بات ہوتی رہتی تھی۔ ایک عرصے تک ایک خاتون ہماری باورچی رہی۔اس کے گالوں کی ہڈیاں اونچی تھیں اور ناک سڑی ہوئی تھی۔اس کا شوہر ہمارا گڈریا تھا۔ جو ایک بوڑھا آدمی تھا اور اس کے چہرے کی ایک طرف فالج سے ماری گئی تھی۔ ہم دونوں کو ماسکو کے باشندے کہتے تھے کیونکہ وہ سرکاری کوارٹروں سے آئے تھے۔ان کی ایک آٹھ سالہ بڑی پیاری بیٹی تھی جس کے بال سنہری تھے۔وہ ماں باپ کو ہمیشہ جھگڑتے ہی دیکھتی تھی۔

اتوار کو لڑکیاں ہمارے یا اپنے بالوں سے جوئیں نکالا کرتی تھیں۔ ملازموں کے کمرے میں بھوسے کے ڈھیر پر بڑی اور چھوٹی دونوں تتایانہ پہلو بہ پہلو لیٹ جاتی

تھیں۔سٹورٹ پڑ کا بیٹا آفا نا سے جو اصطبل میں کام کرتا تھا، اور خانسا ماں پر اس کا دونوں تتایانہ کے درمیان آجاتے۔ پر اس کا تتایانہ سے ٹیک لگا کر اپنی ٹانگیں چھوٹی تتایانہ پر رکھ دیتا۔

''تم کیسے مسلمان ہو؟'' نوجوان سٹورٹ آواز لگاتا۔کیا یہ گھوڑوں کو پانی پلانے کا وقت نہیں ہے؟''

سرخ بالوں والا آفانا سے اور کالے بالوں والا موتو زوک میرے نگران تھے۔ جب میں کسی ایسے وقت آجاتا جب وہ حلوہ یا کوئی دوسری چیز کھانے کی تیاریوں میں ہوتے تو وہ ہنس کر کہتے۔'' آؤ لیوا' ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ'' یا پھر یہ کہتے۔''لیوا! تم اپنی ماں سے کیوں نہیں کہتے کہ ہمارے لئے مرغی کا گوشت بھیج دے۔'' ایسے موقع پر میں پریشان ہو جاتا اور کوئی جواب دیے بغیر باہر بھاگ جاتا۔ایسٹر کے موقع پر میری ماں ملازموں کے لئے کیک اور انڈوں کا حلوہ بنایا کرتی تھی۔ چچی ریئسہ انڈوں پر رنگ کرنے کی ماہر تھی۔ایک دفعہ جب وہ گراموکلے گئیں تو وہاں سے رنگے ہوئے انڈے لائیں۔ مجھے بھی دو ایسے انڈے دیے۔ ہم گھر کے عقب میں ڈھلوان پر سے انڈے لڑکھڑا کر دیکھتے تھے کہ کون سا انڈا مضبوط تھا ایک بار اس مقابلے میں میں آخر تک گیا۔آفانا سے اور میں رہ گئے تھے۔

''کیا یہ خوبصورت نہیں ہیں؟'' میں نے اسے رنگیں انڈے دکھاتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں واقعی خوبصورت ہیں۔'' اس نے رکھائی سے جواب دیا۔''لاؤ میں دیکھتا ہوں ان میں سے کون سا زیادہ مضبوط ہے۔''

مجھ میں اس چیلنج سے انکار کی جرأت نہیں تھی۔آفانا سے نے اڈا لڑکھرایا تو وہ اوپر سے ٹوٹ گیا۔

''چلو یہ میرا ہوا'' اس نے کہا۔''اب دوسرا انڈا لڑکھراتے ہیں۔'' میں نے بڑی فرمابرداری سے اسے دوسرا رنگیں انڈا بھی دے دیا۔

آفاناسے نے اسے بھی لڑکھڑا دیا۔ وہ بھی ٹوٹ گیا۔

''یہ بھی میرا ہوا۔''

آفاناسے دونوں انڈے اٹھائے اور میری طرف دیکھے بغیر انہیں لے کر چلتا بنا۔ میں حیرت سے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ میرا جی رونے کو چاہ رہا تھا۔

بہت تھوڑے مزدور ایسے جو ہمارے کھیتوں پر مستقل طور پر سارا سال کام کرتے تھے۔ زیادہ عارضی تھے اور ان کی تعداد سینکڑوں میں تھی۔ یہ لوگ کیف، چرنیگوف اور پولٹوفا سے آتے تھے اور یکم اکتوبر تک کام کرتے تھے۔ جس سال فصل اچھی ہوتی تھی تو صرف خرسان کے صوبے میں ایسے تین لاکھ مزدوروں کی ضرورت ہوئی تھی۔ انہیں گرمیوں کے چار ماہ کے پچاس روبل ملتے تھے۔ کھانا اور رہائش اس کے علاوہ ہوتی تھی۔ عورتوں کو بیس سے تیس ملتے تھے اچھے موسم میں کھلے کھیت ان کے گھر ہوتے تھے۔ خراب موسم میں وہ گھاس کے گٹھوں کے نیچے سو جاتے تھے۔ انہیں کھانے میں سبزیاں اور دلیہ ملتا تھا۔ گوشت ان کی قسمت میں نہیں تھا۔ یہ خوراک بعض اوقات شکایت کا سبب بن جاتی تھی۔ وہ کھیتوں سے آکر صحن میں جمع ہو جاتے اور منہ کے بل کھلیانوں میں زمین پر لیٹ جاتے، اپنی درانتیاں ہوا میں لہراتے، اپنے پھٹے ہوئے پاؤں بار بار اوپر اٹھاتے اور منتظر رہتے کہ ان کے لئے کیا کیا جائے گا۔ میرا باپ انہیں تو بوز' خشک مچھلی اور اس قسم کی دوسری اشیاء دے دیتا جنہیں لے کر وہ گاتے ہوئے دوبارہ کھیتوں میں واپس چلے جاتے۔ تمام فارموں پر کھیت مزدوروں کے یہی حالات تھے۔ ایسے بوڑھے لوگ بھی تھے جو دس برس سے متواتر آرہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ انہیں کام مل جائے گا۔ انہیں دوسروں سے چند روبل زیادہ اور کبھی کبھی واڈکا کا ایک گلاس مل جاتا تھا۔ وہ دوسروں کے لئے محنت کا معیار مقرر کرتے تھے۔ ان میں سے بعض کے کنبے بہت بڑے تھے بعض لوگ دوسرے صوبوں سے پیدل چل کر آتے تھے۔ راستے میں جو ملتا کھا لیتے اور جہاں جگہ ملتی سو جاتے۔ ایک موسم گرم میں تمام مزدوروں اندھراتے کے

متعدی مرض میں مبتلا ہو گئے ۔ وہ شام کی شفق میں ہاتھ آ گے کی طرف کر کے چلتے ۔ میری ماں کے بھتیجے نے جوان دنوں ہمارے پاس آیا ہوا تھا، ان کے بارے میں اخبار میں مضمون لکھا۔ اس پر ایک انسپکٹر یا نو فکا بھیجا گیا۔ مضمون لکھنے پر میرا باپ اور ماں اپنے مہمان سے بے حد ناراض ہوئے ۔ مضمون نگار کو خود بھی افسوس ہو رہا تھا۔ بہر حال کوئی زیادہ بدمزگی پیدا نہ ہوئی ۔ انسپکٹر کا خیال تھا کہ اندھیراتا کی بیماری غذا میں لحمیات اور چربی کی کمی کے باعث تھی ۔ یہ بیماری صوبے میں عام تھی کیونکہ تمام مزدوروں کو ایک جیسی غذا ملتی تھی ۔ بلکہ بعض صورتوں میں ہماری غذا سے بھی زیادہ خراب ۔

میں اپنے گھر کے اندر جیسی زندگی گزار رہا تھا اس سے بے حد مختلف زندگی ورک شاپ' کچن اور گھر سے باہر پھیلی ہوئی تھی ۔ زندگی کی فلم کا کوئی اختتام نہیں ۔ میرا تو ابھی آغاز ہی ہوا تھا۔ جب میں چھوٹا تھا تو کوئی بھی مجھ پر توجہ نہیں دیتا تھا۔ وسیلائی وچ اور سٹورٹ کی عدم موجودگی میں مزدوروں کی زبانیں کھل جاتی تھیں ۔ باورچی خانے اور ورکشاپ کی بھٹی کی آگ کی روشنی میں مجھے اپنی ماں باپ، رشتے دار اور ہمسائے بالکل مختلف دکھائی دیتے تھے۔ چھوٹی عمر میں میں اپنے بڑوں کی جو باتیں سنا کرتا تھا ان میں سے بہت سی جب تک میں زندہ رہوں گا' مجھے یاد رہیں گی ۔ ان میں سے بہت سی باتوں نے میرے اس رویے کو تراشنے میں مدد کی جو آج میرا معاشرے کی طرف ہے ۔

ہمارے ہمسائے اور میرا ابتدائی سکول

یانو فکا سے کوئی ایک میل کے فاصلے پر ڈیمبوفسکی کی جاگیر تھی ۔ زمین پٹے پر لینے کے علاوہ میرے باپ کے ان کے ساتھ کئی دوسرے کاروباری تعلقات تھے ۔ اس جاگیر کی مالک تھیوڈوسیہ اینٹونو ونا ایک معمر پولش خاتون تھی جو کبھی گورنس رہی تھی ۔ اپنے امیر خاوند کی وفات کے بعد اس نے اپنی جاگیر کے منیجر کاسیمر انٹونو وشا سے شادی کر لی تھی جو اس سے بیس برس چھوٹا تھا۔ تھیوڈوسیہ اپنے دوسرے شوہر کے ساتھ زیادہ عرصہ

تک بناہ نہ کر سکی، اگرچہ بعد میں بھی وہ اس کی جاگیر کے معاملات کی دیکھ بھال کرتا رہا۔ کاسیمرانٹونووچ ایک دراز قامت، داڑھی والا' باتونی اور خوش مزاج پولش آدمی تھا۔ وہ اکثر ہمارے ہاں چائے پینے آتا اور ایک ہی کہانی کو بلند آواز میں دہراتا چلا جاتا۔ اس دوران میں وہ انگلیوں کے اشاروں سے لفظوں پر زور دیتا رہتا۔

کاسیمرانٹونووچ نے گھوڑوں کے اصطبل اور گایوں کے باڑے سے دور شہد کی مکھیاں پال رکھی تھی کیونکہ شہد کی مکھیاں گوبر کی بدبو برداشت نہیں کر سکتیں۔ شہد کی مکھیاں اردگرد کے پھولوں سے شہد بناتی رہتیں۔ یہ شہد بڑی بہتات میں تھا۔ کاسیمرانٹونووچ گاہے گاہے شہد کا چھتا دو پلیٹوں کے درمیان رکھ کر ہمارے لیے لاتا تھا۔ یہ بڑا اشفاف اور سنہری شہد ہوتا تھا۔

کبوتر پالنے کے شوق کے تحت ایک دن ایوان وسیلائی وچ اور میں کتوبر لینے کا سمیرانٹونووچ کے پاس گئے۔ اس نے اپنے بڑے سے خالی مکان کے ایک کمرے کے کونے میں چائے مکھن' شہد اور دہی سے ہماری تواضع کی۔ مگر اس کی پلیٹوں سے سلین کی بو آتی تھی۔ میں چائے پیتا رہا اور ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سنتا رہا۔

''ہمیں دیر تو نہیں ہو جائے گی؟'' میں نے وسیلائی وچ کے کان میں سرگوشی کی۔

''نہیں' تھوڑا انتظار کرو۔ کبوتروں کو ڈربوں میں آلینے دو۔ دیکھ رہے ہو ابھی وہ باہر بیٹھے ہیں۔''

مجھے اکتاہٹ ہونے لگی۔ آخر ہم لالٹین پکڑ کر اوپر کبوتروں کے ڈربوں میں گئے۔

''ذرا احتیاط سے۔'' کاسیمرانٹونووچ بلند آواز میں بولا۔ کبوتر گاہ طویل اور اندھیری تھی جس کے چاروں طرف اونچے اونچے تختے تھے۔ اندر چوہوں، مکھیوں مکڑیوں اور پرندوں کی ہر قسم کی بدبو پھیلی ہوئی تھی، کسی طرح لالٹین بجھ گئی۔ ''وہ رہے انہیں پکڑلو' کاسیمرانٹونووچ نے سرگوشی کی۔ کبوتر خانہ کے اندر کبوتروں کے اڑنے کی آوازں سے ایک افراتفری پھیل گئی۔ لمحہ بھر کے لئے مجھے یوں لگا جیسے یہ دنیا کا خاتمہ تھا۔ ہم سے ختم ہو رہے تھے۔ آہستہ آہستہ میں ہوش میں آیا اور مجھے ایک آواز سنائی دی۔ ''یہ ایک اور

ہے یہ رہا، یہ رہا، اس طرف' اسے بھی بوری میں ڈال لو۔'' ایوان وسیلائی وچ اپنے ساتھ بوری لایا تھا۔ واپسی پر سارا راستہ کبوتر خانے کی بھیانک آوازیں میرا تعاقب کرتی رہیں۔ ہم نے ورک شاپ کے اوپر کبوتر خانہ بنایا۔ میں دن میں دس مرتبہ اوپر جاتا اور کبوتروں کے لئے پانی' دانہ اور ایسی ہی دوسری چیزیں لے جاتا رہتا۔ ایک ہفتے بعد مجھے ایک گھونسلے میں دو انڈے ملے۔ ابھی ہم یہ خوشی پوری طرح منا نہ پائے تھے کہ کبوتروں نے ایک ایک کر کے اپنے پرانے گھر واپس جانا شروع کر دیا۔ صرف تین جوڑے جن کے پر کٹے ہوئے تھے ہمارے پاس رہ گئے۔ وہ بھی پر آنے پر واپس چلے گئے۔ ہم نے ان کے لے جو گھر بنایا تھا، ویرون ہو گیا۔ یوں کبوتر پالنے کی ہماری مہم اختتام پذیر ہوئی۔

میرے باپ نے الزورٹ گراڈ کے نزدیک مسز_ٹی سے کچھ زمین پٹے پر لی۔ مسز۔ٹی مضبوط کردار کی ایک چالیس سالہ بیوہ تھی۔ ایک بڑا پادری ہر وقت اس کے پاس رہتا تھا۔ وہ تاش' موسیقی اور کئی دوسری چیزوں کا شوقین تھا۔ مسز ٹی ایک دفعہ پادری کے ہمراہی میں زمین پٹے پر دینے کی شرائط طے کرنے ہمارے گھر آئی۔ ہم نے دو کمرے ان کے لئے مخصوص کر دیے اور انہیں کھانے میں تلا ہوا چکن' چیری کی وائین' اور چیری کا حلوہ دیا۔ کھانے کے بعد میں کمرے ہی میں رہا اور دیکھا کہ پادری مسکرا کر مسز ٹی کے کان میں سرگوشی کر رہا تھا۔ پھر اس نے اپنے کوٹ کی جیب سے مونوگرام والا سگریٹ کیس نکالا اور سگریٹ سلگا کر مرغولے بنانے لگا۔ جب اس کی مسٹرس کمرے سے باہر گئی ہوئی تھی۔ تو اس نے ہمیں بتایا کہ وہ ناول میں سے فقط مقالمے پڑھتی تھی۔ ہم سب نرمی سے ہنس پڑے اور کسی قسم کا کوئی جملہ کہنے سے گریز کیا کہ مبادا وہ اپنی طرف سے مرچ مسالہ لگا کر مسز۔ٹی کو کچھ نہ بتا سکے۔

میرے باپ کا سمیرا نٹونووچ سے شراکت کر کے مسز۔ٹی سے زمین لیز پر لی تھی۔ یہ وہ وقت تک جب موخرالذکر کی بیوی فوت ہو چکی تھی اور اس کی زندگی میں اچانک تبدیلی آ گئی تھی۔ اس کی داڑھی سے سفید بال غائب ہو گئے تھے۔ وہ اکڑے کالر والی

قمیض پہننے لگا تھا اور ٹائی لگا تا تھا۔ ایک خاتون کی تصویر اس کی جیب میں رہتی تھی۔ اگر چہ دوسروں کی طرح وہ بھی میرے چچا گریگر کا مذاق اڑاتا تھا مگر اپنیدل کی ہر بات اسی سے کرتا تھا۔ اس نے تصویر نکال کر چچا کو دکھائی۔

''ذرا اسے دیکھو۔'' اس نے مدہوشی کی کیفیت میں چچا گریگری سے کہا۔ ''میں نے اس خوبصورت خاتون سے کہا۔ خاتون! تمہارے لب چومنے کے لئے بنے ہیں۔'' کاسیرانٹونووچ نے بعد میں اس حسین عورت سے شادی کر لی۔ لیکن شادی کے ڈیڑھ سال بعد ہی وہ فوت ہوگیا۔ ٹی کی جاگیر کے صحن میں ایک بیل نے اسے اپنے سینگوں پر اٹھا کر موت کی وادی میں پہنچا دیا تھا۔

ہماری جاگیر سے کوئی آٹھ میل دور ایف بھائیوں کی ہزاروں ایکٹر پر مشتمل جاگیر تھی۔ ان کا گھر محل جیسا تھا اور عمدہ فرنیچر سے آراستہ تھا۔ اس میں متعدد مہمان خانے' بیڈروم اور کئی دوسری چیزیں تھیں۔ لیو اور ایوان' دونوں ایف بھائیوں نے یہ ساری جائیداد اپنے ٹوموتھی سے ورثے میں پائی تھی۔ جائیداد کا انتظار ایک سٹورٹ کے ہاتھ میں تھا۔ حساب کتاب ٹھیک رکھنے کے باوجود کتابیں خسارہ ظاہر کر رہی تھیں۔

''مٹی کے گھر میں رہنے کے باوجود ڈیوڈ لیوٹی وچ ہم سے زیادہ امیر ہے۔'' بڑے بھائی کا اشارہ میرے باپ کی طرف تھا۔ جب ہم نے باپ کو یہ بتایا تو ظاہر ہے وہ بڑا خوش ہوا۔ چھوٹا بھائی ایوان ایک مرتبہ اپنے دو شکاری آدمیوں کے ساتھ یانوفکا میں سے گزرا۔ ان کی بندوقیں ان کی پشت پر لٹک رہی تھیں۔ اور شکاری کتے ان کے پیچھے چل رہے تھے۔ یانوفکا میں یہ منظر پہلی بار دیکھا گیا تھا۔

''اگر ان کا یہی چلن رہا تو جلد ہی روپے پیسے سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔'' میرے باپ نے ناپسندیدگی کے لہجے میں کہا۔

خرسان صوبے کے ایسے کنبوں کی تقدیروں پر مہر لگنے والی تھی۔ تمام ایک ہی سمت میں بڑی تیزی سے جا رہے تھے۔ یعنی زوال کی طرف۔ ان میں تھوڑا بہت فرق کے باوجود ایسا ہو رہا تھا۔ بعض موروثی طور پر اشرافیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ بعض سرکاری

ملازم تھے جنہیں سرکاری خدمات کے عوض زمینیں ملی تھیں۔ بعض پولش تھے۔ بعض جرمن اور بعض یہودی جو 1881 سے پہلے زمینیں خریدنے کے قابل تھے۔ ان غیر آباد میدانوں کو آباد کرنے والے خاندان کئی لحاظ سے امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ کامیاب لوگ تھے مگر فطرتاً ڈاکو تھے۔

میں ان میں سے کسی کو نہیں جانتا تھا، کیونکہ وہ سب کے سب اسی کے عشرے کے ابتدائی برسوں میں فوت ہو گئے تھے۔ بہت سوں نے پھوٹی کوڑی سے زندگی شروع کی تھی مگر اپنی مکاری اور مجرمانہ ذہنیت کے باعث بڑی جائیداد بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ ان لوگوں کی دوسری نسل اشرافیہ بن گئی۔ وہ فرانسیسی بولتے تھے' ان کے گھروں میں بلیرڈ روم تھے اور تمام بری عادتیں ان کے حق میں جاتی تھیں۔ عالمی مسابقت کے نتیجے میں پیدا ہونے والے اسی کے عشرے کے زرعی بحران نے ان لوگوں کے بے رحمانہ طور پر متاثر کیا۔ وہ خزاں کے زرد پتوں کی طرح گر پڑے۔ ان کی تیسری نسل نے نیم گلے سڑے' بیکار' غیر متوازن اور ناپختہ لوگ پیدا کئے۔

اشرافیہ کی تباہی و بربادی کی بہتریں مثال گرٹو پونوف خاندان تھا۔ ایک بڑا گاؤں ان کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ ایک بہت بڑا علاقہ ان کی جاگیر تھا۔ اب اس خاندان کے وارثوں کے پاس فقط ایک ہزار ایکڑ رہ گئے تھے اور انہیں بھی وہ بار بار رہن رکھ رہے تھے۔ میرے باپ نے بھی ان سے زمین لے رکھی تھی۔ مگر لیز کی رقم بینک میں جمع کرائی جاتی تھی۔ موجودہ گرٹو پونوف کسانوں کی درخواستیں اور شکائتیں لکھ کر گذر بسر کر رہا تھا۔ جب وہ ہم سے ملنے آیا تو اس نے اپنی آستینوں میں تمباکو اور چینی کی ڈلیاں چھپا لیں۔ اس کی بیوی نے بھی یہی حرکت کی۔ ٹپکتی رالوں کے ساتھ وہ اپنی جوانی کی کہانیاں سناتی رہی اور بتاتی رہی کہ اس کے پاس کتنے ملازم تھے' عطر کی کتنی شیشیاں تھیں۔ کتنے ریشمی جوڑے اور کتنے پیانو تھے۔ ان کے دو بیٹے تقریباً ان پڑھ تھے۔ چھوٹا بیٹا وکٹر ہماری ورکشاپ میں کام سیکھتا تھا۔

یانوفکا سے کوئی چھ میل دور ایک یہودی جاگیردار کنبہ رہتا تھا۔ ان کا نام ایم __

سکائی تھا۔ یہ کنبہ عجیب وغریب پاگلوں کا مجموعہ تھا۔ کنبے کا سربراہ موسی خیر یٹونو وچ کی عمر کوئی ساٹھ برس تھی۔ اس کا طرہ امتیاز یہ تھا کہ اس نے اشرافیہ کی کسی یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ فرانسیسی بڑی روانی سے بولتا تھا۔ پیانو بجالیتا تھا اور ادب کے بارے میں خاصی معلومات رکھتا تھا۔ اس کا بایاں ہاتھ کمزور مگر دایاں ٹھیک تھا۔ اس کے باوجود موسیقی کی کسی تقریب میں پیانو صحیح طور پر بجالیتا تھا۔ لیکن جس تیزی سے وہ دھنیں تبدیل کرتا اس میں گڑبڑ کر جاتا تھا۔ اس کی گفتگو میں بھی خاصی گڑبڑ تھی۔ وہ پیانو بجاتا ہوا ایک دم اٹھ جاتا اور آئینے کے سامنے جا کر کھڑا ہو جاتا۔ اگر کوئی قریب نہ ہوتا تو وہ سگریٹ سے اپنی داڑھی کے کنارے جلانا شروع کر دیتا۔ یعنی وہ اسے صحیح حالت میں رکھنا چاہتا تھا۔ وہ بے تحاشا سگریٹ پیتا تھا اور سگریٹ پینے کے دوران میں آہیں بھرتا جاتا تھا جیسے سگریٹ نوشی اسے سخت ناپسند تھی۔ اس نے پندرہ برس سے اپنی بوڑھی فربہ بیوی سے بات نہیں کی تھی۔

اس کا بیٹا ڈیوڈ پینتیس برس کا تھا۔ وہ اپنے چہرے کی ایک طرف ہمیشہ سفید پٹی باندھے رکھتا تھا جس کے اوپر اس کی سرخ آنکھ پھڑکتی رہتی تھی۔ ڈیوڈ ایک ناکام خودکشی کا کیس تھا۔ جب وہ فوج میں تھا۔ تو اس نے ڈیوٹی پر موجود ایک افسر کی بے عزتی کی تھی۔ افسر نے اس کی مرمت کر دی۔ ڈیوڈ نے ردعمل کے طور پر اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا اور وہاں سے بھاگ کر اپنی بیرک میں آ گیا جہاں اس نے رائفل سے خودکشی کرنے کی کوشش کی۔ گولی اس کے گال میں سے گزر گئی۔ اس سبب اب وہ سفید پٹی باندھے رکھتا تھا۔ اسے کورٹ مارشل کی دھمکی دی گئی۔ مگر ایم ۔ سکائی گھر کا سربراہ ابھی بھی زندہ تھا۔ اس نے پورے علاقے میں شور مچا کر اپنے پوتے کو غیر ذمہ دار قرار دلوا لیا۔ یہ بات سچائی سے دور بھی نہیں تھی۔ اس کے بعد ڈیوڈ پھٹے ہوئے گال اور پاگل کے لقب سے زیدہ رہا۔

جب ایم ۔ سکائی فیملی کے لوگوں سے میری پہلی ملاقات ہوئی تو وہ تنزل کی طرف جا رہے تھے۔ میرے ابتدائی برسوں میں موسی خیر یٹونو وچ ایک ایسی گاڑی میں بیٹھ کر

آیا کرتا تھا جسے بہترین گھوڑے چلا رہے ہوتے تھے۔ چار یا پانچ سال کی عمر میں میں اپنے بڑے بھائی کے ساتھ ان کے گھر گیا تھا۔ان کے گھر کے ساتھ ایک بہترین باغ تھا جس میں مور گھوم رہے تھے۔ سروں پر تاج والے یہ خوبصورت پرندے میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھے تھے۔ بعد کے زمانے میں مور غائب ہو گئے اور ان کے ساتھ اور بہت کچھ بھی جاتا رہا۔ باغ کی باڑھ تباہ ہوگئی۔مویشیوں نے پھل نے دار درخت اور پھول برباد کردیے۔موسی خبریٹونوو چ اب بھی یانوفکا آتا رہتا ہے مگر ایک شکستہ گاڑی میں جسے عام گھوڑے کھینچ رہے ہوتے ہیں۔ بیٹوں نے بطور کسان جائیداد سنبھال لنے کی کوشش کی مگر وہ شریف انسانوں جیسا مظاہرہ نہ کرسکے۔

''یہ کامیاب نہیں ہوں گے'' میرے باپ نے کہا۔ڈیوڈ کوالزورٹ گراڈ کے میلے میں ''بوڑھے ٹٹو'' خریدنے کے لئے بھیجا گیا۔ وہ میلے میں ایک رسالدار کی آنکھ سے گھوڑوں کو دیکھتا رہا اور انجام کار ایک خچر جیسا گھوڑا خرید لایا۔ وہ دیر سے واپس آیا۔ گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔جنہوں نے گرمیوں کا ہلکا سا لباس پہن رکھا تھا۔ چچا ابرام اندھیرے میں لیمپ لے کر پورچ میں گھوڑے کو دیکھنے گیا۔اس کے پیچھے خواتین' طلباء اور نوجوانوں کا ایک ہجوم تھا۔ڈیوڈ کو اچانک احساس ہوا کہ وہ اپنے بہترین عناصر میں تھا۔ وہ ہر گھوڑے کی خوبی گنوانے لگا۔ خاص طور پر وہ گھوڑا جو اس خیال میں ایک خاتون سے ملتا جلتا تھا۔ ابرام نے اپنی داڑھی کھجاتے ہوئے کہا۔'' تمام گھوڑے خوبصورت ہیں۔'' ایک پکنک کا سماں بن گیا تھا۔ڈیوڈ نے ایک خوبصورت نوجوان خاتون کی جوتی بیئر سے بھر کر اسے ہونٹوں سے لگالیا۔

''تم اسے پیو گے نہیں۔''نوجوان خاتون کسی خطرے یا خوشی کے تحت چلائی۔

''اگر میں خود کو گولی مار سکتا ہوں تو یہ کیا چیز ہے'' ہمارے ہیرو نے جواب دیا اور جوتی کا مواد اپنے حلق میں انڈیل لیا۔

''خود کو گولی مانے کی شیخی ہر وقت نہ بگھارا کرو'' اس کی ماں جو عموماً خاموش رہتی تھی ایک دم غصے میں آ گئی۔ وہ ایک بھاری بھرکم خاتون تھی جس پر گھر کا سارا بوجھ آ پڑا

تھا۔

''کیا یہ سردیوں کی گندم ہے؟'' ایک دفعہ ابرام ایم ۔سکائی نے یہ ظاہر کرنے کی خاطر کہ وہ کس قدر ہوشیار اور باریک بین ہے۔' میرے باپ سے پوچھا۔

''موسم بہار کی گندم یقیناً نہیں ہے'' میرے باپ نے جواب دیا۔

''کیا یہ نکوپول گندم ہے؟''

''میں نے کہا نا کہ موسم کی گندم ہے''

''میں جانتا ہوں کہ موسم سرما کی گندم ہے مگر اس کی قسم کیا ہے؟ نکوپول یا گرگا؟''

''میں نے سردیوں میں نکوپول گندم کا نام کبھی نہیں سنا۔ ممکن ہے کسی کے پاس یہ ہو۔ مگر میرے پاس نہیں ہے۔ میرے پاس سندومیر گندم ہے۔'' میرے باپ نے جواب دیا۔

بیٹے کی کوشش کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ ایک سال بعد میرے باپ نے ان سے دوبارہ زمین پٹے پر حاصل کر لی۔

جرمن آباد کاروں کا ایک گروہ تھا۔ ان میں بعض واقعی امیر لوگ تھے۔ وہ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ مضبوط تھے۔ ان کے گھریلو قوائد بھی سخت تھے۔ وہ شاید ہی لڑکوں کو تعلیم کے لئے قصبوں میں بھیجتے تھے۔ ان کی لڑکیاں کھیتوں میں کام کرتی تھیں۔ ان کے مکان اینٹوں اور چھتیں لوہے کی بنی ہوئی تھیں۔ جن پر سبز اور سرخ رنگ کیا گیا تھا۔

ان کے گھوڑوں کی تربیت اچھے طریقے سے کی گئی تھی۔ ان کی گاڑیوں کے نام ''جرمن ویگن'' تھے۔ ہمارے نزدیک ترین جرمن ہمسایہ ایوان ایوانووچ ڈورن تھا۔ وہ فربہ مگر چست آدمی تھا جو چھوٹی ایڑی کے جوتے پہنتا تھا۔ اس کے بال سفید اور چہرہ دھوپ سے سنولایا ہوا تھا۔ وہ ہمیشہ ایک اچھی گاڑی میں سفر کرتا تھا۔ جس کے آگے سیاہ رنگت کے عمدہ نسل کے گھوڑے جتے ہوتے تھے۔ ان گھوڑوں کے سموں کی آواز سے زمین گونج اٹھتی تھی۔ اس قسم کے بہت سے ڈورن تھے۔

ان سب کا سردار فالزل فین تھا جو بھیڑوں کا بادشاہ اور وسیع میدانوں کا شہنشاہ کہلاتا تھا۔

میدانوں سے گزرتے وقت بھیڑوں کا ایک بہت بڑا باڑہ دکھائی دیتا تھا۔'' یہ کس کا ہوسکتا ہے؟'' اپنے آپ سے کوئی پوچھتا ہے۔'' یہ فالزفین کا ہے۔'' سڑک پر گھاس سے بھری ایک گاڑی نظر آتی ہے۔'' یہ کس کی گاڑی ہے؟'' فالزفین کی۔ایک چھکڑے میں اون کا پہاڑ دکھائی دیتا ہے۔'' یہ کس کا ہے؟'' فالزفین کے مینجر کا ہے۔ ایک دم اونٹوں کی قطار نظر آجاتی ہے۔ فالزفین کے سوان کا کوئی مالک نہیں ہوسکتا۔ فالزفین نے گھوڑے امریکہ اور بیل سوئٹزرلینڈ سے درآمد کیے تھے۔

اس خاندان کا بانی جوان دنوں فین کے بغیر صرف فالز کے نام سے بلایا جاتا تھا، کسی زمانے میں ڈیوک آف اوڈن برگ کا گڈریا ہوتا تھا۔ اوڈن برگ کو حکومت کی طرف سے مرینونسل کی بھیڑوں کی افزائش کے لئے بھاری رقم ملی تھی۔ ڈیوک نے لاکھوں روبل قرضہ چڑھا لیا مگر کچھ نہ کیا۔ فالز نے جائیداد خرید کر ایک ڈیوک کی طرح نہیں بلکہ ایک گڈریے کی طرح اس کا نظم ونسق چلایا۔ بھیڑوں کی تعداد بڑھنے کے ساتھ اس کے مرغزاروں اور کاروبار میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس کی بیٹی نے فین نامی بھیڑیں پالنے والے ایک شخص سے شادی کرلی اور اس طرح دو چرواہے خاندان متحدہ ہوگئے۔ پھر فالزفین نام گونجے لگا جیسے دس ہزار بھیڑوں کے پیروں سے زمین گونج اٹھتی ہے۔ گرمیوں کی حدت اور سردیوں کے سخت پالے میں یہی نام لامحدود میدانوں میں گونجتا رہتا تھا۔

میری زندگی کے پہلے پانچ سال میرا زادراہ ہیں۔ میں تجربہ حاصل کررہا ہوں۔ زندگی نئی نئی ایجادات سے بھری ہوئی ہے۔ زندگی عالمی سطح پر ہو یا اس چھوٹے سے گم نام گاؤں میں، ایک ہی سطح پر محنت سے متحرک ہے۔ واقعات ایک کے بعد ایک مجھ پر اپنا بوجھ ڈالے جارہے ہیں۔

ایک کھیت مزدور لڑکی کو سانپ کاٹ جاتا ہے۔ وہ بری طرح رورہی ہے۔ وہ اس

کی سوجی ہوئی ٹانگ کو گھٹنے کے اوپر سے باندھ کر پھٹے ہوئے دودھ میں ڈبو دیتے ہیں۔ لڑکی کو بوبرینٹز کے ہسپتال میں لے جایا جاتا ہے۔ وہ واپس آکر دوبارہ کام شروع کر دیتی ہے۔ اس کی مارگزیدہ ٹانگ پر ایک پھٹا ہوا موزہ چڑھا ہوا ہے۔ اب کھیت مزدوروں نے اسے ''خاتون'' کہنا شروع کر دیا ہے۔

ریچھ نما سور اس آدمی کو شانوں، ماتھے اور بازوؤں پر کاٹ لیتا ہے جو اسے چرا رہا ہوتا ہے۔ یہ ایک نیا ریچھ نما سور تھا جو سوروں کی نسل کو بہتر بنانے کے لئے لایا گیا تھا۔ آدمی کے چہرے پر موت کی زردی تھی اور وہ سسکیاں بھر رہا تھا۔ اسے بھی ہسپتال لے جاتا گیا۔

دو مزدور بھوسے سے بھری گاڑی پر کھڑے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں بھوسے کو بکھیرنے اور جمع کرنے والے لمبے لمبے کانٹے ہیں۔ ایک مزدور دوسرے کی طرف کانٹا پھینکتا ہے جو اس کی پسلی میں اتر جاتا ہے۔ وہ گاڑی سے گر پڑتا ہے۔

یہ سب ایک موسم گرم میں ہوا۔ کوئی بھی موسم گرم ایسے واقعات کے بغیر نہیں گذرتا تھا۔

خزاں کی ایک رات چکی کا پورا جنوبی ڈھانچہ جوہڑ میں گر پڑا۔ یہ ڈھانچہ پہلے ہی فرسودہ ہو چکا تھا۔ طوفان نے اسے ریزہ ریزہ کر دیا۔ چکی کا انجن، آٹا پیسنے والے بڑے پتھر بربادی کے اس منظر میں ننگے کھڑے تھے۔ ڈھانچے کے نیچے سے بڑے بڑے چوہے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔

گلہریوں کا شکار کرنے کے لئے میں چوری چھپے پانی والی ٹینکی کی گاڑی کے پیچھے پیچھے کھیتوں میں بھاگ جاتا۔ پھر میں ان کے بلوں میں پانی ڈالتا اور ڈنڈا ہاتھ میں لیے ان کے باہر نکلنے کا منتظر رہتا۔ کوئی بوڑھی گلہری دیر تک مزاحمت کرتی، وہ بل کے منہ پر آتی اور پھر واپس چلی جاتی۔ پانی کی دوسری بالٹی اس کی قوت مزاحمت ختم کر دیتی اور وہ اپنی موت کا سامنا کرنے کو تیار ہو جاتی۔ ہم اس کی دم کاٹ کر دھاگے سے باندھ دیتے۔ کاونٹی انتظامیہ اس کا ایک کوپک دیتی تھی۔ چالاک لوگ گلہری کی جلد سے کئی

ڈ میں بنا لیتے تھے۔اسی لیے کاؤنٹی انتظامیہ نے اب گلہری کے پنجے مانگنے شروع کر دیے تھے۔ میں بھیگا ہوا گندی حالت میں گھر واپس آتا۔ گھر پر میری ایسی مہمات کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ ماں باپ میرے گھر پر رہنے کو ترجیح دیتے تھے۔

ایک دن میری ماں اور میں چھکڑے پر بیٹھے بو برنیٹز سے واپس آ رہے تھے۔ وہی نزدیک ترین قصبہ تھا۔ برف باری اور ہچکولوں سے میں اونگھ رہا تھا۔ ایک موڑ پر چھکڑا الٹ گیا اور میں اندھے منہ گر پڑا اور برف میں دھنس گیا۔ میں ماں کی چیخ تو سن سکتا تھا مگر جواب دینے کے قابل نہیں تھا۔ نوجوان گاڑی بان نے مجھے کھینچ کر باہر نکالا۔ ہمارا سفر دوبارہ شروع ہو گیا۔ مگر سردی کی ایک لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں اوپر نیچے دوڑ رہی تھی۔ میں نے ماں کو بتایا۔ ''سردی کی لہر؟'' نوجوان گاڑی بان بولا۔ وہ سفید دانت نکال کر ہنس رہا تھا۔ ''ہاں'' میں نے جواب دیا۔ اس نے قہقہہ لگایا۔ ''کوئی بات نہیں''۔ اس نے کہا ''ہم جلد ہی گھر پہنچ جائیں گے۔'' پھر اس نے گھوڑے کو چابک مار کر جلدی چلنے کا اشارہ کیا۔ دوسری رات وہ گاڑی بان گھوڑا لے کر فرار ہو گیا۔ میرے بڑے بھائی نے گھوڑے پر زین ڈالی اور اس وعدے کے ساتھ گھر سے نکل پڑا کہ چور کو عبرت ناک سزا دے گا۔

''بہتر ہوگا کہ پہلے تم اسے پکڑ کر لاؤ'' میرے باپ نے قدرے غم سے کہا۔ دو دن بعد میرا بھائی واپس آ گیا۔ اس نے چور نہ پکڑے جانے کا سارا الزام دھند پر لگا دیا۔

مجھے بخار چڑھ گیا۔ میرے بازو، ٹانگیں اور سر دکھ رہے تھے۔ جیسے وہ سوجھ گئے ہوں۔ پھر مجھے سارا بدن سوجھا ہوا محسوس ہونے لگا۔ حلق بھی دکھنے لگا۔ میری ماں مجھے دیکھنے آئی۔ میرا باپ بھی آیا۔ انہوں نے تشویش بھری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور گلے پر مالش کی تجویز کی۔ ''میرا خیال ہے لیوا کو سانس کی بیماری ہو گئی ہے۔'' باپ نے کہا۔

''اگر گلے کی بیماری ہوتی تو یہ اب تک سٹریچر پر پڑا ہوتا۔'' ایوان وسیلائی وچ

نے جواب دیا۔

سٹریچر پر لیٹنے سے میں یہ مطلب لیتا تھا کہ آدمی مرجاتا ہے۔ میری چھوٹی بہن روز وچہ کے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ میرے متعلق باتیں کررہے تھے۔ میں خاموشی سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ آخر فیصلہ ہوا کہ مجھے بوبرینٹز لے جایا جائے۔ میری ماں پرانے خیالات کی نہیں تھی مگر وہ (مقدس دن) کو سفر کرنا پسند نہیں کرتی تھی۔ ایوان وسیلائی وچ میرے ساتھ گیا۔ ہم اپنی سابقہ ملازمہ چھوٹی تتیانہ کے گھر ٹھہرے جس کی بوبرینٹز میں شادی ہوئی تھی۔ اس کا کوئی بچہ نہیں تھا۔ لہٰذا کسی نو بیماری لگنے کا خطرہ نہیں تھا۔ ڈاکٹر نے میرا گلا دیکھا' میرا ٹمپریچر لیا اور کہا کہ ابھی وہ کچھ بتانے سے قاصر تھا۔ تتیانہ نے مجھے ایک بوتل دی جس کے اندر تنکوں اور گتے سے گرجا گھر بنا ہوا تھا۔ پھر میرے بازوؤں اور ٹانگوں کی تکلیف کم ہوگئی۔ میں ٹھیک ہو رہا تھا۔ یہ کب ہوا؟ میری زندگی میں ایک نیا باب شروع ہونے سے ذرا پہلے۔

ہوا یوں کہ چچا ابرام جو بچوں کو ہفتوں نظر انداز کیے رکھتا تھا' کسی اچھے لمحے میں میرے پاس آیا اور مجھ سے پوچھا۔ ''بتاؤ یہ کون سا سال ہے؟ اچھا تو تمہیں معلوم نہیں۔ یہ 1885 ہے۔ اسے دہراؤ اور یاد رکھو۔ میں تم سے دوبارہ پوچھوں گا۔'' سوال میری سمجھ میں نہ آسکا۔ ''ہاں' یہ 1885 ہے۔'' میرے خاموش طبع کزن اولگا نے کہا۔ ''اس کے بعد 1886 آئے گا۔'' مجھے یقین نہیں آرہا تھا۔ اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ وقت کا کوئی نام ہوتا ہے تو پھر 1885 کو ہمیشہ رہنا چاہیے تھا' طویل عرصے تک ــــ ہمارے مکان کے باہر پڑے ہوئے بڑے پتھر کی طرح' چکی کی طرح' یا پھر میری طرح۔ اور لگا کی چھوٹی بہن بتسیا کو پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ کس پر یقین کرے۔ ایک نئی بات پر ہم تینوں پریشان ہو رہے تھے۔ جیسے کسی نے اچانک ایک تاریک اور خالی کمرے کا دروازہ کھول دیا تھا جہاں آوازیں زور زور سے گونج رہی تھیں۔ آخر مجھے ہار تسلیم کرنا پڑی۔ ہر کوئی اولگا کا ساتھ دے رہا تھا اس طرح 1885 میرے شعور میں پہلا ہندسوں والا سال نقش ہوگیا۔ اس نے میری ابتدائی زندگی کے بے شکل اور بے ترتیب برسوں

کوختم کر دیا۔اس کے بعد مجھے تاریخ کا پتا چل گیا۔اس وقت میں چھ برس کا تھا۔ یہ فصل خراب ہونے، بحران اور روس میں پہلی بار مزدوروں کے بڑے مظاہروں کا سال تھا۔ لیکن سال کا سمجھ میں نہ آنے والا نام میرے ذہن میں چپک کر رہ گیا تھا۔تشویش کی کیفیت میں میں وقت اور ہندسوں کے درمیان خفیہ تعلق کو ایک تقدس دینے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔کئی سال ایسے تھے جو آنکھ جھپکتے ہی بیت جاتے اور بعض بے حد طویل ہو جاتے تھے۔لیکن 1885 کا سال ان میں دراز قد تھا۔ جیسے کسی قبیلے کا سردار۔اس نے مجھے ایک نئے عہد میں داخل کر دیا تھا۔

ذیل میں درج واقعہ نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ میں ایک دفعہ سامان ڈھونے والی ویگن میں ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میں اس انتظار میں تھا کہ میرا باپ گھوڑوں کی باگیں پکڑ لے۔نوجوان گھوڑے ایک دم ڈیمبووسکی کی جاگیر کی طرف بھاگ پڑے۔وہ مکان، کھلیان، باغ اور کھیتوں میں اڑے جا رہے تھے۔میرے عقب میں چیخیں تھیں اور سامنے کھائی۔گھوڑے اڑ رہے تھے۔کھائی کے کنارے پر ایک موڑ تھا جس نے ویگن کو تقریباً الٹ دیا۔گھوڑے ایک دم وہاں رک گئے۔ جیسے ان کے کھر زمین میں گڑ گئے تھے۔کوچوان بھاگا آ رہا تھا۔اس کے پیچھے دو مزدور اور ان کے بعد میرا باپ۔میری ماں واویلا کر رہی تھی۔ میری بڑی بہن ہاتھوں کو زور زور سے ہلا رہی تھی۔ ماں اس وقت بھی چیخ رہی تھی۔ جب میں ویگن سے اتر کر اس کی طرف جا رہا تھا۔میرے باپ کا رنگ زرد پڑ چکا تھا۔اس کے باوجود اس نے مجھے دو تھپڑ جڑ دیے۔ میں بالکل ناراض نہ ہوا۔سب کچھ غیر متوقع طور پر وقوع پذیر ہوا تھا۔

میں اپنے باپ کے ساتھ الزاوٹ گراڈ بھی اسی سال گیا تھا۔ ہم صبح سویرے روانہ ہوئے اور آہستہ آہستہ سفر کرتے رہے۔ بوبرینٹز میں گھوڑوں کو چارہ دیا گیا۔ہم شام کو واشی فایا پہنچے۔ ہم نزاکت سے اسے شی وی یا کہتے تھے۔ یہ اطلاع ملنے پر کہ مضافات میں ڈاکو تھے ہم نے صبح تک وہیں قیام کیا۔الزاوٹ گراڈ نے مجھ پر جو اثر کیا وہ بعد کے سالوں میں پیرس اور نیویارک نے بھی نہیں کیا ہوگا۔اس کے فٹ پاتھ، سبز

چھتیں، بالکونیاں، دکانیں، پولیس مین اور سرخ غبارے سب نے مجھے مسحور کر دیا۔ چند گھنٹوں تک میں کھلی آنکھوں سے تہذیب کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔

ایک سال بعد میں سکول جانے لگا۔ ایک صبح منہ ہاتھ دھونے کے بعد میں ناشتے کی غرض سے کھانے والے کمرے میں گیا وہاں میری ماں کے ساتھ ایک اجنبی بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے میری طرف ایسی نگاہوں سے دیکھا جس سے مجھے معلوم ہو گیا کہ میرے بارے میں باتیں ہوتی رہی تھیں۔

''لیوا ان سے ہاتھ ملاؤ'' میری ماں نے کہ۔ ''یہ تمہارے استاد ہیں'' میں نے قدرے خوف سے اپنے استاد کی طرف دیکھا۔ اس خوف میں ایک اشتیاق بھی ملا ہوا تھا۔ استاد کے رویے میں وہی نرمی تھی جو شاگرد کے ماں باپ کی موجودگی میں ایک استاد کے رویے میں ہوتی ہے۔ استاد کی فیس وغیرہ میرے سامنے ہی طے ہوئی۔ استاد نے روبل اور گندم کی بوریوں کی ایک مقررہ تعداد اور مقدار پر مجھے کالونی کے سکول میں پڑھانا تھا۔ روسی زبان، ریاضی اور توریت عبرانی زبان میں پڑھانی تھی۔ ماں نے استاد کو جو ہدایات دیں وہ کچھ غیر واضح تھیں کیونکہ ایسی باتوں کی کچھ زیادہ اہمیت نہیں تھی۔ چائے کے گھونٹ حلق میں اتارتے وقت میں اپنی زندگی میں آنے والی تبدیلی کو محسوس کرنے لگا۔

اگلی اتوار میرا باپ مجھے کالونی لے گیا اور چچی راحیل کے گھر چھوڑ دیا۔ باپ آتے وقت اپنے ساتھ آٹا، جو، مکھن اور نہ جانے کیا کچھ لیتا آیا تھا۔

یانوفکا اور گرومکلی کے درمیان چار میل کا فاصلہ تھا گرومکلی کے اندر ایک ندی بہتی تھی۔ جس کے ایک طرف یہودی اور دوسری طرف جرمن آبادیاں تھیں۔ دونوں میں نمایاں فرق تھا۔ جرمن گھر نسبتاً صاف ستھرے تھے چھتوں کا کچھ حصہ ٹائلوں او کچھ حصہ سرکنڈوں سے بنا ہوا تھا۔ گھوڑے بڑے اور گائیں زیادہ تندرست تھیں۔ یہودی آبادی کے گھر ٹوٹے پھوٹے تھے، چھتیں بیٹھی ہوئی تھیں اور مویشی بھی لاغر تھے۔

عجیب بات ہے کہ میرے پہلے سکول نے مجھ پر گہرے اثرات نہیں چھوڑے۔

ایک سیاہ سلیٹ تھی جس پر میں روسی زبان کے حروف تہجی لکھا کرتا تھا۔ استاد کی پتلی انگلیاں جس میں اس نے قلم پکڑا ہوتا تھا۔ سب کامل کر بائیبل پڑھنا' چوری پر بعض لڑکوں کو سزا ملنا۔ تمام دھندلے اور غیر واضح ٹکڑے' کوئی مکمل تصویر بنانے سے قاصر۔ یاد رکھنے کے قابل کوئی چیز تھی تو وہ استاد کی بیوی تھی۔ دراز قد' باوقار خاتون جو کبھی کبھی غیر متوقع طور پر آتی تھی اور سکول کے امور میں حصہ لینے لگتی تھی۔ ایک دن اس نے اپنے شوہر سے شکایت کی کہ نئے آٹے میں ایک خاص قسم کی بو تھی۔ جب استاد نے اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے آٹے کو سونگھنے کے لئے اپنی تیز ناک آگے بڑھائی تو بیوی نے آٹا اس کے منہ پر پھینک دیا۔ اس نے اپنی طرف سے مذاق کیا تھا۔ لڑکے اور لڑکیاں ہنسنے لگے۔ استاد نے اپنا سر جھکا لیا۔ مجھے اس پر رحم آ رہا تھا۔ وہ کلاس میں سفید منہ کے ساتھ کھڑا تھا۔

میں چچی راحیل کے ساتھ رہتا تھا۔ مگر کس احساس کے بغیر - بڑے مکان کے ایک ہی صحن کی طرف چچا ابرام کی حکومت تھی۔ اپنے بھتیجے اور بھتیجیوں سے ان کا سلوک بڑا روکھا تھا۔ کبھی کبھی وہ مجھے بلا کر کھانا کھلا دیتا۔ اگر سالن میں گوشت ہوتا تو وہ مذاق میں کہہ دیتا۔ ''میں اس ہڈی کے دس روبل نہیں لوں گا۔'' اس کا اشارہ چچی راحیل کی طرف ہوتا تھا۔

میرے چچا کا مکان کالونی کے شروع میں تھا۔ اس کے سامنے پکے رنگ کا ایک دراز قد دبلا پتلا یہودی رہتا تھا۔ جس نے گھوڑوں کی چوری اور دوسرے غلط کاموں میں نام کما رکھا تھا۔ اس کی ایک بیٹی تھی۔ اس کی شہرت بھی کچھ اتنی اچھی نہیں تھی۔ ان سے تھوڑے ہی فاصلے پر ٹوپیاں بنانے والا ایک یہودی رہتا تھا۔ وہ نوجوان تھا اور اس کی داڑھی آتشیں سرخ تھی۔ ٹوپیاں بنانے والے کی بیوی کالونی کے سرکاری انسپکٹر کے پاس آیا کرتی تھی جو ہمیشہ چچا ابرام کے پاس ٹھہرا کرتا تھا۔ وہ اس سے شکایت کرتی کہ گھوڑا چور کی بیٹی اس کے شوہر کو چرا رہی تھی۔ مگر انسپکٹر اس کی کوئی مدد نہیں کرتا تھا۔ ایک دن سکول سے واپسی پر میں نے دیکھا کہ لوگ ایک جوان لڑکی کو گلی میں گھسیٹ رہے

تھے۔ وہ گھوڑا چور کی کی بیٹی تھی۔ ہجوم شور مچا رہا تھا، چیخ رہا تھا۔ اور اس پر تھوک رہا تھا۔ بائبل جیسا یہ منظر میری یاد پر ہمیشہ کے لئے نقش ہو گیا۔ چند برسوں بعد چچا ابرام نے اسی خاتون سے شادی کر لی۔ لیکن اس وقت تک کالونی کے لوگوں کے کہنے پر اس کے باپ کو ناپسندیدہ شخص قرار دے کر سائبیریا بھیجا جا چکا تھا۔

میری سابق نرس ماشا چچا ابرام کے گھر ملازم تھی۔ میں اس کے پاس کچن میں اکثر چلا جاتا تھا۔ وہ یانوفکا سے ہمارے گھریلو تعلق کی علامت تھی۔ اس کے مہمان آتے رہتے تھے۔ بعض بڑے بے صبرے ہوتے تھے۔ ایسے موقع پر میں کچن سے بڑے آرام سے نکل آتا تھا۔ ایک صبح کالونی کے دوسرے لڑکوں کی طرح مجھے بھی معلوم ہوا کہ ماشا نے ایک بچے کو جنم دیا تھا۔ ہم بڑے اشتیاق سے ایک دوسرے کے کان میں کانا پھوسی کرتے رہے۔ چند روز بعد میری ماں یانوفکا سے آئی۔ وہ ماشا اور بچے کو دیکھنے کو دیکھنے کچن میں گئی۔ میں ماں کے پیچھے ہو لیا۔ ماشا نے اپنے گرد بڑا رومال باندھ رکھا تھا۔ جس سے اس کی آنکھیں بھی ڈھکی ہوئی تھیں۔ ایک بینچ پر بچہ پہلو پر سو رہا تھا۔ میری ماں نے ماشا کو دیکھا، پھر بچے کو۔ پھر اس نے زبان سے کچھ کہے بغیر ملامتی انداز میں سر کو جھٹکا دیا۔ ماشا آنکھیں جھکائے خاموش کھڑی رہی۔ پھر اس نے بچے کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''ذرا دیکھیں اس نے کیسے بڑوں کی طرح اپنا ہاتھ گال کے نیچے رکھا ہوا ہے۔''

''تمہیں اس پر ترس نہیں آتا؟'' میری ماں نے پوچھا۔

''بالکل نہیں'' ماشا نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔ ''کس قدر پیارا ہے۔''

''تم جھوٹ بول رہی ہو۔ تمہیں شرمندہ ہونا چاہیے'' میری ماں نے اس دفعہ ملامتی انداز میں کہا۔ ایک ہفتے بعد بچہ اسی طرح پر اسرار طور پر فوت ہو گیا جیسے پر اسرار انداز میں دنیا میں آیا تھا۔

میں اکثر سکول سے اپنے گاؤں چلا آتا تھا اور وہاں ایک ہفتے تک رہتا تھا۔ سکول کے زمانے میں میرا کوئی گہرا دوست نہیں تھا۔ اس لیے کہ میں عبرانی نہیں بولتا تھا۔ سکول کا زمانہ چند ماہ تک رہا۔ مجھے اس زمانے کی یادوں کے قحط کا اعتراف ہے۔ اتنا ضرور

ہے کہ میرے استاد شوفر (یہ اس کا نام تھا) نے مجھے لکھنا پڑھنا سکھا دیا تھا۔ یہ مضبوط تعلیمی بنیاد میری آگے کی زندگی میں میرے بہت کام آئی جس کے لئے میں اس کا بے حد ممنون تھا۔

میں ٹھیک ٹھاک پڑھنے لگا تھا۔ شعر نقل کر لیتا تھا۔ خود بھی شعر لکھنے کے قابل ہو گیا تھا۔ بعد میں میں نے اپنے کزن سنیا۔ زیڈ کے ساتھ مل کر ایک رسالہ بھی نکالا۔ میرا نیا راستہ پرخار تھا۔ میں نے لکھنے کا فن ابھی سیکھا ہی تھا کہ یہ مجھے دغا دینے لگا۔ میں ایسے لفظ استعمال کرنے لگا جو میں نے اپنے گھر میں پہلے کبھی نہیں سنے تھے۔ مجھے احساس ہو گیا کہ میں ایک ایسا کام کرنے چلا تھا جو میرے بس کا نہیں تھا۔ لیکن الفاظ مجھے اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ ایسے الفاظ جو میرے لئے ممنوع تھے۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ جو کچھ لکھوں گا اسے ماچس کی ڈبیا میں چھپاتا جاؤں گا اور پھر کھلیان کے عقب میں کسی خالی جگہ پر دفن کر دوں گا۔ میں ابھی ممنوعہ الفاظ کی فہرست بنا رہا تھا۔ کہ میری بڑی بہن کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ میرے کام میں دلچسپی لینے لگی۔ میں نے کاغذ چھپا لیا۔ بہن کے بعد میری ماں بھی آ گئی۔ دونوں مطالبہ کرنے لگی کہ میں جو کچھ لکھ رہا تھا انہیں دکھاؤں۔ ڈر کے مارے میں نے کاغذ دیوان کے پیچھے پھینک دیا۔ میری بہن اسے نکالنے لگی تو میں زور سے چیخنے لگا۔ ''میں خود نکالوں گا۔'' میں رینگتا ہوا دیوان کے نیچے گیا اور وہاں کاغذ ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ میری مایوسی کی کوئی انتہا نہیں تھی اور نہ ہی میرے آنسوؤں کی۔

یہ کرسمس 1886 کی بات ہے کہ ایک شام ہم کھانے والے کمرے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ بہروپیوں کا ایک دستہ کمرے میں داخل ہوا۔ یہ اس قدر اچانک ہوا کہ میں خوف سے دیوان میں گر پڑا۔ مجھے چپ کرایا گیا اور کہا گیا کہ میں ''زار میکسی میلیان'' کو غور سے سنوں۔ پہلی مرتبہ میں نے ایک عجیب وغریب لفظ سنا تھا۔ ایک لفظ جو میرے لئے ڈرامائی حقیقت اختیار کر گیا۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ اس ڈرامے کا بڑا کردار ہمارا ملازم پروخود ادا کر رہا تھا۔ جو ایک سابق سپاہی تھا۔ اگلے دن کھانے کے بعد میں کاغذ پنسل لے کر ملازموں کے کمرے میں چلا گیا اور ''زار میکسی

میلیان'' سے کہا کہ وہ اپنے مکالمے مجھے لکھوائے۔ پروخوراس پر زیادہ رضامند دکھائی نہیں دے رہا تھا۔مگر میں اس سے چمٹ گیا اور بار بار درخواست کرنے لگا۔آخراس نے ہتھیار ڈال دیے۔ہم کھڑکی کے پاس آرام سے بیٹھ گئے۔وہ زارمیکسی میلیان کی تقریر بولنے لگا۔اور میں کھڑکی کے ایک کھردرے پٹ کو اپنا میز کر لکھنے لگا۔ابھی پانچ منٹ ہی ہوئے تھے کہ میرا باپ دروازے پر نمودار ہوا اور مجھے دیکھ کر سختی سے بولا۔
''لیوا، اپنے کمرے میں چلو'' میں ساری دوپہر دیوان پر پڑا روتا رہا۔

لفظوں سے میری محبت کا یہ علم تھا کہ میں نے شعر لکھنے شروع کر دیے مگر اس سے میرے شعری مستقبل کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔میری شعرگوئی کا میری بڑی بہن کا پتا چل گیا۔میری بہن سے میری ماں کو اور میری ماں سے زیادہ میرے باپ کو وہ مجھ سے کہتے کہ میں مہمانوں کی سامنے بلند آواز میں اپنے شعر سناؤں۔یہ میرے لیے تکلیف کی حد تک پریشانی کی بات ہوتی تھی۔میں انکار کر دیتا۔پہلے وہ مجھے نرمی سے کہتے۔پھر دھمکی پر اتر آتے۔میں بھاگ جاتا۔مگر میرے بڑوں کو مجھے قابو میں کرنا آتا تھا۔وہ اپنی بات منوا کر رہتے۔دھڑکتے ہوئے دل اور آنکھوں میں نمی کے ساتھ میں شرماتے ہوئے ادھر ادھر سے چرائے ہوئے شعر لڑکھڑاتی زبان میں سنانے لگتا۔ان میں سے اکثر بے وزن ہوتے تھے۔

جیسا بھی تھا، یہ بات ضرور تھی کہ میں نے علم کے درخت کا پھل چکھنا شروع کر دیا تھا۔زندگی مجھ پر روز بروز نہیں بلکہ لحہ بہ لحہ کھل رہی تھی۔پھر کھانے والے کمرے میں دیوان کے نیچے پڑے کاغذ کے پھٹے ہوئے ٹکڑے دوسری دنیاؤں میں پھیلنے لگے۔ مطالعے نے مجھ پر ایک نئی زندگی کا باب کھول دیا۔

اوڈیسہ _ میرا خاندان اور میرا اسکول

1888 میں بڑے بڑے واقعات میری زندگی میں نمودار ہونے لگے۔ مجھے پڑھائی کے لیے اوڈیسہ بھیج دیا گیا۔یہ اس طرح ہوا کہ میری ماں کا بھتیجا موسی فیلپو وچ

شپنٹزر جو اٹھائیس سالہ نوجوان تھا، ایک گرمیوں میں ہمارے پاس آیا اور اس نے ساری گرمیاں ہمارے پاس ہی گزار دیں۔ وہ ایک عمدہ اور ذہین انسان تھا جسے چھوٹی سی غلطی پر یونیورسٹی سے گریجویشن کرنے سے روک دیا گیا تھا۔ وہ تھوڑا صحافی اور تھوڑا ریاضی دان تھا۔ اسے پیار سے مونیا کہا جاتا تھا۔ اپنی قابلیت اور عمدہ کردار کے باعث وہ اپنی ماں اور چند بہنوں کا بے حد لاڈلا اور چہیتا تھا۔ میرا گھر بھی اس کی بے حد عزت کرتا تھا۔ ہر کوئی اس کے آنے سے خوش تھا۔ میں بھی خاموشی سے اس احساس میں شامل تھا۔ جب مونیا کھانے والے کمرے میں داخل ہوا تو میں نرسری کی دہلیز پر کھڑا تھا۔ مجھ میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ آگے بڑھتا کیونکہ میرا جوتا دو جگہوں سے پھٹا ہوا تھا۔ یہ کوئی مفلسی کی علامت نہیں تھی۔ ہمارا خاندان اپنی محنت سے ایک کھاتا پیتا گھرانہ بن رہا تھا۔ پھٹا ہوا جوتا پہننے کا سبب رات کی محنت، خود پر عدم توجہ اور گھر کا کم تر معیار زندگی تھا۔

''ہیلو لڑکے'' موسی فیلیپووچ نے کہا۔ ''ذرا میرے پاس آؤ۔''

''ہیلو'' میں نے جواب دیا مگر اپنی جگہ سے ایک انچ نہ ہلا۔ میرے ماں باپ نے قدرے مجرمانہ ہنسی سے بتایا کہ میں اپنی جگہ سے کیوں نہیں ہل رہا تھا۔ وہ بڑی خوش دلی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور مجھے اپنے بازوؤں میں بھر کر دہلیز سے اپنی جگہ لے کر آیا۔

کھانے پر مونیا سب کی توجہ کا مرکز تھا۔ میری ماں اسے خود ہر چیز کھانے کو دے رہی تھی اور اس سے پوچھ رہی تھی کہ اسے کھانے میں کون کون سی چیزیں پسند تھیں۔ شام کو جب مویشیوں کو ان کے باڑے میں بند کر دیا گیا تو موینا نے مجھ سے کہا۔ ''چلو تھوڑا تازہ دودھ پیتے ہیں۔ تم گلاس پکڑنا میں گائے کو دوہوں گا۔ گلاس کو اندر سے نہیں بلکہ باہر سے پکڑنا۔''

موینا سے میں نے بہت سی باتیں سیکھیں جنہیں میں پہلے نہیں جانتا تھا۔ یعنی گلاس کیسے پکڑا جاتا ہے۔ اسے کیسے دھویا جاتا ہے۔ بعض لفظوں کا تلفظ کیا ہے اور گائے کا تازہ دودھ چھاتی کے لئے کیوں مفید ہے۔ وہ بہت سیر کرتا تھا۔ لکھتا رہتا تھا۔ اس نے مجھے روسی گرامر اور ریاضی سکھائی اور جمنیزیم کی پہلی کلاس کی تیاری کرائی۔ اس نے

میرے اندر ایک جوش بھر دیا مگر اس کے ساتھ ہی بے چین بھی کر دیا۔ اس کی زندگی میں ایک تنظیم کا عنصر موجود تھا۔ شہری تہذیب کا عنصر۔

مونیا کا اپنے دیہاتی رشتہ داروں سے سلوک بڑا دوستانہ تھا۔ وہ ان سے مذاق کرتا رہتا اور انہیں ہلکے پھلکے گانے سناتا رہتا۔ بعض اوقات وہ اداس ہو جاتا اور کھانے کی میز پر کسی سوچ میں غرق چپ چاپ بیٹھا رہتا۔ ہم سب اسے متفکر نظروں سے دیکھتے اور پوچھتے کہ وہ ٹھیک تو تھا۔ اس کا جواب مختصر ہوتا اور یوں لگتا جیسے وہ کچھ چھپا رہا تھا۔ گاؤں میں اس کے قیام کے اختتام کے نزدیک میں اس کے موڈ کیا تار چڑھاؤ کی وجہ کچھ کچھ سمجھنے لگا تھا۔ یا تو وہ دیہاتیوں کے آداب زندگی سے پریشان تھا یا پھر کوئی ناانصافی اسے تنگ کرتی رہتی تھی۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ اس نے میرے باپ یا ماں کی کسی سختی کا نوٹس لیا تھا۔ یہ ناممکن تھا۔ کھیت مزدوروں سے میرے باپ کا جو سلوک تھا وہ دوسری جاگیروں پر کام کرنے والے مزدوروں سے زیادہ مختلف نہیں تھا۔ اگر اچھا نہیں تھا تو اس کا مطلب ہے کہ بڑا تھا۔ جب ایک دفعہ ہمارے نگران نے ایک ملازم کو ایک لمبی چھڑی سے کچو کے دیے کہ اس نے گھوڑوں کو دیر تک باہر کیوں رکھا تھا تو مونیا کا رنگ زرد پڑ گیا اور وہ زیر لب بڑبڑاتا رہا۔ ''کس قدر شرم کی بات ہے۔'' مجھے بھی یہ بات شرم ناک محسوس کرتا۔ میرا خیال ہے میں ضرور محسوس کرتا۔ بہر حال اس نے کچھ محسوس کرنے میں میری مدد ضرور کی جس سے میرے اندر زندگی بھر اس کے لئے ایک احسان مندی کا احساس پیدا ہو گیا۔

مونیا ریاست کے یہودی سکول کی پرنسپل سے شادی کرنے والا تھا۔ یانوفکا میں اس خاتون کو کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ لیکن ہر ایک کو احساس تھا کہ وہ عام خواتین سے بہتر ہو گی کیونکہ وہ ایک سکول کی پرنسپل تھی اور مونیا کی ہونے والی دلہن تھی۔ اگلے موسم بہار میں مجھے اوڈیسہ بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا۔ وہاں میں نے مونیا کے خاندان کے ساتھ رہنا اور جمنیزیم جانا تھا۔ کالونی کے درزی نے میرے کپڑے تیار کیے۔ شہر کے رشتہ داروں کے لئے اشیا کا ایک بیگ بھر کر مجھے دیا گیا جس میں مکھن، جام اور دوسرے تحفے تھے۔ میری

رخصتی کی تقریب خاصی طویل ہوگئی۔ میں رو رہا تھا۔ میرے ساتھ میری ماں اور بہنیں بھی۔ مجھے پہلی بار احساس ہورہا تھا کہ یانو فکا سے مجھے کس قدر محبت تھی۔ ہم گاڑی میں سوار ہو کر میدانوں میں سے گزرتے ہوئے سٹیشن کی طرف جارہے تھے۔ میں بڑی سڑک آنے تک روتا رہا۔

نومی بگ سے ہم نے نکولیف جانے والی ٹرین پکڑ لی۔ یہاں سے ہم ایک دخانی کشتی میں بیٹھ گئے۔ کشتی کے سائرن نے میری ہڈیوں میں ایک کپکپی دوڑا دی۔ یہ ایک نئی زندگی کی آواز تھی۔ اب تک ہم دریائے بگ میں سفر کرتے آئے تھے۔ اب سمندر ہمارے سامنے تھا اس کے علاوہ اور بہت کچھ بھی۔ گھر پہنچ کر میرا اچھی طرح جائزہ لیا گیا، پہلے ایک نوجوان خاتون نے اور پھر ایک معمر خاتون نے جو اس کی ماں تھی، میری پیشانی اور گالوں پر بوسے دیے۔ یہ ایک بڑا پرانا گھر تھا۔ اس میں لڑکیوں کا سکول بھی تھا۔ سکول کی پرنسپل بھی اسی میں رہتی تھی۔ موسی فیلپووچ حسب معمول مجھ سے مذاق کرتا رہتا۔ وہ یانوفک، اس کے باشندوں حتیٰ کہ ہمارے مویشیوں کے بارے میں پوچھتا رہتا۔ مویشی میرے لئے اتنی کم مایہ چیزیں تھیں کہ ان کے متعلق پوچھنے سے مجھے پریشانی ہونے لگتی۔ جس کمرے میں ہم جا کر بیٹھے تھے وہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اسی کمرے کے ایک کونے میں پردے کے پیچھے مجھے جگہ دی گئی۔ اپنی سکول کی زندگی کے پہلے چار برس میں نے وہیں گزارے۔

میں نے ایک دم خود کو ایک سخت قسم کے ڈسپلن کی گرفت میں پایا۔ جب موسی فیلپووچ ہمارے گاؤں میں آیا تھا تو وہاں بھی وہ اسی قسم کے ڈسپلن کا مظاہرہ کرتا رہا تھا۔ ابتداء میں سختی زیادہ محسوس ہوئی۔ نو بجے مجھے سو جانا ہوتا تھا۔ سکول میں پڑھائی کی مدت زیادہ ہونے کے ساتھ سونے کے وقت میں کمی ہوتی گئی۔ مجھے ہر وقت یاد دلایا جاتا کہ مجھے صبح بخیر کہنا نہیں بھولنا تھا۔ ہاتھوں اور ناخنوں کو صاف رکھنا تھا، چاقو اور کانٹے کے ساتھ نہیں کھانا تھا' کاہلی کا مظاہرہ نہیں کرنا تھا' ملازموں کا شکریہ ادا کرتا تھا اور لوگوں کی پشت پیچھے برائی نہیں کرنی تھی۔ میں نے درجنوں ایسے لفظ سیکھے جو اپنے گھر پر نہیں سیکھ سکتا

تھا۔ یہ روسی نہیں بلکہ یوکرانی تلفظ کے تھے۔ ہر روز مجھ پر تہذیبی ماحول کا ایک نیا پہلو کھلتا جو اس تہذیب سے بڑا ہوتا جس میں میں نے زندگی کی نو برس گزارے تھے۔ کلاسیکل ادب کے جادو اور تھیٹر کی دلکشی نے گاؤں میں ہونے والے چھوٹے چھوٹے سارے شو اور ڈرامے بھلا دیے۔ میں شہری ہوتا جا رہا تھا۔ کبھی کبھی گاؤں ایک دم میرے شعور میں ابھر آتا اور مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے میں نے کوئی جنت گم کر دی تھی۔ تب میرے اندر ایک ہوک اٹھتی میں گھومنے نکل جاتا اور کھڑکی کے شیشوں پر انگلیوں سے اپنی ماں کو خط لکھتا رہتا۔ یا پھر تکیے میں منہ دے کر رونے لگتا۔

موسی فیلپووچ کے یہاں زندگی بڑی عاجزانہ قسم کی تھی۔ اس کے مالی ذرائع اتنے تھے کہ بس گزارہ ہو رہا تھا۔ گھر کے سربراہ کے پاس کرنے کو کوئی خاص کام نہیں تھا۔ وہ یونانی المیہ ڈراموں کا تبصرے کے ساتھ ترجمہ کرتا رہتا۔ بچوں کے لئے کہانیاں لکھتا اور شلوسر اور دوسرے مورخوں کا مطالعہ کرتا رہتا۔ اس کے علاوہ سکول چلانے میں بیوی کی مدد کرتا۔ بعد میں اس نے ایک اشاعت گھر کھول لیا جو ابتدا میں تو مشکلات کا شکار رہا مگر بعد میں اچھی حیثیت اختیار کر گیا۔ پھر دس بارہ برس میں وہ جنوبی روس کا ایک ممتاز ناشر بن گیا۔ میں اس کنبے کے ساتھ چھ برس تک رہا۔ اس عرصے میں میں کتاب کی چھپائی سے کتاب کی جلد بندی تک سارے کام سیکھ گیا۔ پروف پڑھنا میرا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ نئی کتابوں سے مجھے محبت اسی زمانے میں پیدا ہوئی۔

جیسا کہ بورژوا یا پیٹی بورژوا گھروں میں ہوتا ہے، ملازموں کی حیثیت مکینوں کی زندگیوں میں کچھ زیادہ نہیں ہوتی۔ ان کا نوٹس کم ہی لیا جاتا ہے۔ گھر کی خادمہ داشا نے مجھے اپنا رازدان بنا لیا۔ وہ اپنے دل کی ہر بات مجھ سے کر دیتی۔ رات کے کھانے کے بعد جب ہر کوئی آرام کر رہا ہوتا تو میں چپکے سے اس کے پاس کچن میں چلا جاتا۔ وہاں داشا مجھے اپنی زندگی کی چھوٹی موٹی باتیں بتائی رہتی۔ اس نے اپنی پہلی محبت کے بارے میں بھی مجھے بتایا۔ وہ طلاق یافتہ تھی۔ ''وہ بڑا بدمعاش تھا۔'' وہ اپنے سابق شوہر کی شکایت کیا کرتی۔ میں نے اسے پڑھانا شروع کر دیا۔ وہ ہر روز کم از کم نصف گھنٹہ

میرے پاس بیٹھتی۔ وہ حروف تہجی اور لفظوں کی ساخت کے اسرار کو سمجھنے کی کوشش میں لگی رہتی۔ اب گھر میں ایک بچہ نمودار ہو گیا تھا جس کے لئے ایک نرس رکھی گئی۔ اس نرس کا اپنا ایک بیٹا تھا۔ میں اس نرس کے لئے خط لکھتا رہتا۔ اس کا شوہر امریکہ میں تھا۔ وہ اسے اپنی تکالیف بتاتی رہتی۔ اس کی درخواست پر میں خط کو زیادہ سے زیادہ دکھ بھرا اور موثر بنانے کی کوشش کرتا رہتا۔ وہ مجھے لکھایا کرتی ''ہمارا بیٹا ہی ہماری تاریک زندگی کے آسمان کا روشن ستارہ ہے۔'' اس کو اپنے شوہر سے والہانہ عشق تھا۔ خط لکھ کر مین اسے بلند آواز میں بڑھ کر سنایا کرتا تھا۔ خط کے اختتام پر جب وہ شوہر سے ڈالروں کا مطالبہ کرتی تو میں پریشان ہو جاتا۔ پھر وہ کہتی۔

''ایک اور خط''

''وہ کس کے لئے؟'' میں اس تخلیقی کام کی دوبارہ تیاری کرنے لگتا۔

''میرے کزن کو'' نرس غیر یقینی کی طاقت میں جواب دیتی۔ اس خط میں بھی اس کی تاریک زندگی کا ذکر ہوتا مگر ستارے کے متعلق کوئی بات نہ کہی جاتی۔ آخر میں ایک تجویز ہوتی کہ اگر وہ چاہے تو اس کے پاس آنے کو تیار تھی۔ نرس خط لے کر بمشکل ہی گئی ہوتی کہ ملازم لڑکی آجاتی اور مجھے اطلاع دیتی۔ ''اس کا تو کوئی کزن ہی نہیں ہے۔'' اس کی آواز میں غصہ ہوتا۔

''پھر وہ کیا ہے؟'' میں پوچھتا۔

''ایسے ہی کوئی خیالی آدمی''

اور میں انسانی تعلقات کی پیچیدگی پر غور کرنے لگتا۔

کھانے پر موسی فیلپووچ کی بیوی فینی عجیب طریقے سے مسکراتی ہوئی مجھ سے پوچھتی۔ ''ادیب صاحب، آپ اور سوپ لیں گے؟''

''کیا کہا؟'' میں چوکنا ہو کر پوچھتا۔

''اوہ، کچھ نہیں۔ تم اس نرس کے لئے خط لکھتے رہتے ہو۔ ہماری نظر میں تو تم ادیب ہو۔ تاریک آسمان پر روشن ستارہ۔ تو ایک ادیب ہی لکھ سکتا ہے۔'' پھر اسے خود

پر اختیار نہ رہتا اور وہ ہنسنا شروع کر دیتی۔

''بڑا اچھا خط لکھتا ہے'' موسی فیلپووچ لقمہ دیتا۔ ''لیکن اب تمہیں اس کے لئے مزید خط نہیں لکھنے چاہیں۔ اب فینی لکھا کرے گی۔''

زندگی میں ڈوبی ہوئی غلط سمت نہ تو سکول کو دیکھتی ہے اور نہ ہی گھر کو۔ وہ اپنا کا جاری رکھتی ہے۔ وہ اس قدر طاقت ور اور چھا جانے والی ہوتی ہے کہ ایک دس سالہ لڑکا بھی اس کی گرفت سے نہ بچ سکا۔ اب میں سکول اور گھر کی بجائے کچن میں جا کر چوری چوری خط لکھتا رہتا تھا۔

دس فیصد یہودی بچوں کا سرکاری سکول میں داخلہ دینے کا قانون پہلی دفعہ 1887 میں متعارف کرایا گیا تھا۔ رشوت اور سفارش کے بغیر کسی جمنیزیم میں داخلہ لینا تقریباً ناممکن تھا۔ دس فیصد کوٹہ پورا ہونے کے بعد یہودی لڑکے پرائیویٹ سکولوں میں داخلہ لینے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ ایک عرصے سے اخبارات اور رسالوں میں بحث چل رہی تھی۔ کہ سرکاری اور پرائیویٹ تعلیم میں سے کون سی بہتر تھی۔ قدامت پسندوں کا خیال تھا کہ سرکاری تعلیم لڑکوں میں زیادہ ڈسپلن پیدا کرتی تھی۔ آزاد خیال لوگ پرائیویٹ تعلیم کے حق میں تھے۔ میرے ہائی سکول جانے تک ایک خاص آرڈر کے تحت اس قسم کے مباحث پر پابندی عائد کر دی گئی تھی کہ کن سکولوں کی تعلیم زیادہ بہتر تھی۔

خزاں کے موسم میں میں نے سینٹ پال ☆ realschule میں ہائی کلاس کے پہلے سال کے لئے داخلے کا امتحان دیا۔ میں نے یہ امتحان پاس کر لیا۔ روسی زبان میں میرے تین اور ریاضی میں چار نمبر آئے۔ یہ نمبر کافی ثابت نہ ہوئے۔ رشوت کی وجہ سے انتخاب کا طریقہ بڑا پیچیدہ بنا دیا گیا تھا۔ مجھے دو مضامین میں پانچ پانچ نمبر لینے چاہیے تھے۔ بہر حال مجھے داخلے کے بعد سکول سے منسلک ایک دوسری ابتدائی جماعت میں بھیج دیا گیا۔ اس کلاس میں کچھ عرصہ پڑھنے کے بعد مجھے پھر باقاعدہ کلاس میں لیا جانا تھا۔

سینٹ پال سکول بنیادی طور پر ایک جرمن ادارہ تھا۔ اسے لوتھر کے حامیوں نے قائم کیا تھا اور اس کا مقصد اوڈیسہ اور جنوبی ضلع کے جرمن آباد کاروں کی تعلیمی ضرورت

کو پورا کرنا تھا۔ اگرچہ سینٹ پال سکول ریاست کی طرف سے منظور شدہ تھا اور اسے تمام مراعات اور حقوق حاصل تھے مگر یہ گریڈ تک تھا اور ساتویں گریڈ کے لئے ایک اور

☆ روس میں اس وقت پرائیویٹ سکولوں کو Realschule کہا جاتا تھا۔

پرائیویٹ سکول میں جانا پڑتا تھا۔ اس کے بعد یونیورسٹی میں داخلہ ملتا تھا۔ بظاہر مفروضہ یہ تھا کہ آخری گریڈ آنے تک جرمن روح طلباء میں سے نکل جائے گی۔ یہ روح سینٹ پال سکول میں ہر سال کم ہوتی جا رہی تھی۔ جرمن لڑکوں کی تعداد نصف سے کم رہ گئی تھی۔ اسی طرح جرمن سٹاف بھی بتدریج کیا جا رہا تھا۔

سکول میں تعلیم کے پہلے چند دن قدرے تکلیف دہ تھے۔ پھر وہ خوشی کے دنوں میں بدل گئے۔ میں بالکل نئی یونیفارم میں سکول گیا۔ میری ٹوپی بی نئی تھی جس کا بارڈر زرد رنگ کا تھا۔ درمیان میں سکول کا بڑا پیچیدہ قسم کا مونوگرام تھا۔ میرا چمڑے کا سکول بیگ بھی بالکل نیا تھا۔ کتابیں بھی نئی تھیں اور پنسل باکس بھی بالکل نیا۔ یہ سارا نیا بوجھ اٹھا کر میں طویل اپنسکی سٹریٹ پار کر کے سکول پہنچا۔ سٹریٹ کا لمبا ہونا میرے لئے خوشی کا باعث بن رہا تھا کیونکہ اس طرح چلنے میں زیادہ وقت گزارنے کا موقع مل رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا۔ جیسے میرے پاس سے گزرنے والے لوگ میری یونیفارم اور بستے کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ میں بھی انہیں ایک دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ پھر اچانک ایک دبلا پتلا لڑکا جو کوئی تیرہ سال کا ہوگا میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں اوزار تھے۔ وہ کسی دوکان میں کام سیکھنے والا لگتا تھا۔ اس نے دو ایک قدم میری طرف بڑھائے، اپنے سر کو ذرا جھٹکا دیا اور بلند آواز سے میری جیکٹ کے شانے پر تھوک دیا۔ پھر کوئی لفظ کہے بغیر حقارت سے میری طرف دیکھ کر آگے بڑھ گیا۔ اس نے ایسا کیوں کیا تھا؟ اس کی وجہ مجھے اب معلوم ہوئی ہے۔ اس نے یہ حرکت اپنی مفلسی کے پیش نظر معاشرتی احتجاج کے طور پر کی تھی۔ میں دیر تک پتوں سے اپنے شانے کو صاف کرتا رہا۔ اور اپنی بےبسی اور ہتک پر اندر ہی اندر غصے کھول رہا تھا۔ میرا سکول تک کا باقی راستہ بڑی اداسی میں کٹا۔

دوسری چوٹ سکول کے صحن میں میری منتظر تھی۔ ''پیٹر پفلو وچ'' لڑ کے چلائے۔ ''یہ رہا ایک اور ابتدائی کلاس سے یونیفارم میں آنے والا۔'' اس کا کیا مطلب تھا؟ یوں لگتا تھا جیسے ابتدائی کلاس کوئی نجی معاملہ تھا اور وہاں سے آنے والے طلبا کے لئے سینٹ پال کی یونیفارم پہننا ممنوع تھا۔ کلاس کے سیاہ داڑھی والے مانیٹر پیٹر پفلو وچ نے مجھے بتایا کہ میں بیج اتار دوں اور بیلٹ بھی تبدیل کر لوں اور عام قسم کی بیلٹ پہنوں۔ یہ میرے لئے دوسرا صدمہ تھا۔

اس دن سکول میں کوئی کلاس نہ ہوئی جرمن طلباء اور کئی دوسرے لوگ لوتھرئین چرچ میں جمع ہوئے جس کی نام پر یہ سکول تھا۔ میری راہنمائی کے لئے ایک ایسا فربہ لڑکا مقرر کیا گیا جو دوسرے برس بھی ابتدائی کلاس میں رہ گیا تھا اور سکول کے نظام سے واقف تھا۔ اس نے چرچ میں مجھے اپنے قریب بنچ پر بٹھا لیا۔ میں نے پہلی مرتبہ باجے کی آواز سنی تھی جس سے میرے اندر تھرتھراہٹ سی پیدا ہو گئی۔ پھر ایک طویل قامت بغیر داڑھی والا آدمی نمودار ہوا جس کے کوٹ کا اگلا حصہ بالکل سفید تھا۔ اس کی آواز لہروں کی طرح چرچ میں گونج رہی تھی۔ اس کی آواز نے دعا کے شکوہ کو چار چاند لگا دیے۔ ''یہ کون بول رہا ہے؟'' میں نے جذباتی ہو کر پوچھا۔ یہ پاسٹر بنیامین ہے۔'' میرے نئے دوست کارل سن نے بتایا۔ یہ بہت عقل مند آدمی ہے۔ اوڈیسہ کا سب سے عقل مند آدمی۔''

''وہ کیا کہہ رہا ہے۔''

''جو وہ ہر روز کہتا ہے۔'' کارل سن نے کسی جذبے کے بغیر کہا۔ ''یعنی آپ خود کو ایک اچھا شاگرد ثابت کریں، سخت محنت کریں، دوسرے لڑکوں سے تعلقات اچھے رکھیں۔'' بینامین کا یہ بھاری جبڑے والا مداح بعد میں بے حد کاہل اور غلط لڑکا نکلا۔ وہ بڑا پھڈے باز تھا۔

سکول کا دوسرا دن آرام سے گزرا۔ میں نے ریاضی میں اپنی ذہانت دکھائی اور بلیک بورڈ سے سوال پھرتی سے اتار لیے۔ میرے استاد روڈنکو نے کلاس کے سامنے

میری تعریف کی اور مجھے دو''پانچ'' دیے۔سکول کا ڈائریکٹر کرسچن کر سچونو وچ جونئر کلاسوں کو خود جرمن زبان پڑھاتا تھا۔وہ ایک عمدہ اہل کار تھا جو اپنے بہنوئی بنیامین کی وجہ سے اس عہدے پر پہنچا تھا۔کرسچن کر سچونو وچ نے نئے لڑکوں کے ہاتھوں کا معائنہ شروع کر دیا۔اسے میرے ہاتھ صاف لگے۔بلیک بورڈ سے سبق نقل کرتے وقت میری مہارت اور ذہانت دیکھ کر اس نے مجھے پانچ نمبر دیے۔سکول کے دوسرے دن کے اختتام پر میں تین''پانچ'' لے کر گھر واپس آرہا تھا۔وہ میرے لئے چمڑے کے بستے میں ایک خزانے کی طرح تھے۔میں پکروسکی سٹریت میں چلنے کے بجائے بھاگتا ہوا گھر جا رہا تھا۔

اب میں سکول جانے والا لڑکا بن چکا تھا۔میں صبح جلدی اٹھتا،جلدی سے چائے پیتا،دوپہر کا کھانا اپنے اورکوٹ کی جیب میں ٹھونستا اور صبح کی دعا میں وقت پر پہنچنے کے لئے سکول کی طرف بھاگ پڑتا۔میں کاہل نہیں تھا۔وقت پر اپنی سیٹ پر بیٹھ جاتا تھا،غور سے سبق کو سنتا اور احتیاط سے کاپی میں اتار لیتا۔گھر کے لئے جو کام ملتا اسے بڑی محنت سے کرتا۔مقررہ وقت پر سونے کے لئے چلا جاتا تاکہ صبح اٹھ کر اور تیار ہو کر سکول پہنچ جاؤں اور دعا میں شامل ہوسکوں۔میں کسی مشکل کے بغیر ایک کلاس سے دوسری کلاس میں جاتا رہا۔راستے میں جب کبھی کوئی استاد مل جاتا تو میں احترام کے ساتھ آداب بجالاتا۔

لوگوں میں جوش وجذبہ عام طور پر ٹھیک ٹھاک ہی ہوتا ہے۔مگر اساتذہ میں اس کا تناسب کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔سینٹ پاک سکول کے اساتذہ میں پڑھانے کی امنگ اوسط سے زیادہ تھی۔سکول معیار بلند تھا اور اسکی بھی وجہ تھی۔سکول انتظامیہ سخت اور ڈسپلن کی پابند تھی۔اس سختی میں ہر سال اضافہ ہوتا جارہا تھا۔خاص طور پر جب سے نکولائی انتونو وچ کانسکی ڈائریکٹر بنا تھا۔وہ پیشے کے لحاظ سے فزیسٹ تھا اور مزاجاً انسانیت سے نفرت کرتا تھا۔جس آدمی سے باتیں کر رہا ہوتا اس کی طرف کبھی نہ دیکھتا۔وہ ربڑ کے جوتے پہن کر برآمدوں اور کلاس روموں میں دبے پاؤں گھومتا رہتا۔وہ

مدھم مگر کھردری آواز میں بات کرتا جو ڈرانے والی ہوتی تھی۔ کانسکی بظاہر خاموش دکھائی دیتا تھا مگر اس کے اندر کی چڑ چڑاہٹ ظاہر ہونے سے نہیں رہتی تھی۔ یہ چڑ چڑاہٹ اس کی عادت بن چکی تھی۔ بہترین طالب علم کی طرف بھی اس کا رویہ فوجیوں جیسا ہوتا تھا۔ میرے ساتھ اس کا برتاؤ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔

فزیسٹ کی حیثیت سے اس نے ایک ایسا آلہ ایجاد کیا تھا جو گیسوں کی مزاحمت کے متعلق بوئل مائریٹ کے قانون کا بڑا اچھا مظاہرہ کرتا تھا۔ ہر مظاہرے کے بعد دو تین لڑکے ایسے ہوتے تھے جو سرگوشی میں ''بہت اچھا'' کہا کرتا تھا۔ مگر کبھی کوئی لڑکا اٹھ کر شک بھری آواز میں پوچھ لیتا تھا۔ اس آلے کا موجد کون ہے؟ کانسکی برف جیسی آواز میں آرام سے کہہ دیتا۔ ''میں'' ہر کوئی ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگتا۔ پوچھنے والا لڑکا بلند آواز میں تحسین کے ڈونگرے برسانے لگتا۔

سکول کو زیادہ سے زیادہ روسی بنانے کے لئے کانسکی کو ڈائریکٹر بنایا گیا تھا۔ اس کے بعد انگریزی ادب کے استاد انتون ویسکی وچ کرزنوسکی کو سکول کا انسپکٹر بنا دیا گیا۔ وہ سرخ داڑھی والا ہوشیار آدمی تھا۔ اس سے پہلے وہ مذہب سے وابستہ تھا۔ تحائف کا دلدادہ، ایک حد تک آزاد خیال، اپنی فرضی شفقت کے پردے میں اپنے ارادوں کو بڑی ہوشیاری سے چھپانے والا۔ انسپکٹر بننے کے ساتھ ہی وہ زیادہ محنتی اور قدامت پسند ہو گیا کرزانوسکی پہلی جماعت سے آگے تک روسی پڑھاتا تھا۔ اسے میری گرائمر اور زبان سے محبت بہت پسند آئی تھی۔ اس نے میرے لکھے ہوئے سبق کا کلاس میں بلند آواز میں پڑھنا اپنا معمول بنا لیا تھا۔ وہ مجھے پانچ میں سے پانچ نمبر دیا کرتا تھا۔

ریاضی کا استاد یورچکو بڑے گھٹے ہوئے بدن اور بلغمی مزاج والا چالاک آدمی تھا۔ اسے اوڈیسہ کی مقامی بولی میں ''بھاری ٹرک ڈرائیور کہا جاتا تھا۔ یورچنکو پہلی جماعت سے آخری جماعت کے ہر لڑکے کو ''تم'' کہہ کر بلاتا تھا اور اسے اپنے طرز تخاطب پر کوئی عار محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اکھڑپن کے باوجود سکول میں اس کی ایک عزت تھی۔ لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ وہ رشوت لیتا تھا تو یہ عزت برف کی طرح پگھل

گئی۔ دوسرے اساتذہ پر بھی کسی نہ کسی طریقے سے رشوت لینے کا شک موجود تھا۔ کمزور طالب علم کو عموماً اس استاد کے سپرد کیا جاتا تھا جس کی اس کو ضرورت ہوتی تھی۔ اگر لڑکا دیہی ہوتا تو اسے ٹیوشن پڑھنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔

ریاض کا دوسرا استاد زچنسکی زیووچنکو کی بالکل ضد تھا۔ وہ دبلا پتلا اور زردی مائل چہرے کا مالک تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی مونچھیں اور آنکھیں مٹیالے رنگ کی تھیں۔ اس کی چال ایسی تھی جیسے ابھی سو کر اٹھا تھا۔ وہ بلند آواز میں کھانستا اور کلاس میں فرش پر تھوک دیتا تھا۔ مشہور تھا کہ اسے محبت میں ناکامی ہوئی تھی اور وہ مایوسی کی حالت میں بادہ نوشی پر اتر آیا تھا۔ اگرچہ زچنسکی بڑا ریاضی دان نہیں تھا مگر اسے سوچ میں گم رہنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ وہ اپنے شاگردوں اپنے مطالعے حتیٰ کہ اپنے مضمون سے بھی غافل دور کہیں دیکھتا رہتا تھا۔ چند سال بعد اس نے استرے سے اپنا گلا کاٹ لیا تھا۔

چونکہ میں ریاضی میں بہت اچھا تھا لہٰذا دونوں استادوں سے میرے تعلقات بڑے خوشگوار تھے۔ جب میں سکول کی آخری جماعت میں تھا تو میں ریاضی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

تاریخ کے استاد کا نام لوبیوف تھا۔ وہ دراز قد اور بارعب شخصیت کا مالک تھا۔ اس کی ناک پر ہنودی فریم والی عینک ٹکی رہتی تھی۔ اور جوان چہرہ کالی داڑھی سے بھرا ہوا تھا۔ جب وہ ہنستا یا مسکراتا تو اس وقت ہم بچوں کو بھی پتا چل جاتا تھا کہ اس کی شخصیت میں کوئی چیز مصنوعی تھی۔ وہ مسکین، کمزور ارادے اور اندر سے ٹوٹا ہوا آدمی تھا۔ وہ اس خوف میں بھی مبتلا رہتا کہ کہیں لوگ اس کے متعلق کچھ جان نہ جائیں۔

مجھے تاریخ سے بڑی دلچسپی تھی مگر یہ دلچسپی تھی مگر یہ دلچسپی درمیان میں مدھم پڑ جاتی۔ پھر میں بتدریج نصاب کی کتابیں چھوڑ کر دوسری کتابوں کا مطالعہ کرنے لگا کہ میرا ذہنی افق وسیع ہوتا جائے۔ تاریخ کے مطالعے میں بلا شبہ کوئی چیز مجھے مسحور کرتی تھی۔ اپنے استاد کو کبھی کبھی یونہی پریشان کرنے کی خاطر میں نے تاریخ کے غیر ضروری نام اور تفصیلات ازبر کر رکھی تھیں۔ جس سے میرے ذہن پر فالتو بوجھ پڑتا تھا۔ لوبیوف اپنی

کلاس کے ساتھ چلنے کا اہل نہیں تھا۔ بعض اوقات وہ سبق پڑھانے کے دوران میں اچانک بھڑک اٹھتا اور کہتا کہ اس کی توجہ ہٹانے کے لیے کلاس میں سرگوشیاں کی جارہی تھیں۔ یا کسی بات پر یوں ہی اپنی ہتک محسوس کرنے لگتا۔ ساری کلاس حیرانی سے اپنے کانوں کو ہاتھ لگانے لگتی۔ لوبیوف کسی جمنیزیم میں لڑکیوں کو بھی پڑھاتا تھا۔ وہاں بھی وہ بری عجیب وغریب حرکتیں کرتا تھا۔ انجام کار اسے پاگل پن کے دورے پڑنے لگے اور اس نے کھڑکی کے فریم سے لٹک کر جان دے دی۔

جغرافیہ کا استاد زوقفسکی ایک بہت بڑی دہشت تھا۔ وہ لڑکوں کو گوشت کاٹنے والی کلہاڑی کی طرح کاٹ کر رکھ دیتا تھا۔ زوقفسکی کلاس میں ایک ناممکن خاموشی کا مطالبہ کرتا رہتا۔ جب کوئی لڑکا کلاس میں سبق سنا رہا ہوتا تو اسے ایک دم روک دیتا اور پھر اس کی طرف یوں دیکھتا جیسے کوئی شکاری اپنے شکار کی طرف دیکھتا ہے۔ ہر کوئی اس کا مطلب سمجھتا تھا۔ کوئی بالکل نہ ہلے، ممکن ہو تو سانس بھی نہ لے۔ مجھے ایک موقع یاد ہے جب زوقفسکی آپے سے باہر ہو گیا تھا۔ یہ اس کا یوم پیدائش تھا۔ لڑکوں میں سے کسی نے کچھ کہہ دیا جس کا تعلق سبق سے نہیں تھا بلکہ نیم نجی قسم کی بات تھی۔ زوقفسکی اسے پی گیا۔ یہ بذات خود بہت بڑی بات تھی۔ پھر وہ لڑکا بڑے نخرے سے اٹھا اور کہنے لگا۔ ''یہ بات عام مشہور ہے کہ لوبیوف یوقفسکی کے یوم پیدائش پر شمع روشن نہیں کرے گا۔'' زوقفسکی ایک دم غصے میں آ گیا۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہو؟ بیٹھ جاؤ'' پھر ایک ایسی خاموشی نے پوری کلاس کو اپنی گرفت میں لے لیا جس کے لئے جغرافیے کی کلاس مشہور تھی۔ لڑکا جس کا نام واکر تھا یوں بیٹھ گیا جیسے جھاگ بیٹھ جاتی ہے۔ ہر طرف سے ملامت بھر نظریں اس کی طرف اٹھنے لگیں۔ ''میں قسم کھاتا ہوں یہ سچ ہے'' واکر نے سرگوشی میں جواب دیا۔ استاد سے اس کے معاملات کچھ زیادہ درست نہیں تھے۔

جرمن زبان کے استاد کا نام سٹریوف تھا۔ اس کا قد لمبا اور سر بڑا تھا۔ داڑھی اس قدر بڑی تھی کہ ناف تک آتی تھی۔ یہ بھاری بھرکم آدمی جو سراپا شفقت تھا، اپنے بھاری جسم کو اپنی بچوں جیسی ٹانگوں پر اٹھائے پھرتا تھا۔ وہ بے حد ایمان دار شخص تھا۔

شاگردوں کے فیل ہونے پر اسے بڑا دکھ ہوتا تھا اور ان کے غم میں برابر شریک ہوتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا۔ کہ کوئی لڑکا ایک کلاس میں دو سال گزارے۔ اس نے اپنے باورچی کے بھتیجے کو سکول میں داخلہ دلوانے میں بے حد مدد کی مگر لڑکا کند ذہن نکل آیا۔ سٹریوف تھوڑا سا مسخرہ تھا مگر مجموعی طور پر بڑا ہمدرد استاد تھا۔

فرانسیسی زبان کے استاد کا نام گستاف سامولووچ برنانڈے تھا۔ وہ سوئٹزرلینڈ کا رہنے والا تھا۔ وہ بھارے بدن کا تھا مگر یوں لگتا تھا جیسے اس کے بھاری بھرکم بدن کو دبا کر اسے پتلا کیا گیا تھا۔ اس کا سر درمیان سے بالوں سے فارغ تھا۔ پتلے، نیلے نامہربان ہونٹ، تیکھی ناک اور اس کی پیشانی پر x سے ملتا جلتا ایک نشان تھا جو بڑا پراسرار تھا۔ برناڈر کو ہر کوئی ناپسند کرتا تھا اور اس کی بھی وجہ تھی۔ وہ بدہضمی کا مریض تھا اور کلاس روم میں بھی ہاضمے کی گولیاں کھاتا رہتا تھا۔ وہ ہر شاگرد کو اپنا ذاتی دشمن سمجھتا تھا۔ اس کی پیشانی پر زخم کا نشان مستقل طور پر اندازوں کا سبب بنا ہوا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ گستاف نے جوانی میں ڈوئل لڑا تھا جس میں اس کا مخالف پیش قبض سے اس کی پیشانی پر زخم لگانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ چند ماہ بعد اس کی تردید کر دی گئی۔ پھر یہ کہا جانے لگا کہ پیشانی کا زخم کسی ڈوئل کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ ناک کے آپریشن کی وجہ سے تھا جس میں پیشانی کا ایک حصہ بھی متاثر ہو گیا تھا۔ لڑکے استاد کی ناک کا بغور معائنہ کرتے رہتے۔ بعض تیز نگاہ لڑکوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ انہیں ٹانکے دکھائی دیتے تھے۔ پھر کچھ قانونی ذہن رکھنے والے بھی تھے۔ ان کا خیال تھا کہ زخم بچپن میں سڑھیوں سے گرنے کا نتیجہ ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ تشریح دور کی کوڑی لانے کے مترادف تھی۔ بڑی بات یہ تھی کہ برنانڈے کو بطور بچہ ذہن میں لانا ناممکنات میں سے تھا۔

سکول کے نگران اور چوکیدار کی بھی ہماری زندگیوں میں بڑی اہمیت تھی۔ اس کا نام انٹون تھا۔ وہ جرمن تھا۔ اس کی سفیدی مائل مونچھیں دو طرف سے بھری ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے پر کبھی پریشانی کے آثار دکھائی نہیں دیتے تھے۔ سکول کے بعد سکول کی دیکھ بھال اس کا روزمرہ کا کام تھا۔ لیکن یہ بھی ایک بڑا کام تھا۔ بہرحال اس کے ساتھ

دوستانہ تعلقات قائم رکھنا ضروری تھا۔لیکن میرے اوراس کے درمیان ایک سرد مہری چلتی رہی۔ وہ بھی میری زیادہ پرواہ نہیں کرتا تھا۔اصل بات یہ تھی۔ کہ میں کبھی اس کا مرہون منت نہیں ہوا تھا۔ میں ہمیشہ وقت پر سکول آتا تھا۔ میرا بستہ پورا ہوتا اور میرا سکول کا کارڈ ہمیشہ جیکٹ کی بائیں جیب میں ہوتا تھا۔لیکن بیسیوں لڑکے ہرروز اس کے رحم وکرم پر ہوتے تھے اور اسے ہر طرح خوش رکھنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ بہرحال وہ سینٹ پال سکول کے ستونوں میں سے ایک تھا۔گرمیوں کی تعطیلات کے بعد یہ سن کر ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اس نے غصے اور حسد کی حالت میں ایک دوسرے نگران کی اٹھارہ سالہ لڑکی کو گولی ماردی تھی اوراب وہ جیل کے اندر تھا۔

سکول کی باقاعدہ زندگی اور عام دکھوں کی ماری ہوئی زندگی میں مصائب اورغم اپنے سوراخ ڈالتے رہتے تھے۔ان کا درد کچھ زیادہ ہی محسوس ہوتا تھا۔جیسے خالی جگہ میں ہچکی زیادہ زور سنائی دیتی ہے۔

سینٹ پال چرچ کے ساتھ ایک یتیم خانہ منسلک تھا۔سکول کے صحن کے ایک حصہ پر اس کا تصرف تھا۔اس کے باسی نیلے پرانے کپڑوں میں ملبوس غمگین چہروں کے ساتھ صحن میں آتے، مایوسی کی حالت میں ادھر ادھر گھومتے رہتے اور پھر سر جھکائے زینے چڑھتے دکھائی دیتے۔اس حقیقت کے باوجود کہ صحن سکول کے لڑکوں اور یتیم خانے کے باسیوں کے لئے مشترکہ جگہ تھی، دودنیائیں واضح طور پر الگ الگ دکھائی دیتی تھیں۔ میں نے دو ایک دفعہ ان میں سے بعض لڑکوں سے بات کرنے کی کوشش کی مگر وہ غیر رضامندی کی حالت میں کوئی تسلی بخش جواب دیے بغیر جلدی سے صحن کے اپنے حصے کی طرف بھاگ گئے۔انہیں سختی سے منع کر دیا گیا تھا کہ وہ طلباء کے معاملات میں دخل نہ دیں۔ میں سات سال تک اس صحن میں کھیلتا رہا مگر ایک بھی یتیم لڑکے کا نام مجھے نہیں آتا تھا۔ نئے سال کے آغاز پر پاستر بنیادمین مقدس کتاب سے ان کے لئے دعائے خیر مانگا کرتا تھا۔

صحن میں یتیم خانے کے ساتھ جمنا سٹک کا سامان اور دوسرے کھیلوں کی چیزیں پڑی تھیں۔سکول میں داخلے کے تھوڑے دن بعد میں وہ کھیل دہرانا چاہتا تھا جو ایک یتیم

لڑکے نے میرے سامنے کھیلا تھا۔اس نے لوہے کی سلاخ پر چڑھ کر اپنے بدن کا 180 درجے کا زاویہ بنایا تھا اور پھر نیچے زمین پر چھلانگ لگا دی تھی۔ میں یہی کھیل دہرانا چاہتا تھا۔لیکن وقت پر اپنے ہاتھ چھوڑنے میں ناکام رہا اور میرا بدن سیڑھی سے جا کر لگا۔میری چھاتی پر چوٹ لگی اور مجھے سانس لینے میں دشواری پیش آنے لگی۔ میں زمین پر گرا ہوا اپنے گرد جمع لڑکوں کی ٹانگوں میں ایک زخمی کیڑے کی طرح تڑپ رہا تھا۔پھر میں بے ہوش ہو گیا۔اس کے بعد میں جمناسٹک میں زیادہ محتاط ہو گیا۔

میری زندگی یونہی بے مقصد گھومنے پھرنے اور کھیلوں وغیرہ کے لئے نہیں بنی تھی۔ جب میں چھٹیوں میں گاؤں جاتا یہ کمی وہاں پوری کر لیتا۔شہر میرے لئے تعلیم اور مطالعے کی جگہ تھی۔لڑکوں کا سڑکوں پر گھومنا مجھے سخت ناپسند تھا۔ان کے لئے جھگڑا مول لینے کی وجہ تلاش کرنا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔

جمنیزیم میں جن لڑکوں کے بٹن اور بیج چاندی کے ہوتے تھے انہیں ''ہیرنگ'' اور سکول میں تانبے کے بٹن والے لڑکوں کو ''کپرز'' کہا جاتا تھا۔ایک دن میں سکول سے گھر واپس آرہا تھا کہ راستے میں مجھے ایک لمبے قد والا جمنیزیم کا لڑکا مل گیا۔وہ مجھ سے بار بار پوچھ رہا تھا۔''کپرز'' بننے کے لئے کتنے پیسے دینے پڑتے ہیں؟'' میری طرف سے کوئی جواب نہ ملنے پر وہ مجھے کندھے پر کچوکے دینے لگتا۔''تم کیا چاہتے ہو؟'' میں نے اس سے بڑی نرمی سے پوچھا۔لڑکے کو میرا بولنا پسند نہ آیا۔چند لمحے رک کر اس نے پوچھا۔

''تمہارے پاس سلنگ شاٹ ہے؟''

''سلنگ شاٹ، وہ کیا ہوتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

لڑکے نے خاموشی سے اپنی جیب سے ایک چھوٹا سا آلہ نکالہ جس کے لمبے سرے پر ایک ربر اور سکہ لگا ہوا تھا۔ میں چھت پر بیٹھے کبوتروں کو اس سے شکار کرتا ہوں اور پھر بھون کر کھاتا ہوں۔'' اس نے کہا۔ میں حیرت سے اس نئے آشنا کی طرف دیکھنے لگا۔ اس قسم کا کام دلچسپی کا سبب تو ضرور تھا مگر شہر کے اندر قدرے بے ہودہ لگتا تھا۔

بہت سے لڑکے کشتی رانی کے لئے چلے جاتے تھے۔کئی سمندر کے باہر آئے ہوئے پانی میں مچھلیاں پکڑنے چلے جاتے تھے۔ مجھے یہ دونوں شوق نہیں تھے۔ عجیب بات تھی کہ سمندرے کنارے سات سال گزارنے کے باوجود میری زندگی میں سمندر کا کوئی دخل نہیں تھا۔اس سارے عرصے میں میں نے نہ تو کشتی رانی کی اور نہ ہی مچھلیاں پکڑنے کے لئے گیا۔سمندر سے میرا سامنا فقط اس وقت ہوتا جب میں گاؤں آیا جایا کرتا تھا۔ ایک سوموار کو جب کارل سن اپنی چھیلی ہوئی ناک کے ساتھ جس کی جلد میں سے خون رس رہا تھا، میرے پاس آیا اور ایک بڑی مچھلی پکڑنے کی شیخی بگھارنے لگا تو مجھے وہ بالکل اچھا نہ لگا۔ان دنوں میرے اندر کا شکاری ابھی تک بیدار نہیں ہوا تھا۔

ابتدائی جماعت میں کوسٹا۔آر سے میری بڑی دوستی ہوگئی۔ وہ ایک ڈاکٹر کا بیٹا تھا۔ وہ مجھ سے ایک سال چھوٹا تھا۔ قد بھی مجھ سے چھوٹا تھا۔آنکھیں چھوٹی چھوٹی۔ بظاہر بڑا خاموش دکھائی دیتا تھا مگر اندر سے بڑا چالاک تھا۔ وہ شہر سے بخوبی واقف تھا اور اس سلسلے میں مجھ سے بازی لے گیا تھا۔ پڑھائی میں کچھ ایسا اچھا نہیں تھا۔اس کے برعکس میں ہمیشہ بہت اچھے نمبر لیتا تھا۔کوسٹا گھر پر سوائے نئے دوستوں کا ذکر کرنے کے اور کچھ نہیں کرتا تھا۔اس کی ماں جو چھوٹے قد کی ایک خشک مزاج خاتون تھی، فینی سولو مونفنا کے پاس یہ درخواست لے کر آئی کہ اس کے بیٹے کو میرے ساتھ بیٹھ کر پڑھنے کی اجازت دی جائے۔ مجھ سے مشاورت کے بعد اسے اجازت مل گئی۔ تین سال تک ہم ایک ہی بنچ پر بیٹھے تھے۔ پھر وہ ایک سال فیل ہوگیا اور یوں ہم جدا ہو گئے۔ بہرحال بعد میں بھی ہمارے تعلقات قائم رہے۔

کوسٹا کی ایک بہن جمنیزیم میں تھی جو اس سے دو سال بڑی تھی۔ اس کی کئی سہیلیاں تھی۔ان کے بھائی بھی تھے۔لڑکیاں میوزک پڑھتی تھیں۔لڑکے ان کے گرد چکر لگاتے رہتے تھے۔ سالگرہ کے موقع پر والدین مہمانوں کو مدعو کرتے تھے۔ایسے مواقع پر رفاقتوں اور رقابتوں کی ایک چھوٹی سی دنیا آباد ہوجاتی تھی۔اس چھوٹی سی دنیا کا مرکز نگاہ ایک امیر سوداگر کا کنبہ ہوتا تھا۔ یہ کنبہ بھی اسی عمارت میں رہتا تھا جہاں کوسٹا

رہتا تھا۔ تمام اپارٹمنٹ کی بالکونیاں ایک ہی سمت صحن میں کھلتی تھیں۔ انہیں بالکونیوں میں ہر قسم کی ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ سوداگر کے گھر کا ماحول اس ماحول سے بالکل جدا تھا جس میں میں رہتا تھا۔ اس گھر میں لڑکے اور لڑکیاں گھر کی مالکہ کی زیر پرستی عشق و محبت اور فلرٹ کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ گفتگو کے دوران میں پتہ چل جاتا تھا۔ کہ کون کس میں دلچسپی لے رہا تھا۔ مجھے ایسے معاملات میں کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اسے میری خود پرستی بھی کہا جا سکتا ہے۔ ایک دن گھر کی مالک کی چودہ سالہ لڑکی نے مجھ سے کہا۔

''جب تم کسی سے محبت کرنے لگو تو مجھے بتا دینا۔''

''میں تم سے وعدہ کرتا ہوں۔ مگر ابھی اس قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔'' میں ایک ایسے آدمی کے فخر کے ساتھ جواب دیتا جسے اپنی قدر و قیمت معلوم ہو۔ اس وقت میں دوسرے گریڈ میں پہنچ چکا تھا۔ چند ہفتوں بعد لڑکیوں نے اجتماعی طور پر گانے کا ایک شو سٹیج کیا۔ ایک گانے میں رات کا پس منظر دکھایا گیا تھا۔ ایک بڑی شال پر ستارے ٹانکے گئے تھے اور گھر کی چھوٹی بیٹی گانے کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

''دیکھو وہ کتنی خوبصورت لگ رہی ہے۔'' بڑی بہن نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ میں نے اس سے اتفاق کیا اور اسی وقت اپنے دل سے ایک وعدہ کر لیا۔ پھر یہ وعدہ پورا کرنے کا وقت آ گیا۔ بڑی بہن مجھ سے پوچھنے لگی۔ ''مجھے نہیں بتاؤ گے؟''

''ضرور بتاؤں گا۔'' میں نے آنکھیں جھکا کر جواب دیا۔

''کون ہے وہ؟''

میری زبان ہل نہیں رہی تھی۔ اس نے کہا کہ میں اس لڑکی کے نام کا پہلا حرف ہی اسے بتا دوں۔ بات میرے لئے قدرے آسان ہو گئی۔ بڑی بہن کا نام انا تھا اور چھوٹی کا بر تھا۔ میں نے اس کے نام کا پہلا حرف بنانے کی بجائے دوسرا حرف بتایا۔

''بی؟'' اس نے قدرے مایوسی سے کہا اور یہیں گفتگو ختم ہو گئی۔

دوسرے دن میں کوسٹا کے گھر پڑھائی کے لئے جا رہا تھا اور تیسری منزل کے طویل

برآمدے میں سے گزر رہا تھا۔ میں نے پہلے ہی سیڑھیوں میں سے دیکھ لیا تھا کہ دونوں بہنیں اپنی ماں کے ساتھ بالکونی میں بیٹھی ہوئی تھی۔ جب میں ان سے ذرا سے فاصلے پر رہ گیا تو مجھے محسوس ہوا کہ ماں اور بیٹیاں مجھے تیز اور سوئی جیسی نظروں سے گھور رہی تھیں۔ان میں ایک طنز بھی تھا۔ چھوٹی بہن نے مجھے دیکھ کر آنکھیں دوسری طرف کر لیں جن میں ایک بڑا روکھا پن اور بیگانگی تھی۔ مجھے ایک دم محسوس ہو گیا کہ میں دھوکے میں تھا۔ ماں اور بڑی بیٹی نے مجھ سے یوں ہاتھ ملائے جیسے کہہ رہی ہوں۔''بطخے کی اولاد، تمہاری سنجیدگی کی تہہ کیا ہے، ہمیں معلوم ہو گیا ہے''۔ چھوٹی بہن نے میری طرف دیکھے بغیر بڑی لاوپرا ہی سے اپنا گتے جیسا سرد ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ان کی تیز نگاہوں کی زد میں میں نے ابھی مزید تھوڑا آگے جانا تھا۔ میں ان کی نظروں کے قاتل تیر اپنی پیٹھ میں پیوست ہوتے ہوئے محسوس کرتا رہا۔اس دھوکے کے بعد میں نے اس دغا باز گروہ سے مکمل طور پر اپنے تعلقات ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اب کبھی ان کے گھر نہیں جاؤں گا، انہیں بھول جاؤں گا، اور ہمیشہ کے لئے دل سے نکال دوں گا۔اس سلسلے میں بعد میں آنے والی چھٹیوں نے میری بڑی مدد کی۔

غیر متوقع طور مجھے ایک دم محسوس ہونے لگا کہ میری نزدیک کی نظر کمزور تھی۔ مجھے آنکھ کے ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا جس نے مجھے چشمہ لگا دیا۔اس سے میری شان میں کوئی کسر نہ آئی بلکہ میں خود کو زیادہ اہم محسوس کرنے لگا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا۔ کہ جب میں پہلی دفعہ عینک کے ساتھ اپنے گاؤں جاؤں گا تو میری توقیر میں اضافہ ہو گا۔لیکن میری عینک سے میری باپ کو بڑا صدمہ ہوا۔اس کا خیال تھا کہ میں نے محض دکھاوے اور ظاہرداری کے لئے عینک لگائی تھی۔اس نے کہا کہ میں اسے فوراً اتار دوں۔ میں نے اسے بتایا کہ اس کے بغیر میں لکھ پڑھ نہیں سکتا تھا اور نہ ہی بلیک بورڈ دیکھ سکتا تھا مگر میری دلیل بے سود ثابت ہوئی۔ یانوفکا میں میں چوری چھپے عینک لگاتا رہا۔

میں دیہی علاقے میں خوب گھومتا پھرتا تھا اور زیادہ جرات کا مظاہرہ کرتا تھا۔ یہاں آکر میں شہر کا ڈسپلن بھلا دیتا تھا۔ میں اکیلا ہی گھوڑے پر سوار ہو کر بوبرینٹز چلا

جاتا اور شام کو واپس آجاتا تھا۔ یہ کوئی پچاس کلومیٹر کا سفر ہوتا تھا۔ بوبرینٹز میں میں اپنی عینک کا بڑھا چڑھا کر مظاہرہ کرتا اور جس طرح لوگ اس سے متاثر ہوتے اس بارے میں مجھے کوئی شک نہیں تھا۔ بوبرینٹز میں لڑکوں کا ایک ہی میونسپل سکول تھا۔ نزدیک ترین جمنیزیم الزورٹ گراڈ میں تھا جو یانوفکا سے پچاس کلومیٹر تھا۔ بوبرینٹز میں لڑکیوں کا ایک ہائی سکول تھا۔ لڑکیاں لڑکوں سے سکول سے اپنے دوست تلاش کرتی تھیں۔ گرمیوں میں صورتحال مختلف ہوتی تھی۔ الزورٹ گراڈ سے ہائی سکول کے لڑکے اپنی بہترین یونیفارموں اور شائستگی کے ساتھ واپس آجاتے تھے جس سے میونسپل سکول کے لڑکے پس منظر میں چلے جاتے تھے۔ اس سے تلخی پیدا ہو جاتی تھی۔ بوبرینٹز کے سکول کے لڑکے ہتک محسوس کرتے ہوئے غصے میں آجاتے اور وہ اپنا ایک لڑاکا گروہ بنا لیتے۔ پھر چھڑیاں اور پتھر چلنے لگتے۔ بعض اوقات چاقو چلنے کی نوبت بھی آجاتی۔ ایک دن میں ایک دوست کے باغ شہتوت کے درخت پر بیٹھا مزے سے شہتوت کھا رہا تھا کہ ایک پتھر باغ کی باڑھ کے پیچھے سے آکر میرے سر میں لگ گیا۔ یہ اس جنگ کا ایک چھوٹا سا واقعہ تھا۔ جب لڑکے سکولوں میں واپس چلے جاتے تو یہ جنگ بھی ختم ہو جاتی۔ الزورٹ گراڈ میں صورتحال دوسری تھی۔ وہاں ہائی سکول کے طلباء لڑکوں اور دلوں پر ایک جیسی حکومت کرتے تھے۔ لیکن گرمیوں میں خرکوف اور دوسرے دور دراز شہروں سے یونیورسٹی کے طلباء آجاتے اور وہ سکول کے لڑکوں کو پس منظر میں دھکیل دیتے۔ یہاں جنگ بڑی سخت ہوتی اور لڑکیوں کی دغابازی ناقابل بیان ہوتی تھی۔ اس جنگ کی ایک خوبی یہ تھی کہ اس میں اخلاقی اقدار کا خیال رکھا جاتا تھا۔

گاؤں میں میں دیہاتی کھیل کھیلتا رہتا اور لڑکیوں سے بدتمیزی سے پیش آتا۔ یہیں میں نے ایوان وسیلائی وچ کی خود ساختہ سائیکل چلانی سیکھی تھی۔ اسی کی بدولت میں اوڈیسہ جانے والی سڑک پر سائیکل چلانے کی جرات کرنے لگا تھا۔ گاؤں میں میں نے گھوڑوں سے چلنے والی دو پہیہ گاڑی کو چلانے میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ اس وقت تک یانوفکا میں بہترین گھوڑے آچکے تھے۔ میں نے اپنے چچا براڈسکی کو جو بیئر

پھینک دو گے؟''اس نے پوچھا۔ وہ اس مہم میں میرا ساتھ دینے کو بالکل تیار نہیں تھا۔

''آپ نے ایسا سوچا ہی کیوں؟'' میں نے ہتک محسوس کرتے ہوئے جواب دیا۔

وہ چپ چاپ دم سادھ کر میرے پیچھے بیٹھ گیا۔ میں نے گاڑی کو گھاٹی میں سے نکالا، پھر چکی کے پاس سے گزرتا ہوا گرمیوں کی بارش سے دھلی ہوئی سڑک پر لے آیا۔ منہ زور گھوڑا سڑک دیکھ کر بھاگنا چاہتا تھا۔ مگر پہاڑ کی چڑھائی کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ ایک دم غصے میں آ گیا اور گاڑی سے باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں گاڑی کے تختے پر پاؤں جما کر پوری طاقت سے باگیں کھینچنے لگا اور اس قدر اونچا اٹھ گیا کہ میرا چچا یہ دیکھ سکے کہ میں بگوں کے ساتھ معلق ہو کر رہ گیا تھا۔ لیکن گھوڑا ابھی کوئی فیصلہ کر چکا تھا۔ وہ مجھ سے تین گنا چھوٹا تھا۔ یعنی چار سال کا تھا۔ غصے میں آ کر وہ گاڑی کو پہاڑی پر اس طرح کھینچ رہا تھا جیسے کوئی بلی اپنی دم سے بندھے ٹین کے ڈبے کو چھڑانے کی کوشش میں ہو۔ چچا نے تمباکو نوشی بند کر دی۔ اس کا سانس تیزی سے چل رہا تھا اور وہ مجھے ڈانٹنے والا تھا۔ میں سیٹ پر مضبوطی سے بیٹھ گیا اور گھوڑے کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دیں مجھ میں یک دم ایک اعتماد آ گیا۔ میری زبان جو تالو سے چپک گئی تھی، اب آزاد ہو گئی تھی۔ میں گھوڑے سے کہہ رہا تھا۔ بچے، اب اپنی حرکتیں چھوڑ دو۔'' جب وہ بھاگنے کی کوشش کرتا تو میں بڑے دوستانہ انداز میں اس کی سرزنش کرتا۔ اب میں نے اپنے بازو زیادہ آرام دہ طریقے سے پھیلا دیے تھے اور محسوس کیا کہ چچا بھی خود کو پرسکون پا کر دوبارہ سگریٹ پینے لگا تھا۔ میں نے بازی جیت لی تھی اگرچہ میرا دل گھوڑے کے ہانپنے کی آواز کی طرح دھڑک رہا تھا۔

شہر آ کر میں دوبارہ ڈسپلن کی جوت میں جت گیا۔ مجھے اس میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ ورزش اور کھیل کی جگہ کتابوں نے لے لی۔ کبھی کبھی تھیٹر دیکھنے چلا جاتا تھا۔ میں شہر میں رہ تو رہا تھا۔ مگر اس سے میرا تعلق قائم نہیں ہو رہا تھا۔ اس کی زندگی میرے قریب سے ہو کر گزر رہی تھی۔ میرے ساتھ ہی ایسا نہیں تھا بلکہ بڑے بھی کھڑکیوں سے اپنا سر زیادہ باہر نکالنے کی جرات نہیں کرتے تھے۔ روس کی پولیس ریاست میں اوڈیسہ سب

سے زیادہ ''پولیس زدہ'' شہر تھا۔ شہر کا گورنر سابق ایڈمرل زیلونی دوئم تھا۔ وہ بے لچک طاقت کے ساتھ حکومت کر رہا تھا۔ اوڈیسہ کے باشندے اس کے متعلق ان گنت کہانیاں سرگوشیوں میں کرتے رہتے تھے۔ انہیں دنوں ملک سے باہر اس کے بہادرانہ کارناموں کے بارے میں ایک کتاب شائع ہوئی تھی۔ میں نے اسے ایک دفعہ دیکھا تھا۔ وہ بھی اس کی پشت سے - میرے لئے یہ کافی تھا۔ گورنر اپنی گاڑی میں بالکل سیدھا کھڑا تھا اور سڑک پر مٹھی ہلا ہلا کر کسی کو لعن طعن کر رہا تھا۔ پولیس والے دم سادھے کھڑے تھے اور لوگ کھڑکیوں میں سے خوف زدہ چہروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ میں نے اپنا بستہ سنبھالا اور تیز قدموں چل پڑا۔

جب کبھی میں اپنی نوجوانی کے ابتدائی برسوں کی سرکاری روس کی تصویر اپنے ذہن میں لاتا ہوں تو مجھے گورنر کی پشت دکھائی دیتی ہے۔ وہ ہوا میں اپنی مٹھی لہراتا نظر آتا ہے اور حلق پھاڑ کر ایسے الفاظ میں لعن طعن کر رہا ہوتا ہے جو کسی لغت میں عام طور پر نہیں ملتے۔

کتابیں اور ابتدائی تصادم

سکول کے زمانے ہی میں نہیں بلکہ جوانی کے سارے عہد میں افراد اور فطرت کے بجائے کتابیں اور خیالات میرے لئے زیادہ اہم تھے۔ دیہاتی پس منظر ہونے کے باوجود فطرت سے مجھے زیادہ لگاؤ نہیں تھا۔ اس سے مجھے دلچسپی بعد کے برسوں میں پیدا ہوئی جب میرا بچپن اور جوانی پیچھے رہ گئے تھے۔ بہت عرصے تک لوگ میرے ذہن سے دھندلے سایوں کی طرح گزرتے رہے۔ میں کتابوں اور اپنی ذات میں گم رہا۔ یہیں سے میں خود کو اور اپنے مستقبل کو تلاش کرتا رہا۔

میری پڑھائی کا آغاز 1887 میں موسی فیلیو وچ کے یانوفکا آنے سے ہوا۔ وہ اپنے ساتھ بہت سی کتابیں لایا تھا جن میں ٹالسٹائی کی تحریریں بھی تھیں۔ شروع میں مطالعہ خوش کے بجائے ایک کام لگتا تھا۔ ہر کتاب اپنے ساتھ نئی رکاوٹیں لائی تھی۔ نامانوس الفاظ، سمجھ سے باہر انسانی تعلقات، ابہام اور غیر مستقل مزاجی جو خوابوں اور حقیقت کو ایک دوسرے سے الگ کرتے ہیں۔ اس وقت فوری طور پر میرے

سوالوں کا جواب دینے والا کوئی نہیں تھا۔ لہٰذا میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کوئی کتاب پڑھنے لگتا، پھر اسے چھوڑ دیتا اور تھوڑی دیر بعد دوبارہ پڑھنا شروع کر دیتا۔ علم حاصل کرنے کی ایک غیر یقینی سی خوشی تو ضرور حاصل ہوئی مگر اس کے ساتھ کوئی نامعلوم سا خوف بھی لگا رہتا۔ ممکن ہے کہ کسی کو میرے اس زمانے کے مطالعے کا تجربہ پسند آ جائے۔ میں رات کو گاڑی لے کر میدانوں میں نکل جاتا۔ ایک دوسرے کے پاس سے گزرتی ہوئی گاڑیوں کے پہیوں کی آوازیں، سڑک کے کنارے رات کی تاریکی میں بھڑکتی ہوئی آگ، ہر چیز مانوس نظر آتی مگر اس کے معانی سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ کیا ہو رہا ہے؟ کون قریب سے گزر رہا ہے اور کیا لے جا رہا ہے؟ اپنے آپ پر بھی شک گزرتا۔ آگے کی سمت جا رہا ہوں یا پیچھے کو؟ کچھ بھی واضح نہیں۔ اور چچا گریگری جیسا کوئی دوسرا نہیں ہے جو اشیا کی وضاحت کر سکے اور بتائے۔ ''یہ گاڑی بان ہیں اور گندم لے کر جا رہے ہیں۔''

اوڈیسہ میں کتابوں کے انتخاب کا دائرہ بڑا وسیع تھا۔ اس کے ساتھ راہنمائی کرنے والے بہت تھے۔ میں بڑے اشتیاق سے کتابوں کو ہڑپ کر جاتا اور پھر سیر کرنے باہر چلا جاتا۔ سیر کے دوران میں نے جو کچھ پڑھا ہوتا اسے ذہن میں دہراتا چلا جاتا اور جلدی سے گھر واپس آ کر دوبارہ مطالعے میں مصروف ہو جاتا۔ شام کے وقت سونے سے پہلے میں درخواست کیا کرتا تھا کہ کتاب کا کوئی دوسرا باب ختم کرنے کے لئے مجھے ایک گھنٹہ یا پانچ منٹ مزید دے دیے جائیں۔ اس قسم کی درخواست کے بغیر شاید ہی کوئی شام گزرتی تھی۔

دیکھنے، جاننے اور اسے اپنے اندر جذب کرنے کی تازہ تازہ بھوک کی تشفی شائع شدہ مواد سے ہوتی تھی۔ جیسے کوئی بچہ پیالی کو اپنے ہونٹوں سے لگانے کی کوشش کرتا ہے۔ میری بعد کی زندگی میں جو کچھ بھی ہوا، وہ دلچسپ تھا یا سنسنی خیز خوش گوار تھا یا غمگین، وہ میرے مطالعے کے تجربات میں پہلے ہی نمودار ہو چکا تھا۔ جیسے پنسل سے بنا کوئی خاکہ یا واٹر کلر سے بنائی ہوئی کوئی دھندلی سی تصویر۔

اوڈیسہ میں قیام کے پہلے سال کے دوران میں شاموں کو ہوم ورک ختم کرنے کے بعد اور بستر میں لیٹنے سے پہلے، بلند آواز میں کوئی کتاب پڑھتا میری خوشی کا سب سے بڑا وقت ہوتا تھا۔

موسی فیلیپووچ عام طور پر پشکن یا نکراسوف پڑھا کرتا تھا۔ ان دونوں میں سے وہ نکراسوف کو ترجیح دیتا تھا لیکن مقررہ وقت پر فینی سولومونفنا کی آواز آتی ''لیوا، سونے کا وقت ہو گیا ہے''۔ میں اسے ملتجی

نگاہوں سے دیکھنے لگتا۔ ''میرے بچے اب سونے کا وقت ہے۔'' وہ دوبارہ کہتی۔

''بس پانچ منٹ اور۔'' میں التجا کرتا۔ مجھے پانچ منٹ دے دیے جاتے۔ پھر میں کتابوں کو چوم کر اس احساس کے ساتھ بستر پر لیٹ جاتا کہ انہیں پڑھنے کی آواز مجھے ساری رات آتی رہے گی۔ مگر ہوتا یہ تھا کہ سرہانے پر سر رکھتے ہی میں خواب خرگوش کے مزے لینے لگتا تھا۔

سکول کی آخری جماعت کی ایک لڑکی جس کا نام صوفیہ تھا اور جو میری دور کی رشتہ دار تھی، چند ہفتوں کے لئے فیلیپووچ کنبے کے ہاں ٹھہرنے کے لئے آئی۔ وجہ یہ تھی کہ اس کے گھر والے سرخ بخار میں مبتلا ہو گئے تھے۔ وہ بڑی قابل اور پڑھی لکھی لڑکی تھی مگر انفرادیت اور کردار کے فقدان کے باعث وہ جلد ہی میری مرید ہو گئی۔ میں بھی اس کا زبردست مداح تھا۔ مجھے ہر روز اس میں کوئی نہ کوئی نئی خوبی نظر آتی۔ وہ علم کا خزانہ تھی۔ اس کے مقابلے میں میری اپنی آنکھوں میں کوئی حیثیت نہیں رہی تھی۔ میں اس کے امتحان کے پروگرام کی نقل کر کے اور کئی دوسرے طریقوں سے اس کی مدد کرتا رہتا۔ اس کے عوض جب رات کو کھانے کے بعد بڑے سونے کو چلے جاتے تو وہ مجھے بلند آواز میں کتاب پڑھ کر سناتی پھر ہم دونوں نے ایک طنزیہ نظم لکھنی شروع کر دی۔ نظم کا نام تھا ''چاند کی طرف سفر'' اس کام میں بھی میں پیچھے رہ جاتا تھا۔ جونہی میں میں اسے کوئی خیال بتاتا، اس کے ذہن میں خیالات کا انبار لگ جاتا۔ وہ نظم لکھتی چلی جاتی اور اس کی دھن بھی بناتی جاتی۔ اس وقت میں خود کو بڑا کمتر محسوس کرنے لگتا۔ جب چھ ہفتوں بعد صوفیہ اپنے گھر چلی گئی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں پہلے سے زیادہ عمر کا ہو گیا تھا۔

فیملی کے پرانے دوستوں میں سے ایک سرگئی ایوانووچ سائی شبوسکی تھا جو ایک کہنہ مشق صحافی اور رومانی طبعیت کا آدمی تھا وہ جنوبی روس میں شکسپیئر پر حتمی رائے سمجھا جاتا تھا۔ وہ نہایت ذہین آدمی تھا مگر شراب کی لت میں بری طرح گرفتار تھا۔ اس کمزوری کے سبب وہ لوگوں حتیٰ کہ بچوں کو بھی ایک احساس گناہ کے ساتھ دیکھتا تھا۔ وہ فینی سولومونفنا کو چھوٹی عمر سے ہی جانتا تھا اور اسے ''فینی فشکا'' کہہ کر پکارتا تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں سرگئی ایوانووچ میری طرف مائل ہو گیا۔ یہ پوچھنے کے بعد کہ میں سکول میں کیا پڑھتا تھا۔ اس نے مجھے پشکن کے مضمون ''شاعر اور کتاب فروش'' کا موازنہ نکراسوف کے مضمون ''شاعر اور شہری'' سے کرنے کو کہا۔ میرا سانس خشک ہو گیا۔ میں نے موخرالذکر ادیب کی کوئی کتاب نہیں پڑھی تھی۔ زیادہ خوف مجھے اس بات سے آ رہا تھا کہ وہ خود ادیب تھا۔ لفظ ''ادیب'' سن کر مجھے یوں لگتا تھا جیسے

کوئی شخص کسی نا قابل رسائی جگہ پر بیٹھا ہو۔

''ہم ابھی اسے پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔'' سرگئی ایوانووچ نے کہا اور نکراسوف کو زبانی پڑھنا شروع کر دیا۔ وہ کمال روانی سے پڑھ رہا تھا۔ ''تمہیں سمجھ نہیں آ رہی ہے؟ اب یہ سب کچھ اپنے مضمون میں ڈال دو''۔ مجھے مطالعے کے کمرے میں بیٹھا دیا گیا اور پشکن اور نکراسوف کی کتابیں میرے حوالے کر دی گئیں۔

''مجھ سے یہ کام نہیں ہوگا۔'' میں نے فینی سولومونفنا کے کان میں غم بھرے لہجے میں سرگوشی کی۔

''میں یہاں کیا لکھوں؟''

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' اس نے میر سر کو تھپتھپاتے ہوئے جواب دیا۔ ''تمہاری سمجھ میں جو کچھ آتا ہے لکھ دو۔ اور بس''

ہاتھ کی طرح اس کی آواز بھی نرم تھی۔ میں قدر سنبھل گیا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ میں اپنے لکھنے کی صلاحیت پر قابو پا کر لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ ایک گھنٹے کے بعد مجھے کاغذ دکھانے کے لئے کہا گیا۔ میں نے ایک بڑا کاغذ سرگئی کے حوالے کر دیا۔ ایسا کرتے وقت میں سر سے پاؤں تک لرز رہا تھا حالانکہ سکول میں کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ سرگئی نے خاموشی سے چند سطریں پڑھنے کے بعد اپنی چمکتی ہوئی آنکھیں میری طرف پھیریں اور بلند آواز میں بولا۔ ''ذرا سنیں اس نے کیا لکھا ہے۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ بڑا ذہین لڑکا ہے'' پھر اس نے پڑھنا شروع کر دیا۔ ''شاعر اپنی محبوبہ فطرت میں رہتا تھا جس کی خوشی اور غم کی ہر آواز شاعر کے دل میں گونجتی تھی۔'' یہ لفظ میرے ذہن پر اس طرح نقش ہو گئے کہ مجھے آج تک یاد ہیں۔''

رات کے کھانے پر سرگئی ایوانووچ لطیفے سناتا رہتا۔ ماضی کی یادوں میں کھویا رہتا، پر لطف کہانیاں سناتا رہتا، واڈکا کا گلاس چڑھاتے ہوئے اس کا حافظہ تیز ہو جاتا۔ وہ گاہے گاہے میز کی دوسری طرف مجھے دیکھ کر کہتا۔ ''تم نے اتنا اچھا لکھنا کہاں سے سیکھا تھا؟ واقعی تم ایک بوسے کے مستحق ہو۔'' پھر وہ رومال سے اپنی مونچھیں احتیاط سے صاف کرتے ہوئے ڈگمگاتے قدموں سے میز کے گرد چکر لگا کر میری طرف آ جاتا۔ میں یوں بیٹھا ہوتا جیسے کسی بھاری ضرب کا منتظر تھا۔

''لیوا تم خود اٹھ کر انہیں ملو''۔ موسی فیلپووچ میرے کان میں کہتا۔ کھانے کے بعد سرگئی ایوانووچ

اپنے حافظے کی مدد سے ''پوپوف کا خواب'' سنانا شروع کر دیتا۔ میں غور سے اس کی سفید مونچھوں کی طرف دیکھتا رہتا جن کے نیچے سے عجیب وغریب لفظ نکلتے رہتے تھے۔ نشے کی حالت میری نظر میں اس کی عزت کم نہیں کرتی تھی۔ بچوں کے پاس بڑی زبردست تجریدی قوت ہوتی ہے۔

شام کو اندھیرا پھیلنے سے پہلے میں موسی فیلپووچ کے ساتھ سیر کرنے کے لئے چلا جاتا۔ جب وہ اچھے موڈ میں ہوتا تو ہم ہر قسم کی باتیں کرتے رہتے۔ ایک موقع پر اس نے مجھے اوپرا ''فاسٹ'' کی کہانی سنائی جو اسے بہت پسند تھی۔ میں جس توجہ اور انہماک سے کہانی سن رہا تھا، مجھے امید تھی کہ ایک دن یہ اوپرا اسٹیج پر ضرور دیکھوں گا۔ اس کے لہجے کی تبدیلی سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ کہانی کسی نازک موڑ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میں اس کی پریشانی سے خود پریشان ہو رہا تھا اور ڈر رہا تھا کہ شاید کہانی کا انجام نہ سن سکوں۔ لیکن موسی فیلپووچ نے خود کو جمع کیا اور کہانی جاری رکھی۔ ''اور پھر شادی سے پہلے گریچن کے ہاں ایک بچہ پیدا ہو گیا'' اس مقام سے گزرنے کے بعد ہم دونوں نے سکھ کا سانس لیا۔ اس کے بعد کہانی کا انجام بخیر ہو گیا۔

گلے کی خرابی کی وجہ سے میں گلے پر پٹی باندھے بستر پر لیٹا تھا۔ مجھے پڑھنے کے لئے ڈکنز کا ناول ''آلیور ٹوسٹ'' دیا گیا۔ نرسنگ ہوم میں ان عورتوں کے بارے میں ڈاکٹر کی باتوں نے مجھے بے حد پریشان کر دیا جن کے پاس شادی کی انگوٹھی نہیں ہوتی۔

''اس کا کیا مطلب؟'' میں نے موسی فیلپووچ سے پوچھا۔ ''شادی کی انگوٹھی کا اس سے کیا تعلق ہے؟''

''اوہ'' اس نے ذرا رک کر جواب دیا۔ ''سیدھی بات ہے''۔ جب لوگوں کی شادی نہیں ہوتی تو وہ شادی کی انگوٹھی نہیں پہنتے۔''

میں گریچن کو یاد کرنے لگا۔ ایک انگوٹھی سے آلیور ٹوسٹ کی تقدیر کی تبدیلی میرے خیالات میں گھومنے لگی۔ انگوٹھی جس کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ کتابوں کے مطالعے سے انسانی تعلقات کی ممنوعہ دنیا میرے شعور میں ایک دم ابھر آئی۔ اور جو باتیں میں عام طور پر سنا کرتا تھا۔ اب ادب کے ذریعے ان سے زیادہ آشنا ہو رہا تھا۔ مگر ایک بلند سطح پر۔

ان دنوں ٹالسٹائی کا ڈرامہ ''اندھیرے کی طاقت'' نے عوام میں ایک ہلچل پیدا کر دی تھی۔ یہ ہر

کہیں زیرِ بحث تھا مگر کسی واضح نتیجے پر پہنچے بغیر۔ یوبیدونوشیف زار الیگزانڈر سوم کو ترغیب دلا کر اس ڈرامے کو بند کرانے میں کامیاب ہوگیا۔ میں جانتا تھا کہ موسی فیلیو وچ اور فینی سونومونفنا میرے کمرے سے ملحقہ کمرے میں ڈرامہ چھپ کر پڑھا کرتے تھے۔ مجھے ان کی سرگوشیاں سنائی دیتی رہتیں۔

''میں اسے پڑھ سکتا ہوں؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں پیارے، تم ابھی بہت چھوٹے ہو'' انہوں نے جواب دیا۔ جواب اس قدر قطعی تھا کہ میں نے بحث کی ضرورت محسوس نہ کی۔ پھر یہ ڈرامہ کتابوں کی الماری میں رکھ دیا گیا۔ مگر موقع ملتے ہی میں نے وہاں سے نکال کر جلدی سے قسطوں میں پڑھ ڈالا۔ اس ڈرامے نے مجھے کوئی خاص متاثر نہ کیا ڈرامے کے سب سے زیادہ المیہ مناظر جیسا کہ بچے کو رسی سے لٹکا کر مار دینا ہڈیوں کو توڑنے کے متعلق گفتگو کسی بڑی حقیقت کی بجائے ادبی ایجادات کے طور پر قبول کیے گئے۔ انہیں سٹیج کی چالاکی بھی سمجھا گیا۔ دوسرے لفظوں میں میں انہیں سمجھنے میں ناکام رہا۔

تعطیلات کے دوران جب میں گاؤں میں تھا تو ایک دن کتابوں والی الماری دیکھ رہا تھا۔ اس میں مجھے ایک ایسا کتابچہ مل گیا جو میرا بڑا بھائی الزارٹ گراڈ سے لایا تھا۔ میں نے اسے کھولا تو مجھے ایک دم یوں لگا جیسے وہ کوئی غیر معمولی اور خفیہ چیز تھی۔ یہ قتل کے ایک مقدمے کی عدالتی کاروائی تھی جس میں ایک بچی کو جنسی جرم کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ کتاب پڑھی تو وہ میڈیکل اور قانونی تفصیلات سے بھری ہوئی تھی۔ کتاب پڑھتے وقت مجھے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے میں رات کے وقت گرتا پڑتا، پتھروں سے ٹھوکریں کھاتا کسی جنگل میں سے گزر رہا تھا اور مجھے راستہ نہیں مل رہا تھا۔

میں پہلی بار تھیٹر اس وقت گیا جب میں سکول کی ابتدائی کلاس میں تھا۔ یہ ایک یوکرائنی ڈرامہ تھا اور میرے ساتھ سکول کا چوکیدار گریگری خولود تھا۔ میں خوف کا مارا ایک زرد کاغذ بنا بیٹھا رہا۔ یہی حال گریگری کا تھا۔ یہ ایک ایسی خوشی تھی جو میری برداشت سے باہر تھی۔ وقفے کے دوران میں بھی اپنی سیٹ سے نہ اٹھا مبادا کوئی کوئی سین دیکھے بغیر گزر جائے۔ ڈرامے ایک مزاحیہ سین پر ختم ہوگیا۔ اور ڈرامے کا تناؤ قہقہوں میں بدل گیا۔ ڈرامے کے دوران میرا سر پیچھے کی طرف چلا جاتا۔ پھر میں جلدی سے آنکھیں سٹیج پر لگا لیتا۔ گھر آکر میں نے ڈرامے کی کہانی اپنی طرف سے نمک مرچ لگا کر بڑے مزے سے سنائی اور اپنے قہقہوں کے تجربے میں دوسروں کو شامل کرنے کی کوشش میں لگا رہا۔ مجھے یہ جان کر بڑی مایوسی ہوئی کہ میری یہ

کوشش کامیاب ثابت نہیں ہوئی تھی۔ ''یوں لگتا ہے تمہیں نذرسٹوڈ لیا بالکل پسند نہیں آیا۔'' موسیٰ فیلیپو وچ نے پوچھا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ ملامت کر رہا تھا۔ ''نہیں اس کی اداکاری تو بہت عمدہ تھی۔'' میں نے نذر کے المیہ کردار کو دھیان میں لاتے ہوئے جواب دیا۔

تیسرے گریڈ میں جانے سے پہلے میں کچھ عرصہ کے لئے اپنے انجینئر چچا کے گھر اس کے گرمیوں کے مکان میں اوڈیسہ سے باہر چلا گیا۔ وہاں میں نے ایک شوقیہ تھیٹر دیکھا جس میں ہمارے سکول کے ایک لڑکے کروگ لاکوف نے ایک ملازم کا کردار ادا کیا تھا۔ کروگ لاکوف کی آنکھیں بڑی ذہین مگر صحت بڑی کمزور تھی۔ میں اس کا بڑا گرویدہ ہو گیا اور اس سے درخواست کی کہ وہ مجھے بھی کسی ڈرامے میں کوئی پارٹ دلوائے۔ ہم نے پشکن کا ڈرامہ ''حبشی سردار'' منتخب کیا۔ میں نے اس میں بیٹے کا کردار کرنا تھا اور کرگ لاکوف نے باپ کا۔ میں اس کی غیر مشروط راہنمائی میں دن رات ڈرامے کی سطریں یاد کرتا رہا۔ یہ کسی قدر ولولہ انگیز لمحات تھے۔ لیکن جلد ہی سب کچھ برباد ہو گیا۔ کرگ لاکوف کے والدین نے صحت کی خرابی کی وجہ سے اسے ڈرامے میں حصہ لینے سے روک دیا۔ سکول کھلنے پر وہ فقط پہلے چند ہفتے کلاس میں آیا۔ سکول کے بعد میں اسے پکڑنے کی کوشش کرتا رہا تاکہ راستے میں ہم ادبی گفتگو کرتے جائیں۔ پھر وہ بالکل غائب ہو گیا۔ پتا چلا کہ وہ بیمار تھا۔ چند ماہ بعد معلوم ہوا کہ وہ تپ دق سے فوت ہو گیا تھا۔

تھیٹر کا جادو چند سال تک میرے سر پر چڑھ کر بولتا رہا۔ میں اطالوی اوپیرا کا شوقین ہو گیا جو اوڈیسہ میں بڑا مقبول تھا۔ چھٹے گریڈ میں تھیٹر دیکھنے کے لئے پیسہ حاصل کرنے کی خاطر میں ٹیوشن بھی پڑھاتا رہا۔ چند ماہ تک سٹیج کی اداکارہ گوسی پنیا یگٹ سے خفیہ طور پر دل ہی دل میں محبت بھی کرتا رہا۔ وہ میرے نزدیک ایک ایسی حور تھی جو آسمان سے سیدھی اوڈیسہ کے تھیٹر کی سٹیج پر اتر آئی تھی۔

مجھے اخبار پڑھنے کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن اس قانون پر کچھ زیادہ سختی سے عمل درآمد نہیں کیا جاتا تھا۔ میں نے چند شرائط کے بعد یہ حق حاصل کر لیا۔ اخبارات میں کالم مجھے سب سے زیادہ اپنی طرف کھینچتے تھے۔ اوڈیسہ کے پریس میں تھیٹر مرکزی حیثیت اختیار کیے ہوئے تھا، خاص طور پر اوپیرا اس سلسلے میں عوام کی ترجیحات تھیٹروں کی پرفارمنس پر منحصر ہوتی تھی۔ اور عوام کی رائے تعمیر کرنے میں اخبارات کا بڑا ہاتھ ہوتا تھا۔

ان دنوں کالم نگار ڈوروشی وچ بڑا مشہور تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ شہر کی آنکھ کا تارا بن گیا۔ وہ چھوٹی

چھوٹی باتوں کے متعلق بڑے موثر انداز میں لکھتا تھا۔ اس میں کسی کو شک ہی نہیں تھا کہ وہ بلا کا ذہین تھا۔ وہ کالم میں بڑی معصومیت مگر جرات سے اپنا کام کر جاتا۔ اس کے کالم اوڑیسہ کے بند ماحول میں ہوا کے تازہ جھونکے ہوتے تھے۔ صبح اخبار کھولتے ہی میں ڈوروشی وچ کا کالم تلاش کرنے لگ جاتا۔ اس کا کالم ہر گھر میں باپ اور بیٹے ایک جیسے جذبے اور جوش سے پڑھتے تھے۔

ابتدائی برسوں ہی سے لفظوں کے لئے میری محبت بڑھتی، گھٹتی مگر اس کے ساتھ ہی جڑیں پکڑتی رہی ہے۔ میری نظروں میں مصنف، صحافی اور فن کار ہمیشہ ایک ایسی دنیا کی ترجمانی کرتے رہے ہیں جو دوسری دنیاؤں سے زیادہ دلکش ہوتی ہے۔ اور صرف منتخب لوگوں پر کھلتی ہے۔

دوسرے گریڈ میں ہم نے ایک رسالہ شروع کیا۔ موسی فیلپو وچ اور میں اس موضوع پر کئی دن تبادلہ خیال کرتے رہے تھے۔ موسی فیلپو وچ نے اس کا نام ''قطرہ'' رکھا تھا۔ یہ نام رکھنے کے پیچھے یہ دلیل کام رہی تھی کہ سینٹ پال سکول کا دوسرا گریڈ ادب کے سمندر میں اپنی طرف سے ایک ''قطرے'' کا اضافہ کر رہا تھا۔ میں نے یہ خیال ایک نظم کی شکل میں پیش کیا جسے تعارفی مضمون میں جگہ دی گئی۔ رسالے میں میرے نام سے کئی دوسرے مضمون اور نظمیں شائع ہوئیں۔ ہمارے ایک آرٹسٹ نے رسالے کا بڑا خوبصورت سرورق بنایا۔ پھر اس رسالے کا افتتاح بڑی شان اور دھوم دھام سے ہوا۔ افتتاحی تقریب کے موقع پر کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔ فقط ''قطرے'' کے اوراق پھڑ پھڑا رہے تھے۔ میری نظم ''ننھے صاف قطرے'' بلند آواز میں پڑھی گی اور مجھے خوب داد ملی۔ صاحب صدر نے نظم کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ ''نظم تو بہت اچھی ہے مگر شاعر کو شاعری کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔'' پھر وہ مجھے شاعری کے اسرار و رموز بتانے لگا۔ لیکن یہ فنی باتیں ایک دوسرے گریڈ کے لڑکے کی سمجھ میں خاک آتی تھیں۔

میں یہ تو بتانا بھول ہی گیا کہ اس زمانے میں سکول سے کوئی رسالہ وغیرہ نکالنے کی ممانعت تھی۔ دوسروں کو بچانے کے لئے مجھے قربانی کا بکرا بنا لیا گیا۔ میری پڑھائی کا پرامن زمانہ اس وقت ختم ہو گیا جب مجھے سینٹ پال سکول سے عارضی طور پر نکال دیا گیا۔

بچپن ہی سے میری زندگی میں کئی تصادم چلے آ رہے تھے جو ایک وکیل کے مطابق ناانصافی کے خلاف جدوجہد سے پیدا ہوئے تھے۔ میری رفاقتوں کے بناؤ اور بگھاڑ میں یہ عنصر ہمیشہ غالب رہا۔ تمام واقعات کا ذکر کرنے میں بہت وقت لگ جائے گا۔ یہاں صرف دو واقعات کا ذکر کروں گا جو خاص اہمیت

کے حامل ہیں۔

میرا سب سے بڑا تصادم دوسرے گریڈ میں برنانڈے سے پیدا ہوا جس کا نام ہی میں نے ''فرنچ مین'' رکھا ہوا تھا حالانکہ وہ سوئس تھا۔ سکول میں جرمن زبان اور روسی زبان میں مسابقت چلتی تھی۔ برنانڈے فرانسیسی سکھانے میں قدرے سست تھا۔ لڑکوں کی بڑی تعداد سکول میں فرانسیسی سیکھتی تھی۔ لیکن نوآبادیوں سے آنے والے لڑکے خاص طور پر اس سلسلے میں مشکلات کا شکار تھے۔ برنانڈے نے جرمنوں کے خلاف ایک مسلسل جنگ شروع کر رکھی تھی۔ اس کا محبوب شکار وا کر تھا۔ وا کر واقعی ایک کمزور طالب علم تھا۔ ہم سب کا یہ خیال تھا کہ برنانڈے نے اسے جس قدر کم نمبر دیے تھے وہ اس کا حق دار ہرگز نہیں تھا۔ اس دن برنانڈے کچھ زیادہ ہی غصے میں تھا۔ اس نے ڈپریشن دور کرنے کی دو گولیاں کھا رکھی تھیں۔

''اسے ٹسٹ کا دوسرا موقع دیا جائے'' لڑکے کلاس میں سرگوشیاں کر رہے تھے اور ایک دوسرے کو اکسا رہے تھے۔ میں ان میں سب سے آگے تھا۔ ہم منہ بند کر کے آوازیں نکال رہے تھے تا کہ کسی کی آواز کی شناخت نہ ہو سکے۔ ہم پہلے بھی ایسا کرتے تھے مگر انتہائی مدہم آواز میں کیونکہ برنانڈے کا خوف ہی بہت زیادہ ہوتا تھا۔ اس دفعہ ہم نے جرات کی انتہا کر دی۔ جونہی اس نے حاضری کا رجسٹر اپنے ہاتھ میں لیا۔ کمرے کے آخری کنارے سے گیدڑوں جیسی آوازیں ابھرنے لگیں۔ یہ آوازیں پھیلتی پھیلتی سامنے والے ڈیسکوں تک آ گئیں۔ میں اس کام میں جس قدر حصہ لے سکتا تھا، میں نے لیا۔ برنانڈے صورتحال دیکھ کر کلاس چھوڑ کر باہر جانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی آوازیں زیادہ بلند ہو گئیں۔ وہ دہلیز پر کھڑا ہو گیا اور پلٹ کر دیکھا۔ پھر وہ چلتا ہوا کمرے کے درمیان میں آ کر رک گیا۔ اب وہ اپنے دشمنوں کے بالکل درمیان میں تھا۔ اس کا چہرہ زرد پڑ چکا تھا اور آنکھیں آگ برسا رہی تھیں۔ وہ بالکل خاموش تھا۔ سامنے والے ڈیسکوں کے لڑکے یوں ظاہر کر رہے تھے جیسے وہ بالکل معصوم ہوں۔ پیچھے بیٹھنے والے لڑکے اپنے بستوں کے ساتھ مصروف تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ چند لمحے ہمیں گھورنے کے بعد وہ غصے سے آگ بگولا بنا مڑا اور یوں تیزی سے دروازے سے نکل گیا کہ اس کے کوٹ کی دم کسی بادبان کی طرح لہرا رہی تھی۔ اس کے کمرے سے نکلتے ہی ایک زبردست نعرہ بلند ہوا جو اس کے ساتھ برآمدے میں چلتا گیا۔

اگلا سبق شروع ہونے سے پہلے اس واقعہ کی انکوائری شروع ہو گئی سکول کا میٹر کمرے میں آ گیا۔ برنانڈے کی آنکھوں میں انتقام بھرا ہوا تھا۔ میٹر تیز نظروں سے لڑکوں کے چہروں کا جائزہ لینے لگا۔ جو

لڑکے اسے قدرے غیر جانب دار دکھائی دیے وہ ان سے کہنے لگا۔ ''تم بھی یقیناً اس بدتمیزی میں شامل تھے۔'' بعض لڑکوں نے احتجاج کیا، بعض خاموش رہے۔ آخر دس یا پندرہ لڑکوں کو سزا کے لئے چن لیا گیا۔ کسی کو ایک گھنٹے کی سزا ملی، کسی کو دو گھنٹے کی، کسی کا کھانا بند کر دیا گیا باقی لڑکوں کو گھر جانے کو کہا گیا۔ ان میں میں بھی شامل تھا۔ برنانڈے مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں وقت سے پہلے گھر جانے کے حق میں نہیں تھا۔ لیکن میں نے معافی کی درخواست نہ کی اور بوجھل قدموں سے گھر کی طرف چل پڑا۔

اگلی صبح گذشتہ دن کے واقعہ کو ذہن سے نکال کر جب میں سکول کی طرف جا رہا تھا تو سزا یافتہ لڑکوں میں سے ایک نے مجھے سکول کے گیٹ پر روک لیا اور کہا۔ ''تم کسی مصیبت میں پڑنے والے ہو۔'' کل ڈینی ورنے میئر کے سامنے تمہارے خلاف باتیں کیں تھیں۔ میئر نے برنانڈے کو بلایا اور پھر ہیڈ ماسٹر کو۔ وہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ تم اس سارے ہنگامے کے سرغنہ تو نہیں تھے۔''

میرا دل ڈوب گیا۔ اسی وقت کلاس کا مانیٹر پفلو وچ نمودار ہوا۔ ''ہیڈ ماسٹر کے پاس جاؤ۔'' وہ بولا۔ آثار کچھ اچھے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ میں پوچھتا ہوا ہیڈ ماسٹر کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ اس کا کمرہ برآمدے کے ایک پراسرار گوشے میں تھا۔ میں دروازے کے باہر جا کر کھڑا ہو گیا۔ ہیڈ ماسٹر میرے قریب سے گزرا مجھ پر ایک مایوسی کی نگاہ ڈالی اور اپنا سر ہلایا۔ میں مردہ حالت میں کھڑا رہا۔ ہیڈ ماسٹر دوبارہ اپنے کمرے سے نکلا اور بولا ''بہت اچھا، بہت اچھا'' میں سمجھ گیا کہ حالات ٹھیک نہیں تھے۔ تھوڑی دیر بعد استاتذہ اپنے کمروں سے باہر نکلنے لگے۔ وہ میری طرف دیکھے بغیر دوسرے کلاس روموں میں جا رہے تھے۔ فقط کرز ہونوسکی نے ہلکا سے جھک کر میرے سلام کا جواب دیا۔ جیسے وہ کہہ رہا ہو۔ بچے! عذاب میں پڑ گئے ہو۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔ ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔'' برنانڈے برآمدے سے گزرا تو میں نے اسے بھی جھک کر سلام کیا۔ وہ سیدھا میری طرف آیا اور اپنی منحوس داڑھی پر ہاتھ پھیرتے اور اپنے ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا۔ ''دوسرے گریڈ کا سب سے عمدہ طالب علم ایک اخلاقی مجرم نکلا۔'' پھر وہ مڑا اور ڈگ بھرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ میئر نے میرے پاس سے گزرتے ہوئے کہا۔ ''تم بھی اس قسم کے لڑکے ہو؟ ہم تمہیں سبق سکھا دیں گے۔'' اب میری لمبی اذیت کا وقت شروع ہو چکا تھا۔ میری کلاس کے اندر کوئی سبق نہیں پڑھایا جا رہا تھا۔ وہاں برنانڈے، ہیڈ ماسٹر، میئر، اور انسپکٹر کانسکی پر مشتمل تحقیقی کمیٹی کا اجلاس ہو رہا تھا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ ایک سزا یافتہ لڑکے نے کمیٹی کے سامنے بیان دیتے ہوئے کہا تھا۔ ''ہمیں ناحق سزا دی گئی۔ جس نے سب سے زیادہ شور مچایا تھا اس کو چھوڑ دیا گیا ہے۔'' یہ بی تھا جس نے لڑکوں کو اکسایا تھا اور خود بھی ہنگامے میں شامل تھا۔ اسے تو گھر جانے کی اجازت دے دی گئی۔ کارل سن میرے بیان کی تصدیق کرے گا۔''

''مجھے یقین نہیں آتا'' میٹر نے کہا۔ بی ایک مہذب لڑکا ہے۔'' لیکن کارل سن جس نے مجھے بتایا کہ بنیامین اوڈیسہ کا چالاک ترین انسان تھا، میرے خلاف الزام تراشی میں بعض دوسرے لڑکوں کے ساتھ مل گیا۔ میٹر نے برنانڈے کو بلایا۔ دوسروں سے شہ پا کر کچھ اور لڑکوں نے بھی گواہی دے دی۔ ایسے لڑکوں کی تعداد دس یا بارہ تھی۔

اب وہ سب اپنے حافظے پر زور دینے لگے۔ ایک سال پہلے بی نے سیر کے دوران میں ہیڈ ماسٹر کے متعلق کچھ کہا تھا۔ یہی بات بی نے کسی اور سے بھی کہی تھی۔ بی نے فلاں وقت فلاں شرارت میں حصہ لیا تھا۔ واکر جو ساری مصیبت کی جڑ تھا، جذباتی آواز میں بولا۔ ''آپ سب جانتے ہیں کہ میں رو رہا تھا کیونکہ برنانڈے نے مجھے سب سے کم نمبر دیے تھے۔ بی میرے پاس آیا۔ اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا اور کہا۔ ''مت رو واکر۔ ہم انسپکٹر جنرل کو ایسا خط لکھیں گے کہ وہ برنانڈے کو نوکری سے نکال دے گا۔''

''کس کو خط لکھو گے؟''

''انسپکٹر جنرل کو۔''

''کیا یہ ٹھیک ہے؟ پھر تم نے کیا کہا؟''

''میں نے کچھ نہیں کہا تھا۔''

ڈینی لوف نے کہانی کو آگے بڑھایا۔ یہ بالکل درست ہے۔ بی نے انسپکٹر جنرل کو خط تحریر کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔ مگر وہ سکول سے نکالے جانے کے ڈر سے اس پر دستخط نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ''ہر لڑکے کو ایک ایک جملہ لکھنے کی اجازت تھی۔''

''اچھا تو یہ بات تھی۔'' برنانڈے گرجا۔ ''ہر لڑکے کو ایک ایک جملہ لکھنے کی اجازت تھی'' ہر لڑکے سے سوال پوچھے گئے۔ ان میں سے بہت سے صاف مکر گئے کہ کیا ہوا تھا اور کیا نہیں ہوا تھا۔ ان میں سے ایک کوسٹا آر بھی تھا۔ وہ دیکھ کر بری طرح رو رہا تھا کہ کسی طرح ایک بہترین طالب علم سے شرم ناک

غداری کی جا رہی تھی۔ مخبر مکر جانے والوں کی مذمت کر رہے تھے اور انہیں میرا دوست قرار دے رہے تھے۔ کلاس روم میں افراتفری مچی ہوئی تھی۔ بہت سے لڑکوں نے اپنے زبان بند رکھی اور کچھ نہ کہا۔ ڈینی لوف ایک بھڑوے کا کردار ادا کر رہا تھا۔ ایسا اس نے کبھی نہیں کیا تھا اور نہ بعد میں کبھی۔ میں ہیڈ ماسٹر کے کمرے کے باہر اس آدمی کی طرح کھڑا تھا جس سے ملک کے خلاف کوئی بہت بڑا جرم سرزد ہو گیا تھا۔ بڑے گواہوں کو باری باری مجرم کے سامنے لایا جا رہا تھا۔ آخر میں مجھے گھر جانے کو کہا گیا۔

''جاؤ اور اپنے والدین کو یہاں آنے کے لئے کہو''

''میرے والدین گاؤں میں رہتے ہیں۔''

''پھر جن کے پاس رہتے ہو انہیں بھیجو۔''

ایک دن پہلے بلاشبہ میں بہترین طالب علم تھا۔ کیسے صورتحال ایک دم بدل گئی تھی۔ میں نے بھی کبھی مجھ پر شک کا اظہار نہیں کیا تھا۔ آج میں زمین پر اوندھے منہ گرا پڑا تھا اور ڈینی لوف جو اپنی اور شرارتوں کی وجہ سے مشہور تھا، ساری کلاس اور سکول کے حکام کے سامنے مجھ پر الزام تراشی کر رہا تھا۔ کیا ہو گیا تھا؟ کیا میں کسی ایسے مستحق لڑکے کی مدد کر بیٹھا تھا جو میرا دوست نہیں تھا۔ اور جس کے لئے عام طور پر میرے دل میں ہمدردی کے جذبات بھی نہیں تھے۔ یا پھر میں کلاس کی متحد ہرائے پر زیادہ ہی اعتماد کر بیٹھا تھا؟ پکرو وسکی سٹریٹ میں سے گزرتے وقت میں اس قسم کے استدلال کے موڈ میں نہیں تھا۔ میرے ساتھ جو کچھ بیتی تھی میں نے دھڑکتے دل، آنسوؤں کی بوچھاڑ اور لفظوں کی طغیانی میں اپنے سرپرستوں کو سنا دی۔ انہوں نے مجھے پوری طرح حوصلہ دینے کی کوشش کی اگرچہ وہ خود بھی پریشان ہو گئے تھے۔ فینی سولومونفنا بذات خود ہیڈ ماسٹر اور سکول کے دوسرے حکام پاس گئی اور بطور استاد ہونے کے اپنے تجربات کی روشنی میں انہیں سمجھانے اور نرم دلی سے کام لینے کی درخواست کی۔ یہ سب کچھ میرے علم کے بغیر ہو رہا تھا۔ میں اپنے کمرے میں بند بستہ میز پر رکھے دل برداشتہ بیٹھا رہا۔ دن گزرتے گئے۔ اب کیا ہوگا؟ ہیڈ ماسٹر نے کہا۔ یہ مسئلہ زیر بحث لانے کے لئے اساتذہ کی کونسل کا اجلاس بلایا جائے گا'' یہ اور بھی تکلیف دہ بات تھی۔

آخر اجلاس بلایا گیا۔ موسی فیلیپووچ سننے کے لئے گیا۔ میں بڑی شدت سے اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ یہ انتظار زار کی عدالت کے فیصلے کے انتظار سے کہیں زیادہ شدید تھا جو بعد کے سالوں میں میری قسمت میں لکھا تھا۔

زینے کی نیچے دروازے میں کسی داخل ہونے کی آواز سنائی دی۔ قدموں کی وہی مانوس آواز جو زینہ سنائی دیتی تھی، کھانے کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ فیلپو وچ کے پہلو بہ پہلو دوسری طرف سے فینی سولومونفنا کمرے میں داخل ہوئی۔ میں نے آہستہ سے پردہ ہٹایا۔''سکول سے نکال دیے گئے ہو؟'' موسی فیلپو وچ نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔''سکول سے نکال دیا گیا ہے؟''فینی سولوموینفنا نے اپنا سانس درست کرتے ہوئے پوچھا۔''ہاں سکول سے نکال دیا گیا ہے۔'' موسی فیلپو وچ نے زیادہ مدہم آواز میں اپنا جملہ دہرایا۔ میں کچھ نہ بولا اور دونوں کو دیکھ کر پردے کے پیچھے چلا گیا۔ موسم گرما کی چھٹیوں کے دوران میں جب ہم یانو فکا میں تھے تو فینی سولومونفنا نے اس منظر کو دہراتے ہوئے کہا۔''جب اس نے سکول سے نکال دیے گئے ہو' کے لفظ سنے تو بالکل زرد پڑ گیا تھا۔ مجھے ایک دم اس کی فکر پڑ گئی۔''اس وقت بھی میں رویا نہیں تھا۔ تکلیف ضرور ہوئی تھی۔

اساتذہ کی کونسل کے اجلاس میں سکول سے نکالنے کے تین درجوں پر بحث ہوئی تھی۔ کسی دوسرے سکول میں داخلہ لینے کے حق سے محروم رکھنا، سینٹ پال سکول میں داخلے کے حق سے محروم رکھنا اور موخر الذ میں دوبارہ داخلے کا حق دے دینا۔ میرے لیے آخری اور سب سے نرم سزا تجویز کی گئی تھی۔ اس خیال سے میں کانپ گیا کہ میرے لیے آخری اور سب سے نرم سزا تجویز کی گئی تھی۔ اس خیال سے میں کانپ گیا کہ میرے والدین سنیں گے تو ان پر کیا گزرے گی۔ میرے سر پرستوں نے ہر طرح سے میرے صدمے کو کم کرنے کی کوشش کی۔ فینی سولومونفنا نے میری بڑی بہن وایک طویل خط لکھا جس میں یہ ہدایات درج تھیں کہ یہ خبر میرے ماں باپ کو کیسے سنائی جائے۔ میں سکول کے سال کے اختتام تک اوڈیسہ میں ہی ٹھہرا رہا اور حسب معمول چھٹیوں میں گھر گیا۔ طویل شاموں میں جب میرے ماں باپ سو جایا کرتے تھے، میں اپنے بڑے بھائی اور بہن کو بتاتا رہتا کہ یہ سب کیسے ہوا تھا۔ لڑکوں اور استادوں کا کردار بھی خود ہی ادا کرتا تھا ان دونوں کے ذہن میں بھی ابھی اپنے سکولوں کی یادیں تازہ تھیں۔ وہ خود کو مجھ سے برتر سمجھتے تھے۔ انہوں نے کہانی سن کر اپنے سر زور سے ہلائے او قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے۔ ہنستے ہنستے میری بہن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس نے اپنا سر میز پر ٹکا دیا۔ فیصلہ کیا گیا کہ مجھے ایک یا دو ہفتوں کے لئے کہیں سیر کرنے بھیج دیا جائے۔ میری عدم موجودگی میں میری بہن باپ کو سب کچھ بتا دے گی۔ یہ الگ بات تھی کہ وہ اپنی اس ذمہ داری سے خود خوف زدہ تھی۔ میرے بڑے بھائی کی تعلیمی ناکامی کے بعد میرے باپ

نے ساری امیدیں مجھ پر لگا رکھی تھیں۔ پہلے سال تو اس کی امیدوں کے شجر پر پھل آیا تھا۔ مگر اس کے بعد بربادی کا بور آ رہا تھا۔

جب میں ایک دوست کے ساتھ سیر سے واپس آیا تو مجھے محسوس ہوا کہ سب کچھ بتا دیا گیا تھا۔ ماں نے میرے دوست گریشا کا تو بڑی اچھی طرح سواگت کیا مگر ظاہر کیا کہ جیسے اس نے مجھے دیکھا ہی نہیں تھا۔ اس کے برعکس باپ کا طرز سلوک بتاتا تھا کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ لیکن چند دنوں بعد کھیتوں سے واپس آنے پر جب وہ ٹھنڈے کمرے میں آرام کر رہا تھا۔ تو اس نے میری ماں کی موجودگی میں مجھ سے پوچھا۔ ''ذرا بتاؤ تم نے اپنے ماسٹر پر کیسے سیٹی بجائی تھی؟ ۔'' اس طرح؟ دونوں انگلیاں منہ میں ڈالی تھیں؟'' اور نقل اتارتے ہوئے وہ قہقے لگانے لگتا ماں حیرت کی حالت میں کبھی اسے اور کبھی مجھے دیکھتی رہی۔ اس کے چہرے پر غصے کے ساتھ ساتھ ایک مسکراہٹ آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اتنے بڑے واقعے کا ایسے ہلکے پھلکے انداز میں کیسے ذکر کیا جا سکتا تھا۔ لیکن باپ اپنا مطالبہ دہراتا رہا۔ ہاں تو بتاؤ ذرا کیسے سیٹی بجائی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے قہقہوں میں اضافہ ہو رہا تھا۔ دکھ تو اسے ضرور تھا مگر وہ اس خیال سے خوش ہو رہا تھا کہ اس کا بیٹا بہترین طالب علم کا درجہ پانے کے باوجود اپنے استاد پر سیٹی بجانے کی جرات رکھتا تھا۔ میں اسے یقین دلانے کی بے سود کوشش کرتا رہا۔ کہ میں نے سیٹی نہیں بجائی تھی، صرف منہ کے اندر ''ہوں ہوں'' کیا تھا جو ایک بڑی پرامن اور معصوم شرارت تھی۔ اس کا اصرار تھا کہ میں نے سیٹی بجائی تھی۔ جب ماں رونے لگی تو بات ختم ہوگئی۔

میں نے امتحانوں کی بالکل تیاری نہیں کی تھی۔ جو کچھ ہوا تھا اس نے وقتی طور پر پڑھائی سے میرا دل اچاٹ کر دیا تھا۔ میں نے ایک بے چین موسم گرما گزارا جس میں مجھے بدمزاجی کے دورے پڑتے رہتے تھے۔ میں امتحانوں سے پندرہ دن پہلے اوڈیسہ واپس چلا گیا۔ وہاں بھی پڑھائی میں میرا دل نہ لگا۔ فقط فرانسیسی زبان کی تیاری پر میں نے کچھ وقت خرچ کیا۔ امتحان میں برنانڈے نے مجھ سے جس ابتدائی نوعیت کے کچھ سوال پوچھے۔ دوسرے استادوں نے اس سے بھی کم۔ مجھے تیسرے گریڈ میں ترقی مل گئی۔ وہاں میرا سامنا ان تمام لڑکوں سے ہوا جنہوں نے مجھے دھوکہ دیا تھا، یا میرا دفاع کیا تھا یا پھر غیر جانب دار رہے تھے۔ اس کے بعد ایک طویل عرصے تک میرے ذاتی تعلقات اسی بنیاد پر چلتے رہے۔ بعض لڑکوں سے میں نے بالکل قطع تعلق کر لیا اور جن لڑکوں نے اس مشکل وقت میں میرا دفاع کیا تھا ان سے میرا

یارانہ زیادہ مضبوط ہوگیا۔

کوئی اسے میرا پہلا سیاسی ٹسٹ بھی کہہ سکتا ہے۔ یہ دونوں گروپ اسی ایک واقعہ کی پیداوار تھے حاسد اور دھوکہ باز ایک طرف اور جرات منداور بےتکلف دوسری طرف جب کہ غیر جانب دار درمیان میں تھے۔ جو عوام نمائندگی کرتے تھے۔ یہ تینوں گروپ آنے والے برسوں میں کبھی میری نظم سے اوجھل نہ ہوئے۔ میں ان سے زندگی میں مختلف صورتوں اور حالات میں بار بار ملتا رہا۔

سڑکوں سے برف ابھی پوری طرح ہٹائی نہیں گئی تھی۔ اس کے باوجود موسم گرم ہوگیا تھا۔ مکانوں کی چھتیں، درخت اور پرندے موسم بہار کے آثار ظاہر کرنے لگے تھے۔ چوتھے گریڈ کا لڑکا گھر کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اس کے بستے کی ٹوٹی ہوئی ایک سٹرپ تھی۔ وجہ یہ تھی کہ بستے کی ایک ہک ٹوٹ گئی تھی۔ اس کا لمبا کوٹ اس کے لئے تکلیف کا باعث بن رہا تھا جس سے اسے پسینہ آ رہا تھا۔ وہ خود کو تھکا ہو محسوس کر رہا تھا۔ لڑکے کو خود سے اوپر ہر چیز نئی دکھائی دے رہی تھی۔ بہار کی دھوپ یہ احساس دلا رہی تھی۔ کہ کوئی چیز ایسی تھی جو سکول اور انسپکٹر سے بھی طاقت ور تھی۔ پشت پر لٹکتے ہوئے بستے، پڑھائی، شطرنج، کھانے حتیٰ کے مطالعے اور تھیٹر سے بھی زیادہ طاقت ور تھی۔ قصہ مختصر وہ چیز روزمرہ زندگی کی ہر شے سے زیادہ بڑی تھی۔ اس بڑی اور طاقت ور چیز کی خواہش نے اس لڑکے کے بدن کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا۔ وہ اس کی ہڈیوں کے گودے تک اتر گئی۔ اسے تھکاوٹ کا میٹھا درد بھی کہا جا سکتا تھا۔

وہ ایک بھنبھناتے ہوئے سر اور بجتی ہوئی کن پٹیوں کے ساتھ گھر واپس آیا۔ بستے کو میز پر رکھ کر وہ بستر پر لیٹ گیا، اس بات کا احساس کیے بغیر کہ وہ کیا کر رہا تھا۔ اس نے سرہانے میں منہ دیا اور رونے لگا۔ آنسوؤں کا جواز تلاش کرنے کے لئے وہ کتابوں اور اپنی زندگی کے مناظر ذہن میں لانے لگا تاکہ اس کے اندر جلنے والی بھٹی کو تازہ ایندھن مل سکے۔ وہ بے اختیار روئے چلا جا رہا تھا۔ وہ اپنی زندگی کے چودھویں سال میں تھا۔

وہ لڑکا بچپن ہی سے ایک بیماری میں مبتلا تھا جسے ڈاکٹر اپنی سرکاری زبان میں ہاضمے کی نالی میں بلغم کے انجماد کا نام دیتے تھے۔ یہ بیماری اس کی ساری زندگی سے پوری طرح جڑی رہی۔ اسے اکثر اوقات دوائی لے کر ایک ہی قسم کی غذا پر بیماری پڑتا تھا۔ صدمات اس کے ہاضمے کے نظام کو متاثر کرتے تھے۔ چوتھے گریڈ میں یہ بیماری اس قدر شدید ہوگئی کہ اس کی پڑھائی کو تباہ کر دیا۔ ایک طویل مگر نامیاب

علاج کے دورانیے کے بعد ڈاکٹروں کی یہ رائے تھی: اسے دیہی علاقے میں بھیج دیا جائے۔

میں نے ڈاکٹروں کی رائے کو کسی مایوسی کے بجائے خوشی سے قبول کرلیا۔لیکن میرے والدین کی مرضی حاصل کرنی بھی ضروری تھی۔ پھر ایک استاد کا میرے ساتھ رہنا بھی ضروری تھا تا کہ میرا سال ضائع نہ ہو۔اس کا مطلب زائد خرچ تھا اور میرے والدین یا نوفکا میں زائد خرچ کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ بہرحال موسی فیلیپووچ کی مدد سے مسئلہ حل ہوگیا۔طالب علم ''جی'' کو میرا استاد رکھ لیا گیا۔وہ چھوٹے قد کا گھنے اور بڑے بالوں والا آدمی تھا۔اس کے بال اطراف سے سفید ہو رہے تھے۔وہ تھوڑا مغرور اور تھوڑا عجیب وغریب بھی تھا۔ بے حد باتونی اور مشکوک کردار کا مالک وہ ان لوگوں میں سے تھا جو تعلیم مکمل نہیں کرتے اور زندگی میں کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ وہ شاعری کرتا تھا۔مقامی اخبار میں اس کی دو نظمیں شائع ہو چکی تھیں جن کے پرچے وہ اٹھائے پھرتا تھا اور لوگوں کو دکھا کر خوش ہوتا تھا۔میرے اور اس کے تعلق میں گاہے گاہے تلخی آجاتی تھی اور مسلسل خرابی بڑھ رہے تھے۔شروع میں وہ میرے ساتھ بتدریج بڑھتی ہوئی آشنائی قائم کرنا چاہتا تھا اور ہر موقعہ پر اصرار کرتا رہتا کہ وہ میرا دوست بننا چاہتا تھا۔اس نے کلاڈیا نامی ایک لڑکی کی تصویر مجھے دکھائی اور اس سے اپنے پیچیدہ نوعیت کے تعلقات کی وضاحت بھی کی۔ پھر وہ ایک دم پیچھے ہٹ جاتا اور مجھ سے ایک شاگرد جیسی عزت کا مطالبہ کرنے لگا۔اس بھیانک صورتحال کا خاتمہ بہت بری طرح ہوا۔ ہمارے درمیان شدید جھگڑا ہوا اور بات ختم ہوگئی۔مگر اس سے جس قدر تعلق بھی رہا وہ کسی اثر کے بغیر نہیں تھا، کوئی خواہ کچھ کہتا پھرے۔سفید بالوں والا ایک آدمی اپنے شاگرد کو ایک ایسی عورت سے اپنے تعلقات کے راز بتاتا رہا تھا جو تصویر میں بڑی بارعب دکھائی دیتی تھی۔میں خود کو بھی زیادہ عمر کا محسوس کرنے لگا۔

بالائی گریڈ میں ادب کی تعلیم کرزہانیوسکی کے ہاتھ سے نکل کر گاموف کے پاس چلی گئی۔ گاموف ابھی تک جوان آدمی تھا۔اس کے بال اچھے مگر گچھے دار تھے۔وہ کمزور نظر کا مالک تھا اور اپنے مضمون میں اس کی دلچسپی بے حد کم تھی۔ ہم ایک سبق کے بعد دوسرے سبق تک اس کے ساتھ گھسٹتے چلے جاتے۔اس پر مستزاد کہ وہ باقاعدہ نہیں تھا اور سبق نظر کو التوا میں ڈالے رکھتا تھا۔مجھے اس کام سے دلی لگاؤ تھا۔میں استاد کے بتائے ہوئے ذرائع کے علاوہ دوسری کتاب بھی پڑھتا تھا اور ان سے ایسے پیراگراف اور جملے نقل کرتا رہتا تھا جو میرے خیال کو پکڑ لیتے تھے۔ایسا بہت کم لڑکے کرتے تھے کیونکہ یہ سخت جان اور

محنت طلب کام تھا۔

پانچویں گریڈ کے لڑکے، بعض جذباتی ہو کر بعض ڈر کی حالت میں اور بعض امید کے ساتھ اپنے کام کی درجہ بندی کے منتظر تھے۔ لیکن نمبر بتائے نہیں جا رہے تھے۔ سکول کے سال کے دوسری سہ ماہی میں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ تیسری سہ ماہی میں میں نے پیڈ بھر کر پرچہ دیا تھا۔ ایک ہفتہ گزر گیا، پھر دوسرا اور پھر تیسرا۔ لیکن کچھ بتایا نہیں جا رہا تھا۔ احتیاطاً ہم یہ بات گاموف کے نوٹس میں لے آئے۔ اس کا جواب پیچھا چھڑانے والا تھا۔ اگلے سبق پر یبلونوسکی نے جو خود ایک اچھا مضمون نگار تھا۔ بلا جھجک گاموف سے پوچھ لیا: ''ہمیں کیوں نہیں بتایا جا رہا کہ ہمارے پرچوں کا کیا حشر ہوا؟'' گاموف نے طراری سے اسے شٹ اپ کہہ کر چپ کرا دیا۔ لیکن یبلونوسکی ہار ماننے والا نہیں تھا۔ وہ اپنی بھویں مزید چڑھاتے، ڈیسک کے قریب پورے کھڑا ہوتے اور آواز کو بلند کرتے ہوئے اپنے بات دہراتے رہا۔ ''اس طرح تو کام کرنا مشکل ہو جائے گا۔''

''میں تم سے پھر کہتا ہوں کہ خاموش ہو جاؤ اور بیٹھ جاؤ''۔ گاموف نے جواب دیا۔ لیکن یبلونوسکی نہ تو چپ ہوا اور نہ ہی اپنی جگہ پر بیٹھا۔ اس نے بولنا بھی بند نہ کیا۔

''مہربانی کر کے کمرے سے باہر چلے جاؤ'' گاموف چیخا۔

یبلونوسکی سے میرے تعلقات کچھ عرصے سے دوستانہ نہیں تھے۔ دوسرے گریڈ میں برنانڈے کے تجربے نے مجھے زیادہ محتاط بنا دیا تھا۔ لیکن یہاں مجھے محسوس ہوا کہ میں خاموش نہیں رہ سکتا تھا۔

''جناب، یبلونوسکی ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہم سب اس کی حمایت کرتے ہیں۔'' میں نے بلند آواز میں کہا۔

''وہ ٹھیک کہہ رہا ہے، وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' سب لڑکے بول پڑے۔

پہلے گاموف حیران رہ گیا۔ پھر اس نے اپنے حواس درست کیے اور غصے میں آ کر بلند آواز میں بولا ''میں جانتا ہوں کیا کرنا ہے اور کب کرنا ہے۔ اب تم مجھ پر حکم چلاؤ گے؟ تم ضابطے کی خلاف ورزی کر رہے ہو۔''

ہم نے اس کی کسی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ ''ہم تو فقط پرچے دیکھنا چاہتے ہیں۔'' ایک

تیسری آواز آئی۔ گاموف غصے سے کھول رہا تھا۔

''یبلونووسکی: ایک دم کمرے سے باہر نکل جاؤ'' وہ چلایا۔

لیکن یبلونووسکی اپنی جگہ سے ایک انچ نہ ہٹا۔

''باہر چلے جاؤ'' ہر طرف سے دھیمی آوازیں اٹھنے لگیں۔

یبلونووسکی نے اپنے کندھے اچکائے، آنکھوں کی پتلیوں کو گھمایا اور اپنے بھاری بوٹوں کو فرش پر مارتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ جاتی دفعہ وہ دروازے کو پوری طاقت سے بند کرتا گیا۔ سکول میں وقفے کے دوران میں یبلونووسکی اپنے ربر کے بوٹوں پر دبے پاؤں چلتا ہوا آہستہ سے دوبارہ کمرے میں آ گیا۔ یہ ایک بری علامت تھی کمرے میں مکمل خاموشی چھا گئی۔ غصے سے تپتے ہوئے گاموف کی حالت بہت بری تھی۔ اس نے یبلونووسکی کو چوبیس گھنٹوں کے لئے سکول سے نکال دیا اور طرز سلوک کے ''تین'' نمبر دیے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی کیا گیا۔ یہ سکول میں میری دوسری سزا تھی۔ احتجاج کرنے والے تیسرے لڑکے کو بارہ گھنٹے کے لئے سکول سے نکالا گیا۔ یہ معاملہ آگے لے جانے کے بجائے یہیں ختم کر دیا گیا۔ ہمارے ہر احتجاج کے باوجود گاموف نے ہماری پرچے واپس نہ کیے۔ ہم نے بھی اس معاملے کو بھول جانا ہی بہتر سمجھا۔

اسی سال زار فوت ہو گیا۔ واقعہ بڑا زبردست اور اہم تھا مگر ہمیں یہ بڑی دور کی بات محسوس ہوئی۔ جیسے کسی دوسرے ملک میں زلزلہ آیا تھا۔ زار کی بیماری اور اس کی موت پر کسی کو بھی کسی قسم کا دکھ یا رنج نہیں ہوا تھا۔ جب میں دوسری صبح سکول آیا تو ایک بے وجہ سی افراتفری دکھائی دی۔ ''زار مر گیا ہے۔'' جب میں دوسری صبح سکول آیا تو ایک بے وجہ سی افراتفری دکھائی دی۔ ''زار مر گیا ہے۔'' لڑکے ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے۔ انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ کہ اس کے بعد وہ کیا کہیں یا کس طرح اپنے جذبات کا اظہار کریں۔ انہیں خود بھی کسی جذبے کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ اتنا جانتے تھے کہ اس دن کوئی کلاس نہیں ہوگی۔ وہ لڑکے خاص طور پر خوش تھے جنہوں نے گھر کا کام نہیں کیا تھا اور سزا سے خوف زدہ تھے۔ سکول کے نگران نے تمام لڑکوں کو ہال میں جمع ہونے کے لئے کہا جہاں زار کے لئے آخری دعا مانگی جانی تھی۔ پادری جس نے سنہری فریم والا چشمہ لگا رکھا تھا، دعا پڑھنے لگا۔ وہ کہہ رہا تھا: ''جب باپ مر جائے تو بچوں کو دکھ ہوتا ہے۔ جب تمام لوگوں کا باپ مر جائے تو دکھ کتنا بڑا ہوگا۔'' لیکن دکھ کہیں دکھائی نہیں دے رہا

تھا۔ آخری دعا گھٹتی رہی۔ یہ بڑی بورا اور اکتا دینے والی تھی۔ حکم دیا گیا کہ ہر کوئی بازو پر ماتمی پٹی باندھے گا اور ٹوپی کے بیج کا سیاہ کاغذ سے ڈھک دے گا۔ پھر سب کچھ پہلے جیسا ہی ہونے لگا۔

پانچویں گریڈ میں لڑکے کالج جانے اور چھٹیاں کیسے گزارنی ہیں، ایسے موضوعات پر باتیں کرنے لگے تھے۔ مقابلے کے امتحان کی سختی اور سینٹ پیٹرز برگ میں یونیورسٹی کے پروفیسروں کا امید واروں کی طرف رویہ، کس نوعیت کے سوالات پوچھے جائیں گے، وہ خاص لوگ جو ایسے امتحانوں کی تیاری کراتے تھے۔ یہ موضوع بھی زیر بحث آئے۔ پرانے لڑکوں میں سے ہم کچھ ایسے لڑکوں کو بھی جانتے تھے جو ہر سال امتحانوں کی تیاری کرتے اور فیل ہو جاتے تھے۔ اگلے سال وہ پھر تیاری میں لگ جاتے تھے۔ یہ خیال آتے ہی بہت سے لڑکوں کے دل بیٹھنے لگتے تھے۔

چھٹا گریڈ کسی واقعہ کے بغیر گزر گیا۔ ہر کوئی جلد از جلد سکول کے جھنجھٹ سے نکل جانا چاہتا تھا۔ میٹرک کا امتحان بڑے زوروں سے ہال میں لیا گیا۔ اس موقع پر یونیورسٹی کے پروفیسر خاص طور پر بھیجے گئے تھے۔ انسپکٹر جنرل نے امتحانی پرچوں کے پیکٹ ارسال کیے تھے جنہیں ہیڈ ماسٹر نے کھولنا تھا۔ یہ ایک ایسا موقع ہوتا تھا جس پر ہر لڑکے کا دل دھڑکنے لگتا تھا۔ ہر کوئی پریشانی اور گھبراہٹ کی حالت میں سوچتا تھا کہ اس سے پرچہ حل نہیں ہوگا۔ مگر بعد میں پتا چلتا تھا کہ اس قسم کے خوف بڑے مبالغہ آمیز ہوتے تھے۔ لڑکے نقل کرنے میں کامیاب ہو جاتے تھے اور استاد اس معاملے میں خود ان کی مدد کر دیتے تھے۔ پرچہ حل کرنے کے بعد میں فوری طور پر ہال سے باہر نہیں چلا جاتا تھا بلکہ انسپکٹر اسے ملی بھگت کر کے دوسرے لڑکوں کی مدد کرتا رہتا تھا۔

ساتواں گریڈ ایک مددگار گریڈ سمجھا جاتا تھا۔ سینٹ پال سکول میں ایسا کوئی گریڈ نہیں تھا جس کے لئے کسی دوسرے سکول جانا پڑتا تھا۔ اس عارضی عرصے میں ہم خود کو آزاد شہری محسوس کرتے تھے۔ اس موقع پر ہم عام شہریوں جیسے طریقے اپنا لیتے تھے۔ جس دن ہمیں ڈپلومے ملے اسی شام ہمارا ایک بڑا گروپ سمر گارڈن چلا گیا جہاں گانے والیاں ایک اوپن سٹیج پر اپنے فن کا مظاہرہ کرتی تھیں مگر سکول کے لڑکوں کو وہاں جانے کی سخت ممانعت تھی۔ اس شام ہم نے ٹائیاں لگائیں، سگریٹ کے پیکٹ اور بیئر کی دو بوتلیں خریدیں۔ دل کی گہرائیوں میں ہم اپنی اس دلیری پر خوف زدہ بھی تھے۔ ابھی ہم نے بیئر کی پہلی بوتل ہی کھولی تھی کہ ہمارے سکول کا مانیٹر ولہم، جسے ہم اس کی بکری جیسی آواز کی وجہ سے ''بکری'' کہا کرتے

تھے، نہ جانے کہاں سے چھلانگ مار کر ہماری میز کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ ہمارا دل اچھلنے لگے۔ لیکن معاملہ ٹھیک ہوگیا۔ ''اب آہی گئے ہو تو بیٹھے رہو۔'' ولہم نے بڑی فراخ دلی سے کہا اور ہم سب سے ہاتھ ملایا۔ ہم میں سب سے بڑے لڑکے ''کے'' نے جس نے اپنی چھوٹی انگلی میں انگوٹھی پہنی ہوئی تھی، اسے بیئر کا ایک گلاس پیش کیا۔ یہ کچھ زیادہ ہی خاطر تواضع کا مظاہرہ تھا۔ ولہم نے بڑی شان بے نیازی سے معذرت کر دی اور ہمیں خدا حافظ کہہ کر جلدی سے ان لڑکوں کی تلاش میں چل پڑا جو باغ کے ممنوعہ حصے میں جانے کے خواہش مند تھے۔ اب ہمارے حوصلے بلند ہوگئے۔ ہم بیئر پر جھپٹ پڑے۔

ابتدائی کلاس سے، میں نے سکول میں جو سات سال گزارے تھے ان کی اپنی خوشیاں بھی تھیں۔ لیکن یہ خوشیاں غموں کے مقابلے میں تھوڑی تھیں۔ مجموعی طور پر سکول کی یادوں کا رنگ اگر سیاہ نہیں تو خاکستری ضرور تھا۔ بڑی بات یہ تھی کہ سکول کی زندگی کے معرکے، خواہ وہ اچھے تھے یا برے، سکول کی بے روح اور ظالم انتظامیہ سے کئی درجے بہتر تھے۔ کوئی ایک بھی ایسا استاد نہیں تھا جسے میں بعد میں محبت کے کسی جذبے کے ساتھ یاد رکھ سکتا۔ اسکے باوجود ہمارا سکول کچھ ایسا برا بھی نہیں تھا۔ اس نے یقیناً مجھے بعض باتیں سکھائیں جن میں ڈسپلن اور باقاعدہ محنت پیش پیش ہیں۔ یہ دونوں چیزیں بعد کی زندگی میں میری بہت کام آئیں۔ اسی سکول نے میرے اندر موجودہ نظام کے خلاف دشمنی کے بیج بھی بوئے۔ خوشی اس بات کی ہے کہ یہ بیج بنجر زمین پر نہیں گرے تھے۔

گاؤں اور شہر

میں نے زندگی کے پہلے نو برس کسی وقفے کے بغیر گاؤں میں گزارے تھے۔ اگلے سات برسوں میں میں گرمیوں اور کبھی کبھی کرسمس اور ایسٹر کی چھٹیوں میں گاؤں آ جاتا تھا۔ اٹھارہ سال کی عمر تک میں یانوفکا اور اس کے نواح سے گہرے طور پر بندھا رہا۔ میرا بچپن کے ابتدائی حصے پر دیہی زندگی کا اثر بڑا نمایاں ہے۔ اس کے بعد کے عرصے میں میں اس اثر کو شہری زندگی کے اثر سے محفوظ کرنے کی کوشش میں لگا رہا مگر کچھ زیادہ کامیاب نہ ہو سکا۔

دیہی زندگی نے مجھے زراعت، آٹا پیسنے والی چکی اور گندم کو بھوسے سے الگ کرنے والی مشین سے آشنا کیا تھا۔ اس نے کسانوں سے میرا گہرا تعلق قائم کیا۔ قرب و جوار کے کسانوں سے اور ان

کسانوں سے جو ہاتھ میں درانتی پکڑتے اور اپنی پشت پر خالی بوری رکھے یوکرائن کے دور دراز علاقوں سے آتے تھے۔ پھر میری دیہی زندگی کا ایک بڑا حصہ میری یادوں سے محو ہو گیا، یا میرے لاشعور میں چلا گیا۔ لیکن کسی نئے موڑ پر اس کا ایک حصہ ابھر کر باہر آتا رہا جو میرے لئے بڑا مددگار ثابت ہوتا۔ دیہی زندگی نے مجھے زوال پذیر دیہی اشرافیہ کو قریب سے دیکھنے کا موقع مہیا کیا۔ اس نے مجھ پر انسانی تعلقات کے فطری کھردرے پن کے کئی پہلو منکشف کیے اور شہری ثقافت کے متضاد مگر ترقی یافتہ احساسات میں شدت پیدا کی۔

پہلی مرتبہ چھٹیوں میں گاؤں آنے پر مجھ پر شہری اور دیہی زندگی کا تضاد کھل گیا۔ جب میں گھر آ رہا تھا تو سارا راستہ بے صبر رہا۔ میرا دل خوشی سے اچھل رہا تھا۔ میں ہر چیز کو دوبارہ دیکھنا چاہتا تھا۔ نوی بگ میں میرا باپ مجھے مل گیا۔ میں نے بڑے فخر کے ساتھ اسے سکول کی رپورٹ دکھائی جس میں میں بڑے اچھے نمبروں سے پاس ہوا تھا۔ اسے یہ بھی بتایا کہ اب میں پہلے گریڈ میں چلا گیا تھا اور مجھے یونیفارم کی ضرورت تھی۔ ہم ایک ڈھکی ہوئی گاڑی میں رات کو سفر کر رہے تھے۔ ہمارے ساتھ کوچوان کی جگہ چکی کا ایک ملازم تھا۔ وسیع میدان آنے پر دھند اور سردی بڑھ جاتی ہے۔ میرے باپ نے مجھے ایک کوسک کمبل میں لپیٹ دیا۔ حالات کی تبدیلی نے مجھ پر نشہ طاری کر دیا۔ میں ایک دم باتونی ہو گیا اور سکول کی، اور وہاں کے باتھ روموں کی، اپنے نئے دوست کوسٹا۔ آر کی، تھیٹر کی، نہ جانے اور کس کس کی باتیں کرنے لگا۔ پھر میں اسے نظمیں سنانے لگا۔ میرا باپ جاگنے سونے کی حالت میں میری باتیں سنتا رہا۔ کبھی کبھی وہ تھوڑا سانس بھی دیتا۔ ہمارا ملازم بھی بیچ میں سر ہلا دیتا اور میرے باپ کی طرف دیکھ کر کہتا۔ ''کیا مزے دار باتیں ہیں۔''

صبح کے قریب میں سو گیا اور یانو فکا جا کر جاگا۔ اب مجھے اپنا گھر بے حد چھوٹا لگ رہا تھا۔ گندم کی روٹی بدمزہ اور دیہی زندگی کے روزمرہ مانوس مگر عجیب محسوس ہونے لگے۔ میں اپنی ماں اور بہن کو بڑے جذبے کے ساتھ تھیٹر کی باتیں سناتا مگر باپ کے سامنے ایسا کرتے وقت دھیما پڑ جاتا۔ روک شاپ میں وکٹر اور ڈیوڈ مجھے اس قدر بدلے ہوئے لگے کہ انہیں مشکل سے پہچان سکا۔ وہ زیادہ عمر کے اور طاقت ور ہو گئے تھے۔ میرے بارے میں ان کے خیالات بھی مختلف تھے۔ وہ مجھے عزت کے ساتھ بلانے لگے جس پر میں نے احتجاج کیا۔ ''پھر میں تمہیں کیسے بلاؤں؟'' ڈیوڈ بولا۔ ''تم اب زیادہ پڑھے لکھے آدمی

ہو۔'' میری عدم موجودگی میں ایوان وسیلائی وچ نے شادی کر لی تھی۔ ملازموں کے کچن کی تعمیر نو کی گئی تھی۔ ایوان وسیلائی وچ اب وہیں رہتا تھا۔ ورک شاپ کے عقب میں نیا کچن بنایا گیا تھا۔

بہر حال یہ اتنی اہم باتیں نہیں تھی۔ نئی بات یہ تھی کہ میرے اور میرے بچپن کے درمیان ایک دیوار کھڑی ہو رہی تھی۔ ہر چیز وہی تھی مگر مختلف تھی۔ چیزیں اور لوگ بدلے بدلے دکھائی دیتے تھے۔ ایک سال کے عرصے میں بعض چیزیں بدل بھی گئی تھیں۔ مگر بڑی بات یہ تھی کہ میں انہیں مختلف نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پہلی مرتبہ گھر آنے پر میں افراد خانہ سے کچھ الگ سا رہنے لگا۔ پہلے چھوٹی اور معمولی باتوں پر اختلاف ظاہر ہونے لگا۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ یہ اختلافات بڑے ہوتے گئے۔

دیہی اور شہری زندگیوں کے متضاد اثرات میری سکول کی زندگی پر چھائے رہے۔ میں نے محسوس کیا کہ شہر میں میرے تعلقات لوگوں سے زیادہ دیرپا تھے۔ فرانسیسی اور روسی زبان کے استادوں سے اختلاف کے سوا میں گھر اور سکول کے ڈسپلن میں پرامن طور پر وقت گزارتا رہا۔ اس میں زیادہ کمال موسی فیلپووچ کے گھر کے معیار زندگی کا تھا جس میں ایک سختی کے ساتھ ساتھ باہمی تعلقات کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ یہ درست ہے کہ دیہی زندگی طرح شہری زندگی کے بھی اپنے تضادات تھے، حقیقت میں وہ زیادہ تھے، لیکن شہر کے وہ پوشیدہ اور قابو میں رہتے تھے۔ روزمرہ کے کاروباری تعلقات کی وجہ سے شہر کے مختلف طبقات کے لوگ ایک دوسرے سے رابطے میں رہتے تھے۔ اس سے باہر ان کا وجود ایک دوسرے کے لئے بے معنی تھا۔ جیسے وہ کہیں موجود ہی نہیں تھے۔ دیہات میں ہر بات کھلے طور پر ہوتی تھی۔ کسی سے کوئی پردہ نہیں تھا۔ گاؤں میں میرا برتاؤ غیر متوازن اور جھگڑالو ہوتا تھا۔ کئی ایسے مواقع بھی آئے تھے کہ جب فینی سولومونفنا نے یانوفکا میں میری ماں بہن کی طرف داری کی تو میں اس سے ناراض ہو گیا تھا۔ لیکن شہر میں میرے تعلقات بڑے دوستانہ بلکہ محبت پر مبنی ہوتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے جھگڑے چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہو جاتے تھے۔ ایک دفعہ جھگڑے کی وجہ خاصی بڑی نکل آئی۔

ایک بار میں نے عمدہ سوٹ پہن رکھا تھا، ٹوپی بھی شاندار تھی، کمر کی بیلٹ بھی عمدہ چمڑے کی تھی۔ مجھے احساس ہو رہا تھا۔ کہ میں بہت خوبصورت لگ رہا تھا اور ہر ایک کو اپنا آپ دکھاتا پھر رہا تھا۔ جب موسم سرما کی گندم کی کٹائی اپنے عروج پر تھی تو میں اپنے باپ کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر کھیتوں میں گیا۔ فصل کی کٹائی کے نگران آرخپ کی نگرانی میں دس مرد اور بارہ عورتیں کٹی ہوئی فصل کے گٹھے بنا رہے

تھے۔ اوتھریشر میں ڈال کر گندم کے دانے اور بھوسہ الگ کر رہے تھے۔ عورتوں کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ مشینوں کی آوازیں یوں آرہی تھی جیسے گرم ہوا سیٹیاں بجارہی ہو۔

دیکھتے ہیں اس موسم سرما کی گندم کیسی ہے''۔ میرے باپ نے فصل کاٹنے والی مشین پر آرزچ کی جگہ لیتے ہوئے کہا۔ میں اشتیاق سے اسے دیکھتا رہا۔ میرا باپ مشین چلا رہا تھا اور فصل کٹتی جا رہی تھی۔ آرزچ باپ کی کٹائی کی مہارت کو بڑی تحسین آمیز آنکھ سے دیکھ رہا تھا۔ دوسروں کا رویہ الگ الگ تھا۔ کسی کا رویہ ہمدردانہ تھا میرا باپ اب یہ کام کرنے کا اہل نہیں رہا تھا۔ بعض بڑی عدم توجہ سے دیکھ رہے تھے۔ جیسے یہ کوئی بڑا کارنامہ نہیں تھا۔ کچھ کا خیال تھا کہ بوڑھا اپنی نمائش کر رہا تھا۔ میں ان کے خیالات کی ترجمانی صحیح الفاظ میں نہیں کرسکتا تھا۔ مگر ان کے درمیان جو مشینی قسم کے پیچیدہ تعلقات تھے مجھے ان کا شدید احساس تھا۔

جب باپ دوسرے کھیت میں چلا گیا تو میں نے بھی فصل کاٹنے والی مشین کو چلانے کی کوشش کی۔ ''اسے ایڑی سے چلاؤ ایڑی سے اور اپنا پنجہ آزاد رکھو۔ پنجے پر زور مت دو۔'' آرزچ مجھے مشورہ دے رہا تھا۔ لیکن طبعیت میں جوش کی وجہ سے مجھے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ میری ایڑی کہاں تھی۔ تیسرے پھیرے پر مشین کی درانتی زمین میں دھنس گئی۔ ''اگر تم مشین یونہی چلاتے رہے تو درانتی جلد ہی برباد ہو جائے گی''۔ آرزچ نے کہا۔ ''بہتر ہے باپ سے مشین چلانا سیکھ لو۔'' گھٹے باندھنے والی سنولائے چہرے والی ایک عورت جو گرد سے اٹی ہوئی تھی، طنزیہ انداز سے میری طرف دیکھ کر اندر ہی اندر ہنسی۔ میں پسینے میں بھیگا ہوا مشین سے اتر آیا۔ ''ابھی ماں کے پاس بیٹھ کر کیک کھاؤ''۔ عقب سے کسی نے مذاق کیا۔ یہ متزوکا تھا۔ میں اسے جانتا تھا۔ وہ بوٹ جیسے سیاہ چہرے والا ایک فصل کاٹنے والا تھا۔ یانوفکا میں آئے اس کا یہ تیسرا سال تھا۔ وہ گاؤں میں رہتا تھا۔ اور اپنے مزاح کی وجہ سے مشہور تھا۔ مگر زبان دراز تھا اور اپنے مالکوں کی شان میں کچھ نہ کچھ گستاخی کرتا رہتا تھا۔ اس کا مزاح اور جرات مجھے پسند تھے۔ لیکن اس کی بے شرمی اور بے لگامی دیکھ کر میں غصے سے کھولنے لگتا اور اس کے مذاق کو نظرانداز کر دیتا اسے جھاڑ پلا دیتا۔ اس وقت میری سمجھ میں سمجھ کچھ نہیں آرہا تھا۔

جب میں کھیتوں سے گھر واپس آیا تو میں نے اپنے مکان کی دہلیز پر ایک برہنہ پا عورت کو دیکھا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگا کر زمین پر بیٹھی تھی اور دروازے کی سیڑھیوں پر بھی بیٹھنے کی جرات

نہیں کر رہی تھی۔ وہ ذہنی طور پر پسماندہ گڈریے اگناٹکا کی ماں تھی اور سات میل چل کر ایک روبل لینے آئی تھی جو اس کا ہماری طرف نکلتا تھا۔ گھر میں کوئی نہیں تھا۔ لہٰذا اسے روبل نہیں مل سکتا تھا۔ اب اسے شام تک انتظار کرنا پڑتا تھا۔ وہ افلاس اور بے بسی کی مکمل تصویر تھی۔ میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ گیا۔

اگلے سال بھی صورتحال میں کوئی بہتری پیدا نہ ہوئی بلکہ پہلے سے بھی زیادہ خراب ہو گئی۔ میں باہر سے کھیل کر آ رہا تھا کہ صحن میں باپ سے میرا سامنا ہو گیا۔ وہ ابھی ابھی کھیتوں سے واپس آیا تھا۔ وہ مٹی سے اٹا اور تھکا ہوا تھا جس کے باعث اس کا مزاج خراب تھا۔ ایک برہنہ پا چھوٹے قد کا آدمی اس کے پیچھے پا چھوٹے قد کا آدمی اس کے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ وہ اس سے کہہ رہا تھا۔ ''خدا کے لئے میرے گائے واپس کر دیں''۔ تمہاری گائے نے دس کوپک کی فصل کھائی ہوگی مگر اس نے دس روبل کا نقصان پہنچایا ہے''۔ کسان برابر معافی مانگ رہا تھا۔ مگر اس کی آواز میں نفرت کا ایک عنصر بھی چھپا ہوا تھا۔ اس منظر نے مجھے اندر سے مکمل طور پر چکنا چور کر دیا۔ کھیل کے بعد میں جس اچھے موڈ میں گھر واپس آیا تھا وہ ایک بڑی اداسی میں بدل گیا۔ میں اپنے باپ کے پاس سے گزر کر اپنے سونے کے کمرے میں آ گیا اور بستر پر گر کر رونے لگا۔ باپ ہال کمرے سے کمرے سے گزر کر کھانے والے کمرے میں آ گیا۔ کسان گڑ گڑاتا ہوا اس کے پیچھے آ رہا تھا۔ وہ گھر کی دہلیز پر آ کر رک گیا۔ میں دونوں کی آوازیں سن رہا تھا۔ پھر کسان چلا گیا۔ ماں چکی سے واپس آ چکی تھی۔ میں نے ایک دم اس کی آواز پہچان لی۔ کھانے کے لئے پلیٹیں لگائی جا رہی تھیں۔ ماں مجھے بلا رہی تھیں۔ مگر میں جواب دیے بغیر روئے جا رہا تھا۔ آنسو مجھے سکون دے رہے تھے۔ پھر دروازہ کھلا اور ماں کمرے میں آ کر مجھ پر جھک گئی۔

''کیا بات ہے لیوا؟''

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ ماں اور باپ نے ایک دوسرے سے سرگوشی میں کچھ کہا۔

''تم اس کسان کی وجہ سے پریشان ہو؟ ہم نے اس کی گائے واپس کر دی ہے اور اس سے جرمانہ بھی نہیں لیا۔''

''میں اس کی وجہ سے پریشان نہیں ہوں۔'' میں نے تکیے کے اندر سے جواب دیا۔ جس وجہ سے رو رہا تھا اس پر شرمندہ بھی تھا۔

''ہم نے اس سے کچھ نہیں لیا۔'' ماں بار بار کہہ رہی تھی۔

یہ میرا باپ تھا جسے میرے رونے کی وجہ معلوم ہوگئی تھی اور اسی نے میری ماں کو بتایا تھا۔ جب میں باپ کے پاس سے گزر رہا تھا تو اس نے ایک ہی نظر میں میرے چہرے کو پڑھ لیا تھا۔

ایک دن جب میرا باپ گھر پر نہیں تھا تو ایک پولیس سارجنٹ آ گیا۔ وہ شکل سے لالچی، بدتمیز اور مغرور دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ورکروں کے پاسپورٹ مانگنے لگا۔ دو ورکروں کے پاسپورٹ کا عرصہ ختم ہو چکا تھا۔ ان کے مالکوں کو کھیتوں سے بلا کر ان کے زیر حراست ہونے کا اعلان کر دیا ان میں سے ایک بوڑھا شخص تھا جس کی براؤن گردن پر کئی بل پڑے ہوئے تھے۔ دوسرا اس کا جوان بھتیجا تھا۔ دونوں ہال کمرے میں آ کر پولیس سارجنٹ کے قدموں پر گر پڑے۔ وہ کہتے جا رہے تھے۔ ''ہم پر رحم کھائیں، ہم تباہ ہو جائیں گے۔''

پسینے سے بھیگا ہوا فربہ سارجنٹ اپنی تلوار سے کھیل رہا تھا۔ وہ دودھ کا ٹھنڈا گلاس پیتے ہوئے بولا۔ ''میں تو مصروف دنوں میں رحم کھاتا ہوں۔ آج تو چھٹی کا دن ہے۔ مجھے یوں لگا جیسے میں آگ پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں احتجاج کیا۔ ''بہتر ہو گا تم اپنے کام سے کام رکھو، نوجوان''۔ سارجنٹ نے سخت لفظوں میں مجھے جواب دیا۔ میری بڑی بہن نے اشارہ کر کے مجھے چپ رہنے کو کہا۔ وہ دونوں ورکروں کو لے کر چلا گیا۔

تعطیلات کے دوران میں اپنے بڑے بھائی اور بہن کے ساتھ جاگیر کا حساب کتاب رکھنے میں مصروف رہتا تھا۔ یعنی رجسٹر میں مزدوروں کے نام لکھتا تھا۔ ان کی مزدور کی شرائط کیا تھیں، انہیں ادائیگی کیسے کی جاتی تھی، کتنی جنس میں کتنی نقدی میں۔ اجرت ادا کرنے میں میں اپنے باپ کی مدد کیا کرتا تھا۔ ایسے موقع پر باپ اور میرے درمیان چھوٹی موٹی جھڑپ ہو جاتی تھی جسے مزدوروں کے سامنے دبا دیا جاتا تھا۔ حساب کتاب میں کوئی ہیرا پھیری نہیں کی گئی تھی۔ لیکن ملازمت کی شرائط ہمیشہ سخت ہوتی تھیں۔ مزدور، خاص طور پر بوڑھے جان جاتے تھے کہ لڑکا ان کا طرفدار تھا۔ یہ چیز میرے باپ کو غصہ دلا دیتی تھی۔

ایسی جھڑپوں کے بعد میں عموماً کتاب لے کر باہر چلا جاتا اور رات کے کھانے تک باہر ہی رہتا۔ ایک ایسے موقع پر طوفان نے مجھے کھیتوں میں گھیر لیا۔ بادل مسلسل گرج رہے تھے، موسلا دھار میدانی بارش برس رہی تھی، بجلی ہر طرف یوں چمک رہی تھی کہ جیسے مجھے پر گر کر ہی رہے گی۔ میں چلتا گیا۔

میرے جوتے بھیگ کر کسی کتے کی غراہٹ جیسی آواز نکالنے لگے تھے اور میری ٹوپی میں پانی بھر چکا تھا۔ جب میں گھر میں داخل ہوا تو میرا استقبال ترچھی نظروں اور خاموشی سے کیا گیا۔ بہن میرے لئے خشک کپڑے اور کھانے کو کچھ لائی۔

چھٹیوں کے بعد جب میں واپس جاتا تو عموماً میرا باپ میرے ساتھ ہوتا تھا۔ ہمارے ساتھ کوئی مزدور نہیں ہوتا تھا۔ ہم اپنا سامان خود اٹھاتے تھے۔ بھاری بیگ باپ اٹھالیتا تھا۔ اس کی جھکی ہوئی کمر اور تنے ہوئے بازوؤں سے مجھے پتا چل جاتا تھا کہ اس اٹھانے کی کوشش کرتا لیکن جب سامان زیادہ ہی ہوتا اور اس میں اوڈیسہ کے رشتہ داروں کے لئے تحائف ہوتے تو ہم مزدور لے لیتے۔ باپ اجرت دینے میں کنجوسی سے کام لیتا اور مزدور ناراض ہو کر غیر اطمینانیت کی حالت میں چلا جاتا۔ مجھے اس سے بڑی تکلیف ہوتی۔ اس کے برعکس جب میں اکیلا سفر میں ہوتا اور مجھے مزدور کی ضرورت ہوتی تو میں اجرت دیتے وقت اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہتا اور اپنا جیب خرچ دے کر بھی مجھے یوں لگتا جیسے میں نے تھوڑا دیا تھا۔ یہ گھر کی تنگ فضا کا ردعمل تھا جو میری ساری زندگی میں میرے ساتھ چلتا رہا۔

شہر اور گاؤں میں میں پیٹی بورژوا ماحول میں رہتا تھا جہاں کا بڑا اصول حصول دولت کی جدوجہد تھا اس سلسلے میں میں نے کود کو اپنے بچپن کے دیہی ماحول اور جوانی کی شہری زندگی دونوں سے الگ کر لیا تھا۔ روپیہ کمانے کی حس، پیٹی بورژوا نقطہ نظر اور زندگی کی عادات ___ ان سب سے میں ایک زبردست جھٹکے کے ساتھ علیحدہ ہو گیا اور پھر کبھی ان کی طرف نہ آیا۔

مذہب اور قومیت کے دائروں میں دیہات اور شہر کے درمیان کوئی تفاوت نہیں تھا۔ اس کے برعکس وہ مختلف پہلوؤں سے ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے۔ میرے باپ کے کنبے میں مذہب پر زیادہ سختی سے عمل نہیں کیا جاتا تھا۔ شروع میں تھوڑا بہت رکھ رکھاؤ ضرور تھا۔ مقدس دنوں پر میرے ماں باپ عبادت گاہ میں جاتے تھے۔ ماں ہفتے کو دوسروں کی موجودگی میں سلائی کا کام نہیں کرتی تھی۔ جوں جوں بچے جوان ہوت گئے اور خوشحالی میں اضافہ ہوتا گیا، مذہبی رسومات کی پابندی کم ہوتی چلی گئی۔ باپ جوانی میں ہی خدا پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ آخری عمر میں تو ماں اور بچوں کے سامنے اس کا کھلم کھلا اظہار کرتا تھا۔ ماں اس موضوع سے گریز کرتی تھی اور ایسے موقع پر دعا کی خاطر اپنی آنکھیں آسمان کی اٹھالیتی تھی۔

جب میں سات یا آٹھ برس کا تھا تو کنبے میں خدا پر یقین کسی نہ کسی طرح چل رہا تھا۔ ایک

موقع پر ایک مہمان کے سامنے میرے ماں باپ میری ذہانت کی شیخی بگھار رہے تھے اور اسے میرے بنائے ہوئے خاکے اور میری لکھی ہوئی شاعری دکھا رہے تھے۔ مہمان نے ایک دم مجھ سے پوچھ لیا۔

''تم خدا کے بارے میں کیا جانتے ہو؟''

''خدا آدمی جیسی چیز ہے۔'' میں نے کسی جھجک کے بغیر جواب دیا۔

مہمان نے اپنا سر ہلایا۔ ''نہیں، خدا آدمی جیسا نہیں ہے۔''

''پھر خدا کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔ آدمی کے علاوہ میں فقط جانوروں اور پودوں کو جانتا تھا۔ مہمان، میرا باپ اور میری ماں آپس میں نگاہیں تبدیل کرنے لگے۔ جب بچے تسلیم شدہ اعتقادات سے منحرف ہونے لگیں تو بڑوں کو لازمی طور پر پریشانی ہوتی ہے۔

''خدا روح ہے۔'' مہمان نے کہا۔ اب میں نے مبہم مسکراہٹ کے ساتھ اپنے بڑوں کی طرف دیکھا اور ان کے چہرے پڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے یہ معلوم کرنا چاہا کہ وہ مذاق کر رہے تھے یا سنجیدہ تھے۔ میں نے ان کے علم کے سامنے سر جھکا دیا۔ جلد ہی میں اس خیال کو مان گیا کہ خدا ایک روح تھا۔ تھوڑی سی گستاخی کرتے ہوئے میں نے خدا کو اپنی ''روح'' سے جوڑ دیا۔ میرے نزدیک روح کا مطلب سانس تھا۔ جب موت آتی ہے تو سانس ختم ہو جاتی ہے۔ مجھے اس وقت تک معلوم نہیں تھا کہ روح فطری چیزوں میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

اپنی پہلی تعطیلات میں جب میں گھر آیا ہوا تھا اور صوفے پر سونے کی خاطر کھانے کے کمرے میں جا رہا تھا تو خدا کے بارے میں طالب علم ''زیڈ'' سے میری بحث چل پڑی۔ وہ یا نوفکا آیا ہوا تھا اور دیوان پر سوتا تھا۔ اس وقت مجھے یقین نہیں تھا کہ خدا تھا بھی کہ نہیں اور اس کے بارے میں زیادہ سوچا بھی نہیں کرتا تھا۔ اگر مجھے اس سلسلے میں کوئی یقینی جواب مل بھی جاتا تو مجھے کوئی پریشانی نہ ہوتی۔

''موت کے بعد روح کہاں چلی جاتی ہے؟'' میں نے تکیے پر جھکتے ہوئے زیڈ سے پوچھا۔

''جب آدمی سویا ہوتا ہے تو یہ کہاں چلی جاتی ہے؟'' اس نے الٹا سوال کر دیا۔

''یہ خاموش ہو جاتی ہے۔'' میں نے جاگنے کی کوشش کرتے ہوئے دلیل دی۔

''جب گھوڑا مر جاتا ہے تو اس کی روح کہاں چلی جاتی ہے؟'' زیڈ متواتر حملہ کرتا رہا۔

اس جواب نے مجھے مطمئن کر دیا اور میں آرام سے سو گیا۔

موسی فیلپووچ کے گھر میں مذہب کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ اس میں ایک چچی شامل نہیں تھی جس کی ویسے بھی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ میرا باپ چاہتا تھا کہ میں بائیبل پڑھوں۔ یہ اس کی خواہش اور افتخار کا مسئلہ تھا۔ لہٰذا میں نے اوڈیسہ میں ایک نہایت پڑھے لکھے بوڑھے آدمی سے سبق لینا شروع کر دیا۔ یہ پڑھائی چند ماہ جاری رہی جس نے میری اجداد کے اعتقاد کی تصدیق میں کوئی کردار انجام نہ دیا۔ بائیبل کے ایک سبق کے دو معنی نکلتے تھے۔ جس سے مجھے ایک سوال پوچھنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ میں بڑی احتیاط اور سفارت کاری سے کام لیتے ہوئے پوچھا۔ ''اگر یہ مان لیا جائے جیسا کہ بعض لوگ مانتے ہیں، کہ خدا کا کوئی وجود نہیں ہے۔ تو پھر یہ دنیا کیسے وجود میں آئی؟''

''ہوں'' استاد منہ میں بڑبڑایا۔ ''لیکن تم یہی سوال خدا کے خلاف بھی کر سکتے ہو۔'' بوڑھے نے بڑی ہنرمندی اور خوش مزاجی سے اپنے خیال کا اظہار کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرا استاد خدا پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ اس سے میرے ذہن کو مکمل طور پر سکون مل گیا۔

میرے سکول کی نسلی اور مذہبی آمیزش بڑی غلط اور مختلف الخیال تھی۔ مذہب کے تین استاد تھے ایک پروٹسٹینٹ، ایک کیتھولک اور ایک یہودی۔ روسی پادری آرچ بشپ کا بھتیجا تھا۔ وہ بڑا خوش شکل اور خواتین میں مقبول تھا۔ اس کی شکل یسوع کے مجسمے سے ملتی تھی۔ اس کے بال سنہرے تھے اور عینک فریم بھی۔ مذہب کا سبق شروع ہونے سے پہلے لڑکے مختلف گروپوں میں تقسیم ہو جاتے تھے۔ جو لڑکے پرانے اور دقیانوسی روسی اعتقاد نہیں رکھتے تھے وہ روسی پادری کی عین ناک کے نیچے کلاس روم سے باہر نکل جاتے تھے۔ ایسے موقع پر اس کے چہرے کے تاثرات خاص ہوتے تھے۔ جب لڑکے کلاس روم چھوڑ رہے ہوتے تو وہ اپنی حقارت کو عیسائی تحمل کے ذریعے نرم کرتا رہتا۔

''آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟'' وہ لڑکوں سے پوچھتا۔

''ہم کیتھولک ہیں'' اسے جواب ملتا۔

''اوہ کیتھولک۔'' وہ اپنا سر ہلاتا ہوا دہراتا۔ ''اچھا، اچھا، اور تم؟''

''ہم یہودی ہیں۔''

''اوہ، یہودی، اچھا، یہودی۔''

کیتھولک پادری ایک سیاہ سائے کی طرح دیوار کے ساتھ چلتا ہوا کمرے میں داخل ہوتا اور

پھراسی انداز میں کمرے سے یوں نکل جاتا کہ میں سال میں ایک دفعہ بھی اس کا شیو کیا ہوا چہرہ پوری طرح نہ دیکھ سکا تھا۔اس کا نام ژیگل مان تھا۔ وہ ایک اچھی فطرت کا انسان تھا۔ وہ ہمیں بائیبل میں سے تاریخ پڑھاتا اور یہودیوں کے متعلق بتاتا رہتا۔روسی زبان میں پڑھائے جانے والے ان سبقوں کو لڑکے کبھی سنجیدگی سے نہیں لیتے تھے۔

قومیت نے میرے ذہن میں کبھی آزادنہ حیثیت اختیار نہیں کی تھی۔اور نہ ہی روزمرہ زندگی سے اس کا کوئی زیادہ تعلق تھا۔ یہ درست ہے کہ 1881 کے قانون کے بعد جس کے تحت یہودیوں کے حقوق محدود کر دیے گئے تھے۔ میرا باپ خواہش کے باوجود مزید زمین نہیں خرید سکتا تھا۔ وہ اپنی زمین پٹے پر چپ چاپ دے دیتا تھا۔اس سے میری حیثیت پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا تھا۔ایک خوش حال جاگیردار کے بیٹے کی حیثیت سے میں افتادگان خاک کے بجائے مراعات یافتہ طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ ہمارے گھر میں روسی تعداد میں سکولوں میں داخلہ ملتا تھا جس کی وجہ سے میرا ایک سال ضائع ہو گیا تھا۔لیکن سکول میں میں ہمیشہ پہلے نمبر پر ہوتا تھا جس کے سبب پابندیوں سے متاثر نہیں ہوتا تھا۔

ہمارے سکول میں قومیتوں کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔لڑکے اور استاد بھی اس مسئلے پر دھیان رکھتے تھے اور اسے ہوا دینے پر پابندی تھی۔لیکن کبھی کبھی دبا ہوا مسئلہ سطح پر آ جاتا تھا۔تاریخ کے استاد لیوبی موف نے ایک بار ایک پولش لڑکے سے پوچھا کہ سفید روس اور لتھونیا میں کٹر کیتھولک عقیدے کے لوگوں پر سختی کیوں کی جاتی تھی تو وہ لڑکا زرد پڑ گیا۔اس کے دانت باہر نکل آئے اور اس سے ایک لفظ بھی نہ بولا گیا۔''تم بولتے کیوں نہیں ہو؟'' استاد نے اس کے دکھ سے مزہ کشید کرتے ہوئے پوچھا۔کلاس کے ایک لڑکے کا صبر جواب دے گیا اور وہ بولا۔مزیکوک ایک پول ہے اور کیتھولک ہے۔'' جرات کا اظہار کرتے ہوئے استاد بڑبڑایا۔''واقعی؟'' ''ہم یہاں قومیتوں میں فراق روا نہیں رکھتے۔''

پولش لوگوں کے بارے میں لیوبی موف کے خفیہ تعصب سے مجھے دکھ ہوا۔یہی رویہ برنارڈ کا جرمنوں کے ساتھ تھا۔روسی پادری لڑکوں کو دیکھ کر سر ہلانے لگتا تھا۔یہی قومی غیر ہمواری موجودہ نظام سے میری داخلی بیزاری کی سب سے بڑی وجہ تھی۔لیکن یہ بھی دوسری تمام ناانصافیوں کا ایک حصہ تھی۔اس نے میری شکایتوں کی فہرست میں کبھی کوئی نمایاں جگہ حاصل نہیں کی تھی۔

عام کے اوپر خاص، قانون کے اوپر حقیقت اور نظریے کے اوپر ذاتی تجربے کی برتری نے

ابتدائی عمر ہی سے میرے ذہن میں جڑ پکڑ لی تھی۔ اور یہ جڑ عمر میں اضافہ ہونے کے ساتھ زیادہ مضبوط ہوتی گئی۔ اس احساس کو واضح شکل دینے میں شہر نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ اسی نے بعد میں زندگی کے متعلق کوئی فلسفیانہ نظریہ تراشنے میں میری مدد کی۔ جب میں فزکس اور فطری تاریخ کے طالب علموں کی زبان سے ''بدقسمتی'' سوموار، یا سڑک عبور کرتے ہوئے کسی پادری کا مل جانا___ اس قسم کے توہماتی کلمات سنتا تو مجھے بڑا دکھ ہوتا اور میں تکلیف محسوس کرتا۔ مجھے اپنی ذہانت کی بے عزتی محسوس ہوتی اور میں انہیں اس قسم کے توہمات سے دور رکھنے کے لئے کچھ بھی کر گزرنے کو تیار ہو جاتا۔

مربع منحرف شکل والے کھیت کی پیمائش کرنے میں یافکا کے لوگ کئی گھنٹے صرف کر دیتے تھے۔ مگر میں یہی پیمائش جیومیٹری کے اصولوں کا اطلاق کر کے دومنٹ میں نکال لیتا تھا۔ لیکن میری پیمائش ان کے ''عملی'' تجربے سے مطابقت نہیں رکھتی تھی۔ لہٰذا وہ اسے قبول کرنے سے انکار کر دیتے تھے۔ میں اپنا جیومیٹری بکس نکال کر سائنس کے نام پر قسمیں کھاتا رہتا۔ پھر میں سخت الفاظ بھی استعمال کرتا مگر ان پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ لوگ دلیل کی روشنی قبول کرنے سے انکار کر دیتے جس سے مجھے تکلیف ہوتی تھی۔

ہمارے مکینک ایوان وسیلائی وچ کا اصرار تھا کہ وہ مستقل طور پر حرکت میں رہنے والی مشین بنا سکتا تھا۔ میری اس سے شدید بحث چلتی رہتی تھی۔

طاقت کو جمع کر لینے کا اصول اس کے نزدیک محض ایک خواب نما خیال تھا جس کا اس کے مسئلے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ''تم کتابی باتیں کرتے ہو۔ میں عملی باتیں کرتا ہوں۔'' وہ کہا کرتا تھا۔ میرا ذہن اس حقیقت کو قبول کرنے سے انکار کر دیتا کہ انسان تسلیم شدہ سچائیوں سے کیسے گریز کر کے اپنی غلطیوں اور فضول کی خواہشات پر اصرار کر سکتا ہے۔

بعد میں عام کی خاص پر برتری میری ادبی اور سیاسی زندگی کا اٹوٹ حصہ بن گئی۔ میں حقائق کے پیچھے قانون کو دیکھنے لگا۔ اس کا نقصان یہ ہوا کہ میں جلد بازی میں غیر درست عمومیت کی طرف چلا گیا، خاص طور پر جوانی کی عمر میں، جب میرا کتابوں اور تجربے سے حاصل کیا ہوا علم ابھی ناپختہ تھا۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ زندگی کے ہر شعبے میں عمومیت کے دھاگے کو ہاتھ میں پکڑے بغیر آگے نہیں بڑھ سکوں گا۔ وہ سماجی انقلابی اصلاح پسندی جو میری داخلی زندگی کا محور بن چکی تھی، اس کی بنیاد ہی چھوٹی چھوٹی خواہشوں کی تکمیل کے خلاف دشمنی پر تھی۔ میں نظریاتی طور پر غیر عمومی چیزوں کے حق میں ہرگز نہیں تھا۔

میں اپنے آپ پر ایک عقبی نظر ڈالوں گا۔ میرے اندر کا لڑکا کا بلا شبہ خواہش پسند، زود رنج اور مشکل پسند آدمی تھا جس کے ساتھ نبھاہ مشکل تھا۔ میرا خیال نہیں کہ جب وہ سکول میں گیا تو اس کے اندر اپنے ہم جماعتوں پر کسی قسم کی برتری کا احساس تھا۔ یہ درست ہے کہ گاؤں میں اسے مہمانوں سے بڑے فخر کے ساتھ ملایا جاتا تھا۔ لیکن وہاں اس سے موازنہ کرنے کے لئے کوئی دوسرا نہیں ہوتا تھا اور جب بھی شہری لڑکے یا نوفکا میں آتے تھے تو وہ اس سے بہتر پائے جاتے تھے۔ وہ اس سے عمر میں بڑے ہوتے تھے۔ لہٰذا ان کا قد بھی زیادہ ہوتا تھا۔ سکول ایک ایسی جگہ ہے جہاں مسابقت پھلتی پھولتی ہے۔ جس لمحے اس نے خود کو کلاس میں سب سے اوپر پایا اور دوسرے نمبر کے لڑکے کے درمیان اس کا فاصلہ بہت زیادہ تھا تو اسے احساس ہونے لگا کہ اس کی کارکردگی دوسروں سے بہتر ہو سکتی تھی۔ اس کے دوست بننے والے لڑکے اس کی قیادت کو تسلیم کرتے تھے۔ اس چیز نے اس کے کردار مثبت اثر ڈالا۔ استاد بھی اسے تحسین کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ کرزہانوسکی جیسے استاد تو اس پر خاص توجہ دیتے تھے۔ مجموعی طور پر استادوں کا رویہ اس کی طرف اچھا تھا مگر خاص توجہ والا نہیں تھا۔ اس کے بارے میں لڑکے منقسم تھے۔ اس کے دوست بھی تھے اور دشمن بھی۔

لڑکے میں خود تنقیدی کی کمی نہیں تھی۔ وہ کچھ زیادہ ہی نکتہ چین اور حرف گیر تھا۔ وہ اپنی ذہنی استطاعت اور کردار کی خاصیتوں سے غیر مطمئن تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس کے رجحان میں اضافہ ہوتا گیا۔ وہ کوئی جھوٹ بولنے کے دوران میں ہی خود پر سخت گرفت کرنے لگتا یا پھر اس بات پر خود پر طنز کرنے لگتا کہ دوسروں کی بتائی ہوئی کتابیں اس نے تمام کیوں نہیں پڑھ ڈالی تھیں۔ یہ تکبر اور برتری سے ملتی جلتی کوئی چیز تھی۔ یہ خیال کہ وہ دوسروں سے سب سے زیادہ کتابیں پڑھنے اور ذہانت میں سب سے اوپر چلا جائے، ہر وقت اس کے ذہن پر چھایا رہتا تھا۔ وہ سوچتا رہتا تھا کہ انسان کا مقصد کیا ہے؟ اس کا اپنا مقصد کیا ہے؟

ایک شام موسی فلیپووچ میرے سے گزرتا ہوا میرے پاس رک گیا اور اس نے بڑے پیار اور تقدس سے پوچھا: ''بزرگو! زندگی کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟'' وہ مجھ سے اس قسم کے سوال بڑے شاندار مگر طنزیہ انداز میں پوچھتا رہتا تھا۔ لیکن اس دفعہ میں نے محسوس کیا کہ جیسے اس نے میرے دل کی بات بوجھ لی تھی۔ واقعی میں زندگی کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ لیکن یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اتنی چھوٹی عمر

میں میں ایسے سوالوں پر کیوں غور کرتا رہتا تھا۔ میرا خیال تھا کی موسی فلیپو وچ میرے دل کی بات سمجھ گیا تھا۔ ''میرا خیال ہے میں نے کسی زخم کو چھولیا ہے۔'' اس نے اپنا لہجہ بدلتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے میرا کندھا نرمی سے تھپتھپایا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

کیا اس کنبے کے کوئی سیاسی نظریات تھے؟ موسی فلیپو وچ ایک حد تک آزاد خیال اور انسان دوست تھا۔ یہ گھرانہ سوشلسٹ ہمدردیاں بھی رکھتا تھا اور ٹالسٹائی کے خیالات کی حمایت کرتا تھا۔ سیاسی موضوعات پر کھل کر کبھی بحث نہیں ہوتی تھی، خاص طور پر میری موجودگی میں۔ اس کے پیچھے یہ ڈر ہو سکتا تھا کہ کہیں میں سکول میں کچھ کہہ نہ دوں اور کسی مصیبت میں پھنس جاؤں۔ جب کبھی موجودہ صورتحال پر یا انقلابی تحریک میں وقوع پذیر ہو جانے والے کسی واقعہ پر بڑوں کے درمیان گفتگو ہوتی تو یوں ظاہر کیا جاتا جیسے یہ کوئی پرانی بات تھی۔ جیسے زار الیگزینڈ دوم فلاں سال میں قتل ہوا تھا۔ یا کولمبس نے فلاں سال میں امریکہ دریافت کیا تھا۔ میرے آس پاس کے لوگوں کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

سکول کے زمانے میں میرے کوئی سیاسی نظریات نہیں تھے۔ اور نہ ہی میری کوئی ایسی خواہش تھی۔ لیکن میرے لاشعور میں مخالفت کی روح کام کرتی رہتی تھی۔ میں موجودہ نظام، ناانصافی اور ظلم کے سخت خلاف تھا۔ یہ احساس کہاں سے آیا تھا؟ یہ زار الیگزینڈ رسوم کے عہد حکومت نے پیدا کیا تھا۔ پولیس کی بدو ماغی، جاگیرداروں کا استحصال، نوکرشاہی کا غرور، قومی نوعیت کی پابندیاں، سکول میں ناانصافیاں، بچوں، ملازموں اور دیہات میں کسانوں اور مزدوروں سے میرا قریبی رابطہ، ورک شاپ میں کارکنوں کی گفتگو، موسی فلیپو وچ کے گھر کی انسانی روح، نکراسوف کی نظموں اور دوسری کتابوں کا مطالعہ اور اس وقت کا مجموعی سماجی ماحول ___ میرے دو ہم جماعت رودزی وچ اور کولوگریوف ان سب موضوعات پر بڑے مخالفانہ موڈ میں باتیں کیا کرتے تھے۔

ولادیمیر رودزی وچ ایک کرنل کا بیٹا تھا اور ایک عرصے تک ہمارے گریڈ میں دوسرے نمبر پر رہتا تھا۔ اس نے والدین سے اجازت لے کر ایک اتوار کو مجھے اپنے گھر مدعو کیا۔ میرا استقبال ایک روکھے پن مگر قدرے عزت کے ساتھ کی گیا۔ کرنل اور اس کی بیوی نے مجھ سے بہت کم باتیں کیں اور یوں لگتا تھا جیسے تفتیش کر رہے تھے۔ اس گھر میں اپنے تین یا چار گھنٹوں کے قیام کے دوران میں کچھ ایسی باتیں کہہ گیا جو مجھے خود پسند نہیں تھیں۔ یہ اس وقت ہوا جب گفتگو مذہب اور مقتدرہ پر ہو رہی تھی۔ اس گھر میں ایک

قدامت پسندانہ قسم کا تقدس تھا جو میرے سینے پر چوٹ کی طرح لگا۔ بعد میں ولادیمیر کے والدین نے اسے میرے گھر جانے کی اجازت نہ دی اور یوں یہ رابطہ ٹوٹ گیا۔ اوڈیسہ میں پہلے انقلاب کے بعد رودزی وچ کا نام خاصا مشہور تھا۔ اس کی ''وجہ بلیک ہنڈرڈ'' نامی تنظیم کا ممبر ہونا بھی ہوسکتی تھی۔

کولوگریوف کا معاملہ اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ تھا۔ وہ کرسمس کے بعد سکول میں دوسرے گریڈ میں داخل ہوا تھا۔ وہ اپنے لمبے قد اور بے ڈھنگی چال کے سبب بڑا نمایاں دکھائی دیتا تھا مگر ناقابل یقین حد تک محنتی تھا۔ وہ جب چاہتا ہر چیز زبانی یاد کر لیتا تھا۔ پہلے ماہ کے آخر تک اس کا دماغ سبق یاد کر کے مکمل طور پر ایک مرکب بن چکا تھا۔ جب جغرافیہ کا استاد اسے اپنا سبق سنانے کے لئے کہتا تو وہ اس کا سوال سنے بغیر ایک دم بولنا شروع کر دیتا۔ ''یسوع مسیح دنیا میں اپنی حکمرانی چھوڑ گیا۔'' اسے یہ یاد دلانا ضروری ہو جاتا تھا کہ اگلا پیریڈ مذہب کا تھا۔

ایک دفعہ کولوگریوف سے گفتگو کرتے ہوئے میں سکول کے پرنسپل اور ایک دوسرے آدمی کے بارے میں کوئی نکتہ چینی کر گیا۔ ''تم نے پرنسپل کے متعلق ایسی بات کیوں کی؟'' اس نے ایک جائزہ دکھ کے ساتھ کہا۔ ''اس میں کون سی برائی ہے؟'' میں نے زیادہ خلوص کے ساتھ کہا۔ ''وہ ہمارا پرنسپل ہے۔ اگر وہ تمہیں حکم دے کہ اپنا سر اتار دو اور پھر اسے پاؤں تلے روندتے ہوئے چلو تو ایسا کرنا تمہارا فرض ہے۔ اس پر تنقید کرنا درست نہیں۔'' میں یہ سن کر حیران رہ گیا۔ اس وقت مجھے یہ خیال نہ آیا کہ اس کا تعلق ایک جاگیردار گھر سے تھا۔ وہ گھر میں جو کچھ سنتا تھا وہی اس نے دہرا دیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے لئے بعض نظریات کو قبول کرنا اتنا ہی ناممکن تھا جتنا کیڑوں سے بھرا ہوا کھانا کھانا۔

روس کے سیاسی نظام سے نفرت کے ساتھ ساتھ میں نے اپنے ذہن میں مغربی یورپ اور امریکہ کا ایک سہانا نقشہ بنانا شروع کر دیا۔ میں ادھر ادھر سے معلومات جمع کر کے ایک ایسی ثقافت کو ذہن میں لانے لگا جو بہت بلند تھی اور جس میں ہر چیز شامل تھی۔ بعد میں یہ میری محبوب جمہوریت کا لازمی حصہ بن گئی۔ استدلال کا تقاضا ہے کہ اگر کسی چیز کو بطور نظریہ قبول کر لیا جائے تو پھر اسے عملی لباس بھی پہنانا چاہیے۔ اسی وجہ سے یہ بات ناقابل یقین لگتی ہے کہ یورپ کے لوگ توہم پرست نکلیں اور مذہب وہاں اپنا پورا اثر دکھائے، امریکہ میں سفید لوگ کالے لوگوں پر ظلم کریں۔ مغربی یورپ کی یہ سہانی تصویر جو میں نے اپنے حالات کو سامنے رکھ کر غیر محسوس طریقے سے بنائی تھی، میرے انقلابی نظریات کی تشکیل کے دوران

بھی میرے ساتھ چلتی رہی۔ اس وقت اگر میں یہ سن لیتا تو بے حد حیران ہوتا کہ جمہوریہ جرمنی جس کی سوشل ڈیموکریٹک حکومت تھی، شاہ پرستوں کو تو اپنی سرحدوں کے اندر آنے دیتی ہے مگر انقلابیوں کو سیاسی پناہ حاصل کرنے کا حق نہیں دیتی۔ میری خوش قسمتی ہے کہ اس وقت سے بہت سی چیزوں نے مجھے حیران کرنا بند کر دیا ہے۔ زندگی نے استدلال کو میرے اندر سے نکال کر باہر پھینک دیا ہے اور مجھے جدلیات کا طریقہ کار سکھا دیا ہے۔ اب تو ہر من ملر بھی مجھے حیران نہیں کر سکتا۔

ٹوٹ پھوٹ

روس کی اس سیاسی تبدیلی کی پیمائش عشروں سے کی جاتی ہے جس کا آغاز پچھلی صدی کے وسط میں ہوا تھا۔ کریمن جنگ کے بعد ساٹھ کا عشرہ چھوٹی عمر پانے والی اٹھارویں صدی کی روشن خیالی کو یاد کرنے کا عہد تھا اگلے عشرے میں ہمارے دانشور روشن خیالی کے نظریوں سے عملی نتائج نکالنے کی کوشش میں مصروف رہے۔ اس عشرے کا آغاز لوگوں کے پاس انقلابی پراپیگنڈا لے جانے سے ہوا۔ اس کا اختتام دہشت گردی پر ہوا۔ ستر کا عشرہ ''عوامی رضا'' نامی تحریک کی نذر ہو گیا۔ اور وہ اسی تحریک کے نام سے تاریخ میں درج ہوا۔ اس نسل کے بہترین عناصر بارود کی جنگ کے شعلوں کی لپیٹ میں آ گئے۔ دشمن تمام محاذوں پر ڈٹا رہا۔ پھر اُسی کا عشرہ آ گیا جو نظریوں سے مایوسی، اداسی اور زوال کا عشرہ تھا۔ اس میں مذہب اور اخلاقیات کی تلاش ہوتی رہی۔ ردعمل کے پردے پیچھے سرمایہ داری کی طاقتیں اپنے کام میں اندھا دھند مصروف رہیں۔ نوے کا عشرہ اپنے ساتھ کارکنوں کی ہڑتالیں اور مارکسی نظریات لایا۔ یہ لہر نئی صدی کے آغاز پر 1905 میں اپنے انتہا کو پہنچ گئی۔

اُسی کا عشرہ پوبوڈ ونوتیف کے اثرات لئے ہوئے گزر گیا۔ پوبوڈ نوتیف کلیسا کا مختیار کل اور اشرافیہ کی طاقت اور عالمی عدم تبدیلی کا بہت بڑا علم بردار تھا۔ آزاد خیال اسے ایک ایسا افسر سمجھتے تھے جسے زندگی کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ لیکن یہ سچ نہیں تھا۔ پوبوڈ ونوتیف آزاد خیالی سے آگے کہیں زیادہ کی گہرائیوں میں پوشیدہ تضادات کو سمجھتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر ایک دفعہ پیچ ڈھیلے پڑ گئے تو پھر نیچے کا دباؤ سماجی زندگی کی چھت کو ایک دھماکے سے اڑا کر پرزے پرزے کر دے گا اور جن چیزوں کو پوبوڈ ونوتیف اور آزاد خیال لوگ ثقافت اور اخلاقیات کے ستون سمجھتے تھے وہ دھڑام سے گر کر مٹی کا ڈھیر

بن جائیں گی۔ آزاد خیالوں کی بجائے پوبودونوتیف اس منظر کو زیادہ گہری آنکھ سے دیکھ رہا تھا۔ یہ اس کا قصور نہیں تھا کہ تاریخ کا عمل بازنطینی نظام سے زیادہ گہری آنکھ سے دیکھ رہا تھا۔ یہ اس کا قصور نہیں تھا کہ تاریخ کا عمل بازنطینی نظام سے زیادہ طاقت ور ثابت ہوا جس کا دفاع وہ اور الیگزینڈر سوم اور نکولاس دوم کے حامی اپنی پوری طاقت سے کر رہے تھے۔

اُسی کے مردہ عشرے میں جب آزاد خیال یہ سمجھ رہے تھے کہ ہر چیز بے جان ہو چکی تھی، پوبوڈونوتیف ابھی تک اپنے پیروں تلے زیرزمین کہیں گڑگڑاہٹ محسوس کر رہا تھا۔ وہ الیگزینڈر سوم کے نام نہاد پرسکون عہدِ حکومت میں بھی خود کو پرسکون محسوس نہیں کر رہا تھا۔ ''وقت سخت تھا اور ابھی تک سخت ہے اور یہ تسلیم کرنا کڑوی گولی نگلنے کے برابر ہے کہ یہ عمل جاری رہے گا۔'' اس نے اپنے بااعتماد لوگوں کو لکھا رہا ہوں۔ میں ہر لمحہ وقت کا مزاج دیکھ رہا ہوں۔ لوگوں کو بھی دیکھ رہا ہوں۔ حال کا ماضی بعید سے موازنہ کرتے ہوئے میں محسوس کرتا ہوں کہ ہم ایک عجیب دنیا میں رہ رہے ہیں جہاں ہر چیز پیچھے کی طرف ایک بڑی ابتری کی طرف جا رہی ہے اور اس افراتفری کے عین درمیان ہم خود کو بے بس کر رہے ہیں۔'' پوبوڈ آونوشیف 1905 کا سال دیکھنے کے لئے زندہ رہا جب زیرزمین طاقتیں جن سے وہ اس درجہ خوف زدہ تھا، زمین پھاڑ کر باہر نکل آئیں اور پورے پرانے ڈھانچے کی دیواروں اور بنیادوں میں گہری دراڑیں پڑ گئیں۔

1891 کا سال جو فصلوں کی تباہی اور قحط کے لئے مشہور ہے، ملک میں سیاسی ٹوٹ پھوٹ کا سال ثابت ہوا۔ نیا عشرہ مزدور سوال کا مرکز بن گیا۔ روس ہی میں نہیں بلکہ 1901 میں جرمن سوشل ڈیموکریٹ پارٹی نے بھی ارفرٹ پروگرام اپنا لیا۔ پوپ لیو xiii نے محنت کشوں کی شرائط کے تحت اپنا فرمان جاری کیا۔ ولہم ان سماجی خیالات سے بڑا پریشان تھا جو پاگل پن کی حد تک لاعلمی اور نوکرشاہی رومانیت کا مرکب تھے۔ زار اور فرانس کے درمیان تعلقات کی بحالی روس میں سرمائے کے داخلے کا سبب بن گئی۔ وٹ کا تقرر بطور وزیرِ خزانہ صنعتی تحفظ کے عہد کا آغاز ثابت ہوا۔ سرمایہ داری کی طوفانی ترقی ''وقت کا مزاج'' بن گئی جس نے پوبوڈونوشیف کو اس قدر تکلیف میں ڈال رکھا تھا اور وہ بے چین کر دینے والی پیشن گوئیاں کر رہا تھا۔

سیاسی تبدیلی کا ظہور سب سے پہلے دانشوروں میں ہوا۔ نوجوان مارکسی بڑی تیزی سے اور

فیصلہ کن انداز میں حرکت میں آ گئے۔ اس کے ساتھ ہی اونگھتی ہوئی پاپولسٹ تحریک بھی بیداری کے آثار دکھانے لگی۔ 1893 میں پہلی بار سٹرویو کا لکھا ہوا مارکسی کام قانونی طور پر شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔ اس وقت میں چودہ برس کا تھا اور ایسے کاموں سے ابھی بہت دور تھا۔

1894 میں الیگزینڈر سوم وفات پا گیا۔ جیسا کہ عام طور پر ایسے مواقع پر ہوتا ہے، تخت کے نئے جانشین سے بڑی اچھی امیدیں وابستہ کی جانے لگیں۔ اس نے ایک ٹھوکر سے جواب دیا۔ جب ژمٹوف راہنما زار کو ملنے گئے تو اس نے ان کے خیالات کو ''احمقوں کے خواب'' قرار دیا۔ اس کی یہ تقریر پریس میں آ گئی۔ ایک سنی سنائی بات یہ ہے کہ جس کاغذ سے زار نے اپنی تقریر پڑھی تھی اس میں ''بے بنیاد خواب'' لکھا ہوا تھا۔ لیکن زار غصے میں اپنی مرضی کے خلاف کچھ زیادہ غصہ کر گیا۔ اس وقت میں پندرہ برس کا تھا۔ میں ایک حد تک ''احمقانہ خوابوں'' کی طرف تھا۔ مبہم طور پر میرا بتدریج ترقی میں یقین تھا جس نے پس ماندہ روس کو ترقی یافتہ یورپ کے نزدیک لے آنا تھا۔ میرے سیاسی خیالات کی اس سے آگے رسائی نہیں تھی۔

متعدد نسلوں اور رنگوں والا کاروباری اور پرشور شہر اوڈیسہ سیاسی لحاظ سے دوسرے شہروں سے غیر معمولی طور پر بہت پیچھے تھا۔ اس وقت سینٹ پیٹرز برگ، ماسکو اور کیو کے تعلیمی اداروں میں بے شمار سوشلسٹ سرکل موجود تھے۔ جبکہ اوڈیسہ میں کوئی نہیں تھا۔ 1895 میں فریڈرک اینگلز وفات پا گیا تھا۔ روس کے مختلف شہروں میں اس کی یاد میں منعقد ہونے والے جلسوں میں طلبا خفیہ رپورٹیں پڑھ رہے تھے۔ اس وقت میں اپنے سولہویں برس میں تھا۔ لیکن میں اینگلز کے نام سے واقف نہیں تھا اور مارکس کے بارے میں بھی مشکل سے کچھ کہہ سکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے اس کا نام ہی نہیں سنا تھا۔

میرے ذہن کا سیاسی فریم سکول میں مبہم طور پر مخالفانہ رجحان رکھنے والا تھا اور اس سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ اس زمانے میں طالب علم ابھی انقلابی سوالوں سے واقف نہیں ہوئے تھے۔ سننے میں آیا تھا کہ لوگوں کا کوئی گروہ نوویک جو چیک کا باشندہ تھا، اس کے پرائیویٹ جمنیزیم میں آپس میں ملتا تھا۔ وہاں کچھ گرفتاریاں بھی ہوئیں تھیں، نوویک جو ہمارا کھیلوں کا انسٹرکٹر تھا، اسے ملازمت سے نکال دیا گیا تھا اور اس کی جگہ ایک فوجی افسر کو رکھ لیا گیا تھا۔ موسی فلیپووچ کے گھر کے نواح میں غیر اطمنانیت پائی جاتی تھی۔ لیکن کہا جاتا تھا کہ حکومت کو کوئی ہلا نہیں سکتا تھا۔ جرات مند لوگوں نے بھی کئی عشروں کے بعد ایک

ممکن دستور کا خواب دیکھا تھا۔ جہاں تک یا نوفکا کا تعلق ہے وہاں تو اس موضوع پر کبھی بات ہی نہیں ہوئی تھی۔ جب میں سکول سے گریجویشن کر کے گاؤں آیا اور اپنے ساتھ جمہوری خیالات لایا تو میرا باپ ایک دم چوکنا ہو گیا اور اس نے غصے میں کہا۔ ''یہ تین سو سال میں بھی ممکن نہیں ہے۔'' وہ انقلاب پسندوں کی جدوجہد کو بیکار سمجھتا تھا اور اپنے بیٹے کی طرف سے تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ 1921 میں جب وہ سرخ اور سفید خطروں سے بچ بچا کر مجھے کریملن میں ملنے آیا تو میں نے اسے مذاق کرتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ کو یاد ہے کہ آپ کیا کہا کرتے تھے؟ زار کا حکم اگلے تین سو سال تک چلے گا۔'' بوڑھا قدرے عیاری سے مسکرایا اور پھر اس نے یوکرانی زبان میں جواب دیا۔ ''اس دفعہ تمہاری سچائی کو بھی دیکھ لیتے ہیں۔''

نوے کے عشرے کے ابتدائی برسوں میں دانشوروں میں ٹالسٹائی کا رجحان ختم ہونا شروع ہو گیا تھا۔ مارکس ازم ایک فتح مندی سے آگے بڑھ رہا تھا اور ایک مقبول عام تحریک کی شکل اختیار کر رہا تھا۔ ہر قسم کی کتابوں میں نظریاتی جدوجہد کی بازگشت سنائی دیتی تھی۔ ہر جگہ پر اعتماد نوجوان دکھائی دیتے تھے جو خود کو مادہ پرست کہتے تھے۔ میں نے یہ سب کچھ پہلی مرتبہ 1896 میں دیکھا تھا۔

ذاتی اخلاقیات کا سوال جو اسی کے عشرے کے غیر متحرک نظریے سے بری طرح جڑا ہوا تھا، اس نے مجھے ایک ایسے زمانے میں متاثر کیا جب ''ذاتی جامعیت'' میری روحانی ترقی کا تقاضا نہیں تھی۔ بعد میں ''ذاتی جامعیت کا سوال دنیا کے متعلق میرے عمومی نقطہ نظر سے جڑ گیا جو مجھے ایک دوسرے بنیادی مخمصے کی طرف لے گیا۔ یعنی عوام کے حقوق کے لئے نعرہ بازی یا مارکسزم؟ ان رجحانات کا تصادم میرے اندر جڑ پکڑتا گیا۔ جب میں معاشی سائنس کے ابتدائی اسباق سیکھ رہا تھا اور یہ سوچ رہا تھا۔ کہ روس کو سرمایہ داری کے مرحلے سے گزرنا چاہیے کہ نہیں'' پرانی نسل کے مارکسیوں نے کامیابی سے محنت کشوں کے لئے ایک راستہ تلاش کر لیا تھا اور وہ سوشل ڈیموکریٹ بن گئے تھے۔

سترہ برس کی عمر میں میں سیاسی لحاظ سے بڑی حد تک غیر مسلحہ اور نہتا ایک دوراہے پر کھڑا تھا۔ کسی تسلسل اور تنظیم کے بغیر بہت سے سوال میرے سامنے کھڑے تھے۔ میں بے چینی سے اپنے اردگرد دیکھتا تھا۔ ایک بات یقینی تھی۔ اس وقت بھی زندگی نے میرے شعور میں سماجی احتجاج کا مادہ بھر رکھا تھا۔ یہ کس چیز پر مشتمل تھا؟ افتادگان خاک کے لئے ہمدردی اور ناانصافی کے خلاف غم وغصہ موخرالذکر جذبہ زیادہ مضبوط تھا۔ بچپن ہی سے انسانوں کی روزمرہ زندگی میں عدم مساوات میرے لئے ایک بڑا مسئلہ بن

گئی تھی۔ ناانصافی نے مجھے ادب اور گستاخ بنا دیا تھا۔ انسانی وقار کو ہر جگہ پیروں تلے روندا جا رہا تھا۔ کسانوں کو کوڑے مارنا میری برداشت سے باہر تھا۔ کسی نظریہ سازی سے پہلے ہی یہ ساری چیزیں میرے ذہن پر نقش ہو چکی تھیں۔ اور ایک آتش گیر مواد بن گئی تھیں۔ یہی وہ چیزیں تھیں۔ جنہوں نے مجھے کسی بڑے نتیجے پر پہنچنے سے روکا ہوا تھا۔ یہ سب کچھ میری ابتدائی زندگی کے مشاہدے پر مشتمل تھا۔

میری نشوونما کا ایک دوسرا پہلو بھی تھا۔ جب ایک نسل دوسری نسل کی جگہ لیتی ہے تو مردے اس سے چمٹ جاتے ہیں۔ یہ حالت ان روسی انقلابیوں کی تھی جن کی جوانیاں اُسی کے عشرے کے بوجھ اور ماحول میں گزری تھیں۔ نئے اصولوں کے وسیع تناظر کے باوجود اس زمانے کے مارکسی حقیقت میں اُسی کے عشرے کی قدامت پسندی کے اسیر تھے، وہ کوئی جرات مندانہ اقدام کرنے سے ڈرتے تھے، جب مشکلات سامنے دکھائی دیتی تھیں۔ تو بے عمل ہو جاتے تھے اور انقلاب کو غیر یقینی مستقبل میں دھکیل دیتے تھے۔ وہ سوشلزم کو صدیوں پر مشتمل ارتقا کا عمل سمجھتے تھے۔

موسی فلپیووچ کے گھر میں سیاسی تنقید میرے آنے اور میرے جانے کے بعد بھی بلند آواز میں ہوتی تھی۔ میرے حصے میں بڑے فرسودہ سال آئے تھے۔ سیاسی موضوعات پر کم ہی بات ہوتی تھی۔ بڑے سوالات سے گریز کیا جاتا تھا۔ جب میرے انقلابی خیالات پروان چڑھ رہے تھے۔ تو میں عوام کے کسی عمل پر بداعتمادی کا رویہ اختیار کر لیتا اور انقلاب کے متعلق شک میں گرفتار ہو جاتا۔ میں اس صورتحال کا مقابلہ مطالعے اور سوچنے کے عمل سے کرتا رہا۔ اس سلسلے میں میرا عملی تجربہ بھی میری مدد کرتا رہا۔

اچھائی کے بغیر برائی کا وجود نہیں ہوتا۔ میں نے اپنے اُسی کے عشرے کی تھرتھراہٹوں کو شعوری کوشش سے قابو کر رکھا تھا جس سے میں عوامی عمل کے بنیادی مسائل کو زیادہ سنجیدہ اور جامع طریقے سے سمجھنے کے قابل ہو گیا تھا۔ مسابقت سے جو کچھ حاصل کیا جاتا ہے وہی دیرپا ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ میری کہانی کے اگلے ابواب میں آئے گا۔

میں نے ساتواں گریڈ اوڈیسہ میں نہیں بلکہ نکولائیف میں پڑھا تھا۔ یہ صوبے کا ایک قصبہ تھا جہاں کے سکول کا درجہ کم تر تھا لیکن نکولائیف میں میرا 1896 کا سال میری جوانی کا کایا پلٹ سال تھا۔ اس نے میرے اندر یہ سوال پیدا کیا تھا کہ انسانی معاشرے میں میری کیا جگہ تھی۔ میں ایک ایسے گھر میں رہتا تھا جہاں دوسرے بچے مجھ سے بڑے تھے اور وہ نئی تحریکوں کی گرفت میں آ چکے تھے۔ یہ بڑی نمایاں

بات تھی کہ میں ''سوشلسٹ خیالی جنت'' کے سب سے بڑے مخالفوں میں شامل تھا۔ میں ایک ایسے شک پرست کا کردار کر رہا تھا۔ جو ایسی تمام باتوں سے آگے بڑھ چکا تھا۔ سیاسی سوالوں پر میرا ردعمل بڑی طنزیہ برتری پر مشتمل ہوتا تھا۔ جس خاتون کے گھر میں میں رہتا تھا وہ بڑی حیرت سے مجھے دیکھتی اور مجھے بطور ایک ماڈل اپنے بچوں کے سامنے پیش کرتی، اگرچہ وہ مجھ سے ذرا بڑے تھے اور ان کے رجحانات کا جھکاؤ بائیں جانب تھا۔ لیکن میں ان کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم نہیں کر سکا تھا۔ اور میں ایسے نوجوان سوشلسٹوں کے اثر سے دور رہنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ یہ ہاری ہوئی جنگ چند ماہ جاری رہی۔ پھر ہوا میں تیرنے والے خیالات مجھ سے زیادہ طاقت ور ثابت ہوئے۔ مجھے ان کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ نکولائیف میں چند ماہ کے اندر ہی میرے رویے میں انقلابی تبدیلی آ گئی۔ میں اپنی قدامت پسندی کو چھوڑ کر اس تیزی کے ساتھ بائیں جانب آیا کہ میرے نئے دوست میری تیز رفتاری سے خوفزدہ ہو گئے۔ ''یہ کیسے ہو گیا؟'' خاتون خانہ کہا کرتی تھی۔ ''میں یونہی تمہیں ایک ماڈل کے طور پر اپنے بچوں کے سامنے پیش کرتی رہی۔''

میں نے اپنی پڑھائی کو نظر انداز کر دیا۔ بہر حال علم کے اس خزانے نے جو میں اوڈیسہ سے اپنے ساتھ لایا تھا مجھے نمایاں طالب علم کا درجہ دلوائے رکھا۔ میں زیادہ سے زیادہ کھیلوں میں مصروف ہو گیا۔ ایک مرتبہ انسپکٹر میرے گھر پر یہ پوچھنے آیا کہ سکول سے میرے غیر حاضر رہنے کی کیا وجہ تھی۔ میں بے عزتی سے زمین میں گڑ گیا۔ لیکن انسپکٹر بڑا اچھا تھا۔ اسے یہ دیکھ کر تسلی ہوگئی کہ جس گھر میں میں رہتا تھا وہ بڑا منظّم تھا اور میرا کمرہ بھی صاف ستھرا تھا۔ وہ یہ نہ جان سکا کہ میرے بستر کے نیچے کئی غیر قانونی سیاسی پمفلٹ پڑے تھے۔

نکولائیف میں، میں نوجوان مارکسیوں کے علاوہ سابق جلاوطن انقلابیوں سے بھی ملا جو پولیس کی زیر نگرانی تھے۔ یہ لوگ عوامی تحریک کے انحطاط کے زمانے کی یادگار تھے۔ اس وقت تک سوشل ڈیموکریٹ جلاوطنی سے واپس نہیں آ رہے تھے بلکہ جلاوطنی میں جا رہے تھے۔ ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی ہوئی دو تحریکوں نے نظریے کو گرد باد بنا دیا تھا۔ کچھ عرصہ میں بھی اس گرد باد میں پھنسا رہا۔ نام نہاد عوامی تحریک سے اب سرانڈ آنے لگی تھی۔ مارکسزم پر تنگ ذہنی کا جو الزام تھا اب دور ہو گیا تھا۔ میں اسے سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر یہ اتنا آسان کام نہیں تھا۔ میری راہنمائی کرنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ ہر نئی گفتگو مجھے تلخ

اور تکلیف دہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور کر دیتی کہ میں انتہائی جاہل تھا۔

گھر کے باغ کے مالی شیو یگوسکی سے میری بڑی دوستی ہو گئی تھی۔ جو بنیادی طور پر چیک باشندہ تھا۔ میرے جاننے والوں میں وہ پہلا آدمی تھا جو اخبارات میں مضامین لکھتا تھا، جرمن زبان پڑھ سکتا تھا، کلاسیکی ادب کو جانتا تھا اور مارکسیوں اور پاپولسٹوں کے مابین بحثوں میں خوب حصہ لیتا تھا۔ باغ کے اندر اس کا کمرہ طالب علموں، سابق جلاوطنوں اور مقامی نوجوانوں کے لئے ملنے ملانے کی جگہ بنا ہوا تھا۔ اس کے ذریعے کوئی بھی ممنوعہ کتاب حاصل کی جاسکتی تھی۔ جلاوطنوں کی گفتگو زیادہ تر یلیابوف، پروسکایا، فگنر جیسے پاپولسٹوں کے گرد گھومتی رہتی تھی جنہیں وہ کوئی بڑا ہیرو تو نہیں سمجھتے تھے مگر ان سے آشنائی اور دوستی کا دعوی ضرور کرتے تھے۔ مجھے احساس ہو رہا تھا۔ کہ میں ایک بڑی زنجیر میں ایک چھوٹے سے حلقے کی حیثیت سے داخل ہو رہا تھا۔

میں کتابیں ہضم کرتا جا رہا تھا اور ڈر بھی رہا تھا کہ عمل کی تیاری کے لئے میری ساری زندگی بھی کافی نہیں ہوگی۔ میرے مطالعے میں بے صبری، ژولیدہ خیالی اور بدنظمی تھی۔ گزشتہ عہد کے غیر قانونی پمفلٹ پڑھنے کے بعد میں نے جان سٹورٹ مل کی ''منطق'' پڑھی، اور اسے مکمل طور پر پڑھنے سے پہلے ہی لپرٹ کی ''منطق'' پڑھی، اور اسے مکمل طور پر پڑھنے سے پہلے ہی لپرٹ کی ''ابتدائی ثقافت'' پڑھنی شروع کر دی۔ بینتھم کی مادیت پسندی مجھے انسانی خیال پر حرف آخر محسوس ہوئی۔ چند ماہ تک میں اس کا زبردست مداح رہا۔ اسی طرح میں چرنیشوسکی کی حقیقت پسندانہ جمالیات کا گرویدہ ہو گیا تھا۔ لپرٹ کو ختم کیے بغیر میگنٹ کی تحریر کردہ انقلاب فرانس کی تاریخ پڑھنے میں گم ہو گیا۔ ہر کتاب میرے لئے ایک زندہ حقیقت تھی مگر مطالعہ کے کسی منظّم نظام کے بغیر۔ خود کو کسی ڈسپلن کے تحت لانے کے لئے میں کبھی کبھی پاگل ہو جاتا۔ اس کے ساتھ ہی یہ سوچ کر کہ مارکسزم تو ایک مکمل نظام دکھائی دیتا ہے، مین اس سے ذرا پرے ہٹ جاتا۔

میں نے اخبارات پڑھنے شروع کیے لیکن اس طرح نہیں جس طرح اوڈیسہ میں پڑھا کرتا تھا۔ بلکہ ایک سیاسی ذہن کے ساتھ۔ اس وقت سب سے معتبر اخبار ''روسکیا ویدوموستی'' تھا جو ماسکو سے نکلتا تھا۔ ہم پڑھنے کی بجائے اس کا مطالعہ کرتے تھے۔ بے جان داریے سے شروع ہو کر سائنسی مضامین تک۔ غیر ملکی نامہ نگاروں میں برلن کا نامہ نگار تو اخبار کی روح تھا۔ یہ ''روسکیا ویدوموستی'' ہی تھا جس کے

ذریعے میں نے پہلے پہل اپنے ذہن میں مغربی یورپ کی سیاسی زندگی کی کوئی تصویر بنائی تھی، خاص طور پر پارلیمانی جماعتوں کی۔ آج اس ہلچل اور جذبے کو ذہن میں لانا مشکل ہے جس کی ساتھ ہم بیبل اور اوجین رچر کی تقریریں سنا کرتے تھے۔ مجھے آج بھی ڈیشنسکی کا وہ جملہ یاد ہے جو اس نے پولیس کے پارلیمنٹ میں داخل ہونے پر کہا تھا۔ ''میں گالیسیا کے تیس ہزار محنت کشوں اور کسانوں کی نمائندگی کرتا ہوں۔ مجھے ہاتھ لگانے کی کون جرات کرے گا؟'' گالیسیا رکا یہ انقلابی ہماری نظر میں ایک بہت بڑی ہستی بن گیا تھا۔ لیکن افسوس پارلیمنٹ کے ڈرامائی سٹیج نے ہمیں بڑی بے رحمی سے دھوکہ دیا۔ جرمن سوشلزم کی کامیابیاں، امیریکہ میں صدارتی انتخابات، آسٹریا میں عوام کے لئے سب کچھ مفت'' فرانسیسی شاہ پرستوں کی سازشیں ___ اپنی ذاتی تقدیروں کی بجائے ہم ان میں زیادہ محو رہتے۔

اس دوران میرے تعلقات اپنی فیملی سے خراب تر ہوتے گئے۔ ایک دفعہ میرا باپ نکولائیف کی اناج منڈی میں آیا تو اسے میری نئی مصروفیات کا پتا چل گیا۔ اسے خطرے کا احساس تو ہو گیا تھا مگر اسے امید تھی کہ وہ باپ کا رعب استعمال کر کے مجھ پر قابو پالے گا۔ پھر ہم دونوں چند بڑے طوفانی مناظر سے گزرے۔ میں کوئی تعاون کیے بغیر اپنی آزادی اور اپنا راستہ خود تلاش کرنے کے حق کا دفاع کرتا رہا۔ بات یہاں ختم ہوئی کہ میں نے باپ سے کسی قسم کی مادی مدد لینے سے انکار کر دیا۔ میں اپنی رہائش گاہ چھوڑ کر شیویگووسکی کے ساتھ رہنے لگا جس نے ایک بڑا باغ پٹے پر لے لیا تھا اور وہاں زیادہ کھلی جگہ میں رہتا تھا۔ یہاں، ہم چھ لوگ ایک ہی جگہ رہ رہے تھے۔ گرمیوں کی تازہ ہوا اور کھلی فضا کی خاطر تپ دق میں مبتلا ایک یا دو طالب علم یہاں آ گئے۔ میں نے پرائیویٹ طور پر پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ ہم فقیرانہ زندگی گزارتے تھے۔ اور اپنا کھانا خود بناتے تھے۔ ہم نیلے رنگ کے کرتے پہنتے تھے۔ اور بانس کی ہیٹ اور کالی چھڑیاں استعمال کیا کرتے تھے۔ شہر میں خبر پھیلی ہوئی تھی کہ ہم نے کوئی خفیہ تنظیم میں شمولیت اختیار کر رکھی تھی۔ ہم بے حساب پڑھتے، بے حساب بحثیں کرتے اور بڑے اشتیاق اور جذبے کے ساتھ مستقبل میں جھانکتے رہتے۔ ہم اپنے آپ میں بڑے خوش تھے۔

کچھ عرصے بعد ہم نے لوگوں میں مفید کتابیں تقسیم کرنے کے لئے ایک تنظیم بنائی۔ ہم نے لوگوں سے چندہ لیا، سستے ایڈیشنوں والی کتابیں خریدیں مگر انہیں تقسیم نہ کر سکے۔ باغ میں ایک مزدور اور ایک کاریگر رہتا تھا۔ سب سے پہلے ہم نے انہیں پڑھانے کی کوشش کی۔ لیکن مزدور خفیہ پولیس والا نکل

آیا جسے ہماری نگرانی پر مور کیا گیا تھا۔اس نے کاریگر کو بھی اپنا ہم نوا بنا رکھا تھا۔وہ ہماری کتابوں کا ایک بڑا پیکٹ چرا کر ہیڈ کوارٹر لے گیا۔ظاہر ہے یہ آغاز بدشگونی پر مبنی تھا۔لیکن ہمیں اپنی کامیابی کی پختہ امید تھی۔

میں نے اوڈیسہ کے ایک عوامی نوعیت کے میگزین کے لئے ایک متنازعہ قسم کا مضمون لکھا۔یہ مارکسی رسالہ تھا۔اس میں مواد کے بجائے غصہ اور حوالہ جات زیادہ تھے۔میں نے مضمون ڈاک کے ذریعے بھجوا دیا ایک ہفتے بعد وہاں یہ معلوم کرنے گیا کہ مضمون کا کیا بنا تھا۔ایڈیٹر نے عینک کے موٹے موٹے شیشوں کے نیچے سے بڑی ہمدردی کے ساتھ مضمون نگار کو دیکھا۔اسے اس کے سر پر بالوں کے بڑے بڑے گچھے تو دکھائی دیے مگر داڑھی میں ایک بال بھی نظر نہ آیا۔مضمون شائع نہ ہو سکا۔مجھے بھی کوئی ایسا افسوس نہ ہوا۔کوئی بھی نقصان میں نہ رہا خاص طور پر میں۔

جب پبلک لائبریری کے بورڈ آف ڈائریکٹرز نے سالانہ فیس پانچ روبل سے چھ روبل کر دی تو ہمارا خیال تھا کہ جمہوریت کو ختم کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔لہٰذا ہم چوکنے ہو گئے۔چند ہفتے ہم نے کچھ نہ کیا اور لائبریری کے ارکان کا اجلاس بلانے کی تیاریوں میں لگے رہے۔ہم نے چندہ جمع کر کے زیادہ انقلابی لڑکوں کو ممبر بنوا دیا حالانکہ ان کی عمریں بیس برس سے کم تھیں جو قانونی ضرورت تھی۔ہم نے لائبریری کے درخواست کے رجسٹر کو ایک آتشیں کتابچہ بنا دیا۔جب سالانہ اجلاس بلایا گیا تو دو پارٹیاں آئیں۔ایک طرف سرکاری اہل کار، آزاد خیال، جاگیردار، اساتذہ اور نیوی کے افسر تھے۔دوسری طرف ہم جمہوریت پسند تھے۔ہر محاذ پر ہماری فتح ہوئی۔ہم نے پانچ روبل فیس بحال اور نئے بورڈ کا انتخاب کیا۔

اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کے لئے ہم نے امداد باہمی کی بنیاد پر اپنی ایک یونیورسٹی قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ہم بیس طالب علم تھے۔میرا شعبہ عمرانیات تھا۔اس کا بڑا نام تھا۔میں بڑے جوش وخروش سے اپنا نصاب تیار کیا۔مگر دو لیکچر ٹھیک ٹھاک طور پر دینے کے بعد مجھے احساس ہو گیا کہ میرے علم کا خزانہ ختم ہو گیا تھا۔دوسرا لیکچرار جس کا موضوع انقلاب فرانس تھا، ایک دم گڑبڑا گیا اور اس نے لکھ کر لیکچر دینے کا وعدہ کیا۔وہ اپنا یہ وعدہ بھی پورا کرنے میں ناکام رہا اور یوں ہماری یونیورسٹی اپنے انجام کو پہنچ گئی۔

پھر میں نے سوکولوسکی بھائیوں میں سے بڑے بھائی کے ساتھ مل کر ایک ڈرامہ لکھنے کا فیصلہ کیا۔اس مقصد کیلئے ہم عارضی طور پر اپنے کمیون سے علیحدہ ہو کر کسی کو اپنا اتا پتہ بتائے بغیر ایک کمرے

میں پوشیدہ ہو گئے۔ ہمارا ڈرامہ نسلوں کے تصادم کے پس منظر میں سماجی رجحانات سے بھرا ہوا تھا۔ ڈرامے کے دو ہی کردار تھے۔ ایک پالولسٹ اور دوسرا مارکسسٹ۔ پاپولسٹ کو کمزور کردار کا اور مارکسسٹ کو جرات اور امید کا نشان دکھایا گیا۔ وقت کیا کیا کرشمے دکھاتا ہے۔ رومانی عنصر کے لئے پرانی نسل کے ایک انقلابی کو چنا گیا تھا جو زندگی کی مصیبتوں میں پھنسا ہوا ایک مارکسی لڑکی سے محبت کرتا تھا۔ وہ لڑکی ''اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا'' کہہ کر اس کی محبت کو ٹھکرا دیتی ہے۔

ڈرامہ لکھنا کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ بعض اوقات ہم دونوں اکٹھے بیٹھ کر لکھتے اور ایک دوسرے کی غلطیاں درست کرتے رہتے۔ بعض اوقات ہم کسی ایکٹ کو منظروں میں تقسیم کر لیتے اور مکالمے لکھتے رہتے۔ سوکولووسکی شام کو اپنے کام سے واپس آتا تھا۔ پھر وہ ستر کے عشرے کے غم و یاس کے مارے ہیرو کے مکالمے لکھنے شروع کر دیتا۔ میں بھی لڑکوں کو پڑھانے کے بعد اس کام میں جت جاتا۔ خاتون خانہ کی لڑکی ہمارے لئے سماوار لے آتی۔ سوکولووسکی اپنی جیب سے روٹی اور سبزی نکالتا۔ کسی پراسرار جذبے کے تحت دنیا سے تیاگ حاصل کر لینے والے یہ دونوں ڈرامانویس ساری شام محنت شاقہ میں گزار دیتے۔ ہم نے سٹیج کے سارے لوازمات کے ساتھ پہلا ایکٹ مکمل کر لیا۔ بقیہ چار ایکٹوں کا خاکہ تیار کیا گیا۔ جوں جوں ہم اس کام میں آگے بڑھتے گئے، ہمارا جذبہ مدہم پڑتا گیا۔ کچھ عرصے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہمیں وہ پراسرار کمرہ چھوڑ دینا چاہیے اور ڈرامے کی تکمیل کا کام آئندہ کسی وقت پر ملتوی کر دینا چاہیے۔ سوکولووسکی کاغذوں کا پلندہ اٹھا کر کسی دوسری جگہ لے گیا۔ بعد میں جب دونوں اوڈیسہ کے قید خانے میں تھے۔ تو سوکولووسکی نے اپنے ایک رشتے دار کے ذریعے ڈرامے کا سکرپٹ تلاش کرنے کی کوشش کی۔ شاید اس نے سوچا کہ ڈرامہ مکمل کرنے کی وہ بہترین جگہ تھی۔ لیکن سکرپٹ کا کہیں نام ونشان نہ ملا۔ اس بات کا زیادہ امکان تھا کہ سکرپٹ جس گھر میں رکھا گیا تھا، اس کے مکینوں نے اس کے بد قسمت مصنفوں کی گرفتاری پر اسے آگ کا رزق بنا دیا ہو۔ میرے لئے یہ نقصان برداشت کر لینا کوئی بڑی بات نہیں تھی کیونکہ اپنی غیر ہموار زندگی میں میں نے اس سے زیادہ قیمتی مسودے کھو دیے تھے۔

میری پہلی انقلابی تنظیم

1896ء کے موسم خزاں میں میں اپنے گاؤں گیا اور باپ سے میری عارضی صلح ہوگئی۔ باپ مجھے انجینئر بنانا چاہتا تھا۔ اس دوران میں انقلاب مجھ پر بتدریج قبضہ جمارہا تھا۔ جب بھی میرے مستقبل کا سوال اٹھتا' فیملی میں ایک بحران پیدا ہو جاتا۔ ہر کوئی غم زدہ دکھائی دینے لگتا۔ میری بڑی بہن شدت سے رونے لگتی اور کسی کو سمجھ نہ آتی کہ اسے کیسے چپ کرایا جائے۔ میرا چچا جو انجینئر تھا اور اوڈیسہ میں رہتا تھا' ان دنوں ہمارے پاس آیا ہوا تھا اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں اسے شہر میں آ کر ملوں۔ یوں بحران عارضی طور پر ٹل گیا۔

میں چند ہفتے اپنے چچا کے پاس رہا۔ ہم مسلسل منافع اور قدر زائد پر بحث کرتے رہتے تھے۔ میرا چچا اس موضوع کی تشریح کرنے کی بجائے منافع حاصل کرنے کو ترجیح دیتا تھا۔ اس دوران میں میں نے ریاضی کے کورس میں اپنا نام یونیورسٹی میں رجسٹر کرانے کیلئے کچھ نہ کہا۔ میں کسی امید پر اوڈیسہ میں ٹھہرا رہا۔ آخر مجھے کس کی تلاش تھی؟ اصل میں مجھے اپنی ہی تلاش تھی۔ میں نے محنت کشوں سے آشنائی پیدا کی۔ غیر قانونی لٹریچر حاصل کرتا رہا' پرائیویٹ طلباء کو پڑھایا رہا' تجارتی سکول کے پرانے لڑکوں کو توہمات کے خلاف لیکچر دیتا رہا اور مارکسیوں سے بحث کے دوران میں اپنے پرانے نظریات پر قائم رہنے کی کوشش میں لگا رہا۔ خزاں میں روانہ ہونے والی آخری سٹیمر سے میں نکولائیف آ گیا اور شی گووسکی کے باغ کو دوبارہ اپنا ٹھکانہ بنالیا۔

پھر وہی پرانا دھندہ شروع ہوگیا۔ ہم ترقی پسند رسالوں کے نئے شماروں پر بحث کرتے اور ڈارون ازم کو اپنی گفتگو کا موضوع بناتے رہے۔ ہم مبہم طور پر کوئی تیاری اور انتظار کر رہے تھے۔ کون سی چیز ہمیں انقلابی پراپیگنڈا پر مجبور کر رہی تھی؟ یہ بتانا مشکل تھا۔ ہمارے اندر کوئی جذبہ ابھر رہا تھا۔ دانشوروں کے جس حلقے میں میرا آنا جانا تھا۔ اس میں کسی نے بھی کوئی انقلابی کام نہیں کیا تھا۔ ہمیں احساس ہوگیا کہ چائے کی میز ہماری گفتگو اور انقلابی کام کے درمیان بہت بڑی خلیج واقع تھی۔ ہم جانتے تھے کہ محنت کشوں سے رابطہ قائم کرنے کیلئے انتہائی خفیہ ہاتھوں کی ضرورت تھی۔ ہم نے حلف اٹھایا

کہ ہم یہ کام بے حد پر اسرار طریقے سے کریں گے۔ہمیں اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ ہم چائے کی میز پر گفتگو کے ذریعے خفیہ طور پر آگے بڑھتے جائیں گے۔لیکن کسی یو یہ یقین نہیں تھا کہ تبدیلی کب آئے گی۔اپنی تاخیر کو چھپاتے ہوئے ہم ایک دوسرے سے تیاری کرنے کو کہتے رہتے۔ہم کچھ ایسے غلط بھی نہیں تھے۔

ہوا میں تبدیلی کے کچھ آثار دکھائی دینے لگے جنہوں نے ہمیں انقلابی کام کی طرف مائل کر دیا۔ یہ تبدیلی فقط نکولا ئیف میں ہی نہیں بلکہ پورے ملک میں نظر آ رہی ۔خاص طور پر ادارالحکومت میں۔ 1896ء میں پیٹرز برگ میں جولاہوں کی مشہور ہڑتال ہوگئی۔اس نے دانشوروں میں ایک نئی زندگی ڈال دی۔عوام میں بیداری کی لہر محسوس کر کے طلباء میں جرات آ گئی۔کرسمس اور ایسٹر کے موقع پر درجنوں طالب علم نکولائیف میں در آئے۔ وہ اپنے ساتھ ماسکو' پیٹرز برگ اور کیف میں اتھل پتھل کی کئی کہانیاں لائے تھے۔بعض طلباء کو یونیورسٹیوں سے نکال دیا گیا تھا۔فروری 1897ء میں ایک خاتون نے جس کا نام وٹر دنا تھا' سینٹ پیٹرز برگ کے قلعہ میں خود کو آگ لگا کر مرگئی تھی۔ اس المیے نے جس کی کبھی وضاحت نہیں کی گئی لوگوں میں ہلچل پیدا کر دی۔جن شہروں میں یونیورسٹیاں تھی وہاں ہنگامے شروع ہوگئے۔گرفتاریاں اور جلاوطنیاں زیادہ تیز ہوگئیں۔

میں نے اپنے انقلابی کام کا آغاز وٹروفا کی موت پر ہونے والے مظاہروں سے کیا۔ ہوا یوں کہ میں اپنے کمیون کے ایک نوجوان ممبر گریگری سوکولووسکی کے ہمراہ سڑک پر جا رہا تھا

''کام شروع کرنے کا وقت آ گیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں- وقت آ گیا ہے''۔ میں نے کہا۔

''لیکن کیسے؟''

''یہی تو مسئلہ ہے۔''

''ہمیں کارکن تلاش کرنے ہوں گے۔کسی کا انتظار کیے بغیر کارکن تلاش کر کے

کام شروع کر دینا ہوگا۔''

''میرا خیال ہے ہم انہیں حاصل کر سکتے ہیں۔'' سوکولووسکی نے کہا۔''میں ایک چوکیدار کو جانتا ہوں جو بازار میں کام کرتا تھا۔اس کا تعلق بائبل فرقے سے ہے۔ میں اسے تلاش کرتا ہوں۔''

سوکولووسکی اسی دن اسے تلاش کرنے بازار میں چلا گیا۔ وہ وہاں نہیں تھا۔لیکن اسے وہاں ایک عورت مل گئی جس کا ایک دوست اسی مذہبی فرقے سے تعلق رکھتا تھا۔اسی عورت کے دوست کے ذریعے سوکولووسکی نے چند محنت کشوں سے آشنائی پیدا کر لی۔ان میں ایک الیکٹریشن ایوان ایندری ڑی وچ موخن بھی تھا جو جلد ہی ہماری تنظیم کا ایک سرگرم رکن بن گیا۔سوکولووسکی اپنی تلاش کے بعد واپسی پر بڑے جوش میں تھا۔

''مجھے اصلی آدمی مل گئے ہیں۔'' وہ جذبے سے بولا۔

اگلے دن ہم چھ یا سات لوگ ایک سرائے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ باجے کی آواز کانوں کے پردے پھاڑ رہی تھی اور ہمیں بولنے کیلئے ذرا اونچی آواز میں بات کرنی پڑ رہی تھی۔محض جو ایک دبلا پتلا نوکیلی داڑھی والا تیز اور تشویش میں ڈوبے چہرے والا آدمی تھا۔میرے بغیر داڑھی والے چہرے کا انہیں بائیں ادھ کھلی آنکھ سے بڑے غور سے جائزہ لے رہا تھا۔اس نے نپے تلے جملوں میں اپنی بات شروع کی۔''اس کام میں بائبل کی آیات نے میرے لئے بنیاد فراہم کی۔ میں مذہب سے شروع ہوا اور پھر زندگی کی طرف آ گیا۔کل ہی کی بات ہے کہ میں لوبیا کے دانوں کی مدد سے بعض لوگوں کو پوری سچائی سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''لوبیا کے دانوں سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''بڑی سیدھی بات ہے۔میں ایک دانہ میز پر رکھ دیتا ہوں اور پھر کہتا ہوں۔''یہ زار ہے'' اس کے گرد میں اور دانے رکھ دیتا ہوں۔ یہ اس کے وزیر' پادری اور جرنیل ہوتے ہیں۔ان کے پاس ہی اشرافیہ کے لوگ اور سوداگر ہوتے ہیں۔دوسری ڈھیری میں عوام ہوتے۔ پھر میں پوچھتا ہوں''زار کہاں ہے؟''لوگ مرکز کی طرف اشارہ

کرتے ہیں۔''وزیر کہاں ہیں؟'' وہ زار کے گردنواح کی طرف اشارہ کرتے ہیں ۔اچھا اب انتظار کرو۔اس موقع پر محض اپنی بائیں آنکھ مکمل طور پر بند کر لیتا اور وقفے کے بعد کہتا۔''پھر میں تمام دانوں کو آپس میں ملا دیتا ہوں'' اور پوچھتا ہوں۔''بتاؤں زار اور وزیر کہاں ہیں؟'' لوگ جواب دیتے ہیں۔''ہم کیسے بتا سکتے ہیں۔ہم انہیں تلاش کرنے سے رہے۔'' یہی میں کہتا ہوں۔''تمام دانوں کو آپس میں ملا دو۔''

مجھے اس کی کہانی سن کر اس قدر لطف آیا کہ میں پسینے سے بھیگ گیا۔یہی اصل حقیقت تھی جب کہ ہم لوگ اندازے لگانے اور انتظار کرنے میں مصروف تھے۔موخن کا کام ہی انقلابی کام تھا۔

''لیکن دانوں کو آپس میں ملایا کیسے جائے؟'' موخن نے مختلف لہجے میں ذرا سختی سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔''ہمارا کام لوبیا کے دانوں جیسا نہیں ہے۔میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟'' اور وہ میرے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

اس دن سے ہم اپنے کام میں جت گئے۔ہمارے پاس راہنمائی کیلئے کوئی بزرگ نہیں تھا اور ہمارا اپنا تجربہ ناکافی تھا۔لیکن ہم نہ تو پریشان اور نہ ہی کسی مشکل کا شکار ہوئے۔بات سے بات بنتی چلی گئی۔

گذشتہ صدی کے اختتام پر روس کی اقتصادی ترقی کا محور جنوب مشرق کی طرف تبدیل ہو رہا تھا۔جنوب میں بڑے بڑے پلانٹ نصب کیے جا رہے تھے۔نکولائیف میں دو پلانٹ لگ رہے تھے۔ 1897ء میں یہاں آٹھ ہزار نئے محنت کش کام کرنے آ گئے تھے۔دو ہزار مزدور پہلے ہی کارخانوں اور مختلف کاروبار میں کام کر رہے تھے۔محنت کشوں کی ذہنی سطح اور ان کی اجرت بھی اچھی تھی۔ان پڑھ بہت کم تھے۔جو جگہیں بعد میں انقلابی تنظیموں نے پر کیں وہ پہلے مذہبی فرقوں کے قبضے میں تھیں اور وہ لوگ سرکاری مذحب کے ساتھ کامیابی سے جنگ میں مصروف تھے۔سیاسی ابتری کی عدم موجودگی میں نکولائیف کی پولیس بڑے امن سے سو رہی تھی۔وہ بڑی خوبی سے ہمارے ہاتھوں میں کھیلی۔اگرچہ وہ بیدار ہوتی تو ہم اپنی سرگرمیوں کے پہلے ہفتے ہی میں گرفتار ہو

جاتے۔مگر ہم نے اس سے پوری طرح فائدہ اٹھایا۔ پولیس اس وقت بیدار ہوئی جب ہم محنت کشوں کو بیدار کر چکے تھے۔

جب موخن اور اس کے دوستوں سے میری آشنائی ہوئی تو اس وقت مجھے لوو کے نام سے بلا جاتا تھا۔ میں نے اپنا اصلی نام خفیہ رکھا ہوا تھا۔کسی نیک اور اچھے کام کیلئے لوگوں کو لمبے عرصے تک دھوکے میں رکھنا تکلیف دہ بات ہوتی ہے۔لیکن ''لوو'' مجھے اچھا نام لگا اور میں نے اسی کو اپنا لیا۔

محنت کش یوں ہماری طرف آئے جیسے وہ ہمارے منتظر تھے۔ وہ اپنے دوستوں کو بھی لائے۔بعض اپنی بیویوں کے ساتھ آ گئے۔بعض بزرگ لوگ اپنے بیٹوں کو بھی ساتھ لے آئے۔ہم ان کی تلاش میں نہیں بلکہ وہ لوگ ہماری تلاش میں تھے۔اگرچہ ہم ناتجربہ کار اور جوان تھے مگر ہم نے جو تحریک شروع کی تھی وہ ایک کامیابی سے ہم کنار ہو رہی تھی۔ ہمارا یہ ہر لفظ کا احترام کیا جاتا۔بیس پچیس اور ان سے بھی زیادہ محنت کش دریا کے کنارے، جنگل اور دوسری خفیہ جگہوں پر ہمارے اجلاس میں شرکت کرتے اور بحث میں حصہ لینے لگے۔ان میں زیادہ تر عمدہ فنی کاریگر تھے جو اچھی اجرتیں لیتے تھے۔ وہ نکولا ئیف میں جہاز سازی کے کارخانے میں آٹھ گھنٹے کام کرتے تھے۔وہ ہڑتالوں کے حق میں نہیں تھے۔ بلکہ معاشرتی تعلقات میں انصاف کے طلب گار تھے۔ وہ عیسائی تھے اور خود کو مختلف عیسائی فرقوں کے ناموں سے بلواتے تھے۔لیکن ان کی فرقہ پرستی تنگ نظری پر مشتمل نہیں تھی۔ وہ مذہبی کٹرپن کے خلاف تھے۔ انقلاب کی طرف پیش قدمی میں ان کا مذہب عارضی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ان میں بعض کی گفتگو پہلے چند ہفتوں میں مذہب اور اپنے فرقے کے اعتقاد کے حوالے سے ہوتی تھی وہ عیسائیت کے پرانے زمانے کا موجودہ زمانے سے موازنہ کرتے رہتے تھے۔مگر جب انہیں معلوم ہو گیا کہ نوجوان نسل ان کی باتوں پر ہنستی تھی تو انہوں نے اپنا طرز گفتگو تبدیل کر لیا۔

ان میں نمایاں چہرے آج بھی مجھے یاد ہیں۔ایک مستری تھا جس کا نام کوروکوف تھا۔ وہ ہر وقت ایک پیالہ ہاتھ میں پکڑے رہتا تھا۔ وہ خود کو اعتدال پسند کہتا تھا۔اور

جب تاراس سیویشوچ ' جو ایک عیسائی واعظ اور پوتوں والا تھا' سوویں مرتبہ ابتدائی عیسائیوں کا ذکر شروع کر دیتا تو کوروکوف اسے ''تمہارا مذہب ہمارے جوتے کی نوک پر'' کہہ کر چپ کرا دیتا تھا اور غصے سے اپنا پیالہ درختوں کی طرف پھینک دیتا۔ وہ تھوڑی دیر تک دیکھتا رہتا اور اپنا پیالہ تلاش کرنے جنگل میں چلا جاتا۔ ایسا ٹیلوں پر اگے جنگل میں اجلاس کے موقع پر ہوتا تھا۔

کئی محنت کش نئے خیالوں سے اس قدر سرشار تھے کہ انہوں نے اشعار لکھنے شروع کر دیے تھے۔ کروتھوف نے ''پرولتاری مارچ'' کے عنوان سے نظم لکھی جو اس طرح شروع ہوتی تھی۔ ''ہم پہلا اور آخری حرف ہیں' ابتدا بھی ہیں اور انتہا بھی۔ نستمبر نکوجو ایک ترکھان تھا' اس نے یوکرانی زبان میں ایک گیت لکھ کر اس کی دھن بھی بنائی تھی جسے سب مل کر گاتے رہتے تھے۔ مگر وہ دوغلا نکلا۔ پولیس سے مل گیا اور تنظیم سے غداری کے جرم کا مرتکب ہوگیا۔

یفیموف جس کی آنکھیں نیلی تھیں اور ایک جوان محنت کش تھا' اس کا تعلق ایک اچھے سرکاری افسر کے خاندان سے تھا۔ وہ پڑھا لکھا ہی نہیں بلکہ بہت پڑھا لکھا تھا اور شہر کی کچی آبادیوں میں کہیں رہتا تھا۔ وہ مجھے ایک ایسی جگہ پر ملا تھا جہاں بھوکے ننگے لوگ کھانا کھانے جاتے تھے۔ وہ بندرگاہ پر نگرانی کا کام کرتا تھا۔ وہ سگریٹ اور نہ ہی شراب پیتا تھا۔ بڑا باادب اور خاموش لڑکا تھا۔ فقط اکیس برس کا تھا مگر اس کے گرد لپٹی ہوئی اداسی اور غم کو دیکھ محسوس ہوتا تھا جیسے اس کی زندگی میں کوئی پراسرار چیز شامل تھی۔ اس نے مجھے اعتماد میں لیتے ہوئے بتایا کہ اس کا تعلق ایک خفیہ دہشت گرد تنظیم سے تھا وہ مجھے بھی اسے متعارف کرنا چاہتا تھا۔ (اس تنظیم کا نام ''عوامی رضا'' تھا) میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ موخن' یفیموف اور میں ایک چائے خانے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے اور کسی کے انتظار میں تھے۔ یفیموف نے ایک لمبے تڑنگے اور مضبوط جسم کے آدمی کی طرف آنکھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ رہا۔''

وہ آدمی ایک خالی میز کے گرد بیٹھ کر چائے پینے لگا۔ پھر اس نے اپنا کوٹ پہنا اور

صلیب کو دیکھ کر سینے پر ہاتھ سے کراس کا نشان بنانے لگا۔ ''یہ کیا؟ کیا وہ عوام رضا'' کا رکن ہے؟'' موخن نے دبی آواز میں کہا۔ اس آدمی نے کوئی بہانہ بنا کر یفیموف سے ملنے سے انکار کر دیا۔ یہ واقعہ میرے لئے ایک اسرار رہی رہا۔ کچھ عرصہ بعد یفیموف کا گیس سے دم گھٹ گیا اور یوں اس نے زندگی کا حساب بے باق کر دیا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ کسی خفیہ ادارے کا آلہ کار تھا۔ یا شاید اس سے بھی زیادہ کوئی بڑی چیز۔

موخن جو الیکٹریشن تھا' اس نے پولیس کے چھاپے سے بچنے کیلئے اپنے کمرے میں ایک پیچیدہ قسم کا الازم سسٹم نصب کر رکھا تھا۔ وہ ستائیس برس کا تھا مگر اپنی عملی دانائی اور بھرپور تجربے کی بدولت اپنی عمر سے کہیں زیادہ عمر لگتا تھا اسے تپ دق تھی اور خون تھوکتا تھا۔ وہ ساری زندگی ایک انقلابی رہا' ایک جلاوطنی اور قید کے بعد اسے دوبارہ جلاوطن کر دیا گیا۔ میں اسے دوبارہ تیئیس برس کے بعد خرکوف میں یوکرانی کمیونسٹ پارٹی کی کانفرنس کے موقع پر ملا تھا۔ ہم بیٹھے اپنے ماضی کو دہراتے رہے اور ان لوگوں کی قسمت پر تبادلہ خیال کرتے رہے جو انقلاب کے ابتدائی دنوں میں ہمیں ملے تھے۔ اور پھر بتدریج بچھڑتے رہے۔ کانفرنس میں موخن کو یوکرانی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کنٹرول کمیٹی کا رکن چنا گیا تھا۔ یہ عزت واقعی اس نے بڑی محنت سے کمائی تھی۔ لیکن اس کے تھوڑے دنوں بعد ہی بیماری نے اسے دبوچ لیا جس سے وہ کبھی صحت یاب نہ ہو سکا۔

ہماری پہلی ملاقات کے تھوڑے ہی عرصے بعد موخن نے مجھے اپنے ایک دوسرے دوست یا نیکو سے ملایا۔ وہ بھی ایک فرقہ پرست تھا۔ اس کا چھوٹا سا ایک گھر تھا جس کے صحن میں سیب کے درخت تھے۔ یا نیکو لنگڑا اور ایک سست الوجود آدمی تھی مگر بڑا شائستہ۔ اس نے مجھے لیموں کی بجائے سیب کے ساتھ چائے پینا سکھایا۔ وہ ہمارے گروپ کے دوسرے آدمیوں کے ساتھ پکڑا گیا اور قید میں کچھ عرصہ گزارنے کے بعد دوبارہ نکولائیف واپس آ گیا۔ لیکن تقدیر نے ہمیں جدا کر دیا۔ 1925ء میں میں نے ایک اخبار میں پڑھا کہ جنوبی روسی لیبر یونین کا ایک سابق رکن موخن کوبان کے صوبے میں رہتا تھا اس وقت وہ ٹانگوں سے بالکل معزور ہو چکا تھا۔ بہرحال میں اپنے مشکل وقتوں

کے باوجود اسے ایسٹو کی کے ہسپتال میں داخل کرانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کی ٹانگیں ٹھیک ہو گئیں۔ میں اسے ملنے کیلئے ہسپتال گیا۔ اسے اس وقت تک معلوم نہیں تھا کہ ٹراٹسکی اور لووا ایک ہی آدمی کے دو نام تھے۔ ہم پھر سیب کے ساتھ چائے پیتے اور اپنے ماضی کو یاد کرتے رہے۔ اس کی زبان سے مجھے یہ سن کر بے حد حیرت ہوئی کہ ٹراٹسکی ایک انقلاب دشمن تھا۔

اور بھی کئی دلچسپ لوگ تھے مگر سب کا ذکر کرنا محال ہے۔ جہاز سازی کے فنی سکول میں تربیت پانے والی نئی نوجوان نسل بے حد مہذب تھی انسٹرکٹر کے ایک ہی اشارے سے وہ اس کے خیالات کو سمجھ جاتی تھی۔ محنت کش ہماری توقعات سے کہیں زیدہ انقلاب کے بارے میں شک کا شکار نکلے۔ ہمارے کام کی حیرت ناک کامیابی نے ہمیں ایک طرح کے نشے سے مدہوش کر رکھا تھا۔ انقلابی کہانیوں کی بجائے انقلابی پراپیگنڈا سے ہماری تنظیم میں شامل ہونے والے محنت کشوں کو انگلیوں پر گنا جا سکتا تھا۔ جب کوئی انقلابی دو یا تین لوگوں کو سوشلزم کی طرف لے کر آتا تو ہم اسے اہم بڑا کارنامہ سمجھتے تھے۔ اس ئے برعکس ہمارا عملی کام لامحدود اور بہت زیادہ تھا۔ اگر کہیں کوئی کمی تھی تو وہ انسٹرکٹروں اور مارکسی ادب کی تھی۔ مارکس اور اینگلز کے لکھے ہوئے کمیونسٹ مینی فیسٹو کی کاپیوں کی قلت تھی اور استاد انہیں ایک دوسرے سے چھینتے پھرتے تھے۔

ہم نے جلد ہی اپنا ادب خود پیدا کرشروع کر دیا۔ یہ ایک طرح سے ہماری ادبی کام کی باقاعدہ ابتدا تھی جس کا انطباق اتفاق سے میری انقلابی سرگرمیوں سے ہو گیا۔ میں ہاتھ سے ہی لمبے لمبے مصموف لکھتا رہتا اور پھر ان کی نقلیں کرتا۔ اس وقت ہمیں ٹائپ رائٹر کی موجودگی کا کوئی علم نہیں تھا۔ میں حروف کو بڑا صاف اور واضح طور پر لکھنے کی کوشش کرتا۔ تاکہ تھوڑے سے تھوڑا پڑھا لکھا آدمی بھی کسی دقت کے بغیر مضمون پڑھ سکے۔ میں ایک صفحہ دو گھنٹے' میں مکمل کرتا تھا کئی ہفتے مجھے کمر سیدھی کرنے کا موقع نہ ملتا تھا۔ فقط جلسوں اور مطالعے کیلئے وقت نکالتا تھا۔ لیکن ورکشاپوں اور ملوں کے مزدور اور محنت کش کاسنی سیاہی سے لکھے ہوئے ہمارے پراسرار کاغذ پڑھ کر جوش و جذبے کا

اظہار کرتے تو میری خوشی کی انتہا نہیں رہتی تھی۔ پھر یہ کاغذ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہوتے رہتے اور ان پر بحث جاری رہتی وہ ان کاغذوں کے مصنف کو کوئی بڑی سرا سرار ہستی سمجھتے تھے جو چوبیس گھنٹے ان کی ورکشاپوں اور ملوں میں گھومتی رہتی اور ان کے حالات کا جائزہ لے کر اسے کاغذ پر منتقل کر دیتی تھی۔

ہم کاپی تیار کرتے اور رات کو اپنے کمروں میں چھپائی کا کام کرتے رہتے۔ ایک آدمی صحن مین پہرے دار کے فرائض انجام دیتا۔ خطرے کی صورت میں ہم نے اپنے کام کو جلانے کا پورا انتظام کر رکھا تھا۔ ہر چیز ابھی ابتدائی مرحلے میں تھی۔ ہم بالکل مبتدی تھے۔ لیکن نکولا ئیف کی پولیس ہم سے بھی زیادہ متبدیل اور ناتجربہ کار تھی۔ بعد میں ہم چھپائی والی مشین ایک متوسط عمر کے کارکن کے گھر لے گئے جو دکانوں میں کام کے دوران میں ایک حادثے میں اپنی آنکھیں کھو بیٹھا تھا۔ اس نے بلا جھجک اپنا اپارٹمنٹ ہمارے حوالے کر دیا۔ وہ ہلکا سا قہقہہ لگا کر کہا کرتا تھا۔ ''اندھے آدمی کیلئے تو ہر جگہ قید خانہ ہے۔'' ہم نے آہستہ آہستہ اس کیا پارٹمنٹ میں چھپائی کا سارا سامان جمع کر لیا۔ ہم رات کو کام کرتے تھے۔ گندہ کمرہ کی کی نیچی چھت ہمارے سروں کو چھوتی تھی، مفلسی کی مکمل تصویر تھا۔ ہم ٹین کی شیٹ پر تیل کے چولہے سے اپنا انقلابی کھانا تیار کرتے تھے۔ اندھا ہم سے زیادہ اعتماد کے ساتھ کمرے میں پھرتا رہتا تھا۔ جب میں چھپائی والی مشین سے تازہ تازہ چھپا ہوا کاغذ نکالتا تو دو کارکن جن میں ایک لڑکا اور دوسری لڑکی تھی، بڑی مشتاق نظروں سے دیکھنے لگتے۔ کوئی ہوش مند آدمی اس صورتحال میں ہمیں کام کرتے دیکھ لیا تو یقیناً یہ سوچ کر ہمارا مذاق اڑاتا کہ یہ بے وقوف کس طرح ایک طاقت ور اور صدیوں پرانی حکومت کا تختہ الٹ دیں گے۔ مگر یہی خواب فقط ایک نسل نے حقیقت میں بدل دیا۔ ہماری ان راتوں سے 1905ء فقط آٹھ سال دور تھا، اور 1917ء بیس برسوں سے بھی کم۔

اس وقت منہ زبانی پروپیگنڈہ مجھے اشاعت یافتہ کاغذوں کی نسبت کبھی زیادہ تسلی نہیں دیتا تھا۔ میرا علم ناقص تھا اور مجھے معلوم نہیں تھا کہ اپنے الفاظ میں کس طرح تاثیر

پیدا کروں۔ ہم نے کبھی تقریریں نہیں کی تھیں۔ فقط ایک دفعہ جنگل میں یوم مئی پر ہوانے والے جلسے میں میں نے تقریر کی تھی جس نے مجھے بڑا پریشان کر دیا تھا۔ مجھے اپنا ہر لفظ جھوٹ محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے برعکس جب میں اپنے گروپ میں بات کرتا تو میری کارکردگی ایسی بری نہیں ہوتی تھی۔ بہرحال انقلابی کام پوری رفتار سے جاری رہا۔ میں نے اوڈیسہ سے رابطے قائم کیے اور انہیں مضبوط بنایا۔ شاموں کو میں سٹیمر پر چلا جاتا ایک روبل میں تیسرے درجے کا ٹکٹ خریدتا اور چمنی کے پاس جیکٹ کو سرہانے رکھ کر اور کوٹ کو اپنے اوپر ڈال کر سو جاتا۔ صبح کے وقت اوڈیسہ پہنچ جاتا اور جن لوگوں سے مجھے ملنا ہوتا ان سے ملتا۔ سفر میں کوئی وقت ضائع کیے بغیر اگلی رات کو واپس آ جاتا۔ اوڈیسہ میں میرے رابطوں میں اچانک اضافہ ہو گیا۔ ہوا یوں کہ پبلک لائبریری کے دروازے پر میری ملاقات ایک ورکر سے ہوئی جس نے عینک لگا رکھی تھی۔ ہم نے ایک دوسرے کو غور سے دیکھا اور سمجھ گئے۔ وہ کمپوزر البرٹ پول یاک تھا جس نے بعد میں پارٹی کے مرکزی اشاعت گھر کو منظّم کیا تھا۔ تنظیم میں ہماری دوستی ایک سنگ میل کی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ اس سے ملاقات کے چند روز بعد میں باہر سے ''غیر قانونی لٹریچر'' سے بھرا ہوا ایک لیگ لے آیا۔ یہ سب بڑے خوبصورت سرورقوں والے پراپیگنڈہ پمفلٹ تھے۔ ہم بیگ کو کھول کر تحسین بھری نظروں سے یہ خزانہ دیکھتے رہتے۔ یہ پمفلٹ ہم نے چشم زدن میں تقسیم کر رہے جس سے محنت کشوں کے حلقوں میں ہماری توقیر میں اضافہ ہو گیا۔

پول یاک ہی سے اتفاقاً مجھے معلوم ہوا کہ ہمارے مکینک شرفسل جو خود کو انجینئر کہتا تھا اور ہمارے گروپ میں شامل ہونے کی کوشش میں لگا رہتا تھا' اصل میں ایک پرانا مخبر تھا۔ وہ ایک احمق اور نکما آدمی تھا اور ہر وقت یونیفارم کی بیج والی توپی پہنے رہتا تھا۔ حسی طور پر ہم نے کبھی اس پر اعتبار نہیں کیا تھا۔ لیکن اسے ہم سے چند لوگوں کے متعلق کچھ نہ کچھ معلوم ہو گیا تھا۔ میں نے ایک دن اسے موخن کے کمرے میں بلایا اور اس کا نام لیے بغیر اس کی ساریٰ داستان حیات سنا دی۔ وہ پاگل ہو گیا۔ ہم نے اسے دھمکی دی کہ اگر

اس نے ہمارے ساتھ دھوکہ کیا تو ہم اسے ٹھکانے لگا دیں گے۔ یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی۔تین ماہ بعد وہ ہمیں چھوڑ کر چلا گیا۔ جب ہم گرفتار ہو گئے تو اسی شرنسل نے ہمارے خلاف شہادتوں کے خوفناک انبار لگا دیے۔

ہم نے اپنی تنظیم کا نام جنوبی روسی ورکرز یونین رکھا ہوا تھا۔ ہمارا ارادہ اس میں دوسرے شہروں کے ورکرز شامل کرنے کا بھی تھا۔ میں نے سوشل ڈیموکریٹک خطوط پر اس کا دستور بنایا۔مل مالکان نے اپنے کرائے کے مقرروں کے ذریعے ہمارے اثر کو زائل کرنے کی کوشش کی۔ہم اگلے دن نئے پرچوں سے ان کا جواب دے دیتے۔اس لڑائی نے محنت کشوں ہی کو نہیں، عام شہریوں کو بھی بیدار کر دیا تھا۔ سارا قصبہ ان انقلابیوں کی باتیں کرتا رہتا تھا جو ہینڈ بلوں سے ملوں اور ورکشاپوں پر دھاوا بول رہے تھے۔ پولیس ابھی تک سوئی ہوئی تھی۔اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ باغ میں رہنے والے یہ ٹٹ پونجیے کوئی کارآمد کام کرنے کے قابل تھے۔اسے شک تھا کہ ہمارے پیچھے زیادہ تجربہ کار ہاتھ تھے یعنی پرانے جلاوطن لوگ۔اس سے یہ فائدہ ہوا کہ ہمیں کام کرنے کیلئے مزید دو تین ماہ مل گئے۔آخر ہماری نقل وحرکت پر گہری نظر رکھی جانے لگی۔ پولیس ایک کے بعد دوسرے گروپ کا سراغ لگانے لگی۔لہذا ہم نے اسے دھوکہ دینے کی خاطر نکولا شیف کو چند ہفتوں کیلئے چھوڑ دینے کا فیصلہ کرلیا۔ مجھے اپنے گاؤں جانے کیلئے کہا گیا تھا۔اس کے ساتھ ہی ہم نے یہ بھی فیصلہ کیا تھا کہ اگر بڑی تعداد میں گرفتاریاں ہوئیں تو ہم چھپیں گے نہیں بلکہ جرات سے گرفتاریاں دیں گے تاکہ پولیس ورکروں کو یہ نہ کہہ سکے۔''دیکھا نا، تمہارے راہنما تمہیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔''

جانے سے پہلے نستر ینکو نے اصرار کیا کہ میں ہینڈ بلوں اور کتابچوں کا ایک بنڈل اسے دیتا جاؤں۔اس نے رات کے پچھلے پہر قبرستان کے عقب میں ملنے کی جگہ مقرر کی۔ وہاں زمین گہری برف سے ڈھکی ہوئی تھی۔چاند پوری طرح چمک رہا تھا۔قبرستان کے عقب میں ایک ویرانہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔جب میں کوٹ کے نیچے سے ایک پیکٹ نکال کر اس کے حوالے کر رہا تھا تو عین اسی وقت کوئی قبرستان کی دیوار

سے نکل کر چلتا ہوا ہمارے پاس آیا۔

''یہ کون ہے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''مجھے معلوم نہیں'' نسترنکو نے جواب دیا۔ وہ آدمی ہمارے قریب سے گزر گیا ۔میرے ذہن میں کبھی یہ شک نہیں گزرا تھا کہ نسترنکو پولیس کیلئے کام کررہا تھا۔

اٹھائیس جنوری 1898ء کو وسیع پیمانے پر گرفتاریاں ہوئیں۔کوئی دوسوآدمی پکڑے گئے۔انہیں کوڑے مارے گئے۔گرفتار ہونے والوں میں سوکولوف نام کا ایک سپاہی بھی تھا جس نے قید خانے کی دوسری منزل سے چھلانگ لگا دی۔اسے بہت سی چوٹیں آئیں۔ایک دوسرا آدمی لیونڈوسکی اپنا دماغی توازن کھوبیٹھا بہت سے لوگ متعدد بیماریوں کا شکار ہوگئے۔

گرفتار ہونے والوں میں سے بہت سے اتفاقیہ طور پر گرفتار ہوئے تھے۔ بہت سے لوگ جن پر ہم تکیہ کیے ہوئے تھے' ہمیں چھوڑ گئے۔ہم سے غداری کی مثالیں بھی سامنے آئیں۔بعض لوگ جو ہماری تنظیم میں بڑے غیر نمایاں تھے۔انہوں نے بڑی جرات اور مضبوط کردار کا مظاہرہ کیا۔مثلاً آگسٹ ڈورن نامی ایک جرمن خرادیہ تھا۔ اس کی عمر کوئی پچاس سال کی ہوگی۔ وہ نامعلوم وجوہات کے باعث گرفتار کرلیا گیا تھا۔وہ ایک طویل مدت تک جیل میں رہا۔اس کا قصور فقط اتنا تھا کہ وہ چند بار ہمارے گروپ میں آیا تھا۔قید میں اس کا طرز سلوک بڑا شاندار تھا۔وہ بلند آواز میں گانے گاتا رہتا اور ملی جلی روسی زبان میں لطیفے سنا کر جوانوں کے حوصلے بلند رکھتا۔جب ہمیں ماسکو کی جیل میں بھیج دیا گیا تو وہاں ہمیں ایک ہی کوٹھری میں رکھا گیا۔ ڈورن سمادار کو مزاحیہ انداز میں خطاب کرکے اپنے پاس آنے کو کہتا۔ جب وہ اس کے پاس نے آتی تو کہتا۔''تم نہیں آؤ گی؟ کوئی بات نہیں''ڈورن تمہارے پاس آجائے گا۔''
یہ بات ہر روز دہرائی جاتی اور ہم ہر روز اس سے لطف اندوز ہوتے تھے۔

نکولاشیف کی تنظیم پر بڑی زبردست ضرف پڑی تھی مگر یہ غائب نہ ہوئی۔انقلابی اور پولیس دونوں تجربہ کار ہوتے جارہے تھے۔

میری پہلی قید

جنوری 1898ء کے چھاپے میں میں نکولاشیف کی بجائے ایک دولت مند جاگیردار جس کا نام سوکوون تھا' کی جاگیر سے گرفتار ہوا تھا۔شویگووسکی کو بطور مالی وہاں کام ملا ہوا تھا۔ میں یانوفکا سے نکولاشیف جاتے ہوئے ایک بڑے صندوق کے ہمراہ اس کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔صندوق میں کتابیں، کتابچے' پمفلٹ اور دوسرا غیرقانونی ادب بھرا ہوا تھا۔شویگووسکی نے یہ سارا غیرقانونی مواد گاجروں کے ہمراہ ایک بڑے نشیب میں چھپادیا تھا۔صبح سورج نکلنے پر جب وہ اپنے کام پر جارہا تھا تو اس نے یہ سارا مواد نکال کر میرے حوالے کر دیا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب پولیس نے وہاں اچانک چھاپہ مارا۔شویگووسکی پیکٹ کو پانی کی ٹینکی کے عقب میں چھپانے میں کامیاب ہوگیا۔ جب پولیس کی نگرانی میں گھر کی نگران خاتون ہمیں کھانا کھلارہی تھی تو اس نے اس سے کانا پھوسی کرتے ہوئے کہا کہ وہ پیکٹ وہاں سے اٹھا کر کہیں چھپادے۔ بوڑھی خاتون کو یہ ترکیب بہتر محسوس ہوئی کہ پیکٹ کو باغ میں برف کے نیچے دفن کردے۔ہمیں یقین تھا کہ ہمارا مال دشمن کے ہاتھ نہیں لگے گا۔ جب موسم بہار آیا تو برف پگھل گئی۔ اب سبز گھاس نے پیکٹ کو ڈھانپ لیا تھا اور وہ بہار کی بارش سے قدرے پھول گیا تھا۔

ہم ابھی تک جیل میں تھے۔گرمیاں آ گئی تھیں۔ایک مزدور باغ میں گھاس کاٹ رہا تھا۔اس کے دو بیٹے وہاں کھیل رہے تھے۔کھیل کے دوران میں وہ پیکٹ سے ٹکرا گئے۔ وہ اسے اٹھا کر لے آئے اور باپ کے حوالے کر دیا۔ باپ نے جاگیردار کو دے دیا۔ جاگیردار اس قدر خوف زدہ ہوا کہ وہ اسی وقت نکولاشیف گیا اور وہاں پیکٹ خفیہ پولیس کے چیف کے سپرد کر دیا۔مسودوں کی تحریر ہمارے بہت سے ساتھیوں کے خلاف شہادت بن گئی۔

نکولاشیف کے پرانے قید خانے میں سیاسی قیدیوں کیلئے اچھی رہائش کا کوئی انتظام نہیں تھا' خاص طور پر جب وہ زیادہ تعداد میں ہوتے تھے۔ مجھے اور ایک نوجوان

جلد ساز کو جس کا نام یاوچ تھا' ایک ہی کوٹھری میں رکھا گیا۔ یہ ایک بڑی کوٹھری تھی جس میں تیس آدمی رہ سکتے تھے۔ مگر اس میں کمرہ گرم کرنے کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ دروازے میں ایک بڑا سوراخ تھا جہاں سے برآمدہ صاف دکھائی دیتا تھا۔ یہ برآمدہ صحن کی طرف جاتا تھا۔ جنوری کا کہرا بڑا ظالم تھا۔ ہمارے سونے کیلئے تنکوں کی بنی ہوئی ایک میٹرس تھی جسے صبح چھ بجے اٹھا لیا جاتا تھا۔ صبح اٹھ کر اپنے آپ کو تیار کرنا ہمارے لئے ایک بڑا عذاب تھا۔ میں اور یاوچ ہیٹ' اورکوٹ اور برکے جوتے پہن کر فرش پر ایک دوسرے سے جڑ کر بیٹھ جاتے اور سٹوو پر جھکے رہتے۔ سٹوو ہمیں گرم کرنے سے قاصر رہتا۔ ہم دو گھنٹے یا اس سے زیادہ وقت اسی حالت میں اونگھتے رہتے۔ یہ ہمارے لئے دن کا سب سے اچھا وقت ہوتا تھا۔ اس وقت ہمیں تفتیش کیلئے بلایا نہیں جاتا تھا۔ لہذا ہم خود کو گرم رکھنے کیلئے کمرے کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک بھاگتے رہتے تھے۔ ہم ماضی کا ذکر کرتے رہتے اور مستقل سے اچھی امیدیں وابستہ رکھتے۔ میں نے یاوچ کو سائنس کے متعلق کچھ نہ کچھ بتانا شروع کر دیا۔ اس طرح تین ہفتے گزر گئے۔

پھر ایک تبدیلی نمودار ہوئی۔ مجھے اپنے سارے سامان کے ساتھ قید خانے کے دفتر میں بلایا گیا اور دو گرانڈیل آدمیوں کے حوالے کر دیا گیا۔ وہ مجھے گاڑی میں بیٹھا کر خرسون کے قید خانے میں لے گئے یہ عمارت پہلی عمارت سے بھی زیادہ خستہ اور پرانی تھی۔ میرا سیل کمرے جیسا تھا۔ اس میں ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی جو کھلتی ہی نہیں تھی۔ اس میں لوہے کی بڑی بڑی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ ان میں سے تھوڑی سی روشنی اندر داخل ہوتی تھی۔ اب میں مکمل طور پر تنہائی کا شکار ہو گیا تھا۔ سیل میں نہ تو چہل قدمی کی جگہ تھی اور نہ ہی میرا کوئی ہمسایہ تھا۔ میں کھڑکی میں سے باہر بھی نہیں دیکھ سکتا تھا کیونکہ سردی کی وجہ سے اسے بند کر دیا گیا تھا۔ مجھے باہر سے کوئی چیز نہیں مل سکتی تھی' چائے اور نہ ہی شکر۔ مجھے دن میں ایک بار قیدیوں کا کھانا دیا جاتا تھا۔ نمک کے ساتھ سوکھی روٹی میرا ناشتہ ہوتا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ رات کا تھوڑا سا کھانا بچا کر صبح ناشتے کیلئے

رکھ لوں۔ لیکن ناشتے میں اضافہ کرنے کی دلیل رات کو مجھے بے معنی اور مجرمانہ محسوس ہوتی تھی۔ میں نے اپنے کپڑے بھی تبدیل نہیں کئے تھے۔ تین ماہ سے ایک ہی زیر جامہ پہن رہا تھا اور میرے پاس صابن بھی نہیں تھا کمرے کے کیڑے مکوڑے مجھے زندہ کھا رہے تھے۔ میں کمرے کے ایک نکڑ سے دوسری نکڑ تک ایک ہزار ایک سو گیارہ قدم اٹھاتا تھا۔ اس وقت میں اپنے انیسویں سال میں تھا اور میری تنہائی مسلسل تھی۔ میں نے زندگی کے بیس برس مختلف قید خانوں میں گزارے۔ لیکن میری پہلی قید تنہائی مجھے کبھی نہیں بھولے گی۔ میرے پاس کتاب تو کیا کاغذ کا ایک پرزہ اور پنسل بھی نہیں تھی۔ سیل میں ہوا کا گزر مشکل تھا۔ ہوا کا کوئی جھونکا اسی صورت میں سیل میں داخل ہوتا تھا جب کوئی وارڈن چند لمحوں کیلئے میرے کمرے میں آتا تھا۔

کمرے میں چلتے پھرتے اور قید خانے کی روٹی کے ٹکڑے کو چباتے ہوئے میں شاعری کرتا رہتا تھا۔ میں نے پاپولسٹوں کے گانے ''ڈبی نسکا'' کو پرولتاریہ کے گیت ''ماچی نسکا'' میں بدل دیا تھا۔ میں نے انقلابی رزقیہ نظمیں بھی لکھیں اگرچہ یہ بڑی عام قسم کی نظمیں تھیں مگر بعد میں بڑی مشہور ہوئیں۔ وہ آج بھی گیتوں کی کتابوں میں شامل کی جاتی ہیں۔ ایسے وقت بھی ہوتے تھے جب میں تنہائی کی شدت سے بیمار پڑ جاتا تھا۔ لیکن اس سے میرے ارادے اور بھی مضبوط ہو جاتے تھےاور میں اپنے پھٹے جوتوں میں کمرے کی ایک نکر سے دوسری نکر تک دوبارہ ایک ہزار ایک سو گیارہ قدم چلنے لگتا تھا۔

تیسرے مہینے کے آخر یک جب تنکوں سے بھرا ہوا بیڈ قید خانے کی روٹی اور جوئیں میرا مقدر بن چکی تھیں تو ایک شام جیل کا گارڈ میرے لئے چیزوں سے بھرا ہوا ایک بیگ لا۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ بیگ کسی دوسری دنیا سے آیا تھا۔ اس میں بستر کی نئی چادریں، تکیے کے نئے غلاف، سفید روٹی، چائے، شکر، سیب، مالٹے، ٹن کا دودھ اور دوسری بہت سی اشیاء تھیں۔ اکتیس سال کے بعد آج بھی مجھے اس بیگ کی ہر چیز یاد ہے۔ انمیں سے میں جیم کی بوتل، صابن اور کنگھی کے نام بھول گیا تھا۔ ''یہ چیزیں تمہاری ماں نے بھیجی

ہیں۔''اسٹینٹ وارڈن نے کہا۔اگرچہ اس زمانے میں مجھے لوگوں کے چہرے اور خیالات پڑھنے کی کوئی ایسی مہارت نہیں تھی لیکن میں اس آدمی کے لہجے سے جان گیا تھا کہ اسے رشوت دی گئی تھی۔

کچھ دنوں بعد مجھے ایک سٹیمر میں بٹھا کا اوڈیسہ لے جایا گیا جہاں مجھے ایک ایسے قید تنہائی میں رکھا گیا جو چند سال پہلے ہی تعمیر ہوا تھا' وہاں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔نکولا ئیف اور خرسون کی جیلوں کے بعد اوڈیسہ کا قید اخانہ ایک جنت سے کم نہ تھا۔ ٹیپ اور ٹیلی فون اور کھڑکیوں سے چلانے کی اجازت تھی۔ دوسرے الفاظ میں یہ ہمارے رسل کے ذرائع تھے۔ میں ٹیپ کے ذریعے خرسون میں لکھے ہوئے اشعار اپنے ہمسایوں کو بھیج دیتا تھا اور وہ جواب میں مجھے خبریں وغیرہ ارسال کر دیا کرتے تھے۔کھڑکی کے ذریعے شیوگووسکی مجھے اطلاع دینے میں کامیاب ہوگیا کہ کتابوں والا بیگ پکڑا گیا تھا لہذا اب مجھے اسے پھندے سے بچنے کیلئے تدابیر پر غور کرنے میں اپنا وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں تھی جو پولیس نے میرے لئے بچھایا ہوا تھا۔ میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ اس وقت تک ہم نے سہادت دینے سے انکار نہیں کیا تھا جیسا کہ ہم نیہ بعد میں برسوں میں کیا تھا۔

موسم بہار کی گرفتاریوں کے بعد قید خانہ اپنی گنجائش سے زیادہ بھر گیا۔ یکم مارچ 1898ء کو جب کہ میں ابھی تک خرسون کی جیل میں تھا' سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کی پہلی کانگریس کے فوراً بعد گرفتار کرلیا گیا۔ چند ماہ بعد کانگریس کی بات کرنے والا کوئی نہیں رہ گیا تھا۔لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ انسانی تاریخ پر اثر انداز ہوا۔ کانگریس میں جو مینی فیسٹو تیار کیا گیا تھا اس میں سیاسی جدوجہد کی تصویر کشی کچھ یوں کی گئی تھی:''یورپ کے مشرق میں ہم جس قدر دور جائیں سیاسی لحاظ سے بورژوازی اتنی ہی زیادہ بزدل اور بددیانت ملے گی۔ اسی تناسب سے پرولتاریہ کا سیاسی اور ثقافتی کام زیادہ بڑا اور مشکل ہوجاتا ہے۔'' اسی مینی فیسٹو کا مصنف بدنیت پیٹرسٹر یو تھا جو بعد میں آزاد خیالی اور پھر اس کے بعد شاہ پرستی اور عیسائیت کا رجعتی راہنما بن گیا۔ یہ ایک

بڑی تلخ حقیقت تھی۔

اوڈیسہ میں قید کے پہلے چند ماہ کے دوران مجھے باہر سے کوئی کتاب نہیں ملتی تھی۔لہذا میرا انحصار جیل کی لائبریری پر تھا جس میں زیادہ تر قدامت پسند تاریخی اور مذہبی جرائد ہوتے تھے۔میں انہیں انتہائی انہماک سے پڑھتا رہتا تھا۔ان کے ذریعے مجھے عیسائیت کے مختلف فرقوں کا علم ہوا۔میں یہ بھی جان گیا کہ وہ ایک دوسرے کے خلاف کیا دلائل استعمال کرتے تھے''آرتھوڈیکس ریویو' میں لکھا تھا۔''عیسائی شعور حقیقی سائنسوں سے محبت کرتا ہے جب میں فطری سائنس ہمارے عقیدے کا ایک لازمی جز ہے۔'' بالام کے گدھے کا معجزہ جو ایک پیغمبر سے دلیل میں الجھ جاتا ہے' فطری سائنس کے نقطہ ونظر سے قابل دید نہیں تھا۔''کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ طوطے اور دوسرے بولنے والے پرندے باتیں کرتے ہیں؟'' آرچ بشپ نکانور کی اس دلیل نے میرے ذہن بلکہ میرے خوابوں پر چندروز تک خوف ناک طور پر تسلط جمائے رکھا۔

شیطانوں اور ان کے سرغنے''ظلمت کا شہزادہ'' اور ظلمت کی سلطنت' یہ سب چیزیں میرے لیے ایک مسلسل حیرت کا باعث تھیں۔اسی قسم کی ہزاروں برسوں کی دوسری حماقتیں میرے رستہ ++ کا رخ موڑنے کی کوشش کرتے رہیں۔بہشتکا مفصل بیان' اس کی صحیح جائے وقوع اور اس کا داخلی نقشہ ان اداس کردینے والے الفاظ پر ختم ہوتا تھا۔''بہشت کی صحیح جائے وقوع کا پتا معلوم کرنا مشکل ہے۔'' چائے پر' کھانے پر اور سیر کے دوران میں میں یہ جملہ دہراتا رہتا تھا۔''جہاں خوشیوں سے بھری ہوئی بہشتکا تعلق ہے' جغرافیائی لحاظ سے اس کے طول عرض کے متعلق درست معلومات حاصل نہیں ہوسکیں۔'' میں پولیس سارجنٹ مکلن سے مذہبی بحث اور چخ چخ کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔مکلن ایک انتہائی لالچی' بدنیت اور ناقابل اصلاح دروغ گو تھا۔مگر بظاہر بڑا پاکباز اور مقدس کتابوں کا جوشیلا قاری۔ایک سیل سے دوسرے سیل میں جاتے اور زینہ چڑھتے وقت اس کی چابیاں اس کی کمر کے ساتھ بجتی رہتی تھیں۔وہ یہ آیت پڑھتا رہتا تھا۔

''خدا کی نہیں یسوع کی ماں کے منہ سے نکلے ہوئے ایک الفاظ نے زندیق آریئس کا پیٹ پھاڑ دیا۔'' وہ مجھے بتایا کرتا تھا۔

''پھر آج کے زندیقوں اور ملحدوں کے پیٹ کیوں نہیں پھٹتے؟'' میں اس سے پوچھتا۔

''یہ مختلف زمانہ ہے۔'' وہ غصے بھرے لہجے میں جواب دیتا۔

گاؤں سے آئی ہوئی اپنی بہن کے ذریعے میں نے چار مختلف زبانوں میں بائبل کے چار نسخے حاصل کیے۔ میں نے سکول میں سیکھی ہوئی جرمن اور فرانسیسی زبان کی مدد سے ان چاروں نسخوں کا ایک ایک لفظ پڑھا۔ ان کے پہلو بہ پہلو اطالوی اور انگریزی زبانوں میں بھی بائبل کا مطالعہ کرتا رہا۔ اس طرح چند ماہ کے اندر میں بائبل کا بہترین مفسر بن گیا۔ مجھے غیر ملکی زبانیں جاننے کا کوئی ایسا بڑا دعوی نہیں ہے۔ متعدد یورپی مما لک میں رہنے کے باوجود میرا غیر ملکی زبانوں کا علم اوسط درجے ہی کا رہا۔

عزیز و اقارب کو ملنے کے وقت قیدیوں کو چوبی پنجروں میں منتقل کر دیا جاتا اور ان کے درمیان بڑا فاصلہ رکھا جاتا تھا۔ جب میرا باپ پہلی دفعہ مجھے ملنے آیا تو اس نے سوچا کہ مجھے ہمیشہ اسی پنجرے میں رکھا جاتا تھا۔ وہ اس قدر جذباتی ہو گیا کہ اس کا حلق رندھ گیا۔ میرے سوالوں کے جواب میں وہ خاموشی سے اپنے سنے اور سفید ہونٹ ہلاتا رہا۔ میں اس کا چہرہ کبھی نہیں بھول سکتا۔ اس کے مقابلے میں میری ماں زیادہ گرم جوش اور پرسکون تھی۔

باہر جو کچھ ہو رہا ہے اس کی بازگشت ایک حد تک ہم تک پہنچتی رہی تھی۔ جنوبی افریقہ کی جنگ کی ہمیں خبر تک نہ ہوئی ہم ابھی تک گنوار اور دیہاتی ہی تھے۔ ہم بوروں اور انگریزوں کی جنگ کو بڑے سرمائے کی چھوٹے سرمائے پر فتح سمجھتے رہے۔ ڈریفس کیس جو اس وقت اپنے عروج پر تھا، ہمیں بہت لطف دے رہا تھا۔ ایک دفعہ یہ افواہ بھی ہم تک پہنچی کہ فرانس میں فوج نے حکومت کا تختہ الٹ دیا تھا اور وہاں بادشاہت بحال ہو گئی تھی۔ ندامت سے ہمارے سر گڑ گئے۔ ہم دروازوں کو پیٹ رہے تھے اور شور مچا

رہے تھے۔جیل کے محافظ ہمیں روکنے کی کوشش میں برآمدوں اور سیڑھیوں میں بھاگ رہے تھے۔ان کا خیال تھا کہ ہمیں کھانے کے ناقابل کھانا دیا گیا تھا۔مگر ایسا نہیں تھا۔ ہم تو فرانس میں بادشاہت کی بحالی پر احتجاج کر رہے تھے۔

مذہبی جرائد میں فری حسین لوگوں کے بارے میں مضامین میری دلچسپی کا باعث بنتے رہے۔ یہ عجیب وغریب تحریک کہاں سے نمودار ہوئی تھی؟ میں اپنے آپ سے پوچھتا۔ مارکسی نسطہ نظر سے اس کی وضاحت کیسے کی جائے گی؟ میں ایک مدت تاریخی مادیت کی مزاحمت کرتا رہا تھا اور میرا خیال تھا کہ معاشرتی سائنس میں کثیر الاتعداد عناصر تبدیلی کے ذمہ دار ہوتے تھے۔لیکن یہ عناصر کہاں سے آتے تھے اور یہ کن حالات کے اثرات کی پیداوار تھے' یہ بات میری سمجھ سے بالاتر تھی۔

اٹلی کے نامور ہگلیئن -- مارکسٹ' انطونیو لیرولا کے دو مضامین فرانسیسی زبان میں ترجمے کی شکل میں مجھے قید خانے میں مل گئے۔ بہت سے اطالوی مصنفوں کے برعکس لیرولائے سیاست میں تو نہیں لیکن فلسفے میں مادی جدلیات پر عبور حاصل کر رکھا تھا۔اس کے تجزیے میں گہری بصارت تھی۔ اس نے معاشرے میں تبدیلی لانے والے کثیر الاتعداد عناصر کی بڑے شاندار اور گہری بصارت سے وضاحت کی تھی۔

اگر چہ اس کے مضامین کو پڑھتے ہوئے مجھے بیس سال سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے' اس کے باوجود اس کے استدلال کا عام طریقہ ابھی تک میرے ذہن پر اپنے مستقل نقوش چھوڑے ہوئے ہے۔اس کا یہ جملہ کہ''خیالات آسمان سے نازل نہیں ہوتے'' میں آج تک نہیں بھول سکا۔ لیرولا کے بعد مارکس کے تمام دوسرے روسی شاعر شامل ہیں' مجھے کبھی متاثر نہ کر سکے۔ بہت سال بعد تک بھی میں یہ بات سمجھنے سے قطعی طور پر قاصر رہا کہ بہت سے مارکسٹ جرمن پروفیسر سٹیملر کی لکھی ہوئی کتاب''معاشیات اور قانون'' کے اثر میں کیسے آ گئے تھے۔ یہ کتاب بھی ان بے شمار کوششوں میں سے ایک کوشش تھی جو فطری اور انسانی تاریخ کے عظیم دھارے کو ازل سے لیکر آج تک اور اس کے بعد تک بھی ایک خود نما علم کے رعب کے سہارے موڑنے میں لگی رہتی ہیں۔

جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں' اسی زمانے میں میں ++++تحریک کے متعلق کچھ جاننے میں دلچسپی لینے لگا رتھا۔ کئی ماہ تک اس موضوع پر احباب اور رشتہ داروں کی مہیا کردہ کتابوں کا میں بڑے غور اور انہماک سے مطالعہ کرتا رہا۔ آخر کیا بات تھی کہ سترھیوں صدی کی پہلی چوتھائی سے سوداگر' کاروباری لوگ' فن کار' بنک کار سرکاری افسر اور قانون دان خود کو مینس کہلوانا پسند کرتے تھے اور قرون وسطیٰ کے گلڈوں کی رسومات کے احیا کے درپے تھے؟ یہ ساری رازدانی اور نقاب پوشی کیا تھی؟ تصویر صاف ہونے لگی۔ پرانا گلڈ ایک پیداواری اور تنظیم سے کچھ زیادہ حیثیت رکھتا تھا۔ یہ اپنے ارکان کی اخلاقیات اور طرز زندگی کا خیال رکھتا تھا اور اس پر اثر انداز ہوتا تھا۔ یہ شہروں میں تعمیراتی کام کرنے والے مستریوں اور نیم کاریگروں پر توجہ دیتا تھا۔گلڈوں کی ٹوٹ پھوٹ نے ایک ایسے سماج کی اخلاقیات میں بحران پیدا کر دیا جو ابھی قرون وسطیٰ کے اثرات سے بمشکل نکلا تھا۔ پرانی اخلاقی قدر رہی جس تیزی سے زوال پذیر ہو رہی تھیں ان کے مقابلے میں نئی اخلاقیات ترقی نہیں کر رہی تھی۔ جیسا کہ عام طور پر تاریخ میں ہوتا ہے' پرانی قدروں کا تحفظ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔عملی راج گری اور مستری پن نظریاتی مستری پن بن گیا۔ پرانا طرز زندگی جس کا تحفظ کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی' اس نے ایک نئے معامی حاصل کر لیے۔فری مین کی کی بعض شاخوں میں جاگیردارانہ نوعیت کے رجعتی عناصر چھائے ہوئے تھے۔ اٹھارویں صدی میں درین مینسری نے روشن خیالی کی پالیسی اختیار کر لی' جیسے روشن خیال لوگوں کی تنظیم تھی جو بعد میں انقلاب کے پیش رو ثابت ہوئے۔فری مین کے ممبروں میں لوئی xvI اور ڈاکٹر گلیٹن بھی شامل تھے جس نے بعد میں گلیٹن ایجاد کی تھی۔جنوبی جرمنی میں فری میزی نے کھلم کھلا انقلابی کردار اپنا لیا' جب کہ کیتھرین دی گریٹ کے دربار میں یہ نقاب پوش بن کر اشرافیہ اور نوکر شاہی کی صفوں میں بیٹھ گئی۔ایک فری مین ملکہ نہ نوی کوف نامی ایک فری مین کو سائبیریا میں جلاوطن کر دیا تھا۔

آج کے سستے زمانے میں کوئی بیٹا اپنے دادا کے کپڑے مشکل ہی پہنتا ہے۔لیکن

خیالوں کی دنیا میں پرانے خیال ابھی تک بطور فیشن چل رہے ہیں۔ پرانے خیال ایک نسل سے دوسری نسل کے حوالے کیے جا رہے ہیں اگرچہ وہ میری ماں کے تکیے کے فرسودہ اور پھٹے ہوئے غلافوں کی طرح بدبو دے رہے ہیں۔ جو لوگ اپنے خیالات کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں وہ بھی انہیں تھوڑا بہت پرانا رنگ دے دیتے ہیں۔ خیالوں کی نسبت صنعت میں انقلاب زیادہ تیزی سے آتے ہیں۔ خیالات میں رفوگری اور پیوند کاری کو زیادہ ترجیح دی جاتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ فرانسیسی پارلیمان میں بیٹھنے والے پیٹی بورژوا ارکان بہتر اخلاقی قدریں پیدا کرنے میں ناکام رہے جن کے ذریعے سے وہ عوام کو نئے تعلقات کے انتشار سے بچا سکتے۔ وہ کوئی نئی عمارت تعمیر کرنے کا سوچنے کی بجائے پرانے پارلیمانی نظام کی مرمت ہی کا سوچتے رہے۔

جیسا کہ قید خانے کے قوائد کے مطابق مشق کی پرانی کاپی ختم ہونے پر نئی کاپی دے دی جاتی ہے' مجھے فری میزی پر ایک ہزار صفحات پر مشتمل کتاب رے دی گئی۔ اس میں بے شمار چھوٹے چھوٹے کردار اور دوسری کتابوں کے اقتباسات درج تھے۔ میں اسکی تشریح اپنے خیالات اور تاریخ کے مادیت پر مبنی نظریے کی روشنی میں کرتا رہتا تھا۔ اس طرح سال کا بیشتر حصہ گزر گیا۔ میں خیاب کے ہر باب کا اقتباس تیار کرتا' اسے ایک سمگل شدہ کاپی درج کرتا اور پھر پڑھنے کیلئے ایک دوسرے ساتھیوں کو ان کے کمروں میں بھیج دیتا۔ یہ کاپی انہیں ایک پیچیدہ نظام کے تحت بھیجی جاتی تھی جس کا نام ہم نے ''ٹیلی فون'' رکھا ہوا تھا۔ اگر کوئی کمرہ زیادہ دور نہیں ہوتا تھا تو اس کا باسی ایک رسی سے کوئی چھوٹا سا وزن باندھ کر اسے میرے کمرے میں پھینک دینے کی کوشش کرتا۔ اگر وہ اس کوشش میں کامیاب ہو جاتا تو میں اس رسی کے ساتھ کاپی باندھ دیتا۔ پھر وہ وہی کاپی اسی طریقے سے کسی دوسرے دوست کو بھجوا دیتا۔ جب کاپی کسی دور کے کمرے میں بھجوانی مقصود ہوتی تو اس صورت میں زیادہ پیچیدہ طریقہ اختیار کیا جاتا تھا۔

اوڈیسہ میں میری قید کے اختتام تک میری نوٹ بک فلسفیانہ خیالات اور تاریخی حوالا جات کا ایک ضخیم ذخیرہ بن چکی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ آج وہ اشاعت کے قابل

ہو گی کہ نہیں ۔ میں ایک ہی وقت میں مختلف ذرائع سے بہت کچھ سیکھ رہا تھا اور اپنی پہلی ہی کتاب میں یہ سب کچھ ڈال دینے کو بے قرار تھا۔ میرا خیال ہے اس کا مرکزی خیال اور میرے اخذ کیے ہوئے نتائج درست تھے۔ اس وقت بھی میں محسوس کرتا تھا کہ میں مضبوط پیروں پر کھڑا تھا' اور جوں جوں کام آگے بڑھتا گیا' میرا یہ یقین زیادہ پختہ ہوتا گیا۔ آج وہ مسودہ حاصل کرنے کی خاطر میں کچھ بھی دینے کو تیار ہوں ۔ یہ جلاوطنی میں میرے ساتھ تھا' اگرچہ وہاں میں فری میزی کی بجائے مارکسی اقتصادیات کے مطالبے پر زیادہ وقت صرف کرتا تھا۔ جلاوطنی سے باہر فرار کے بعد الیگزینڈر لوفتا نے جو سائبیریا میں میرے ساتھ جلاوطنی کی زندگی گزار رہی تھی اور بعد میں میری بیوی بنی' سائبیریا سے یہ مسودہ میرے ماں باپ کے ذریعے 1903ء میں مجھے پیرس اس وقت بھجوادیا جب وہ مجھے وہاں ملنے آئے تھے۔ جب بعد میں میں ایک خفیہ مشن پر روس گیا تو اسے اپنے ہجرت نصیب عاجزانہ سامان کے ساتھ جنیوا ہی میں چھوڑ گیا۔ بعد میں میرا یہ سامان ''اسکرا'' کے محافظ خانے (Avchiues) میں رکھ دیا گیا اور ایک بے وقت قبر کی نذر ہو گیا۔ سائبیریا سے دوسرے فرار کے بعد میں نے اسے حاصل کرنے کی بے سود کوشش کی۔ میرا خیال ہے میں نے جس سوئس خاندان کے پاس اپنا سامان رکھا تھا۔ ممکن ہے اس نے اپنا آتش دان گرم کرنے کیلئے اسے استعمال کر لیا ہو۔ اس محترمہ کو میں ملامت کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

قید میں میں نے ادبی ذرائع کی عدم موجودگی میں فری میزی پر جس طرح کام کیا تھا وہ میرے لئے بہت مفید ثابت ہوا۔ اس وقت تک میں بنیادی مارکسی ادب سے نسبتاً لاعلم تھا۔ لبرولا کے مضامین واقعی فلسفے کا خزانہ تھے۔ ان کی بعض باتیں میری سمجھ سے بالا تر تھیں جن میں میں نے اپنے خیال کے مطابق اضافہ کر کے اپنا مقصد حل کر لیا تھا میں نے انہیں اپنے ذہن میں متعدد مفروضوں کے ساتھ ختم کیا تھا۔ فری میزی پر میرا کام ان مفروضوں کیلئے ایک ٹسٹ ثابت ہوا۔ میں نے تازہ دریافتیں نہیں کی تھیں۔ کیونکہ میں نے جو باقاعدہ اور ترتیب وار نتائج اخذ کیے تھے انہیں ایک عرصہ پہلے ہی

آزمایا جاچکا تھا اور وہ زیرعمل تھے۔ میرا خیال ہے یہ چیز بعد میں میری ذہنی اور دانش ورانہ ترقی پر اثرانداز ہوئی بعد کے وقتوں میں اس چیز کی تصدیق مارکس' اینگلز' پلیخانوف اور میرنگ کی تحریروں سے ہوئی جو قید کے دنوں میں مجھے ایک گیس ورک محسوس ہوتی تھی۔ میں نے کسی ضد یا تنگ نظری کی حالت میں تاریخی مادیت کو گھول کر نہیں پیا تھا۔ جدلیاتی طریقہ مجھ پر کسی تجریدی وضاحت کی شکل میں آشکار نہیں ہوا تھا' بلکہ میں نے اسے ایک ابلتے ہوئے چشمے کی طرح تاریخی عمل میں تلاش کیا تھا۔

اس دوران میں انقلاب کی لہر نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ تاریخی جدلیات بھی عملی طور پر اپنا کام دکھا رہی تھی' اور وہ بھی ایک وسیع پیمانے پر۔ طلباء کی تحریک مظاہروں کی شکل میں پھیل رہی تھی۔ کاسک طلباء کو پیٹ رہے تھے۔ آزاد خیال اپنے بچوں سے اس سلوک پر غم وغصہ کا اظہار کر رہے تھے۔ سوشل ڈیموکریسی مضبوط ہو کر مزدور تحریک کا لازمی حصہ بنتی جا رہی تھی۔ دانش وروں کے حلقوں میں انقلاب اب کوئی مراعات یافتہ شغل یا دھندہ نہیں رہا تھا۔ گرفتار ہونے والے ورکروں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ جیل میں جگہ کی تنگی کے باوجود سانس لینا آسان ہو رہا تھا۔ دوسرے سال کے اختتام تک جنوبی روسی ورکرز یونین کے کیس کا فیصلہ سنا دیا گیا چار بڑے مجرموں کو مشرقی سائبیریا میں چار سال کیلئے جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ اس کے بعد ہمیں چھ ماہ تک ماسکو کی جیل میں عارضی طور پر رکھا گیا تھا۔ یہ عرصہ میں نے نظریے کے گہرے مطالعے میں گزارا۔ اس وقت میں نے پہلی بار لینن کا نام سنا۔ میں نے روسی سرمایہ داری پر اس کی کتاب پڑھی جو نئی نئی بازار میں آئی تھی۔ پھر میں نے نکولائیف میں مزدور تحریک پر ایک پمفلٹ لکھا اور اسے جیل سے باہر سمگل کرایا۔ تھوڑے دنوں بعد وہ جنیوا سے شائع ہو گیا۔ گرمیوں میں ہمیں ماسکو کی جیل سے نکال لیا گیا۔ دوسرے قید خانوں میں ابھی آرام تھا۔ پھر 1900ء کے موسم خزاں میں ہمیں ہماری جلاوطنی کی جگہوں پر بھیج دیا گیا۔

میری پہلی جلاوطنی

ہم مجرموں کے ایک گروہ کی شکل میں سپاہیوں کی نگرانی میں دریائے ینا کی مدہم رو کے ساتھ نیچے کی طرف جا رہے تھے۔ ساری رات سخت سردی میں گزری۔ ہمارے کوٹ صبح کے کہرے سے ڈھک گئے تھے۔ راستے میں آنے والے دیہات میں فیصلے کے مطابق ایک یا دو مجرموں کو اتار دیا جاتا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے' اوست کت گاؤں پہنچنے میں ہمیں تین ہفتے لگے تھے۔ وہاں مجھے ایک خاتون قیدی کے ساتھ جو ہماری بڑی قریبی ساتھی تھی دریا کے کنارے اتار دیا گیا۔ خاتون قیدی کا نام اَلیگزینڈر لوفنا تھا۔ وہ جنوبی روسی ورکرز یونین میں ایک بڑی اہم حیثیت رکھتی تھی۔ سوشلزم سے مکمل وفاداری اور کسی قسم کے لالچ سے صاف ذہن نے اسے بلاشبہ ایک دوسرے سے باندھ رکھا تھا۔ ایک دوسرے سے جدا ہو جانے کے خوف کے تحت ہم نے ماسکو جیل میں شادی کر لی تھی۔

وہ گاؤں کسانوں کے کوئی ایک سو جھونپڑوں پر مشتمل ہوگا۔ ہم نے گاؤں کے کنارے پر ایک جھونپڑے کو اپنی قیام گاہ بنا لیا۔ ہمارے گرد جنگل اور نیچے دریا تھا۔ شمال میں دور' دریا کے بہاؤ پر سونے کی کانیں تھیں جہاں سنے کا عکس دریا کے پانی پر ناچتا رہا تھا۔ اوست کت نے بڑے ہنگامہ پرور وقت دیکھے تھے۔ بڑے بڑے بدمعاشوں' ڈاکوؤں اور قاتلوں کے دن جب ہم وہاں گئے تو ایسے لوگ بہت کم رہ گئے تھے۔ گاؤں میں امن تھا مگر شراب نوشی کی کثرت نے ابھی تک اسے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ جس جوڑے کی جھونپڑی ہم نے لی تھی وہ بلا کا مے نوش تھا۔ دنیا کا اس سے دور دور افتادہ علاقے میں زندگی تاریک اور اداس تھی۔ رات کے وقت کاکروچ اپنی سرسرائیوں سے جھونپڑی کو بھر دیتے تھے۔ وہ میز' بستر حتیٰ کہ ہمارے چہروں پر رینگنے کی کوشش کرتے تھے۔ ہم گاہے گاہے جھونپڑی سے ایک دو دن کیلئے باہر چلے جاتے تھے

اور درجہ انجماد سے 35 درجے نیچے (فارنہائٹ) میں دروازہ کھلا چھوڑ جاتے تھے۔

گرمیوں میں زہریلی مکھیاں ہماری زندگی اجیرن بنائے رکھتی تھیں۔ اگر کوئی گائے جنگل میں کھو جاتی تو وہ اسے کاٹ کر موت کی نیند سلا دیتی تھیں۔ کسانوں نے ان سے بچنے کیلئے اپنے چہروں پر کپڑے کی جالیاں پہن رکھی تھیں۔ موسم بہار اور خزاں میں سارا گاؤں ایک دلدل بن جاتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ علاقہ خوبصورت تھا لیکن میری جلاوطنی کے سالوں میں یہ مجھے بڑا اداس دکھائی دیا۔ میں اس میں دلچسپی لے کر اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں جنگل اور دریا کے درمیانی علاقے میں رہتا تھا مگر میں نے ان پر کبھی توجہ نہیں دی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ اپنی کتابوں اور ذاتی تعلقات میں بہت مصروف تھا۔ میں مارکس کا مطالعہ کرتا رہتا اور کتاب کے صفحات سے کاکروچوں کو ہٹاتا جاتا۔

جلاوطنوں کیلئے دریائے لینا ایک بڑا آبی راستہ تھا۔ جو لوگ اپنی جلاوطنی کی مدت پوری کر لیتے تھے وہ اسی دریا کے راستے جنوب کو واپس چلے جاتے تھے۔ بڑھتی ہوئی انقلابی لہر کے باعث اس راستے کا استعمال مسلسل اور زیادہ ہونے لگا تھا۔ جلاوطن لوگ ایک دوسرے سے خطوط کا تبادلہ کرتے رہتے تھے۔ بعض لوگ اتنے عرصے سے جلاوطن تھے کہ وہ ایک طرح کا قیمتی خزانہ بن چکے تھے۔ ازکوتش کے گورنر کو درخواست دے کر جلاوطنوں کا ایک جگہ سے دوسری جگہ تبادلہ مقابلتاً آسان تھا۔ الیگزینڈر لوفنا اور میں اڑھائی سو میل دور مشرق میں دریائے الم کے کنارے ایک ایسی جگہ نقل مکانی کر گئے جہاں ہمارے چند دوست تھے۔ وہاں مجھے کچھ عرصے کے لئے ایک کروڑ پتی سوداگر کے پاس کلرک کی جاب مل گئی۔ اسکے فر اور اون کے گودام، سٹور اور سیلون ہالینڈ اور بلجیئم سے زیادہ بڑے علاقے میں پھیلے ہوئے تھے۔ وہ تجارتی لحاظ سے بڑا طاقتور تھا۔ اس کے ماتحت ہزاروں تنگو لوگ تھے جنہیں وہ پیار سے ''میرے تنگو'' کہتا تھا۔ وہ اپنا نام تک نہیں لکھ سکتا تھا اور نام کی جگہ کراس کا نشان لگا دیتا تھا۔ وہ سارا سال حبشیوں جیسے انداز میں رہتا۔ مگر نزنی نوگوروڈ کے سالانہ میلے میں ہزاروں روبل لٹا دیتا تھا۔ میں

ڈیڑھ ماہ تک اس کی ماتحتی میں کام کرتا رہا۔ پھر ایک دن میں نے غلطی سے ایک بل میں ایک پونڈ کی بجائے چالیس پونڈ کی رقم لکھ دی اور اسے ایک دور دراز کے سٹور پر بھیج دیا۔ اس غلطی نے میری شہرت کا بیڑا غرق کر دیا اور مجھے ملازمت سے فارغ کر دیا گیا۔

ہم اوست کت واپس چلے گئے وہاں سردی خوف ناک حد تک تھی۔ درجہ حرارت درجہ انجماد سے 55 ڈگری (فارن ہیٹ) نیچے چلا جاتا تھا۔ واپسی پر کوچوان کو گھوڑوں کی ایال سے برف جھاڑنی پڑتی تھی۔ میں نے اپنے گھٹنوں پر اپنی دس ماہ کی بیٹی بٹھا رکھی تھی۔ اور اسے فر کی ٹوپی میں چھپا رکھا تا جس میں سانس کیلئے تھوڑی سے جگہ ناک کے پاس موجود تھی۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ہم اس کی ٹوپی سے برف ہٹانے کے ساتھ یہ بھی دیکھتے رہتے کہ وہ زندہ تھی کہ نہیں۔ بہرحال اس سفر میں کوئی ناخوشگوار حادثہ پیش نہ آیا۔ ہم اوست کت میں زیادہ عرصہ نہ ٹھہرے۔ چند ماہ بعد گورنر نے ہمیں ذرا دور جنوب میں ورخونسک نامی جگہ پر جانے کی اجازت دے دی۔ جہاں ہمارے بعض دوست رہتے تھے۔

جلاوطنوں میں پرانے پاپولسٹوں نے طویل مدت کی جلاوطنی اور اپنے گھروں سے دور رہنے کی وجہ سے ایک قسم کی اشرافیہ کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ نوجوان مارکسٹوں نے اپنا ایک الگ نمایاں گروپ بنالیا تھا۔ میرے زمانے میں ہڑتال پر جانے والے محنت کشوں کی ایک بڑی تعداد جو عموماً ان پڑھ تھی، شمال کی طرف ہجرت کرنے لگی تھی۔ ان کیلئے جلاوطنی سیاسی اور ثقافتی تربیت کا ایک عمدہ سکول ثابت ہوئی۔ جب لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو زبردستی ایک جگہ رکھا جائے تو ذہنی عدم مطابقت اور جھگڑے پیدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ خودکشی کی واردات بھی جنم لینے لگتی ہیں۔ ہم ورخونسک سے آئے ہوئے ایک طالب علم کی باری باری نگرانی کرنے لگے۔ ہم نے اس کی میز پر لوہے کا چمکتا ہو کچھ سامان دیکھا۔ اس کے پاس ہی سکے سے بنی ہوئی شاٹ گن کی کچھ گولیاں بھی تھیں۔ مگر ہماری نگرانی بے سود ثابت ہوئی کیونکہ اس نے شاٹ گن کی نالی

اپنی چھاتی پر رکھ پر اپنے پاؤں سے گھوڑا دبا دیا۔ تھا۔ ہم نے خاموشی سے اسے پہاڑوں میں دفن کر دیا تھا۔اس وقت ہم تقریریں وغیرہ کرنے کے حق میں نہیں تھے ۔اوراسے ایک مصنوعی چیز سمجھتے تھے۔جلاوطنوں کے بڑے بڑے علاقوں میں خودکشی کرنے والوں کی متعدد قبریں تھیں ۔بعض جلاوطن مقامی آبادی میں خصوصاً شہروں میں سما گئے ۔بعض شراب کے عادی ہو گئے ۔قید خانے کی طرح جلاوطنی میں بھی فقط سخت کام ہی آپ کو بچا سکتا ہے۔میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ مارکسٹ ہی تھے جوان حالات میں کام کرتے رہتے تھے۔

یہ لینا ہی کا سفر تھا جس کے دوران میں ڈزرزفسکی ؛یوزرکی اور دوسرے نوجوان انقلابیوں سے میری ملاقات ہوئی جنہوں نے مستقبل میں ایک اہم کردارادا کرنا تھا۔ ہم ایک دوسرے کا بڑے اشتیاق سے انتظار کرتے رہتے تھے۔موسم سرما کی ایک رات کو جب ہم دریائے لینا کے کنارے آگ روشن کر کے بیٹھے ہوئے تھے تو ڈزرزفسکی نے پولش زبان میں اپنی ایک نظم سنائی۔اس کا چہرہ اور آواز بڑے خوبصورت تھے مگر نظم ذرا ہلکی تھی۔

اوست کت میں آنے کے تھوڑے عرصے بعد میں نے ارکتشی کے ایک اخبار ''وستوچنوی اور بوزرنی''(مشرقی ریویو) میں مضامین لکھنے شروع کر دیے۔ یہ پرانے پاپولسٹوں نے قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے شائع کیا تھااور کبھی کبھی مارکسٹوں کے ہاتھ لگ جاتا تھا۔ میں نے ایک دیہی نمائندے کے طور پر اس میں لکھنا شروع کیا اور اپنے پہلے مضمون کی اشاعت کا بڑی بے قراری سے منتظر تھا۔ایڈیٹر نے میری حوصلہ افزائی کی اور میں ادب کے علاوہ سوامی سوالات پر بھی لکھنا شروع ہو گیا۔جب میں کوئی قلمی نام رکھنے کے بارے میں سوچ رہا تھا تو میں نے اطالوی لغت کھولی اور جس لفظ پر میری نظر سب سے پہلے پڑی وہ ''اینڈری تو تو'' تھا۔لہذا میں کئی برس تک ''اینڈٹ اوتو'' بنا رہا۔ میں مذاق کے طور پر اپنے دوستوں کو بتا تا رہتا تھا کہ میں اخبار میں مارکسی اینڈٹ اوتو (روح) داخل کرنا چاہتا تھا۔کچھ عرصے بعد میں میری

تنخواہ دو کوپک فی سطر سے چار کوپک ہوگئی۔ یہ میری کامیابی کا بہترین ثبوت تھا۔ میں کسانوں' پرانے روسی ادیبوں' ابسن' ہاپ مان اور نطشے' سوپیاں' اینڈلو اور گورگی کے بارے میں لکھا کرتا تھا۔ ساری ساری رات بیٹھا اپنے مسودوں پر کام کرتا اور صحیح الفاظ تلاش کرنے میں لگا رہتا تھا۔ میں ادیب بنتا جارہا تھا۔

1896ء سے میں بہت سفر کیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میں انقلابی خیالات اور مارکسی اصولوں سے بچنے کی کوشش میں تھا۔ یہ ایک الگ بات تھی کہ اس کے باوجود میں انقلابی کام کررہا تھا۔ جلاوطنی کے زمانے تک مارکسزم میرا بنیادی فلسفہ بن چکا تھا۔ جلاوطنی کے دوران میں میں نے اپنا ایک نیا نقطہ نظر وضع کیا تھا اور اس کے مطابق زندگی کے ''ازلی'' مسائل پر غور کرنے کی کوشش کی۔ یعنی محبت' دوستی' زندگی' رجائیت' قنوطیت وغیرہ کیا ہیں؟ مختلف حالات اور سماجی صورتحال میں لوگ مختلف طریقے سے محبت اور نفرت کرتے ہیں۔ جس طرح درخت اپنی جڑوں سے نمی کشید کر کے پتوں' پھول اور پھل پیدا کرتا ہے' اسی طرح ایک فرد اپنے معاشرے کی معاشی جڑوں سے اپنے جذبے اور خیال کشید کرتا ہے۔ اس زمانے میں میرے لکھے ہوئے مضامین کا ایک ہی مرکزی خیال تھا۔ یعنی فرد اور معاشرے کا باہمی تعلق۔ کچھ عرصہ پہلے مضامیں ایک کتاب کی شکل میں شائع ہوئے ہیں۔ مجھے خیال آیا کہ اگر یہ مضامین میں نے آج لکھے ہوتے تو قدرے مختلف اسباب میں لکھے ہوتے مگر ان کے مواد میں کوئی تبدیلی نہ کی ہوتی۔

ان دنوں سرکاری یا نام نہاد ''قانونی'' مارکسزم ایک قسم کے بحران کا شکار تھا۔ میں حقیقی تجربے سے اندازہ کرسکتا تھا کہ کس بے حیائی سے نئی سماجی ضروریات ایک نظریے کے تھان سے اپنی ضروریات کے مطابق لباس تیار کرسکتی تھیں جن کا مقصد ہی کچھ اور تھا۔ نوے کے عشرے تک روسی دانش وروں کا ایک بڑا حصہ پاپولسٹ نظریوں میں گل سڑ رہا تا۔ وہ سرمایہ داری کو رد کر کے کسانوں کیلئے زمین کی مشترکہ ملکیت کے حق میں تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کیلئے سرمایہ داری کی تمام مادی مراعات، خوشیوں اور سیاسی اثر کی علامت بھی تھی۔ بورژوا دانش وروں کیلے مارکسزم ایک ایسا تیز چاقو تھا جس کی

مدد سے وہ پاپولسٹوں کی رسی کاٹ کرنفرت سے بھرے ماضی سے الگ ہوجانا چاہتے تھے۔اسی چیز نے گذشتہ صدی کے آخری برسوں میں مارکسزم کو تیزی کے ساتھ پھیلنے کا موقع مہیا کیا تھا۔

جب مارکسزم نے اپنا یہ مقصد پورا کرلیا تو یہی مارکسزم دانشوروں کو تکلیف دینے لگا۔اس کی جدلیات ترقی کے سرمایہ دارانہ طریقہ کار کیلئے تو موزوں تھیں لیکن یہ جان کر کہ یہ پورے سرمایہ دارانہ نظام کو رد کرتی ہیں' انہوں نے ان کو ترقی میں رکاوٹ کہہ کرفرسودہ قرار دے دیا۔صدی کے اختتام پر جب میں قید اور جلاوطنی میں تھا تو روسی دانش ور مارکسزم کو ایک وسیع تنقید کا نشانہ بنا رہے تھے۔وہ سرمایہ داری کے حوالے سے اس کی تاریخی ضرورت کو تسلیم کرتے تھے مگر انقلابی ذرائع سے سرمایہ داری کے خاتمے کے حق میں نہیں تھے۔ان قلابادیوں کے ذریعے پرانے پاپولسٹ دانش ور اپنی قدیم ہمدردیوں کے ساتھ خود کو آزاد خیال بورژوا دانش مندوں میں ڈھال رہے تھے۔

اب مارکسزم پر یورپی تنقید بھی' خواہ اس کا معیار کچھ بھی تھا' بڑی مستعدی سے روس میں جگہ پانے لگی تھی۔ایڈورڈ برن سٹین سوشلزم سے آزاد خیالی کی طرف جانے والے راستے کا ایک بہت بڑا راہنما بن گیا۔فلسفے کے مروجہ طور طریقوں نے بڑے اعتماد کے ساتھ اعلان کر دیا کہ انہوں نے مادہ پرستوں کی جدلیات کو باہر پھینک دیا تھا۔یہ سب کچھ انقلاب سے بچنے کی خاطر کیا جا رہا تھا۔کانٹ نے اگرچہ ہیگل کا تختہ الٹ دیا تھا مگر وہ بھی زیادہ دیر تک اپنی حیثیت قائم نہ رکھ سکا۔روسی آزاد خیالی نے تاخیر سے جنم لیا تھا مگر ایک آتش فشاں زمین پر۔حالات جیسے بھی تھے' آزاد خیالی کو کوئی معتبر تحفظ مہیا نہیں کر رہے تھے۔انقلابی عوام کے سامنے کھڑا ہونے اور انہیں روکنے کیلئے زیادہ مضبوط رکاوٹوں کی ضرورت تھی درمیان میں پھنسے ہوئے خیال پرست آرتھوڈ یکس عیسائی بن گئے۔بلگاکوف جو سیاسی معاشیات کا پروفیسر تھا' وہ زرعی سوال پر مارکسزم پر نظر ثانی کر کے آزاد خیالی کی طرف چلا گیا اور بعد میں ایک پادری بن گیا۔ ایسا کرنے میں اسے چند برس لگے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں روس سماجی سوچ کی ایک بڑی لیبارٹری بن گیا تھا۔ فری میئری کی تاریخ پر میں نے جو کام کیا تھا' اس نے مجھے یہ احساس دلانے میں بڑی مدد کی کہ خیالات تاریخی عمل کے تابع ہوتے ہیں۔ میں نے لبرولا کی یہ بات دہرائی کہ خیالات آسمان سے نازل نہیں ہوتے۔ اب سوال سائنسی مطالعے کا نہیں بلکہ سیاسی راستہ منتخب کرنے کا تھا۔ مارکسزم کی ہر ترمیم پر ہر طرف جو بحث جاری تھی اس نے دوسرے نوجوان مارکسٹوں کی طرح میری بڑی مدد کی۔ ہم نے اپنے ذہن بنا لئے اور ہتھیار تیز کر لئے۔ ہمیں مارکسزم کی ضرورت تھی' پاپولزم نے نجات حاصل کرنے کیلئے ہی نہیں جو ہمیں تھوڑا سا متاثر کر رہا تھا۔ ترمی' پسندوں کے خلاف جدوجہد نے ہمیں سیاسی طور پر ہی نہیں بلکہ نظریاتی طور پر بھی مضبوط کر دیا ہم پرولتاری انقلابی بن رہے تھے۔

اسی زمانے میں ہمیں اپنے بائیں بازو کی طرف سے بھی بہت زیادہ تنقید کا سامنا کرنا پڑا' شمالی آبادیوں میں وسکی نام کی ایک آبادی تھی۔ وہاں منماسکی نام کا ایک جلاوطن رہتا تھا جو تھوڑے ہی عرصہ میں مشہور ہو گیا۔ منماسکی نے شروع میں سوشل ڈیمو کریٹک موقع پرستی پر تنقید سے اپنا آغاز کیا۔ اسی کا پہلا مضمون جس میں جرمن سوشل ڈیموکریسی کی موقع پرستی کا بھانڈہ پھوڑا گیا تھا' جلاوطنوں میں بڑا مشہور ہوا۔ اس کے دوسرے مضمون میں مارکس کے معاشی نظام پر تنقید کی گئی تھی اور یہ حیرت ناک نتیجہ اخذ کیا گیا تھا کہ سوشلزم کے ذریعے پیشہ دانش ور محنت کشوں کا استحصال کر رہے تھے۔ اس نے اپنے تیسرے مضمون میں بڑے شاہانہ انداز میں سیاسی جدوجہد کر رد کر دیا۔ چند ماہ تک منماسکی کے مضامین لینا کے جلاوطنوں میں بڑے جوش وخروش اور دلچسپی کا باعث بنے رہے۔ انہوں نے حکومت دشمنی اور انتشار پسندی کے خلاف مجھے ایک طاقت ور ٹیکہ لگا دیا۔ یہ نظریہ دیکھنے میں تو بڑا دلفریب نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں اپنے عملی نتائج کی روشنی میں بڑا بے جان اور بزدلانہ ہے۔

ایک انتشار پسند سے میری گہری ملاقات ماسکو کی جیل میں ہوئی تھی۔ وہ ایک دیہاتی سکول کا ماسٹر تھا جس کا نام لوزن تھا۔ وہ بڑا محتاط' کم گو اور ایک حد تک ظالم تھا۔

وہ جیل میں بھی مجرموں کے ساتھ رہنا پسند کرتا تھا اور ان کی ڈاکوں اور قتلوں کی کہانی بڑے غور سے سنتا تھا۔ وہ نظریے پر بات کرنے سے بچتا رہتا تھا۔ ایک مرتبہ میں نے اصرار کر کے اس سے پوچھا کہ وہ خود مختار کمیٹیاں ریلوے کا نظام کیسے چلائیں گی؟ اس نے جواب دیا' انتشار پسندی کے زمانے میں مجھے ریل میں سفر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس کا یہ جواب میرے لئے کافی تھا۔ لوزن نے ورکروں کو اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کی مگر اس میں ناکام رہا ہمارے اور اس کے درمیان ایک خفیہ جنگ جاری رہی جو غم وغصہ سے خالی نہیں تھی۔

ہم اکٹھے سائبیریا گئے تھے۔ جب دریائے لینا میں طغیانی آئی ہوتی تھی تو لوزن نے ایک کشتی میں بیٹھ کر اسے پار کرنا چاہا اس نے مجھے بھی اپنے ساتھ آنے کو کہا میں تیار ہو گیا۔ بپھرے ہوئے دریا کی سطح پر شہتیر اور مردہ جانوروں کی لاشیں تیر رہی تھیں۔ راستے میں بہت سے بھنور تھے۔ ہم بحفاظت دوسرے کنارے پہنچ تو گئے۔ مگر بہت سے خطرات مول لینے کے بعد۔ لوزن نے مجھے زبانی طور پر تحسین کا سٹرٹیفکیٹ دیتے ہوئے کہا۔ ''تم ایک اچھے کامریڈ ہو۔'' اس کے بعد ہمارے تعلقات دوستانہ ہونے لگے۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد اسے شمال کی ایک دورافتادہ جگہ بھیج دیا گیا۔ چند ماہ بعد اس نے مقامی پولیس کے سربراہ کو چاقو مار دیا۔ پولیس والا کچھ ایسا برا آدمی بھی نہ تھا۔ چاقو کا زخم خطرناک ثابت نہ ہوا۔ مقدمے کے دوران لوزن نے عدالت کو بتایا کہ وہ ذاتی طور پر پولیس کے چیف کے خلاف نہیں تھا لیکن وہ اس کے ذریعے حکومت کے مظالم پر چوٹ لگانا چاہتا تھا۔ اسے سخت قید کی سزا سنائی گئی۔

جس وقت سائبیریا کے جلاوطنوں کی آبادیوں میں یہ گرم بحثیں جاری تھیں کہ روسی کسانوں کے مختلف طبقات کیا ہیں' انگلش ٹریڈ یونینیں کیا کر رہی تھیں؟ طبقاتی مفادات کس نوعیت کے تھے اور مارکسزم اور ڈارونزم میں کیا فرق تھا تو انہیں دنوں حکومتی حلقوں میں ایک خاص جدوجہد ظاہر ہو رہی تھی۔ فروری 1901ء میں مقدس مجلس کلیسا نے لیوٹا ٹالسٹائی کو عیسائیت کے دائرے سے خارج کر دیا۔

مجلس کلیسا کا فرمان تمام اخبارات میں شائع ہوا۔ ٹالسٹائی پر چھ الزام عائد کیئے گئے تھے پہلا وہ بائیبل کی خلاف ورزی کرتے ہوئے خدا کی ذات سے منکر ہے اور دوسرا وہ انکار کرتا ہے کہ یسوع خدا کا بھیجا ہوا آدمی ہے اور اسے مردوں سے زندہ اٹھایا گیا تھا۔ تیسرا وہ حضرت مریم کی پاک بازی اور دوشیزگی اور ان کے مقدس حمل سے انکاری ہے۔ چوتھا وہ موت ک بعد کی زندگی اور گناہوں کی پاداش پر یقین نہیں رکھتا۔ پانچواں وہ روح القدس کی بخشش کو رد کرتا ہے۔ چھٹا وہ عشائے ربانی کا مذاق اڑاتا ہے۔ حکومت کے بڑے بڑے ستون جن میں سفید داڑھیوں والے بزرگ بھی شامل تھے اور جو خود کو بے حد تجربہ کار دانا اور ہم انقلابیوں کو مجرم نہیں تو نیم پاگل ضرور سمجھتے تھے اس عظیم حقیقت پسند ادیب کیلیئے سزا کا مطالبہ کر رہے تھے۔ ہم ٹالسٹائی کے کفر پر مبنی کلمات کی فہرست بار بار پڑھتے ہر دفعہ ایک تازہ حیرت کے ساتھ' اور اپنے آپ سے کہتے: نہیں' انسانی تجربہ ہمارے پاس ہے' ہم مستقبل کے نمائندہ ہیں جب کہ یہ بڑے بڑے عہدوں اور رتبوں پر براجمان لوگ مجرم ہی نہیں پاگل اور خبطی بھی ہیں۔ ہمیں یقین تھا کہ ہم اس جلاوطنی سے بہتر طور پر سرخ رو ہو جائیں گے۔

بوسیدہ حکومتی ڈھانچے میں بنیادوں تک دراڑیں پڑ رہی تھیں۔ جدوجہد میں طلباء ابھی تک سرغنہ تھے۔ وہ بے صبری میں دہشت گردی کے طریقوں پر اتر آئے تھے۔ والیشوف کی طرف سے کپر ووچ (جو 1901ء میں وزیر تقسیم تھا) کو گولیوں کا نشانہ بنانے کے بعد تمام جلاوطن یوں بیدار ہو گئے جیسے انہوں نے نقارہ جنگ سن لیا تھا۔ دہشت پسندانہ طریقے استحصال کرنے کے متعلق دلائل دیے جانے لگے۔ جب سب دل کا غبار نکال چکے تو مارکسٹوں نے دہشت گردی کے خلاف ووٹ دیا۔ ہم نے کہا کہ بارود عوامی عمل کی جگہ نہیں لے سکتا تھا۔ اس طرح محنت کش طبقہ عمل پر آمادہ نہیں ہو سکتا۔ ہم زار کے وزیروں کو مارنے کے حق میں نہیں بلکہ انقلابی اقدام سے زاریت کا تختہ الٹنا چاہتے ہیں۔ یہی وہ مقام تھا جہاں سوشل ڈیموکریٹوں اور سوشلسٹ انقلابیوں کے درمیان خط امتیاز کھنچ جاتا تھا۔ میرے نظریات کی تشکیل قید خانے میں ہوئی جب کہ

میرے اندر سیاسی خوداعتمادی جلاوطنی کے زمانے میں آئی۔

اس طرح دوسال گزر گئے۔اس دوران میں پیٹرز برگ' ماسکو اور وارسا کے پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہ گیا تھا۔جو تحریک زیر زمین شروع ہوئی تھی' اب شہر کی سڑکوں پر دکھائی دے رہی تھی۔بعض اضلاع میں کسان بھی متحرک ہو رہے تھے۔ سائبیریا میں بھی سوشل ڈیموکریٹ تنظیمیں وجود میں آ رہی تھیں۔انہوں نے مجھ سے رابطہ قائم کیا اور میں ان کیلئے پمفلٹ اور ہینڈ بل تیار کرنے لگا۔تین سال کے وقفے میں دوبارہ عملی جدوجہد میں آ گیا تھا۔

جلاوطن لوگ اپنی جلاوطنی کی جگہوں پر ٹھہرنے کو تیار نہیں تھے۔ان میں فرار ہونے کی بیمار پھیل رہی تھی۔ہمیں ردوبدل کا ایک نظام وضع کرنے کی ضرورت تھی۔ ہر گاؤں میں ایسے کسان موجود تھے جو اپنی جوانی میں پرانے انقلابیوں کے زیر اثر رہے تھے۔وہ خفیہ طور پر کشتیوں' گاڑیوں اور چھکڑوں میں سیاسی کام جاری رکھے ہوئے تھے اور اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا رہے تھے۔ سائبیریا کی پولیس بھی ہماری پرح بے یارومددگار تھی۔میدانوں کی وسعت دوست بھی تھی اور دشمن بھی۔کسی مفرور کو پکڑنا بڑا مشکل تھا۔یہ زیادہ ممکن تھا کہ وہ دریا میں ڈوب جاتا یا کسی جنگل میں برف میں دب کر مرجاتا۔

انقلابی تحریک وسعت اختیار کررہی تھی مگر اس میں اتحاد کی کمی تھی۔ ہر شہر اور قصبہ اپنی انفرادی جدوجہد میں مصروف تھا۔حکومت کو یہ برتری حاصل تھی کہ وہ اجتماعی شکل میں کام کررہی تھی۔ایک مرکزی پارٹی کی ضرورت انقلابیوں کے ذہنوں کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ میں نے اس ضرورت پر ایک مضمون لکھا جسے جلاوطنوں کی تمام آبادیوں میں تقسیم کیا گیا۔اس پر بڑی بحث ہوئی۔ہم نے دیکھا کہ روس کے اندر اور اس سے باہر ہمارے سوشل ڈیموکریٹ ساتھی اس سوال پر زیادہ توجہ نہیں دے رہے تھے۔ 1902ء کے موسم گرما میں مجھے باہر سے شائع شدہ کتابوں کا ایک بنڈل ملا۔کتابوں کی اشاعت اور جلد بندی نہایت نفیس طریقے سے کی گئی تھی۔ کاغذ بھی بڑا عمدہ تھا۔ان

کتابوں سے ہمیں معلوم ہوا کہ بدیس میں ''اسکرا'' نام سے ایک اخبار نکلتا تھا جس کا بڑا مقصد تمام انقلابیوں کو ایک مرکزی تنظیم میں جمع کر کے باعمل بنانا تھا جنیوا سے شائع ہونے والی لینن کی ایک کتاب بھی ہم تک پہنچی ۔کتاب کا نام تھا ''کیا کیا جائے'' جو خاص طور پر اس مسئلے پر لکھی گئی تھی ۔میرے سامنے کرنے والے جو بڑے کام تھے ان کے پیش نظر میں نے اب تک جو کام کیا تھا' جو پمفلٹ' مضمون' اور ہینڈ بل لکھے تھے، وہ بڑے حقیر محسوس ہونے لگے ۔ مجھے اپنے عمل اور سرگرمیوں کیلئے کوئی اور میدان دیکھنے کی ضرورت تھی ۔ مجھے جلاوطنی سے فرار حاصل کرنا تھا۔

اس وقت تک ہماری دو بیٹیاں پیدا ہو چکی تھیں ۔چھوٹی چار ماہ کی تھی ۔سائبیریا کے حالات زندگی آسان نہیں تھی ۔میرے فرار نے الیگزینڈرا لوفنا پر دوہرا بوجھ ڈال دینا تھا۔لیکن نے دو لفظ کہہ کر میری پریشانی دور کر دی۔''تم جاؤ'' انقلاب کا فرض ہر ذاتی سوال اور مسئلے پر چھا گیا۔ ہمارے سامنے جو نئے عظیم کام تھے ان کے پیش نظر اس نے خود میرے فرار کی تجویز پیش کی تھی ۔اس نے میرے تمام شبہات ایک طرف رکھ دیے۔

میرے فرار کے کئی دہائی بعد تک اس نے یہ بات پولیس سے خفیہ رکھی ۔ باہر سے میں اس کے ساتھ بمشکل رابطہ قائم رکھ سکتا تھا۔ پھر اسے دوسری بار جلاوطن کر دیا گیا۔اس کے بعد ہماری ملاقات کبھی کبھار ہوتی تھی ۔ زندگی نے ہمیں ایک دوسرے سے جدا کر دیا تھا۔لیکن ہماری دوستی اور ذہنی رفاقت کو کوئی ختم نہیں کر سکتا تھا۔

میرا پہلا فرار

راستوں کو دشوار گزار اور نا قابل سفر بناتا ہوا موسم خزاں نزدیک آرہا تھا۔ فرار کو تیز تر بناتے ہوئے ہم نے ایک پنتھ دو کاج کا فیصلہ کیا۔ایک کسان دوست مجھے امی باجی کے ہمراہ جو مارکس کی مترجم تھی' ورخولنست سے باہر نکالنے پر متفق ہو گیا۔رات کے وقت اس نے ہمیں اپنے چھکڑے میں گھاس اور دری کے نیچے چھپا دیا جیسے ہم کوئی

سامان تھے۔ اس کے ساتھ ہی پولیس کا شک دور کرنے کیلئے میرے گھر میں میرے بستر پر ایک بیمار آدمی کو ڈمی لٹا دی گئی۔ کوچوان سائبیریا کے رواج کے مطابق چھکڑے کو دوڑانے لگا۔ وہ ایک گھنٹے میں بیس ورسٹ (میل سے کم) کا فاصلہ طے کر جاتا۔ میری کمر پر جتنے جھٹکے لگتے تھے انہیں میں گنتا رہا۔ میری ساتھی کا جو حال تھا وہ بیان سے باہر تھا۔ سفر پہلے میں اور میری ساتھی دو مختلف راتوں پر ہولیے تاکہ ہم دونوں ایک ہی خطرے کا شکار نہ ہو جائیں۔ میں حفاظت سے ریل کے ڈبے میں سوار ہو گیا۔ وہاں ارکتش سے آئے ہوئے میرے دوستوں نے مجھے ایک سوٹ کیس دیا جس میں کلف لگی قمیضیں، ٹائیاں اور دوسرا مہذب سامان تھا۔ میرے ہاتھ میں روسی ترجمہ شدہ ہومر کی ''الیاڈ'' کی ایک کاپی تھی۔ میری جیب میں ٹراٹسکی کے نام پر بنا ہوا پاسپورٹ تھا۔ اس وقت مجھے سائبیرین ریلوے لائن پر مغرب کی طرف جا رہا تھا۔ سٹیشن پر کھڑی پولیس نے بڑی بے اعتنائی سے مجھے جانے دیا۔

راستے میں ریلوے سٹیشنوں پر دراز قد سائبیرین عورتیں بھنے ہوئے چکن، سور کے تکے، دودھ کی بوتلیں اور روٹی بیچ رہی تھیں۔ ہر سٹیشن سائبیریا کے خاص انداز میں تعمیر کیا گیا تھا۔ ڈبہ سارا راستہ مسافروں سے بھرا رہا۔ مسافر چائے پیتے اور سستی ڈبل روٹی کھاتے رہے۔ میں باہر کی زندگی کے خواب دیکھتا رہا۔ یہ فرار بڑا پرسکون تھا جس میں کوئی رومانی شان وشوکت نہیں تھی۔ میں مسلسل چائے پیتا رہا۔

میں نے سمارا میں مختصر قیام کیا جہاں ''اسکرا'' کا سٹاف پناہ گیروں پر مشتمل سٹاف سے بالکل نمایاں دکھائی دے رہا تھا۔ سٹاف کا سربراہ کلر نامی ایک شخص تھا۔ یہ اس کا فرضی نام تھا۔ اصل میں وہ کرزیانوسکی تھا جو آج سٹیٹ پلاننگ کمیٹی کا چیئرمین ہے۔ وہ اور اس کی بیوی لینن کے دوست تھے۔ اور 5-1894 میں سینٹ پیٹرز برگ میں اور بعد میں جلاطنی کے زمانے میں لینن کے ساتھ مل کر سوشل ڈیموکریسی کا کام کرتے رہے تھے۔ 1905ء میں انقلاب کی شکست کے بعد کلر اپنے ہزاروں انقلابی ساتھیوں کے ساتھ پارٹی سے چلا گیا اور بطور انجینئر اس نے صنعتی دنیا میں بڑا نام کمایا۔ جو انقلابی خفیہ

طور پر کام کرتے رہے تھے انہوں نے شکایت کی کہ اس نے ان کی اتنی مدد بھی نہیں کی تھی جتنی آزاد خیال کرتے رہے تھے۔ دس یا بارہ برس کے وقفے کے بعد کرزیانووسکی پارٹی کے برسر اقتدار آنے کے بعد دوبارہ اس میں شامل ہو گیا۔ بہت سے دانش وروں نے یہی وطیرہ اختیار کیا تھا جو آج سٹالن کی حکومت میں ریڑھ کی ہڈی بنے ہوئے تھے۔

سمارا میں میں سرکاری طور پر ''اسکرا'' کی سٹاف ''پیرو'' کے قلمی نام سے شامل ہو گیا۔ مجھے نام کلرنے سائبیریا میں میری صحافیانہ کامیابیوں سے خوش ہو کر دیا تھا ''اسکرا'' ازسرنو پارٹی کی تنظیم کر رہا تھا۔ 1898ء میں منسک میں منعقد ہونے والی پہلی پارٹی کانگریس پارٹی کو مرکزی حیثیت دینے میں ناکام رہی تھی۔ بڑی تعداد میں گرفتاریوں نے ہماری کمزور تنظیم کو جو ابھی تک ملک میں جڑ نہیں پکڑ سکی تھی' مزید کمزور کر دیا تھا۔ اس کے بعد انقلابی تحریک بکھرے ہوئے مرکزوں میں کام کرتی رہی۔ اور اس کا کردار دیہی نوعیت کا ہو گیا۔ اس کی فکری سطح بھی گر گئی۔ سوشل ڈیموکریٹوں نے عوام کو اپنی طرف کرنے کی خاطر اپنے سیاسی نعروں کو پس منظر میں دھکیل دیا۔ انہوں نے اپنے نام نہاد ''معاشی سکول'' کا اعلان کر دیا۔ یہ سکول اپنی طاقت صنعتی ترقی اور ہڑتالوں کی افزونی سے حاصل کر رہا تھا۔ گذشتہ صدی کے موڑ پر ایک ایسا بحران پیدا ہوا جس نے پورے ملک میں مخالفت کو بڑھا دیا اور سیاسی تحریک کو زبردست بڑھاوا دیا۔ ''اسکرا'' نے دیہی ''معیشت دانوں'' لی خلاف ایک زبردست تحریک شروع کی اور ایک مرکزی انقلابی پارٹی کی وکالت شروع کر دی۔ اسکرا کا سٹاف باہر بھی رکھا گیا تھا تا کہ تنظیم جس میں بڑی احتیاط کے ساتھ پیشہ ور انقلابیوں میں سے آدمی رکھے جاتے تھے' نظریاتی طور پر استحکام حاصل کر سکے اور نظریاتی اور عملی طریقوں میں اتحاد اور یگانگت پیدا ہو سکے۔ اسکرا میں بہت سے کام کرنے والے پرانے ساتھی اور دانش ور بھی تھے۔ وہ پارٹی کانگریس اور مقامی سوشل ڈیموکریٹک کمیٹیوں پر کنٹرول حاصل کرنے کیلئے لگے رہتے جس سے اسکرا کے خیالات اور طریقہ کار کا فتح حاصل ہونا تھی۔ اسکرا حقیقی معنوں میں انقلابی تنظیم کا ایک خاکہ تھا۔ وہ اپنی ترقی کی منزلیں طے کرتے وقت دو قدم آگے

بڑھتا تو ایک قدم پیچھے ہٹ جاتا۔ یہ روز بروز عوام اور محنت کشوں کے نزدیک ہوتا جا رہا تھا اور ان کے سامنے دوررس نتائج کے کام رکھ رہا تھا۔ اسی تنظیم نے پندرہ برس بعد بورژوازی کا تختہ الٹ کر خود اقتدار حاصل کر لیا تھا۔

سمارا تنظیم کی درخواست پر میں نے خرکوف' پولٹاوا' اور کیف کا دورہ کیا اور بہت سے ایسے انقلابیوں سے ملاقات کی جو اسکرا میں شمولیت کر چکے تھے یا جنہیں شمولیت کی ترغیب دینا تھی۔ میں بہت تھوڑی کامیابی کے ساتھ واپس آیا۔ جنوبی علاقوں کے ساتھ تعلقات ابھی اتنے اثر آفرین نہیں تھے۔ خرکوف میں جن لوگوں کے پتے مجھے دیے گئے تھے وہ غلط نکلے۔ پولٹوا میں مجھے بڑی سہ پرستانہ نگاہ سے دیکھا گیا۔ ظاہر ہے کہ ایک دورے سے زیادہ توقع وابستہ نہیں کی جا سکتی تھی۔ مسلسل کام کرنے کی ضرورت تھی۔ اسی دوران میں لینن نے جس کے ساتھ سمارا تنظیم کے بڑے خوشگوار تعلقات تھے' مجھے ملک سے باہر جانے کی ہدایت کی۔ کلر نے میرے اخراجات کا بندوبست کیا اور اسکے ساتھ ہی کامانیز - بوڈولشک کے نزدیک آسٹریا کی سرحد عبور کرنے کے متعلق ضروری اطلاعات فراہم کیں۔

سمارا کے ریلوے سٹیشن پر گاڑی میں بیٹھے مسافروں میں ایک میلے کا سماں تھا۔ پولیس سے دوسری مرتبہ بچنے کیلئے میں نے اپنے سامان کے ساتھ اپنی سیٹ پر سولویوف نامی ایک طالب علم کو بٹھا دیا اور خود اسی وقت ڈبے میں سوار ہوا جب گاڑی چلنے والی تھی۔ سولویوف آجکل اٹلی سنڈیکیٹ کے سربراہوں میں سے ایک ہے۔ میں پاس ہی کھیتوں میں بڑے پرسکون طریقہ سے گھومتا رہا۔ میری آنکھ کلاک پر تھی۔ ریل کی راونگی کی دوسری گھنٹی بج گئی۔ مجھے ایکدم احساس ہوا کہ مجھے ریل کی روانگی کا غلط وقت دیا گیا۔ میں سرپٹ بھاگا۔ سولویوف جو میرے انتظار میں ڈبے میں بیٹھا ہوا تھا مجھے اپنی طرف آیا ہوا دیکھ کر ایکدم چلتی ہوئی گاڑی میں سے کود پڑا۔ اسے سٹیشن پولیس اور سرکاری اہلکاروں نے گھیر لیا۔ مجھے ٹرین کی طرف بھاگتا ہوا دیکھ کر دوسرے لوگ بھی میری طرف متوجہ ہو گئے۔ پولیس نے سولویوف کے خلاف کارروائی کرنے کی دھمکی

دی مگر بعد میں بات مذاق میں رفع دفع ہوگئی۔

میں کسی مشکل کے بغیر بارڈر پر پہنچ گیا۔آخری سٹیشن پر پولیس والے نے مجھے پاسپورٹ دکھانے کو کہا۔ جب اس نے پاسپورٹ دیکھ کرتسلی کا اظہار کیا تو مجھے بڑی حیرت ہوئی کیونکہ میں خود کو تیار کیا ہوا تھا۔ایک لڑکا جوجمنیزم میں میرے ساتھ پڑھتا تھا اس نے سرحد پار کروانے کے مجھ سے پیسے لیے۔ اووہ جمہوریہ روس میں ایک کیمائی ادارے کا سربراہ ہے۔اس کا خیال ہے کہ اس نے سوشلسٹ انقلابیوں کی مدد کی تھی۔ جب اسے معلوم ہوا کہ میرا تعلق اسکرا تنظیم سے تھا تو اس نے کہا۔''تمہیں معلوم ہے کہ اسکرا نے اپنے گذشتہ شمارے میں دہشت گردی کے متعلق بڑی شرمناک باتیں لکھی تھیں؟''

میں اس سے نظریاتی بحث کا آغاز کرنے ہی والا تھا کہ وہ دوبارہ مشتعل ہوکر کہنے لگا۔''میں تمہیں سرحد پار نہیں کراؤں گا۔''اس غیر متوقع بات پر میں بے حد حیران ہوا۔ اس کے باوجود یہ بالکل درست تھی۔ پندرہ برس بعد ہم نے ہتھیار بند ہوکر سوشلسٹ انقلابیوں کی جنگ لڑنی تھی۔ بہرحال اس وقت مجھے مستقبل کی تاریخ کے امکانات میں زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے اس کہا کہ اسکرا میں شائع ہونے والے مضمون کی مجھے سزا دینا انصاف کی بات نہیں تھی۔ اسے میری مدد کرنی ہی پڑے گی۔لڑکا نرم پڑ گیا۔ ''اچھا' میں تمہاری مدد کروں گا۔''بولو۔''مگر انہیں بتا دینا کہ ایسا آخری بار ہوگا۔''

اس لڑکے نے مجھے ایک گشتی کاروباری آدمی کے خالی گھر میں رات کیلئے ٹھہرا دیا۔ اس آدمی نے اگلی صبح آ جانا تھا۔ مجھے ہلکا سا یاد پڑتا ہے کہ گھر میں داخل ہونے کیلئے مجھے کھڑکی کا راستہ اختیار کرنا پڑا تھا۔ رات کو ایک دم تیز روشنی کے کوندے نے مجھے جگا دیا۔ایک چھوٹے قد کا اجنبی جس نے ایک ہاتھ میں موم بتی اور دوسرے میں چھڑی پکڑ رکھی تھی' مجھ پر جھکا ہوا تھا۔چھت سے ایک برے آدمی کا سایہ میری طرف رینگ رہا تھا۔

''تم کون ہو؟''میں نے غصے سے پوچھا۔

''یہی سوال میں تم سے پوچھتا ہوں۔'' اجنبی نے جواب دیا۔'' تم میرے بستر میں لیٹے ہوا اور مجھ سے پوچھ رہے ہو کہ میں کون ہوں'' ظاہر ہے وہ مالک مکان تھا۔ میری اس بات نے کہ اس نے تو صبح کے وقت آنا تھا' اسے بالکل متاثر نہ کیا۔'' میں جانتا ہوں کہ میں نے ک واپس آنا ہوتا ہے۔'' اس کی بات درست تھی۔ صورتحال بڑی پیچیدہ ہو رہی تھی۔ وہ بولا۔ میں جان گیا کہ یہ حرکت الیگزینڈر نے کی ہو گی۔ اب میں اس سے صبح ہی بات کروں گا۔'' میں ایک دم اس سے متفق ہو گیا اور بتایا کہ الیگزینڈر ہی نے مجھے اس مکان میں داخل کیا تھا۔ میں نے رات مالک مکان کے ساتھ گزاری۔ اسنے بڑی شفقت اور محبت سے مجھے صبح چائے پلائی۔

الیگزینڈر نے آ کر بڑے طوفانی انداز میں ہر بات میرے میزبان کو بتائی اور پھر مجھے بروڈی گاؤں کے سمگلروں کے سپرد کر دیا۔ مجھے سارا دن ایک باڑے میں رکھا گیا۔ اس کا مالک ایک یوکرانی کسان تھا۔ اس نے تربوز سے میری خوب خاطر تواضع کی۔ رات کو طوفانی بارش میں وہ مجھے سرحد کی طرف لے گیا۔ ہم دیر تک اندھیرے میں چلتے اور ٹھوکریں کھاتے رہے۔'' اب میری پشت پر سوار ہو جاؤ۔'' میرے گائیڈ نے مجھ سے کہا۔'' اس سے آگے پانی ہے۔'' میں ذرا ہچکچایا اور سرگوشیاں کر کے اس کی ہمت بڑھا رہا تھا۔ پہیے کیچر میں دھنس رہے تھے۔ ہلکا چھکڑا ایک طرف لڑھک کر پھر سیدھا ہو جاتا تھا۔ اکتوبر کے ماہ کا کیچر بے حد سرد اور گہرا تھا۔ پھر ہم دونوں ایک جھٹکے سے نیچے گرے اور اس میں دھنس گئے۔ ستم یہ ہوا کہ میں ایک عینک کھو بیٹھا لیکن سب سے خوفناک بات یہ ہوئی کہ جب ہم کیچڑ میں کرے پڑے تھے تو اس وقت دل چھیلا جانے والی ایک آواز سنائی دی۔ بالکل اسی جگہ سے جہاں ہم پڑے ہوئے تھے۔ دکھ سے بھری ہوئی چیخ' مدد کیلئے بلاتی ہوئی آسمان سے مدد مانگنے والی پراسرار آواز۔ اس اندھیری اور بھیگی ہوئی رات میں یہ بتانا سمجھ سے باہر تھا کہ وہ کس کی آواز تھی۔ ایک آواز جو اس قدر صاف تھی مگر انسانی نہیں تھی۔

''یہ ہمیں برباد کر دے گا۔'' بوڑھا مایوسی میں بڑبڑایا۔'' میں تم سے کہہ رہا ہوں یہ

ہمیں برباد کر دے گا۔‘‘

’’یہ کون ہے؟‘‘ خوف سے میرا سانس خشک ہو گیا۔

’’یہ کم بخت مرغا ہے۔ میری بیوی نے مجھے خیرات کے طور پر پادری کو دینے کیلئے مجھے دیا تھا۔‘‘ مرغا باقاعدہ وقفوں سے چیختا رہا۔ ’’یہ ہمیں برباد کر دے گا۔ فوج کی چوکی یہاں سے فقط دو سو گز دور ہے۔ سپاہی ایک منٹ میں یہاں پہنچ جائیں گے‘‘۔

’’اس کی گردن دبا دو‘‘ میں نے سرگوشی کی۔

’’کس کی؟ مرغے کی؟ نہ جانے کہاں چھپا بیٹھا ہے۔ مجھے دکھائی نہیں دے رہا۔‘‘

ہم اندھیرے میں کیچڑ میں ٹامک ٹوئیاں مارنے لگے۔ بارش ہمارے جسموں پر تھپیڑے مار رہی تھی۔ ہم مرغے اور اپنی قسمت کو کوسنے لگے۔ بچارہ پرندہ احتجاج کیا۔ ’’تم بھیگے بغیر دوسری طرف نہیں جا سکتے‘‘۔ اس نے کہا۔ مجھے اس کی پیٹھ پر سوار ہو کر سفر جاری رکھنا پڑا۔ میرے جوتے پانی میں بھیگے بغیر نہ رہ سکے۔

کوئی پندرہ منٹ بعد ہم بروڈی کے آسٹریا والے حصے میں ایک یہودی کے جھونپڑے میں خود کو خشک کر رہے تھے۔ جھونپڑے کے باسیوں نے مجھے بتایا کہ میرا گائیڈ زیادہ رقم لینے کی خاطر مجھے گہرے پانی میں لے گیا تھا۔ دوسری طرف میرے کسان گائیڈ نے مجھے دوستانہ انداز میں یہودیوں سے خبردار رہنے کو کہا جو اپنے جھونپڑے میں پناہ دینے کا تین گنا زیادہ کرایہ وصول کرتے تھے۔ میرے مالی ذرائع بڑی تیزی سے ختم ہو رہے تھے اور مجھے ریلوے سٹیشن پر پہنچنے کیلئے ابھی مزید آٹھ کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنا تھا۔ ہم بارش کی وجہ سے کیچڑ میں رو تین کلومیٹر تک چلتے رہے حتیٰ کہ سڑک آ گئی۔ ہمارا سفر مشکل ہی نہیں خطرناک بھی تھا۔ ہم دو پہیوں والے چھکڑے میں سفر کر رہے تھے جسے ایک مزدور چلا رہا تھا۔

’’اس کاروبار میں ایک دن میں جان گنوا بیٹھوں گا۔‘‘ وہ بڑبڑایا۔

’’وہ کیوں؟‘‘

’’سپاہی پکارتے رہتے ہیں۔ اگر آپ جواب نہ دیں تو گولی مار دیتے ہیں۔ وہ

دیکھو وہ ان کی روشنیاں دکھائی دے رہی ہیں۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم ایک اچھی رات میں سفر کر رہے ہیں۔''

واقعی رات بہت اچھی تھی۔ اندھیرے سے بھرپور اور بدن کاٹنے والی خزاں کی رات۔ چہرے پر پڑنے والی وقفے وقفے کی بارش اور کیچڑ میں گھوڑے کے سموں کی آواز ہم پہاڑوں پر چڑھ رہے تھے۔ پہیے پھسل رہے تھے۔ بوڑھا آدمی گھوڑے کے ساتھ میرے کمبل کے نیچے دب گیا۔ بوڑھے نے اسے رہائی دلائی اور وہ خاموش ہو گیا۔ ہم نے چھکڑے کو سیدھا کیا اور اپنا سفر جاری رکھا۔ سٹیشن پر پہنچ کر ٹرین آنے سے پہلے میں تین گھنٹوں تک خود کو خشک کرتا رہا۔

کرنسی تبدیل کروانے کے بعد مجھے پتہ چلا کہ زیورچ پہنچنے کیلئے جو میری منزل تھی، میرے پاس کافی رقم نہیں تھی۔ وہاں میں نے ایکسل راڈ کو ملنا تھا۔ میں نے وی آنا تک کا ٹکٹ خریدا اور فیصلہ کیا کہ آگلے سفر کیلئے وی آنا میں رقم کا انتظام کروں گا۔ وی آنا میں مجھے یہ جان کر بے حد حیرت ہوئی کہ جرمن زبان جاننے کے باوجود کوئی بھی میری بات سمجھ نہیں رہا تھا۔ میرے پاس سے گزرنے والے مجھے سنتے مگر کوئی جواب دیئے بغیر آگے بڑھ جاتے۔ آخر میں ایک بوڑھے آدمی کو جس نے سرخ ٹوپی پہن رکھی تھی۔ میں یہ بات سمجھانے میں کامیاب ہو گیا کہ میں ''آربیٹر-زی تنگ'' کے دفتر میں جانا چاہتا تھا۔ میں نے یہ پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ وکٹر ایڈلر جو آسٹرین سوشل ڈیمو کریسی کا راہنما تھا، کے سوا کسی کو یہ بات نہیں بتاؤں گا کہ روسی انقلاب کے مفاد میں زیورچ میں میرا فوری طور پر رہنا بہت ضروری تھا۔ میرا گائیڈ مجھے وہاں تک لے جانے پر متفق ہو گیا۔ ہم ایک گھنٹے تک چلتے رہے۔ وہاں جا کر ہمیں معلوم ہوا کہ اخبار کا دفتر کسی اور جگہ منتقل ہو گیا تھا۔ ہمیں پھر نصف گھنٹہ کی مشاقت طے کرنا پڑی۔ وہاں پہنچ کر دروازے پر کھڑے چوکیدار نے ہمیں اطلاع دی کہ ملاقات کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ میرے پاس گائیڈ کو دینے کیلئے رقم نہ تھی، میں بھوکا تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ مجھے زیورچ جانا تھا۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ ایک آدمی جو مشکل سے کوئی دوستانہ

نوعیت کا نظر نہیں آ رہا تھا' سیڑھیوں سے اتر رہا تھا۔ میں نے اس سے ایڈلر کے بارے میں پوچھا۔

''تمہیں معلوم ہے کہ آج کون سا دن ہے؟'' اس نے مجھ سے قدرے سختی سے پوچھا۔

''مجھے نہیں معلوم تھا ٹرین میں' جمکڑے میں' کاروباری آدمی کے گریس یوکرانی کے بارے میں' رات کو مرغے کے ساتھ جدوجہد میں مجھے وقت کا احساس نہیں رہا تھا۔

''آج اتوار ہے'' اس شریف آدمی نے مجھے یاد دلایا اور میرے پاس سے گزرنے کی کوشش کی۔

''پھر کیا ہوا۔ میں ایڈلر سے ملنا چاہتا ہوں۔''

اس آدمی نے مجھے ایک ایسی آواز میں جواب دیا جیسے وہ کسی طوفان میں اپنے سپاہیوں کو حکم دے رہا تھا۔

''میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ تم ڈاکٹر ایڈلر کو اتوار کے دن نہیں مل سکتے''۔ ''لیکن میرا س سے ملنا بہت ضروری ہے'' میں نے اپنی بات پر اصرار کیا۔ ''تمہارا کام دس گنا زیادہ اہم ہو تم اسے نہیں مل سکتے' بات تمہاری سمجھ میں آئی؟'' اس آدمی کا نام فرزت اسٹریز تھا۔ جو دفتر کا انچارج تھا۔ اور سارے دفتر کیلئے ایک دہشت بنا ہوا تھا۔ وہ میری طرف تیز نظروں سے دیکھ کر بولا۔ ''میری بات دھیان سے سنو۔ اگر تم یہ خبر لے کر بھی آتے کہ تمہارا زار قتل ہو گیا ہے اور تمہارے ملک میں انقلاب آ گیا ہے تو اس صورت میں بھی تم ڈاکٹر کے اتوار کے آرام میں مخل ہونے کے حقدار نہیں بنتے۔''

میں اس شریف آدمی کی گرج سے متاثر ہونا شروع ہو گیا لیکن اس کے ساتھ ہی میں یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ وہ احمقانہ باتیں کرر ہا تھا۔ یہ بات میری سمجھ سے بالاتھی کہ اتوار کے آرام کو انقلاب پر کیسے ترجیح دی جا سکتی تھی۔ میں نے ہار ماننے سے انکار کر دیا۔ مجھے زیورچ جانا تھا وہاں اسکرا کے ایڈیٹر میرا انتظار کرر ہے تھے اس کے علاوہ میں سائبیریا سے فرار ہو کر آیا تھا اور یہ زیادہ اہم بات تھی۔ میں سیڑھیوں میں اس آدمی کا

راستہ روکے کھڑا رہا۔آخر اس نے مجھے ڈاکٹر ایڈلر کا ایڈریس دے دیا۔ میں اپنے گائیڈ کے ہمراہ اس کے گھر کی طرف چل پڑا۔

مجھے ملنے کیلئے جو آدمی باہر نکلا وہ چھوٹے قد اور جھکے ہوئے شانوں والا تھا۔اس کی آنکھیں سوجھی ہوئی اور چہرہ تھکا ہوا تھا۔اس وقت وی آنا میں قانون ساز اسمبلی کا کوئی الیکشن ہور ہا تھا۔ایڈلر نے اس دن دن کو مختلف تقریریں کی تھیں اور رات کو مضامین لکھے تھے۔ان باتوں کا مجھے بعد میں اس کی بہو سے پتا چلا۔

''جناب میں آپ سے آپ کا اتوار کا آرام خراب کرنے پر معافی کا خواستگار ہوں۔''

''تم نے جو کہنا ہے کہو'' اس نے قدرے سخت لہجے میں کہا' لیکن اسکی آواز میں خوف کے بجائے ہمت بڑھانے والا عنصر تھا۔اس کے چہرے کی ہر جھری سے ذہانت کا اظہار ہور ہا تھا۔

''میں روسی ہوں''

''تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔ یہ اندازہ کرنے کیلئے میرے پاس کافی وقت تھا۔''

میں نے ڈاکٹر کو اپنی اس گفتگو سے آگاہ کیا جو دفتر کے دروازے پر فرٹز اسٹریز سے ہوئی تھی۔

''کیا واقعی ایسا ہوا تھا؟ اس نے یہی کچھ کہا تھا؟ وہ کون آدمی ہوسکتا ہے؟ کیا وہ ایک لمبا تھا؟ چیخنے کے انداز میں بات کرتا تھا؟ اچھا! اچھا وہ اسٹریز تھا۔تم نے بتایا ہے کہ وہ چیختا تھا ہاں! ہاں وہ اسٹریز ہی تھا۔اسے اتنی سنجیدگی سے نہ لو۔اگر کبھی تمہارے پاس روس میں انقلاب کی خبر ہو تو تم رات کو بھی میرے مکان کی گھنٹی بجا سکتے ہو' +++++۔'' وہ اچانک بلند آواز میں بولا اس کی روسی بہو آ گئی۔''اب ہمارا وقت زیادہ اچھا گزرے گا یہ کہہ کر وہ ہم دونوں کو چھوڑ کر چلا گیا۔

مجھے اپنے اگلے سفر کا یقین ہو گیا۔

ایک مہاجر

1902ء کے موسم خزاں میں میں زیورچ سے پیرس کے راستے لندن پہنچا۔ میرا خیال ہے یہ اوائل اکتوبر تھا۔ گھوڑا گاری کا ڈرائیور کئی گنجک راستوں سے گزر کر مجھے اس ایڈریس پر لے گیا جو کاغذ کے ایک پرزے پر لکھا ہوا تھا۔ میری منزل لینن کا مکان تھی۔ زیورچ چھوڑنے سے پہلے مجھے ہدایت کی گئی تھی کہ میں تین دفعہ دروازے پر دستک دوں۔ ابھی بہت صبح تھی تہذیب اور شرافت کا تقاضا تھا کہ اتنی جلدی اور بے وقت کسی کے گھر پر دستک دینے کے بجائے گھنٹہ دو گھنٹے سٹیشن پر ہی گزارے جاتے۔ نادیا کوستن نوگنا نے دروازہ کھولا۔ جس نے شاید میری دستک کی آواز سن لی تھی۔ میں نے اس سے اتنی صبح آنے پر معذرت کی اور بتایا کہ میرے آنے کے مقصد نے مجھے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں نے زیورچ میں بھی اسی بے رحمانہ طریقہ سے ایکسل راڈ کو بے آرام کیا تھا اگرچہ وہ صبح کی بجائے آدھی رات کا وقت تھا۔ لینن ابھی تک بستر میں لیٹا ہوا تھا اور اس کے چہرے پر بجا طور پر حیرت کے ہلکے سے آثار تھے۔ یہ وہ حالات تھے جن میں ں یری اس سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ کلر کے خط سے لینن اور نادیہ مجھے پہلے ہی جانتے تھے اور وہ میرے منتظر تھے۔

''پیرو'' آ گیا ہے۔ ان لفظوں سے میرا استقبال کیا گیا۔ میں نے روس میں جتنا کام کیا تھا لینن کو اس سے آگاہ کیا اور بتایا کہ جنوب میں تعلقات خراب ہیں؟ خرکوف میں اسکرا کا خفیہ ایڈریس غلط ہے' جنوبی ''ورکر'' اخبار کے ایڈیٹر ادغام کے خلاف ہیں' آسٹریا کی سرحد عبور کرنے پر جس طالب علم کی ڈیوٹی لگائی گئی ہے وہ اسکرا کے لوگوں کی مدد کرنے سے انکار کر دیتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ سارے حقائق کوئی خوش کن باتیں نہیں تھیں لیکن ہمارے اندر اس قدر اعتماد تھا کہ انہیں درست کیا جا سکتا تھا۔

اسی صبح یا اگلی صبح ولادی میرا یچ ایلچ (لینن کا اصی نام) اور میں لندن کی لمبی سیر کو نکل گئے ایک پل پر کھڑے ہو کر لینن نے ویسٹ منسٹر اور دوسری مشہور عمارتوں کی طرف اشارہ کیا۔ اب مجھے یاد نہیں رہا کہ اس نے کیا صحیح لفظ استعمال کئے تھے لیکن اس نے جو

کچھ کہا تھا وہ کچھ یوں تھا ''یہ ان کا نامور ویسٹ منسٹر ہے''۔ ''ان کا'' سے اس کا مطلب انگلستان کے حکمران طبقات سے تھا۔ لینن انگریزوں کے ثقافتی ورثے' عجائب گھروں' لائبریریوں یا اسی قسم کی دوسری چیزوں کا ذکر کرتے وقت ہمیشہ ''ان کا'' لفظ استعمال کرتا جس سے اشارہ حکمران طبقوں کی طرف ہی ہوتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حکمران طبقوں کے دکھائی نہ دینے والے سائے پوری انسانی ثقافت پر پھیلے ہوئے تھے۔ یہ سائے اس کے نزدیک اتنے ہی حقیقی تھے جتنی دن کی روشنی۔

اس وقت لندن کے فن تعمیر نے مجھے کچھ زیادہ متاثر نہیں کیا تھا۔ جسمانی طور پر ورخوینسک نے منتقلی کے بعد روسی سرحد سے باہر جو ملک میں پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا ان میں وی آنا' پیرس اور لندن شامل تھے۔ ان شہروں پر میں نے ابھی اچٹتی ہوئی نظر ڈالی تھی۔ ویسٹ منسٹر پیلس مجھے خاصا مصنوعی دکھائی دیا تھا۔ یہ بات بھی نہیں تھی کہ لینن مجھے یہ جگہ دکھانے کیلئے اتنی لمبی سیر پر لے گیا تھا اصل مقصد مجھ سے آشنائی حاصل کرنا اور سوال پوچھنا تھا۔ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس کا معائنہ واقعی بڑا گہرا تھا۔

میں اسے سائبیریا میں ہونے والی بحث ومباحثوں کے متعلق بتاتا رہا' خاص طور پر ایک مرکزی تنظیم کی ضرورت میں اس بارے میں لکھے جانے والے مضامین اور ارکتش میں پرانے پاپولسٹوں سے اپنی لڑائیوں کے متعلق جہاں میں نے چند ہفتے قیام کیا تھا۔ میں نے اسے منخاوسکی کے تین مضمونوں کے متعلق بھی بتایا' اسی قسم کی اور باتیں بھی لینن جانتا تھا کہ کس طرح کسی کی بات سنی جاسکتی تھی۔

''تم نے نظریے پر کیا کام کیا؟''

میں نے اسے بتایا کہ ماسکو کے قید خانے میں ہم نے کس طرح گروپ کی شکل میں اس کی کتاب ''روس میں سرمایہ داری کی ترقی'' اور جلاوطنی میں مارکس کے ''سرمایہ'' کی پہلی جلد پر کام کیا تھا۔ ہم نے برن سٹین اور کٹسکی کے مابین اختلاف رائے کا بڑے غور سے مطالعہ کیا تھا اور اس کیلئے اصلی ذرائع استعمال کئے تھے۔ ہم میں سے کوئی بھی برن سٹین کا مقلد نہ تھا۔ فلسفے میں ہم بگدانوف کی کتاب سے بڑے متاثر تھے جس میں

اس نے مارکسزم کو ماچ اور ایوانیئرس کے علم کے نظریے کو آپس میں ملا دیا تھا۔اس وقت لینن کا خیال تھا بگدانوف کے خیالات درست تھے۔''میں فلسفی تو نہ ؓ ں ہوں'' اس نے قدرے کچے لہجے میں کہا''لیکن پلیخانوف نے بگدانوف کے فلسفہ کو خیال پرستی کی ایک چھپی ہوئی شکل قرار دے کر اس کی مذمت کی ہے۔'' چند برس بعد لینن نے ماچ اور ایوانیئرس کی بحثوں پر ایک ضخیم کتاب لکھی ان کے نظریات پر اس کی تنقید بنیادی طور پر پلیخانوف کی تنقید کی طرز پر تھی۔

میں نے گفتگو میں لینن کو بتایا کہ روسی سرمایہ داری پر اس کی کتاب میں جو اعداد و شمار دیے گئے تھے اور جس طرح ان کا تجزیہ کیا گیا تھا اس سے سائبیرین جلاوطن بڑے متاثر ہوئے تھے۔''یہ ایک دم نہیں اس نے جو اتنا بڑا کام کیا تھا نوجوان کامریڈ اسے عزت اور تحسین کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔میرے مستقبل کے کام پر بھی عام انداز میں بات چیت ہوئی۔ ہمارا اس بات پر اتفاق ہو گیا کہ میں کچھ عرصہ باہر ٹھہرا رہوں' موجودہ ادب سے واقفیت حاصل کروں' ارد گرد کا جائزہ لوں اور باقی چیزوں کا بعد میں جائزہ لیا جائے۔میں جاہتا تھا کہ کچھ عرصے بعد غیر قانونی طور پر دوبارہ روس میں داخل ہو جاؤں اور وہاں انقلابی کام کروں۔

چند گلیاں دور نادیہ مجھے میری رہائش گاہ کیلئے جگہ کی تلاش ایک ایسے گھر میں لے گئی جہاں ویرا زاسیلچ مارتوفا اور اسکرا کی پرنٹنگ پریس کی مینجر بلوم فیلڈ کا قیام تھا۔ برطانوی رواج کے مطابق کمرے ایک ہی فرش پر نہیں تھے بلکہ عمودی شکل میں تھے۔ روس میں ابھی ایسا ہی تھا۔سب سے نیچے مالک مکان کا کمرہ تھا اور اس کے اوپر ایک کے بعد ایک دوسرے کمرے تھے۔ ایک مشترکہ کمرہ بھی تھا جس میں ہم چائے اور سگریٹ پیتے اور بحث میں مصروف رہتے تھے۔ یہ کمرہ زاسولچ اور مارٹوف کی مہربانیوں سے کبھی کسی ترتیب سے آشنا نہیں ہوا تھا۔پلیخانوف نے پہلی بار یہاں آنے سے اسے ''صمبرہ'' قرار دیا تھا۔یہ میری مختصر داستان کا آغاز تھا۔ میں نے اسکرا اور ''زاریا'' جو اسکرا کی عمارت ہی سے نکلتا تھا' کے شماروں اور ان میں شائع ہونے

والے تبصروں کا مطالعہ شروع کر دیا۔ یہ بڑے شاندار پرچے تھے جنہیں سائنسی مہارت اور انقلابی جذبے کے ساتھ نکالا جا رہا تھا۔ حقیقت میں مجھے اسکرا سے محبت ہوگئی تھی اور اس محبت کو قابو میں رکھنے کیلئے میں مسلسل کوشش میں لگا رہتا تا۔ میں نے جلد ہی اسکرا کیلئے لکھنا شروع کر دیا۔ شروع میں چھوٹے موٹے تبصرے، پھر مضامین اور بعد میں اداریے تک۔

اس زمانے میں میں نے وائیٹ چیپل میں عام لیکچر بھی دیے۔ روسی مہاجروں کے سربراہ تچاکووسکی اور بڑی عمر کے دہشت پسند تچر کی ژوف سے میرے مناظرے بھی ہوتے رہتے تھے۔ جس قسم کے بچگانہ دلائل سے یہ بزرگ مارکسزم کو نجلنا چاہتے تھے مجھے اس پر حیرت ہوتی تھی۔ گھر آتے وقت مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں ہوا میں چل رہا ہوتا تھا۔ وائٹ چیپل اور باہر کی عمومی دنیا سے میرے رابطوں کا بڑا ذریعہ کندن کا باسی الیگی ژوف، ایک روسی مہاجر مارکسسٹ تھا جس کے اسکرا کے مدہروں سے بھی بڑے گہرے تعلقات تھے۔ اس نے مجھے برطانوی زندگی کے اسرار سے آگاہ کیا۔ وہ میری دوسری تمام ہر قسم کی خبروں اور اطلاعات کا ذریعہ ہوتا تھا۔ الیگی ژوف لینن کے بارے میں بڑی عزت سے بات کرتا تھا۔ ایک دن اس نے مجھ سے کہا۔ ''میرا یقین ہے پلیخانوف کی بجائے لینن انقلاب کیلئے زیادہ ضروری ہے۔'' میں نے یہ بات لینن کو تو نہ بتائی مگر مارٹوف سے اس کا ذکر کر دیا۔ اس نے کسی قسم کا تبصرہ نہ کیا۔

ایک اتوار کو میں لینن اور کرپسایا کے ساتھ ایک گرجے میں ایک سوشل ڈیموکریٹ اجلاس میں شرکت کیلئے گیا جہاں تقریروں کے ساتھ حمدیں بھی گائی جا رہی تھیں۔ بڑا مقرر ایک دھن ساز بھی تھا جو نیا نیا آسٹریلیا سے آیا تھا۔ وہ سوشل انقلاب پر بات کرنے لگا۔ پھر سب کھڑے ہوگئے اور گانے لگے۔ خدایا! اب بادشاہ اور امیر آدمی نہیں ہونے چاہیں۔'' مجھے اپنی آنکھوں اور اکانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ جب ہم گرجے سے باہر آ گئے تو لینن نے کہا۔ ''برطانوی پرولتاریہ میں بہت سے انقلابی اور سوشلسٹ عناصر ہیں۔ مگر وہ قدامت پسندی، مذہب اور تعصب کا شکار ہیں۔ وہ یہ سارے بندھن توڑ کر

سامنے آنے سے قاصر ہیں۔''

چرچ میں سوشل ڈیموکریٹک اجلاس میں شرکت کے بعد ہم نے دو کمروں پر مشتمل ایک اپارٹمنٹ کے کچن میں کھانا کھایا۔ میرے دوست گھر کا راستہ عام طور پر بھول جانے پر میرا مذاق اڑا رہے تھے۔ مجھے گلیاں بھول جاتی تھیں۔ بعد میں میں نے اس معاملے میں بڑی بہتری دکھائی مگر بے حد محنت کے بعد۔

میں نے اوڈیسہ کی جیل میں جس قدر انگریزی سیکھی تھی' لندن آ کر اسے زیادہ بہتر نہ کر سکا۔ میں روسی معاملات میں بے حد کھبا ہوا تھا۔ برطانوی مارکسزم کچھ زیادہ دلچسپ نہیں تھا۔ ان دنوں سوشل ڈیموکریسی کا فکری مرکز جرمنی تھا۔ ہم بڑے غور سے پرانے مارکسیوں اور ترمیم پسندوں کے درمیان جاری جدوجہد کو دیکھتے رہتے تھے۔

لندن میں اور بعد میں جنیوا میں میں لینن کی بجائے زوسولچ اور مارٹوف سے زیادہ ملتا رہتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ لندن میں ہم ایک ہی مکان میں رہتے تھے اور جنیوا میں ایک ہی ریسٹورانٹ میں کھانا کھاتے تھے' لہٰذا دن میں ہماری کئی ملاقاتیں ہوتی رہتی تھی جب کہ لینن ایک گھریلو قسم کا آدمی تھا۔ اس سے سرکاری ملاقاتوں کے علاوہ عام ملاقاتیں بڑی مختصر ہوتی تھیں۔ مارٹوف کی ہوہیمنیں عادتوں کا لینن پر سایہ تک نہیں پڑا تھا۔ لینن وقت کو ایک بے حد قیمتی تحفہ سمجھتا تھا۔ وہ برٹس میوزیم لائبریری میں زیادہ وقت گزارتا تھا جہاں وہ اپنا نظریاتی مطالعہ جاری رکھتا تھا اور اخبارات کیلئے مضامین لکھا کرتا تھا۔ اس کی مدد سے مجھے بھی وہاں داخلہ مل گیا۔ کتابوں کی بہتات دیکھ کر میں ان پر ٹوٹ پڑا۔ مگر جلد ہی مجھے براعظم کیلئے راونہ ہونا پڑ گیا۔ وائیٹ جیپل میں میری عوامی تقریروں کے ''ٹیسٹ'' کے بعد مجھے لیکچر دینے کیلئے بریسلز لیگ اور پیرس بھیج دیا گیا میرے لیکچر کا موضوع ''روسی موضوعیت پسند سکول'' کی تنقید کے خلاف تاریخی مادیت کا دفاع تھا۔ لینن کو میرے اس موضوع میں بڑی دلچسپی تھی۔ میں اپنے لیکچر کا خاکہ اسے دکھا دیا کرتا تھا وہ مجھے مشورہ دیتا کہ میں اپنے لیکچر میں ردوبدل کرتا رہوں تاکہ مضمون کی شکل میں ''یاریا'' میں شائع ہو سکے۔ لیکن مجھ میں اتنی جرات نہیں تھی کہ میں اپنے

نظریاتی مضمون پلیخانوف کے پہلو بہ پہلو شائع کروا سکوں۔

پیرس سے مجھے تار دے کر فوری طور پر لندن بلایا گیا۔ وہ مجھے روس میں سمگل کرنا چاہتے تھے کیونکہ وہاں وسیع پیمانے پر گرفتاریاں ہو رہی تھیں اور آدمیوں کی کمی پڑ گئی تھی۔ میں نے ابھی لندن کی زمین پر پاؤں رکھا ہی تھا کہ یہ منصوبہ بدل دیا گیا دوچ جو اس وقت لندن میں رہتا تھا اور میرے ساتھ بڑی محبت سے پیش آتا تھا اس نے بعد میں مجھے بتایا کہ کس طرح وہ میرے حق میں کھڑا ہو گیا تھا اور لندن میں اس نے میرے قیام اور تعلیم کو بہتر بنانے پر زور دیا تھا اور کس طرح لینن نے اس کی بات سے اتفاق کیا تھا۔ روسی تنظیم اسکرا میں کام کرنے کی خواہش بے حد شدید تھی لیکن میں تھوڑی دیر اور باہر قیام کرنے کے امکانات پر بہت خوش تھا۔

میں پیرس واپس آ گیا جہاں لندن کے برعکس روسی طالب علموں کی بستی بہت بڑی تھی۔ انقلابی پارٹیاں طالب علموں کو اپنی طرف کھینچنے کی خاطر آپس میں بری طرح لڑ رہی تھیں۔ اس سلسلے میں این' آئی' سیدوفا کی یادداشتوں میں سے ایک اقتباس نیچے درج ہے۔

''1902ء کے موسم خزاں میں پیرس کے اندر روسی آبادی میں دن رات لیکچر دیئے جاتے تھے۔ اسکرا گروپ جس سے میرا تعلق تھا اس نے پہلے مارٹوف اور پھر لینن کو یہاں بھیجا ''اکانومسٹوں'' اور سوشلسٹ انقلابیوں کے مابین ایک جنگ لڑی جا رہی تھی۔ ہمارے گروپ میں ایک ایسے نوجوان کامریڈ کے متعلق باتیں ہو رہی تھیں جو سائبیریا سے فرار ہو کر آیا تھا۔ وہ سب سے پہلے ای ایم الیگزینڈروفا کے گھر گیا۔ اس نے اسکرا میں شمولیت اختیار کر لی تھی ہم نوجوان نسل اکا کرینہ میخالوفنا کے بڑے دلدادہ تھے' اس کی تقریر بڑے شوق سے سنتے اور اس سے متاثر ہوتے تھے۔ جب اسکرا کا نیا مضمون نگار (یعنی ٹراٹسکی مترجم) پیرس میں نمودار ہوا تو اکا کرینہ میخالوفنا نے مجھ سے کہا کہ میں کہیں نزدیک ہی اس کے لئے کوئی خالی کمرہ تلاش کروں۔ جس مکان میں میں رہتی تھی وہاں ایک کمرہ خالی تھا۔ اس کا کرایہ بارہ فرانک ماہوار تھا لیکن کمرہ چھوٹا اور

تاریک تھا جیسے قید خانے کا کوئی سیل۔ جب میں اکا کرینہ میخا نوفنا کو کمرے کا خلیہ بتا رہی تھی تو اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا''ٹھیک ہے۔ کام چل جائے گا اسے یہ کمرہ لے دو۔

جب نوجوان کا مریڈ (جس کا نام ہمیں ابھی تک نہیں بتایا گیا تھا) کمرے میں میں آ گیا اکا کرینہ میخا نوفنا نے مجھ سے پوچھا''کیا وہ اپنی تقریر تیار کر رہا ہے؟''

''مجھے معلوم نہیں ۔میر اخیال ہے وہ ایسا کر رہا ہو گا''میں نے جواب دیا۔''گذشتہ رات جب میں سیڑھیاں چڑھ رہی تھی تو میں ہے اسے کمرے میں سیٹیاں بجاتے ہوئے سنا تھا۔''

''پھر جا کر اسے بتاؤ بلکہ وہ سیٹیاں بجانے کے بجائے سخت کام کرے''وہ اس کی کامیابی کے متعلق بڑی متفکر تھی۔لیکن اس کی پریشانی غیر ضروری تھی۔اس کی تقریر بہت عمدہ ثابت ہوئی اسکرا کا نوجوان مقرر توقعات سے کہیں زیادہ بہتر ثابت ہوا۔''

لندن کے مقابلے میں میں پیرس کے متعلق زیادہ جاننے کا خواہش مند تھا۔ یہ مجھ پر این آئی سیدوفا کے اثر کا نتیجہ تھا۔ میری پیدائش اور پرورش دیہات میں ہوئی تھی۔ لیکن یہ پیرس تھا جس نے مجھے فطرت کے نزدیک کیا۔ وہیں حقیقی فن سے میری روبرو ملاقات ہوئی۔ میں نے بڑی مشکل سے پینٹنگز اور فطرت کو خراج تحسین پیش کرنا سیکھا۔ سیدوفا اپنے بعد کے ایک میں کہتی ہے''پیرس کے بارے میں وہ اپنے تاثرات کا اظہار کچھ اس طرح کرتا ہے۔''اوڈیسہ سے مشابہت رکھتا ہے مگر اوڈیسہ اس سے اچھا ہے۔'' اس فضول نتیجے میں کی وضاحت یہی کی جا سکتی ہے کہ ایل' ڈی مکمل طور پر سیاسی زندگی میں کھو گیا تھا اور کسی چیز کو وہ اس وقت دیکھتا تھا جب وہ اسے خود کو دیکھنے پر مجبور کرتی تھی۔ پھر وہ اس قسم کے ردعمل کا اظہار کرتا جیسے اس چیز کو دیکھنا اس کیلئے ناگزیر ہو گیا تھا۔ پیرس کے بارے میں اس کے تاثرات سے میں متفق نہیں تھی اور اسے اپنی رائے تبدیل کرنے پر مجبور کرتی رہتی۔''

یہ بات بالکل ٹھیک تھی ۔ میں دنیا کے مرکز کے ماحول میں ایک ضدی اور خود

غرضانہ رویے کے ساتھ داخل ہو رہا تھا۔ پہلے پہل تو میں پیرد سے '' منکر '' ہو گیا ورا سے نظرانداز کر دیا۔ یہ رویہ ذات کے تحفظ کی خاطر ایک وحشیانہ جدوجہد کا نتیجہ تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ پیرس کے نزدیک ہونے اور اسے مکمل طور پر سمجھنے کیلئے بہت ساری ذہنی قوت کی ضرورت تھی۔ دراصل میری اپنی انقلاب کی دنیا تھی جو بڑی سخت تھی اور جس کا کوئی رقیب نہیں ہو سکتا تھا۔ میں بتدریج مگر مشکل کے ساتھ آرٹ کے نزدیک ہو رہا تھا۔ سب لیوری اور لکسمبرگ کی سیر اور نمائشوں میں جانے سے گریز کرتا رہا۔ ہیرے جوہرات مجھے اچھے نہیں لگتے تھے۔ پووس ڈی' چاونز بڑا زاہدانہ اور بے رنگ' کیسری کے پورٹریٹ شفق میں لپٹے ہوئے ابہام کے ساتھ مجھے چڑا دیتے تھے۔ یہی حال مجسموں اور فن تعمیر کے نمونوں کا تھا۔ دراصل میں آرٹ کی بالکل اسی انداز میں مزاحمت کر رہا تھا جیسے ابتدا میں انقلاب اور بعد میں مارکسزم کی کرتا رہا تھا۔ میں نے چند برس تک لینن اور اسکے طریقوں کی بھی مزاحمت کی تھی۔ 1905ء کے انقلاب نے یورپ اور اس کے کلچرل سے میری بڑھتی ہوئی بیگانگی میں رخنہ پیدا کر دیا۔ یہ روس سے دوسری جلاوطنی تھی جس کے دوران میں میں آرٹ کے قریب آیا تھا۔ میں نے چیزوں کو دیکھا' پڑھا اور ان کے بارے میں تھوڑا بہت لکھا بھی مگر آرٹ کے مداح کے درجے سے آگے نہ جا سکا۔

پیرس میں میں نے جارنیر کو سنا۔ یہ وہ زمانہ تھا جو واسرک روسی حکومت کا سربراہ تھا' ملرینڈ وزیر برائے روزگار اور جرنیل گلفٹ وزیر برائے جنگ تھا۔ میں نے گادستوں کے ایک مظاہرے میں حصہ لیا اور بڑے زور شور سے نعرے لگائے اور دوسروں کے ساتھ مل کر ملرنیڈ کے خلاف ہر بڑی بھلی بات کہی۔ اس وقت جارنیر نے مجھ پر کوئی اچھا تاثر نہیں چھوڑا تھا۔ میں نے شدت سے محسوس کیا کہ وہ ایک دشمن تھا۔ اگرچہ چند سال بعد میں اس شاندار ہستی کا مداح بن گیا تھا مگر اس کے نظریات سے میری رقابت پہلے جیسی رہی۔

طلباء کے مارکسی حصے کے اصرار پر لینن ایک ہائی سکول میں تین لیکچر دینے پر متفق

ہو گیا۔ یہ سکول روسی یونیورسٹیوں سے نکالے گئے پروفیسروں نے پیرس میں قائم کیا تھا۔ آزاد خیال پروفیسروں نے ناپسندیدہ لیکچراروں سے کہہ دیا کہ وہ جہاں تک ممکن ہو سکے بحث وغیرہ میں پڑنے سے اعتراض کریں۔ لیکن لینن کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس نے اپنا پہلا لیکچر اس بیان سے شروع کیا کہ مارکسزم ایک انقلابی نظریہ ہے اور یہ بحث مباحثے کی دعوت ہے۔ مجھے یاد ہے کہ وہ لیکچر دینے سے پہلے نروس اور جذباتی ہو رہا تھا۔ لیکن جونہی وہ پلیٹ فارم پر آیا' اسے خود پر مکمل قابو حاصل ہو گیا' کم از کم بظاہر ایسا دکھائی دے رہا تھا۔ پروفیسر کمبروف جو لینن کی تقریر سننے آیا ہوا تھا اس نے دو لفظوں میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ ''ایک مکمل پروفیسر'' اس سے بڑی اور کیا تعریف ہو سکتی ہے۔

ایک دفعہ ہم نے لینن کو اوپرا لے جانے کا فیصلہ کیا۔ اس کا انتظام سیدوفا نے کرنا تھا۔ اوپرا جاتے وقت بھی اس کے ساتھ وہی بریف کیس تھا جسے وہ لیکچر دیتے وقت ساتھ لے جایا کرتا تھا۔ ہم ایک گروپ کی شکل میں سب سے بالائی گیلری میں بیٹھ گئے۔ یعنی لینن کے علاوہ سیدوفا اور میں۔ میرا خیال ہے ہمارے ساتھ مارٹوف بھی تھا۔ موسیقی سے بالکل خالی میری ایک یاد اس اوپرا سے وابستہ ہے۔ پیرس میں لینن نے جوتوں کا ایک جوڑا خریدا۔ یہ جوتے اسے تنگ نکلے۔ اتفاق سے اسی وقت مجھے بھی نئے جوتوں کی ضرورت تھی۔ لینن نے وہ جوتے مجھے دے دیے۔ شروع میرا خیال تھا کہ وہ مجھے ٹھیک آئے تھے۔ اوپرا سے واپسی کے وقت میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے تنگ کر رہے تھے۔ میں سارا راستہ تکلیف میں مبتلا رہا۔ لینن راستے میں میرا ہاتھ دباتا رہا۔ اس نے ان جوتوں میں جو چند گھنٹے گزارے تھے اس کا بھی یہی حال ہوا تھا۔

پیرس سے میں بریسلز' لیگ اور سوئٹزرلینڈ میں روسی طلب کی کالونیوں اور فشر کو سنا مگر اس کی کانٹ کے خیالات پر مبنی تعلیمات نے مجھے متاثر نہ کیا۔ اس کا ایک خاص معیار کا فلسفہ میرے لئے بالکل اجنبی تھا۔ جب عمدہ سبز گھاس سامنے پڑی ہو تو خشک بھوسہ کون کھائے گا۔ ان میں سے ایک اکسنتیف تھا جو کرنسکی کی حکومت میں وزیر داخلہ

بن گیا تھا۔ میں نے جدلیاتی مادہ پرست کی حیثیت سے یہاں کئی سفر کے سر کئے۔

پارٹی کانگریس اور پھوٹ

جب تیس سال کی عمر میں لینن ملک سے باہر گیا تھا تو وہ مکمل طور پر ذہنی بالغ اور پختہ ہو چکا تھا۔روس میں طلباء کے حلقوں میں' سوشل ڈیموکریٹک گروپوں میں اور جلاوطنوں کی آبادیوں میں وہ اولین حیثیت کا احساس دلاتے رہتے تھے۔ روس چھوڑتے وقت اس کے پاس نظریاتی مواد اور تجربے کا ایک بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ باہر اس سے تعاون کرنے والے اس کے منتظر تھے۔ ان میں ''لیبر کی آزادی کا گروپ'' جن میں مارکسی ترجمان پلیخانوف سو سے اوپر تھا' مختلف نسلوں کے اساتذہ نظریہ ساز' سیاست دان اور مقرر -- ان سب لوگوں کی یورپ میں تعلقات اور شہرت تھی پلیخانوف کے علاوہ دو دوسری نمایاں ہستیاں تھیں۔ زوسولچ اور ایکسل راڈ۔ ویرا زسولچ نے اپنے ماضی کے عمدہ کارناموں کی بدولت صف اول میں جگہ حاصل کر لی تھی۔ وہ بہترین ذہین اور شاندار پس منظر کی مالک تھی۔ وہ موراخ اور نادر نگاہ رکھنے والی نفسیات دان تھی۔ یہ زوسولچ ہی تھا جس نے ''گروپ'' کو اینگلز کے پرانے متعدوں سے جوڑا تھا۔

پلیخانوف اور زوسولچ کے برعکس جو عنی سوشلزم سے نزدیکی طور پر وابستہ تھے' ایکسل راڈ ''گروپ'' میں جرمن سوشل ڈیموکریسی کے خیالات اور تجربے کی نمائندگی کرتا تھا۔ ان دنوں پلیخانوف زوال آمادہ ہو گیا تھا۔ جو چند لینن کی طاقت کا باعث بنی رہی تھی وہی پلیخانوف کو زوال کی طرف لے جا رہی تھی۔ یعنی انقلاب کی طرف نقطہ نظر۔ پلیخانوف نے اپنا سارا کام ابتدائی نظریاتی زمانے میں کیا تھا۔ وہ بنیادی طور پر مارکسی مبلغ اور مناظرہ پسند تھا' انقلابی سیاست دان اور پرولتاریہ کا نمائندہ نہیں تھا۔ جوں جوں انقلاب کے سائے نزدیک آ رہے تھے' پلخانوف کے پیروں تلے کی زمین سرکتی جا رہی تھی۔ یہ منظر دیکھنے کی اس میں جرات نہیں تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ نوجوانوں سے چڑنے لگا تھا۔

اسکرا کا سیاسی راہنما لینن تھا۔ مارٹوف ادبی طاقت تھا۔ گفتگو کی طرح اس کی تحریر میں بھی روانی تھی۔ لینن کا قریبی ساتھی ہونے کے باوجود مارٹوف اس کے اتھ کام کرتے وقت آرام محسوس نہیں کرتا تھا۔ وہ ایک دوسرے کو ''تم'' کہہ کر بلاتے تھے۔ لیکن اس قسم کی سردمہری دونوں کے تعلقات میں سرائیت کرنے لگی تھی۔ مارٹوف زیادہ تر زمانہ حال میں رہتا تھا۔ موجودہ تعلقات' موجودہ ادبی کام' موجودہ سیاسی مسائل' موجودہ خبریں اور بات چیت۔ دوسری طرف اگرچہ لینن کے پاؤں زمانے حال میں مضبوطی سے گڑے ہوئے تھے مگر وہ مستقبل کے پردے کے اندر جھانکتا رہتا تھا۔ مارٹوف ان گنت اندزے اور مفروضے گھڑتا رہتا تھا جنہیں وہ خود ہی ایک دم رد بھی کر دیتا تھا جب کہ لینن ایسا ضرورت کے تحت کرتا تھا۔ مارٹوف کے خیالات کی حد سے بڑی ہوئی باریک بینی بعض اوقات لینن کو کسی خطرے سے چوکنا کرنے سر ہلانے پر مجبور کر دیتی تھی۔ مختلف سیاسی خطوط وضع کرنے کا ابھی وقت نہیں آیا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ انہوں نے ابھی تک کسی شکل میں اپنا اظہار ہی نہیں کیا تھا۔ بعد میں پارٹی کی دوسری کانگریس کے موقع پر اسکرا کے بنیادی ارکان گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ ''سخت'' گروپ اور ''نرم'' گروپ۔ یہ نام شروع میں بے معنی محسوس ہوتے تھے۔ سطح پر کوئی تقسیم دکھائی نہیں دیتی تھی۔ سطح پر کوئی تقسیم دکھائی نہیں دیتی تھی۔ فقط نقطہ نظر میں اختلاف تھا۔ آ کر تک جانے کا ارادہ اور قطعیت دونوں گروہوں کی اپنی اپنی تھی۔

پارٹی میں پھوٹ سے پہلے بھی لینن اور مارٹوف کے بارے میں کہا جا سکتا تھا کہ اول الذکر ''سخت'' اور موخر الذکر ''نرم'' تھا۔ وہ دونوں خود بھی یہ بات سمجھتے تھے۔ لینن مارٹوف کی طرف تنقیدی اور قدرے شک بھری نظروں سے دیکھا کرتا تھا۔ اور مارٹوف اس کی نظروں کی چبھن محسوس کر کے پریشانی کی حالے میں آنکھیں جھکا لیا کرتا تھا۔ بعد میں کبھی وہ آپس میں باتیں کرر ہے ہوتے تو میں کم از کم یہی محسوس کیا کرتا تھا کہ ان کی گفتگو میں دوستانہ پن اور مزاح کم ہوتا تھا۔ لینن بات کرتے وقت مارٹوف سے پرے دیکھتا رہتا۔ جب کبھی لینن مجھ سے مارٹوف کے متعلق باتیں کرر ہا ہوتا تو اس کی آواز

میں ایک خاص قسم کی لے ہوتی تھی۔ ''یہ کس نے کہا تھا؟ جولیس نے؟'' اور ''جولیس'' ایک خاص لہجے میں کہا جاتا تھا۔ اس لفظ پر ہلکا سا زور اور خبردار کرنے کی کفیت ہوتی تھی۔ جیسے کہہ رہا ہو۔ ''ایک اچھا آدمی ہے' اس میں کوئی شک نہیں' بلکہ بہت اچھا آدمی ہے' مگر ذرا نرم ہے'' اسی زمانے میں مارٹوف ویرا یوفنا سوئچ کے زیر اثر آرہا تھا۔ وہ اسے لینن سے پرے کر رہی تھی' سیاسی طور پر نہیں بلکہ نفسیاتی طور پر۔

لینن نے روس سے تمام رابطے اپنے ہاتھ میں لے رکھے تھے۔ ادارتی بورڈ کی سیکریٹری اس کی بیوی نادیہ کونستانتینوفنا کرپسا کایا تھی۔ تنظیم کے ہر کام میں اس کی مرکزی حیثیت تھی۔ کامریڈ اسی کے پاس آتے اور وہی انہیں ہدایات دے کر رخصت کرتی تھی (وہی رابطے قائم کرتی' خفیہ پتے مہیا کرتی' خطوط لکھتی اور مراسلہ نگاری کے فرائض انجام دیتے وقت کوڈ اور ڈی کوڈ کا خیال رکھتی تھی۔ اس کے کمرے سے کاغذ کے جلنے کی بو آتی رہتی تھی۔ وہ خفیہ خطوط کو آگ پر گرم کر کے انہیں پڑھا کرتی اور شکایت کیا کرتی کہ لوگ صاف طور پر نہیں لکھتے تھے اور کوڈوں کو آپس میں غلط ملط کر دیتے تھے۔ یا پھر کیمیاوی سیاہی سے اس طرح لکھتے تھے کہ ایک سطر دوسری سطر پر چڑھ جاتی تھی۔

لینن سیاسی تنظیم کے روزمرہ کے کام میں پرانے اراکین اور خصوصاً پلیخانوف سے جس سے اس کی خاص طور پر پارٹی پروگرام کو ڈرافٹ کرنے میں تلخی ہوتی رہتی تھی' زیادہ سے زیادہ آزاد ہونے کی کوشش میں لگا رہتا تھا۔ پلیخانوف کے ڈرافٹ کے مقابلے میں لینن نے جو ڈرافٹ تیار کیا تھا' پلیخانوف نے اس کا مذاق اڑایا تھا۔ لینن ان طریقوں سے پریشان یا دبنے والا نہیں تھا۔ اس کشمکش نے بڑی ڈرامائی شکل اختیار کر لی۔ زوسوئچ اور مارٹوف ثالث بن گئے۔ اول الذکر پلیخانوف اور موخرالذکر لینن کی طرف سے۔ دونوں ثالث بڑے مصالحانہ موڈ میں تھے۔ اس لیے کہ دونوں دوست تھے۔ ویرا ایونفنا کے کہنے کے مطابق اس نے ایک دفعہ لینن سے کہا۔ ''پلیخانوف ایک شکاری کتا ہے۔ وہ شکار کو پکڑتا ہے' جھنجوڑتا ہے اور پھر نیچے گرا دیتا ہے۔ جب کہ تم ایک بل ڈاگ ہو۔ تمہاری گرفت موت کی گرفت ہے۔'' بعد میں اس نے اپنی یہ بات میرے سامنے

دہراتے ہوئے اس میں یہ اضافہ کیا۔ ''لینن اس سے بڑا لطف اندوز ہوا تھا۔ ''موت کی گرفت'' --لینن مزے سے دہراتا رہا۔ پھر لینن کی نقل اتارتے ہوئے بڑے ہلکے پھلکے انداز میں لینن کے لفظ بولتی رہی۔ (لینن 'ر' کا حرف صاف طور پر نہیں بول سکتا تھا)

یہ تمام اختلافات رائے میرے روس سے آنے سے پہلے کے تھے۔ مجھے ان کے بارے میں کبھی شک نہیں گزرا تھا۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ میرے آنے سے اسکرا کے ایڈیٹروں کے تعلقات زیادہ کشیدہ ہو گئے تھے۔ میرے آنے سے چار ماہ بعد لینن نے پلیخانوف کو لکھا:

پیرس' 2 مارچ 1903ء

''میں نے ادارتی بورڈ کے تمام ارکان سے کہا تھا کہ وہ ادارتی بورڈ کے ارکان کی حیثیت سے ''پیرو'' سے تعاون کریں۔ میرا یقین ہے کہ تعاون سے ووٹوں کی اکثریت ہی نہیں متفقہ فیصلہ بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ ہمیں ایک ساتویں رکن کی ضرورت ہے تاکہ ووٹ ڈالنے اور فیصلے میں آسانی رہے (چھ جفت ہندسہ ہے) اس سے ہماری طاقت میں بھی اضافہ ہوگا۔ ''پیرو'' کئی ماہ سے ''اسکرا'' میں مضامین لکھ رہا ہے۔ اس کا کام تسلی بخش ہے۔ وہ لیکچر بھی دیتا ہے جس میں وہ خاصا کامیاب ہے۔ مضامین کے شعبے اور روزمرہ کی خبروں پر تبصرے کیلئے اس کا ہونا مفید ہی نہیں بلکہ بے حد ضروری ہے۔ بلاشبہ وہ بڑی نادر صلاحیتوں کا مالک ہے۔ اس میں قابلیت ہے اور وہ بڑی ترقی کرے گا۔ اس کے علاوہ اور مقبول عام ادب کے میدام میں بھی وہ نمایاں خدمات انجام دے سکتا ہے ممکنہ اعتراضات: (1) اس کی کم عمری (2) اس کے جلد روس چلے جانے کا امکان (3) اس کا قلمی نام اور اس کا جز وقتی کام کرنا۔

سفارشات

1 - ''پیرو'' کو آزاد آسامی پر کام کرنے کی سفارش نہیں کی جاتی لیکن بورڈ کا ممبر بنانے کی سفارش کی جاتی ہے۔ وہاں اس حیثیت میں وہ تجربہ حاصل کرے گا۔ اس

میں بلا شبہ ایک سیاسی آدمی بننے کی صلاحیت موجود ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس کے علم اور تجربے میں اضافہ ہوگا۔ اسے پابند بنانے اور اس کی ہمت افزائی کرنے کیلئے تعاون ضروری ہے۔

2 - اگر ''پیرو'' نے ہمارے ساتھ قریبی تعلق قائم کرنا ہے تو اسے اتنی جلدی چھوڑ کر جانا نہیں ہوگا۔ اگر وہ چلا جاتا ہے تو اس نے بورڈ میں جس قدر کام کیا ہے اسکو اس کے منفی نہیں بلکہ مثبت نمبر ملیں گے۔

3 - طرز تحریر میں نقائص زیادہ ضروری معاملہ نہیں ہے وہ اس کی اصلاح کرے گا۔ وہ اپنی اصلاح خاموشی سے قبول کر لیتا ہے (رضامندی سے نہیں) بورڈ میں ہونے والی بحثیں، ووٹنگ اور ہدایات اس کے کردار پر بڑا یقینی اور مثبت اثر ڈالیں گی۔

لہذا میں مختصر طور پر یہ تجویز کرتا ہوں:

1 - بورڈ کے چھ کے چھ ارکان ''پیرو'' سے مکمل تعاون کے حق میں ووٹ ڈالیں۔

2 - اگر اسے قبول کیا جاتا ہے تو ایڈیٹروں کے درمیان تعاون و ووٹنگ کے قواعد اور ایک دستور تیار کرنے کا کام اسے سونپ دیا جائے گا۔ یہ ہمارے لئے اور کانگریس کیلئے بھی ضروری ہے۔

بعد کی تحریر: میرے خیال میں اس مسئلے پر انتخاب کو ملتوی کرنا غیر موزوں ہوگا کیونکہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ ''پیرو'' ہوا میں معلق رہتے اور اس پر کم عمری کا ''الزام'' لگنے سے قدرے ناراض ہے اگر ہم ''پیرو'' کو فوری طور پر قبول نہیں کرتے اور فرض کیا وہ ایک ماہ کیلئے روس چلا جات تو وہ یہ سمجھے گا کہ ہم اسے بورڈ میں لینے کیلئے رضامند نہیں تھے۔ وہ چلا گیا تو یہ بڑی ناپسندیدہ بات ہوگی۔''

یہ خط میں نے تھوڑا عرصہ پہلے ڈھونڈ نکالا تا۔ یہ پورے کا پورا اس لیے درج کیا ہے کہ یہ بورڈ کے اندر کی حالت اور اس کے کردار کی خاصیت کے علاوہ میری طرف اس کے رویے کی ترجمانی کرتا ہے۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، بورڈ میں میری شمولیت

کے سلسلے میں جو جدوجہد جاری تھی میں اس سے مکمل طور پر بے خبر تھا۔ لیکن کا خیال کہ میں ادارتی بورڈ میں نہ لئے جانے پر ناراض تھا' میرے اس وقت کے مزاج سے بالکل ایسے ہی تھا جیسے ایک شاگرد کا اپنے استاد کی طرف ہوتا ہے۔ اس وقت میں فقط تیئیس برس کا تھا۔ سب سے کم عمر ایڈیٹر مارٹوف تھا جو مجھ سے سات سال بڑا تھا۔ لینن کی عمر مجھ سے دس سال زیادہ تھی۔ اتنے عظیم آدمی کے ساتھ کام کرنے سے میں اپنی قسمت پر بڑا نازاں تھا۔ میں ان سے بہت کچھ سیکھ سکتا تھا' اور میں نے محنت سے بہت کچھ سیکھا بھی۔

لینن کو کیسے یہ خیال آیا کہ میں ناراض تھا۔ میرا خیال ہے یہ فقط ایک چال تھی۔ سارا خط اس جذبے سے بھرا ہوا ہے کہ وہ جو کچھ چاہتا تھا اسے حاصل کر کے رہتا تھا۔ اس میں دوسروں کو قائل کر لینے کی صلاحیت تھی۔ اس نے میری فرضی ناراضگی سے دوسرے ایڈیٹروں کو ڈرانے کی کوشش کی تھی۔ یہ ایک زائل دلیل تھی۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ ''میری کم عمری'' کی دلیل کے عقب میں بھی یہی بات تھی۔ بوڑھا دوچ مجھے ''نوجوان'' کہہ کر ہمیشہ بلایا کرتا تھا۔ ڈوچ سے میں کبھی سیاسی طور پر متاثر نہیں ہوا تھا۔ ہماری دونوں کی فقط دوستی تھی۔ لینن نے معمر لوگوں کیلئے یہ دلیل محض اس لیے استعمال کی ہوگی کہ

لندن' 10 مارچ 1903 ولادیمیر ایلچ نے ہمیں تجویز بھیجی ہے کہ ہم ''پیرو'' کو جسے تم جانتے ہو' مدیروں کے بورڈ میں مکمل حقوق کے ساتھ رکھ لیں۔ اس کا ادبی کام ناقابل تردید صلاحیت ظاہر کرتا ہے۔ اس کے خیالات ہم سے ملتے ہیں۔ اسے اسکرا کے مفادات کا پورا خیال ہے۔ یہاں باہر بھی وہ اپنی تقریر کو غیر معمولی صلاحیت کے سبب لوگوں میں اثر رکھتا ہے۔ اس کی تقریر میں ایک لذت ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ اس سے کیا مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔ لینن اور اس میں سے متاثر ہیں۔

اس خط میں مارٹوف کو لینن کی صدائے بازگشت دکھایا ہے۔ لیکن اس نے میری ناراضگی کے سلسلے میں لینن کی دلیل کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ میں اور مارٹوف ایک ہی مکان میں رہتے تھے۔

بورڈ میں میری شمولیت پر لینن اس قدر زیادہ اصرار کیوں کر رہا تھا؟ وہ ایک پائیدار اور محکم اکثریت چاہتا تھا۔ متعدد اہم سوالوں پر بورڈ کے ارکان دو مساوی گروپوں میں تقسیم ہو جاتے تھے۔ پلخانوف' زوسولچ اور ایکسل راڈ ایک طرف (یہ زیادہ عمر کے تھے) لینن' مارٹوف اور پٹریسوف دوسری جانب (یہ نوجوان تھے) لینن کو یہ یقین تھا کہ زیادہ اہم سوالوں پر میں ان کی طرف رہوں گا۔ ایک موقع پر جب پلیخانوف کی مخالفت ضروری تھی' لینن نے مجھے ایک طرف بلا کر چالاکی سے کہا۔ ''مارٹوف کو بولنے دینا۔ وہ طریقے سے بات کرتا ہے۔ تم سیدھا تیر چلا دیتے ہو۔'' میرے چہرے پر حیرت کے آثار دیکھ کر وہ جلدی سے بولا۔ ''میں بھی سیدھا تیر چلانے کے حق میں ہوں مگر اس دفعہ بہتر ہوگا کہ پلیخانوف سے دوسری طرح معاملہ طے کیا جائے۔''

مجھے بورڈ پر لیے جانے کی لینن کی تجویز پلیخانوف کی مخالفت کی نذر ہوگئی۔ زیادہ بڑی بات یہ ہوئی کہ اس تجویز سے پلیخانوف کا رویہ میری طرف بڑا غیر دوستانہ ہو گیا۔ وہ جان گیا تھا کہ لینن اس کے خلاف اکثریت بنانا چاہتا تھا۔ لہذا کانگریس کے انعقاد تک بورڈ کی تنظیم نو کا کام التوا میں ڈال دیا گیا۔ بہر حال بورڈ نے کانگریس کا انتظار کیے بغیر مجھے اپنے اجلاسوں میں مشاورتی حیثیت سے بلانے کا فیصلہ کرلیا۔ پلیخانوف نے اس کی بھی سخت مخالفت کی۔ لیکن ویرا ایونوفنا نے اس سے کہا۔ ''تم خواہ کچھ کہتے رہو میں اسے لے آؤں گی۔'' اور وہ مجھے بورڈ کی اگلی میٹنگ میں لے گئی۔ چونکہ پردے کے عقب میں ظہور پذیر ہونے والے مناظر کا مجھے کوئی علم نہیں تھا لہذا جس سرد مہری سے گوری ویلنٹونووچ نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا' اس میں اسے ملکہ حاصل تھا۔ پلیخانوف کی مجھ سے ناپسندیدگی ایک عرصے تک جاری رہی۔ حقیقت میں یہ کبھی ختم ہوئی ہی نہیں تھی۔ اپریل 1904ء میں مارٹوف نے ایکسل ڈار کو خط لکھتے ہوئے اس میں میری طرف پلیخانوف کی ذاتی نفرت کا حوالہ بھی دیا۔ ایک ایسی نفرت جو گھٹیا تھی اور اس کیلئے کسی عزت کا باعث نہیں تھی۔

لینن نے اپنے خط میں میرے جس ادبی اسلوب کا حوالہ دیا تھا وہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ اس کی بات دونوں طرح سچ تھی۔ میرے حاشیے لکھنے اور اپنی خامی تسلیم نہ کرنے کے حوالے سے۔ اس وقت لکھنے کی مشق کرتے ہوئے مجھے ابھی دو برس ہوئے تھے اور میرے نزدیک طرز اسلوب کی بڑی اہمیت تھی۔ لفظوں کے مختلف رنگ میری سمجھ میں آنے لگے تھے۔ جس طرح دانت نکالتے وقت بچے اپنے مسوڑوں کو غلط چیزوں سے بھی ملنے لگتے ہیں' اسی طرح میں بھی ادب میں دانت نکالنے کے مرحلے میں تھا اور کئی دفعہ جوش تحریر میں غلط الفاظ استعمال کر جاتا تھا۔ فقط وقت نے میرے اسلوب میں صفائی پیدا کرنی تھی۔ ہیت اختیار کرنا نہ تو حادثاتی چیز ہوتی ہے اور نہ ہی خارجی۔ یہ فکری عمل کا ایک عکس ہوتا ہے۔ اس بات پر مجھے کوئی حیرت نہیں ہو رہی تھی کہ میں بطور ادیب اپنی انفرادیت کو دوسرے کہنہ مشق ادیبوں کے مقابلے میں تیزی سے ایک الگ شکل دے رہا تھا۔

اس دوران میں کانگریس کے انعقاد کا دن قریب آ رہا تھا۔ لہٰذا ادارتی بورڈ کو جنیوا منتقل کرنے کا فیصلہ کیا گیا جہاں اشیا سستی اور روس سے رابطہ آسان تھا۔ لینن نے بادل نخواستہ یہ فیصلہ قبول کر لیا سیدوفا اس کے متعلق لکھتی ہے۔ ''جنیوا میں ہمیں رونگ سے کمروں میں رکھا گیا۔ ایل' ڈی' کانگریس کے کام میں منہمک تھا جب کہ میں پارٹی کے کام کی خاطر روس جانے کی تیار کر رہی تھی۔'' کانگریس کیلئے مندوب آنے شروع ہو گئے تھے مگر ہم اپنے اجلاسوں میں مصروف تھے۔ ابتدائی کاموں میں لینن بلا شبہ سب پر سبقت لے گیا تھا' اگرچہ بظاہر ایسا دکھائی نہیں دیتی تھی۔ بعض مندوب دلوں میں کئی قسم شبہات لے کر آئے تھے۔ کانگریس کی تیاریوں میں بڑا وقت لگ گیا۔ مجوزہ دستور کی تیاری پر بھی بہت سا وقت خرچ ہو گیا۔ یہ ضروری تھا کیونکہ مرکزی تنظیم (اسکرا) اور مرکزی کمیٹی جس نے روس میں کام کرنا تھا' دونوں کے درمیان تعلقات کی نوعیت کو قائم کرنا بڑا ضروری تھا۔ میں خود چاہتا تھا کہ ادارتی بورڈ کو مرکزی کمیٹی کے تابع کر دیا جائے۔ اسکرا سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی اکثریت کا بھی یہی خیال تھا۔

''ایسا نہیں ہوسکتا۔'' لینن کو اعتراض تھا۔''مختلف طاقتوں کے باہمی تعلقات مختلف ہیں۔ وہ روس سے ہماری راہنمائی کیسے کرسکتی ہیں؟ نہیں' ایسا نہیں ہوسکتا۔ ہمارا مرکز مضبوط ہے' ہمارے خیالات مضبوط ہیں' ہمیں یہاں سے راہنمائی کا حق استعمال کرنا چاہیے۔''

''اس طرح تو ادارتی بورڈ کی آمریت قائم ہوجائے گی۔'' میں نے کہا۔

''اس میں کیا برائی ہے؟'' لینن غصے میں غرایا۔''موجودہ صورتحال میں ایسا ہی ہونا چاہیے۔''

لینن کے تنظیمی منصوبے نے میرے ذہن میں شکوک پیدا کردیے۔ یہ خیال میرے ذہن سے دور نہیں تھا کہ اس سوال پر کانگریس میں طوفان کھڑا ہوجائے گا۔

چونکہ میں اپنی جلاوطن کے دوران میں سائبیرین یونین سے قریبی طور پر منسلک رہا تھا لہذا مجھے اسی کا نمائندہ بنایا گیا تھا۔ جاسوسوں سے بچنے کیلئے مجھے تولا کے نمائندے ڈاکٹر الیانوف کے ساتھ ننھی مضافات میں ایک چھوٹے سے سٹیشن نیون سے ڈاکٹر الیانوف کی ہمراہی میں جنیوا آنا تھا۔ نیون کے سٹیشن پر ایکسپرس گاڑی فقط نصف منٹ کیلئے ٹھہرتی تھی۔ اچھے روسی دیہاتیوں کی طرح ہم دونوں غلط کرنے لگے۔ ٹرین رکنے کے ساتھ ہی دوبارہ چل پڑی۔ ہمیں ڈبے میں بیٹھنے کی مہلت نہ ملی تو ہم دو ڈبوں کے درمیان والی جگہ میں بیٹھ گئے۔ سٹیشن ماسٹر نے ہمیں دیکھ کر ٹرین کو روک لیا۔ ہمیں ڈبے میں بٹھانے کے بعد گارڈ نے بتایا کہ اس نے زندگی میں پہلی بار ایسے احمق لوگ دیکھے تھے۔ ٹرین کو دوبارہ ٹھہرانے پر ہمیں پچاس فرانک جرمانہ کیا گیا۔ ہم نے اسے بتایا کہ ہم فرانسیسی کا ایک لفظ بھی نہیں سمجھتے تھے۔ یہ سچ تو نہیں تھا مگر اس سے ہمارا مقصد پورا ہو گیا۔ تین منٹ تک ہم پر چلانے کے بعد موٹا سوئس گارڈ چلا گیا۔ یہ اس نے ایک طرح سے نیک کام کیا تھا کیونکہ ہم دونوں کے پاس ملا کر بھی پچاس فرانک نہیں تھے۔ جب وہ ڈبے میں ٹکٹ چیک کرنے کی خاطر دوبارہ آیا تو وہ ہماری طرف حقارت سے اشارہ کرکے دوسرے مسافروں کو بتاتا رہا کہ اس نے کیسے بغر سے ہمیں نکال کر ہماری جان

بچائی تھی۔ بچارے کو معلوم ہی نہیں تھا کہ ہم ایک پارٹی بنانے جا رہے تھے۔

کانگریس کا افتتاح بریسلز میں لیبر کواپریٹو سوسائٹی کے صدر دفتر میں ہوا۔ جو مینشن ڈی پیپلز نامی عمارت میں واقع تھا۔ جس ٹور میں بیٹھ کر ہم نے اپنا کام کرنا تھا وہ اون سے بھرا ہوا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اون کے کیڑے ہمیں مستقل طور پر کاٹتے رہے۔ ہم نے انہیں ''انسلی کی فوج'' * کا نام دے دیا

---

*: انسلی بلجیئم میں سوشلسٹ پارٹی کا راہنما تھا اور کواپریٹو تحریک کیلئے جیسے بورژوازی پر حملے کیلئے متحریک کیا گیا تھا۔ ہمارے اجلاس ایک جسمانی اذیت تھے۔ اس سے بھی بڑی بات مندوبین کی کانگریس میں پہلے دن ہی سے عدم دلچسپی تھی۔

میرے پاس سموکولیف نامی ایک بلغارین باشندے کے نام کا پاسپورٹ تھا جس کے بارے میں میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ میرے ساتھ زوسولچ تھا۔ کانگریس میں شرکت کیلئے اوڈیسہ سے آیا ہوا ''زیڈ'' نامی ایک مندوب ہمارے پاس سے گزرا اور اس نے دبی ہوئی زبان میں کہا۔ ''تمہارے پیچھے ایک جاسوس ہے۔ تم جاؤ' میں اسے نمٹتا ہوں۔'' زیڈ بذات خود ایک تجربہ کار جاسوس تھا۔ اور اس کے پاس ایک ستارہ شناس جیسی آنکھ تھی۔ وہ ریسٹورانٹ کے نزدیک ہی ایک عمارت کے بالائی کمرے میں رہتا تھا اور اس نے اپنے کمرے کی کھڑکی کو مشاہدہ گاہ بنا رکھا تھا۔

میں زوسولچ کو خدا حافظ کہہ کر سیدھا چل پڑا۔ میری جیب میں میرا بلغارین پاسپورٹ اور پانچ فرانک تھے۔ ایک دراز قامت آدمی جس کی ناک بطخ کی چونچ جیسی تھی میرا پیچھا کر رہا تھا۔ یہ آدھی رات کا وقت تھا اور سڑک پر کوئی آدمی نہیں تھا۔ میں تیزی سے پچھلی جانب مڑا۔

''موسیو' اس سڑک کا کیا نام ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا وہ شخص گھبرا گیا اور دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ ''جی ٹی سی پاس'' اس نے کہا۔

وہ بلاشبہ ریوالور کی گولی کا منتظر تھا۔ میں سڑک پر سیدھا چلتا گیا۔ کسی جگہ کلاک

نے ایک بجایا۔ایک گلی آتے ہی میں اس میں مڑا اور اپنی پوری رفتار بگھا گنے لگا۔وہ آدمی بھی میرے پیچھے بھاگ رہا تھا۔دو اجنبی آدھی رات کو بریسلز کی گلیوں میں بھاگ رہے تھے۔اب میں قدموں کی آواز سن رہا تھا۔تین گلیوں سے گزر کر میں پھر سڑک پر آ گیا وہ بھی میرے پیچھے تھا۔ہم دونوں تھک گئے تھے اور غصے میں تھے۔اب ہم چل رہے تھے۔ہم موڑ پر کھڑی گھوڑا گاڑیوں کے پاس سے گزرے۔گاڑی میں فرار ہونا بیکار تھا کیونکہ جاسوس نے دوسری گاڑی میں میرا پیچھا کرنا تھا۔ہم دونوں نے چلنا جاری تھا۔اب جیسے سڑک کا اختتام آ رہا تھا اور ہم شہر سے باہر جا رہے تھے ساری رات کھلی رہنے والی ایک بار کے قریب میں نے ایک اکیلی گھوڑی دیکھی۔اور جلدی سے اس کا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔

''فوراً چل پڑو۔میں جلدی میں ہوں۔''

''آپ کہاں جانا چاہتے ہیں؟'' جاسوس ہماری باتیں غور سے سن رہا تھا۔میں نے ایک پارک کا نام بتایا جو میری رہائش گاہ سے چند قدم کے فاصلے پر تھا۔

''ایک سو سوس کرایہ ہوگا۔''

''تم چلو''

کوچوان نے گھوڑے کی باگیں کھینچیں۔جاسوس جلد یبار کے اندر گیا اور ایک آدمی کیساتھ باہر آیا۔وہ اپنے غائب ہوتے ہوئے دشمن کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

نصف گھنٹے بعد میں اپنے کمرے میں تھا۔میں نے موم بتی روشن کی تو ڈریسنگ ٹیبل پر ایک خط پڑا تھا میرے بلغارین نام پر آیا تھا۔یہاں میرے نام کس کا خط آ سکتا تھا۔خط پولیس کی طرف سے تھا جس میں لکھا تھا کہ میں اگلے دن دس بجے اپنے پاسپورٹ کے ہمراہ پولیس اسٹیشن حاضر ہو جاؤں۔ممکن تھا کسی دوسرے جاسوس نے میرا سراغ لگا لیا تھا۔پھر وہ ساری رات کی دوڑ کیا تھی؟ اس رات اسی قسم کے خط دوسرے مندوبین کو بھی آئے۔جو پولیس سٹیشن سے ہو کر آئے انہیں چوبیس گھنٹوں کے اندر بلجیئم چھوڑ دینے کیلئے کہا گیا تھا۔میں پولیس سٹیشن جانے کی بجائے لندن چلا گیا جہاں کانگریس منتقل

کر دی گئی تھی۔

برنس میں روسی خفیہ پولیس کے سربراہ نے جس کا ہارٹنگ تھا' بعد میں مجھے بتایا کہ بریسلز میں ایک دم اتنے سارے غیر ملکیوں کو دیکھ کر بلجیئم کی پولیس گھبرا گئی تھی۔ اسے شک تھا کہ ان میں ایک سازش میں ملوث دس دہشت گرد بھی شامل ہوں گے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ہارٹنگ نے بذات خود بریسلز کی پولیس کو حیران کر دیا تھا۔ اس کا اصل نام ہیکل مان تھا۔ اسے بم دھماکہ کرنے کے جرم میں ایک فرانسیسی عدالت سے سخت سزا ملی تھی۔ بعد میں وہ ایک جعلی نام سے زار کی خفیہ پولیس میں جرنیل کے عہدے تک پہنچ گیا۔ ہارٹنگ نے ایک دورے خفیہ ایجنٹ سے جس کا نام ڈاکٹر ژتومرسکی تھا' تمام اطلاعات حاصل کی تھیں۔ ڈاکٹر ژرومرسکی برلن میں کام کرتے ہوئے بھی تنظیم کی کانگریس میں بڑی دلچسپی لیا تھا۔ لیکن ہمیں اس کا پتا بہت بعد میں چلا تھا۔ زار کا عہد حکومت بظاہر بڑا مضبوط تھا۔ اس کے باوجود وہ گرنے سے بچ نہ سکا۔

کانگریس کے دوران ہی اسکرا کے بنیادی ارکان کے اختلافات کھل کر سامے آ گئے۔ ''سخت'' اور ''نرم'' کا فرق واضح ہو گیا۔ سب سے پہلے دستور کیلئے پیرے پر ہی اختلاف ہو گیا۔ مجھے اس سوال پر کہ پارٹی کا ممبر بننے کا کون اہل تھا۔ لینن کا اصرار تھا کہ پارٹی کی شناخت زیر زمین تنظیم کے نام سے کی جائے۔ اختلاف رائے کچھ ایسا اہم بھی نہیں تھا کیونکہ زیر زمین تنظؒم کے ارکان کو بھی ووٹ ڈالنے کا ایک جیسا حق حاصل تھا۔ لیکن دو مختلف رجحان بالکل واضح تھے۔ لینن پارٹی کے اندر کو نوعیت کو بالکل حتمی اور صاف شکل میں دیکھنا چاہتا تھا۔ مارٹوف غیر واضح شکل کے حق میں تھا۔ ارکان کی گروہ بندی نے کانگریس کی آئندہ کارروائی کا تعین کر دیا اور بشمول دوسری چیزوں کے پارٹی کے مرکزوں کو بھی ایک شکل دے دی۔

پس پردہ دونوں فریقوں کی طرف سے ڈیلی گیٹ کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ لینن نیی مجھے اپنی طرف کرنے میں کوئی موقع ضائع نہ کیا۔ لینن' میں اور تیسرا مندوب کراسیکوف سیر کر رہے تھے جس کے دوران میں وہ اور لینن مجھے بتاتے

رہے کہ میں اور مارٹوف ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے تھے کیونکہ مارٹوف بہت ''نرم'' تھا۔ کراسیکوف نے اسکرا کے دوسرے مدیروں کا ذکر کچھ ایسے برے انداز میں کیا کہ لینن کے ماتھے پر تیوریاں چڑھ گئیں۔ میں کپکپا سا گیا۔ اسکرا کے مدیروں کی طرف میرا رویہ ابھی تک جوانی کت جذباتی پن پر مبنی تھا۔

اس گفتگو نے مجھے پارٹی کے قریب لانے کے بجائے قدرے پرے دھکیل دیا۔ اختلافات بڑے گنجک ہو گئے تھے۔ گروہ بندی ہو رہی تھی اور غیر واضح چیزوں پر کام ہو رہا تھا۔ ہم نے چیزوں کو واضح کرنے کیلئے اسکرا کے معتبر لوگوں کا ایک اجلاس طلب کر لیا۔ اجلاس کی صدارت کس نے کرنی تھی' یہ فیصلہ کرنے میں بھی مشکلات پیش آ رہی تھیں۔ ''میں بنجمن کے حق میں ہوں۔'' ڈوئیچ نے راستہ تلاش کرنے کی کوشش میں کہا۔ اس کا اشارہ میری طرف تھا۔ لہذا اس اجلاس کی صدارت مجھے کرنی پڑی جس میں آئندہ کیلئے بالشویک اور منشویک کے مابین تفریق واضح ہوگئی۔ اس وقت ہر ایک کی رگیں ٹوٹ رہی تھیں۔

لینن اجلاس سے اٹھ کر چلا گیا اور جاتے وقت دروازے کو زور سے بند کرتا گیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب پارٹی کے اندر تلخ کھینچا تانی میں اسے اپنے آپ پر اختیار نہیں رہا تھا۔ اس سے صورت حال زیادہ خراب ہوگئی۔ اختلافات تو کانگریس کے درمیان ہی پیدا ہو گئے تھے مگر اب وہ سطح پر آ گئے تھے۔ لینن نے مجھے اپنی طرف یعنی ''سخت'' طرف لانے کی ایک اور کوشش کی اور اسلسلے میں زیڈ نامی ایک خاتون مندوب اور اپنے بھائی دمستری کو میرے پاس بھیجا۔ ہمارے درمیان گفتگو ایک پارک میں ہوئی جو کئی گھنٹے جاری رہی۔ وہ مجھے جانے نہیں دے رہے تھے۔ ''ہمیں حکم ہے کہ ہم ہر قیمت پر تمہیں اپنے ساتھ لے کر جائیں۔'' انہوں نے کہا۔ میں نے صاف طور پر انکار کر دیا۔

کانگریس کے تمام ارکان کیلئے پھوٹ غیر متوقع تھی۔ جدوجہد میں سب سے زیادہ باعمل اور سرگرم آدمی لینن نہ تو یہ پھوٹ دیکھ سکا تھا اور نہ ہی اس کا اندازہ کر سکا تھا۔ اس کی یہ خواہش بھی نہیں تھی۔ واقعات کے دھارے نے دونوں اطراف کو پریشان کر

دیا تھا۔ کانگریس کے بعد لینن کئی ہفتے اعصابی طور پر بیمار رہا۔ سیدوفا نے اپنی یاداشتوں میں تحریر کیا۔ ''ایل' ڈی لندن سے روزانہ خط لکھا کرتا تھا۔ اس کے خطوں میں گروہ بندی کی صورتحال روز بروز خراب ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ اسنے اپنے آخری خط میں گروہ بندی وقوع پذیر ہونے کا لکھا اور یہ بھی بتایا کہ اسکرا میں پھوٹ نے سب کو بے حد پریشان کر دیا تھا۔ لندن سے ایل' ڈی کی واپسی کے بعد مجھے کانگریس کی رپورٹ کے ساتھ پیٹرز برگ جانا پڑا۔''

میں کانگریس میں ''نرم'' کی طرف سے کیسے آ گیا تھا۔ اسکرا کے مدیروں میں میرے سب سے قریبی تعلقات مارٹوف زوسولچ اور ایکسل راڈ کے ساتھ تھے۔ مجھ پر ان کا اثر کسی شک و شبہ کے بغیر تھا۔ کانگریس سے پہلے ادارتی بورڈ میں اختلافات تو پائے جاتے تھے مگر اس قدر شدید نہیں تھے۔ میں پلیخانوف سے پرے ہٹ گیا تھا۔ چھوٹی موٹی جھڑپوں کے بعد وہ مجھے سخت ناپسند کرنے لگا تھا۔ لینن کا رویہ میری طرف غیر معمولی طور پر محبت بھرا تھا۔ لیکن میں سمجھتا تھا کہ وہ ادارتی بورڈ پر دانستہ حملہ کر رہا تھا۔ اسکرا ایک اکائی تھی جو بڑے عمدہ طریقے سے کام کر رہی تھی۔ بورڈ میں پھوٹ کا خیال میرے لئے ایک دہشت ناک خواب تھا۔

انقلابی مرکزیت ایک بڑا سخت' ضروری اور ولولہ انگیز اصول ہے۔ یہ اکثر اوقات دوست ارکان اور سابق ساتھیوں کے گروہوں سے بڑی سختی سے پیش آتا ہے۔ یہ بات اہمیت سے خالی نہیں ہے کہ ''بے رحمی'' اور عدم مصالحت'' جیسے لفظ لینن کے پسندیدہ لفظوں میں تھے۔ وہ ایک غیر جذباتی انقلابی تھا جو ایک واضح مقصد کیلئے جدوجہد کر رہا تھا۔ ایک ایسی جدوجہد جو کسی ذاتی غرض یا مقصد سے بالکل پاک تھی۔ 1903ء کے پورے سال میں لینن کی یہی کوشش رہی کہ وہ زوسولچ اور ایکسل راڈ کو ادارتی بورڈ سے ہٹا دے۔ میں ان دونوں کی بڑی عزت کرتا تھا اور اس میں محبت کا کچھ عنصر بھی شامل تھا۔ دونوں کی ماضی کی خدمات کے پیش نظر لینن کی نگاہ میں ان کی بڑی عزت تھی۔ لیکن اس کا خیال تھا کہ وہ مستقبل کی راہ میں رکاوٹ بن رہے تھے۔ اسی چیز نے

اسے ان دونوں کو قیادت سے محروم کرنے کی ترغیب دی تھی لیکن میں اس سے متفق نہیں تھا۔ میں سر پا احتجاج بن گیا۔ جب پارٹی ایک تنظیم کی شکل اختیار کر رہی تھی تو اس وقت پرانے کارکنوں کو ہٹا دینا ایک بے رحمانہ اقدام تھا۔ دوسری کانگریس کے موقع پر میرا لینن سے جدا راستہ اختیار کرے کی بڑی وجہ یہی تھی۔ اس کا رویہ ظالمانہ ہونے کے سبب میرے نزدیک ناقابل معافی تھا۔ لیکن تنظیم نقطہ نظر سے سیاسی طور پر ایسا کرنا ضروری بھی تھا۔ بہرحال پرانے لوگوں سے علیحدگی جو ابتدا میں اکٹھے تھے' ایک طرح سے ناگزیر تھی۔ لینن ہم سب سے بہت پہلے یہ بات سمجھ چکا تھا۔ اس نے ابتدا میں پلیخا نوف کو زوسولچ اور ایکسل راڈ سے الگ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن بعد کے واقعات نے جلد ہی بتا دیا کہ اس کی یہ کوشش کیسے بیکار ثابت ہوئی

لینن سے میری علیحدگی ''اخلاقی'' یا یوں کہہ لیں' ذاتی وجوہات کی بنا پر ہوئی۔ سطح پر ایسا ہی تھا۔ اندرون خانہ یہ سیاسی نوعیت کی تھی اور اس نے اپنا اظہار تنظیمی طریقوں سے کیا تھا۔ میں خود کو مرکزیت پسند سمجھتا تھا۔ لیکن اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ ایک پرانے نظام کے خلاف جنگ لڑنے اور لاکھوں لوگوں کو متحرک کرنے کیلئے ایک انقلابی جماعت کو کس قدر مضبوط مرکزیت کی ضرورت تھی۔ میرا ابتدائی زمانہ ایک ایسے بیمار ماحول میں گزرا تھا جو اوڈیسہ میں قیام کے مزید پانچ برسوں کی وجہ سے زیادہ طویل ہو گیا تھا۔ لینن کی جوانی ''نارودنا یہ وولیا'' میں گزری تھی۔ میرے بعد کے چند برسوں میں آنے والوں کی تربیت ایسے ماحول میں ہوئی تھی جو نئی سیاسی اتھل پتھل کے زیر اثر تھا۔ 1903ء میں لندن کانگریس کے وقت انقلاب میرے لئے ابھی تک ایک نظریاتی تجرید تھی۔ میں لینن کی مرکزیت پسندی کو انقلابی نظریے کا منطقی نتیجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ کسی مسئلے کو آزادانہ طور پر دیکھنا اور اس سے ضروری نتائج اخذ کرنا ہمیشہ میری فکری کھوج کی ضرورت بنی رہی۔

کانگر کے موقع پر جنم لینے والے تصادم کی گھمبیرتا کی وجہ اصولوں کی لڑائی کے علاوہ یہ بات بھی تھی کہ پرانے لوگ لینن کی اہمیت اور رتبے کو پہچاننے میں ناکام رہے

تھے۔کانگریس کے دوران میں اوراس کے بعد ایکسل راڈ اور بورڈ کے دوسرے پرانے ارکان کا لینن کی طرف ہتک آمیز رویہ اور حیرانی میں لپٹے ہوئے اس قسم کے جملے بھی تھے: ''ایسا کرنے کیلئے وہ اعصاب کہاں سے لایا؟'' ایک بزرگ نے کہا۔''جب وہ یہاں آیا تھا تو اس کا برتاؤ ایک شاگرد جیسا نہیں تھا؟ اس میں اتنا سارا اعتماد کہاں سے آ گیا؟ اتنی اعصابی طاقت اس میں کہاں سے آئی؟''

لینن اعصابی طور پر مضبوط تھا۔اسے بس یہ یقین دلانے کی ضرورت تھی کہ پرانی نسل پرولتاریہ کی جنگ جو تنظیم کی جو انقلاب کی چاپ سن رہی تھی' قیادت سنبھالنے کی اہل نہیں تھی۔ پرانے لوگ اور وہ ان کے ساتھی اپنے اندازوں میں غلطی پر تھے لینن ایک شاندار پارٹی ورکر ہی نہیں بلکہ ایل راہنما بھی تھا۔ایک ایسا آدمی جس کے بدن کا ہر ریشہ ایک خاص مقصد کیلئے کام کرتا رہتا تھا۔ پرانی نسل کے لوگوں کے ساتھ کام کرنے کے بعد اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ ان سے زیادہ مضبوط اور بہتر کام کرنے کے اہل تھا۔

کانگریس کے موقع پر لینن نے پلیخا نوف کو اپنی طرف کر لیا' فقط تھوڑے عرصے کیلئے۔اس کے ساتھ ہی وہ مارٹوف کو کھو بیٹھا۔ یہ ہمیشہ کا نقصان تھا۔ پلیخا نوف نے کانگریس میں کسی چیز کو سونگھ لیا تھا۔لینن کے متعلق بات کرتے ہوئے اس نے ایکسل راڈ سے کہا۔''روبز پیریز اسی قسم کے مواد کے بنے ہوتے ہیں۔'' پلیخا نوف نے بذات خود کانگریس میں کوئی خاص حصہ نہیں لیا تھا۔ فقط ایک دفعہ میں نے اسے پورے رنگ پر دیکھا تھا۔ وہ کانگریس کی پروگرام کمیٹی کا اجلاس تھا۔ کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے اس نے اپنے مزاج اور عملیت اور اپنی شخصیت کے جادو سے پورے مجمع کو پھلجھڑی بنا دیا۔اس کے ذہن میں پروگرام واضح اور فنی لحاظ سے مکمل تھا۔اسے اپنے آپ پر یقین اور اپنے علم کی برتری کا احساس تھا۔اس کی آنکھوں میں ایک روشن اور مسکراتی ہوئی طنزیہ چمک اور اس کی سفید بڑتی مونچھوں میں پھڑ پھڑاہٹ تھی۔اس کی آواز قدرے ڈرامائی مگر زندہ اعتماد سے بھرپور تھی اور اس کی حرکات وسکنات تاثر سے بھری ہوئی تھیں۔

* منشویکوں کا راہنما مارٹوف انقلابی تحریک کا سب سے بڑا المیہ کردار تھا۔ وہ ایک فطری ادیب' شاندار سیاست دان اور باریک بین مفکر تھا۔ جس تحریک کا وہ راہنما بنا مارٹوف کا داس سے بہت اونچا تھا۔ مگر اس میں جرات کی کمی اور ارادے میں پختگی نہیں تھی۔ ترش روئی اور بدمزاجی سے کام نہیں چل سکتا تھا۔ واقعات پر مارٹوف کا پہلا رد عمل بڑا انقلابی نوعیت کا ہوتا تھا۔ لیکن اس کا ذہن اس ردعمل کا ساتھ نہیں دیتا تھا اور اس کا جذبہ جلد ہی سرد پڑ جاتا تھا۔ آنے والے انقلاب سے پہلے رونما ہونے والے اہم واقعات کے درمیان میری اور اس کی دوستی زیادہ پائیدار ثابت نہ ہوسکی۔

---

* روسی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کی دوسری کانگریس کے موقع پر پارٹی دو حصوں میں تقسیم ہوگئی تھی۔ بالشویک اور منشویک۔ بالشویک کا مطلب اکثریت اور منشویک کے معنی اقلیت تھا۔ (مترجم)

میں اس کے متعلق خواہ کچھ کہوں۔ دوسری کانگریس میری زندگی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس نے مجھے سال کیلئے لینن سے جدا کردیا۔ اب میں ماضی کی طرف دیکھتا ہوں تو مجھے کوئی افسوس نہیں ہوتا۔ میں دوسری مرتبہ لینن کے نزدیک بہت سے لوگوں کے بعد آیا۔ لیکن میں اپنے طریقے سے آیا تھا۔ انقلاب' ردانقلاب اور سامراجی جنگ کے تجربوں کے بعد۔ میں اس کے نزدیک اس کے ان ''شاگردوں'' کی نسبت زیادہ یقین اور سنجیدگی سے آیا تھا جو زندگی میں اس عظیم آدمی کے الفاظ اور حرکات و سکنات کو دہراتے رہتے تھے مگر صحیح وقت پر نہیں۔ اور اس کی موت کے بعد اس کے بے بس جانشین مخالف طاقتوں کے ہاتھوں میں بے خبری میں آلہ کار بن گئے۔

روس واپسی

دوسری کانگریس کی اقلیت سے میرا گہرا تعلق مختصر تھا۔ زیادہ ماہ نہیں گزرے تھے کہ اقلیت' منشویک' کے اندر دو رجحان نمایاں طور پر دکھائی دینے لگے۔ میں جلد از جلد

اکثریت سے اتحاد کیلئے اقدام کے حق میں تھا کیونکہ میں پھوٹ کو ایک بڑا واقعہ تو ضرور سمجھتا تھا مگر اسے زیادہ کچھ نہیں۔ دوسروں کیلئے پھوٹ موقع پرستی کے ارتقاء کی طرف اٹھنے والا پہلا قدم تھا۔ میں نے 1904ء کا سارا سال منشویک کے مختلف گروہوں کے ساتھ پالیسی اور تنظیم کے سوال پر گزار دیا۔ دلائل کا زور دو باتوں پر تھا۔ آزاد خیالی اور بالشویک کی طرف رویہ۔ میں غیر مصالحانہ مزاحمت کے ساتھ اس بات کے خلاف تھا کہ آزاد خیالوں کو عوام کے پاس جانے کا موقع دیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی بڑھتے ہوئے جذبے کے ساتھ میں سوشل ڈیموکریٹک دھڑوں کے اتحاد کا حامی تھا۔

ستمبر میں میں نے اقلیتی گروپ کی رکنیت چھوڑنے کا اعلان کر دیا۔ اس سے پہلے میں نے اسی سال اپریل میں بطور سرگرم کارکن اس کے لئے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اس عرصے کے دوران میں میں نے کچھ عرصہ میونخ میں روسی مہاجروں کے سرکل میں گزارا تھا۔ میونخ اس زمانے میں جرمنی کا سب سے زیادہ جمہوری اور فن کا رانہ شہر سمجھا جاتا تھا۔ باویریا کی سوشل ڈیموکریسی وہاں ٹھیک طور پر کام کر رہی تھی۔ میں میونخ میں آرٹ گیلریاں دیکھتا رہا۔

پارٹی کانگریس کے وقت بھی روس کا جنوبی حصہ ہڑتالوں کے بخار میں مبتلا تھا۔ کسانوں میں بے چینی بڑھ رہی تھی۔ یونیورسٹیوں میں ہلچل تھی۔ روس' جاپان' جنگ نے انقلاب کو زبردست فائدہ پہنچایا۔ پریس زیادہ جرات دکھا رہا تھا۔ دہشت گردی کے واقعات بڑھنے لگے تھے۔ آزاد خیال بیدار ہونا شروع ہو گئے تھے اور سیاسی دعوتیں دے رہے تھے۔ انقلاب کا بنیادی سوال ایک دم سامنے آ گیا تھا۔ تجریدیں حقیقت اختیار کر رہی تھیں۔ منشویک اور خاص طور پر زوسولچ آزاد خیالوں سے بڑی امیدیں لگا بیٹھی تھی۔

کانگریس سے پہلے ''سینڈوٹ'' کیفے میں ادارتی بورڈ کے ایک اجلاس کے دوران میں زوسولچ نے اپنے خاص مدھم اور عاجزانہ لہجے میں شکایت کی (ایسے مواقع پر اس کا لہجہ ایسا ہی ہوتا تھا) ہم آزاد خیالوں پر زیادہ حملے کر رہے تھے۔ یہ اس کی دکھتی

رگ تھی۔ ''دیکھو وہ کس قدر مشتاق ہیں'' وہ لینن سے پرے دیکھتے ہوئے کہا کرتی حالانکہ اصل میں وہ لینن ہی سے مخاطب ہوتی تھی۔ ''سٹریوچا ہتا ہے کہ روسی آزاد خیال سوشلزم سے قطع تعلق نہ کریں کیونکہ اگر انہوں نے ایسا کیا تو ان کا انجام بھی جرمن آزاد خیالوں جیسا ہوگا۔ اس کا کہنا ہے کہ انہیں فرانسیسی انقلاب پسند سوشلسٹوں کے نقش قدم پر چلنا چاہیے۔''

''ہمیں ان پر کاری ضرب لگانی چاہیے'' لینن نے مسکراتے ہوئے کہا' جیسے وہ ویرا ایوانفنا کو چھیڑ رہا تھا۔

''آپ نے خوب کہا'' اس نے مایوسی میں ڈوب کر کہا۔ ''وہ ہمیں ملنے آئیں اور ہم ان پر کاری ضرب لگائیں۔''

لینن کے ساتھ میری بڑی بے تکلفانہ گفتگو ہو رہی تھی جو آگے بڑھنے کے ساتھ زیادہ گہری اور قطعی ہوتی جا رہی تھی۔ 1904ء میں آزاد خیالوں نے دعوتوں کی جو تحریک شروع کی تھی وہ جلد ہی بحران کا شکار ہوگئی۔ اسی تحریک کے دوران میں میں نے یہ سوال پوچھا تھا۔ ''آگے کیا ہوگا؟'' میں نے خود ہی اس کا جواب کچھ اس طرح دیا تھا: عام ہڑتال سے راستہ کھولا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد پرولتاریہ اٹھ کھڑی ہوگی جو آزاد خیالی کے خلاف عوام کو آگے لے کر بڑھے گی۔ اس بات نے منشویکوں سے میرے اختلافات کی خلیج کو زیادہ گہرا کر دیا۔

23 جنوری 1905ء کو میں کئی جگہ لیکچر دینے اور ٹرینوں میں بے خواب راتیں گزارنے کے بعد جنیوا واپس آیا۔ میں نے اخبار فروخت فروش لڑکے سے ایک دن پہلے کا اخبار خریدا۔ اس میں لکھا تھا کہ محنت کش ''سرمامحل'' تک احتجاج کرتے ہوئے جائیں گے۔ مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ ایک گھنٹے بعد میں اسکرا کے دفتر میں گیا۔ مارٹوف بڑا جذباتی ہو رہا تھا۔

''احتجاج تو ہوا ہی نہیں'' میں نے کہا۔

''تم یہ کیا کہہ رہے ہو؟'' وہ مجھ پر جھپٹ پڑا۔ ''ہم نے تو ساری رات ایک کیفے

میں اس کے متعلق خبریں پڑھنے میں گزار دی ہے اور تم کہتے ہو کہ احتجاج ہوا ہی نہیں ۔ یہ دیکھو۔'' اس نے خونی اتوار * کے ذریعے آئی ہوئی رپورٹ میرے ہاتھ میں تھما دی ۔ایک بے جان مگر جلتی ہوئی سنسناہٹ مجھ پر طاری ہوگئی ۔

اب میں مزید باہر نہیں ٹھہر سکتا تھا ۔ بالشویکوں سے میرے تعلقات کانگریس کے موقع پر ہی ختم ہوگئے تھے ۔ میں نے منشویکوں کو بھی چھوڑ دیا ۔اب جو کچھ کرنا تھا مجھے خود کرنا تھا ۔ ایک طالب علم کے ذریعے میں نے نیا پاسپورٹ حاصل کیا اور اپنی بیوی ناطالیہ ایوانفنا سیدوفا (یہ ٹراٹسکی کی دوسری بیوی تھی ۔-مترجم) کے ہمراہ جو 1904 ء کے موسم خزاں میں دوبارہ باہر آئی تھی' ٹرین کے ذریعے سیونخ چلا گیا ۔ پروس نے ہمیں اپنے گھر پر ٹھہرایا ۔ وہاں اس نے 22 جنوری کو وقوع پذیر ہونے والے واقعات کی میری لکھی ہوئی رپورٹ پڑھی اور بڑا جذباتی ہوگیا ۔''واقعات نے تمہارے تجزیے کی تصدیق کردی ہے ۔اب اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ لڑائی کیلئے عام ہڑتال بڑا ضروری ہتھیار ہے ۔ 22 جنوری کی ہڑتال ایک سیاسی ہڑتال تھی اگرچہ اسے پادری کا لبادہ

----

* 2 جنوری 1905 ء میں پادری گاپون کی قیادت میں پیٹرز برگ کے عوام کا ایک بڑا ہجوم زار کی تصویریں اور چرچ کے بینرز اٹھائے ''سرمامحل'' تک گیا تھا اور زار کو ایک درخواست پیش کی تھی جس میں ان کے حالات بہتر کرنے کو کہا گیا تھا ۔لیکن زار کی پولیس نے گولی چلاکر ہزاروں محنت کشوں کو ہلاک اور زخمی کا دیا اس دن کو خونی اتوار کہا جاتا ہے ۔

پہنا دیا گیا تھا ۔اب روس میں انقلاب محنت کشوں کی جمہوری حکومت لاکر ہی رہے گا ۔''اس کے بعد پروس نے میرے پمفلٹ کا پیش لفظ لکھا ۔

پروس بلاشبہ گذشتہ صدی کے اختتام کا ایک مارکسٹ تھا ۔ وہ مارکسی طریقے بڑی مہارت سے استعمال کرتا تھا' وہ گہری بصیرت کا مالک تھا اور اہم عالمی واقعات پر قریبی

نظر رکھتا تھا۔ اس کی بے خوف سوچ اور پختہ طرز تحریر اور اسلوب نے اسے شاندار ادیب بنا دیا تھا۔ وہ اپنے مطالعے ہی کی وساطت سے مجھے سماجی انقلاب کے نزدیک لایا تھا۔

اس کے باوجود پروس میں ایک دیوانگی اور غیر معتبری کا عنصر موجود تھا۔ انقلابی ہونے کے ساتھ اس کی امیر ہونے کی خواہش بڑی حیران کن تھی۔ وہ اسے اپنے سماجی انقلابی خیالوں کے ساتھ ملاتا رہتا تھا۔ ''پارٹی بالکل جامد اور پتھر کا ڈھانچہ بن چکی ہے'' وہ شکایت کیا کرتا۔ ''بیبل کے دماغ میں بھی کچھ ڈالنا مشکل ہو گیا ہے۔ ہم مارکسسٹ انقلابیوں کو ایک اخبار کی ضرورت ہے جو تین یورپی زبانوں میں ہو۔ اس کیلئے پیسے کی ضرورت ہے' اور یہ بھی بہت سارے پیسے کی۔'' اس طرح وہ بل ڈاگ اپنے موٹے اور چربی چڑھے دماغ میں انقلاب اور دولت کو غلط ملط کرتا رہتا تھا۔ اس نے میونخ میں اپنا ایک اشاعت گھر قائم کرنے کی کوشش کی مگر اس میں بڑی طرح ناکام رہا۔ پھر وہ روس چلا گیا اور وہاں اس نے 1905ء کے انقلاب میں حصہ لیا۔ اپنے خیال کی انفرادیت اور اچھوتے پن کی باوجود وہ ایک سیاسی راہنما کے طور پر بری طرح ناکام ثابت ہوا۔ 1905ء کے انقلاب کی ناکامی کے بعد وہ انحطاط کا شکار ہو گیا۔ وہ جرمنی سے ویانا اور وہاں سے قسطنطنیہ چلا گیا جہاں پہلی عالمی جنگ میں اس کی سنی گئی۔ جنگ میں فوجی ٹھیکے حاصل کر کے وہ دولت مند ہو گیا۔ اس کے دوش بہ دوش وہ جرمن ترقی پسندانہ عسکریت کا حامی بھی تھا۔ اس نے انقلابیوں سے قطع تعلق کر لیا اور جرمن سوشل ڈیموکریسی کے دائیں بازو کے دانش وروں میں شامل ہو گیا۔ جنگ کے دنوں میں میرا اس سے کوئی سیاسی یا ذاتی تعلق نہیں رہا تھا۔

میونخ سے سیدوفا اور میں ویانا چلے گئے۔ مہاجروں کی لہر اب روس کی طرف مڑ رہی تھی۔ وکٹر ایڈلر مکمل طور پر روسی معاملات میں کھو چکا تھا اور وہ روسی مہاجروں سے ایڈریس' پاسپورٹ اور پیسے وغیرہ لے رہا تھا۔ اس کے گھر پر ایک ہیئر ڈریسر نے میرا حلیہ تبدیل کیا کیونکہ میرا پہلا حلیہ روسی پولیس اور اس کے بیرونی گماشتوں کی نظر میں

آ چکا تھا۔

''مجھے ابھی ابھی ایکسل راڈ کا ایک تار ملا ہے۔'' ایڈلر نے مجھے اطلاع دی۔ ''تار میں لکھا ہے کہ گویا ن ملک سے باہر آ گیا ہے اور اس نے سوشل ڈیموکریٹ ہونے کا اعلان کر دیا ہے۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے۔ اگر وہ کہیں غائب ہو جاتا تو ایک اچھی روایت قائم کر جاتا۔ اب ایک مہاجر کے طور پر وہ مسخرہ بن کر رہ جائے گا۔ ایسے لوگ پارٹی میں کامریڈ کی بجائے تاریخی طور پر شہید اچھے لگتے ہیں۔'' وہ اپنی آنکھوں میں ایک ایسی چمک لا کر بول رہا تھا جس میں اس کی طنز کے کنارے کند کر دیے گئے۔

میں نے ویانا ہی میں ڈیوک اعظم سرگئیں کے قتل کی خبر سنی۔ ایک کے بعد ایک واقعات کا انبار لگ رہا تھا۔ سوشل ڈیموکریٹک پریس نے اپنی آنکھیں مشرق کی طرف لگا دی تھیں۔ میری بیوی رہائش اور رابطوں کا بندوبست کرنے مجھ سے پہلے کیف چلی گئی۔ آربوژوف نامی ایک ریٹائرڈ کارپورل کے نام کے پاسپورٹ پر میں فروری میں خیف پہنچا اور چند ہفتوں تک ایک گھر سے دوسرے گھر میں منتقل ہوتا رہا۔ پہلے میں ایک وکیل کے یہاں ٹھہرا جو اپنے ہی سائے سے ڈرتا تھا۔ پھر فنی ادارے کے ایک پروفیسر کے گھر میں۔ پھر میں ایک بیوہ کے پاس چلا گیا جو آزاد خیالی تھی۔ ایک بار تو مجھے آنکھوں کے ایک ہسپتال میں پناہ لینی پڑی۔ ڈاکٹر کی ہدایات کے تحت جو میری صورت حال کو سمجھتا تھا' ایک نرس میرے پیروں کو غسل دیتی اور میری آنکھوں میں بے ضرر قسم کے قطرے ڈالتی رہی۔ مجھے خود کو وہاں دیر تک چھپانا پڑ گیا۔ میں اس سے چھپ کر اپنے ملغویات لکھتا رہا۔ وہ مجھے آنکھوں پر زور دینے سے بری طرح روکتی رہتی۔ راؤنڈ کے وقت ڈاکٹر اپنے ایک غیر معتبر نائب کو کہیں بھیج دیتا اور ایک اعتبار والی خاتون نائب کو میرے کمرے میں بھیج کر اندر سے دروازہ بند کر لیتا اور پردے کھینچ لیتا اور یہ ظاہر کرتا جیسے وہ میری آنکھوں کا معائنہ کر رہا تھا۔ وقت گزر جانے پر ہم تینوں مل کر ہنسنے لگتے۔

''تمہارے پاس سگریٹ ہے؟'' ڈاکٹر پوچھتا۔

''ہاں'' میں جواب میں کہتا۔

''آنکھیں ٹھیک ہیں؟'' وہ پھر پوچھتا۔

''بالکل ٹھیک ہیں؟'' میں جواب دیتا۔

اور ہم پھر ہنسنا شروع کر دیتے۔ اس کے بعد میں نے جو کچھ لکھنا ہوتا لکھنے کیلئے چلا جاتا۔ اس زندگی سے میں بہت خوش تھا۔ فقط مجھے بوڑھی نرس کو دھوکہ دینے پر افسوس ہوتا جو کتنی نرمی اور شفقت سے میرے پاؤں دھوتی تھی۔

ہماری زیر زمین پرنٹنگ پریس ان دنوں کیف میں کام کرتی تھی اور خفیہ پولیس کے چھاپوں کے باوجود کئی سال تک اس کی ناک کے نیچے کام کرتی رہی تھی۔ 1905ء کے موسم بہار میں میری بہت سی تحریریں اسی پریس میں شائع ہوئی تھیں۔ طویل تحریروں کی اشاعت کی ذمہ داری کراسن نامی ایک انجینئر کی تھی جسے میں کیف ہی میں ملا تھا۔ وہ بالشویک مرکزی کمیٹی کا رکن تھا اور ایک عمدہ پرنٹنگ پریس کا انچارج رہا تھا جو کاسائیس میں کہیں تھی۔ میں نے کیف میں اس کیلئے بہت سے کتابچے لکھے جن کی چھپائی بڑی عمدہ ہوتی تھی۔ اب حالات میں یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔

انقلابی پارٹی ان دنوں نئی نئی بنی تھی۔ ان کے ارکان کے عمل میں ابھی ایک ناپختگی اور ناتجربہ کاری تھی۔ کراسن بھی اس خامی سے مبرا نہیں تھا۔ لیکن اس میں انتظامی لحاظ سے ایک مضبوطی ضرور دکھائی دیتی تھی۔ وہ انجنیئر تھا اور کہیں کام کرتا رہا تھا جہاں اس کی شہرت بہت اچھی تھی۔ اس کے جاننے والوں کا حلقہ نوجوان انقلابیوں کے مقابلے میں زیادہ وسیع اور مختلف الخیال لوگوں پر مشتمل تھا۔ اس کے ہر جگہ رابطے تھے۔ ادبی حلقوں کے علاوہ ماسکو کے صنعتی علاقوں میں بھی اس نے اپنے رابطوں کو بطریق احسن قائم رکھا ہوا تھا۔ 1905ء میں پارٹی کے کام کے علاوہ وہ ہتھیاروں کی خریداری' ان کی دیکھ بھال اور حساب کتاب کا بھی ذمہ دار تھا۔ وسیع تناظر رکھنے کے باوجود وہ ذرا جلد باز تھا اور فوری نتائج حاصل کرنے کیلئے بے تاب رہتا تھا' سیاست میں بھی اور زندگی میں بھی۔

یہ اس کی طاقت بھی تھی اور کمزوری بھی۔ 1905ء کا انقلاب ناکام ہو جانے پر اس نے پھر کسی صنعت میں کہیں ملازمت اختیار کر لی۔ اس کے باوجود کراسن اپنے مقصد کے حصول میں لگا رہا۔ وہ بلا شبہ غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اپنے انجینئرنگ کے کام میں اسے وہی اطمینان حاصل ہوتا تھا جو کسی زمانے میں وہ انقلابی کام کر کے حاصل کیا کرتا تھا اسے بالشویک انقلاب پر حسد سے بھری حیرت ہوئی تھی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس انقلاب کی قسمت میں ناکامی لکھی تھی۔ وہ ایک عرصے تک ہماری اس قابلیت پر شک کرتا رہا کہ ہم ملک میں پیدا ہونے والے انتشار اور ابتری پر قابو پالیں گے۔ لیکن بعد میں اس کے سامنے کرنے والے کاموں کے جو میدان کھلے تھے ان پر وہ بہت خوش تھا۔

جہاں تک میرا تعلق ہے کراسن سے میرا رابطہ خدا کا بھیجا ہوا ایک تحفہ تھا۔ ہم نے سینٹ پیٹرز برگ میں ملاقات کرنے کا انتظام کیا۔ اس نے مجھے وہاں کے خفیہ پتے بھی دیے۔ ان میں سب سے زیادہ اہم پتہ توپ خانے کے ایک سکول کا تھا۔ جہاں میں نے وہاں کے چیف میڈیکل آفیسر الیگزینڈر اور الیگزیڈووچ لٹکنز سے ملنا تھا۔ پھر یہ تعلقات ہمارے خاندانی تعلقات میں ڈھل گئے۔ یہ اسی کا گھر تھا جہاں 1905ء میں میں نے کئی دن اور راتیں پناہ حاصل کی تھی۔ اسی گھر کے زینے اور کبھی صحن میں میں ایسے لوگوں سے ملتا رہا جس کا گھر وہاں ناممکن تھا۔ لیکن ڈاکٹر کے چھوٹے عملے سے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ پولیس کو کچھ نہیں بتایا گیا تھا اور ہر کام بڑے ہموار طریقے سے ہوتا رہا تھا۔ ڈاکٹر کا بڑا بیٹا الیگزینڈر جو اس وقت اٹھارہ سال کا تھا' پارٹی کا ممبر تھا جس نے چند ماہ بعد اورلوف کے ضلع میں کسانوں کی تحریک کی قیادت کی تھی۔ مگر سخت اعصابی دباؤ برداشت نہ کر سکا اور بیمار پڑ کر مر گیا۔ ڈاکٹر کا چھوٹا بیٹا افگراف جوان دنوں جمنیزم میں پڑھتا تھا' اس نے بعد میں خانہ جنگی اور سوویت حکومت کے دوران میں تعلیم کے شعبے میں اہم کام کیا۔ لیکن 1921ء میں کریمیا میں وہ ڈاکوؤں کے ہاتھوں مارا گیا۔

سینٹ پیٹرز برگ میں میں سرکاری طور پر وکنیتیف نامی ایک جاگیردار کے

پاسپورٹ پر رہتا تھا۔ انقلابی حلقوں میں میں پیٹر پیٹرووچ کے نام سے جانا جاتا تھا۔ میں پارٹی کے دونوں فریقوں میں سے کسی کا بھی ممبر نہیں تھا۔ میں کراسن کے ساتھ کام کرتا رہا جو اس وقت بالشویکوں کا ہمدرد تھا۔ میرے دونوں فریقوں سے تعلقات کی نا پر میں کراسن کے زیادہ نزدیک ہوگیا۔ میں منشویک فریق سے بھی رابطہ رکھے ہوئے تھا جو اس وقت بڑی انقلابی پالیسی اپنائے ہوئے تھا۔ میرے اثر کے تحت' اس فریق نے مشاورتی ڈوما کا بائیکاٹ کردیا۔ ایسا کرنے سے اس کے اپنے بیرونی منشویک مرکز سے تعلقات خراب ہو گئے۔ لیکن اس فریق کو حکومت نے جلد ہی اپنے پھندے میں پھنسا لیا۔ اس کے اپنے ہی ایک رکن نے جس کا نام ڈبروسکوک تھا اور جو ''سنہری عینک والا نکولائی'' کے نام سے پکارا جاتا تھا' اسے غداری کا مرتکب ہوگیا۔ بعد میں وہ حکومت کا ایجنٹ بن گیا تھا۔ وہ مجھے پہچانتا تھا اور جانتا تھا کہ میں سینٹ پیٹرز برگ میں تھا۔ یوم مئی پر جنگل میں ہونے والے اجلاس کے موقع پر میری بیوی کو گرفتار کرلیا گیا۔ مجھے کچھ عرصہ کیلئے زیرزمین جانا پڑا۔ پھر گرمیوں میں میں فن لینڈ چلا گیا۔ کچھ عرصہ میں نے اس میں گزارا جس میں ادبی کام اور املک کی سیر کرتا رہا۔ میں اخبار غور سے پڑھتا تھا' ان سے تراش لیتا تھا' انہیں سنبھال کر رکھتا تھا اور پارٹیوں کو نئی نئی شکلیں اختیار کرتے ہوئے دیکھتا رہتا تھا۔ یہ وہی زمانہ تھا کس میں میں نے روسی معاشرے کی داخلی طاقتوں کے متعلق اپنے نظریے کی تشکیل کی تھی اور روسی انقلاب کے امکانات پر غور کیا تھا۔

اس وقت میں نے لکھا کہ روس کو ایک بورژوا جمہوری انقلاب کا سامنا ہے۔ انقلاب کی بنیاد زمین کی ملکیت کا سوال ہے۔ سیاسی طاقت پر وہی طبقہ یا جماعت قبضہ کرے گی جو زاریت اور جاگیرداروں کے خلاف کسانوں کی قیادت کرے گی۔ آزاد خیال اور جمہوریت پسند دانش ور ایسا کرنے کے اہل نہیں ہیں۔ ان کا وقت گزر چکا ہے۔ انقلابی پیش منظر پر پرولتاریہ پہلے ہی قبضہ کرچکی ہے۔ فقط محنت کشوں کے ذریعے ہی سوشل ڈیموکریسی کسانوں کو اپنی قیادت کے نیچے لاسکتی ہے۔ یہی وہ طریقہ ہے جس کے ذریعے روسی سوشل ڈیموکریسی کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ جمہوری انقلاب کو

مکمل کرے۔ لیکن ایک دفعہ کنٹرول حاصل کرنے کے بعد جمہوری پارٹی خود کو جمہوری پروگرام تک ہی محدود نہیں رکھے گی۔ اسے سوشلسٹ ذرائع اختیار کرنے پڑیں گے۔ وہ ایسا کرنے میں کس حد تک کامیاب ہوگی اس کا انحصار روس کے اندر کارفرما طاقتوں کے باہمی تعلق ہی پر نہیں ہے بلکہ بین الاقوامی صورتحال پر بھی ہے۔ حکمت عملی کا تقاضا ہے کہ سوشل ڈیموکریسی کسانوں کی قیادت کیلئے آزاد خیالی سے لڑتے وقت بورژوا انقلاب کے زمانے میں بھی اقتدار کو حاصل کرنے کے کام کو اپنے سامنے رکھے۔

انقلاب کے عام امکانات کا سوال حربی مسائل سے گہرے طور پر وابستہ تھا۔ پارٹی کا مرکزی سیاسی نعرہ ایک دستور ساز اسمبلی کا مطالبہ تھا۔ لیکن انقلابی جدوجہد نے یہ سوال کھڑا کر دیا کہ کون اسمبلی کو بلائے گا اور کیسے بلائے گا۔ پرولتاریہ کی قیادت میں اٹھنے والی بیداری کی لہر کا منطقی ایک عارضی انقلابی حکومت کا قیام تھا جس میں پرولتاریہ کی نمائندگی اشد ضروری تھی۔

اس سوال نے پارٹی کے بالائی سرکل اور میرے اور کراسن کے درمیان ایک گرم بحث چھیڑ دی۔ میں نے ایک مضمون لکھا۔ اور اس میں یہ دلیل دی کہ زاریت پر انقلاب کی مکمل فتح کا یہ مطلب ہوگا کہ پرولتاریہ کسانوں سے مل کر اقتدار پر کنٹرول حاصل کرلے یا ایسے کنٹرول کیلئے ممکنہ اقدامات کرے۔ اس مضمون نے کراسن کو خوف زدہ کر دیا۔ اس نے عارضی انقلابی حکومت کا خیال قبول کرلیا۔ ایسی حکومت کے کاموں کا جو خاکہ میں نے تیار کیا تھا وہ بھی اسے پسند آیا تھا۔ لیکن اس نے ایسی حکومت میں سوشل ڈیموکریٹوں کی اکثریت کے متعلق پہلے سے کوئی قوائد وضع کرنے کے اصول کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس مضمون کی اشاعت سینٹ پیٹر برگ میں ہوئی۔ کراسن نے وعدہ کیا کہ وہ بیرون ملک مئی میں منعقد ہونے والی کل جماعتی کانگریس میں میرے مضمون کا دفاع کرے گا۔ مگر کانگریس منعقد نہ ہوسکی۔ بہرحال کراسن نے بالشویک کانگریس میں عارضی حکومت کے مسئلے پر ہونے والی بحث میں بھرپور حصہ لیا اور میرے مضمون کو لینن کی قرارداد کے ساتھ بطور ضمیمہ نتھی کر دیا۔ یہ بات سیاسی طور پر اس قدر

دلچسپ تھی کہ میں بالشویک کانگریس کی کارروائی کو اس کتاب میں لکھنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔

''جہاں تک کامریڈ لینن کی قرارداد کا تعلق ہے۔'' کراسن نے کہا۔''اس کی ناکامی اس بات میں پوشیدہ ہے کہ یہ عارضی حکومت اور مسلح شورش کے مابین تعلق کو واضح طور پر بیان نہیں کرتی۔ حقیقت یہ ہے کہ عوامی شورش اپنی عارضی حکومت خود قائم کرتی ہے۔قرارداد میں یہ رائے بھی درست نہیں ہے کہ عارضی انقلابی حکومت مسلح عوامی شورش کی قطعی فتح اور نوکر شاہی کا تختہ الٹنے کے بعد قائم ہو گی۔ ایسا نہیں ہے۔ یہ شورش کے دوران ہی قائم ہو جاتی ہے اور شورش کے طرز سکول میں سرگرم حصہ لیتی ہے۔ یہ سادگی پر مشتمل ہے کہ سوشل ڈیموکریسی اس وقت عارضی انقلابی حکومت میں حصے دار بنے گی جب نوکر شاہی کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔ جب مونگ پھلی کو کوئی دوسرے ہاتھ آگ پر بھونیں گے تو پھر ہمیں کون ہاتھ لگانے دے گا۔'' میں نے اپنے مضمون میں بالکل یہی باتیں کی۔

لینن جس نے اپنی تعارفی رپورٹ میں یہ سوال صرف ایک نظریاتی مشکل میں پیش کیا تھا' کراسن کی بات سے متفق تھا۔ وہ کہنے لگا۔

''میں کامریڈ کراسن کی رائے سے بڑی حد تک متفق ہوں۔ بطور ایک ادیب مجھے اس سوال کے ادبی پہلو پر زیادہ توجہ مرکوز کرنی چاہیے تھی۔ جدوجہد میں جس چیز کی مرکزی حیثیت ہے اس کی طرف کامریڈ کراسن نے صحیح طور پر اشارہ کر دیا ہے اور میں اس نقطہ نظر سے پوری طرح اتفاق کرتا ہوں۔ آدمی یونہی بے کار نہیں لڑتا۔ اس کی نگاہ میں کسی حیثیت پر قبضہ کرنا ہوتا ہے۔''

لہٰذا قرارداد میں ضروریات کے مطابق ترمیم کر دی گئی۔ یہاں یہ ذکر کرنا بے جا نہیں ہوگا کہ گذشتہ چند برسوں کے بحث مباحثوں میں عارضی حکومت کے مسئلے پر تیسری کانگریس کی قرارداد کا ہزاروں دفعہ حوالہ دیا گیا ہے۔'' جیسے یہ ٹراٹسکی ازم'' کے خلاف ہو۔ سٹالن سکول کے''سرخ پروفیسروں'' کی ہوا کو بھی خبر نہیں کہ جس چیز کو وہ میرے

خلاف بیان کرر ہے ہیں اور اسے لینن ازم کہہ رہے ہیں' وہ سطریں میری ہی تحریر کردہ ہیں۔

فن لینڈ کا ماحول اس کی پہاڑیاں' چناروں کے درخت' جھلیں' اس کی خزاں کی شفاف ہوا۔ اور اس کا سکون -- ایک مستقل انقلاب کی یاد دہانی کراتے رہے۔ ستمبر میں میں فن لینڈ کے زیادہ اندونی حصے میں چلا گیا اور وہاں جنگل میں ایک جھیل کے کنارے مکمل تنہائی میں ایک ہوٹل غا منیشن میں رہنے لگا جس کا نام ''رایوہا'' تھا۔ فنس زبان میں اس لفظ کا مطلب ''سکون'' ہے۔ یہ ہوٹل نما مینشن خزاں میں عام طور پر خالی رہتا تھا۔ میرے قیام کے آخری دنوں میں ایک سویڈش ادیب ایک انگریز ایکٹرس کے ساتھ اس منشن کے ایک حصے میں رہ رہا س تھا۔ وہ لوگ اپنا بل ادا کیے بغیر وہاں سے چلے گئے۔ ہوٹل کے مالک نے پلسنگ فورس تک اس کا تعاقب کیا۔ اسکی بیوی سخت بیمار تھی۔ اس کی سانس فقط شمپین پینے سے بحال رہتی تھی۔ مجھے وہ کبھی دکھائی نہ دی۔ شوہر کی عدم موجودگی میں وہ فوت ہوگئی۔ اس کی نعش میرے کمرے سے اوپر والے کمرے میں پڑی تھی۔ ہیڈ و پیٹر یلسنگ فورس تک اس کے شوہر کے پیچھے گیا۔ متوفیہ کی آخری رسومات کیلئے ایک نوعمر لڑکا رہ گیا تھا۔ پھر سخت برف باری ہونے لگی۔ چنار کے درختوں نے سفید چادر اوڑھ لی اور مینشن موت کی علامت نظر آنے لگا۔

لڑکا کہیں کچن میں تھا۔ مجھ سے ذرا اوپر ایک مردہ خاتون پڑی ہوئی تھی۔ میں بالکل اکیلا تھا۔ ''راہویا'' مکمل سکون کی تصویر بن چکا تھا۔ نہ کوئی آدمی نہ کوئی آواز ۔ میں لکھتا اور کمرے میں پھرتا رہا۔ شام کو ڈاکیہ کاغذوں کا ایک بنڈل لایا جو سینٹ پیٹرز برگ سے آیا تھا۔ میں ایک ایک کرکے کاغذوں کا دیکھنے لگا۔ یوں لگا جیسے ایک کھلی کھڑکی سے طوفان اندر داخل ہورہا تھا۔ ہڑتال ایک شہر سے دوسرے شہر تک پھیل رہی تھی۔ ہوٹل کی خاموشی میں کاغذوں کی سرسراہٹ برف کے تودے جیسی سرسراہٹ لگ رہی تھی۔ انقلاب اپنے پورے شباب پر تھا۔

میں نے لڑکے سے اپنا بل طلب کیا' گھوڑا گاڑی کیلئے کہا اور اپنا ''سکون'' تک

کرتو دے سے ملنے چل پڑا۔ اسی شام میں سینٹ پیٹرز برگ کے پولی ٹیک انسٹی ٹیوٹ کے بڑے ہال میں تقریر کر رہا تھا۔

1905ء کا سال

اکتوبر کی ہڑتال منصوبے کے مطابق کامیاب نہ ہوسکی۔ یہ چھاپہ خانوں سے شروع ہوئی اور پھر دب گئی۔ فیصلہ کن لڑائیوں کی منصوبہ بندی خونی اتوار (22 جنوری) کی سالگرہ پر کی گئی تھی۔ اس لئے میں کسی جلد بازی کے بغیر فن لینڈ کی پناہ گاہ میں اپنا کام کر رہا تھا۔ لیکن ایک اتفاقیہ ہڑتال نے دیکھتے ہی دیکھتے ریلوے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور وہ تیزی سے پھیلنے لگی۔ اسی سال دس اکتوبر کے بعد ہڑتال اپنے سیاسی نعروں کے ساتھ ماسکو سے سارے ملک میں پھیل گئی۔ اس سے پہلے کبھی ایسی عام ہڑتال دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ متعدد شہروں میں فوج کی جھڑپیں ہوئی تھیں۔ مجموعی طور پر اکتوبر کے واقعات سیاسی نوعیت ہی کے رہے اور انہوں نے مسلح شورش کی شکل اختیار نہ کی۔ بہرحال سرکشی کو قدرے ہوش آ گیا اور اس نے پسپائی اختیار کر لی۔ *17 اکتوبر کو آئینی مینی فیسٹو کا اعلان کر دیا گیا۔ طاقت اس وقت زخمی زاریت کے ہاتھ ہی میں تھی۔ وٹ کے الفاظ کے مطابق حکومتی پالیسی بزدلی

----

* یہ تاریخ جولین کیلنڈر کے مطابق ہے جو انقلاب سے پہلے روس میں رائج تھا۔ عام کیلنڈر کے مطابق یہ تاریخ 30 اکتوبر کو آتی ہے اور اس طرح سترہ دن کا فرق پڑ جاتا ہے۔

کور نظری اور حماقت کا مرکب تھی۔ اس کے باوجود انقلاب نے پہلی فتح حاصل کر لی۔

اسی وٹ نے بعد میں لکھا تھا۔ ''1905ء کے روسی انقلاب کا سب سے اہم حصہ کسانوں کا یہ نعرہ تھا ''ہمیں زمین دو'' وٹ مزید لکھتا ہے: ''میں محنت کشوں کی سوویٹ کو زیادہ اہمیت دیتا' اور نہ ہی اس کی کوئی اہمیت تھی۔'' اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نوکر

شاہی کا سب سے ذہین پرزہ بھی ان واقعات کی اہمیت نہ سمجھ سکا جو حکمران طبقے کیلئے آخری وارننگ تھے۔ وٹ محنت کشوں کی سوویٹوں کو سمجھنے اور اپنے نقطہ نظر پر نظر ثانی کرنے سے پہلے ہی بر وقت فوت ہو گیا۔

جب میں سینٹ پیٹرز برگ پہنچا تو ہڑتال اپنے عروج پر تھی۔ ہڑتال کی لہر دور تک پھیلتی جا رہی تھی۔ مگر خطرہ یہ تھا کہ اگر تحریک کو کسی مرکزی تنظیم نے کنٹرول نہ کیا تو یہ نتائج حاصل کئے بغیر بتدریج دم توڑ دے گی۔ میں فن لینڈ سے یہ منصوبہ لے کر آیا تھا کہ ایک ایسی منتخب غیر جماعتی تنظیم ہونی چاہیے جس کا ہر مندوب ایک ہزار محنت کشوں کی نمائندگی کرے۔ اور دنسکی نامی ایک ادیب سے (جو بعد میں اٹلی میں سوویٹ سفیر بنا) مجھے اپنی آں دوالے دن معلوم ہوا کہ منشویکوں نے پہلے ہی ایک منتخب انقلابی تنظیم کا نعرہ بلند کر دیا تھا جس کے ہر رکن نے پانچ سو لوگوں کی نمائندگی کرنی تھی۔ یہ ایک بالکل درست اقدام تھا۔ بالشویک مرکزی کمیٹی کی جو ڈلی تنظیم اس وقت سینٹ پیٹرز برگ میں تھی وہ اس بنیاد پر کسی منتخب غیر جماعتی تنظیم کی مخالفت کر رہی تھی کہ کہیں اس کا پارٹی سے مقابلہ نہ ہو جائے۔ لیکن بالشویک محنت کشوں کو ایسا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ سوویٹ کی طرف بالشویک راہنماؤں کا فرقہ وارانہ رویہ لینن کے نومبر میں آنے تک برقرار رہا۔

لینن کے بغیر لینن کے ماننے والوں کی قیادت پر ایک ہدایاتی باب تحریر کیا جا سکتا ہے۔ لینن کی موجودگی میں اس کے شاگرد اس بات کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے تھے کہ نظریاتی اور فنی مسائل کو خود آزادانہ طور پر حل کریں۔ جب وہ کسی نازک لمحے میں لینن سے دور ہوتے تو بے بسی کی حالت میں ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھتے رہے۔ 1905ء کے موسم خزاں اور پھر 1917ء کے موسم بہار میں ان کی یہی حالت تھی۔ ان دونوں موقعوں پر اور ان کے علاوہ تاریخی طور پر دوسرے کم اہمیت کے مواقع پر بھی پارٹی کے نیم راہنماوں کی نست کا رکن زیادہ دانش مندی اور راہنمائی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ پہلے انقلاب کے موقع پر بالشویک پارٹی کی طرف سے بہتر کارکردگی نہ کرنے کی ایک بڑی وجہ لینن کی آمد میں تاخیر تھی۔

یہ ذکر میں پہلے بھی کر چکا ہوں کہ یوم مئی پر جنگل میں ہونے والے اجلاس پر پولیس نے چھاپہ مار کراین' آ ئی' سیدوفا کو گرفتار کرلیا تھا۔اس نے چھ ماہ قید میں کاٹے۔ پھر اسے تیور بھیج دیا گیا جہاں وہ پولیس کی نگرانی میں رہتی تھی۔اکتوبر مینی فیسٹو کے عدوہ سینٹ پیٹرز برگ واپس آ گئی۔ہم نے مڑاور مسز وکنتیف کے نام سے ایک کمرہ کرائے پر لے لیا جس کا مالک اسٹاک ایکسچینج پر جوا کھیلتا تھا۔سٹاک مارکیٹ میں مندا چل رہا تھا۔کمروں میں پیش گوئیاں ہوتی رہتی تھیں۔اخبار والالڑکا ہمارے لئے ہر صبح سارے اخبار لے کر آ تا تھا۔ میرا مالک مکان میری بیوی سے اخبار ادھار لے کر پڑھتا تھااور پھر اپنے دانت پیسنے لگتا تھا۔اس کے حالات مستقل طور پر خراب ہو رہے تھے ایک دنوہ ہمارے کمرے میں اخبار زور زور سے لہراتا ہوا داخل ہوااور بولا۔''وہ مجھے پکڑنے چوکیدار تک پہنچ گئے ہیں۔اگرانہوں نے مجھ پر ہاتھ ڈالا تو میں انہیں گولی ماردوں گا۔'' پھراس نے جیب سے گن نکالی اور سے ہوا میں لہرانے لگا۔وہ پاگل دکھائی دے رہا تھا۔اسے ہمدری کی ضرورت تھی۔میری بیوی یہ پریشان کن خبر لے کر میرے اخبار کے دفتر میں آ ئی ہم نے سوچا کہ ہمیں اپنا کمرہ لینا چاہیے۔لیکن ہمارے پاس وقت بالکل نہیں تھا۔لہذا ہم نے ہر بات قسمت پر چھوڑ دی۔ہم اپنی گرفتارتک اس پریشان حال سٹے باز کے پاس ہی رہے۔خوش قسمتی سے نہ تو اسے اور نہ ہی پولیس کو معلوم ہو سکا کہ وکنتیف کون تھے۔گرفتاری کے بعد بھی ہمارے کمرے کی تلاشی نہ لی گئی۔

سوویٹ میں میں اپنے رہائشی گاؤں کے نام سے یانوفسکی کہہ کر بلایا جاتا تھا۔ اخبارات میں میرا نام ٹراٹسکی تھا۔ مجھے تین اخباروں کے لئے کام کرنا پڑتا تھا۔ پروس کے ساتھ میں نے گم نام''روسی گزٹ'' میں کام شروع کیا اور پھر اسے عوام کا لڑاکا ہتھیار بنا دیا۔ چند دنوں میں اخبار کی اشاعت تیس ہزار سے ایک لاکھ تک پہنچ گئی۔ چند ماہ بعد یہ پانچ لاکھ کی حد عبور کرگئی۔لیکن ہمارے فنی ذرائع اخبار کا ساتھ نہ دے سکے۔ آخر حکومت کے چھاپے نے ہمیں ہماری مشکلات سے نجات دلا دی۔

13 نومبر کو ہم نے منشویک کے تعاون سے ایک بڑا سیاسی اخبار''نچالو'

(آغاز) نکالا۔اخبار کی اشاعت دن دگنی اور رات چوگنی بڑھ رہی تھی۔لینن کے بغیر بالشویکوں کا اخبار''نوایا ژین''(نئی زندگی) گھٹ رہا تھا۔اسکے برعکس''نچالو'' بہت بڑی کامیابی دکھا رہا تھا۔میرے خیال میں یہ اخبار گذشتہ نصف صدی کے اخباروں میں مارکس کے اخبار''ری ان چی ژیتونگ'' سے مشابہت رکھتا تھا جو 1848ء میں نکالا گیا تھا۔''نوایا ژین'' کے ایڈیٹر کامینوف نے بعد میں مجھے بتایا کہ وہ کس طرح ٹرین میں سفر کرتے وقت مختلف سٹیشنوں پر اخبارات کی فروخت کا جائزہ لیا کرتا تھا۔سینٹ پیٹرز برگ کے سٹیشن پر مسافروں کی قطاریں لگی ہوتی تھیں۔ہر کوئی ''نچالو'' ''نچالو'' کا مطالبہ کر رہا ہوتا تھا۔اس کے بعد''نوایا ژین''اور پھر''نچالو''''نچالو''۔

''پھر میں نے دکھ کے ایک احساس کے ساتھ اپنے آپ سے کہا۔'' کامینوف !مان لو کہ''نچالو''والے تم سے بہتر لکھتے ہیں۔''

''روسی گزٹ''اور''نچالو'' کے علاوہ میں''اژوستیا(خبر) کیلئے اداریہ بھی لکھتا تھا۔یہ سرکاری سوویت اخبار تھا۔پھر مجھے ان گنت درخواستیں، مینی فیسٹو اور قراردادیں بھی تحریر کرنی پڑتی تھیں۔سوویٹ کے قیام کے پہلے باون دن کام سے بے حد بدلے ہوئے تھے۔سوویٹ، ایگزیکٹو کمیٹی، اخبارات، بس کام ہی کام تھا۔ہم اس بھنور میں کس طرح زندہ تھے، مجھے آج تک سمجھ نہیں آ سکی۔مگر ماضی کا بڑا حصہ سمجھ سے بالاتر ہے کیونکہ اسے دوبارہ یاد کرنے سے ہم اپنی سرگرمی کھو بیٹھتے ہیں۔ہم خود پر باہر کھڑے ہو کر نگاہ ڈالتے ہیں۔ہمیں کام میں کچھ پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ہم اپنے بھنور خود تخلیق کرتے تھے۔ہمیں جلدی ہوتی تھی۔جلدی میں بعض کام بگڑ جاتے اور بعض اچھے بھی ہو جاتے تھے۔ہمارا نگران ایڈیٹر ڈاکٹر ڈی، ایم، ہرٹ زن سٹین کبھی کبھی''نچالو'' کے دفتر میں آ جاتا۔اس نے پرنس البرٹ جیسا شاندار کوٹ زیب تن کیا ہوتا۔وہ کمرے کے وسط میں کھڑا ہماری افراتفری کو بڑے پیار سے دیکھتا رہتا۔ایک سال بعد اسے عدالت کے کٹہرے میں اس الزام کا جواب دینے کیلئے کھڑا ہونا پڑا کہ وہ ایک انقلابی اخبار میں شائع ہونے والی غم وغصہ سے بھری خبریں اور مضامین کنٹرول کیوں نہیں کر سکا تھا۔اس

اخبار پر اس کا کوئی اثر نہیں تھا۔ بوڑھے آدمی نے ہمارے خلاف کچھ نہ کہا۔اس کے برعکس اس نے عدالے کو بتایا کہ ہم کس قسم کا گھٹیا کھانا کھا کر جو چوکیدار ہمارے لئے قریبی بیکری سے لایا کرتا تھا۔اخبار کا کام کرتے رہتے تھے۔ بچارے بڑھے کو ایک سال قید بھگتنی پڑی کیونکہ انقلاب ناکام ہو گیا تھا۔

وٹ نے اپنی یادداشتوں میں لکھا تھا کہ ''1905ء میں لوگوں کی اکثریت پاگل ہو گئی تھی۔'' ایک قدامت پسند آدمی کو انقلاب اس لئے ایک ''مجموعی پاگل پن'' لگتا ہے کیونکہ یہ سماجی تضادات کے عام نوعیت کے پاگل پن کو حد سے زیادہ بڑھا کر اس میں ایک تناؤ پیدا کر دیتا ہے' جیسے لوگ اپنا خراب ''کیری کچر'' دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ اس کے باوجود جب تضادات بہت زیادہ بڑھ جاتے ہیں اور ناقابل برداشت ہو جاتے ہیں تو ایسی صورتحال پیدا ہو جاتی ہے جس میں لوگ پاگل ہو جاتے ہیں۔لیکن ایسی حالتوں میں پاگل اکثریت سمجھدار اقلیت کا ناطقہ بند کر دیتی ہے۔تاریخ کا پہیہ اس طرح چلتا رہتا ہے۔

انقلابی ریلا زلزلے یا سیلاب جیسا نہیں ہوتا۔انقلاب کی افراتفری میں ایک نیا نظام ایک دم جنم لینے لگتا ہے۔آدمی اور اس کے خیالات نیا لباس پہننے لگتے ہیں۔انقلاب ان لوگوں کو پاگل پن لگتا ہے جنہیں وہ سوکھے پتوں کی طرح پرے پھینک دیتا ہے۔ ہمارے لئے یہ ایک مختلف چیز تھی۔ہم اپنے پورے عناصر میں تھے' سراپا طوفان۔ ہر چیز نے ایک وقت اور جگہ حاصل کر لی تھی۔ ہم میں سے بہت اپنی ذاتی زندگی گزارنے لگے تھے' بعض محبت کرنے لگے تھے اور بعض نئے دوست بنا کر انقلابی تھیٹر دیکھنے جاتے تھے۔مثال کے طور پر پروس ایک طنزیہ ڈرامے سے اس قدر متاثر ہوا تھا کہ اس نے پچاس ٹکٹیں خرید کر اپنے احباب کو مدعو کر لیا (بتا تا چلوں کہ اس سے ایک دن پہلے اسے اپنی کتابوں کے پیسے ملے تھے) جب وہ گرفتار ہوا تو پولیس نے اس کی جیب سے وہ ٹکٹ برآمد کر لیے۔ یہ بات بات پولیس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ ایک انقلابی کا تھیٹر سے کیا تعلق ہو سکتا تھا اور اتنے سارے ٹکٹ اس نے کیا کرنے تھے۔ یہ

معلوم نہیں تھا کہ پروس ہر کام وسیع پیمانے پر کرتا تھا۔

سوویٹ عوام کی اکثریت کو بیدار کر دیا۔ محنت کشوں نے اسے پسند کیا۔ دیہی علاقوں میں گڑ بڑ جاری تھی۔ پورٹ ماؤتھ کے امن کے بعد فوج مشرق بعید سے واپس آ رہی تھی اور اس کے اندر بھی گڑ بڑ تھی۔ لیکن گارڈز اور کوسک رجمنٹ اپنی جگہ مضبوطی سے کھڑے تھے۔ انقلاب کو کامیاب بنانے والے تمام عناصر موجود تو تھے مگر وہ پوری طرح پروان نہیں چڑھے تھے۔

مینی فسٹو کے نفاذ کے ایک دن بعد 18 اکتوبر کو دس لاکھ لوگ اپنی پہلی فتح کے نشے میں مدہوش سینٹ پیٹرز برگ یونیورسٹی کے سامنے کھڑے تھے۔ میں بالکونی میں کھڑا انہیں بتا رہا تھا کہ وہ اپنی غیر مکمل فتح پر اس قدر شور نہ مچائیں۔ دشمن ہوشیار تھا اور وہ پھندا لگائے بیٹھا تھا۔ میں نے زار سے کا دستور پھاڑ کر ہوا میں بکھیر دیا۔ لیکن اس قسم کی سیاسی تنبیہہ کا عوام پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ بڑے واقعات کیلئے عوام کی تربیت ضروری ہے۔

اس سلسلے میں مجھے سینٹ پیٹرز برگ سوویٹ کے دو واقعات یاد ہیں۔ ایک واقعہ 29 اکتوبر کا ہے جب ''بلیک ہنڈرڈ'' کے پروگرام کے متعلق شہر افواہوں سے بھرا ہوا تھا۔ مندوبین اپنی ورک شاپوں سے سیدھے اجلاس میں آئے اور ان ہتھیاروں کے نمونے دکھائے جو ان کے ورکرز بلیک ہنڈرڈ کے خلاف کر رہے تھے۔ وہ اپنے چاقو اور دوسرے ہتھیار ہوا میں لہرا رہے تھے۔ ایسا وہ سنجیدگی سے نہیں بلکہ مذاق کے طور پر کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کی دشمن کے خلاف تیاری مسئلے کو حل کر دے گی۔ ان کی اکثریت کو معلوم نہیں تھا کہ یہ زندگی اور موت کا سوال تھا۔ یہ بات انہوں نے دسمبر میں سیکھی۔

3 دسمبر کو شام کو سینٹ پیٹرز برگ سوویٹ کو فوج نے گھیر لیا۔ آنے جانے کے تمام راستے بند ہو گئے۔ میں نے بالکونی سے جہاں مجلس عاملہ کا اجلاس ہو رہا تھا' ہال میں جمع ہونے والے سینکڑوں مندوبین سے کہا۔ ''مزاحمت مت کرو مگر انہیں اپنے ہتھیار بھی نہ

دو۔''ان کے پاس ریوالور تھے۔''انہوں نے فوج کے نرغے میں آئے ہوئے ہال میں اپنے ہتھیار توڑنے شروع کر دیے۔ اب اس عمل میں 29 اکتوبر والا کوئی مذاق نہیں تھا۔ انہیں محسوس ہورہا تھا کہ دشمن کو کچلنے اور مار بھگانے کیلئے زیادہ بڑي اور بے رحم اقدام کی ضرورت تھی۔

اکتوبر ہڑتال کی جزوی کامیابی میرے لئے بڑی زبردست نظریاتی اور سیاسی اہمیت رکھتی تھی۔ یہ میرے نزدیک آزاد خیال بورژوازی کی مخلافت نہیں تھی۔ نہ ہی کسانوں کی شورش یا دانش وروں کا دہشت گردی کا کوئی فعل تھا۔ کسانوں کی اس ہڑتال نے زاریت کو پہلی دفعہ اس کے گھٹنوں پر جھکا دیا تھا۔ پرولتاریہ ایک ناقابل تردید حقیقت کے روپ میں سامنے آئی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ مستقبل انقلاب کا نظریہ اپنے پہلے امتحان میں کامیاب ثابت ہوا تھا۔ انقلاب پرولتاریہ کے سامنے اقتدار پر قابض ہونے کے امکانات کھول رہا تھا۔ بعد کے ردعمل کے برف بھی مجھے اپنی جگہ سے ہلانے میں ناکام رہے۔ اسی جگہ سے میں نے مغرب کے متعلق بھی نتائج اخذ کیے۔ اگر روس کی پرولتاریہ اتنی زبردست ہوسکتی ہے تو مغرب کے زیادہ ترقی یافتہ ممالک کی پرولتاریہ کی انقلابی طاقت کس قدر خوفناک بن سکتی تھی۔

میں جس بے احتیاطی اور بے سلیقگی سے لکھتا ہوں جو میرا خاص انداز ہے' اس کا ذکر کرتے ہوئے لوناچرسکی نے میرا انقلابی نظریے کو کچھ اس قسم کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔''1905ء میں کامریڈ ٹراٹسکی کا خیال تھا کہ دونوں انقلاب (بورژوا اور سوشلسٹ) اگرچہ ایک دوسرے سے مطابقت نہیں رکھتے مگر آپس میں یوں بندھے ہوئے ہیں کہ وہ مستقل انقلاب بن جاتے ہیں۔ جب دونوں انقلاب بورژوا سیاسی انقلاب کے ذریعے سے ایک انقلابی عہد میں داخل ہو جاتے ہیں تو روس باقی دنیا کے ہمراہ اس عہد سے گزرے بغیر بچ نہیں سکے گا جب تک کہ سماجی انقلاب مکمل نہ ہو جائے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ نظریہ قائم کرنے میں کامریڈ ٹراٹسکی نے بڑی دور بینی اور وسعت نظر کا ثبوت دیا ہے' اگرچہ اس میں اس نے پندرہ برس کی غلطی کر دیا

ہے۔''

میری پندرہ برس کی غلطی جسے بعد میں ریڈک نے بھی دہرایا ہے' کسی حقیقت کا درجہ نہیں رکھتی۔ ہمارے 1905ء کے سارے اندازوں اور نعروں کی بنیاد شکست کی بجائے فتح مند انقلاب کا مفروضہ تھا۔ ہم کچھ بھی حاصل نہیں کر سکے۔ نہ جمہوریہ' نہ زمین اور نہ ہی کام کرنے کے آٹھ گھنٹے۔ کیا ہم نے یہ مطالبہ پیش کرنے میں تاخیر یا غلطی کی تھی؟ انقلاب کی شکست نے تمام امکانات پر سیاہی پھیر دی۔ ان میں میرے نظریے بھی شامل تھے۔ سوال انقلاب کی تاریخ مقرر کرنے کا نہیں بلکہ اس کی داخلی طاقتوں اور مجموعی ترقی اور بڑھنے کا تھا۔

1905ء کے انقلاب کے دوران میں میرے اور لینن کے تعلقات کیسے تھے؟ اس کی موت کے بعد سرکاری طور پر تحریر کردہ تاریخ پر نظر ثانی کی گئی ہے (اس میں 1905ء کا سال بھی شامل ہے) اور اچھی اور بری طاقتوں کے مابین ایک جدوجہد اب بھی جاری ہے۔ حقائق کیا تھے؟ لینن نے سوویٹ کے کام میں کبھی سرگرم حصہ نہیں لیا تھا اور نہ ہی اس نے وہاں کبھی کوئی تقریر وغیرہ کی تھی۔ وہ اس کے ہر کام کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ وہ بالشویک نمائندوں ذریعے اس کی پالیسیوں پر اثر انداز ہوتا تھا اور اپنے اخبار میں ان پر تبصرہ کرتا رہتا تھا۔ وہ سوویٹ کی حکمت عملیوں سے کہیں بھی غیر متفق نہیں تھا۔ دستاویزات گواہ ہیں کہ چند ایک غیر اہم فیصلوں کو چھوڑ کر سوویٹ کے تمام فیصلوں میں میرا ہاتھ ہوتا تھا۔ میں پہلے انہیں مجلس عاملہ کے سامنے پیش کرتا اور بعد میں انہیں سوویٹ کے سامنے رکھا جاتا تھا۔ جب بالشویک اور منشویک کے نمائندوں پر مشتمل وفاقی کمیشن قائم کیا گیا تو پھر بھی میں اس کے نمائندے کے طور پر مجلس عاملہ کے سامنے پیش ہوا۔ اس سلسلے میں کبھی کوئی تصادم نہیں ہوا تھا۔

میری فن لینڈ سے واپسی سے پہلے ہی سوویٹ کا پہلا صدر چن لیا گیا تھا۔ وہ خرستالوف نامی ایک جوان وکیل تھا' حادثاتی طور پر انقلاب میں داخل ہونے والا یہ شخص جو پادری گوپان اور سوشل ڈیموکریسی کے درمیانے عرصے کی نمائندگی کرتا تھا۔

خرستالوف صدر تو بن گیا مگر اس کی کوئی سیاسی قیادت نہیں تھی۔ اس کی گرفتاری کے بعد ایک ''پریذیڈیم'' چنا گیا جس کا سربراہ میں تھا۔ سوویٹ کا ایک نمایاں رکن سورچوف اپنی یادداشتوں میں لکھتا ہے۔ ''سوویٹ کا فکری راہنما ایل' ڈی' ٹراٹسکی تھا۔ سوویٹ کا صدر نوسار خرستالوف فقط دکھاوے کا صدر تھا۔ کیونکہ وہ بذات خود ایک مسئلہ حل کرنے کے قابل بھی نہیں تھا۔ وہ اپنے بیماری کی حد تک بڑے ہوئے غرور اور تکبر کے ساتھ ٹراٹسکی سے نفرت کرتا تھا کیونکہ اس سے ہر قسم کا مشورہ طلب کیا جاتا تھا۔ مجھے یاد ہے کسی نے لینن کی موجودگی میں کہا تھا کہ خرستالوف کا ستارہ غروب ہو رہا ہے۔ آج سوویٹ میں ٹراٹسکی ایک طاقت ور آدمی ہے۔ ایک لمحے کیلئے لینن کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ پھر وہ بولا۔ ''ٹراٹسکی نے یہ مقام ان تھک محنت سے حاصل کیا ہے۔''

دونوں اخباروں کے مدیروں کے تعلقات بڑے دوستانہ تھے۔ وہ ایک دوسرے کی بدخوئی نہیں کرتے تھے۔ بالشویک اخبار ''نویازون زین'' نے لکھا۔ ''نچالو کا پہلا شمارہ نکل آیا۔ اس جدوجہد میں ہم ایک کامریڈ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ پہلے شمارے کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کامریڈ ٹراٹسکی نے اکتوبر ہڑتال کے متعلق بڑے شاندار طریقے سے لکھا ہے۔'' جب لوگ ایک دوسرے سے لڑ رہے ہوں تو وہ اس طرح نہیں لکھا کرتے۔ لیکن ہماری کوئی لڑائی نہیں تھی۔ اس کے برعکس دونوں اخبار بورژوا تنقید کے خلاف ایک دوسرے کو تحفظ دیتے تھے۔ لینن کی آمد کے بعد بھی ''نویازون زین'' نے مستقل انقلاب کے متعلق میرے مضمون کا دفاع کیا۔ دونوں اخبار پارٹی کے دونوں فریقوں کی طرح پارٹی میں اتحاد کے حق میں تھے۔ لینن کی صدارت میں بالشویکوں کی مرکزی کمیٹی نے متفقہ طور پر یہ قرارداد منظور کی کہ پھوٹ کی بڑی وجہ جلاوطنی کے حالات تھے اور انقلاب کے واقعات نے کسی بھی جدوجہد کے جواز سے محروم نہیں رکھا۔ میں نے اس استدلال کا ''نچالو'' میں دفاع کیا' حالانکہ مارٹوف نے تھوڑی سے مزاحمت کی تھی۔

عوام کے دباؤ کے تحت سوویٹ میں موجود منشویکوں نے اس کے پہلے دور میں

بائیں بازو کے ساتھ ہر ممکن تعاون کی حکمت عملی اپنائے رکھی۔لیکن ردعمل کی پہلی چوٹ سے ان کے موقف میں تبدیلی آ گئی۔فروری 1906ء میں منشویکوں کے راہنما مارٹوف نے ایکسل راڈ کو ایک خط میں شکایت کی۔''دو ماہ پہلے میں نے جو مضمون شروع کیے تھے انہیں اب تک مکمل نہیں کر سکا۔یہ اعصابی پریشانی یا ذہنی تھکاوٹ کا نتیجہ ہوسکتا ہے۔بہرحال میں اپنے خیالات کو مجتمع نہیں کرسکتا۔''مارٹوف کو معلوم نہیں تھا کہ وہ اپنی بیماری کو کیا نام دے۔مگر اس کا نام یقینی طور پر ہے اور وہ ہے ''منشویزم''۔انقلاب کی جدوجہد میں موقع پرستی کا دوسرا نام تذبذب اور خیالات کو مجتمع نہ کرسکنے کی نااہلیت ہے۔

جب منشویک اپنے کیے پر کھلم کھلا افسوس کا اظہار اور سوویٹ کی پالیسی پر تنقید کر رہے تھے تو اس وقت بھی میں روسی پریس اور جرمن اخبارت کے علاوہ روزا لکسمبرگ کے میگزین میں اس کا دفاع کر رہا تھا۔1905ء میں جو کچھ ہوا تھا اس پر میں نے''روسی انقلاب کی زد میں''کے نام سے ایک کتاب لکھی جو بعد میں متعدد ممالک میں''1905ء''کے نام سے دوبارہ شائع ہوئی۔اکتوبر انقلاب کے بعد یہ کتاب روس میں ہی نہیں بلکہ مغرب کی دوسری کمیونسٹ پارٹیوں میں بھی سرکاری طور پر ایک نصابی کتاب کی حیثیت اختیار کر گئی۔لینن کی موت کے بعد ایک منظم طریقے سے تیار کردہ تحریک کے تحت میری اس کتاب پر سخت نکتہ چینی ہونے لگی۔ابتدا میں چھوٹے موٹے جملے کسے جانے لگے۔پھر بتدریج جرات مندانہ انداز میں تنقید ہونے لگی۔پھر اپنی خامیاں اور غلطیاں چھپانے کی خاطر ایک طوفان بدتمیزی کھڑا کر دیا گیا۔اور یوں 1905ء کے انقلاب کے دوران لینن اور ٹراٹسکی کی پالیسیوں اور جدوجہد کا تمسخرہ اڑایا گیا۔

1905ء کے انقلاب نے ملک' پارٹی اور میری اپنی زندگی میں ایک اتھل پتھل پیدا کر دی۔مگر یہ اتھل پتھل مجھے ایک بڑی پختگی کی طرف لے گئی۔نکولاثیف میں میرا پہلا انقلابی کام ایک دیہاتی نوعیت کا ابتدائی تجزیہ تھا۔لیکن یہ تجربہ اپنا نشان چھوڑ

گیا۔نکولا ئیف میں مجھے جس قدر سادہ لوح ورکرز ملے تھے' مجھے بعد کی زندگی میں کبھی نصیب نہ ہو سکے۔اس وقت میرا کوئی نام نہیں تھا اور ہمارے درمیان کوئی نہیں تھا۔روسی پرولتاریہ کی وہ قسم میرے شعور پر ہمیشہ کیلئے اپنے نقوش چھوڑ گئی۔جیل میں مجھے اپنی انقلابی تسلیم دوبارہ نئے سرے سے شروع کرنی پڑی قید کے اڑھائی سال اور سائبیریا میں جلاوطنی کے دو برسوں نے زندگی کے انقلابی نقطہ نظر کے متعلق میری نظریاتی بنیاد رکھ دی۔ میرا پہلا غیر ملکی قیام میری سیاسی تعلیم کیلئے سکول ثابت ہوا۔نامور مارکسی انقلابیوں کی راہنمائی میں میں وسیع تاریخی تناظر اور بین الاقوامی رابطوں کے ذریعے واقعات کو سمجھنے لگا۔اپنے غیر ملکی قیام کے اختتام کے نزدیک میں نے بالشویک اور منشویک فریقوں سے علیحدگی اختیار کر لی۔فروری 1905ء میں میں روس واپس آ گیا۔دوسرے مہاجر راہنما نومبر دسمبر تک واپس نہ آئے۔روس میں کوئی ایسا کامریڈ نہیں تھا جس سے میں کچھ سیکھ سکتا۔اس کے برعکس مجھے وہاں ایک استاد کی حیثیت اختیار کرنی پڑتی۔طوفانی برسوں کے واقعات ایک دوسرے کے پیچھے قطار باندھے آ رہے تھے۔ان کے درمیان اپنی جگہ بنانے کی ضرورت تھی۔ابھی ایک اعلان کی سیاہی خشک بھی نہیں ہوتی تھی کہ دوسرے کو زیر زمین پرنٹنگ پریس میں اشاعت کیلئے بھیج دیا جاتا تھا۔جیل اور جلاوطنی میں وضع کئے گئے نظریوں اور ملک سے باہر تیار کیے گئے سیاسی طریقوں کو پہلی مرتبہ جنگ میں آزمانے کا موقع آ گیا تھا۔میں واقعات کو دیکھ کر پراعتماد تھا۔اوران کے داخلی طریقہ کار کو سمجھتا تھا یا میرا یہ دعوی تھا کہ اس دعوی پر یقین تھا۔کارکنوں کے ذہنوں پر ان کا کیا اثر ہونا تھا وہ بھی مجھے دکھائی دے رہا تھا۔فروری سے اکتوبر تک ان واقعات میں میری شمولیت بڑی حد تک ادبی نوعیت کی تھی۔اکتوبر میں میں اس بڑے بھنور میں سر کے بل کود پڑا۔جو میرے خیال میں میر طاقتوں کا سب سے بڑا امتحان تھا۔آگ میں رہتے ہوئے فیصلے کرنے تھے۔مگر وہ فیصلے بڑی آسانی سے میرے ذہن میں آ گئے۔میں نے مڑ کر بالکل نہ دیکھا کہ دوسرے کیا کہیں گے۔کسی سے مشورہ کرنے کا میرے پاس وقت ہی نہیں تھا۔مجھے ہر کام جلدی میں کرنا تھا۔بعد

میں مجھے اس بات پر بے حد حیرت ہوئی کہ واقعات نے کس طرح منشویک کے سب سے آچالاک اور ہوشیار آدمی مارٹوف کو بے خبری میں دبوچ کر ایک پریشانی اور ابتری میں ڈال دیا تھا۔ایسی باتوں پر دھیان دیے بغیر ذاتی تجزیے کیلئے بہت تھوڑا وقت رہ گیا تھا۔ مجھے باقاعدہ احساس ہوا کہ اب میرے سیکھنے کا وقت ختم ہو گیا تھا۔مگر اس حوالے سے نہیں کہ میں نے سیکھنا بند کر دیا تھا۔انسان ساری زندگی سیکھتا رہتا ہے۔اب میں نے ایک شاگرد کی طرح نہیں بلکہ ایک استاد کی طرح سیکھنا شروع کیا تھا۔اپنی دوسری گرفتاری کے وقت میں چھبیس برس کا تھا۔میری پختگی کا ثبوت دوشچ نے دیا جس نے مجھے''نوجوان'' کہنے کی بجائے مجھے میرے پورے نام سے بلایا۔

لوناچرسکی نے اپنی کتاب''نیم سرخ سایۂ'' جس پر بعد میں پابندی عائد ہو گئی تھی، میں اس کردار کا حوالہ مندرجہ ذیل الفاظ میں دیا ہے جو پہلے انقلاب کے راہنماؤں نے ادا کیا تھا:

''سینٹ پیٹرز برگ کی پرولتاریہ میں س کی (ٹراٹسکی) کی ہر دل عزیزی اس کی گرفتاری کے وقت بہت بڑھ چکی تھی۔عدالت میں مقدمے کے دوران میں اس کے طرز سلوک نے اس ہر دل عزیزی میں اضافہ کر دیا تھا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باق نہیں ہے کہ 6-1905ء کے راہماؤں میں ٹراٹسکی اپنی نوعمری کے باوجود بلاشبہ سب سے زیادہ پختہ راہنما تھا۔اس کا مہاجرانہ حلیہ بھی اس کیلئے کسی خامی کا باعث نہیں تھا جیسا کہ لینن کے سلسلے میں تھا۔وہ دوسروں کی نسبت بہتر طور پر جانتا تھا کہ ریاستی جدوجہد کیا ہوتی ہے۔وہ زیادہ مقبولیت کے ساتھ انقلاب کی بھٹی سے باہر نکلا۔لینن اور مارٹوف کو بھی ایسی مقبولیت عام حاصل نہ ہوسکی۔پلیخانوف اپنے نیم آزادانہ رجحانات کے سبب اپنی بہت سی ساکھ کھو بیٹھا۔لیکن ٹراٹسکی صف اول میں داخل ہو گیا۔''

یہ سطور جو 1923ء میں لکھی گئی تھیں آج ان کی اہمیت پہلے سے زیادہ ہے کیونکہ لوناچرسکی اب ان سطور کے بالکل مخالف لکھ رہا تھا۔

کوئی عظیم کام وجدان کے بغیر نہیں ہوتا۔یعنی اس لاشعوری جس کے بغیر جو اگرچہ

نظریاتی اور عملی کام سے پروان چڑھتی رہتی ہے مگر فرد کی فطرت میں پوری طرح جڑ پکڑے ہوئے ہوتی ہے۔ نہ ہی نظریاتی تعلیم اور عملی روزمرہ اس سیاسی بصیرت کی جگہ لے سکتا ہے جو کسی انسان کو کوئی صورتحال سمجھنے، اسے پرکھنے اور مستقبل میں جھانکنے والی آنکھ عطا کرتی ہے۔ فطرت کا یہ تحفہ اچانک ردوبدل اور اتھل پتھل کے مواقع پر فیصلہ کن اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔ یعنی انقلاب کے موقع پر۔ میرا یقین ہے کہ 1905ء کے واقعات نے اس انقلابی وجدان کو مجھ پر منکشف کیا اور مجھے اس قابل بنایا کہ بعد کی زندگی میں اس کی پریقین حمایت پر بھروسہ کرسکوں۔ یہاں میں یہ اضافہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے جو غلطیاں کیں، خواہ کتنی ہی فاش تھیں، اور ان میں واقعی بعض بہت فاش تھیں، ان کا تعلق ان مسائل سے نہیں تھا جو بنیادی یا صربی نوعیت کے تھے بلکہ تنظیم اور پالیسی جیسے قابل اخراج معاملات سے تھے۔ اپنی پوری شعوری حالت میں میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مجموعی طور پر میں کسی سیاسی صورتحال اور اس کے انقلابی تناظر میں کبھی کسی سنجیدہ غلطی کا مرتکب نہیں ہوا۔

روسی زندگی میں 1905ء کا انقلاب 1917ء کے انقلاب کی ایک ڈریس ریہرسل تھی۔ میری ذاتی زندگی میں بھی اس کی یہی اہمیت تھی۔ میں نے 1917ء کے واقعات میں پکے ارادے اور اعتماد سے حصہ لیا کیونکہ وہ اس جاری تبدیلی اور انقلابی سرگرمی کا حصہ تھے جو تین دسمبر 1905ء کو سینٹ پیٹرز و برگ کے گھیراؤ سے شروع ہوئی تھی۔

میری گرفتاری اس دن کے ایک دن بعد ہوئی جب ہم نے مالی مینی فسٹو شائع کیا تھا اور جس میں اعلان کیا گیا تھا کہ زار حکومت کا مالی دیوالیہ پن ناگزیر تھا۔ اس کے ساتھ یہ اعلان بھی کیا گیا تھا کہ رومانوف حکومت جو قرضے لے گی انہیں فتح مند قوم تسلیم نہیں کرے گی۔ سوویٹ آف ورکرز ڈیلی گیٹز کے مینی فسٹو میں تحریر کیا گیا تھا ''نوکرشاہی کبھی عوام کا اعتماد حاصل نہیں کرسکی۔ اور نہ ہی عوام نے اسے کبھی کوئی اختیار دیا ہے۔ لہذا ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ عوام کے خلاف لڑی جانے والی جنگ میں استعمال ہونے والے زار

حکومت کے قرضوں کی کوئی ادائیگی نہیں کی جائے گی۔''

چند ماہ بعد فرانس کی وزارت خزانہ نے ہمارے مینی فیسٹو کا یہ جواب دیا کہ اس نے روس کو پون ملین فرانک کا نیا قرضہ دے دیا۔ آزاد خیال اور رجعتی اخبارات نے اس دھمکی کا بڑے طنزیہ انداز میں ذکر کیا جو سوویٹ کی طرف زار حکومت اور یورپی بینکوں کو دی گئی تھی۔ بعد کے برسوں میں اس مینی فیسٹو کو بڑی کامیابی سے ذہنوں سے نکال دیا گیا۔ مگر یہ کبھی کبھی اپنی یاددہانی کراتا رہا۔ زار حکومت کا دیوالیہ پن اور فوجی انہدام ایک ساتھ وقوع پذیر ہوئے۔ انقلاب کی کامیابی کے بعد دس فروری 1918ء کو زار حکومت کی طرف سے لیے گئے تمام قرضے منسوخ قرار دے دیے گئے۔ یہ کہنا غلط ہے جیسا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اکتوبر انقلاب کسی قسم کی کوئی ذمہ داری تسلیم نہیں کرتا۔ انقلاب اپنی ذمہ داریاں پوری طرح قبول کرتا ہے۔ اس نے دو دسمبر 1905ء کو جو ذمہ داری قبول کی تھی اسے دس فروری 1917ء تک نبھایا۔ یہ انقلاب زار کے قرض خواہوں کو یہ بتانے کا پورا حق رکھتا ہے۔ شریف لوگو! ہم نے تو آپ کو پہلے ہی خبردار کر دیا تھا۔''

1905ء ایک لحاظ سے 1917ء کے سال کی تیاری کا سال تھا۔

مقدمہ، جلاوطنی، فرار

قید کا دوسرا چکر شروع ہو گیا۔ پہلے کے مقابلے میں اس دفعہ قید کو برداشت کرنا زیادہ آسان تھا اور حالات بھی آٹھ سال کی نسبت زیادہ بہتر تھے۔ سب سے پہلے مجھے مختصر عرصے کیلئے ''کرسٹی'' جیل میں رکھا گیا۔ پھر پیٹر پال قلعہ میں آ کر میں ''ابتدائی قید کے مکان'' میں۔ سائبیریا بھیجنے سے پہلے ایک ٹرانسفر جیل میں رکھا گیا۔

مجموعی طور پر میں پندرہ ماہ قید میں رہا۔ ہر قید خانے کی اپنی کچھ خاصیتیں ہوتی ہیں جنہیں آپ کو اپنانا پڑتا ہے۔ لیکن انہیں اپنائے رہنا سخت بوریت کا کام ہے کیونکہ قید خانے آخر قید خانے اور ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اب پھر میں باقاعدہ فنی اور ادبی کام کے

ایک عرصے میں داخل ہو گیا تھا۔ میں نے کرایہ کا نظریہ اور روس میں سماجی تعلقات کی تاریخ کا مطالعہ کیا۔ کرایہ کے نظریے پر میں نے جو ضغیم کام کیا تھا' اگر چہ وہ نامکمل تھا مگر اکتوبر انقلاب کے پہلے برسوں میں کہیں گم ہو گیا۔ یہ میرا اتنا ہی بڑا نقصان تھا جتنا فری میسنری پر میرے کام کا نقصان روس کی سماجی تاریخ پر میں نے جو مطالعہ کیا تھا اسے بعد میں اپنے مضمون ''انقلاب کے نتائج اور اس کا تناظر'' میں سمو دیا۔ یہ مضمون اس زمانے میں مستقل انقلاب کے نظریے کا جامع ثبوت تھا۔

''ابتدائی قید کے مکا''' میں تبدیل ہو جانے کے بعد وکیلوں کو ہمیں ملنے کی اجازت تھی۔ پہلے ڈوما نے سیاسی زندگی کو متحرک کر دیا۔ اخبارات کا رویہ دوبارہ جرات مندانہ ہو گیا۔ مارکسی فلسفے پر کتابوں کی اشاعت نے نئی زندگی حاصل کر لی۔ نئے حالات نے جنگ جو آنہ سیاسی تحریریں لکھنا ممکن بنا دیا تھا۔ میں نے قید میں بہت زیادہ لکھا۔ وکلا میرے مسودے اپنے بریف کیسوں میں لے جاتے تھے۔ میرا پمفلٹ ''پیٹر سٹر یو سیاست میں'' اسی زمانے کا لکھا ہوا ہے۔ میں نے اسے اتنے جذبے اور جوش کے ساتھ تحریر کیا تھا کہ قید خانے کے صحن میں ٹہلنا بھی مجھے تکلیف دیتا تھا۔ یہ پمفلٹ موقع پرستوں کی تنقید کے جواب میں آزاد خیالی کے خلاف اور سینٹ پیٹرز برگ سوویٹ اور ماسکو میں دسمبر کی مسلح شورش کے حق میں لکھا گیا تھا۔ بالشویک اخبارات نے اس کا دوستانہ انداز میں استقبال کیا۔ منشویک پریس خاموش رہا۔ پمفلٹ کی دس لاکھ کاپیاں چند ہفتوں میں فروخت ہو گئیں۔

ڈاکٹر سورچوف جو میرے ساتھ جیل میں تھا' اس نے بعد میں اپنی کتاب ''انقلاب کی صبح'' میں جیل کے زمانے کے متعلق لکھا۔ ''ایل' ڈی' ٹراٹسکی نے اپنی کتاب ''روس اور انقلاب'' بڑے اعصابی دباؤ میں جیل کے اندر لکھی۔ اس کتاب میں اس نے پہلی * دفعہ اس خیال کو آگے بڑھایا کہ روس میں جو انقلاب شروع ہوا تھا وہ سوشلسٹ حکومت قائم ہونے تک ختم نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کا مستقبل انقلاب کا نظریہ فقط چند لوگوں نے قبول کیا مگر وہ اس سختی سے ڈٹا رہا۔ اتنا ضرورت تھا کہ اس نے

بورژوا-سرمایہ دارانہ

----

* یہ بات درست نہیں تھی۔ ایل' ڈی' ٹراٹسکی۔

معیشت کے سڑنے کی بوسونگھ لی تھی اور سوشلسٹ انقلاب کو قریب آتے دیکھ لیا تھا۔''

سورچوف نے مزید لکھا۔'' جیل میں ٹراٹسکی کا سیل جلد ہی ایک قسم کی لائبریری میں تبدیل ہوگیا۔ اسے ہر قابل توجہ نئی کتاب مل جاتی۔ وہ انہیں پڑھتا رہتا اور اپنے ادبی کام میں دن رات مشغول رہتا۔ وہ ہم سے کہا کرتا تھا۔'' میں بہت اچھا محسوس کرتا ہوں۔ میں بیٹھا کام کرتا رہتا ہوں اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں کسی قید خانے میں نہیں ہوں۔'' زار کے زمانے میں اس قسم کا احساس واقعی ایک غیر معمولی بات ہے۔''

ذہن کو سکون دینے کیلئے میں یورپی کلاسیکی ادب پڑھنے لگتا تھا۔ سیل میں بستر پر لیٹے یہ ادب میں مجھے ایسا ہی مزہ آتا تھا جیسے کوئی وائن کا رسیا چسکیاں لے کر وائن پیتا ہے یا سگار کے کش لگاتا ہے۔ یہ میرے بہترین لمحات ہوتے تھے۔ اس زمانے میں میں نے جو سیاسی تحریریں لکھیں ان سب میں کہیں نہ کہیں ادبی کتابوں کے حوالے اور اقتباسات موجود ہیں۔ یہ وہی زمانہ ہے جب مجھ پر پہلی دفعہ فرانسیسی ناول کی عظمت کا راز آشکار ہوا۔ فرانسیسی ناول سے میری محبت آج تک موجود ہیں۔ خانہ جنگی کے دوران میں بھی میں ٹرین میں بیٹھا کوئی نہ کوئی نیا فرانسیسی ناول پڑھتا رہتا تھا۔

یہ سب کچھ ہوتے ہوئے میں قید کی زندگی سے کیسے کوئی شکایت کر سکتا تھا۔ یہ میرے لئے ایک بڑی اچھی تربیت گاہ تھی۔ پیٹر پال قلعے کی قید تنہائی سے نکلتے وقت مجھے ایک طرح کا افسوس ہو رہا تھا۔ وہ خاموش اور ہنگاموں سے خالی فضا میرے فکری کام کیلئے کس قدر موزوں تھی۔ اس کے برعکس'' ابتدائی قید کا مکان'' آدمیوں اور ہنگاموں سے بھرا ہوا تھا۔ وہاں بہت سے لوگوں کو سزائے موت دی گئی تھی۔ ان میں دہشت گرد

اور اسلحہ کے سوداگروں کی زیادہ تعداد تھی ۔ پہلے ڈوما کی وجہ سے جیل کا عملہ خاصا نرم رویہ رکھتا تھا۔ دن کو سیلوں پر قفل نہیں لگائے جاتے تھے اور ہم سب مل کر سیر کیا کرتے تھے ۔ ہم ''مینڈک کی چھلانگ'' کا کھیل بھی کھیلتے رہتے ۔ سزائے موت پانے والے قیدی ہمیں اپنی پشت پر بٹھا لیا کرتے ۔ میری بیوی ہفتے میں دو بار مجھے ملنے آتی ۔ ڈیوٹی پر حاضر اہل کار ہمارے مسودوں اور خطوں کے تبادلے پر چشم پوشی کر لیتے ۔ ان میں سے ایک ادھیڑ عمر کے اہل کار کا رویہ تو بہت ہی اچھا تھا میں نے اسے اپنی ایک کتاب اپنی تصویر اور دستخطوں کے ساتھ دی ۔ ''میری تمام بیٹیاں کالج جاتی ہیں ۔'' اس نے آنکھ جھپکتے ہوئے پراسرار انداز میں سرگوشی کی ۔ بعد میں وہ سوویٹ کے تحت مجھے ملا قحط کے ان دنوں میں مجھ سے جو کچھ ہو سکا میں نے اس کیلئے کیا۔

پروس بوڑھے ڈوئچ کے ساتھ جیل کے صحن میں گھوما کرتا تھا۔ میں بھی کبھی کبھی ان کا ساتھ دے دیا کرتا تھا۔ ایک تصویر میں ہم تینوں کو جیل کے کچن میں دکھایا گیا ہے۔ ان تھک ڈوئچ جیل سے وسیع پیمانے پر فرار کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ اس نے پروس کو بھی اس میں شامل کر لیا۔ اب وہ میری رضا کے خواہش مند تھے ۔ میں نے اس بنا پر اس کی مخالفت کی کہ آئندہ ہونے والی کارروائی کی سیاسی طور پر بڑی اہمیت تھی ۔ ویسے بھی اس منصوبے میں بہت سارے لوگ شامل کر لیے گئے تھے ۔ جیل کی لائبریری میں جہاں یہ سازش تیار کرتے رہتے تھے' جیل کے ایک اہل کار نے آلات کا ایک سیٹ تلاش کر لیا۔ جیل انتظامیہ نے اس معاملے کو دبا دیا کیونکہ خیال تھا کہ خفیہ پولیس نے جیل انتظامیہ میں ردوبدل کرنے کی خاطر یہ حرکت دانستہ کی تھی ۔ انجام کار ڈوئچ اپنے چوتھے فرار میں کامیاب ہو گیا۔ جیل سے نہیں بلکہ سائبیریا سے ۔

دسمبر کی شکست کے بعد پارٹی میں تفریق زیادہ تیزی سے بڑھ گئی ۔ ڈوما کی تحلیل مسائل کو از سر نو تازہ کر دیا۔ میں نے ایک پمفلٹ میں ان مسائل کو اپنا موضوع بنایا جسے لینن نے ایک بالشویک اشاعت گھر سے شائع کرایا۔ منشویک پہلے ہی ہر محاذ پر پسپائی اختیار کر رہے تھے ۔ ان دونوں فریقوں کے باہر جس قدر تعلقات خراب تھے' جیل کے

اندر نہیں تھے۔ ہم نے سینٹ پیٹرز برگ سوویٹ کے متعلق ایک مشترکہ کام شائع کرایا تھا جس میں بعض منشویک بھی حصہ دار تھے۔

سوویٹ آف ورکرز ڈیلی گیٹز کا مقدمہ 19 ستمبر 1906ء کو سٹولپین کی فوجی عدالت میں شروع ہوا۔ عدالت کا صحن اور گردونواح کی سڑکیں فوجی کیمپ میں تبدیل ہو گئیں۔ سینٹ پیٹرز برگ کی ساری پولیس متحرک کر دی گئی۔ لیکن عدالتی کارروائی قدرے آزادانہ ماحول میں ہو رہی تھی۔ رجعت پسند حکومت انقلاب کو قابو میں کرنے کے سلسلے میں وٹ کی کمزوریوں اور اس کی ''آزاد خیالی'' کو بر سر عام لا کر اس کی تذلیل پر تلی ہوئی تھی۔ چار سو گواہوں کو بلایا گیا تھا جن میں سے دو سو آئے اور انہوں نے عدالت کے سامنے شہادتیں دیں۔ ان میں زندگی کے ہر شعبے کے لوگ شامل تھے۔ یعنی ورکرز' صنعت کار' خفیہ پولیس کے اہل کار' انجینئر' سرکاری ملازم' شہری' صحافی' ڈاک خانے کے ملازم' پولیس' جمنیزم کے طلباء میونسپل کونسلرز' چوکیدار' غنڈے' سینٹرز' پروفیسرز' فوجی سپاہی سب عدالت کے سامنے پیش ہوئیاور وکیل صفائی اور استغاثہ کے وکیل کے سوالوں کا جواب دیتے اور جرح میں حصہ لیتے رہے۔ زیادہ سوال اور بحث سوویٹ کے کارکنوں کی سرگرمیوں پر ہوتی رہی۔ مقدمہ لڑنے والے اپنی صفائی پیش کرتے رہے۔ میں نے انقلاب میں مسلح شورش کی اہمیت پر بات کی۔ ہم نے بڑا مقصد پا لیا تھا۔ لیکن جب عدالت نے ایک بڑے گواہ سینٹر لوپوخن کو جس نے 1906ء کے موسم خزاں میں محکمہ پولیس میں حکومتی مواد کی اشاعت اور تقسیم کیلئے ایک پرنٹنگ پریس لگایا تھا' بلانے سے انکار کر دیا تو ہم نے عدالتی کارروائی میں حصہ لینے سے انکار کر دیا اور مطالبہ کیا کہ ہمیں دوبارہ جیل بھیج دیا جائے۔ ہمارے ساتھ ہی وکیل صفائی' گواہ اور لوگ عدالت سے باہر نکل آئے۔ جج اور استغاثہ کے وکیل عدالت میں بیٹھے رہے۔ عدالت نے ہماری عدم موجودگی میں فیصلہ سنا دیا۔ یہ مقدمہ جو ایک ماہ تک زیر سماعت رہا' اس کی کارروائی کہیں شائع نہ ہوئی۔ آج تک پتا نہیں چل سکا کہ اس کارروائی کی فائل کہاں ہے۔ اس مقدمے کی نمایاں باتیں میں نے اپنی کتاب ''1905ء'' میں درج

کی ہیں۔

عدالت میں کاروائی کے وقت میری ماں اور باپ بھی موجود تھے۔ ان کے خیالات اور جذبات منقسم تھے۔نکولاشیف میں شیوگووسکی کے باغ میں قیام کے زمانے میں بطور ایک لڑکے کے میں جو حماقتیں کیا کرتا تھا' انہیں سمجھنا ان کیلئے ان بھی مشکل ہو رہا تھا۔ میں ایک اخبار کا مدیر تھا سوویت کا چیئر مین تھا اور بطور ادیب میرا ایک نام تھا۔ بوڑھا جوڑا ان سب چیزوں سے بڑا متاثر تھا۔ میری ماں نے میرے وکیلوں سے اس امید پر بات کرنے کی کوشش کی کہ وہ میری تعریف میں مزید کیا کہہ سکتے تھے۔ میری تقریر جسے وہ بمشکل سمجھ سکی تھی' وہ خاموشی سے روتی رہی۔اس وقت وہ اور بھی روئی جب بہت سے وکیل میرے دفاع میں اٹھ کھڑے ہوئے اور مجھ سے ہاتھ ملاتے رہے۔ میری تقریر نے جو جوش وجذبہ پیدا کر دیا تھا اس کے پیش نظر استغاثہ کے ایک وکیل نے تھوڑی دیر کے لئے عدالتی کاروائی ملتوی کر دینے کی درخواست کی۔اس کا نام' زیڈ زارو ڈنی تھا۔ کرنسکی کی حکومت میں وہ وزیر انصاف تھا۔اس نے ملک سے غداری کے الزام میں مجھے جیل میں ڈال دیا تھا۔لیکن یہ دس سال پہلی کی بات تھی۔

کاروائی کے وقفوں کے دوران میں بوڑھا جوڑا مجھے خوشی سے دیکھتا رہا۔ میری ماں کو یقین تھا کہ میں بری ہی نہیں ہو جاؤں گا بلکہ مجھے کوئی امتیازی نشان بھی دیا جائے گا۔ میں اسے سخت سزا سننے کا حوصلہ رکھنے کی ترغیب دیتا رہا۔ وہ خوف زدگی اور کچھ نہ سمجھنے کی حالت میں میرے وکیلوں کی طرف دیکھتی رہی' جسے ان کی موجودگی میں یہ کیسے ممکن ہوسکتا تھا۔ میرا باپ ایک ہی وقت میں زرد' خاموش اور خوش بھی تھا۔

ہمیں تمام شہری حقوق سے محروم کر کے جلاوطنی کی سزا سنا دی گئی۔ یہ قدرے نرم سزا تھی۔ ہم سخت محنت کی سزا کی توقع کر رہے تھے۔لیکن جلاوطنی کی یہ سزا پہلی جلاوطنی کی سزا سے مختلف اور سخت تھی۔ یہ جلاوطنی غیر معینہ عرصے کیلئے تھی اور فرار کی ہر کوشش پر تین سال کی مزید سخت سزا تھی۔ اس سزا کے ساتھ جو پنتالیس کوڑے لگتے تھے انہیں چند سال پہلے ختم کر دیا گیا تھا۔

میں نے تین جنوری 1907ء کو اپنی بیوی کو لکھا۔ ''ٹرانسفر جیل میں آئے ہمیں دو یا تین گھنٹے ہو چکے ہیں۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ ''ابتدائی قید کے مکان'' سے نکلتے وقت میں پریشان تھا۔ میں اس چھوٹی کوٹھری کا اس قدر عادی ہو گیا تھا کہ وہاں کام کرتے ہوئے مجھے رعف آتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ٹرانسفر جیل میں ہم سب کو ایک ہی جگہ رکھا جائے گا۔ اس سے زیادہ تکلیف دہ بات اور کیا ہو سکتی ہے؟ اس کے بعد جلاوطنی کا گندہ اور تھکا دینے والا سفر شروع ہو جائے گا۔ کون جانتا تھا کہ ہمیں اپنی منزل تک پہنچنے میں کتنا وقت لگے۔ یہ بھی کسے معلوم ہے کہ ہماری واپسی کب ہو گی۔ کیا یہ اچھا نہ ہوتا کہ میں سیل نمبر 462 میں پڑھتا' لکھتا اور واقعات کا انتظار کرتا رہتا۔

ہم آج یہاں کسی پیشگی اطلاع کے بغیر غیر متوقع طور پر لائے گئے ہیں۔ استقبالیہ کمرے میں ہمیں قیدیوں کا لباس پہننے کا حکم دیا گیا۔ ہم نے سکول کے بچے کے تجسس کے ساتھ ایسا کیا۔ خود کو خاکستری پتلونوں کوٹوں اور ٹوپیوں میں دیکھنا دلچسپی سے خالی نہیں تھا۔ ہمیں اپنا زیر جامہ اور بوٹ رکھنے کی اجازت دے دی گئی۔ ہم اپنی کوٹھری میں اس نئے لباس میں آئے۔ ایک جذباتی ہجوم۔''

اپنے جوتے اپنے پاس رکھنا میرے لئے کوئی معمولی اہمیت کی بات نہیں تھی۔ ایک جوتے کی ایڑی میں میرا پاسپورٹ اور دوسرے جوتے کی ایڑی میں سونے کے سکے تھے۔ ہم سب کو ابدورسک نامی گاؤں میں بھیجا جانا تھا جو بحرہ منجمد شمالی کے حلقے میں تھا۔ ابدورسک سے قریبی ریلوے لائن پندرہ سو اور قریبی تار گھر آٹھ سو ورسٹ دور تھا۔ ڈاک پندرہ دنوں میں ایک بار آتی تھی۔ جب بہار اور خزاں میں سڑکیں خراب ہوتیں تو ڈاک چھ یا آٹھ ہفتوں تک نہیں آتی تھی۔

سفر کے دوران میں غیر معمولی ذراع استعمال کیے گئے۔ سینٹ پیٹرز برگ میں ہمیں کانوائے کی شکل میں لے جایا جانا مناسب خیال کیا گیا۔ تلوار سے لیس ہمارا سارجنٹ ہمیں قیدی گاڑیوں میں نظمیں سناتا گیا۔ ساتھ والی گاڑی میں خفیہ پولیس تھی جو ہر سٹاپ پر ہماری گاڑی کو گھیر لیتی تھی۔ جیل کے حکام ہمارے ساتھ بڑا عمدہ سلوک کر

رہے تھے۔ انقلاب اور ردانقلاب متوازن چل رہے تھے اور کسی کو معلوم نہیں تھا کہ جیت کس کی ہوگی۔ کانوائے کے انچارج نے ہمیں حکام بالا کا وہ حکم نامہ دکھایا جس میں ہمیں قانون کے تقاضے کے خلاف ہتھکڑیاں پہنانے سے منع کر دیا گیا تھا۔

گیارہ جنوری کو سفر کے دوران میں میں نے اپنی بیوی کو لکھا ''اگر افسر مہربان اور مہذب ہو تو نچلا عملہ بھی ایسا ہی ہو جاتا ہے۔ سب نے ہمارے مقدمے کی کاروائی پڑھ رکھی ہے۔ وہ سب ہمارے ساتھ ہمدردی سے پیش آ رہے ہیں۔ سپاہیوں کو آخری وقت تک معلوم نہیں تھا کہ وہ کن کو لے جا رہے تھے اور کہاں لے جا رہے تھے۔ ہمیں ماسکو سے سینٹ پیٹرز برگ منتقل کرتے وقت جو سخت حفاظتی تدابیر اختیار کی گئی تھیں، ان سے انہوں نے اندازہ لگایا تھا کہ ہمیں سزائے موت کیلئے سچلوسل برگ لیجایا جا رہا تھا۔ ٹرانسفر جیل کے استقبالیہ ہال میں میں نے دیکھا کہ کانوائے کے سپاہی بڑے جوش میں تھے، کچھ متفکر بھی تھے جیسے وہ کسی احساس جرم میں گرفتار تھے۔ ٹرین میں مجھے اس کی وجہ معلوم ہوئی۔ وہ جان گئے تھے کہ ہمیں موت کی نہیں بلکہ جلاوطنی کی سزا ہوئی تھی۔ خفیہ پولیس جو سارے کانوائے کی انچارج تھی، ہمارے ڈبے میں کبھی نہ آئی۔ وہ باہر۔ پہرہ دیتی رہی سٹیشن آنے پر ڈبے کو گھیر لیتی اور دروازے پر کھڑی ہو جاتی۔ وہ یوں ظاہر کرتی جیسے ہماری سخت نگرانی کر رہی ہے۔''

ہم تومن تک بذریعہ ریل گئے۔ وہاں سے سفر گھوڑوں پر شروع ہو گیا۔ چودہ قیدیوں کی نگرانی کیلئے باون سپاہیوں کے علاوہ ایک کپٹن پولیس کا ایک سینئر افسر اور ایک پولیس سارجنٹ تھا۔ پارٹی کے پاس چالیس دو پہیوں والی گھوڑا گاڑیاں تھیں۔ تومن سے تبوتسک تک ہم نے دریائے اوب کے راستے جانا تھا۔ میں نے اپنی بیوی کو لکھا۔''ہم ہر روز نو سے سو ورسٹ تک سفر کرتے ہیں اور شمال کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ہر روز ایک درجہ حرارت کم ہوتا جا رہا ہے۔ اس مسلسل سفر سے کلچرل میں فرق پڑتا جا رہا ہے، اگر ہم اسے صحیح معنوں میں کلچرل کہہ سکتے ہیں۔ ہم ہر روز سردی اور بربریت کی سلطنت میں داخل ہوتے جا رہے ہیں۔''

متعدد ایسے علاقوں سے گزر کر جہاں کی ساری آبادی ایک بخار میں مبتلا تھی، ہم تیرہ فروری کو اپنے سفر کے 33 ویں دن بیری زوف پہنچے یہ وہ جگہ تھی جہاں ایک زمانے میں زار پیٹر کا دست راس اس پرنس مینشی کوف جلاوطنی کی زندگی گزارتا رہا تھا۔ بیری زوف میں دو دن کے قیام کا اعلان کیا گیا۔ ابدرسک پہنچنے کیلئے ابھی سوورسٹ کا سفر پڑا تھا۔ قیام کے دوران میں ہم مکمل آزادی سے گھومتے پھرتے رہے۔ ہمارے محافظوں کو ہمارے فرار کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ واپسی کا راستہ دریائے اوب میں سے ٹیلی گراف کے تاروں کے ساتھ ساتھ تھا۔ مفرور نے پکڑے جانا تھا۔ بیری زوف کے مکینوں میں روشووسکی نامی ایک لینڈ سروئیر تھا۔ میں اس کے ساتھ فرار کا مسئلہ زیر بحث لایا۔ اس نے بتایا کہ ایک راستے سے یہ کوشش کی جاسکتی ہے۔ پہلے آپ سیدھے دریائے سوسفا کے ساتھ ساتھ یورال تک جائیں۔ راستے میں کان کنوں کی آبادیاں آئیں گی۔ بگوسلووسکی کی کانوں کے قریب چھوٹی گیج کی ریلوے لائن آئے گی۔ وہاں سے آپ کشفا پہنچ جائیں جو پرم ریلوے لائن پر ایک جنکشن ہے۔ پھر پرم سے واتکا، ولودا، سینٹ پیٹرز برگ اور وہاں سے ہلسنگ فورس۔

سوسفا کے دو راستے تھے۔ بیری زوف سے پرے جنگل ہی جنگل ہے۔ ہزاروں میل تک نہ تو پولیس ہے اور نہ ہی کوئی آبادی۔ کہیں کہیں اوستاکوں کی جھونپڑیاں دکھائی دے جاتی ہیں۔ ٹیلی گراف کا کوئی نشان نہیں۔ راستے میں کہیں گھوڑے دکھائی نہیں دیتے۔ یہ راستہ فقط ہرنوں کیلئے ہے۔ یہاں پولیس تو کسی کو پکڑ نہیں سکتی تھی مگر جنگل میں گم ہو جانے اور برف میں ختم ہونے کا خطرہ ضرور تھا۔ اور یہ فروری کا مہینہ تھا۔ برفانی طوفانوں کا مہینہ۔

قیدیوں میں ایک ڈاکٹر فیٹ تھا جو پرانا انقلابی تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ عرق النسا کا بہانہ کرنے سے میں چند روز مزید بیری زوف میں رک سکتا تھا۔ منصوبے کے پہلے حصے پر تو کامیابی سے عمل درآمد کرایا گیا۔ جیسا کہ ہر کوئی جانتا ہے عرق النسا کا پتا بڑے سے بڑا ڈاکٹر بھی نہیں لگا سکتا۔ مجھے ایک ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ وہاں کی انتظامیہ

نے مجھ پر کوئی پابندی عائد نہ کی۔ ''ٹھیک'' ہونے پر میں چندس گھنٹوں کیلئے باہر جا سکتا تھا۔ سیر کرنے کے سلسلے میں ڈاکٹر نے میری ہمت افزائی کی۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں' سال کے ان دنوں میں کوئی بھی فرار ہونے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔

مجھے ارادہ باندھنا تھا۔ میں نے مغربی راستے سے جانے کا فیصلہ کر لیا جو سیدھا یورال جاتا تھا۔ اس کیلئے روشکوفسکی نے ایک مقامی کسان سے مشورہ لیا جو بکری کا سم'' کہلاتا تھا۔ اس خشک مزاج' کوتاہ قد مگر ذہین آدمی نے بڑی دلچسپی سے میرے فرار کا منصوبہ تیار کیا۔ بعد میں جب اس فرار میں اسکے حصے کا پتا چلا تو اسے سخت سزا دی گئی۔ اکتوبر انقلاب کے بعد ''بکری کے سم'' کو کچھ عرصے تک خبر نہ چلی کہ میں وہی آدمی تھا جس کے فرار میں اس نے دس سال پہلے مدد کی تھی۔ وہ 1923ء میں مجھے ملنے ماسکو آیا اور ہماری ملاقات بڑی دوستانہ رہی۔ اسے سرخ فوج کی پوری یونیفارم دی گئی' تھیٹر لے جایا گیا اور گراموفون اور دوسرے تحائف دیے گئے۔ تھوڑے عرصے بعد ہی بوڑھا آدمی اپنے دور دراز کے شمالی علاقے میں فوت ہو گیا۔

بیری زوف سے سفر ہرنوں کے ذریعے کیا جانا تھا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ اس موسم میں میرا گائیڈ کون بن سکتا تھا۔ ''بکری کے سم'' نے ایک ہوشیار اور تجربہ کار زیران تلاش کر لیا جو بظاہر اپنے دوسرے زیرانوں جیسا ہی تھا۔

''وہ شرابی تو نہیں؟''

''ایک بلانوش شرابی۔ مگر وہ روسی اور زیران زبانیں بڑی روانی سے بول سکتا ہے۔ وہ دواوسیاک بولیاں بھی جانتا تھا۔ جو مشکل سے ہی دوسرے سے ملتی ہیں۔ اس جیسا کو چوان ملنا بہت مشکل ہے۔ وہ ہے بھی بہت چالاک اور ہوشیار''۔

یہ وہی چالاک اور جہاں دیدہ آدمی تھا جس نے بعد میں ''بکری کا سم'' کو پکڑوا دیا۔ مگر مجھے فرار کرانے میں کامیاب * ہو گیا۔

اتوار کی نصف شب فرار ہونے کیلئے مقرر کی گئی۔ اس وقت سرکاری اہلکاروں نے شوقیہ تھیٹر دیکھنے میں مصروف ہونا تھا جس کیلئے ایک بارک کو عارضی طور پر تھیٹر میں تبدیل

کیا گیا تھا۔ میں وہاں آیا اور پولیس کے مقامی چیف کو بتایا کہ میں بہت بہتر محسوس کر رہا تھا اور جلد ہی ابدورسک جانے کے قابل ہو جاؤں گا۔ یہ بہانہ بہت ضروری تھا۔

جب گرجے کے گھڑیال نے بارہ بجائے تو میں ''بکری کاسم'' کے صحن میں تھا۔ برگ گاڑی میرے انتظار میں تھی۔ میں اس کے پیندے میں اپنے فر کے فالتو کوٹ پر لیٹ گیا۔ ''بکری کاسم'' نے میرے اوپر منجمد گھاس ڈال دی اور اسے رسی سے باندھ دیا۔ اس کے بعد ہم چل پڑے۔ برف پگھلنے سے پانی کے قطرے میرے منہ پر گرنے لگے۔ چند میل چلنے پر ہم ٹھہر گئے۔ ''بکری کاسم'' نے گھاس کو کھول دیا اور میں باہر نکل آیا۔ پھر اس نے سیٹی بجائی۔

---

*اپنی کتاب ''1905ء'' میں میں نے یہ واقعہ جان بوجھ کر مختلف انداز میں بیان کیا ہے۔ اس وقت حقائق بیان کرنا زار کی پولیس کو اپنے ساتھ پکڑوانے کے برابر تھا۔ مجھے امید ہے سٹالن اب ان پر سختی نہیں کرے گا۔ اب تو ان کی قیدیوں کے دن بھی ختم ہو چکے ہوں۔ میرے فرار کے آخری مرحلے میں لینن نے بھی میری مدد کی تھی جس کا ذکر میں بعد میں کروں گا۔

چند لوگوں نے اس کی سیٹی کا جواب دیا۔ لیکن جواب میں جو آوازیں آئیں وہ نشے میں بھیگی ہوئی تھیں۔ آنے والا زیران نشے میں دھت تھا اور وہ اپنے دوست ساتھ لایا تھا۔ یہ ایک بڑا آغاز تھا مگر کوئی چارہ نہیں تھا۔ مجھے میرے ہلکے سامان کے ساتھ برف گاڑی میں منتقل کر دیا گیا۔ میرے پاس فر کے دو کوٹ' فر کی جرابین فر کے بوٹ اور فر کی دوہری ٹوپی اور فر کے دستانے تھے۔ یعنی ایک اوسیاک کا مکمل سردیوں کا لباس۔ میرے بیگ میں شراب کی چند بوتلیں تھیں۔ برف کے صحرا میں بہترین ساتھی۔

سیور چیکوف اپنی یادداشتوں میں لکھتا ہے۔ ''بیری زوف کی بلندی سے آگ کے الاؤ کے پاس بیٹھ کر آس پاس کے برف کے میدانوں میں ایک ورسٹ تک ہر قسم کی حرکات وسکنات کا جائزہ لیا جا سکتا تھا آگ کے قریب بیٹھے ڈیوٹی پر حاضر چوکیدار سے

پولیس والا پوچھ سکتا تھا کہ اس نے رات کو کسی کو گاڑی میں قصبے سے باہر جاتے ہوئے تو نہیں دیکھا تھا۔ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے روشکووسکی نے ایک مقامی آدمی کے ساتھ یہ انتظام کر رکھا تھا کہ وہ ایک بچھڑے کو ذبح کرنے کی خاطر ابدورسک جانے والی سڑک پر لے جائے۔ توقع کے مطابق اس چال کا پتا چل گیا۔ جب دو دن بعد ٹراٹسکی کا فرار سامنے آیا تو پولیس بچھڑا ذبح کرنے والے ایک شخص لی تعاقب میں دوڑ پڑی اور یوں اس نے مزید دو دن ضائع کر دیئے۔'' مگر یہ بات مجھے بہت بعد میں معلوم ہوئی۔

ہم سوسفا کے ساتھ چلنے لگے۔ میرا گائیڈ اپنے ساتھ جو ہرن لایا تھا وہ بہترین قسم کے تھے۔ سفر شروع ہوتے ہی میرا شرابی ڈرائیور سو جاتا۔ کبھی ہرن ٹھہر جاتے۔ یہ ہم دونوں کیلئے خطرے کی گھنٹی تھی۔ آ کر یہ ہوا کہ وہ میرے ہلانے پر بھی کوئی جواب نہیں دیتا تھا۔ پھر میں اس کی ٹوپی اتار دیتا۔ جب اس کے بال برف میں جمنے لگتے تو اسے ہوش آنے لگتا۔

ہم چلتے گئے۔ یہ ایک زبردست سفر ہے۔ چاروں طرف حد نگاہ تک برف ہے جس میں فر کے درخت اپنے سفید سر اٹھائے کھڑے ہیں۔ برف پر جانوروں کے پنجوں کے نشان دکھائی دیتے ہیں۔ ہرن ایک اچھی چال سے چلتے رہے ہیں۔ وہ تھک جاتے تو ان کی زبانیں باہر نکل آتی ہیں۔ اور وہ بھاری سانس لینے لگتے ہیں راستہ تنگ ہے' ہرن بالکل ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور حیرت کی بات ہے کہ وہ آپس میں ٹکراتے نہیں ہیں۔ یہ عجیب جانور ہیں۔ انہیں بھوک ہی نہیں لگتی۔ تھکاروٹ بھی کم ہی محسوس کرتے ہیں۔ ہماری روانگی سے چوبیس گھنٹے پہلے تک انہوں نے کچھ نہیں کھایا ہے۔ ڈرائیور نے بتایا کہ ابھی تو انہوں نے اپنی چال پکڑی ہی ہے۔ وہ ایک گھنٹے میں آٹھ سے دس ورسٹ سفر طے کر لیتے ہیں۔ وہ اپنی خوراک کا خود بندوبست کر لیتے ہیں۔ ان کی گردنوں سے لکڑی کا ایک ٹکڑا بندھا ہے۔ انہیں کھلا کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے۔ انہیں پتا چل جاتا ہے کہ برف کے نیچے کہاں کائی ہے۔ وہ اپنے سموں سے وہ جگہ کھود لیتے ہیں اور پھر کانوں تک سر کو اندر گھسیڑ کر اپنی خوراک حاصل کر لیتے ہیں۔

تین ہرنوں میں سے بڑا ہرن لنگڑا ہو گیا ہے سخت پریشانی ہے ۔اسے بدلنا پڑتا ہے ۔ہم اوستاکوں کی کوئی آبادی تلاش کرنے لگے ہیں ۔ وہ بکھرے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے سے کئی کئی ورسٹ دور رہتے ہیں ۔ میرا گائیڈ ان کی موجودگی بڑے غیر محسوس طریقے سے معلوم کرتا ہے ۔ وہ کئی ورسٹ سے دھویں کی بو سونگھ لیتا ہے ۔ ہرن تبدیل کرنے میں پورا ایک دن لگ گیا ہے ۔لیکن اس دوران میں مجھے صبح کے وقت ایک خوبصورت چیز دیکھنے کو مل گئی ہے تین اوستاک پوری رفتار سے برف گاڑی چلا رہے ہیں ۔انہوں نے ہرنوں کے ریوڑ میں سے چس د ہرنوں کو تاک رکھا تھا ۔ان کے کتے ان کو ان کی طرف دھکیل رہے ہیں ۔

ہم برف اور جنگلوں میں سے گزرتے رہے ۔ بہت سے درخت آگ لگنے سے جلے ہوئے تھے ۔ ہم برف کو گرم کر کے پانی بناتے اور برف پر بیٹھ کر چائے پیتے ۔ میرا گائیڈ شراب کو ترجیح دیتا مگر میں اس بات کا خیال رکھتا کہ وہ زیادہ نہ پی جائے ۔

بظاہر محسوس نہیں ہوتا تھا مگر راستہ مستقل طور پر تبدیل ہو رہا تھا اور ہرن یہ جانتے تھے ۔ اب ہم ایک کھلے میدان سے گزر رہے تھے ۔ جو صنوبر کے جنگل اور دریا کے درمیان واقع تھا ۔ راستہ خوفناک تھا ۔ برف گاڑی کے عقب میں ہوا تیزی سے چلتی اور برف اڑنے لگتی ۔تیسرا ہرن راستہ جھٹکنے لگا ۔ وہ پیٹ تک برف میں دھنس گیا' بڑی شکل سے باہر نکلا' راستے پر آیا' درمیانے ہرن سے ٹکرایا اور اس نے آگے چلنے والے ہرن کو راستے سے پرے دھکیل دیا ۔ایک جگہ راستہ دھوپ سے گرم ہو گیا تھا جہاں برف گاڑی بڑی تیزی سے پھسلنے لگی ۔ اسے سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا ۔ ہرن بھی تھکاوٹ محسوس کرنے لگے ۔

پھر سورج غروب ہو گیا ۔ برف دوبارہ راستے پر جم گئی اور گاڑی چلانی آسان ہو گئی ۔ ہرن کسی آواز کے بغیر دھکی چلنے لگے ۔ وہ بڑے آرام دے گاڑی کو کھینچ رہے تھے ۔ہم نے تیسرے ہرن آگے سے کھول کر پیچھے باندھ دیا ۔سفر آسانی ہو جانے سے ہرن ادھر ادھر ہونے لگے تھے جس سے گاڑی کی الٹنے کا خطرہ تھا ۔ گاڑی بڑی ہمواری

اور خاموشی سے چلتی رہی۔ جیسے ایک کشتی شفاف جھیل پر تیر رہی ہو۔ مدھم پڑتی شفق میں جنگل زیادہ خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ گاڑی کی حرکت بمشکل' محسوس ہوتی تھی۔ ایک جادو میں گرفتار درخت ہماری طرف آ رہے تھے۔ برف سے ڈھکی چھپی جھاڑیاں ہم سے دور بھاگ رہی تھیں۔ ہر چیز اسرار سے بھری ہوئی تھی۔ رات کی بھرپور خاموشی میں ہرنوں کے سموں کی مدہم مدہم آواز اٹھ رہی تھی۔

سفر ایک ہفتہ جاری رہا۔ ہم نے سات سوکلومیٹر طے کر لیے تھے اور اب یورال کے قریب پہنچ رہے تھے۔ ہم نے سات سوکلومیٹر طے کر لیے تھے اور قافلے دکھائی دینے لگتے۔ میں خود کو انجینئر اور بارون تول مہم کا ممبر ظاہر کرتا۔ یورال کے قریب ہمیں اتفاقاً ایک سرکاری اہل کار مل گیا جو اس مہم میں کام کرتا رہا تھا اور اس کے ممبروں کو جانتا تھا۔ اس نے مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ میری خوش قسمتی کہ وہ اس وقت اپنے حواس میں نہیں تھا۔ میں نے بیگ میں سے رم کی ایک بوتل اسے دے کر اپنی جان چھڑائی۔ ہر کام ٹھیک ٹھاک ہو رہا تھا۔ ایک دفعہ میں نے یورال میں گھوڑي کے ذریعے سفر کیا تھا۔ میں خود کو ایک سرکاری افسر ظاہر کر رہا تھا جو اپنے ایکسائز انسپکٹر کے ساتھ ضلع کے دورے پر نکلا ہوا تھا۔ آخر ہم چھوٹی لائن والے ایک ریلوے سٹیشن پر پہنچ گئے۔ جب میں نے اپنے اوستیاک فرکوٹ اتار رہا تھا تو سٹیشن پر موجود پولیس نے مجھے بڑی بے اعتنائی سے دیکھا۔

اس ریلوے لائن پر میں محفوظ نہیں تھا۔ ابدورسک سے تار پر ہدایات آنے میں ایک اجنبی دکھائی دینے پر آسانی سے پکڑا جا سکتا تھا۔ بہرحال میں خوف میں مبتلا چلتا رہا۔ لیکن ایک دب کے بعد جب میں پرم ریلوے لائن پر آسانی سے پہنچ گیا تو میں خود کو پرسکون محسوس کرنے لگا' جیسے میں نے مقدمہ جیت لیا تھا۔ ترین ایک انہی سٹیشنوں سے گزر رہی تھی جہاں کچھ عرصہ پہلے خفیہ پولیس' سٹیشنوں کے عملے اور مقامی پولیس کے افسر بڑی سنجیدگی سے ہمارا استقبال کرتے رہے تھے۔ لیکن اب میں نے ایک دوسری

سمت میں جانا تھا اور میں ایک مختلف جذبے سے سفر کر رہا تھا۔ پہلے چند لمحوں میں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے خالی ڈبہ مسافروں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ میں سانس لینے پلیٹ فارم پر اتر گیا۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ میرے اندر سے بے ساختہ ایک آواز اٹھی۔ یہ خوشی اور آزادی کی آواز تھی۔

ایک قریبی ریلوے سٹیشن سے میں نے اپنی بیوی کو تار بھیجا کہ وہ فلاں جنکشن سٹیشن پر میرا انتظار کرے۔ اسے ایسے کسی تار کی توقع نہیں تھی' اور وہ بھی' اس قدر جلدی۔ مگر اس میں حیرت کی کوئی بات بھی نہیں تھی۔ ہم ایک ماہ میں بیری زوف پہنچے تھے۔ شمال کی طرف ہمارے سفر کی داستان سے سینٹ پیٹرز برگ کے اخبارات بھرتے ہوئے تھے۔ ڈاک کے ذریعے رپورٹیں آ رہی تھیں۔ ہر کسی کا یہی خیال تھا کہ میں ابدورسک کی طرف جا رہا تھا۔ گھر میں نے واپسی کا سفر گیارہ دنوں میں طے کر لیا تھا۔ سینٹ پیٹرز برگ کے قریب میرا اپنی بیوی سے ملنا ناقابل یقین بات تھی۔ پھر ہماری ملاقات مقررہ وقت پر ہوگئی۔

این' آئی' سیدوفا نے اسے یوں بیان کیا ہے۔ ''جب ترو کی میں مجھے تار ملا جو سینٹ پیٹرز برگ کے نواح میں ایک چھوٹا سا فنس گاؤں ہے اور جہاں میں اپنے نومولودہ بیٹے کے ساتھ ٹھہری ہوئی تھی تو میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اسی دن مجھے ایل' ڈی کا سفر کے دوران میں لکھا ہوا ایک خط ملا تھا جس میں اس نے کہا تھا کہ جب میں ابدورسک اسے ملنے آؤں تو اپنے ساتھ بعض ضروری مضامین اور کتابیں لیتی آؤں۔ اب وہ ایک پراسرار طریقے سے واپس آ رہا تھا اور اس نے مجھے ایک جنکشن پر ملنے کو کہا تھا۔ مگر یہ عجیب بات تھی کہ وہ جنکشن کا نام تار میں لکھنا بھول گیا تھا۔ دوسرے دن سینٹ پیٹرز برگ گئی اور ریلوے کے ایک اہل کار سے قریبی ریلوے جنکشن کا ٹکٹ مانگنے لگی۔ میں اس سے زیادہ پوچھ گچھ کرنے سے ڈرتی تھی۔ آخر سٹیشن کا نام جانے بغیر میں سفر پر چل پڑی میں نے وئسا تکا کا ٹکٹ خرید لیا تھا۔ ریل کار جاگیرداروں سے بھری ہوئی تھی۔ وہ پیٹرز برگ سے اپنی جاگیروں سے واپس آ رہے تھے اور عید کا ہفتہ منانے

کیلئے اپنے ساتھ دعوتوں کا بہت سا سامان لے جا رہے تھے ان کی باتوں کا موضوع شراب، کیل، سگریٹ اور اس قسم کی دوسری اشیا تھیں۔ میرے لئے یہ گفتگو برداشت کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ میں نے آنے والی ملاقات کا سوچ کر بے حد جذباتی ہو رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ کوئی حادثہ نہ ہو جائے۔ اس کے باوجود میں ملاقات کے متعلق پر یقین تھی۔

''میرے لیے صبح کا انتظار مشکل تھا کہ اس وقت ٹرین نے سیمنو کے سٹیشن پر پہنچنا تھا۔ یہ نام میں نے راستے میں سنا تھا۔ اور اسے ہمیشہ کیلئے ازبر کر لیا تھا۔ گاڑیاں رکیں۔ ایک مری اور ایک دوسری میں سٹیشن کی طرف بھاگی وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں دوسری گاڑی میں چڑھ گئی اور ایک ایک ڈبے کی تلاشی لینے لگی۔ وہ کہیں نہیں تھا۔ اچانک ایک ڈبے میں میں نے ایل، ڈی کے فرکوٹ کو دیکھ لیا۔ وہ گاڑی میں تھا۔ مگر کہاں تھا؟ میں نے ڈبے سے چھلانگ لگائی اور سیدھی ایل، ڈی سے جاٹکرائی۔ وہ سٹیشن کے باہر مجھے تلاش کر کے واپس آیا تھا۔ تار گھر کی طرف سے تار میں سٹیشن کا نام درج نہ کرنے پر وہ بڑے غصے میں تھا۔ اور اسی وقت اس کی شکایت کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے بڑی مشکل سے روکا۔ ہم ڈبے میں بیٹھ گئے اور اپنا سفر جاری رکھا۔ ایل ڈی جس آزادی اور بے تکلفی سے گاڑی کے اندر اور باہر سٹیشن پر کھڑا ہو کر ہنس اور اونچی آواز میں قہقہے لگا رہا تھا مجھے اس پر حیرت ہو رہی تھی۔ میں اسے کہیں چھپا لینا چاہتی تھی۔ فرار ہونے پر اسے جو سخت سزا ملنی تھی اس کے متعلق سوچ کر میرا کلیجہ منہ کو آ رہا تھا۔ مگر وہ مکمل طور پر اپنی نمائش کر رہا تھا اور کہتا تھا کہ یہی اس کی سب سے بڑی حفاظت تھی۔''

سینٹ پیٹرز برگ کے سٹیشن سے ہم سیدھے اپنے وفادار دوستوں کے پاس توپ خانے کے سکول میں چلے گئے۔ مجھے دیکھ کر ڈاکٹر لنکن کا کنبہ جس قدر حیران ہوا اس سے زیادہ حیران لوگ میں نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ میں کھانے والے کمرے میں ایک بھوت کی طرح کھڑا تھا اور سب اہل خانہ سانس روکے مجھے حیرت زدگی کی حالت میں دیکھے جا رہے تھے۔ ایک دوسرے سے بغل گیر ہونے اور چومنے کے بعد بھی انہیں اپنی

آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا وہ مجھے دیکھے جا رہے تھے۔آخر انہیں یقین آ گیا کہ میں ہی ان کے سامنے کھڑا تھا۔آج بھی میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ حد پر مسرت لمحات تھے۔لیکن میں ابھی خطرے سے باہر ہرگز نہیں تھا۔سب سے پہلے ڈاکٹر نے اس طرف ہماری توجہ مبذول کرائی کہ ایک طرح سے خطرے کا اب آغاز ہوا تھا۔بیری زوف کے حکام نے میری روپوشی پر بلاشبہ تار بھیج دیے ہوں گے۔سینٹ پیٹرز برگ سوویٹ میں کام کرنے کے سبب بہت سے لوگ مجھے جانتے تھے۔لہذا میں نے اپنی بیوی کے ساتھ فن لینڈ جانے کا فیصلہ کرلیا جہاں سینٹ پیٹرز برگ کی نسبت انقلاب کی بدولت زیادہ آزادیاں تھیں۔سب سے زیادہ خطرناک جگہ سینٹ پیٹرز برگ میں فن لینڈ کا ٹرمینل تھا۔ٹرین چلنے سے پہلے کئی خفیہ پولیس والے ڈبوں میں گھس کر تلاشی لینے لگے۔میری بیوی دروازے کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئی۔اس کی آنکھوں میں مجھے معلوم ہو رہا تھا کہ ہم کس قدر خطرے میں تھے۔ہم چند لمحے اعصابی تناؤ کا شکار رہے۔پولیس نے ہماری طرف بے دھیانی سے دیکھا اور چلی گئی۔وہ اسی کی اہل تھی۔

لینن اور مارٹوف بہت عرصہ پہلے سینٹ پیٹر برگ چھوڑ کر فن لینڈ میں رہ رہے تھے۔سٹاک ہوم میں دونوں فریقوں میں جو صلح ہوئی تھی اس میں پھر دراڑیں پڑ رہی تھیں۔انقلاب کی لہر ابھی تک اتر رہی تھی۔منشویک 1905ء کے احمقانہ اعمال پھر دہرانے لگے۔بالشویک چپ تھے اور نئے انقلاب کی تیاری کر رہے تھے۔میں لینن اور مارٹوف سے ملا جو قریبی مگر الگ الگ دیہات میں رہتے تھے۔مارٹوف کا کمرہ حسب معمول بدنظمی کا شاہکار تھا۔ایک کمرے میں آدمی کے قد کے برابر اخبارات کا انبار لگا تھا۔مجھ سے گفتگو کے دوران میں وہ اخبار کے انبار میں غوطہ لگاتا اور وہ مضمون نکالنے کی کوشش کرتا جو وہ مجھے دکھانا چاہتا تھا۔راکھ سے اٹے ہوئے مسودے اس کے میز پر پڑے تھے۔گندی عینک اس کی ناک پر نیچے تک آئی ہوئی تھی۔ہمیشہ کی طرح مارٹوف کے ذہن میں بہت سے خیالات تھے' شاندار اور نازک ترین۔لیکن وہ اپنے کسی خیال کو دوسرے پر ترجیح نہیں دے سکتا تھا۔اسے سمجھ نہیں آئی تھی کہ اس نے آگے کیا کرنا

تھا۔

اس کے برعکس لینن کا کمرہ نظم اور ترتیب کی ایک مثال تھا۔ وہ سگریٹ نہیں پیتا تھا اخبارات پر ضروری نشانیاں لگا کر اس نے اپنی دسترس میں رکھے ہوئے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس کے صاف مگر غیر معمولی چہرے پر وہ تاثر تھا جیسے وہ غیر متزلزل انداز میں وقت کو حکم دے رہا تھا۔ اس وقت یہ بات ابھی واضح نہیں ہوئی تھی کہ انقلاب کی لہر قطعی طور پر دب گئی تھی یا یہ دوبارہ ابھرنے سے پہلے وقتی طور پر سست خرام ہوئی تھی۔ دونوں صورتوں میں یہ بے حد ضروری تھا کہ شک پرستوں کا مقابلہ 1905ء کے تجربے پر نظریاتی طور پر از سرنو غور کر کے تازہ انقلاب کیلئے کارکنوں کو تیار کیا جائے۔ جیل میں میں نے جو کام کیا تھا لینن نے اسے سراہا مگر ضروری نتائج اخذ نہ کرنے پر طنز کی۔ دوسرے لفظوں میں میں بالشویک کی طرف نہیں آیا تھا۔ یہاں وہ ٹھیک تھا۔ رخصت ہوتے وقت اس نے مجھے ہلسنگ فورس کے کچھ پتے دے جو بہت قیمتی ثابت ہوئے۔

لینن نے جن احباب سے ملنے کیلئے مجھے کہا تھا انہوں نے میری بڑی مدد کی اور مجھے فیملی کے ساتھ ہلسنگ فورس کے نواح میں اگلبو ایک گاؤں میں پرسکون طور پر وقت گزارنے کیلئے رہائش گاہ تلاش کر کے دی۔ کچھ عرصہ بعد لینن بھی وہاں قیام کرنے آ گیا۔ ہلسنگ فورس کا پولیس کا چیف ایک سرگرم انقلابی قوم پرست تھا۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ سینٹ پیٹرز برگ کی طرف سے کسی ممکنہ خطرے کی صورت میں وہ مجھے پیشگی خبردار کر دے گا۔ میں اپنی بیوی اور بیٹے ہمراہ چند ہفتوں اگلبو میں رہا۔ جب میں جیل میں تھا تو میرا بیٹا میری عدم موجودگی میں پیدا ہوا تھا۔ اس گاؤں میں میسر آنے والے سکون اور خاموشی کا ذکر میں نے اپنی کتاب ''وہاں واپسی'' میں کیا ہے۔ اس کتاب سے مجھے جو رقم حاصل ہوئی اس کے ذریعے میں براستہ سٹاک ہوم باہر چلا گیا۔ میری بیوی اور بیٹا وقتی طور پر روس چلے گئے۔ مجھے سرحد تک چھوڑنے ایک جوان فنس خاتون آئی جو خود بھی ایک سرگرم کارکن تھی۔ اس وقت تمام قسم کے سرگرم کارکن

ہمارے دوست تھے مگر 1917ء میں وہ فاشسٹ اور اکتوبر انقلاب کے دشمن بن گئے ۔

سکنڈے نیویا کے ایک سٹیمر پر میں ایک نئی غیر ملکی جلا وطنی پر روانہ ہو گیا جو دس سال جاری رکھی ۔

میری دوسری غیر ملکی جلا وطنی :-- جرمن سوشلزم-

1907ء کی پارٹی کانگریس نے اپنے اجلاس میں لندن کے ایک مشہور سوشلسٹ چرچ میں منعقد کیے ۔ یہ ایک طویل، پرہجوم، طوفانی مگر ابتری کی ماری ہوئی کانگریس تھی ۔ سینٹ پیٹرز برگ میں دوسرا ڈوما ابھی تک زندہ تھا ۔ انقلاب دب رہا تھا مگر برطانیہ کے سیاسی حلقوں میں ابھی تک دلچسپی کا باعث بنا ہوا تھا ۔ نمایاں آزاد خیال لوگ نامور مندوبوں لا اپنے گھروں پر اپنے مہمانوں سے ملانے کیلئے مدعو کر رہے تھے ۔ پارٹی کے فنڈز میں کمی بھی انقلاب کی لہر کے مدہم ہو جانے کی نشان دہی کرتی تھی ۔ واپسی کا سفر تو ایک طرف رہا کانگریس کو اختتام تک چلانے کیلئے بھی رقم نہیں تھی ۔ جب یہ افسوس ناک خبر کلیسا کے محرابوں میں سے ہوتی ہوئی ان مندوبین تک پہنچی جو مسلح شورش کی بحثوں میں مصروف تھے تو وہ حیرت کی تصویر بن گئے ۔ اب کیا کیا جائے ؟ ہم کلیسا میں زیادہ عرصہ نہیں ٹھہر سکتے تھے ۔ آخر ایک راستہ تلاش کر لیا گیا، اور وہ بھی بڑے غیر متوقع طور پر ۔ ایک آزاد خیال انگریز روسی انقلاب کیلئے تین ہزار پونڈ ادھار دینے پر تیار ہو گیا ۔ میرا خیال ہے اتنی ہی رقم تھی ۔ لیکن اس کا مطالبہ تھا کہ قرض کا غذات پر تمام مندوبین دستخط کریں ۔ اس طرح اسے ہزاروں روسیوں کے دستخط مل گئے جن میں کئی فرقوں اور قومیتوں کے لوگ شامل تھے ۔ بہر حال اسے قرضے کی واپسی کیلئے ایک طویل مدت کا انتظار کرنا پڑا ۔ جنگ اور اس کے ردعمل کے دنوں میں پارٹی اتنی بڑی رقم کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتی تھی ۔ بعد میں سوویت حکومت نے یہ قرضہ ادا کیا ۔ انقلاب اپنی ذمہ داریاں پوری ضرور کرتا ہے اگر چہ اس میں عام طور پر تاخیر ہو جاتی ہے ۔

کانگریس کے ابتدائی دنوں میں ایک دن کلیسا کے دالان میں ایک دراز قد، گول

چہرے اور متناسب جسم والے ایک آدمی نے جس نے گول ہیٹ پہن رکھا تھا' مجھے روک لیا اور بولا۔ ''میں تمارا مدح ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ ذرا ہنسا۔

''مداح؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ پھر اس نے میرے ان پمفلٹوں کا حوالہ دیا جو میں نے قید میں لکھے تھے۔ میرا مداح میکسم گورکی تھا جسے میں پہلے مرتبہ مل رہا تھا۔

''اب میرے لئے یہ کہنا بڑا مشکل ہو گیا ہے کہ میں بھی آپ کا مداح ہوں۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ان دنوں گورکی بالشویکوں کے حلقہ اثر میں تھا۔ اس کے ساتھ نامور ایکٹرس اینڈری ہفا تھی۔ ہم لندن میں گھومتے رہتے تھے۔

''تم یقین کرو گے کہ یہ تمام زبانیں بول لیتی ہے۔'' گورکی نے اینڈری ہفا کی طرف حیرت سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ خود فقط روسی زبان جانتا تھا مگر بڑی عمدہ جب کوئی فقیر ہماری گاڑی کا دروازہ بند کرتا تو گورکی بڑے ملتجی لہجے میں کہتا۔ ''ہمیں اسے چند پنس دے دینے چاہیں۔'' اس پر اینڈری یفا جواب دیتی۔ ''اسے دے دیے گئے ہیں الوشا' دے دیئے گئے ہیں۔''

لندن کانگریس کے موقع پر میں نے روسا الکسمبرگ سے اپنی دوستی کا احیاء کیا اسے میں 1904ء سے جانتا تھا۔ وہ چھوٹے قد کی دبلی پتلی اور بیمار دکھائی دینے والی خاتون تھی۔ مگر اس کا چہرہ خوبصورت اور آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ وہ اپنے کردار اور ذہنی طاقت سے دوسروں کو اپنا اسیر کر لیتی تھی۔ اس کا اسلوب جو نپا تلا اور بے رحمانہ تھا' اس کی جرات مندانہ روح کا آئنہ تھا۔ اس کی طرز نگارش کے کئی روپ تھے۔ انقلاب اور انقلابی جذبہ' انسان اور فن' فطرت' پرندے اور پروان چڑھتی اشیاء یہ سب اس کی روح کے تار تھے۔ ایک دفعہ اس نے لوس کٹسکی کو لکھا: ''جب میں یہ کہتی ہوں تو اس وقت کسی کو یقین کرنے کیلئے میرے پاس ہونا چاہیے کہ میں کسی غلط فہمی کی بنا کر عالمی تاریخ کے بھنور میں پھنسی ہوئی ہوں۔ جب کہ اصل میں مجھے کھیتوں میں راج ہنسوں کو دیکھنے کیلئے پیدا ہونا چاہیے تھا۔'' ہماری کوئی بڑی ذاتی دوستی نہیں تھی۔ ہماری ملاقاتیں مختصر اور کبھی کبھار ہوتی تھیں۔ میں اس کا دور سے مداح تھا۔ میرا خیال ہے میں

اس وقت اسے صحیح طور پر پہنچان نہیں سکا تھا۔''مستقل انقلاب'' کے متعلق اس کا نقطہ نظر وہی تھا جو میرا تھا۔ایک دفعہ کانگریس کے موقع پر لابی میں لینن اور میرے درمیان نیم مزاحیہ قسم کی گفتگو ہو رہی تھی۔مندوبین ہمارے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔لینن نے روسا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔''وہ روسی زبان ٹھیک طرح بول نہیں سکتی۔'' میں نے برجستہ جواب دیا۔''مگر وہ مارکسی زبان بہترین بولتی ہے۔'' ہم سب ہنس پڑے۔

کانگریس میں مجھے بورژوا انقلاب اور اس کی کانوں سے خصوصی تعلقات میں پرولتاریہ کے حصے پر اظہار خیال کا دوبارہ موقع مل گیا۔لینن نے بحث کو سمیٹے ہوئے کہا۔''ٹراٹسکی کا خیال ہے کہ آج کے انقلاب میں کسانوں اور پرولتاریہ کے مشترکہ مفادات ہیں۔بورژوا جماعتوں کے متعلق ہماری بنیادی باتیں یہاں ایک دوسرے سے ملتی ہیں۔'' یہی بات میں نے 1905ء میں کہی تھی۔یہاں میں فقط یہ اضافہ کرنا چاہوں گا کہ لندن میں میری 1907ء کی تقریر آج بھی بالکل صحیح ثابت ہوئی ہے۔اسے اکتوبر انقلاب کے بعد بالشویکوں کا کسانوں اور بورژوازی کی طرف رویے کی مثال کے طور پر علیحدہ شائع کیا گیا تھا۔

لندن سے میں برلن اپنی بیوی کو ملنے چلا گیا جس نے سینٹ پیٹر برگ سے وہاں آنا تھا۔اس وقت پروس بھی سائبیریا سے فرار ہو چکا تھا۔ڈرسڈن میں اس نے میری کتاب''وہاں اور وہاں سے واپسی'' کی اشاعت کا انتظام کیا یہ کتاب جس کا تعلق میرے فرار سے تھا' میں اس کا روسی انقلاب کے حوالے سے پیش لفظ لکھنے پر بھی متفق ہو گیا۔چند ماہ میں اس پیش لفظ سے میری کتاب''روس انقلاب کی زد'' میں برآمد ہو گئی۔پھر میری بیوی پروس اور میں سوئٹزرلینڈ کی آوارہ گردی پر نکل گئے۔گرمیاں ختم ہو رہی تھیں۔موسم شاندار اور صبحیں بے حد سہانی تھیں۔ہم پہاڑوں کی ہوا کھاتے اور دودھ پیتے رہے۔ایک وادی میں اترتے وقت میری بیوی اور میں بڑی مشکل سے جان گنوانے سے بچ گئے۔بعد میں ہم بوہیمیا میں ایک چھوٹے سے گاؤں میں چلے گئے

جس کا نام ہرسچ برگ تھا۔ چھوٹے سرکاری اہل کار گرمیاں گزارنے یہاں آتے تھے۔ ہم نے چند ہفتے وہاں قیام کیا۔ جب ہمارے پیسے ختم ہونے لگے' اور یہ ہوتا رہتا تھا' تو ہم سوشل ڈیموکریٹ اخبارات کیلئے مضمون لکھنے لگے۔ ہرسچ برگ کے قیام کے دوران میں میں نے سینٹ پیٹرز برگ میں ایک بالشویک اشاعت گھر کیلئے جرمن سوشل ڈیموکریسی پر کتاب لکھی۔ 1905ء کے بعد میں دوسری مرتبہ یہ خیال آگے بڑھایا کہ سوشل ڈیموکریسی کی بڑی مشین' بورژوا سماج کے کسی نازک لمحے میں قدامت پسند نظام کو بچانے کے کام آ تی سکتی تھی۔ اس وقت میں یہ دیکھنے سے قاصر تھا کہ حقائق کس حد تک میرے نظریاتی مفروضے کی تصدیق کریں گے۔ ہرسچ برگ سے ہم اپنے اپنے راستے پر ہولئے۔ میں سٹیچ گارڈ کانگریس کی طرف' میری بیوی روس اپنا بیٹا لینے اور پروس جرمنی چلا گیا۔

وہ سوشلسٹ انٹرنیشنل کانگریس میں بھی تک 1905ء کے انقلاب کی طوفانی صدائے بازگشت سنائی دے رہی تھی۔ ہرکوئی بائیں بازو کے نقطہ نظر کے مطابق بات کر رہا تھا۔ مگر انقلابی طریقہ کار سے مایوسی کا اظہار صاف طور پر محسوس ہورہا تھا۔ روسی انقلابی ابھی تک دلچسپی کا باعث بنے ہوئے تھے۔ مگر اس میں ایک طنزیہ عنصر بھی شامل تھا۔ جیسے لوگ کہہ رہے تھے۔ ''دیکھو' وہ پھر آ گئے ہیں۔'' فروری 1905ء کو ویانا کے راستے روس جاتے وقت میں نے وکٹر ایڈلر سے پوچھا کہ جمہوری حکومت میں سوشل ڈیموکریسی کی شمولیت کے کیا امکانات تھے۔ ایڈلر نے مجھے اپنے مخصوص طریقے سے جواب دیا۔ ''میں تسلیم کرتا ہوں کہ میرے امید سے کہیں زیادہ تم لوگ جمہوری حکومت تشکیل دینے کے قریب پہنچ گئے تھے''۔ ایڈلر کا رویہ میری طرف عام طور پر بڑا دوستانہ ہوتا تھا۔

سٹچ گارڈ کانگریس میں برطانوی مندوب کوچ آیا ہوا تھا۔ اس نے 1902ء میں مجھے برٹش میوزیم میں داخلہ دلایا تھا۔ وہ ہتک آمیز انداز میں سفارتی کانفرنس کو چوروں کا اجلاس سمجھ رہا تھا۔ یہ بات پرنس وون بولو کو پسند نہ آئی۔ برلن کے دباؤ کے تحت ورٹم

برگ کی حکومت کو کوپچ کو کانگریس سے باہر نکالنا پڑا۔ بیبل اس پر بے چین ہوگیا۔ پارٹی میں اتنی جرات نہیں تھی کہ وہ کوپچ کے نکالنے جانے پر احتجاج کرتی۔ ایک بھی مظاہرہ نہ ہوا۔ جیسے انٹرنیشنل کانگریس کوئی سکول روم تھا۔ جس میں شرارتی لڑکے کو جماعت سے باہر نکال دیا جائے اور باقی جماعت خاموش رہے۔ جرمن سوشل ڈیموکریسی میں بزدلی کا سایہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔

اکتوبر 1917ء میں میں وی آنا میں تھا۔ میری بیوی بھی بیٹے کو لے کر وہاں آ گئی۔ انقلاب کی نئی لہر کے انتظار میں ہم نے شہر کے مضافات میں ہٹل ڈورف میں رہائش اختیار کر لی۔ وہاں ہمیں ++ کہیں اور لے گئی جس نے یورپ کی زمین کو خون سے تر کر دیا تھا۔ جب دوسرے جلاوطن سوئٹزرلینڈ اور پیرس میں تھے۔ تو ہم نے آخر ویانا کو کیوں چنا تھا؟ اس وقت جرمن سیاسی زندگی سے میرے گہرے رابطے تھے۔ لیکن پولیس کی وجہ سے برلن میں ہمارا رہنا مشکل تھا۔ لہذا ہم نے ویانا کو اپنا گھر بنا لیا۔ لیکن ان سات برسوں میں میں آسٹروی زندگی کی بجائے جرمن زندگی کو زیادہ غور سے دیکھتا رہا۔ آسٹروی زندگی مجھے پنجرے میں گلہری جیسی لگتی تھی۔

پارٹی کے مسلمہ راہنما وکٹر ایڈلر کو میں 1902ء سے جانتا تھا۔ اب میں اس پارٹی اور اردگرد کے لوگوں سے واقفیت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ہلفرڈنگ سے میری آشنائی 1907ء میں کٹسکی کے گھر پر ہوئی تھی۔ اس وقت اس کا انقلابی پن اپنے عروج پر تھا جو اسے روسا الکسمبرگ اور کارل لب نخٹ سے حقارت کا رویہ اختیار کرنے سے نہ روک سکا۔ لیکن میں روس کی خاطر بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح جان پر کھیل جانے کو تیار تھا۔ میرے آنے سے پہلے ہی اس نے مختلف رسالوں میں میرے ترجمہ شدہ مضامین پڑھ رکھے تھے۔ اس کا اصرار تھا کہ ہم ایک دوسرے کو ''تم'' کہہ کر مخاطب کیا کریں۔ اسی وجہ سے ہمارے ظاہری تعلقات بڑے بے تکلف ہو گئے۔ لیکن اس کی کوئی سیاسی یا اخلاقی بنیاد نہیں تھی۔

ہلفرڈنگ جرمن سوشل ڈیموکریسی کو ایک لولی لنگڑی اور بے کار چیز سمجھتا تھا اور اس

کا موازنہ آسٹروی پارٹی کی سرگرمیوں سے کرتا رہتا تھا۔ اس کی تنقید میں آگ بھری ہوتی تھی۔ عملی طور پر وہ جرمن پارٹی میں بطور ادیب کام کرتا تھا اور اس سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ جب کبھی وہ ویانا آتا مجھے ایک کیفے میں لے جاتا اور وہاں آسٹروی مارکسسٹوں سے میرا تعارف کراتا رہتا۔ میں جب بھی برلن جاتا تو ہلفرڈنگ سے ضرور ملتا۔ ایک دفعہ برلن کے ایک کیفے میں میکڈونلڈ سے میری ملاقات ہوئی۔ برن سٹین نے مترجم کے فرائض انجام دیے۔ ہلفرڈنگ سوال پوچھتا رہا۔ میکڈونلڈ جواب دیتا رہا۔ وہی گھسی پٹی باتیں۔ میں دل میں سوچتا رہا کہ ان تینوں میں سے کوئی شخص اس چیز سے دور ہے جسے میں سوشلزم کہتا ہوں۔ مجھے کوئی جواب سوجھ نہیں رہا تھا۔

برٹ امن مذاکرات کے دوران میں مجھے ہلفرڈنگ کا ایک خط ملا۔ اس سے کہیں اہم بات کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی بہرحال میں نے خط کھول لیا۔ اکتوبر انقلاب کے سوشلسٹ مغرب سے یہ پہلی براہ راست آواز آئی تھی۔ مگر مجھے اس میں ملا کیا؟ ہلفرڈنگ نے ایک قیدی کی رہائی کا مطالبہ کیا تھا۔ وہ ویانا کا کوئی ڈاکٹر تھا۔ خط میں انقلاب کے متعلق ایک بھی لفظ نہیں لکھا گیا تھا۔ اس کے باوجود وہ مجھے تم کہہ کر بلانا پسند کرتا تھا۔ ہلفرڈنگ جس قسم کا آدمی تھا میں بخوبی جانتا تھا۔ میں اس کے متعلق کسی قسم کی غلط فہمی میں مبتلا نہیں تھا۔ مگر مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

لینن نے اس موقع پر جس زندہ دلی سے پوچھا تھا مجھے اب تک یاد ہے۔

''سنا ہے تمہیں ہلفرڈنگ کا خط آیا ہے؟''

''جی ہاں''

''کیا لکھا ہے؟''

''اپنے ایک قیدی رشتہ دار ڈاکٹر کی مدد کو کہا ہے۔''

''انقلاب کے متعلق اس نے کیا لکھا ہے؟''

''کچھ نہیں لکھا۔''

''کچھ نہیں لکھا؟''

''نہیں کچھ نہیں لکھا۔''

''یقین نہیں آتا''، لینن نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ میں پہلے ہی خود کو سمجھا چکا تھا کہ اکتوبر انقلاب اور برسٹ میں وقوع پذیر ہونے والے المیے کی ہلفرڈنگ کے نزدیک بس اتنی اہمیت تھی کہ ایک رشتہ دار قیدی کی رہائی کا مطالبہ کیا جا سکے۔ لینن نے اپنی حیرت کا اظہار جن دو چار نوحہ کناں جملوں میں کیا انہیں میں نے اپنے قاری کیلئے ضابطہ تحریر میں لانے سے معذرت خواہ ہوں۔

یہ ہلفرڈنگ تھا جس نے مجھے ویانا میں اپنے دوستوں اوٹو بائر، میکس ایڈلر اور کارل رینر سے متعارف کرایا تھا۔ یہ سب پڑھے لکھے لوگ تھے جن کا بعض موضوعات پر علم مجھ سے کہیں زیادہ تھا۔ میں مرکزی کیفے میں بیٹھا ان کی باتیں بڑے غور اور دلچسپی سے سنا کرتا تھا۔ لیکن جلد ہی میں پریشان ہونا شروع ہو گیا۔ یہ لوگ انقلابی نہیں تھے۔ بلکہ وہ لوگ تھے جن کا انقلاب سے دور کا تعلق بھی نہیں تھا۔ ایسا ان کی ہر بات سے محسوس ہوتا تھا۔ مجھے تو ان کی باتوں سے صہونیت دشمنی کی بو بھی آتی تھی۔

مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ یہ پڑھے لکھے مارکسسٹ سیاست میں بڑے مسائل سامنے آنے پر ان کے حل کیلئے مارکسی طریقے استعمال کرنے کے نااہل تھے، خاص طور پر جب کہ انقلاب جنم لے رہا تھا۔ سب سے پہلے مجھے ایزنے مایوس کیا۔ ہم ایک کیفے میں بڑی دیر تک بیٹھے رہے۔ میں ہٹل ڈورف میں رہتا تھا اور وہاں جانے کیلئے کوئی گاڑی پکڑنے میں مجھے دیر ہو گئی رینر نے مجھے اپنے گھر رات گزارنے کیلئے کہا۔ اس وقت اس پڑھے لکھے آدمی کے ذہن سے یہ خیال بہت دور تھا کہ آسٹریا۔ ہنگری کی غم زدہ قسمت جس کا وہ بڑا علمبردار تھا، ایک دن اسے آسٹروی جمہوریہ کا چانسلر بنا دیگی۔ اس کے گھر کی طرف چلتے ہوئے ہم روس میں ممکنہ واقعات پر بات کرنے لگے جہاں رد انقلاب اپنے قدم مضبوطی سے جما چکا تھا۔ رینر گفتگو میں بڑی عدم دلچسپی کا اظہار کر رہا تھا۔ اس کے برعکس وہ آسٹروی وزیر بیرن بک کے متعلق باتیں کرنے کا زیادہ مشتاق تھا۔ روس کے متعلق اس کے خیالات کچھ اس قسم کے تھے۔ 3 جون 1907ء کے فوجی انقلاب

کے بعد سٹولپین دستور کے تحت جاگیرداری اور بورژوازی کے درمیان جو اتحاد ہوا ہے اس سے روس میں پیداواری طاقتوں کو ترقی کا موقع ملے اور اس اتحاد کے قائم رہنے کے بڑی امکانات تھے۔ میں نے جواب میں کہا کہ جاگیرداری اور بورژوازی کا اتحاد ایک دوسرے انقلاب کی راہ ہموار کر رہا تھا جس سے اقتدار روسی پرولتاریہ کے پاس منتقل ہونے کے بڑے امکانات تھے۔ لیمپ پوسٹ کی روشنی میں رینر کا میری طرف اچٹتی ہوئی پریشان نظروں سے دیکھنا مجھے ابھی تک یاد ہے۔ اس نے میری بات کو مجذوب کی بڑ سمجھا۔ شاید اسے سچ گارڈ میں انٹرنیشنل سوشلسٹ کانگریس میں میری وہ تقریر یاد آ گئی تھی جس میں میں نے عالمی انقلاب کے وقت اور تاریخ کا اعلان کیا تھا۔

''آپ کا یہ خیال ہے؟'' اس نے بے حد مہذبانہ انداز میں پوچھا۔ ''ممکن ہے مجھے روس کے حالات سے زیادہ واقفیت نہ ہو۔'' بات جاری رکھنے کی کوئی مزید وجہ نہیں تھی صاف دکھائی دے رہا تھا کہ وہ شریف آدمی انقلابی جدلیات سے اتنا ہی دور تھا جتنا قدیم مصر کا کوئی فرعون۔

میرے پہلے تاثرات بعد کے مشاہدات سے زیادہ گہرے ہوتے گئے۔ یہ پڑھے لکھے لوگ تھے۔ عام طور پر مارکسی فلسفے پر اخبارات میں بڑے عمدہ مضامین بھی لکھ لیتے تھے۔ لیکن میرے لئے وہ اجنبی تھے۔ ان لوگوں سے تعلقات میں اضافے کے ساتھ مجھے اپنے اس مشاہدے پر زیادہ یقین ہوتا چلا گیا۔ اپنے مضامین اور تقریروں کے بجائے اپنی روزمرہ کی بے تکلف گفتگو میں یہ لوگ بڑے کھلے طور پر عورتوں سے اپنی حقارت، پولیس کے ڈر، چھوٹے دکانداروں کی حمایت اور اسی نوعیت کے دوسرے موضوعات پر بڑی شیخی بگھارا کرتے تھے۔ اکثر اوقات حیرت میں میرے منہ سے نکل جایا کرتا تھا۔ ''واہ کیا انقلابی ہیں۔'' میں یہاں ورکروں کی بات نہیں کر رہا۔ ان کے بھی اپنے تعصّبات تھے مگر بڑی سادہ نوعیت کے۔ میں آسٹریا کے اعلیٰ پائے کے مارکسسٹوں پارلیمان کے اراکین، ادیبوں اور صحافیوں سے ملتا رہتا تھا۔ ان ملاقاتوں میں میں دیکھتا تھا کہ انسان کے غیر معمولی ذہن میں کیسی کیسی باتیں جمع ہوتی رہتی ہیں اور

وہ ایک نظام میں رہتے ہوئے اپنی تعلیم نو سے کیسے گریز کرتا رہتا ہے۔ایک مارکسسٹ سیاسی اور معاشی ہیجان ہی میں رہ کر مارکسسٹ بن سکتا ہے۔اسے روایات اور عادات کو رد کرنا پڑتا ہے۔لیکن میں نے آسٹروی مارکسسٹ کو بڑا متعصب پایا۔اس نے مارکس کے نظریے کے بعض حملے کسی قانون کی عام کتاب کی طرح پڑھ لیے تھے اور اب انہیں پر انہیں پرزندہ تھا۔ویانا میں اپنے سات سالہ قیام کے دوران میں آسٹروی سوشل ڈیمو کریسی کا کارکن ہوتے ہوئے بھی مجھے اس کے بالائی سطح کے لوگوں سے بات کرتے وقت کبھی کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی حالانکہ میں ان کے جلسوں میں جاتا' مظاہروں میں شرکت کرتا' ان کے رسالوں میں مضامین بھیجتا اور بعض اوقات جرمن زبان میں جھوٹی موٹی تقریر بھی کرلیتا تھا۔اس کے باوجود سوشل ڈیموکریٹ راہنما میری لئے اجنبی تھے جب کہ ان کے مقابلے میں ورکروں کے اجلاس یا یوم مئی پر مظاہروں میں میں خود زیادہ بہتر محسوس کرتا تھا۔

ایسے ماحول میں مارکس اور اینگلز کے درمیان ہونے والی گفتگوؤں پر مشتمل کتابیں میرے لئے ایک بڑا سہارا تھیں۔ یہ میرے اپنے خیالات اور باقی دنیا کی طرف میرے رویے کا کڑا امتحان تھیں۔ ویانا کی سوشل ڈیموکریسی کے راہنما بھی میرا ہی فارمولا استعمال کرتے تھے' مگر ہم لوگ نظریات کو تھوڑا سا موڑ دے کر مختلف شکل دے دیتے تھے۔سوشل ڈیموکریسی سے ہمارا معاہدہ عارضی اور غیر حقیقی تھا۔ مارکس اور اینگلز کے درمیان مراسلہ نگاری میرے لئے نظریاتی ہی نہیں بلکہ ایک نفسیاتی انکشاف بھی تھا۔ ہر صفحے پر مجھے اس بات کا ثبوت ملتا تھا کہ میں ان سے براہ راست نفسیاتی طور پر جڑا ہوا تھا۔انسانوں اور نظریات کے متعلق ان کا رویہ میرا اپنا رویہ لگتا تھا۔جس چیز کا وہ اظہار نہیں کرسکتے تھے میں اس کا اندازہ کرسکتا تھا۔ میں ان کی ہمدردیاں اور نفرتوں میں ایک جیسا شامل تھا۔ وہ دونوں مکمل انقلابی تھے۔مگر ان میں فرقہ پرستی کا شائبہ تک نہیں تھا۔ وہ دونوں' خصوصاً اینگلز کسی وقت بھی کہہ سکتے تھے کہ انسان کی کوئی چیز بھی ان کیلئے اجنبی نہیں ہے۔لیکن ان کے انقلابی نقطہ نظر نے انہیں انسانوں کے

کاموں اور تقدیر سے بہت بلند کر دیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتیں ان کی شان کے خلاف تھیں۔ اوچھا پن تو ان کے بوٹوں کے تلووں کو بھی نہیں چھو سکتا تھا۔ ان کی تحسین مزاج ' ہمدردیاں -- ان سب میں روحانی شرافت کی نادر فضا ہوتی تھی۔ وہ کسی کو سخت تنقید کا نشانہ بناتے تھے مگر گرے ہوئے معیر کے ساتھ ہرگز نہیں۔ وہ بے رحم ہو سکتے تھے مگر ظالم نہیں۔ ظاہری شان و شوکت ' القابات ' تمغے وغیرہ ' ان سب کی طرف وہ ایک سرد حقارت کے ساتھ دیکھتے تھے۔ ان کی تحریروں کے بعد جب میں ان کے خطوط پڑھے تو میں نے محسوس کیا کہ جس چیز نے مجھے مارکس اور اینگلز کی دنیا سے اتنے گہرے طور پر جوڑ رکھا ہے اسی نے آسٹروی مارکسسٹوں سے غیر مصالحانہ طور پر مخالفت پر مجبور بھی کر دیا تھا۔

یہ لوگ خود کو حقیقت پسند اور مادہ پرست کہلا کر بڑا فخر محسوس کرتے تھے۔ مگر یہاں بھی وہ اتھلے پانی میں تیرتے تھے۔ ویانا پارٹی نے 1907ء میں اپنے فنڈز میں اضافہ کرنے کی خاطر ڈبل روٹی کی ایک بیکری بنائی۔ یہ بہت ہی فضول قسم کی مہم جوئی تھی۔ اصولی طور پر بھی اور عملی طور پر بھی۔ میں نے شروع ہی سے اس کی مخالفت کی۔ لیکن ویانا کے مارکسسٹوں نے ایک خندہ تحقیر سے مجھے جواب دیا۔ بیس برس بعد بہت سے نقصان اور ندامت کے ساتھ اس بیکری کو کسی کے پاس فروخت کرنا پڑا۔ اوٹو بائر نے اس بیکری کو فروخت کرنے کی ضرورت میں کئی دلائل دینے کے علاوہ یہ دلیل بھی دی کہ میں دھمکیاں دیتا رہتا تھا۔ لیکن اس نے کارکنوں کو یہ کیوں نہ بتایا کہ میں جو کچھ دیکھ رہا تھا ' وہ اسے دکھائی کیوں نہیں دے رہا تھا اور اس نے میری تنبیہ پر عمل کیوں نہیں کیا تھا۔ جو میری بصارت کی کوئی اتنی بڑی مثال بھی نہیں دی۔ میں نے کوئی مارکیٹ کی صورتحال دیکھ کر تنبیہ نہیں کی تھی بلکہ سرمایہ دارانہ سماج میں ایک پرولتاری پارٹی کی حیثیت دیکھی تھی۔ یہ ایک بڑا تنگ اور محدود نوعیت کا انداز تھا مگر درست ثابت ہوا۔ میں اصل میں اپنے آسٹروی حزب مخالف کو مارکسی طریقہ کار کی برتری کا احساس دلانا چاہتا تھا۔

وکٹر ایڈلر اپنے ساتھیوں سے کہیں زیادہ بلند سطح پر کھڑا تھا۔ لیکن وہ ایک عرصے سے شک پرست ہو گیا۔ آسٹروی زندگی کی گنجک میں اس کی صلاحیتیں چھوٹی چھوٹی

باتوں پر ضائع ہو رہی تھی۔ مستقبل کا لینڈ سکیپ دھندلا تھا اور ایڈلر کبھی کبھی نمایاں نمایاں طریقے سے اس جانب سے نظریں پھیر لیتا تھا۔ ''ایک پیغمبر کا کام ناشکر گزاری کا کام ہوتا ہے' اور پھر وہ بھی آسٹریا میں'' وہ اپنی تقریروں میں یہ جملہ اکثر دہرایا کرتا تھا۔ ''تم جو چاہو کہو۔'' اس نے سٹُٹ گارڈ کانگریس کے دوران میں مجھ سے کہا۔ ''جہاں تک میرا تعلق ہے میں تاریخ کی مادہ پرستانہ تشریح پر آسمانی کتابوں میں درج سیاسی پیشن گوئیوں کو زیادہ ترجیح دوں گا۔''

یہ ایک طرح کا مذاق تھا' اور مذاق تھا بھی نہیں۔ اسی بات نے میرے نزدیک اہم اشیا کے حوالے سے ہم دونوں کو مخالف سمتوں میں کھڑا کر دیا تھا۔ مستقبل کے ایک وسیع سیاسی تناظر کے بغیر میں کسی سیاسی یا ادبی سرگرمی کا تصور ہی نہیں کر سکتا۔ وکٹر ایڈلر شک پرست بن گیا تھا اور اسی وجہ سے وہ ہر بات برداشت کر جاتا تھا۔ اس نے خود کو ہر چیز کے مطابق ڈھال لیا تھا' خصوصاً ایک قوم پرست کے جذبے میں' جس نے آسٹروی سوشل ڈیموکریسی کا بیڑا غرق کر دیا تھا۔

جب میں آسٹروی سوشل ڈیموکریسی کی جنگ جوآنہ وطن پرستی کے خلاف کھل کر کھڑا ہو گیا تو پارٹی کے راہنماؤں سے میرے تعلقات زیادہ خراب ہو گئے۔ یہ 1909ء کی بات ہے۔ بلقان کے سوشلسٹوں سے ملاقات کے دوران میں' خصوصاً سرب سوشلسٹوں سے جن میں ایک دمتری تتسووچ تھا اور جو بعد میں بلقان کی جنگ میں مارا گیا تھا' میں نے یہ شکایات سنی تھیں کہ سربیا کا سارا بورژوا پریس ایک شرمناک خوشی کے ساتھ جنگ جوآنہ نعرے لگانے کے ساتھ یہ بھی کہہ رہا تھا کہ کارکنوں کا بین الاقوامی اتحاد ایک فراڈ اور دھوکے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ یہ سب کچھ ''آربیتر ذی تنگ'' میں شائع ہوتا تھا۔ میں نے ''آربیتر ذی تنگ'' کی جنگ جوآنہ وطن پرستی کے خلاف محتاط مگر دبے غصے سے بھرا ایک مضمون لکھا اور اسے اشاعت کیلئے ''نیوزیت'' کو بھیج دیا۔ کوتسکی نے بہت سی ہچکچاہٹ کے بعد مضمون شائع کر دیا۔ اگلے دن ایک معمر روسی مہاجر کلیسا چکو نے جس کے ساتھ میرے دوستانہ تعلقات

تھے' اطلاع دی کہ پارٹی کے راہنما مجھ سے بڑے ناراض تھے اور کہہ رہے تھے۔ ''اس نے یہ جرات کیسے کی؟''

اوٹو بائیر اور دوسرے آسٹروی مارکسسٹوں نے نجی طور پر تسلیم کیا کہ اخبار کا غیر ملکی خبروں کا ایڈیٹر لنٹر ذرا زیادہ ہی آگے جا رہا تھا۔ دراصل یہ ایڈلر کی اپنی رائے تھی جس کا اظہار دوسروں کے ذریعے ہو رہا تھا۔ وہ حد سے تجاوز وطن پرستی برداشت تو کر لیتا تھا مگر پسند نہیں کرتا تھا۔ باہر سے بڑھتی ہوئی مخالفت کے پیش نظر تمام راہنما جذباتی طور پر ایک ہو گئے۔ بعد میں کسی ایک ہفتے کے دن اوٹو بائیر اس میز پر آیا جس پر میں اور کلیسا چکو بیٹھے تھے۔ وہ مجھ پر برسنے لگا۔ میں نے اس سے کہا کہ اس کے لفظوں کی بوچھاڑ کے سامنے میں کچھ کہنے سے قاصر تھا۔ میں اس کے طرز تکلم پر نہیں بلکہ اس کے طرز استدلال پر حیران ہو رہا تھا۔

''لنٹر کے مضامین کی کیا اہمیت ہے؟'' اس نے قدرے مزہ دینے والی ہٹ دھرمی سے پوچھا۔'' آسٹریا-ہنگری کیلئے خارجہ پالیسی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ کوئی ورکر اسے پڑھتا بھی نہیں۔ اس کی ذرا اہمیت نہیں۔''

میں پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے یہ لوگ نہ انقلاب اور نہ ہی جنگ پر یقین رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے یوم مئی کے مینی فیسٹو میں جنگ اور انقلاب کے متعلق لکھا تو ضرور تھا لیکن اسے کبھی سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔ انہیں دکھائی ہی نہیں دے رہا تھا کہ تاریخ اپنے بھاری بوٹوں کے ساتھ چیونٹیوں کے اس ڈھیر کو کچل کر آگے بڑھ رہی تھی جس پر وہ بڑی بے خبری کی حالت میں ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ چھ برس بعد انہیں معلوم ہوا کہ آسٹریا-ہنگری کی بھی کوئی خارجہ پالیسی تھی۔ اس وقت بھی وہ اسی بے شرمی کی زبان میں باتیں کرنے لگے جو انہوں نے لنٹر اور اس جیسے دوسرے جنگ جو وطن پرستوں سے سیکھی تھی۔

برلن میں ماحول زیادہ نہیں تو ایک حد تک مختلف ضرور تھا۔ وہاں ویانا جیسا احمقانہ استادنہ اور عاملانہ رویہ بمشکل دکھائی دیتا تھا۔ باہمی تعلقات بڑے سادہ تھے۔ قوم پرستی

بھی زیادہ نہیں تھی۔ اگر تھی بھی تو خود کو آسٹریا جیسی شدت کے ساتھ ظاہر نہیں کرتی تھی۔ جہاں کئی قومیں آباد تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وقتی طور پر تمام قوم پرستانہ جذبات پارٹی کے پندار میں ڈھل گئے تھے۔ سب سے طاقت ور سوشل ڈیموکریسی -- پہلا بین الاقوامی ساز۔

ہم روسیوں کیلئے جرمن سوشل ڈیموکریسی ماں اور استاد کی طرح ایک زندہ مثال تھی۔ ہم دور سے اس کی پرستش کرتے رہتے تھے۔ ہم ببیل اور کٹسکی کے نام بڑی عقیدت سے لیتے تھے۔ جرمن سوشل ڈیموکریسی کے متعلق پریشان کن نظریاتی پیش اندیشگی کے باوجود جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں' میں بلا شبہ اس کے جادو میں گرفتار تھا۔ یہ حقیقت اس میں مزید اضافہ کر دیتی کہ رہتا تو میں ویانا میں تھا مگر کبھی کبھی برلن کا چکر لگاتا رہتا تھا اور دونوں سوشل ڈیموکریٹک حکومتوں کا موازنہ کر کے خود سے کہتا تھا۔ ''نہیں' برلن ویانا جیسا نہیں ہے۔''

برلن میں میں نے بائیں بازو والوں کی دو ہفتہ وار میٹنگ میں شرکت کی۔ وہ جملہ کو ''رین گولڈ'' ریستورانٹ میں ہوتی تھیں۔ اس اجتماع کی بڑی ہستی فراز مہرنگ ہوتا تھا۔ کارل لب نخت بھی آیا کرتا تھا۔ وہ دیر سے آتا اور جلدی چلا جاتا۔ ہلفرڈنگ مجھے پہلے مرتبہ وہاں لے کر گیا تھا۔ اس وقت تک وہ خود کو بائیں بازو والا کہتا تھا اگرچہ وہ روسا الکسمبرگ سے اتنی ہی شدت سے نفرت کرتا تھا جتنی نفرت ڈاشنسکی اس کے خلاف آسٹریا میں اپنے اندر پال رہا تھا۔ وہاں جو باتیں ہوتی تھیں میرا حافظہ انہیں محفوظ کرنے سے قاصر رہا ہے۔ مہرنگ نے ایک دفعہ بڑے طنزیہ انداز میں اپنا گال پھڑکاتے ہوئے (اسے یہ بیماری تھی) مجھ سے پوچھا تھا کہ اس کا کون سا ''لافانی کام'' روسی زبان میں ترجمہ ہوا تھا۔ ہلفرڈنگ گفتگو کے دوران جرمن بائیں بازو والوں کو انقلابی کیا کرتا تھا۔ ''ہم انقلابی ہیں؟'' وہ میری طرف اشارہ کرکے پوچھتا۔ مہرنگ اس کی بات کاٹ کر کہتا۔ ''انقلابی تو وہ ہیں۔'' اور وہ میری طرف اشارہ کرتا کر کے کہتا۔ میں مہرنگ کو بہت کم جانتا تھا۔ پھر میں اس کے اندر پوشیدہ یہود

دشمن سے بھی ملا جو روسی انقلاب کا ذکر اکثر بڑے ہلکے پھلکے مزاحیہ انداز میں کرتا اور میں سمجھنے سے قاصر رہتا کہ وہ سنجیدہ تھا یا واقعی مذاق اڑا رہا تھا۔لیکن مہرنگ اس سلسلے میں سنجیدہ تھا جیسا کہ اس کے بعد کی زندگی سے معلوم ہوا۔

کٹسکی سے میری پہلی ملاقات 1907ء میں ہوئی۔ پروس مجھے اس کے گھر لے کر گیا تھا۔ میں برلن کے نزدیک فریڈی نو میں اسکے چھوٹے سے صاف ستھرے گھر کی سیڑھیاں بڑے جذباتی انداز میں چڑھ رہا تھا۔سفید بالوں والے ایک خوش مزاج آدمی نے جس کی نیلی آنکھیں بے حد صاف تھیں، روسی زبان میں خوش آمدید کہہ کر میرا استقبال کیا۔اس کی کتابوں سے میں اس کے متعلق جو کچھ جانتا تھا، اس ملاقات نے اس کی پرسحر شخصیت کا خاکہ زیادہ مکمل کر دیا۔جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ اس کے گھر میں قسم کے شور کی عدم موجودگی تھی جو اس کی غیر متنازعہ اتھارٹی کا نتیجہ تھی جس نے اسے داخلی سکون مہیا کر رکھا تھا۔اس کے مخالف اسے انٹرنیشنل کا ''پاپا'' کہہ دیتے تھے۔

کٹسکی کا بڑا نظریاتی مقصد یہ تھا کہ اصلاح اور انقلاب میں کسی طرح مصالحت ہو جائے۔اس نے اپنی فکری پختگی اصلاح پسندی کے زمانے میں حاصل کی تھی۔اس کے نزدیک حقیقت ایک سادہ قسم کی اصلاح پسندی تھی اور انقلاب دھند میں لپٹا ہوا ایک مکان۔ مارکسزم کو ایک مکمل نظام قبول کرنے کے بعد اس نے ایک سکول کے استاد کی طرح قبول کیا۔مگر بڑے واقعات اس کے دائرہ نگار سے پرے رہے۔اس کا زوال بھی 1905ء کے انقلاب کے زوال کی طرح جلدی ہو گیا۔کٹسکی سے بات کرنے سے کچھ زیادہ حاصل نہیں ہوتا تھا۔اس کا ذہن بڑا گوشے دار اور خشک تھا۔اس میں نفسیاتی دوربینی اور پھرتی نہیں تھی۔اسکے تجزیے لمبے چوڑے اور لطیفے گھسے پٹے ہوتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ ایک خراب مقرر تھا۔

روسا الکسمبرگ سے کٹسکی کی دوستی کا زمانہ کٹسکی کی بہترین فکری سرگرمیوں کا زمانہ تھا۔لیکن 1905ء کے انقلاب کے بعد جلد ہی ان کے تعلقات میں ایک سرد مہری

آ گئی۔ کٹسکی روسی انقلاب سے بڑی سرگرم ہمدردی جتا تا مگر اس کی تشریح ذرا پرے کھڑے ہو کر کرتا تھا۔ وہ جرمن سرزمین پر انقلابی طریقوں کی نقل مکانی کے خلاف تھا۔ جب ٹریٹو پارک کے مظاہرے سے پہلے میں اس کے گھر گیا تو روسا اس کے ساتھ کسی گرم بحث میں مصروف تھی۔ اگرچہ وہ ایک دوسرے کو ''تم'' کہہ کر بلاتے تھے اور گہرے دوست تھے مگر اس وقت روسا کی آواز میں ایک غصہ تھا اور کٹسکی ایک ہراس کی حالت میں اس کی بات کو بڑے ہلکے پھلکے مزاحیہ انداز میں لے رہا تھا۔ ہم اکٹھے مظاہرے میں شامل ہوئے' روسا' کٹسکی' اسکی بیوی' ہلفر ڈونگ' گستاف' ایکسٹین اور میں۔ راستے میں ان کی جھڑپوں میں زیادہ تیزی آ گئی۔ کٹسکی بطور نماشائی مظاہرے کو دیکھنا چاہتا تھا جب کہ روسا اس میں شرکت حق میں تھی۔

دونوں کی مخالفت 1910 ء میں پروسیا کے مسئلے پر اظہار رائے کے سوال پر کھل کر سامنے آ گئی۔ کٹسکی اس وقت دشمن پر غلبہ پانے کے بجائے دشمن کو تھکا دینے کی پالیسی کا حامی تھا جو ایک ناقابل مصالحت رجحان تھا۔ کٹسکی موجودہ نظام کو بتدریج قبول کرنے کے خطوط پر کام کر رہا تھا۔ دونوں کی مخالفت 1910 ء میں پروشیا کے مسئلے پر اظہار رائے کے سوال پر کھل کر سامنے آ گئی۔ کٹسکی اس وقت دشمن پر غلبہ پانے کے بجائے دشمن کو تھکا دینے کی پالیسی کا حامی تھا جو ایک ناقابل مصالحت رجحان تھا۔ کٹسکی موجودہ نظام کو بتدریج قبول کرنے کے خطوط پر کام کر رہا تھا۔ اس عمل میں جس چیز نے ''تھک جانا'' تھا وہ بورژوا سماج نہیں بلکہ محنت کشوں کی انقلابی خیال پرستی تھی۔ رجعت پسند طبقہ اور سرکاری اہل کار کٹسکی کے ساتھ تھے جوان کیلئے ایک ایسا فکری لباس تراش رہا تھا جس میں ان کی برہنگی چھپ جاتی تھی۔

پھر جنگ چھڑ گئی۔ تھکا دینے کی سیاسی حکمت عملی کی جگہ گھات لگا کر لڑنے کی پالیسی نے لے لی۔ کٹسکی جنگ کیلئے خود کو ویسے ہی ڈھال رہا تھا جیسے اس نے خود کو امن کیلئے تیار کیا تھا۔ لیکن اس وقت روسا نے دکھادیا کہ اپنے نظریات سے وفاداری کیسے نبھائی جاتی ہے۔

مجھے کٹسکی کے گھرلابورکی ساٹھویں سالگرہ کی تقریب یاد ہے۔ مہمانوں میں آگسٹ بیبل بھی تھا جو ستر برس سے تجاوز کر چکا تھا۔ یہ پارٹی کے عروج کا زمانہ تھا۔ وہ پالیسی میں متحد تھے ۔بزرگ لوگ اپنی کامیابیوں کا حساب دیکھ کرمستقبل کے بارے میں بڑے پریقین تھے۔رات کے کھانے پرتقریب کے عین عروج میں لابور بڑے پر لطف خاکے بنا رہا تھا۔ میں اس تقریب میں پہلی بار بیبل اور اس کی بیوی جولیا سے ملا تھا۔ہر کوئی بیبل کا ہر لفظ غور سے سن رہا تھا‘میں بھی۔

بیبل اس نئے طبقے کی سست اور اڑیل تحریک کا نمائندہ تھا جو نیچے سے ابھررہی تھی۔ یہ بوڑھا تھکاوٹ سے چورتھامگر ایک مقصدکی خاطرچلتا جارہا تھا۔اپنے استدلال‘اپنی تقریروں‘اپنے مضامین اور اپنی کتابوں میں بیبل کسی ایسی چیز سے بے خبرنہیں تھاجو فوری طورپر اس کا عملی مقصد پورا نہ کر سکے۔ اس کا شاندار سیاسی ولولہ اسی چیز میں پوشیدہ تھا۔وہ اس طبقے کی نمائندگی کرتا تھاجو اپنے فالتو وقت میں کچھ سیکھتا ہے‘ اپنے ہر لمحے کی قدرکرتا ہے اور فقط اشد ضروری چیزوں کو اپنے اندر جذب کرتاہے۔ یعنی یہ طبقہ انسان کا مکمل مجسمہ ہوتا ہے۔ بیبل بلقان جنگ اور عالمی جنگ کے دوران میں بخارٹ امن کانفرنس کے وقت فوت ہوگیا۔مجھے یہ خبر رومانیہ میں پلوسی کے سٹیشن پر ملی ۔بیبل مر گیا!مجھے یقین نہیں آرہا تھا۔سوشل ڈیمو کریسی کا کیا بنے گا؟لابور پارٹی کے عروج کے بارے میں جو باتیں‌کرتارہتاتھاوہ ایک دم کوندے کی طرح میرے ذہن میں آ گئیں۔پارٹی میں بیس فیصد انقلابی ،تیس فیصد موقع پرست اور باقی بیبل کے ماننے والے تھے۔

بیبل ہیسے کو اپنا جانشین بنانا چاہتا تھا۔بوڑھا بلاشبہ ہیسے کی خیال پرستی کو پسند کرتا تھامگر اس کی انقلابی خیال پرستی کو نہیں‌جواس میں تھی ہی نہیں۔ ہیسے کی خیال پرستی محدود‘روزمرہ کی اور ذاتی نوعیت کی تھی۔وہ اپنی چلتی اور کامیاب وکالت کو پارٹی کے مفاد میں قربان کرنے کو تیار تھا۔روسی انقلابیوں کو اس بات پر حیرت

ہوتی تھی کہ بیبل اپنی تقریروں میں ہیسے کی اس بڑی قربانی کا کبھی ذکر نہیں کیا کرتا تھا۔حتیٰ کہ پارٹی کانگریس کے موقع پر بھی نہیں۔ میرا خیال ہے جنیامیں۔ بیبل نے پارٹی کی مرکزی کمیٹی کیلئے ایک دوسرے چیئرمین کی پراصرار سفارش کی تھی۔میں ہیسے کو جانتا تھا۔پارٹی کی ایک کانگریس کے بعد ہم دونوں نے جرمنی کاایک حصہ اور نومربرگ اکٹھے دیکھا تھا۔ وہ ذاتی تعلقات میں بے حد نرم خو اور نفیس آدمی تھا۔سیاست میں وہ اپنی فطرت کے مطابق چلتا تھا۔یعنی ایک اوسط درجے کا ایماندار آدمی' کسی انقلابی مزاج اور نظریاتی نقطہ نظر کے بغیر ایک سیدھا سادھا دیہاتی جمہوریت پسند۔ فلسفے کے میدان میں وہ قدرے عیاری سے خود کو کانٹ کا پیروکار کہتا تھا۔نازک صورتحال میں وہ قطعی فیصلے سے گریز کرتا۔وہ دیکھواور انتظار کروکی پالیسی پر عمل کرتا۔اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ بعدمیں سیاسی طورپر تراد لوگوں کی پارٹی نے اسے اپنا راہنما چن لیا۔

کارل لب نخت ایک بالکل مختلف آدمی تھا۔میں اسے مدت سے جانتا تھامگر ہماری ملاقاتوں میں طویل وقفے آ جاتے تھے۔لب نخت کا برلن والا گھر روسی مہاجرین کا ہیڈکوارٹر تھا۔جرمن پولیس زاریت کی جو مدد کرتی تھی اس پر ہربار ہمیں احتجاج کرنا پڑتا تھا۔ہم پہلے لب نخت کے پاس جاتے۔وہ ہر دروازے پر دستک دیتا اور قانون کی مدد مانگتا۔وہ ایک تعلیم یافتہ مارکسسٹ تھااور نظریے کے بجائے باعمل آدمی تھا۔ وہ فطرتاً جذباتی اور حسی طورپر بیدار آدمی تھا۔ اسے سیاسی الہام ہوتا تھا۔اسے صورتحال کی خبرہوتی۔اس کا ہاتھ ہمیشہ عوام کی نبض پر ہوتا تھا۔اس میں پہل کرنے کا جذبہ اتم درجے موجود تھا۔وہ صحیح معنوں میں ایک انقلابی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جرمن سوشل ڈیمو کریسی کے گھر میں نصف اجنبی تھا۔جرمن سوشل ڈیمو کریسی اپنے نوکر شاہی رویے کے مطابق آگے بڑھتی اور ضرورت پڑنے پر پیچھے بھی ہٹ جاتی تھی۔وہ متعصب اور فضول قسم کے اوچھے لوگوں کاگروہ تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ بڑی طنزیہ نظروں سے لب نخت کو دیکھتے تھے۔

ستمبر 1911ء کے آغاز میں جنیامیں سوشل ڈیمو کریٹک کانگریس کے موقع پر لب نخت کی تجویزپر مجھ سے کہا گیا کہ میں فن لینڈ میں زار کی حکومت کے مظالم پر بات کروں۔لیکن میری تقریر سے پہلے کیف میں سٹولین کے قتل کی خبر آ گئی۔ببیل ایک دم مجھ سے پوچھنے لگا۔''اس قتل کا کیا مطلب ہے؟اس کی ذمہ دار کون سی پارٹی ہو سکتی ہے؟میری تقریر پر جرمن پولیس چوکنی تو نہیں ہو جائے گی؟''

''آپ ڈرتے ہیں؟''میں نے بوڑھے سی محتاط انداز میں پوچھا۔مجھے سٹینٹ گارڈ میں کیوبلچ کی بات یاد آ گئی۔''میری تقریر کوئی مصیبت تو کھڑی نہیں کر دے گی؟''اس نے پوچھا۔

''ہاں میں ڈرتا ہوں۔'' ببیل نے جواب دیا۔''میں چاہوں گا کہ تم تقریر نہ کرو۔''

''ٹھیک ہے۔''

ببیل نے سکھ کا سانس لیا۔ایک لمحے بعد لب نخت میری طرف ڈورتا ہوا آیا۔اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔''کیا تمہیں تقریر نہ کرنے کو کہا گیا ہے؟اور تم اس سے متفق ہو گئے ہو؟''

''میں کیسے انکار کر سکتاہوں؟''میں نے جواب دیا۔''میزبان ببیل ہے'میں نہیں ہوں۔''

لب نخت نے اپنی تقریر میں سارا غصہ نکال لیا۔وہ زار حکومت پر بے رحمانہ طورپر برسا۔پریذیڈم کی طرف سے اشارے ہوتے رہے مگر اس نے کسی کی پرواہ نہ کی۔ بعد کی ساری تکلیفوں کا سبب یہی تقریریں تھیں۔

جب چیک ٹریڈ یونینوں نے جرمن قیادت کی مخالفت کی تو یہ آسٹروی مارکسسٹوں نے اسے ٹریڈ تنظیموں میں پھوٹ قراردے دیااور بڑی مہارت سے بین الاقوامیت کا توڑ تلاش کر لیا۔کوپن ہیگن میں بین لااقوامی کانگریس کے موقع پر اس

مسئلے پر پلیخانوف نے اپنی رپورٹ پیش کی۔تمام روسیوں کی طرح اس نے چیک نقطہ نظر کے خلاف جرمن نقطہ نظر کی مکمل اور کھل کر حمایت کی۔ کمیٹی کے صدر کیلئے بوڑھے ایڈلر نے پلیخانوف کا نام تجویز کیا۔سلاوک وطن پرستی کے توڑ کے جواب میں کسی روسی کو آگے لانا ضروری تھا۔چیک کیس کو جائز ثابت کرنے کیلئے نیسمی،سوکپ اور سمیرل نے مجھ پر دباؤ ڈالا مگر میں نے ان کی قومی تنگ نظری کو افسوس کے ساتھ رد کر دیا۔ میں نے آسٹروی مزدور تحریک کو اس قدر قریب سے دیکھا تھاکہ یہ لوگ چیک لوگوں پر کوئی الزام لگانے کی حیثیت میں نہیں تھے۔اس بات کے بہت سے ثبوت موجود تھے کہ چیک پارٹی کے کارکن آسٹرو-جرمن پارٹی کے کارکنوں سے زیادہ انقلابی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ نیمی جیسا وطن پرست ویانا کی موقع پرست قیادت کے خلاف چیک کارکنوں کی جائز شکایات کو جرمن قیادت کے خلاف استعمال کرنے کے 'موقع کی تلاش میں تھا۔

ویانا میں کوپن ہیگن میں شمولیت کیلئے جاتے وقت ایک سٹیشن پر جہاں میں نے گاڑی تبدیل کرنی تھی،میری ملاقات لینن سے ہو گئی۔وہ پیرس سے آرہا تھا۔ہمارے پاس ایک گھنٹہ تھا۔اس میں ہمارے درمیان ایک اہم گفتگو ہوئی۔پہلے مرحلے میں دوستانہ اور بعد میں اس کے بالکل برعکس۔میری دلیل تھی کہ چیک ٹریڈ یونینوں کے الگ ہو جانے کا الزام اگرکسی پر دیا جا سکتا تھا تو سب سے پہلے وہ ویانا کے راہنما تھے جو بڑی بلند آوازوں میں دنیا کے مزدوروں کوجن میں چیک مزدور بھی شامل تھے،متحد ہوکر لڑنے کی اپیل کرتے اور بعد میں پس پردہ بادشاہت سے سودا کرکے بات ختم کر دیتے تھے۔ لینن بڑے دھیان سے میری بات سنتا رہا۔ دوسرے کی بات غور سے سننے کی اس میں زبردست صلاحیت تھی۔جب اس کامدمقابل بول یا تقریرکر رہا ہوتا تو وہ عرصے میں اس سے پرے خلا میں کہیں دیکھتا رہتا تھا۔

ہماری گفتگو بڑی مختلف نوعیت کی ہوتی گئی۔ بہرحال میں نے لینن کو اپنے تازہ مضمون کے متعلق بتایا جو روسی سوشل ڈیمو کریسی پر تھااور جو'وورورٹسٹن''

میں شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون میں نے کانگریس کیلئے لکھا تھا جس پر بالشویکوں اور منشویکوں نے سخت تنقید کی تھی۔ مضمون میں سب سے چبھتا ہوا سوال''چیزیں نے لینے'' کا تھا۔انقلاب کو شکست کے بعد ''ہتھیاروں کے چھن جانے'' اور دہشت گردوں کے واقعات میں اضافہ ہونے سے انقلابی پارٹی میں انتشار پیدا ہوگیا تھا۔لندن کانگریس میں ووٹوں کی اکثریت منشویکوں،پولوی اور بعض بالشویکوں پر مشتمل تھی۔جب مندوبین نے اپنی کرسیوں سے نعرہ لگایا۔''لینن کیا کہتا ہے؟ ہم لینن کو سنیں گے۔''تو بالشویک اندر ہی اندر ہنسے اور ان کے چہروں پر خوشی کے تاثراقت آگئے۔لندن کانگریس کے بعد''خارج'' کیے جانے کی پالیسی جاری رہی۔یہی وہ نکتہ تھا جسے میں نے اپنے مضمون میں اجاگر کیا۔

''تم ایسا بھی لکھ سکتے ہو؟''لینن نے مجھے ملامت کرتے ہوئے کہا۔اس کے کہنے پر میں نے اسے مضمون کے نمایاں نکتے بتائے۔

''تار بھیج کر یہ مضمون رکوا دو۔''

''نہیں''میں نے جواب دیا۔''مضمون نے آج صبح کے شمارے میں شائع ہو جانا ہے۔''

حقیقت میں واقعی مضمون ٹھیک نہیں تھا۔اس میں کہا گیا تھا کہ پارٹی بالشویکوں اور منشویکوں کے دوبارہ اتحاد سے نئی شکل لے لے گی اور اس میں سے انتہا پسند عناصر نکال دیئے جائیں گے جب کہ اصل بات یہ تھی کہ منشویکوں کی بے درد لڑائی کے بعد پارٹی نے ایک نئی شکل لے لی تھی۔ لینن نے کانگریس میں روسی وفد کو میرے مضمون کی مذمت کرنے کیلئے کہا۔زندگی میں لینن کے ساتھ یہ میرا تیز ترین تصادم تھا۔اس وقت اس کی طبعیت ٹھیک نہیں تھی۔اس کے دانت میں سخت درد تھا اس کا سر پٹی سے بندھا ہوا تھا۔مضمون اوراس کے مصنف کی طرف روسی وفد کا رویہ درشت تھا۔ منشویک میرے ایک دوژسرے مضمون کی وجہ سے مجھ سے ناخوش تھے جس میں ان کی خبر لی گئی تھی۔

''نیوزیٹ'' میں اس نے کس قدر فضول مضمون لکھا ہے۔''ایکسل راڈ نے اکتوبر 1910 ء کو مارٹوف کو لکھا۔''یہ اس مضمون سے بھی زیادہ فضول ہے جو اس نے ''ورورکس'' میں لکھا تھا۔''

لونا چرسکی لکھتا ہے۔''پلیخانوف جو ٹراٹسکی کو سخت ناپسند کرتا تھا'اس نے اس موقع سے فائدہ اٹھاکر ٹراٹسکی کو عدالت میں گھسیٹنا چاہا۔میرے خیال میں یہ بات ٹھیک نہیں تھی۔میں نے ٹراٹسکی سے بات کی۔زار ژوف کے ساتھ مل کر ہم نے پلیخانوف کو یہ منصوبہ ناکام بنا دیا۔''روسی وفد کے زیادہ ممبروں کو مضمون کے متعلق بالواسطہ طورپر رپورٹ ملنے سے اس کے مندرجات کا پتا چلا تھا۔میں نے مضمون کو کانگریس میں پیش کرنے اور پڑھائے جانے کا مطالبہ کیا۔زینوثیف کا خیال تھا کہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔اکثریت نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ میری یاد داشت کے مطابق زار ژوف نے شاید کانگریس میں مضمون بلند آواز میں پڑھا تھا۔مضمون کے متعلق جس طرح پہلے شور مچایا گیا تھااس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی بہت ہی خراب چیز تھی۔لیکن وہ بے ضرر ثابت ہوا۔ مندوبین کی اکثریت نے ووٹوں کے ذریعے اس کی مذمت سے انکار کر دیا۔لیکن میں آج اس مضمون کی بناپر خود مذمت کرتا ہوں کہ اس میں بالشویکوں کا درست تجزیہ نہیں کیا گیا تھا۔

چیک ٹریڈ یونینوں کے مسئلے پر کانگریس میں روسی وفد نے پراگ قرارداد کے مقابلے میں ووٹ دیا۔ میں نے ایک ترمیم متعارف کروانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔مجھے اس وقت تک خود بھی یقین نہیں تھا کہ سوشل ڈیمو کریسی کی پارٹی پالیسی میں کسی قسم کی بڑی ترمیم کی ضرورت تھی۔ ترمیم ایک جہاد کی شکل میں ہونی چاہیے تھی۔اس کیلئے ہم نے 1914 ء تک انتظار کیا۔

نئے انقلاب کی تیاریاں

ردِانقلاب کے زمانے میں میں 1905 کے انقلاب کی تشریح اور اگلے انقلاب کی نظریاتی تحقیق

میں لگا رہا۔ بیروں ملک آنے کے فوراً بعد میں نے روسی مہاجروں اور روسی طلبا کی بستیوں میں دو لیکچر دیے جن کے نام یہ تھے۔''روسی انقلاب کی تقدیر، موجودہ سیاسی صورتحال کے حوالے سے'' اور ''سرمایہ داری اور سوشلزم اور سماجی انقلابی امکانات'' پہلے لیکچر کا نفس مضمون یہ تھا کہ 1905 کے تجربے کی روشنی میں روس میں مستقبل انقلاب آنے کی تصدیق ہوگئی تھی۔ دوسرے لیکچر میں میں نے روسی انقلاب کو عالمی انقلاب سے جوڑ دیا تھا۔

اکتوبر 1908 میں میں نے ویانا سے روسی زبان میں ''پراودا'' (سچائی) کے نام سے اخبار نکالنا شروع کر دیا۔ یہ محنت کشوں کا اخبار تھا۔ اخبار روس کے اندر بحراسود یا گلیشین سرحد سے سمگل کیا جا تا تھا۔ اخبار ساڑھے تین برس تک پندرہ روزہ رہا۔ اس کے باوجود اس پر بڑا کام کرنا پڑتا تھا۔ روس سے خفیہ مراسلہ نگاری بہت سا وقت لے جاتی تھی۔ اس کے علاوہ بحراسود کے جہاز رانوں کی زیرزمین یونین سے بھی میرا رابطہ تھا اور میں ان کو بھی ان کا پرچہ نکالنے میں مدد دیتا تھا۔

''پراودا'' میں زیادہ کام کرنے اور لکھنے والا اے، اے، جوفے تھا جو بعد میں روس کا نامور سفارت کار بن گیا۔ ویانا کے شب و روز ہماری دوستی کے آغاز کا زمانہ تھا۔ جوفے بلند پایہ فکری صلاحیتوں کا مالک تھا۔ ذاتی تعلقات میں بے حد خوشگوار اور اپنے نصب العین سے بے حد وفادار۔ اس نے ''پراودا کو پیسہ اور طاقت دی۔ جوفے کو اعصابی تکلیف ہوگئی اور نامور نفسیات دان الفریڈ ایڈلر سے اپنا علاج کرانے لگا۔ الفریڈ ایڈلر شروع میں فرائڈ کا شاگرد تھا۔ مگر بعد میں اس نے نفسیات کا اپنا سکول قائم کر لیا۔ جوفے کے ذریعے مجھے تحلیل نفسی کا پتا چلا اور اس علاج نے مجھے بڑا مسحور کیا۔ ''پراودا'' میں مضمون لکھنے والا دوسرا ایک طالب علم تھا جس کا نام سکوبیلف تھا جو بعد میں کرنسکی حکومت میں وزیر محنت بن گیا تھا۔ 1917 میں ہماری ملاقات بطور دشمن ہوئی۔ وکٹر کوپ نے بھی کچھ عرصہ ''پراودا'' میں بطور سیکریٹری کام کیا۔ وہ ان دنوں سویڈن میں روسی سفیر ہے۔

''پراودا'' کے سلسلے میں جوفے روس گیا اور وڈیسہ میں پکڑا گیا۔ اس نے ایک لمبا عرصہ جیل میں گزارا اور پھر سائبیریا جلاوطن ہوگیا۔ وہ فروری 1917 میں انقلاب آنے پر رہا ہوا۔ بعد میں اکتوبر انقلاب میں اس نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ اس بیمار آدمی کی جرات اور بہادری دیکھنے کے قابل تھی۔ اسے میں آج بھی اسی طرح صاف طور پر کھڑا دیکھ رہا ہوں جیسے 1917 کے موسم خزاں میں وہ سینٹ پیٹرز

برگ کے باہر اپنے قدرے بھاری بدن کے ساتھ توپ کے گولوں سے چھلنی ایک کھیت میں کھڑا تھا۔ گولے اس کے اردگرد پھٹ رہے تھے اور وہ کسی گھبراہٹ اور جلد بازی کے بغیر ایک سفارتکار جیسے تحمل کے ساتھ ان کے درمیان اپنے قدموں کی رفتار میں سستی لائے بغیر چلتا رہا تھا۔ وہ ایک بڑا اچھا مقرر تھا، پرمغز اور متاثر کرنے والا۔ بطور ادیب بھی اس میں یہی خوبیاں تھیں۔ وہ جو کام بھی کرتا بڑی نفاست اور باریک بینی سے کرتا۔ انقلابیوں میں یہ خوبی کم ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ لینن اس کے سفارتی کام کے متعلق بڑی عمدہ رائے رکھتا تھا۔ کسی دوسرے کی نسبت کئی برس تک اس کے ساتھ زیادہ وابستہ رہا۔ دوستی اور اصولوں کے ساتھ اس کی وفاداری لاجواب تھی۔ جوفے کی زندگی کا خاتمہ بڑے دردناک انداز میں ہوا۔ اس کی موروثی بیماریاں اس کی صحت کو تباہ کر رہی تھیں۔ بالکل اسی طرح جیسے خودغرض مارکسسٹوں کو تباہ کر رہے تھے۔ بیماری اور سیاسی مواقع کی محرومی کے ہاتھوں جوفے نے تنگ آ کر 1917 کے موسم خزاں میں خودکشی کر لی۔ موت سے پہلے اس نے مجھے جو خط لکھا تھا اسے سٹالن کے حواریوں نے اس کی میز سے اچک لیا۔ پھر اس کے خط کی بعض سطروں کی بدل دیا گیا۔ مگر اس قسم کی حرکتوں سے انقلاب کی کتاب میں درج شریف ترین ناموں میں ایک نام کا اضافہ ہونے سے کیسے رہ سکتا تھا۔

ردانقلاب کے تاریک ترین دنوں میں جوفے اور میں بڑے اعتماد کے ساتھ ایک نئے انقلاب کے منتظر تھے اور انقلاب 1917 میں بالکل اسی شکل میں آیا جیسے ہم نے سوچا تھا۔ سورچی خوف جو اس وقت ایک منشویک تھا اور آج سٹالن کا چیلا بنا بیٹھا ہے، اپنی یادداشتوں میں ویانا کے ''پراودا'' کے متعلق لکھتا ہے۔ ''اپنے پرچے میں وہ (ٹراٹسکی) روس میں مستقل انقلاب کی وکالت کرتا رہتا تھا۔ اس کی دلیل تھی کہ ایک مرتبہ انقلاب شروع ہو جائے تو پھر ختم نہیں ہوتا جب تک کہ ساری دنیا میں سرمایہ داری ختم اور سوشلسٹ نظام قائم نہ ہو جائے۔ اس پر رومانی ہونے کا الزام عائد کیا جاتا ہے اور بالشویک اور منشویک دونوں اس کا تمسخر اڑاتے ہیں۔ لیکن وہ حملوں کی پروا کیے بغیر اپنی بات مضبوطی سے ڈٹا رہتا ہے۔''

1909 میں روز الکسمبرگ کے پولش میگزین میں میں نے پرولتاریہ اور کسانوں کے درمیان انقلابی تعلقات کے متعلق ان الفاظ میں لکھا ''کسان تحریک کو جو سب سے بڑی تاریخی بیماری لاحق ہے، وہ اپنی جگہ نہ چھوڑنے کی بیماری ہے۔ وہ گاؤں میں رہ کر جاگیردار کی زمین پر قبضہ کرنے کی خاطر اسے لوٹنا چاہتا ہے۔ مگر جب کوئی محنت کش اس کی طرف آتا ہے تو وہ فوجی وردی پہن کر جاگیردار کی زمین کی

حفاظت پر اتر آتا ہے۔ 1905 کے روسی انقلاب میں یہی ہوا تھا۔ اس انقلاب کے واقعات کو اسباق کا ایک سلسلہ سمجھا جا سکتا ہے جس کے ذریعے تاریخ کسانوں کے ذہن میں وہ شعور بھر رہی ہے جو کسانوں کے زمین کے مطالبے اور ریاستی طاقت کے مسئلے کو آپس میں جوڑتا ہے۔''

فن لینڈ کی مثال دیتے ہوئے، جہاں سوشل ڈیموکریسی نے چھوٹے کسانوں کا زمین کے مسئلے پر ساتھ دیتے ہوئے بڑی مقبولیت حاصل کی تھی، میں نے مضمون کا اختتام ان الفاظ میں کیا۔ ''شہروں اور دیہات میں اپنی تحریک کو زیادہ وسعت دینے کے لئے ہماری پارٹی کو کسانوں کے اندر اپنا اثر پھیلانے کی خاطر مزید کس قدر کام کی ضرورت ہے۔ یہ بات بھی پیش نظر رکھنی پڑے گی تاکہ سیاسی اقتدار کے لالچ میں ہم کہیں ہتھیار رکھ نہ دیں۔ انقلاب کی نئی لہر ابھرنے پر ایسا ہونے کے امکانات ہوتے ہیں۔ کسانوں کو نظر انداز کرنے یا ''سوال کے اوپر سے چھلانگ'' لگانے سے کیا نتائج برآمد ہوں گے؟'' یہ بھی دیکھنا پڑے گا۔

اس وقت جب یہ دکھائی دیتا تھا کہ انقلاب کو مکمل اور مستقل طور پر پاؤں کے نیچے کچل دیا گیا تھا، میں نے 4 دسمبر 1909 کو ''پراودا'' میں لکھا۔ ''اس وقت جب رجعت پسندی کے سیاہ بادلوں نے ہمیں گھیرا ہوا ہے، ہمیں ایک نئے ظفر مند اکتوبر کا عکس دکھائی دے رہا ہے'' آزاد خیالوں ہی نے نہیں بلکہ منشویکوں نے بھی اس جملے کا مذاق اڑایا، اسے محض نعرہ اور کسی معنی سے خالی قرار دیا۔ پروفیسر ملوکوف جس ''ٹراٹسکی ازم'' کی اصطلاح گھڑنے کا اعزاز حاصل کیا تھا، غصے میں غرایا۔ پرولتاریہ کی آمریت کا خیال بالکل بچگانہ ہے۔ یورپ میں کوئی اس کی حمایت نہیں کرے گا'' اس کے باوجود 1917 میں ایسے واقعات رونما ہوئے جنہوں نے اس آزاد خیال پروفیسر کا پختہ اعتماد متزلزل کر دیا ہوگا۔

رد انقلاب اور پسپائی کے زمانے میں میں تجارت اور صنعت کے مسئلے پر عالمی اور قومی سطح پر مطالعہ کر رہا تھا۔ اس سوال پر مجھے ایک انقلابی دلچسپی نے متحرک کیا تھا۔ میں ایک طرف تجارت اور صنعت میں اتار چڑھا اور دوسری طرف مزدور تحریک اور انقلابی جدوجہد کے ترقی پذیر مرحلوں کے درمیان تعلق دریافت کرنا چاہتا تھا۔ دوسرے سوالوں کی طرح اس سوال میں بھی میں سیاست کو معاشیات پر انحصار کرتے ہوئے دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اگر اس عمل کو اس کے پورے تناظر میں دیکھا جائے تو دونوں کا ایک دوسرے سے ملنا ضروری دکھائی دیتا ہے۔

میں اس وقت ہرسٹ برگ کے قصبے بوہیمین میں رہ رہا تھا جب نیویارک سٹاک ایکسچینج ''بلیک فرائی ڈے'' ہیجان کا شکار ہوا۔ یہ عالمی بحران کا وہ پھوڑا تھا جس نے روس کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لینا تھا۔ روس اس وقت جاپان سے جنگ اور متوقع انقلاب کی وجہ سے اپنی بنیادوں تک ہلا ہوا تھا۔ کن نتائج کی توقع تھی؟ پارٹی میں بلاامتیاز یہ متفقہ رائے تسلیم کی جاتی تھی کہ یہ بحران انقلابی جدوجہد کو تیز کر دے گا۔ میرا موقف دوسرا تھا۔ بڑی جنگوں شکستوں کے بعد اس بحران نے محنت کش طبقے پر مثبت کے بجائے منفی اثرات مرتب کرنے تھے۔ اس نے محنت کشوں کو اپنی طاقت پر اعتماد سے بدظن اور سیاسی طور پر کمزور کر دینا تھا۔ ان حالات میں صنعتی احیاء ہی محنت کشوں کو ایک دوسرے کے قریب ان کی رگوں میں نیا خون دوڑا، ان کے اعتماد کو بحال اور مزید جدوجہد کے قابل بنا سکتا تھا۔

یہ نظریاتی اور سیاسی امتحان میری مستقبل کی سرگرمیوں کے لئے گراں قیمت سرمایہ تھا۔ کمیونسٹ انٹرنیشنل کی تیسری کانگریس کے موقع پر مندوبین کی اکثریت میرے اس اصرار پر میرے خلاف ہوگئی کہ جنگ سے قبل یورپ میں معاشی احیاء ناگزیر تھا کیونکہ ایسا ہونے سے مزید انقلابی بحران پیدا ہونے تھے۔ پھر حال ہی میں کمیونسٹ انٹرنیشنل کی چھٹی کانگریس کے موقع پر میں نے چین میں معاشی اور سیاسی صورتِ حال کا پیشگی اندازہ نہ کر سکنے کا الزام لگایا تھا۔ یہ فضول قسم کی امید لگائی گئی تھی کہ چینی انقلاب اپنی تباہ کن شکستوں کے باوجود اس لئے ترقی کرتا رہے گا کہ ملک میں اقتصادی بحران بڑھ رہا تھا۔ عمل کی جدلیات کچھ ایسی پیچیدہ نہیں ہیں۔ لیکن زندہ حقائق میں انہیں دریافت کرنے کے بجائے انہیں خود وضع کرنا زیادہ آسان ہے۔ اس سوال پر مجھے بیحد کڑے تعصّبات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے جس سے سیاست میں فاش غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں اور تکلیف دہ نتائج کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

منشویک ازم کے مستقبل اور پارٹی کے اندر تنظیمی مسائل پر لینن کا جو نقطہ نظر تھا ''پراودا'' اس سے کبھی پوری طرح اتفاق نہ کر سکا۔ مجھے اب بھی امید تھی کہ 1905 کی طرح نیا انقلاب اب پھر منشویکوں کو مجبور کر دے گا۔ کہ وہ انقلابی راستہ اختیار کریں۔ لیکن میں نظریاتی اور سیاسی مشکلات کا غلط اندازہ کر گیا۔ پارٹی کے اندر تبدیلیوں کے سوال پر میں ایک قسم کی ''سماجی انقلابی ہلاکت'' کے جرم کا مرتکب ہو گیا۔ یہ ایک غلط موقف تھا۔ لیکن یہ ''نوکر شاہی ہلاکت'' سے کہیں زیادہ بدتر تھا جو کسی قسم کے خیال سے عاری تھی اور جس کی بدولت میرے آج کے نقادوں کی اکثریت کمیونسٹ انٹرنیشنل کے کیمپ میں بیٹھی ہوئی ہے۔

1912 میں جب روس میں سیاسی بہاؤ اوپر کی جانب جانے لگا تو میں نے سوشل ڈیموکریٹوں کے تمام دھڑوں کے نمائندگان کی ایک متحدہ کانفرنس بلانے کی کوشش کی اس بات کا اظہار کرنے کے لئے کہ روسی سوشل ڈیموکریسی کے اتحاد کو بحال کرنے کی امید میں میں اکیلا نہیں تھا۔ میں روز الکسمبرگ کا حوالہ دے سکتا ہوں۔ 1911 کے موسم گرما میں روز الکسمبرگ نے لکھا ''تمام مسائل کے باوجود پارٹی کا اتحاد ابھی بھی بچایا جا سکتا ہے اگر دونوں کو اکٹھے ایک کانفرنس میں بلانے پر مجبور کیا جائے۔ اگست 1911 میں اس نے لکھا کہ اتحاد کو بچانے کا واحد راستہ یہ ہے کہ روس سے بھیجے گئے تمام افراد کی ایک جنرل کانفرنس بلائی جائے کیونکہ روس کے اندر تمام لوگ امن اور اتحاد کے خواہش مند ہیں اور وہ اس ایک خیال کی حقیقی نمائندگی کرتے ہیں کہ آپس میں الجھے ہوئے دو دھڑوں کو ہوش میں لا سکیں۔

بالشویکوں میں خود ثالثی کا رجحان رکھنے والے ابھی بھی بہت مضبوط تھے اور میں یہ امید کر رہا تھا کہ یہ لینن کو بھی جنرل کانفرنس میں حصہ لینے کے لئے لا سکیں گے۔ تاہم لینن تمام طاقتوں کے ساتھ اتحاد کے خلاف تھا اور بعد میں آنے والے حالات نے انجام کار یہ ثابت کیا کہ لینن درست تھا۔

تمام سوشل ڈیموکریٹک فریقوں کے نمائندوں پر مشتمل ایک کانفرنس بلانے کی کوشش کی گئی۔ یہ دکھانے کے لئے کہ روسی سوشل ڈیموکریسی کو جوڑنے کی کوشش میں میں اکیلا نہیں تھا، میں نے روز لکسمبرگ کا حوالہ دیا۔ 1911 کے موسم گرما میں اس نے لکھا تھا۔ ''اگر دونوں فریقوں کو ایک کانفرنس میں بلانے پر متفق کر لیا جائے تو پارٹی کے اتحاد کو بچایا جا سکتا ہے۔'' اگست 1911 میں اس نے دوبارہ لکھا۔ ''اتحاد کو بچانے کا فقط یہی طریقہ ہے کہ روس سے باہر بیٹھے ہوئے روسیوں کی ایک کانفرنس بلائی جائے۔ روسی عوام امن اور اتحاد چاہتے ہیں۔ وہی باہر بیٹھے اپنے لڑاکا مرغوں کو ہوش کے ناخن لینے پر مجبور کر سکتے ہیں۔''

بالشویکوں کے اندر بھی مصالحتی رجحانات اس وقت تک بڑے مضبوط تھے جن کے پیش نظر مجھے امید تھی کہ لینن کا نفرنس میں شرکت کے لئے آمادہ کیا جا سکتا تھا۔ لیکن لینن اپنی پوری طاقت کے ساتھ اتحاد کیخلاف کتھا۔ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ لینن درست تھا۔ ویانا کانفرنس اگست 1912 میں بالشویکوں کے بغیر منعقد ہوئی۔ میں چند دوسرے گمراہ کردہ بالشویکوں کے ساتھ منشویکوں کا ساتھ دینے کے الزام کا مرتکب ٹھہر گیا۔ اس طرح جو نیا ''بلاک'' بنا، اس کی کوئی مشترکہ سیاسی بنیاد نہیں تھی۔ تمام

اہم معاملات میں، میں منشویکوں سے غیر متفق ہوتا تھا۔ کانفرنس کے فوراً بعد میری ان کے خلاف جدوجہد دوبارہ شروع ہوگئی۔ دور بجانوں یعنی سوشل انقلابیوں اور جمہوری اصلاح پسندوں کا گہری داخلی مخالفت کی وجہ سے روزانہ ٹکراؤ ناگزیر تھا۔

کانفرنس سے ذرا پہلے 4 مئی کو ایکسل راڈ نے لکھا ''ٹراسکی کے خط سے میں اس تکلیف دہ نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ یہاں موجود اور روس میں موجود ہمارے ساتھیوں کے ساتھ مصالحت کی کوئی خواہش نہیں رکھتا تاکہ مل کر ایک مشترکہ دشمن کیخلاف لڑا جا سکے۔'' واقعی میری ایسی کوئی خواہش نہیں تھی۔ اور نہ رکھ سکتا تھا۔ میں منشویکوں کا اتحادی بن کر بالشویکوں کے خلاف کیسے لڑ سکتا تھا۔ کانفرنس کے بعد مارٹوف نے ایکسل راڈ سے بدترین عادت اپنائی تھی۔ ایکسل راڈ اور مارٹوف کے مابین ہونے والی خط و کتابت حال ہی میں شائع ہوئی ہے جس سے میرے خلاف ان کی مکمل بے لگام نفرت کی تصدیق ہوتی ہے۔ ہمارے درمیان خلیج کے باوجود میں نے ان کے خلاف کبھی اس قسم کا جذبہ نہیں رکھتا تھا۔ ابتدائی دنوں میں انہوں نے جس طرح میری مدد کی تھی، اس پر میں آج بھی ان کا احسان مند ہوں۔

اگست کانفرنس کے موقع پر جو ''بلاک'' بنا تھا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے میرے خلاف نصاب کی ہر کتاب میں کچھ نہ کچھ درج کیا گیا ہے۔ سادہ لوح اور بے خبر لوگوں کو گمراہ کرنے کی خاطر یوں لکھا گیا ہے۔ جیسے بالشویک ازم تاریخ کی لیبارٹری سے مکمل طور پر مسلح ہو کر نکلا تھا، جب کہ منشویکوں کیخلاف بالشویکوں کی جدوجہد کی تاریخ ان دونوں کو متحد کرنے کی انتھک جدوجہد کی تاریخ بھی ہے۔ 1917 میں روس واپس آنے کے بعد لینن نے بین الاقوامیت کے حامی منشویکوں سے تعلقات ٹھیک کرنیکی کوشش کی تھی۔ جب میں اسی سال مئی میں امریکہ سے واپس پہنچا تو مختلف صوبوں میں سوشل ڈیموکریٹک تنظیموں کی اکثریت بالشویکوں اور منشویکوں پر مشتمل تھیں۔ مارچ 1917 میں پارٹی کانفرنس میں لینن کی آمد سے چند دن پہلے جب سٹالن نے تزارتلی کی پارٹی سے اتحاد کیا تو صوبوں میں سوشل ڈیموکریٹک تنظیموں کی اکثریت متحدہ بالشویکوں اور منشویکوں پر مشتمل تھیں۔ مارچ 1917 میں پارٹی کانفرنس کے موقع پر لینن کی آمد سے قبل سٹال تزارتلی کی پارٹی سے اتحاد کی تبلیغ کر رہا تھا۔ حتیٰ کہ اکتوبر انقلاب کے بعد زینوشیف، کامینیف، ریکوف، لوناچارسکی اور درجنوں دوسرے لوگ سوشل انقلابیوں اور منشویکوں سے اتحاد کے لئے بری طرح اور درجنوں دوسرے لوگ سوشل انقلابیوں اور مشویکوں سے اتحاد کے لئے بری

طرح جدوجہد کر رہے تھے۔ اور یہ وہ لوگ تھے جو اپنے نظریاتی وجود کو برقرار رکھنے کے لئے 1912 کی ویانا کانفرنس میں اتحاد کی ایسی باتیں بیان کر رہے تھے کہ جن سے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔

اخبار ''دی کیف تھاٹ'' نے مجھے پیشکش کی کہ میں اس کا عسکری نمائندہ بن کر بلقان ریاستوں میں چلا جاؤں۔ یہ بڑی بروقت پیشکش تھی کیونکہ اگست کانفرنس پہلے ہی ناکام ہو چکی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھے وقتی طور پر مخصوص عرصے کے لئے خود کو روسی مہاجرین کے مفادات سے دور رکھنا چاہیے۔ میں نے بلقان میں جو چند ماہ گزارے وہ جنگ کے مہینے تھے اور میں نے ان میں بہت کچھ سیکھا۔

ستمبر 1912 میں میں اس خیال کے ساتھ مشرق کی طرف جا رہا تھا کہ جنگ ممکن ہی نہیں بلکہ ناگزیر بھی تھی۔ بلگراڈ میں میں نے ٹکٹ لینے والوں کی قطاریں لگی ہوئی دیکھیں۔ واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ جنگ کسی بھی وقت چھڑ سکتی تھی۔ جن لوگوں کو میں جانتا تھا وہ محاذ جنگ پر مرنے یا مارنے کے ارادے سے جا چکے تھے۔ اس وقت جنگ مجھے بے حد خوفناک لگی حالانکہ میں اسے اپنے مضامین اور خیالات میں ایک معمولی چیز سمجھتا تھا۔ جنگ مجھے ایک عفریت لگی۔ لوگ وردیوں میں محاذ جنگ کی طرف جا رہے تھے۔ سپاہیوں نے اپنی ٹوپیوں میں سبز بیج لگا رکھے تھے۔ وہ قربانی دینے نکلے تھے۔ اس وقت جنگ کا پاگل پن میرے شعور کے اندر گہرائیوں تک اتر گیا۔ بعد میں میں سوچتا تھا کہ موجودہ نسل 1912 کے جنگی جنون سے کتنی پرے چلی گئی ہوگی۔ میں اس وقت بھی سمجھتا تھا کہ انسانیت، اخلاقیات، تاریخی عمل کا نقطہ نظر۔ یہ سب چیزیں کس قدر فرسودہ اور بانجھ ہوتی ہیں۔ لیکن اس وقت جذبات نہیں ان کی تشریح سب سے اہم چیز تھی۔

تاریخ کے ایک ایسے کا احساس جسے میں الفاظ میں بیان کرنے سے معذور تھا، مجھ پر غالب آ رہا تھا۔ تقدیر کے سامنے مجبوری کا احساس، انسانی کیڑے مکوڑوں کے لئے ایک سلگتی ہوئی ہمدردی، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

دو یا تین دن کے بعد جنگ چھڑ گئی۔ میں نے بلقان سے اخبار کے ایڈیٹر کو لکھا ''تم روس میں بیٹھے جان گئے ہو گے کہ یہاں جنگ شروع ہو گئی ہے۔ تمہیں یقین بھی تھا کہ یہ شروع ہونی تھی۔ لیکن یہاں، اس جگہ بیٹھے مجھے یقین نہیں آ رہا۔ روزمرہ کی زندگی، بہتی ہوئی ناک والے بچے، سگریٹ چلن ___ سمجھ نہیں آتی کہ ان سب کو جنگ کے ساتھ کیسے الگ کر دوں۔ میرا ذہن قبول نہیں کر رہا۔ میں جانتا ہوں کہ

جنگ شروع ہوگئی ہے۔لیکن مجھے یقین نہیں آ رہا۔'' بہرحال مجھے یقین کرنا تھا، اور وہ بھی فیصلہ کن انداز میں ایک طویل عرصے کے لئے۔

1912-13 کے برسوں نے سربیا، بلغاریہ، رومانیہ اور جنگ سے میری قریبی آشنائی کرادی۔ متعدد پہلوؤں سے یہ 1914 کی نہیں بلکہ 1917 کی بھی تیاری تھی۔ میں اپنے مضامین میں جنگجوآنہ وطن پرستی، جنگ کے سراب اور رائے عامہ کو سائنسی طور پر منظم طریقے سے موڑنے کی مخالفت کرتا رہا۔ میرے اخبار کے ایڈیٹر نے میرے مضامین شائع کر کے بڑی جرات کا مظاہرہ کیا جن میں میں قیدی ترکوں پر بلغاریہ کے مظالم اور اس پر روسی پریس کی خاموشی کی مذمت کرتا رہا۔اس پر آزاد خیال اخبارات نے احتجاج کا شور برپا کردیا۔

30 جنوری 1913 کو میں نے ترکوں پر ڈھائے جانے والے سربوں کے مظالم کے بارے میں اخبار کے ذریعے بلغاریہ کے مستقل سرکاری دفاعی وکیل ملی کوف سے مارواےئ کے پارلیمان نے ایک سوال پوچھا۔اس سوال کا جواب اس نے بڑی ہکلاہٹ سے دیا۔ یہ تنازعہ معاملہ کئی ہفتے چلتا رہا۔سرکاری اخبارات کا خیال تھا کہ ''اینٹیڈ آٹو'' کے قلمی نام سے لکھنے والا کوئی مہاجر ہی نہیں بلکہ آسٹریا۔ہنگری کا ایجنٹ بھی تھا۔

رومانیہ میں گزرنے والا میرا ایک ماہ مجھے ڈاب رڈ جانو۔ گیرا کے قریب لے گیا۔اس کے علاوہ راکووسکی سے جسے میں 1903 سے جانتا تھا، میرے تعلقات ہمیشہ کے لئے مضبوط ہو گئے۔

روس، ترکی جنگ کے دنوں میں ایک روسی انقلابی ستر کی دہائی میں رومانیہ میں سے گزر رہا تھا کہ وہیں ٹھہر گیا۔ اصل میں اس کے بس سے باہر حالات نے اسے رکھنے پر مجبور کردیا تھا۔ چند برس بعد ''گیرا'' کے نام سے اس نے رومانیہ کے دانشوروں میں اپنا بڑا اثر ورسوخ پیدا کرلیا۔ پھر وہ اپنے اثر ورسوخ کی توسیع کرتا ہوا اسے محنت کشوں کے حلقے تک لے گیا۔سماجی بنیادوں پر ادبی تنقید ''گیرا'' کا منفرد اسلوب تھا جس کی وساطت سے اس نے رومانیہ کے دانشوروں میں اپنا ایک الگ حلقہ قائم کرلیا۔ پھر جمالیات اور ذاتی اخلاقیات کے حوالے سے وہ انہیں سائٹیفک سوشلزم کی طرف لے آیا۔ رومانیہ کی تقریباً ہر سیاسی پارٹی کے راہنمائی اپنی جوانی کے دنوں میں گیرا سے راہنمائی حاصل کرتے رہے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ پختہ عمر میں جاکر وہ رجعتی لٹیروں کی پالیسی اپنائے بغیر نہ رہ سکے۔

چی، بی، راکووسکی یورپ کی سوشلسٹ تحریک میں بین الاقوامی طور پر جانی جانے والی ہستیوں میں سے ہے۔ وہ پیدائشی طور پر بلغاری ہے اور وہاں کے ایک قصبے کوتل میں پیدا ہوا جو بلغاریہ کے عین وسط میں واقع ہے۔ لیکن بلقان کے نقشے میں تھوڑا سا موڑ آجانے کے سبب وہ رومانیہ کا باشندہ بن گیا ہے۔ تعلیم کے لحاظ سے فرانسیسی ڈاکٹر اور رابطوں، ہمدردیوں اور ادبی کام کے پیش نظر وہ روسی ہے۔ وہ تمام بلقانی اور چار یورپی زبانیں بول سکتا ہے۔ اس نے مختلف اوقات میں چار سوشلسٹ پارٹیوں (بلغاری، روسی، فرانسیسی، رومانوی) کے داخلی طریقے کار میں سرگرم حصہ لیا ہے انجام کار وہ سوویٹ فیڈریشن کا ایک راہنما، کمیونسٹ انٹرنیشنل کا بانی، یوکرانی سوویٹ آف پیپلز کمسار کا صدر اور انگلینڈ اور فرانس میں سوویٹ روس کا سفیر بن گیا۔ یعنی ''بائیں'' بازو کی مخالفت مول لینے کے لئے اس نے سند حاصل کرلی۔ راکووسکی کی ذاتی خوبیاں، اس کا وسیع بین الاقوامی تناظر، کردار کی جامع شرافت ___ یہ سب چیزیں سٹالن کو کھٹکنے لگیں جوان تمام خوبیوں کی ضد ہے۔

1913 میں راکووسکی رومانوی سوشلسٹ پارٹی کا منتظم اور راہنما تھا جس نے بعد میں کمیونسٹ انٹرنیشنل میں شمولیت اختیار کرلی تھی۔ پارٹی خاصی ترقی کررہی تھی۔ راکووسکی ایک روزنامے کا ایڈیٹر بھی تھا جسے وہ خود مالی طور پر چلا رہا تھا۔ بحراسود کے ساحل پر، منگالیا کے قریب، اس کی ایک چھوٹی سی جاگیر تھی جو اسے وراثت میں ملی تھی۔ اس جاگیر کی آمدنی سے وہ رومانوی سوشلسٹ پارٹی اور بعض دوسرے انقلابی گروہوں کے علاوہ دوسرے ممالک میں انفرادی طور پر لوگوں کی مدد کرتا تھا۔ ہر ہفتے کے تین دن بخارسٹ میں گزارتا جہاں وہ مضامین لکھتا، مرکزی کمیٹی کے جلسوں میں ہدایات جاری کرتا اور چھوٹے مظاہروں اور جلسوں میں تقریریں کرتا۔ پھر وہ ویک اینڈ گزارنے ٹرین پر بیٹھ کر اپنی جاگیر پر چلا جاتا۔ کھانے پینے کا سامان اس کے ساتھ ہوتا۔ وہ کھیتوں میں چلا جاتا اور نئے ٹریکٹر کی کارکردگی دیکھنے کے لئے اپنے فراک کوٹ میں ہل کے پیچھے بھاگتا رہتا۔ پھر وہ ایک دن بعد قصبے کی طرف بھاگتا تاکہ کسی عوامی اجلاس یا پارٹی کی کسی میٹنگ میں شامل ہونے میں دیر نہ ہوجائے ایک دفعہ میں بھی اس کے ساتھ تھا اور اس کی مافوق الفطرت طاقت، اس کی عدم تھکاوٹ اس کی مستقل روحانی نوعیت کی چوکسی اور غیر اہم لوگوں کے لئے اس کی تشویش اور فکرمندی کو سراہے بغیر نہ رہ سکا۔ منگالیا کی کسی بھی سڑک پر وہ نوآبادکاروں یا اپنے کاروباری ایجنٹوں سے گفتگو کرتے وقت رومانی زبان سے ترکی، ترکی سے بلغاری اور پھر جرمن اور فرانسیسی زبانیں

بولنے لگتا۔ آخر میں وہ اردگرد رہنے والے بے شمار روسی سکوپیوں سے روسی زبان میں باتیں کرنے لگتا۔ وہ ایک جاگیردار، ایک ڈاکٹر، ایک بلغاری، ایک رومانی اور سب سے بڑھ کر ایک سوشلسٹ کی حیثیت سے باتیں کرتا رہتا۔ ان تمام پہلوؤں کے ساتھ اس دورافتادہ، وقت کی رفتار سے بے خبر، تمام اندیشوں سے آزاد جہاز رانوں کے اس چھوٹے سے قصبے کی گلیوں میں وہ میری آنکھوں کے سامنے ایک زندہ معجزے کی صورت پھرتا رہتا۔ پھر اسی رات وہ ٹرین سے میدان جنگ کی طرف جا رہا ہوتا۔ خواہ وہ بخارست، صوفیہ، پیرس، سینٹ پیٹرزبرگ یا خرکوف میں ہوتا، وہ ہمیشہ پر اعتماد اور پرسکون ہوتا۔

میں نے اپنی دوسری غیر ملکی جلاوطنی جلاوطنی کے سال روسی ڈیموکریٹک پریس کے لئے مضامین لکھنے میں گزارے۔ میں نے اپنے لکھنے کا آغاز روسی اخبار ''کیف سکایا میسل'' (کیف تھاٹ'') میں میونخ کے ایک رسالے ''Simplicissimus'' کے متعلق ایک طویل مضمون سے کیا۔ اس رسالے نے مجھے اس قدر متاثر کیا تھا کہ میں نے اس کے پہلے شمارے سے آخری شمارے تک تمام پڑھ ڈالے۔ اس میں ٹی، ٹی، ہین کے کارٹون سماجی طنز سے بھرے ہوتے تھے۔ نئی جرمن فکشن سے میری آشنائی بھی انہیں دنوں میں ہوئی میں نے Wedekind (روسی ترقی پسند مصنف پر ایک سماجی تنقیدی مضمون بھی لکھا کیونکہ انقلابی مزاج میں گراوٹ آنے کے باعث روس میں لوگ اس میں دلچسپی لینے لگے تھے۔

روس کے جنوب میں ''کیف سکایا میسل'' مارکسٹوں کا سب سے مقبول عام اخبار تھا۔ کیف کی کمزور صنعتی زندگی اس کے غیر ترقی یافتہ طبقاتی تضادات اور اس کی طویل روایتی انتہا پسندی، ___ ''کیف سکا یامیسل'' جیسا اخبار ایسی فضا میں ہی چل سکتا تھا۔ جس بنیاد پر Simplicissimus میونخ سے نکالا گیا تھا، کیف سے ''کیف سکایا میسل'' نکالنے کی بھی وہی وجہ تھی۔ پریس پر پابندی کے باوجود میں مختلف موضوعات پر مضامین لکھتا رہتا اور یہ بات خطرے سے خالی نہیں تھی۔ ان مضامین کے لئے مجھے بہت سا ابتدائی کام کرنا پڑتا تھا۔ میں ایک غیر جانب دار اخبار میں اپنی مرضی کے مطابق کیسے لکھ سکتا تھا۔ اس کے باوجود میں نے اپنی مرضی کے خلاف کچھ نہیں لکھا تھا۔ ''کیف سکایا میسل'' میں میرے چھپنے والے مضامین کو ایک سوویٹ اشاعت گھر نے سات جلدوں میں شائع کیا ہے۔ میں نے ان میں کوئی رد و بدل نہیں کیا۔ یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ میں نے مرکزی کمیٹی کی منظور سے یہ مضامین بورژوا پریس کو بھیجے تھے اور اس کمیٹی میں لینن کی اکثریت تھی۔

میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں کہ ویانا آنے کے بعد ہم نے اس کے مضافات میں ''ہٹل ڈورف میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ میری بیوی نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے۔ ''ہٹل ڈورف مجھے پسند تھا۔ ہمیں توقع سے بڑھ کر اچھا گھر مل گیا تھا۔ یہاں عام طور پر موسم بہار میں گھر کرائے پر دیے جاتے تھے، ہم نے وہ گھر خزاں کا اور سردیوں کے لئے لیا تھا۔ کھڑکیوں سے پہاڑ دکھائی دیتے تھے، گہرے سرخ اور خزاں کا رنگ لیے ہوئے۔ سڑک استعمال کیے بغیر ہم ایک عقبی دروازے سے دیہی علاقے کی طرف جا سکتے تھے۔ سردیوں کی اتواروں کو ویانا کے شہری رنگین ٹوپیاں اور سویٹر پہنے برف پر پھسلنے والے مخصوص جوتے لیے پہاڑوں کی طرف نکل جاتے۔ اپریل میں جب ہم نے کرایہ دگنا ہو جانے کی وجہ سے گھر چھوڑ دینا تھا تو اس وقت باغ میں بنفشے کے پھول کھل چکے ہوتے جن کی خوشبو نے کھڑکیوں سے داخل ہو کر کمروں کو بھر دینا تھا۔ ہمارا دوسرا بیٹا سروزا یہیں پیدا ہوا۔ پھر ہم زیادہ جمہوری علاقے سیوورنگ میں نقل مکانی کر گئے۔

''بچے روسی اور جرمن زبان بولتے تھے۔ کنڈر رگارٹن میں انہیں جرمن پڑھائی جاتی تھی۔ اسی لیے وہ گھر میں کھیلتے وقت جرمن زبان ہی بولتے تھے۔ لیکن جب میں یا ان کا باپ ان سے بات کرتے تو وہ فوراً روسی بولنے لگتے۔ اگر ہم ان سے جرمن زبان میں مخاطب ہوتے تو وہ پریشان ہو جاتے اور جواب روسی زبان ہی میں دیتے۔ بعد میں وہ ویانا کی مقامی بولی بھی سیکھ گئے اور اسے بڑی عمدگی سے بولنے لگے۔

''وہ کلا چکو گھرانے میں جانا پسند کرتے تھے جہاں انہیں ہر کسی سے بہت پیار ملتا تھا۔ گھر کے سربراہ، اس کی بیوی اور ان کے جوان بچوں سے۔ انہیں ایک سے ایک بڑھ کر خوبصورت چیزیں اور کھلونے دکھائے جاتے۔ بچے نامور مارکسی سکالر رازنوف سے بھی بہت پیار کرتے تھے جو ان دنوں ویانا میں رہتا تھا۔ وہ بچوں سے خوب کھیلتا اور اپنی حرکتوں سے انہیں ہنساتا رہتا۔ ایک دن جب میں چھوٹے بیٹے سروزا کے بال ایک نائی سے کٹوا رہی تھی اور رازنوف میرے قریب بیٹھا تھا تو بیٹے نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ''میرے بال رازنوف جیسے بنواؤ۔'' رازنوف کے سر کے درمیان بہت بڑا گنج اور اردگرد گھنے بال تھے۔

جب لیوک (بڑا بیٹا) کو سکول میں داخل کرایا گیا تو مذہب کا سوال پیدا ہو گیا۔ اس وقت کے آسٹروی قانون کے مطابق چودہ برس سے اوپر کی عمر کے لڑکے کو اپنے ماں باپ کے فرقے کے مطابق

مذہبی تعلیم حاصل کرنی پڑتی تھی۔ چونکہ ہمارے کاغذات میں مذہب کا اندراج کہیں نہیں تھا لہٰذا ہم نے خود کو لوتھرین کہلانا منتخب کر لیا کیونکہ یہ قدرے آسان تھا اور بچوں کو بھی آسان لگتا تھا۔ مذہب کا پریڈ سکول کے اوقات کے بعد ایک خاتون معلّمہ ''سکول ہاؤس'' میں پڑھاتی تھی۔ لیوک کو مذہبی سبق پسند آیا تھا، جیسا کہ اس کے چہرے سے پتا چلتا تھا، مگر وہ کسی سے اس کا ذکر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ایک دن میں نے اسے اپنے بستر میں کچھ گنگناتے ہوئے سن لیا۔ جب میں نے اس سے پوچھا تو وہ بولا ''یہ دعا ہے۔ دعا نظموں جیسی خوبصورت ہوتی ہے۔''

میری پہلی غیر ملکی جلاوطنی کے بعد سے میرے ماں باپ پاس آتے رہتے تھے۔ وہ مجھے ملنے پہلی دفعہ پیرس آئے۔ پھر وہ میری بڑی بیٹی کے ساتھ مجھے ویانا ملنے آئے جو میری پہلی بیوی میں سے تھی اور ان کے ساتھ گاؤں میں رہتی تھی۔ پھر 1910 میں وہ برلن آئے۔ اس وقت تک وہ میری قسمت سے مکمل طور پر سمجھوتہ کر چکے تھے۔ اس سلسلے میں حتمی دلیل جرمن زبان میں میری پہلی کتاب تھی۔

میری ماں کو بڑی سخت بیماری لگ گئی تھی۔ (گلے کے غدود بڑھ جانا) گذشتہ دس برس سے وہ اس بوجھ کو اپنے کام کے دوسرے بوجھ کی طرح اٹھائے پھرتی رہی۔ برلن میں اس کا ایک گردہ نکال دیا گیا تھا۔ اس وقت وہ ساٹھ برس کی تھی۔ آپریشن کے چند ماہ بعد اس کی صحت بہت اچھی ہو گئی اور میڈیکل حلقوں میں اس کیس کی بڑی مشہوری ہوئی۔ مگر اس کی بیماری عود کر آئی اور وہ چند ماہ کے اندر فوت ہو گئی۔ وہ یانوفکا میں فوت ہوئی تھی جہاں اس نے محنت سے بھری زندگی گزاری اور بچوں کو پالا تھا۔

ویانا میں طویل قیام کا باب روسی مہاجر ایس، ایل کلیا چکو گھرانے کے ذکر کے بغیر نامکمل رہے گا جو ہمارا گہرا دوست تھا۔ میری دوسری غیر ملکی جلاوطنی کی ساری تاریخ اس کنبے سے قریبی طور پر بندھی ہوئی ہے۔ یہ گھر ہمارے لیے سیاسی اور فکری دلچسپیوں کا مرکز تھا۔ اس کی وساطت سے ہم نے موسیقی سے محبت سیکھنے کے علاوہ چار یورپی زبانیں سیکھیں۔ ہمارے یورپی رابطے بھی یہیں قائم ہوئے۔ اپریل 1914 میں گھر کے سربراہ سیمون لیووچ کی وفات میرے اور میری بیوی کے لئے ایک بہت بڑا نقصان تھا۔ لیو ٹالسٹائی نے ایک دفعہ اپنے باہنر بھائی سرگئی کے متعلق لکھا تھا کہ چند چھوٹی چھوٹی خامیوں نے اسے بڑا آرٹسٹ نہیں بننے دیا تھا۔ سیمون لیووچ کے بارے میں بھی یہی کہا جا سکتا ہے۔ اس کے اندر سیاست میں نام کمانے کی تمام ضروری صلاحیتیں موجود تھیں، ماسوائے اس کے کہ اس میں بعض برائیاں نہیں تھیں۔ کلیا

چکوگھرانے سے ہمیں محبت اور مدد ملی، ہمیں ان دونوں چیزوں کی ہمیشہ ضرورت رہتی تھی۔

''کیف سکایا میسل'' سے ملنے والی رقم ہماری متوسط زندگی کو چلانے کے لئے کافی تھی۔ مگر کئی ماہ ایسے بھی ہوتے تھے کہ ''پراودا'' کا کام مجھے کمائی کا کام کرنے نہیں دیتا تھا۔ پھر تنگ دستی گھیر لیتی تھی۔ میری بیوی ادھار دینے والی دکانوں کا راستہ جانتی تھی۔ میں نے اچھے دنوں میں جو کتابیں خریدی ہوتی تھیں انہیں ضرورت کے وقت سیکنڈ ہینڈ کتابوں کی دکانوں پر فروخت کر دیتا تھا۔ ایسے وقت بھی آئے جب گھر کا کرایہ ادا نہ کرنے سکنے کے سبب ہمارا عاجزانہ قسم کا سامان ضبط کر لیا گیا۔ ہمارے دو بچے تھے اور کوئی ملازمہ نہیں تھی۔ زندگی میری بیوی کے لئے دوہرا بوجھ تھی۔ اس کے باوجود انقلابی کام کے لئے اس کے پاس وقت ہوتا تھا۔

جنگ کا آغاز

ویانا میں پبلسٹی بورڈوں پر یہ نعرہ لکھا ہوا تھا___ ''سربوں کی قسمت میں موت لکھی گئی ہے۔''___ ''پھر یہ نعرہ لڑکے گلی گلی لے اڑے۔ ہمارا سب سے چھوٹا بیٹا سروز رالڑکوں کے جواب میں___ ''سرب زندہ باد'' ___ کہتا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک دن وہ سوجھی ہوئی کالی آنکھوں کے ساتھ گھر آیا۔ عالمی سیاست میں یہ اس کا پہلا تجربہ تھا۔

سینٹ پیٹرز برگ میں سابق برطانوی سفیر بکانن اپنی یادداشتوں میں اگست کے ان ''ابتدائی شاندار دنوں'' کے متعلق لکھتا ہے ''یوں دکھائی دیتا تھا جیسے پورے روس کی کایا کلپ ہوگئی تھی۔'' بعض دوسرے سیاستدانوں نے بھی اپنی یادداشتوں میں کچھ اسی قسم کے ہیجان کا اظہار کیا ہے مگر انہوں نے حکمران طبقے کی حیثیت سے بکانن جیسی غلطی کا ارتکاب نہیں کیا۔ یورپ کے تمام دوسرے دارالحکومتوں کو بھی اگست میں ''شاندار'' دنوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ایک دوسرے کو مٹانے کے کاروبار میں ان کی بھی مکمل ''کایا کلپ'' ہوگئی تھی۔

آسٹریا۔ہنگری میں عوام کا جب الوطنی کا جذبہ خاص طور پر حیران کن تھا۔ وہ کیا چیز تھی جس نے وزارت جنگ کے سامنے چوک میں جوتوں کے کاریگر پوسپس چل، جو نصف جرمن اور نصف چیک تھا، لا کھڑا کیا تھا؟ ہمارا پرچون فروش مارنچ اور گاڑی بان فرانکل چوک میں کیوں گئے تھے؟ آخر وہ کیا خیال

تھا؟ قومی خیال؟ لیکن آسٹریا۔ہنگری تو کسی قومی خیال کی نفی تھا-- عوام کو حرکت میں لانے والی قوت کچھ اور ہی تھی۔

ان لوگوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے جو ہر روز ایک جیسی رٹ اور نا امیدی میں زندگی گزارتے ہیں۔ وہ سماج کا ستون ہوتے ہیں۔ کسی قسم کی کوئی بھی حرکت ان کی زندگیوں میں کوئی وعدہ، کوئی امید لے آتی ہے۔ عرصہ دراز سے ان کی نفرت کے مرکز لوگوں کو ہٹا دیا جاتا ہے اور ان کی جگہ نئے لوگ آ جاتے ہیں۔ مستقبل میں نا قابل یقین تغیرات ان کے انتظار میں ہوتے ہیں۔ خواہ وہ اچھے ہوں یا خراب۔ پوسپس چل کے لئے روز کی ایک جیسی رٹ سے اور کیا بری چیز ہوگی۔

میں ویانا کی مانوس بڑی سڑکوں پر گھوم رہا تھا اور ایک حیرت ناک ہجوم کو دیکھ رہا تھا جس نے فیشن ایبل ''چوک'' کو بھر دیا تھا۔ ایک ایسا ہجوم جس کے اندر امیدیں جاگ اٹھی تھیں۔ لیکن کیا ان امیدوں کا ایک چھوٹا سا حصہ پہلے ہی بر نہیں آیا تھا؟ کیا یہ کبھی ممکن ہو سکے گا کہ ''چوک'' میں موجود قلی، دھوبی، موچی، نیم کاریگر اور مضافات کے نوجوان اپنی تقدیر کے خود مالک بن جائیں گے؟ جنگ ہر شخص پر اثر انداز ہوتی ہے۔ جو لوگ مایوس اور زندگی سے دھوکہ کھائے ہوئے ہوتے ہیں، محسوس کرنے لگتے ہیں کہ وہ امیروں اور طاقت وروں کے ساتھ مساوی کھڑے ہو گئے ہیں۔ یہ سراب ہو سکتا ہے۔ مگر میں نے اکتوبر 1905 کے انقلاب کے دنوں میں سینٹ پیٹرز برگ میں کچھ اسی قسم کا نظارہ دیکھا تھا۔ اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں کہ تاریخ میں جنگ اکثر اوقات انقلاب کی ماں ثابت ہوئی ہے۔

لیکن جنگ اور انقلاب کے متعلق حکمران طبقوں کے رویے کس قدر مختلف ہوتے ہیں۔ بکانن کو وہ دن کو وہ دن بڑے ''شاندار'' لگے تھے اور روس کی ''کایا کلپ'' ہو گئی تھی۔ دوسری طرف وٹ نے 1905 کے انقلاب کے دنوں کو بہت ''بڑے دن'' قرار دیا تھا۔ ''روسیوں کی اکثریت پاگل ہو گئی ہے'' اس نے لکھا تھا۔

انقلاب کی طرح جنگ بھی زندگی کو اوپر سے لے کر نیچے تک عام راستے سے ہٹا دیتی ہے۔ انقلاب مسلمہ اقتدار پر براہ راست ضرب لگاتا ہے۔ اس کے برعکس جنگ کی وجہ پھیل جانے والی ابتری میں جنگ پہلے تو موجود اقتدار کو مضبوط کرنے کی کوشش کرتی ہے اور بعد میں اس پر چوٹ لگاتی ہے۔ جنگ کے آغاز میں طاقتور سماجی اور قومی تحریکوں کے آغاز کی امیدیں، خواہ وہ پراگ میں ہوں یا ٹریسٹ میں، وارسا میں

ہوں یا ٹفلس میں، بے بنیاد ہوتی ہے۔ستمبر 1914 میں میں نے لکھا تھا۔''جنگ کے اعلان اور فوجوں کی نقل وحمل نے تمام دنیا میں قومی اور سماجی تحریکوں کے تضادات کو ختم کر دیا ہے۔لیکن یہ فقط ایک سیاسی تاخیر ہے، ایک عارضی اور ہنگامی صورتحال تاریخ کے واجب الادا قرضوں کی ادائیگیوں کی نئی تاریخ مقرر ہو جاتی ہے مگر انجام کار وہ ادا کرنی پڑتی ہیں۔'' ان سطور میں میں آسٹریا۔ہنگری ہی کا نہیں بلکہ روس کا بھی ایک طرح سے حوالہ دیا تھا۔اصل میں روس کا زیادہ حوالہ تھا۔

واقعات ایک دوسرے پر تیزی سے اثر انداز ہو رہے تھے۔جورس کے قتل کی خبر آ گئی۔اخبارات اتنے لچر اور فضول جھوٹوں سے بھرے ہوئے تھے کہ جنگ کے آغاز کے بارے میں لوگ وقتی طور پر امید اور شک کے درمیان معلق تھے۔لیکن یہ صورتحال جلد ختم ہو گئی۔جورس کو اس کے دشمنوں نے قتل کیا تھا۔اس کی پارٹی نے بھی اس سے غداری کی تھی۔

آسٹروی سوشل ڈیموکریسی کے سرکردہ حلقوں میں میں جنگ کے متعلق کے کیسا رویہ پایا؟ بعض لوگ خوش تھے اور حکومتوں اور عوام میں تمیز کیے بغیر سربوں اور روسیوں کو گالیاں دے رہے تھے۔یہ قوم پرست تھے۔انہوں نے سوشلسٹ ثقافت کا جو نقاب پہن رکھا تھا وہ جلدی سے اتر رہا تھا۔ہانسی ڈوئیچ بعد میں وزیر جنگ جیسی کوئی چیز بن گیا تھا۔مجھے یاد ہے کہ وہ اس جنگ کی ضرورت اور بروقت چھڑنے پر تحسین آمیز لفظوں میں بات کر رہا تھا کیونکہ جنگ نے آسٹریا کو سربیا کے''خوفناک'' خواب سے نجات دلا دینی تھی۔دوسرے لوگ جن میں وکٹر ایڈلر سب سے آگے تھا، جنگ کو ایک بیرونی تباہی سمجھتے تھے جسے برداشت کرنا ہی پڑنا تھا۔ان کی مایوسی بھری خاموشی دراصل قوم پرستوں کے سرگرم باز و کو ایک آڑ مہیا کر رہی تھی۔بعض لوگ بڑی فخر کی ہوا میں 1871 کی فتح کو یاد کر رہے تھے جس سے جرمن صنعت اور اس کے ساتھ سوشل ڈیموکریسی کو فروغ حاصل ہوا تھا۔

یکم اگست کو جرمن نے روس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔اس سے پہلے ہی روسیوں نے ویانا چھوڑنا شروع کر دیا تھا۔3 اگست کی صبح کو میں وزنلی میں سوشلسٹ ارکان اسمبلی کے پاس یہ پوچھنے گیا کہ ہم روسی مہاجروں کو کیا کرنا چاہیے تھا۔فریڈرک ایڈلر اپنے کمرے میں بیٹھا ویانا میں منعقد ہونے والی بین الاقوامی سوشلسٹ کانگریس کی تیاری میں پھنسا ہوا تھا۔مگر کانگریس تو اب ماضی کا قصہ بن گئی تھی۔دوسری طاقتیں میدان میں اتر آئیں تھیں۔بوڑھے ایڈلر نے تجویز کیا کہ وہ مجھے گیئر کے پاس لے جا کر سیاسی

پولیس کے چیف سے میری ملاقات کرا سکتا تھا۔ کار میں منزل مقصود کی طرف جاتے ہوئے میں نے ایڈلر کی توجہ لوگوں کی اس خوشی کی طرف مبذول کرائی جو جنگ نے ان میں پیدا کی تھی۔ ''یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے محاذ جنگ پر نہیں جانا۔'' اس نے جلدی سے جواب دیا۔ ''سارا پاگل پن سڑکوں پر آ گیا ہے۔ یہ ان کا دن ہے۔ جورس کا قتل تو ایک ابتدا ہے۔ جنگ تمام حسیات اور پاگل پن کی تمام شکلوں کا دروازہ کھول دیتی ہے۔''

پیشے کے لحاظ سے نفسیات دان ہونے کی حیثیت سے وہ ہر معاملے کو، خصوصاً آسٹریا کو، نفسیاتی نقطہ نظر سے دیکھتا تھا۔ پھر اس کی سمجھ میں یہ بات کیوں کر نہ آسکی کہ اس کا اپنا بیٹا ہی ایک سیاسی قتل کا مرتکب ہو جائے گا۔ جنگ کے آغاز سے ذرا ہی پہلے میں نے ایڈلر کے بیٹے کے رسالے ''کامف'' میں انفرادی دہشت گردی کے ناکردہ پن پر مضمون لکھا تھا۔ یہ بڑی اہم بات ہے کہ ایڈلر نے بڑی گرم جوشی سے مضمون کو پسند کیا تھا۔ فریڈرک ایڈلر نے جو دہشت گردی کا فعل کیا تھا وہ فقط مایوسی کا نتیجہ تھا، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ ☆ اپنا غصہ نکالنے کے بعد وہ دوبارہ اپنے روزمرہ میں مصروف ہو گیا۔

گیئر نے اس امکان کی طرف اشارا کیا کہ اگلی صبح تمام روسیوں اور سربوں کو گرفتار کیا جا سکتا تھا۔

''پھر تمہارا مشورہ یہ ہے کہ میں یہاں سے نکل جاؤں؟''

''جتنی جلدی ہو سکے''

''میں کل ہی اپنے کنبے کے ساتھ سوئٹزرلینڈ چلا جاؤں گا۔''

''بہتر ہو گا کہ ابھی چلے جاؤ۔''

یہ گفتگو تین بجے ہوئی تھی۔ چھ بج کر دس منٹ پر میں اپنی بیوی او بچوں کے ہمراہ زیورچ

☆ وکٹر ایڈلر کے بیٹے فریڈرک ایڈلر نے 21 اکتوبر 1916 کو آسٹرو۔ہنگری وزیراعظم کاونٹ سٹورخ کو گولی ماردی تھی۔ اسے سزائے موت ہو گئی جو بعد میں قید میں تبدیل ہو گئی۔ 1819 کے انقلاب کے بعد وہ رہا ہو گیا۔ مترجم

جانے والی ٹرین میں بیٹھا تھا۔ ہم اپنے پیچھے اپنے سات برس کے تعلقات، کتابیں، اخبارات اور غیر مکمل تحریریں چھوڑ آئے تھے جن میں پروفیسر مسارک کی متنازعہ کتاب کے جواب میں روسی ثقافت کے مستقبل کے امکانات پر ایک مضمون بھی شامل تھا۔

جرمن سوشل ڈیموکریسی نے جس طرح فوج کی اطاعت قبول کر لی تھی، اس نے مجھے جنگ چھڑ نے سے بھی زیادہ صدمہ پہنچایا۔ یہ بات الگ ہے کہ میں جرمن سوشلزم کا کچھ ایسا گرویدہ بھی نہیں تھا۔ میں نے 1905 میں لکھا تھا اور بعد میں اسے کئی بار دہرایا تھا۔''یورپی سوشلسٹ پارٹیوں کی اپنی ایک قدامت پسندی ہے جو عوام کی سوشلزم سے محبت کے ساتھ زیادہ ترقی کرتی جارہی ہے۔کوئی وقت ایسا بھی آسکتا ہے جب سوشل ڈیموکریسی محنت کشوں اور بورژوازی کے مابین تصادم میں ایک رکاوٹ بن جائے۔دوسرے لفظوں میں پارٹی کی سوشلسٹ قدامت پسندی ہی پرولتاریہ کی اقتدار حاصل کرنے کی جنگ میں کسی لمحے رکاوٹ بن سکتی ہے۔'' مجھے امید نہیں تھی کہ انٹرنیشنل کے سرکاری عہدے دار جنگ کی صور میں کوئی سنجیدہ انقلابی اقدام کے اہل تھے۔مگر اس کے ساتھ ہی میں یہ خیال بھی قبول کرنے کو تیار نہیں تھا۔کہ سوشل ڈیموکریسی جنگ باز قوم پرستوں کے سامنے پیٹ کے بل رینگنے لگے گی۔

جب''ورورسٹ'' کا وہ شمارہ جس میں چار اگست کو رچستاگ میں ہونے والے اجلاس کی کاروائی شائع ہوئی تھی، سوئٹزرلینڈ پہنچا تو لینن نے فیصلہ کن انداز میں کہہ دیا کہ یہ جعلی شمارہ تھا جسے جرمن جرنل سٹاف نے اپنے دشمن کو ڈرانے اور دھوکہ دینے کے لئے شائع کیا تھا۔تنقیدی ذہن رکھنے کے باوجود جرمن سوشل ڈیموکریسی پر سے اس کا ایمان متزلزل نہیں ہوا تھا۔ویانا کے ایک اخبار''آربیٹر زی تنگ'' نے بھی جرمن سوشل ڈیموکریسی کی فوج کی اطاعت کو''جرمن قوم کے لئے ایک عظیم دن'' نے قرار دیا۔میرا خیال نہیں تھا کہ''ورورسٹ'' کا شمارہ جعلی تھا۔ویانا میں میرے پہلے ذاتی تاثرات نے مجھے آخری حد تک لے جانے کے لئے تیار کر دیا تھا۔اس کے باوجود 4 اگست کا ووٹ (یعنی فوج کی اطاعت گزاری) میری زندگی کا سب سے اندوہناک تجربہ تھا۔ہیبل نے کیا کرنا تھا؟ اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔لیکن ہیبل تو فوت ہو چکا تھا۔اب ہیسے رہ گیا تھا۔وہ ایک ایمان دار دیہاتی قسم کا جمہوریت پسند تھا مگر اس کی نہ تو نظریاتی بنیاد تھی اور نہ ہی اس کا مزاج انقلابی تھا۔کسی نازک موقع پر وہ کوئی فیصلہ کن اقدام کرنے کا اہل نہیں تھا۔وہ دکھواور انتظار کرو کی پالیسی پر چلتا تھا۔واقعات اس کی استطاعت سے بہت بڑے تھے۔اور اس سے پرے دیکھنے شیڑی مان ایمبرئس اور ویلیسی رہ گئے تھے۔

سوئٹزرلینڈ چونکہ کمزور تھا اس نے غیر جانبدار رہنے کا فیصلہ کیا۔اس طرح صورتحال زیادہ واضح ہو گئی۔سوئس پارلیمان میں دو ڈپٹی تھے جو ہم نام تھے۔ایک جوہان سک جو زیورچ سے تعلق رکھتا تھا اور

دوسرا جین سک جو جنیوا سے تھا۔ جو ہان جومنوں اور جین فرانسیسوں کا سودائی تھا۔ سوئس اسی قسم کی بین الاقوامیت کا عکس دار تھا۔

جنگ کے دوسرے مہینے میں زیورچ کی ایک سڑک پر میری ملاقات بوڑھے مولکن بوہر سے ہوگئی جو وہاں رائے عامہ تبدیل کرنے آیا تھا۔ میرے اس سوال پر کہ اس کی پارٹی عالمی جنگ کو کس نقطہ نظر سے دیکھتی ہے، اس پر ''ورسٹینڈ'' کے پرانے رکن نے جواب دیا۔ ''اگلے دو ماہ میں ہم فرانس کو ختم کر دیا گے۔ پھر مشرق کی جانب جا کر زار کی فوج تباہ کریں گے۔ پھر تین یا چار ماہ بعد یورپ کو پائیدار امن سے نواز دیں گے۔'' میں نے اس کا یہ جواب اپنی ڈائری میں حرف بہ حرف لکھ لیا تھا۔ یہ مولکن بوہر کا صورتحال کے بارے میں صرف اپنا اندازہ نہیں تھا۔ وہ سوشل ڈیموکریسی کی سرکاری زبان بول رہا تھا۔ اس وقت وہ سینٹ پیٹرز برگ میں فرانسیسی سفیر سے پانچ پونڈ کی شرط لگا رہا تھا کہ جنگ کرسمس سے پہلے ختم ہو جائے گی۔ مگر ایسا بھی نہیں تھا۔ ہم جن کو ''خیالی جنت کے باسی'' کہا جاتا تھا، سفارتی حلقوں کے لوگوں اور سوشل ڈیموکریسی کے ان شریف زادوں کی نسبت چیزوں کو بہتر طور پر دیکھ سکتے تھے۔

سوئٹزر لینڈ جو کہ جنگ کے دنوں میں ہماری پناہ گاہ تھی اس نے مجھے فن لینڈ میں میری پناہ گاہ ''روحا'' کی یاد دلا دی جہاں میں نے 1905 میں روس میں انقلاب کی خبر سنی تھی۔ سوئس فوج بھی متحرک ہوگئی تھی اور باسل میں توپوں کی مشق کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔ لیکن تشوش کی بڑی بات یہ تھی کہ پنیر کی تو بہتات تھی مگر آلوؤں کی کمی تھی۔ ہمارا ہائشی قصبہ ایک نخلستان لگتا تھا۔ جس کے چاروں طرف جنگ کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں ایک بار پھر ''روحا'' (امن) کو چھوڑ کر سینٹ پیٹرز برگ میں ٹیکنالوجی انسیٹی ٹیوٹ کے ہال میں محنت کشوں سے دوبار خطاب کے لئے چلا جاؤں گا۔ وہ لمحہ آیا مگر 33 ماہ کے بعد۔

جو کچھ ہو رہا تھا اس پر اپنے خیالات کو صاف کرنے کے لئے مجھے اپنی ڈائری کی طرف توجہ دینی پڑی۔ میں نے 9 اگست کو اس میں لکھا تھا: ''سوال غلطیوں کا نہیں ہے، موقع پرستی کے بعض اعمال کا نہیں ہے، بیدن کی گرینڈ ڈچی کے سوشل ڈیموکریٹوں کا بجٹ پر ووٹ دینا نہیں ہے، فرانسیسی جنگجوئی اور عسکریت پسندی کے تجربات کا نہیں ہے، بعض راہنماؤں کی غداری کا نہیں ہے ___ سوال عظیم ذمہ داری کے وقت انٹرنیشنل کے انہدام کا ہے۔ ایک ایسے وقت کا ہے جس کے لئے ماضی میں اتنی بڑی تیاریاں کی

گئی تھیں۔''

11 اگست کو میں نے یہ لکھا تھا: ''سوشلسٹ تحریک کی انقلابی شورش جو شروع ہی سے جنگ جیسی دکھائی دے، ایک نئے انٹرنیشنل کی بنیاد رکھے گی۔ آنے والے سال سماجی انقلاب کے سال ہوں گے۔

میں سوئس سوشلسٹ پارٹی میں بڑی سرگرمی سے داخل ہوا۔ اس کی نچلی پرتوں میں ہی محنت کش سطح پر انٹرنیشنل ازم کو بے انتہا ہمدردی سے دیکھا جاتا تھا۔ پارٹی کی ہر میٹنگ کے بعد مجھے اپنے موقف کی درستگی کا دوہرا یقین ہو جاتا تھا۔ مجھے اپنی پہلی بڑی اور زبردست حمایت ورکروں کی یونین انٹراچ ''Eintracht'' سے حاصل ہوئی۔ اس کی رکنیت میں انٹرنیشنل لوگ بھی شامل تھے۔ یونین کے ڈائریکٹریٹ سے اتفاق کے بعد میں نے جنگ اور سوشلسٹ حب وطنی کے خلاف ایک مینی فیسٹو تیار کیا۔ راہنما نہ آئے۔ انہوں نے سوچا کہ ایک سلگتے ہوئے سوال پر کوئی واضح موقف اختیار کرنا خطرناک ہوسکتا ہے۔ انہوں نے نہ آنے اور وقتی طور انتظار کرنے کو ترجیح دی۔ وہ جرمن اور فرانسیسی جنگجو آنہ وطن پرستی کے دیوانوں کی آتش فشاں تنقید سے بچنا چاہتے تھے۔ ''انٹراچ'' کے اجلاس نے تقریباً متفقہ طور پر مینی فیسٹو کو منظور کرلیا جس نے اپنے تمام ابہام کے باوجود پارٹی ورکروں کو متحرک کر دیا۔ جنگ شروع ہونے کے بعد یہ کسی مزدور تحریک کی پہلی انٹرنیشنل دستاویز تھی۔

ان دنوں میں پہلی مرتبہ راڈک سے ملا جو جنگ شروع ہونے پر جرمن سے سوئٹزرلینڈ آیا تھا۔ جرمن پارٹی میں اس کا تعلق انتہا پسند بائیں بازو سے تھا۔، اور مجھے امید تھی کہ میرے اور اس کے نظریات میں کچھ نہ کچھ مطابقت ہوگی۔ وہ واقعی جرمن سوشل ڈیموکریسی کے حکمران حصے کے سخت خلاف تھا۔ یہاں میں اس کے ساتھ تھا۔ لیکن گفتگو کے دوران میں مجھے یہ جان کر سخت حیرت ہوئی کہ وہ جنگ کے نتیجے میں کسی پرولتاری انقلاب کے امکان کے حق میں نہ تھا، اور نہ ہی اسے مستقبل قریب میں کوئی ایسا امکان دکھائی دیتا تھا۔ اس کا کہنا تھا۔ ''اس کے لئے پیداواری طاقتیں ابھی مناسب طور پر ترقی یافتہ نہیں ہوئیں۔'' میں یہ سننے کا عادی ہو چکا تھا کہ روس کی پیداوار طاقتیں ابھی اتنی ترقی یافتہ نہیں ہوئیں کہ محنت کش طبقہ اقتدار پر قبضہ کر سکے۔ لیکن مجھے ایک ترقی یافتہ سرمایہ دار ملک کے ایک انقلابی سیاستدان سے اس قسم کے جواب کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ میرے زیورچ سے چلے جانے کے تھوڑے دنوں بعد راڈک نے ''انٹراچ'' میں ایک طویل مضمون پڑھا جس میں اس کا استدال تھا کہ سرمایہ دار دنیا ابھی سوشلسٹ انقلاب کے لئے تیار نہیں

تھی۔

راڈک کا مضمون اور زیورچ جسے جنگ کے آغاز میں ایک عمومی سوشلسٹ دوراہا سمجھا جاتا تھا، ان کا ذکر ایک سوئس ادیب بروب باچر نے اپنی یادداشتوں میں بڑے دلچسپ انداز میں کیا ہے۔ عجیب بات ہے کہ اس نے میرے اس زمانے کے نظریات کو ''سست الوجود'' کہا ہے۔ اس لفظ سے اس کا کیا مطلب ہے میرے لئے سمجھنا مشکل ہے۔ اس نے اپنے بارے میں اپنی ایک کتاب میں لکھا ہے جس کا نام ہے ''ایک بانکے شہری سے ایک بالشویک تک'' کتاب پڑھ کر مجھے ہوا کہ وہ کتاب کے پہلے نصف عنوان ہی کے قابل تھا۔ دوسرے نصف حصے کے متعلق میں کوئی ذمہ داری قبول نہیں کرتا۔

جب جرمن اور فرانسیسی سوشلسٹ اخباروں نے سرکاری سوشلزم کی سیاسی تباہی کی تصویر واضح کر دیا تو میں ڈائری لکھنی چھوڑ کر جنگ اوانٹرنیشنل کے موضوع پر ایک پمفلٹ لکھنے بیٹھ گیا۔ راڈک سے اپنی پہلی گفتگو کے نتیجے میں میں اس پمفلٹ میں ایک پیش لفظ کا اضافہ کیا جس میں میں نے اپنے نقطہ نظر پر زیادہ زور دیتے ہوئے کہا کہ موجودہ جنگ ایک طرف نجی ملکیت اور دوسری طرف ریاستی حدود کے خلاف عالمی سطح پر سرمایہ داری کی پیداواری طاقتوں کی شورش تھی۔

یہ کتابچہ جس کا نام ''جنگ اور انٹرنیشنل'' تھا، اس کی قسمت بھی پہلے سوئٹزرلینڈ، پھر جرمنی اور فرانس پھر امریکہ اور آخر میں سوویٹ روس میں میری دوسری کتابوں جیسی ثابت ہوئی۔ ان سب کے متعلق چند لفظ کہنے کی ضرورت ہے۔ میرا کام روسی زبان سے جرمن زبان میں ایک ایسے روسی مترجم نے ترجمہ کیا تھا جسے دونوں زبانوں پر مکمل عبور حاصل نہیں تھا۔ زیورچ میں راگاز نامی ایک پروفیسر نے ترجمے پر نظر ثانی کی ذمہ داری قبول کر لی اور اس طرح مجھے ایک منفرد شخصیت سے ملنے کا موقع مل گیا۔

راگاز اگرچہ خدا پر یقین رکھنے والا ایک عیسائی تھا، پیشے اور تعلیم کے لحاظ سے ایک مذہبی آدمی تھا، اس کے باوجود سوئس سوشلزم میں شدت پسند بازو میں اس کا ایک مقام تھا۔ وہ جنگ کے خلاف انتہا پسندانہ طریقوں سے لڑنے کے حق میں اور پرولتاری انقلاب کا زبردست حامی تھا۔ سیاسی مسائل کی طرف اس کے اور اس کی بیوی کے انتہائی ایماندارانہ رویے نے مجھے ان کی طرف راغب کیا تھا۔ ان کی اسی رویے نے انہیں آسٹروی، جرمن، سوئس اور سوشل ڈیموکریسی کے دوسرے سرکاری اہلکاروں کے مقابلے میں ایک نمایاں اور جداگانہ حیثیت دے رکھی تھی۔ سرکاری اہلکاروں کے دماغ خیالوں سے بالکل خالی تھے۔ جہاں

تک مجھے یاد پڑتا ہے اسے اپنے خیالات اور نظریات کی وجہ سے یونیورسٹی میں اپنی کرسی چھوڑنی پڑی تھی۔ جس طبقے سے اس کا تعلق تھا اس کے پیش نظر یہ بہت بڑی قربانی تھی۔ میری اس سے جس قدر گفتگو رہی اس کے دوران میں میں نے محسوس کیا کہ اس غیر معمولی آدمی کی ساری عزت اور احترام کے باوجود ہم دونوں کے درمیان ایک باریک مگر نا قابل عبور پردہ مائل رہا۔ وہ ایک مکمل صوفی تھا۔ اس نے اپنے اعتقادات مجھ پر کبھی تھوپنے کی کوشش نہیں کی تھی، بلکہ ان کا کبھی ذکر تک نہیں کیا تھا۔ اس کے باوجود اس کی باتوں سے یوں ظاہر ہوتا تھا جیسے کسی مسلح شورش میں کچھ ایسے عناصر شامل ہو جائیں گے جو میرے اندر تھرتھری پیدا کر دیں گے۔ جس لمحے سے میں نے اپنے بارے میں غور کرنا شروع کیا ہے، میں نے خود کو پہلے ایک الہامی آدمی اور بعد میں ایک باشعور مادہ پرست پایا۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ میں نے کبھی دوسری دنیاؤں کی ضرورت کو محسوس نہیں کیا۔ لیکن نفسیاتی طور پر میرا ایسے لوگوں سے رابطہ قائم نہیں ہو سکا جو ایک ہی وقت میں مادی اور روحانی زندگیوں کو تسلیم کرتے ہیں۔

لیکن راگاز کی بدولت میری کتاب اچھی جرمن زبان میں شائع ہوئی۔ اوائل دسمبر 1914 میں یہ کتاب سوئٹزرلینڈ سے آسٹریا اور جرمنی پہنچ گئی۔ یہ بندوبست بائیں بازو کے سوئس راہنما ایف، پلیٹن اور اس کے ساتھیوں نے کیا تھا۔ کتاب جرمن سوشل ڈیموکریسی کے خلاف تھی جو انٹرنیشنل میں دوسری بڑی پارٹی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ہیل مان نام ایک صحافی نے جو پہلے جنگجوآنہ وطن پرستی کے آرکیسٹرا میں آگے بڑھ کر ساز بجاتا تھا۔ اس نے میری کتاب کو ایک پاگل پن قرار دے دیا۔ ایک ایسا پاگل پن جو بڑی حد تک منطقی تھا۔ مجھے بھی زیادہ تحسین کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن ایسے اشاروں کی کمی نہیں تھی جو بتاتے تھے کہ میری کتاب حکومتی پروپیگنڈے کا ایک فن کارانہ آلہ تھی۔

پھر فرانس میں مجھے ایک فرانسیسی اخبار میں سوئٹزرلینڈ کے حوالے سے یہ خبر پڑھنے کو ملی کہ ایک جرمن عدالت نے یہ کتاب لکھنے کی گستاخی پر مجھے قید کی سزا سنادی تھی۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ تیر نشانے پر لگا تھا۔ لیکن اس سزا نے میرے اوپر عائد ہونے والے ان الزامات سے تو مجھے بری کر دیا کہ میں حکومت کا جاسوس یا حواری تھا اور اس کا پروپیگنڈا کرتا تھا۔

چونکہ کتاب جرمن زبان میں شائع ہوئی تھی لہٰذا فرانسیسی حکام نے اسے سرحد پر روک لیا۔ میری کتاب کی ضبطی کے خلاف فرانسیسی اخبار ''ہاروے'' میں ایک مبہم اور ہلکا نوٹ شائع ہوا۔ میرا خیال ہے کہ

یہ نوٹ چی، ریاپورٹ نے لکھا تھا جو قدرے امتیازی حیثیت کا آدمی اور کہنے کو مارکسسٹ تھا۔ وہ ذومعنی باتیں اور جگتیں ایجاد کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا اور ساری زندگی اسی کام میں گزرادی تھی۔

اکتوبر انقلاب کے بعد نیویارک کے ایک ناشر نے میرا یہ جرمن پمفلٹ نمایاں طور پر شائع کیا۔ ناشر کے بیان کے مطابق صدر ولسن نے وائٹ ہاؤس سے اسے فون کر کے کتاب کے پروف منگوائے تھے۔ اس وقت صدر اپنے چودہ نکات کو ترتیب دے رہا تھا۔ اور معتبر لوگوں کی رپورٹوں کے مطابق اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ ایک بالشویک نے اس کا ایک فارمولا تیار کرنے میں اس کی کیسے مدد کی تھی۔ دو ماہ کے اندر امریکہ میں کتاب کی سولہ ہزار کاپیاں بک گئیں۔ پھر برسٹ۔لٹووسک امن معاہدے کے دن آ گئے۔ امریکی پریس نے میرے خلاف غضبناک تحریک شروع کردی اور کتاب دیکھتے ہی دیکھتے بازار سے غائب ہوگئی۔

سوویٹ جمہوریہ میں میرے زیورچ پمفلٹ کے کئی اڈیشن ہوئے۔ جنگ کی طرف مارکسی رویے کے مطالعے کے لئے یہ ایک نصابی کتاب بن گیا۔ 1924 کے بعد یہ کمیونسٹ انٹرنیشنل ''مارکیٹ'' سے ایک دم غائب ہوگیا۔ یہ وہ وقت تھا جب ''ٹراٹسکی ازم'' دریافت کیا گیا تھا۔ انقلاب سے پہلے کی طرح پمفلٹ پر آج بھی پابندی عائد ہے۔

یہ درست ہے کہ کتابوں کی اپنی قسمت ہوتی ہے۔

پیرس اور زمروالڈ

19 نومبر 1914 کو میں نے ''کیف سکایا میسل'' کے جنگی نمائندے کے حیثیت سے فرانس کی سرحد عبور کی۔ میں نے اخبار کی طرف سے یہ پیشکش بڑے شوق سے قبول کی تھی کیونکہ اس کے ذریعے مجھے جنگ کو زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع ملنا تھا۔ پیرس غمزدہ تھا۔ شام کو اس کی سڑکوں پر گہرا اندھیرا چھا جاتا۔ کبھی کبھار کوئی ہوائی جہاز ہمارے سروں پر سے گزر جاتا۔ جرمنوں کی پیش قدمی کو مارنی کے مقام پر روکنے کے بعد جنگ زیادہ تیز اور بے رحم ہوگئی تھی۔ ایک لامحدود ابتری نے یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ سوشل ڈیموکریسی کے فریب خوردہ عوام اور محنت کش خاموش تھے۔ تباہی کے انجن اپنی رفتار تیز کررہے تھے۔ سرمایہ دارانہ تہذیب اپنے ہی خنجر سے خودکشی کررہی تھی اور انسانوں کی کھوپڑیاں توڑ رہی تھی۔

جب جرمن پیرس کے نزدیک آرہے تھے اور فرانسیسی بورژ وامحبّ الوطن اسے چھوڑ کر بھاگ رہے تھے تو ایسے وقت میں دوروسی مہاجروں نے روس سے شائع ہونے والا ایک چھوٹا سا روزنامہ پیرس سے چلانے کا فیصلہ کیا۔ روزنامے کا مقصد پیرس میں مقیم ایسے روسیوں کو حالات سے باخبر رکھنا تھا جنہیں تقدیر نے تتر بتر کر دیا تھا۔ دوسرا مقصد انٹرنیشنل کے استحکام کی روح کو بجھنے سے روکنا تھا۔ پہلا شمارہ نکلنے سے پہلے اخبار کا کل سرمایہ تیس فرانک تھا۔ کوئی بھی ہوش مند آدمی اتنے ''چھوٹے سرمائے'' سے پرچہ نکالنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ایڈیٹروں اور اس کے دوسرے لکھنے والوں میں کام تقسیم کرنے کے باوجود پرچے کا بحران اس قدر شدید تھا کہ اس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں مل رہا تھا۔ بہر حال ایک راستہ تلاش کر ہی لیا گیا۔ پرچے کے کمپوزروں نے بھوکے رہ کر پرچے کو کمپوز کیا۔ ایڈیٹروں نے شہر میں گھوم کر چندہ جمع کیا اور پہلا شمارہ وقت پر شائع ہو گیا۔ خسارے اور سنسر شپ کی سختیاں برداشت کرتا کبھی بند کبھی جاری کبھی نئے نام کے تحت یہ روزنامہ اڑھائی سال تک یعنی فروری 1917 کے انقلاب تک اپنا وجود قائم رکھے رہا۔ پیرس میں آنے کے بعد میں نے اپنے پرچے ''ناشے سلوو'' (ہمارا لفظ) کے لئے سرگرمی سے کام کرنا شروع کر دیا۔ پہلے اس روزنامے کا نام ''گولوس'' (آواز) تھا۔ ایک روزنامے نے بتدریج پیش آنے والے حالات میں میری عمدہ تربیت کی جو ابھی خود کو بتدریج کھول رہے تھے۔ بعد میں ''ناشے سلوو'' کا تجربہ اس وقت میرے کام آیا جب مجھے عسکری معاملات سے واسطہ پڑا۔

میری بیوی اور بچے مئی 1915 میں فرانس آ گئے۔ ہم نے سیورس میں ایک چھوٹے سے گھر میں چند ماہ کے لئے رہائش اختیار کر لی۔ یہ گھر میرے نوجوان دوست اطالوی آرٹسٹ رینے پارسی نے دیا تھا۔ ہمارے بیٹے سیورس کے ایک سکول میں جانے لگے۔ یہاں کا موسم بہار بے حد خوبصورت تھا۔ سبزہ خاص طور پر بے حد دل لبھانے والا تھا۔ لیکن ماتمی لباس میں خواتین کی تعداد مسلسل بڑھتی جا رہی تھی۔ بچے اپنے باپ تلاش کر رہے تھے۔ دونوں فوجیں زمین میں گڑی آمنے سامنے مورچے سنبھالے ہوئے تھیں۔ بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ کلیمین سو اپنے اخبار میں جوفرے پر حملے کر رہا تھا۔ رجعت پسند حلقوں میں زیر زمیں حکومت کا تختہ الٹنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں جس کی رپورٹیں زبانی اور لفظوں میں آ رہی تھیں۔ ''لی ٹیمپس''، چند دنوں سے پارلیمان کو ''گدھا'' لکھے جا رہا تھا۔ اس کے باوجود اخبار کہہ رہا تھا کہ سوشلسٹ ہی قومی اتحاد کو برقرار رکھ سکتے تھے۔

جورس مر چکا تھا۔ میں ''کیفے ڈو کروسان'' میں گیا جہاں اسے ہلاک کیا گیا تھا۔ میں وہاں اسے تلاش کرتا رہا۔ سیاسی طور پر میں اس سے بہت کم شعور تھا اور اس کی طاقتور شخصیت کی کشش محسوس کرتا رہتا تھا۔ جورس کا ذہن قومی روایات کا خزانہ، اخلاقی اصولوں کا مابعدالطبعیات، افتادگان خاک کے لئے محبت اور شاعرانہ جمالیات کی آماجگاہ تھا۔ جورس کے اندر اشرافیہ کی ایک جھلک صاف دکھائی دیتی تھی جبکہ اس کے مقابلے میں بیبل کی سادگی غربا سے ملتی جلتی تھی۔ لیکن جو ورثہ،

فرانسیسی سوشلسٹ پارٹی مکمل طور پر بے دلی کی حالت میں تھی۔ جورس کی جگہ لینے والا کوئی نہیں تھا۔ بوڑھا والانٹ وطن پرستی جذبے کے تحت ہر روز ایک مضمون لکھ رہا تھا۔ میں ایک دفعہ اسے ''عمل کمیٹی'' میں ملا جو پارٹی کے مندوبین اور ٹریڈ یونینوں کے ملاپ سے تشکیل دی گئی تھی۔ والانٹ اپنے ماضی کا سایہ دکھائی دے رہا تھا اس کے نزدیک جنگ سے پہلے کا فرانس جسے اپنی آبادی پر قابو تھا، بہترین فرانس تھا اور قدامت پسندانہ خیالات اور معاشی طرز زندگی رکھتا تھا، ایک ایسا ملک جو آزادی دلانے والی قوم کی حیثیت سے اپنی ترقی اور تحریک کے ساتھ دوسروں میں روحانی زندگی بیدار کرسکتا تھا۔ والانٹ کا سوشلزم بالکل اسی طرح وطن پرستانہ تھا جیسے اس کی وطن پرستی ایک دیوانگی تھی۔ دوسری طرف مارکسی بازو کا راہنما گوسدے جمہوریت کے روحانی چیلوں کے خلاف ایک طویل جنگ کے بعد تھکاوٹ سے نڈھال پڑا تھا اور قومی دفاع کی قربان گاہ پر اپنی غیر مسخ اخلاقی حاکمیت رکھ چکا تھا۔

ہر چیز اوندھے منہ اور ابتری کی حالت میں پڑی تھی۔ ''بادشاہ بناؤ یا امن قائم کرو'' کتاب کا مصنف مارسل سمبات وقتی طور پر سوشلسٹ پارٹی کا راہنما بن گیا۔ آخر کسی نے تو جورس کی خالی جگہ پُر کرنی تھی۔ راندل نے اپنی آواز میں گرج چمک پیدا کر کے اپنے مقتول لیڈر کی نقل اتارنے کی کوشش کی۔ اس کے سائے میں لانگو بھی انتہا پسندی کا مظاہرہ کرنے میں لگا رہا۔ اس کے طور طریقے مسلسل طور پر یاد دلاتے رہتے تھے کہ مارکسی اپنے پوتوں کا ذمہ دار نہیں تھا۔ کنفیڈریشن جنرل کا صدر جو ہاکس چوبیس گھنٹوں میں غائب ہو گیا۔ وہ امن کے زمانے ہی میں ریاست کے وجود سے ''منکر'' تھا مگر جنگ کے وقتوں میں وہ گھٹنے ٹیک گیا۔ انقلابی مسخرا ہاروے جو کل تک عسکریت پسندوں کا شدید مخالف تھا، بالکل بدل گیا۔ مگر اس نے اپنی شدید وطن پرستی قائم رکھی اور ایک مطمئن مسخرے کی حیثیت سے زندہ رہا۔ اپنا مذاق خود اڑانے کے لئے اس کا اخبار خود کو سوشلزم کا علم بردار کہتا رہا۔

مجموعی طور پر یہ سب کچھ موت کا ایک جشن دکھائی دیتا تھا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر خود سے یہ کہے بغیر رہا جا سکتا تھا۔ ''نہیں، ہم زیادہ سخت مواد کے بنے ہوئے ہیں، واقعات ہمیں بے خبری میں پکڑ نہیں سکتے۔ ہم نے یہ سب کچھ پہلے ہی دیکھ لیا تھا اور آئندہ بھی دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور اس کا مقابلہ کرنے کو تیار ہیں۔'' جب یہ لوگ دور ہی دور کارل لب نخیت سے دوستی کا ہاتھ بڑھاتے تو ہم اپنی مٹھیاں بھینچ کر رہ جاتے۔ ان لوگوں کی مخالفت کے عناصر بھی پارٹی اور سنڈیکیٹ میں موجود تھے مگر وہ بکھرے ہوئے تھے اور ان کے اندر زندگی کی علامتیں کم ہی تھیں۔

پیرس کے روسی مہاجرین میں مارٹوف جو منشویکوں کا راہنما تھا، بلاشبہ سب سے زیادہ نمایاں اور سر کردہ شخصیت تھی۔ اس جیسا باصلاحیت انسان میں نے زندگی میں کم ہی دیکھا ہے۔ مگر اس کی بدقسمتی یہ تھی کہ تقدیر نے اسے انقلاب کے دنوں میں ایک سیاستدان بنا دیا تھا اور قوت ارادی سے محروم رکھا تھا۔ جب کبھی بڑے واقعات وقوع پذیر ہوتے، اس کا روحانی توازن المناک طریقے سے خراب ہو جاتا۔ میں اسے تین تاریخ اتھل پتھلوں میں غور دیکھتا رہا تھا۔ یعنی 1905ء 1914ء اور 1917ء میں۔ اس کا پہلا ردعمل ہمیشہ انقلابی ہوتا۔ لیکن جونہی وہ اپنے خیالات کاغذ پر منتقل کرنے لگتا، اس کے ذہن کو شک وشبہات چاروں طرف سے گھیر لیتے۔ اس کی زرخیز اور ہمہ جہت ذہانت کو خود اعتمادی کی ضرورت تھی۔ 1905 میں اس نے اپنے ایک خط میں ایکسل راڈ سے دکھ بھرے انداز میں شکایت کی کہ وہ اپنے خیالات کو مجتمع نہیں رکھ سکتا۔ وہ واقعی ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ اس دن تک بھی جب رجعت پسندوں نے اقتدار پر قبضہ کر لیا تھا۔ جنگ کے آغاز میں اس نے پھر ایکسل راڈ سے شکایت کی کہ واقعات اسے دیوانگی کی حد تک دھکیل کر لے گئے تھے۔ آخر 1917 میں ہچکچاتے ہوئے بائیں جانب ایک قدم اٹھایا اور پھر اپنے ہی گروہ کے اندر قیادت تنزتلی اور ڈان کے حوالے کر دی۔ یہ دونوں ذہانت میں اس کے ٹخنوں کے برابر بھی نہیں تھے۔ ڈان کا معاملہ تو اس سے بھی گیا گزارا تھا۔

14 اکتوبر 1914 کو مارٹوف نے ایکسل راڈ کو لکھا۔ ''پلیخانوف کی نسبت لینن سے ہماری سمجھ بوجھ پیدا ہو سکتی ہے۔ وہ انٹرنیشنل میں موقع پرستی کیخلاف ایک ابھرتی ہوئی ہستی بن رہا ہے۔'' لیکن یہ موڈ مارٹوف پر زیادہ عرصہ طاری نہ رہا۔ جب میں پیرس آیا تو وہ دھندلا رہا تھا۔ ''ناشے سلوو'' میں ہماری رفاقت شروع ہی سے ایک تلخ نوعیت کی کھینچا تانی بنی رہی تھی۔ اس کا خاتمہ اس کے ادارتی بورڈ سے استعفیٰ

اور بعد میں تحریری سٹاف سے چلے جانے پر ہوا۔

پیرس آنے کے فوراً بعد اور مارٹوف موناتی کو تلاش کرنے لگے جو ''لاوی اور ویئر'' میگزین کے ایڈیٹروں میں سے ایک تھا۔ ایک سابق استاد اور بعد میں پروف ریڈر، موناتی پیرس کا مخصوص محنت کش لگتا تھا۔ وہ ذہین بھی تھا اور باکردار بھی۔ وہ ایک لمحے کے لئے بھی عسکریت یا بورژوا ریاست سے مصالحت کے لئے تیار نہیں تھا۔ لیکن درمیانی راستہ کیسے تلاش کیا جاتا؟ ہمارے نقطہ ہائے نظر مختلف تھے۔ موناتی ریاست اور سیاسی جدوجہد سے ''منکر'' تھا۔ لیکن ریاست نے اس کے انکار کو اس وقت نظرانداز کر دیا جب وہ سرخ پتلون پہن کر سنڈیکیٹوں کی جنگجو آنہ وطن پرستی کے خلاف کھلم کھلا احتجاج کے لئے نکل آیا۔ موناتی کی وساطت سے میری ملاقات صحافی روسمرے ہوئی جو خود انتشار پسندوں سے تعلق رکھتا تھا۔ لیکن جیسا کہ بعد میں واقعات نے ثابت کر دیا، وہ انتشار پسندوں کی بجائے مارکسزم کے زیادہ نزدیک تھا۔ اس وقت سے اب تک ہم دونوں ایک رفاقت کے بندھن میں بندھے ہوئے ہیں۔ کے انہدام تک سارے امتحان برداشت کیے ہیں۔ اس وقت تک میں فرانسیسی مزدور تحریک میں چند ایسے سرگرم کارکنوں سے آشنا ہو چکا تھا جنہیں میں پہلے نہیں جانتا تھا۔ ان میں لوہے کا کام کرنے والے محنت کشوں کی یونین کا سیکریٹری موہیم تھا جو بڑا چالاک اور محتاط آدمی تھا۔ اس کے باوجود اس کا انجام بڑا افسوس ناک ہوا۔ ان میں صحافی گوئل بخز تھا جسے غداری کے ایک غلط مقدمے میں سزائے موت سنائی گئی تھی۔ تانبے کی یونین کا سیکریٹری ''پاپا'' بوردنون تھا، استاد لوریٹ تھا جو انقلابی سوشلزم کے راستے میں سرگرداں تھا۔ ان کے علاوہ کئی دوسرے بھی تھے۔ ہم ہر ہفتے کوئی ڈی جیما پس میں ملتے تھے۔ اگر ہماری تعداد بڑھ بڑھ جاتی تو گرینج___ اوکس بیلے میں اجلاس رکھ لیتے۔ جنگ کی خاص اندرونی خبروں کا تبادلہ کرتے اور دیکھتے کہ سفارتی پر کیا ہو رہا تھا۔ پھر سرکاری سوشلزم پر نکتہ چینی کرتے، سوشلسٹ بیداری کے نشانات دیکھتے، ناپختہ ممبروں کی خامیاں دور کرنے اور مستقبل کا نقشہ بنانے میں لگے رہتے۔

4 اگست 1915 کو میں نے ''ناشے سلوو'' میں لکھا: ''ہر چیز کے باوجود کسی ذہنی دباؤ یا سیاسی تشکیل کے بغیر ہم خونی برسی منانے کے لئے جمع ہوئے بڑی سے بڑی بربادیوں اور مصیبتوں کے درمیان ہم انٹرنیشنلسٹ انقلابیوں نے اپنے تجزیے کا معیار، تنقید اور پیش خیالی کو برقرار رکھا۔ ہم نے چیزوں کو قومی عینک سے دیکھنے سے انکار کر دیا حالانکہ ہمیں اس کے لئے سرکاری سوشلسٹوں کی طرف دیکھتے رہیں گے،

انہیں ان کے اصلی ناموں سے پکاریں گے اور ان کے منطقی نتائج کو پیش نظر سے دیکھیں گے۔''

اور اب تیرہ برس بعد میں یہی الفاظ دہرانے کی پوزیشن میں ہوں۔ ہمارا جذبہ سرکاری سیاسی نظریے جس میں محبّ الوطن سوشلزم بھی شامل ہے، سے کہیں زیادہ برتر تھا۔ یہ جذبہ اور احساس ہم سے کبھی جدا نہ ہوا، اور یہ کسی غلط یا ناجائز مفروضے کا ثمر نہیں تھا۔ اس میں کسی قسم کی ذاتیات بھی شامل نہیں تھیں۔ یہ ہماری نظریاتی حیثیت کا فطری نتیجہ تھا کیونکہ ہم ایک بلند چوٹی پر کھڑے تھے۔ ہمارا تنقیدی نقطۂ نظر ہمیں جنگ کو ایک واضح تناظر میں دکھا رہا تھا۔ دونوں طرفیں ایک جلد فتح کو دیکھ رہی تھیں۔ ایسے ہلکے اندازوں کی بے شمار مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ بکانن اپنی یادداشتوں میں لکھتا ہے۔ ''میرا ایک فرانسیسی ساتھی مجھ سے پانچ پاؤنڈ کی شرط لگانے پر تیار تھا کہ جنگ کرسمس تک ختم ہو جائے گی۔'' بچاناں کے اپنے اندازے کے مطابق جنگ زیادہ سے زیادہ ایسٹر تک جاری رہنی تھی۔ اس کے برعکس ہم اپنے اخبار میں ہر روز لکھتے کہ جنگ سرکاری پیشن گوئیوں کے باوجود طول کھینچ جائے گی اور اس کی آگ سے پورا یورپ بھسم ہو کر نکلے گا۔ اتحادوں کی فتح کے بعد جب جنگ کا دھواں اور غبار صاف ہو جائے گا تو فرانس قدرے بڑے بلجیئم کی شکل میں بین الاقوامی حلقے میں داخل ہوگا۔ ہم امیریکہ کی عالمی آمریت کو واضح طور پر دیکھ رہے تھے۔ ہم نے 5 ستمبر 1916 کو سوویں مرتبہ لکھا۔ ''اس جنگ کی مہربانی سے سامراج زیادہ مضبوط ہو گیا ہے۔ وہ دنیا پر چھا جائے گا۔''

اس سے بہت پہلے میرا کنبہ سیورس سے پیرس کے نواح میں چھوٹے سے قصبے کر کدی میں آ گیا تھا۔ پیرس روز بروز ویران ہو رہا تھا۔ ایک ایک کر کے سڑکوں کے کلاک ٹھہر رہے تھے۔ لائن ڈی بل فورٹ کا کلاک ابھی تک اپنی گندی آواز کسی نہ کسی طرح نکالے جا رہا تھا۔ جنگ دور دور تک اپنے قدم جمانے لگی تھی۔ حب الوطنی چیخ رہی تھی کہ ہم خندقوں سے باہر نکلیں، جمود کو توڑیں اور عدم حرکت کو چھوڑ دیں۔ حرکت، حرکت--اور اس خوفناک دیوانگی کا نتیجہ وردن کی جنگ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ میں نے ''ناشے سلوو'' میں لکھا۔ ''وردن کی جنگ کی عسکری اہمیت خواہ کچھ ہو، اس کی سیاسی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ برلن اور دوسری جگہوں پر تحریک چلانے کا مطالبہ ہو رہا ہے۔ تحریک چلے گی۔ لیکن وردن میں ہمارا آنے والا کل وجود پا رہا ہے۔''

1915 کی سرگرمیوں میں پیرس میں روم پارلیمنٹ میں سوشلسٹ فریق کا سیکریٹری ڈپٹی مورگری

آیا۔ وہ پہلی بار پارلیمنٹ میں منتخب ہوا تھا۔ وہ انٹرنیشنل کانفرنس میں فرانسیسی اور برطانوی سوشلسٹوں کی شمولیت حاصل کرنے آیا تھا۔ ہم نے ایک کیفے کی ٹیرس پر چند ایسے سوشلسٹ ارکان پارلیمنٹ کی میٹنگ رکھ لی جو کسی وجہ سے خود کو بائیں بازو کا سمجھتے تھے۔ گفتگو بڑی نرم روی اور ہمواری سے عام موضوعات اور بین الاقوامی رابطوں کی بحالی پر چلتی رہی۔ لیکن جب مورگری نے ایک سنجیدہ سرگوشی میں سوئٹزرلینڈ کی سیر کی خاطر جعلی پاسپورٹ کی بات کی تو ایک کے بعد ایک فرانسیسی ارکان اسمبلی کے چہرے لٹک گئے۔ اب مجھے یاد نہیں کہ کس نے جلدی سے بیرے سے چائے کا بل منگوایا اور ہم اٹھ کر آ گئے۔ مجھے اطالوی سوشلسٹ لیڈر مولری اور ابلیاس کے بھوت ٹیرس پر چلتے دکھائی دیے۔ مارٹوف کے ساتھ واپس آتے وقت ہم ہنس رہے تھے، مگر اس میں اس غصے کا عنصر بھی شامل تھا۔

موناتی اور روسمر کو فوج میں بلا لیا گیا تھا۔ لہذا وہ سوئٹزرلینڈ نہیں جا سکتے تھے۔ میں مرہیم اور بورڈرون کے ساتھ چلا گیا۔ دونوں بڑے ٹھنڈے مزاج کے آدمی تھے۔ ہمیں جعلی پاسپورٹوں کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ فرانسیسی حکومت نے جنگ سے قبل کے اپنے قوائد نہیں بدلے تھے اور ہمیں جائز طور پر وہاں جانے کی اجازت مل گئی تھی۔ کانفرنس کی تنظیم کا کام برن کے سوشلسٹ راہنما گیرم کے ہاتھ میں تھا جو خود کو پارٹی کی تعصّباتی سطح سے بلند کرنے کی کوشش میں تھا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ اس کی اپنی ذاتی سطح بھی وہی تھی۔ اس نے ایک چھوٹے سے گاؤں زمبر والڈ میں جلسوں کا انتظام کیا تھا۔ یہ قصبہ پہاڑوں کے اوپر واقع تھا اور برن سے دس کلومیٹر دور تھا۔ مندوبین چار سیٹوں والی گاڑیوں میں بیٹھ کر پہاڑوں کی طرف چل پڑے۔ پاس سے گزرنے والے لوگ اس جلوس کو بڑی حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ مندوبین خود بھی اس بات پر ہنس رہے تھے کہ پہلی انٹرنیشنل کے نصف صدی کے قیام کے بعد بھی وہ فقط چار گاڑیوں میں جا رہے تھے۔ مگر وہ کسی شک میں گرفتار نہیں تھے۔ تاریخ کا دھاگہ ٹوٹتا رہتا ہے۔ پھر کوئی گانٹھ اسے جوڑ دیتی ہے۔ ہم زمبر والڈ میں یہی کر رہے تھے۔

5 سے 8 ستمبر تک کانفرنس کے دن بڑے طوفانی تھے۔ انقلابی بازو کی قیادت لینن کر رہا تھا۔ ٹھنڈے مزاج ارکان اکثریت میں تھے۔ دونوں فریق بڑی مشکل سے ایک مشترکہ مینی فیسٹو پر متفق ہوئے جس کا خاکہ میں نے تیار کیا تھا۔ میں مینی فیسٹو میں جو کچھ کہنا چاہتا تھا، کہہ نہ سکا۔ پھر بھی یہ آگے کی سمت ایک بڑا اقدم تھا۔ کانفرنس میں لینن انتہائی بائیں جانب تھا۔ زمبر والڈ کے بائیں بازو کی حمایت کے

باوجود لینن کئی سوالوں پر اقلیت میں تھا۔ زمبر والڈ کے بائیں بازو سے میرا کوئی زیادہ تعلق نہیں تھا، اگرچہ میں تمام اہم سوالوں پر اس سے متفق تھا، زمبر والڈ میں لینن آئندہ کے بین الاقوامی عمل کے سپر نگوں کو کس اور سوئس پہاڑوں کے اس گاؤں میں انقلابی انٹرنیشنل کا کونے کا پتھر نصب کر رہا تھا۔

''ناشے سلوو'' نے انٹرنیشنل تحریک کے رابطے دوسرے ممالک سے جوڑنے کے سلسلے میں جو عمدہ کام کیا تھا، فرانسیسی وفد نے اپنی رپورٹ میں اس کا ذکر کیا۔ راکووسکی نے بتایا کہ مذکورہ اخبار نے بلقان ریاستوں میں سوشل ڈیموکریٹک پارٹیاں قائم کرنے اور ان کی بین الاقوامی حیثیت مضبوط کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ ''ناشے سلوو'' میں اطالوی مصنف بالا بونووا کے جو تراجم شائع ہوتے رہے تھے، ان کے ذریعے سے اطالوی پارٹی اس اخبار سے متعارف ہوئی تھی۔ جرمن پریس بشمول سرکاری اخبارات بھی ''ناشے سلوو'' کا ذکر کرتے رہتے تھے۔

لب نخیت بذات خود زمبر والڈ میں نہیں آیا تھا۔ قید ہونے سے پہلے ہوہن زولرن کی فوج نے اسے گرفتار کر لیا تھا۔ لب نخیت نے کانفرنس میں جو خط بھیجا اس میں وہ ''ٹھنڈے مزاج'' سے ایک دم انقلاب کے حق میں ہو گیا تھا۔ کانفرنس میں متعدد دفعہ اس کا نام لیا گیا۔ پھر عالمی سوشلزم میں یہ نام دوست دشمن میں تمیز کی علامت بن گیا۔

کانفرنس نے اپنی کاروائی کی اشاعت پر پابندی عائد کر دی۔ ڈر تھا کہ خبریں ناپختگی کی حالت میں پریس کو نہ پہنچ جائیں اور واپس جاتے ہوئے سرحد عبور کرتے وقت مندوبین کو کسی قسم کی مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ لیکن چند دنوں بعد گمنام زمبر والڈ کا نام ساری دنیا میں گونجنے لگا۔ اس سے ہوٹل کے کاروبار پر بڑا زبردست مثبت اثر پڑا۔ جس ہوٹل میں ہماری کانفرنس ہو رہی تھی، اس کے مالک نے گیرم کو بتایا کہ اسے اپنی جائیداد کی قیمت میں بے حد اضافے کی توقع تھی اور اس لحاظ سے وہ تیسری انٹرنیشنل میں ایک خاص رقم بطور چندہ دینے کو تیار تھا۔ میرا خیال ہے بعد میں اس نے اپنا ارادہ بدل لیا تھا۔

زمبر والڈ کانفرنس نے جنگ کے خلاف بہت سے ممالک میں تحریکوں کو جنم دیا۔ جرمنی میں انتہا پسند انقلابیوں اور ''علیحدگی پسندوں'' نے اپنی سرگرمیاں بڑھا دیں۔ فرانس میں ایک کمیٹی قائم کی گئی جس کا نام ''بین الاقوامی بحالی رابطہ کمیٹی'' رکھا گیا۔ ''ناشے سلوو'' کو مستقل مالی بحران اور دوسری مشکلات سے بچانے کے لئے پیرس میں روسی مہاجرین کی بستیوں نے اپنی صفیں درست کیں مارٹوف جس نے ''ناشے

سلووٗ' کے ابتدائی دنوں میں بڑی سرگرمی سے کام کیا تھا، اب اس سے الگ ہو گیا تھا۔ زمروالڈ میں میرے اور لینن کے درمیان جو معمولی نوعیت کے اختلافات پیدا ہوئے تھے، بعد کے دنوں میں کوئی بڑی شکل اختیار نہ کر سکے اور ختم ہو گئے۔

لیکن اس دوران میں سر پر بادل منڈلا رہے تھے 1916 میں وہ زیادہ گہرے ہو گئے۔ رجعتی اخبار ''لالبرٹی'' بطور اشتہارات ہمارے خلاف کئی قسم کی باتیں شائع کر رہا تھا اور ہمیں جرمن پٹھو کہہ رہا تھا۔ ہمیں دھمکی آمیز گم نام خطوط مل رہے تھے۔ الزامات اور دھمکیوں کا منبع صاف طور پر روسی سفارت خانہ تھا۔ ہماری پرنٹنگ پریس کے اردگرد مشکوک نوعیت کے لوگ منڈلاتے رہتے تھے۔ ہاروی ہمیں پولیس کی دھمکیاں دیتا رہتا تھا۔ روسی جلاوطنوں کے متعلق حکومتی کمیٹی کے چیئرمین پروفیسر ڈرچ ہم کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا تھا کہ حکومت ''ناشے سلووٗ'' کو بند کرنے اور اس کے ایڈیٹروں کو ملک بدر کرنے کا سوچ رہی تھی۔ بہر حال اس میں تاخیر کی جا رہی تھی۔ ان کے پاس ایسا کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی کیونکہ میں نے کبھی قانون کو ہاتھ میں نہیں لیا تھا، بلکہ سنسرشپ کی بھی خلاف ورزی نہیں کی تھی۔ کوئی تو مناسب بہانہ ہونا چاہیے تھا۔ آخر یہ بہانہ ڈھونڈ لیا گیا، بلکہ گھڑ لیا گیا۔

فرانس سے میرا اخراج

جب میں استنبول میں تھا تو بعد فرانسیسی اخبارات نے لکھا کہ میرے فرانس سے چلے جانے کے تیرہ برس بعد بھی فرانس میں میرے اخراج کے احکام ابھی تک نافذ العمل تھے۔ اگر یہ درست ہے تو اس کا مطلب یہ لیا جا سکتا ہے کہ دنیا کی تمام خوفناک ترین تباہیوں اور بربادیوں میں ابھی ساری قدریں ختم نہیں ہوئیں ہیں۔ ان سارے برسوں میں توپ کے گولوں نے کئی نسلوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا ہے، شہر پورے کے پورے مٹ گئے ہیں یورپ کے ویرانوں میں شاہوں کے تاج بکھر گئے ہیں۔ ملکوں کی سرحدیں بدل گئی ہیں۔ مجھ پر فرانس کی سرحدیں ممنوع کر دی گئیں۔ ان سب ابتریوں اور بحرانوں کے باوجود مالوی نے 1916 کے موسم خزاں میں جن احکام پر دستخط کیے تھے، انہیں ابھی تک محفوظ رکھا گیا ہے۔ اگر مالوی نے خود اپنی ملک بدری کا انتظام کیا ہوتا اور اسے اپنے ملک میں واپس آنا ہوتا تو پھر اسے کیسا لگتا؟ تاریخ میں ایک آدمی کا کام بعض اوقات اس کے خالق سے بڑا ثابت ہوتا ہے۔

ممکن ہے ایک سخت مزاج وکیل یہ پوچھنے میں حق بجانب ہو کہ ایک حکم کو اتنی طویل عمر دینے میں کیا دانائی ہے؟ 1918 میں ماسکو میں مقیم فرانسیسی فوجی مشن نے اپنے افسروں کو میرے اختیار میں دے دیا تھا۔ ایک ایسا غلط آدمی جس پر فرانس میں ابھی تک داخلے پر پابندی عائد ہو۔ اس کے لئے ایسا کیونکر کیا جا سکتا تھا؟ پھر 10 اکتوبر 1922 کو ایم، ہیریٹ مجھے، ماسکو میں ملنے آیا۔ اس نے بھی فرانس سے میری بے دخلی کے حکم کے متعلق مجھے کوئی یاد دہانی نہ کرائی اس کے برعکس یہ میں تھا جس نے اسے یاد دلایا کہ فرانس میں میرے داخلے پر پابندی عائد ہے۔ یہ اس وقت ہوا جب اس نے بڑی عنایت سے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں کب فرانس کا دورہ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ لیکن میں نے اسے یہ یاد دہانی مذاق کے طور پر کرائی تھی۔ ہم دونوں ہنس پڑے، مگر مختلف وجوہات کی بنا پر۔ یہ بھی سچ ہے کہ 1925 میں شاتورا بجلی گھر کے افتتاح کے موقع پر تمام سفارت کاروں کی موجودگی میں میری تقریر کے جواب میں فرانسیسی سفیر نے جو عمدہ تقریر کی تھی، اور اس تقریر کے اندر ایم، مالوی کے حکم کی جو ہلکی سی بازگشت تھی، تیز سے تیز کام بھی اس کا کھوج نہیں لگا سکتے تھے۔ اس بات کا میرے پاس کیا جواب ہو سکتا ہے۔ جب 1916 کے موسم خزاں میں دو پولیس انسپکٹر مجھے پیرس سے آئی رن لے جا رہے تھے تو ان میں سے ایک نے مجھ سے کہا تھا۔ ''حکومتیں آتی جاتی رہتی ہیں مگر پولیس باقی رہتی ہے۔''

فرانس سے میرے اخراج کے حالات کو بہتر طور پر سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ایک لمحے کے لئے اس اخبار کا ذکر کروں جس کا میں ایڈیٹر تھا۔ اس اخبار کا بڑا دشمن روسی سفارت خانہ تھا۔ جہاں ''ناشے سلوو'' کے مضامین کا فرانسیسی میں ترجمہ کر کے انہیں فرانس کی وزارت جنگ کو بھجوا دیا جاتا۔ پھر سنسر شپ کے انچارج ایم چاسلس کو بھی فون کیے جاتے جس نے روس میں فرنچ زبان کے استاد کے طور پر جنگ سے پہلے چند برس گزارے تھے۔ چاسلس اپنے ادارے کا کوئی ایسا پختہ آدمی نہیں تھا۔ وہ اپنی ہچکچاہٹوں کو دور کرنے کے بجائے ان میں پھنسا رہتا تھا۔ (اس آدمی نے چند سال بعد لینن کی سوانح عمری لکھی تھی۔ وہ کیسی ہوگی اس کا بخوبی اندازہ کی جا سکتا ہے) وہ روسی سفارت خانے کی مدد پر اتر ہوا تھا۔ یہ ثابت کرنے کے لئے کسی بڑی جدوجہد کی ضرورت نہیں ہے کہ ''ناشے سلوو'' کے خلاف ساری جنگ جو انتقامی جنگ تھی، اس کی بین الاقوامیت کے خلاف نہیں بلکہ زارشاہی کی مخالفت میں اخبار کی انقلابی روح کے خلاف تھی۔

گلیسیا میں روسی کامیابی سے ہمارا اخبار سنسر کی زد میں آ گیا۔ چھوٹی سی عسکری کامیابی پر زار کا سفار

تخانہ تکبر سے پھول گیا۔ہم نے کاونٹ وٹ کی وفات پر جوتعزیت نامہ لکھا تھا وہ سارے کا سارا کاٹ دیا گیا۔ دوسری طرف یہ حالت تھی کہ سینٹ پیٹرز برگ میں نیوی کا میگزین فرانسیسی جمہوریہ اور اس کی پارلیمنٹ کے ارکان کیخلاف بڑے توہین آمیز مضمون شائع کر رہا تھااور اس پر پیرس میں دانت نکوسے جا رہے تھے۔سینٹ پیٹرزگ میگزین کی ایک کاپی ہاتھ میں لیے میں سنسر کے دفتر میں گیااور اس کی وضاحت طلب کی۔

''میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔'' ایم چاسلس نے جواب دیا۔''اخبار کے متعلق ساری ہدایات وزارت خارجہ سے آتی ہیں۔آپ ہماری کسی سفارت کار سے بات کرنا پسند کریں گے؟''

نصف گھنٹے بعد سفید بالوں والا ایک سفارت کار وزارت جنگ میں پہنچ گیا۔ ہمارے درمیان کچھ اس قسم کی گفتگو ہوئی۔یہ میں نے اس وقت لکھ لی تھی۔

''کیا آپ بتائیں گے کہ ہمارے اخبار میں ایک ریٹائرفوجی افسر کے بارے میں اشاعت کی غرض سے بھیجا جانے والا ایک مضمون کس لئے کاٹ دیا گیا ہے؟ وہ فوجی افسر اب بیمار ہے اور زیر عتاب بھی ہے۔مضمون کو روکنے کا فوجی آپریشن سے کیا تعلق ہے؟''

''دیکھیں ایسے مضمون انہیں ناخوش کرتے ہیں۔'' اس نے روسی سفارت خانے کی طرف سر سے اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

''ہم انہیں ناخوش کرنے کے لئے ہی لکھتے ہیں۔''

سفارت کار میرے اس جواب پر انکساری سے مسکرایا، جیسے میں نے کوئی لطیفہ سنایا تھا۔اس نے کہا۔''ہم حالت جنگ میں ہیں اور اپنے اتحادیوں پر بھروسہ کرتے ہیں۔''

''آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ فرانس کے داخلی معاملات زار کی سفارت کاری کنٹرول کرتی ہے؟۔کیا آپ کے اجداد نے لوئس کیپٹ کا سر اڑانے میں غلطی کی تھی؟''

''آپ مبالغہ آمیزی سے کام لے رہے ہیں۔جناب یہ نہ بھولیں کہ ہم حالت جنگ میں ہیں۔''

مزید گفتگو بیکار تھی۔اس نے مجھے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بتایا کہ چونکہ سیاستدان فانی ہوتے ہیں لہٰذا زندہ سیاستدان مردوں کی زبان سے کوئی ناپسندیدہ بات نہیں سننا چاہتے۔اس ملاقات کے بعد سب کچھ پہلے کی طرح ہونے لگا۔سنسر نیلی پنسل استعمال کرتا رہا۔اخبار کی جگہ تقریباً سفید کاغذ شائع

ہونے لگا۔ ہم ایم چاسلس کی مرضی کے خلاف جانے کے جرم کے کبھی مرتکب نہیں ہوئے تھے۔ اس کے باوجود اس نے اپنے مالکوں کی رضا کی کبھی خلاف ورزی نہیں کی تھی۔

ستمبر 1916 میں میرے ہاتھ میں فرانس کی حدود سے بے دخلی کا حکم تھما دیا گیا۔ اس کی کیا وجہ تھی؟ انہوں نے مجھے کچھ نہ بتایا۔ بعد میں بتدریج کھلا کہ یہ سب کچھ فرانس میں روس کی خفیہ پولیس کا کیا دھرا تھا۔

جب فرانس کی پارلیمنٹ کے رکن جین لانگو نے اس سلسلے میں وزیراعظم سے احتجاج کیا۔ (اس کا احتجاج بھی نہایت شریفانہ ہوتا تھا) تو وزیراعظم نے اسے جواب دیا ''آپ کو معلوم ہے کہ ''ناشے سلوو'' ان سپاہیوں کی جیب سے نکلا تھا جنہوں نے مارسلیز میں ایک کرنل کو قتل کیا تھا۔'' لانگو کو اس جواب کی توقع نہیں تھی۔ وہ اخبار کی زمروالڈ پالیسی کو جانتا تھا۔ وہ اس سے تھوڑی بہت مصالحت کر سکتا تھا مگر کرنل کے قتل کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اس نے وہاں موجود میرے دوستوں سے پوچھا اور انہوں نے مجھ سے لیکن مارسیلز میں قاتل کے متعلق جتنا وہ جانتے تھے اتنا ہی مجھے معلوم تھا۔ روسی آزاد پریس کے نمائندے جو ''ناشے سلوو'' کے محبّ الوطن دشمن تھے، اتفاق سے اس معاملے میں آ گئے اور انہوں نے مارسیلز کے حادثے کی پوری وضاحت کر دی۔

ہوا یہ تھا کہ جب زار حکومت اپنی فوج فرانس لائی تو اس کی تعداد تھوڑی تھی۔ تھوڑی تعداد میں ہونے کے سبب اسے ''علامتی'' فوج کہا جاتا تھا۔ اس فوج کے ساتھ بہت سے جاسوس اور خفیہ پولیس والے بھی بڑی تعداد میں آ گئے۔ ان میں ایک ونگ نام کا آدمی بھی تھا (میرا خیال ہے اس کا یہی نام تھا) وہ لندن سے آیا تھا اور اپنے ساتھ روسی قونصل کے لئے ایک تعارفی خط بھی لایا تھا۔ ونگ نے روس فوج میں ''انقلابی'' کاروائی متعارف کرانے کی غرض سے اوسط قسم کے اخباری نمائندوں کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ ہمارے اخبار کی طرف آنے کی اس میں جرات نہیں تھی۔ لہٰذا ہم اسے جانتے ہی نہیں تھے۔ پیرس میں ناکامی کے بعد ونگ تولون چلا گیا جہاں اسے روسی جہاز رانوں میں کچھ کامیابی حاصل ہوگئی جو شاید اس کا مقصد سمجھنے میں ناکام رہے تھے۔ ''ہمارے کام کے لئے یہ جگہ بڑی عمدہ ہے۔ مجھے انقلابی کتابیں اور اخبارات بھیجے جائیں۔'' اس نے بعض روسی صحافیوں کو لکھا۔ مگر اسے کوئی جواب موصول نہ ہوا۔ تولون میں لنگر انداز روسی بحری جہاز ''اسکولڈ'' میں ایک سنجیدہ نوعیت کی

بغاوت ہوگئی۔مگر اسے بے رحمی سے کچل دیا گیا۔اس کام میں ونگ حصہ صاف دکھائی دے گیا لہٰذا اس نے مارسیلز منتقل ہو جانے میں بہتری سمجھی۔ وہ جگہ بھی اس کے لئے عمدہ ثابت ہوئی۔ وہاں بھی اس نے روسی سپاہیوں میں بغاوت کرادی اور انہوں نے کراسی نامی ایک روسی کرنل کر بیرکوں کے صحن میں سنگ زنی سے ہلاک کر دیا۔ جب متعلقہ سپاہی پکڑے گئے تو ان کی جیبوں سے ''ناشے سلوو'' برآمد ہوا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ گرفتار سپاہیوں کو تو اخبار کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

میری فرانس سے بے دخلی کے مسئلے پر لونگو کی اپنے وزیر اعظم سے گفتگو کے فوراً بعد اور ونگ معاملہ سامنے آنے سے پہلے میں نے جولیس گاوسڈے کو ایک کھلا خط لکھا جس میں بتایا کہ کسی خفیہ پولیس والے نے بالکل صحیح وقت پر اخبار کی کاپیاں سپاہیوں میں تقسیم کی تھیں۔ پھر ہمارے پرچے کی سخت مخالفوں نے بھی ہماری امید کے برعکس جلد ہی اصل بات کی تصدیق کر دی۔مگر ہمیں اس کی پرواہ نہیں تھی۔ زار کی سفار تکاری کا مقصد فرانسیسی حکومت کو یہ یقین دلانا تھا اس کی سرزمین پر روسی سپاہیوں کی بغاوت کے بیج بوئے جا رہے تھے اور یہ کام ''ناشے سلوو'' کے ذریعے کیا جا رہا تھا۔ ان کا مقصد حل ہو گیا تھا۔فرانسیسی حکومت جواب تک ''ناشے سلوو'' پر پابندی لگانے سے ہچکچا رہی تھی، اب اسے کوئی رکاوٹ درپیش نہیں تھی۔ اس کے ساتھ وزیر داخلہ مالوی نے فرانس سے میرے اخراج کے حکم پر دستخط کر دیے۔

وزارت داخلہ کو بڑا مضبوط بہانہ مل گیا تھا۔ وزیر اعظم برائیڈ نے جین لونگو ہی کو نہیں بلکہ بہت سے دوسرے ارکان اسمبلی کو بھی مارسلیز کا واقعہ میرے فرانس سے نکالنے کی وجہ بتایا۔ ظاہر ہے اس کا اثر ہونا تھا۔ چونکہ ''ناشے سلوو'' کا باقاعدہ سنسر ہوتا تھا اور وہ بازار میں کھلے عام بکتا تھا، لہٰذا اس کا روسی سپاہیوں تک پہنچ جانا کوئی بڑے اسرار کی بات نہیں تھی۔ تمام لوگوں کو اصل حقیقت کی خبر ہوگئی۔ جب فرانس کے وزیر تعلیم پین لیوی کو اصل بات کا پتا چلا تو اس کے منہ سے ایک دم یہ لفظ نکل گیا۔ ''شرمناک'' پھر اس نے کہا۔ ''چیزوں کو اتنی دور تک نہیں لے جانا چاہیے تھا۔'' چونکہ جنگ جاری تھی اور روس فرانس کا اتحادی تھا۔ ونگ کی سازش کو بے نقاب نہ کیا گیا۔ میرے لیے مالوی کے حکم کو بجالانے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

پیرس کے ناظم نے مجھ سے پوچھا کہ میں کس ملک میں جانا چاہتا تھا۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ برطانیہ اور اٹلی نے میری مہمان نوازی کا شرف قبول کرنے سے معذرت کر دی تھی۔ اب سوئٹزرلینڈ رہ گیا

تھا۔لیکن افسوس سوئس سفارتخانے نے مجھے ویزا دینے سے انکار کر دیا۔ میں نے اپنے سوئس دوستوں کو تار بھیجا۔انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ میرے معاملے پر ہمدردی سے غور کیا جائے گا۔مگر سوئس سفارت خانہ ویزے سے برابر انکار کرتا رہا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ روسی سفارخانہ اپنے اتحادیوں کی مدد سے ضرورت کے وقت برن میں سوئس حکومت پر اپنا دباؤ بڑھا سکتا تھا۔ پیرس میں سوئس سفارت خانہ اس معاملے میں جان بوجھ کرتا خیر کر رہا تھا اور انتظار میں تھا کہ مجھے فرانس سے نکال دیا جائے۔ میں ہالینڈیا سیکنڈے نیویا براسطہ انگلینڈ جا سکتا تھا۔مگر برطانوی حکومت نے مجھے اپنے ملک کے اندر سے گزرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔فقط سپین رہ گیا تھا۔اب انکار کرنے کی میری باری تھی۔

پیرس کی پولیس سے چھ ہفتوں تک میری بحث چلتی رہی۔ میں جہاں جاتا جاسوس میرے ساتھ لگے ہوتے۔ وہ میرے گھر، میرے اخبار کے دفتر ہر جگہ ہوتے اور لحہ بھر کے لئے مجھے اپنی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیتے۔آخر پیرس کے حکام نے سخت اقدام کا فیصلہ کر لیا۔ پولیس کے چیف لارنٹ نے مجھے اپنے دفتر بلایا اور بتایا کہ چونکہ میں رضا کارانہ طور پر پیرس چھوڑنے کو تیار نہیں تھا لہٰذا دو انسپکٹر سادہ کپڑوں میں بڑے مہذبانہ طریقے سے مجھے فرانس کی سرحد تک لے جائیں گے۔زار کے سفارت خانے کا مقصد پورا ہو گیا۔ مجھے فرانس سے نکال دیا گیا۔

اس واقعے کی تفصیلات میں تھوڑا بہت فرق ہو سکتا ہے۔مگر بڑے حقائق نا قابل تردید ہیں۔ پھر بہت سے لوگ جن کا اس کہانی سے تعلق ہے،ابھی تک زندہ ہیں اور ان میں سے بہت سے ابھی تک فرانس میں رہتے ہیں۔اس سلسلے میں دستاویزات بھی موجود ہیں لہٰذا حقائق کو سچ ثابت کرنا مشکل نہیں ہے۔اگر فرانس سے میرے اخراج کے حکم کو پولیس کے ریکارڈ سے نکال کر اس کا گہری نظر سے معائنہ کیا جائے تو اس کے کسی کونے میں موزنر یرونگ کا نام یا انگلیوں کے نشان ضرور دکھائی دیں گے۔

براستہ سپین

اوڈری گاؤں میں دو پولیس انسپکٹر میرے گھر میں میرا انتظار کر رہے تھے۔ان میں سے ایک کوتاہ قد اور زیادہ عمر کا لگتا تھا۔دوسرا طاقتور اور گنجا تھا اور کوئی پنتالیس سال کا ہوگا۔اس کا رنگ سیاہ تھا۔وہ سادہ کپڑوں میں تھے۔ بات کرتے وقت یوں لگتا تھا جیسے آداب بجالائیں گے۔ جب میں اپنے دوستوں اور

اپنی فیملی کو خدا حافظ کہہ رہا تھا تو پولیس بڑی شائستگی سے دروازوں کے عقب میں کھڑی رہی۔ بڑی عمر والا پولیس انسپکٹر اپنی ٹوپی بار بار اتار کر میری بیوی سے کہتا تھا۔ ''مادام معاف فرمائیں۔''

دو جاسوس جو گذشتہ دو ماہ سے بڑی تن دہی محنت سے میرا پیچھا کر رہے تھے، دروازے کے باہر کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نے بڑے دوستانہ انداز میں جیسے ہمارے درمیان کچھ نہیں تھا، کار کا قالین ٹھیک کرتے ہوئے دروازہ بند کیا۔ مجھے وہ شکاری یاد آ گیا جو اپنا شکار خریدار کے حوالے کر رہا تھا۔ ہم چل پڑے۔

ایک تیز ٹرین۔ تیسرے درجے کا ڈبہ۔ زیادہ عمر والا انسپکٹر جغرافیہ دان نکلا۔ وہ ٹومسک، کاسان اور کئی دوسرے جغرافیہ دانوں کو جانتا تھا۔ وہ ہسپانوی بھی بول لیتا تھا اور اس ملک سے بخوبی آشنا تھا۔ دوسرا قدرے سیاہ رنگ انسپکٹر خاموشی سے کچھ فاصلے پر بیٹھا رہا۔ وہ خود پر کوئی بوجھ محسوس نہیں کر رہا تھا۔ ''لاطینی قوم بس اپنا وقت گزار رہی ہے جب کہ دوسری قومیں وقت کو پیچھے چھوڑے جا رہی تھی۔'' وہ اچانک بول پڑا۔ اس نے اپنے بالوں والے ہاتھوں سے، جن میں اس نے انگوٹھیاں پہن رکھی تھیں، چاقو سے پورک کا ایک ٹکڑا کاٹ رہا تھا۔ ''ادب میں کیا پڑا ہے؟ ہر جگہ انحطاط ہے۔ یہی فلسفے کا حال ہے۔ پاسکل اور ڈیکارٹ کے بعد کوئی حرکت نہیں ہے.....'' لاطینی قوم بس وقت گزار رہی ہے.....میں حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا کہ اب وہ کیا کہے گا۔ لیکن وہ خاموشی سے گوشت کے ٹکڑے کو چبھاتا رہا۔ ''آپ کے پاس ٹالسٹائی تھا، زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ لیکن ہم ابسن کو ٹالسٹائی سے بہتر سمجھتے ہیں۔'' اور وہ دوبارہ چپ ہو گیا۔

عملیت اور لیاقت کا یہ اچانک اظہار دیکھ کر زیادہ عمر والا انسپکٹر مجھے ٹرانس۔ سائبیرین ریلوے کی اہمیت بتانے لگا۔ پھر اس نے اپنے ساتھی کے مایوسانہ نتیجے میں اضافے کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم میں پہل کرنے کے جذبے کا فقدان ہے۔ ہر کوئی سرکاری افسر بننا چاہتا ہے۔ یہ افسوس ناک بات ہے۔ مگر اس کے بغیر چارہ بھی نہیں ہے۔'' میں دونوں کو بڑی عاجزی مگر دلچسپی کے ساتھ سنتا رہا۔ ''کسی کا پیچھا کرنا، وہ بھی ان دنوں بالکل ناممکن ہے تعاقب اسی کارگر ثابت ہوتا ہے جب آدمی کو پتا نہ چلے کہ اس کا تعاقب ہو رہا ہے۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟ زیر زمین دوز ریل نہ کریں تعاقب اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے۔'' سیاہ فام انسپکٹر دانت نکال کر ہنسنے لگا۔

زیادہ عمر کے انسپکٹر نے پہلے انسپکٹر کی بات کا اثر کم کرنے کی خاطر کہا۔ ''ہم پیچھا کرتے رہتے ہیں

مگر جانتے نہیں کہ کیوں کر رہے ہیں۔''

''ہم پولیس والے شک کے مارے ہوتے ہیں۔'' سیاہ فام انسپکٹر نے ایک دم موضوع تبدیل کرتے ہوئے کہنا شرع کیا۔'' آپ کے اپنے نظریات ہیں۔مگر ہم نے موجودہ نظام کو برقرار رکھنا ہے۔ عظیم انقلاب کو ہی لیں۔نظریات کی کیسی زبردست تحریک تھی۔مگر انقلاب کے چودہ سال بعد لوگ پہلے کی نسبت زیادہ دکھیا ہوگئے۔ ٹینی کو پڑ میں ہم پولیس والے اپنے فرائض منصبی ہی کی وجہ قدامت پسند کہلاتے ہیں۔ ہمارے پیشے میں تشکیک کا فلسفہ ہی چلتا ہے۔اپنا راستہ چننا اپنے اختیار میں نہیں ہوتا۔کوئی اپنی مرضی نہیں کرسکتا۔حالات ہر چیز کا پہلے ہی تعین کر دیتے ہیں۔

وہ ایک زاہد خشک کی طرح بوتل سے منہ لگا کر وائن پینے لگا۔ پھر بوتل کو بند کر کے بولا۔'' ریناں نے کہاں تھا کہ نئے نظریات وقت سے پہلے ہی آ جاتے ہیں۔اور یہ درست ہے۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے شک بھری نظر سے میرے ہاتھ کی طرف دیکھا جو میں نے ڈبے کے دروازے کی ناب پر رکھا ہوا تھا۔اس کی تسلی کے لئے میں نے ہات جیب ڈال لیا۔اس وقت تک زیادہ عمر کا انسپکٹر اپنے ساتھی سے دوبارہ انتقال کے لئے تیار ہو چکا تھا۔ وہ باسکیوں کی زبان، ان کی عورتوں، سر کے دوپٹوں اوراسی قسم کی دوسری چیزوں کے متعلق باتیں کرنے لگا۔ہم ہندائے ریلوے سٹیشن کے قریب پہنچ رہے تھے۔

''ہمارا قومی رومانی ہیرو ڈیرولیڈی یہاں رہتا تھا وہ فقط فرانس پہاڑ دیکھنا چاہتا۔وہ بھی ایک دان کو کھوٹے تھا۔'' کالا انسپکٹر گاڑھی ہنسی ہنسا۔'' کیا آپ میرے ساتھ سٹیشن تک چلیں گے؟''

سٹیشن پر وردی میں ملبوس ایک فرانسیسی نے مجھ سے سوال پوچھنے کی کوشش کی مگر میرے محافظ نے اسے کوئی اشارہ کیا اور ہم سٹیشن کے برآمدے میں چلنے لگے۔

'' آپ یہاں سے سان سبسطیان ریل کار کے ذریعے جا سکتے ہیں۔'' میرے ساتھ چلنے والے کالے انسپکٹر نے مجھ سے کہا۔''پولیس کی نظروں سے بچنے کے لئے خود کو ایک ٹورسٹ ظاہر کریں۔ یہاں کی پولیس بھی حرامی ہے۔''اوراب میرا آپ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ٹھیک ہے نا؟''

ہم بڑی سرد مہری سے ایک دوسرے سے جدا ہوگئے۔

سان سبسطیان سے جہاں میں سمندر کو دیکھ کر خوش اور قیمتوں کا سن کر غم زدہ ہو گیا تھا'' میٹر ڈ چلا

گیا۔ یہ ایک ایسا شہر تھا جہاں نہ کوئی مجھے اور نہ میں کسی کو جانتا تھا۔ چونکہ مجھے ہسپانوی زبان نہیں آتی تھی لہٰذا میں اتنا ہی تنہا تھا جتنا صحارا یا پیٹر پال کے قلعہ میں تھا۔ اب صرف آرٹ کی زبان رہ گئی تھی۔ جنگ کے دو برسوں نے یہ بھی بھلا دیا تھا کہ ایسی بھی کوئی زبان موجود تھی۔ میں بڑے ذوق وشوق سے میڈرڈ یم دیکھتا اور فن کے ازلی قدروں سے لطف اٹھاتا رہا۔ میں ریمبراں اور دوسرے مصوروں کی پینٹنگز دیکھتا رہا۔ بوسخ کی تصویریں زندگی کا بھرپور لطف تھیں۔ میل کی تصویروں کی چھوٹی چھوٹی تفصیلات دیکھنے کے لئے میوزیم کے محافظ نے مجھے محدب شیشہ دے دیا۔ یہاں جنگ کا احساس نہیں تھا۔ ہر چیز اپنی جگہ پر محفوظ تھی۔ رنگوں کی اپنی زندگی تھی، پابندیاں سے بالکل باہر زندگی۔

میوزیم میں بیٹھے بیٹھے میں نے اپنی ڈائری میں لکھا۔ ''پرانے آرٹسٹوں کی اہمیت اپنی جگہ مسلم مگر جنگ سے پہلے آرٹسٹوں کی ایک ایسی نسل پیدا ہوئی جو زندگی کے زیادہ قریب تھی۔ وہ زیادہ منفرد تھے، انہوں رنگوں کی زیادہ پہچان تھی، وہ زیادہ حساس تھے اور داخلی زندگی پر زیادہ توجہ دیتے تھے۔ لیکن جنگ اپنے وسیع دکھوں اور مصائب کے ساتھ ایک عرصے بعد زندگی کے ان رنگوں کو مٹا دے گی۔ اگر چہ پیشن گوئی مشکل ہے لیکن زندگی کے بے شمار تجربوں اور انسانی تہذیب کی بوقلمیوں کے پیش نظر یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ ایک نیا آرٹ جنم لے گا۔''

ہوٹل میں میں نے ڈکشنری کی مدد سے ہسپانوی اخبار پڑھا اور ان خطوں کا انتظار کرتا رہا جو میں نے اٹلی اور سوئٹزرلینڈ لکھے تھے۔ مجھے اب بھی وہاں جانے کی امید تھی۔ میڈرڈ میں میرے قیام کے چوتھے دن مجھے پیرس سے ایک خط ملا جس میں فرانسیسی سوشلسٹ گیبئر کا ایڈریس دیا گیا تھا۔ وہ ایک انشورنس کمپنی کا ڈائریکٹر تھا۔ بورژوا سماجی پس منظر رکھنے کے باوجود اپنی پارٹی کے محبّ الوطن پالیسی کے سخت خلاف تھا۔ گیبئر سے مجھے معلوم ہوا کہ ہسپانوی پارٹی فرانسیسی محبّ الوطن سوشلز کے زیر اثر تھی، بارسلونا میں پارٹی کی بالائی سطح پر سخت اختلافات تھے۔ اس وقت کسی کیتھولک ولی کی شان میں گستاخی کرنے کے سبب پندر دن کی قید بھگت رہا تھا۔ اگر پرانا زمانہ ہوتا تو اینگولانو کو زندہ جلا دیا جاتا۔

سوئٹزرلینڈ سے جواب کے انتظار کے دوران میں میں ہسپانوی الفاظ یاد کرتا اور میوزیم جاتا رہا۔ جس ہوٹل نما ولا میں گیبئر نے مجھے ٹھہرایا ہوا تھا اس کی ملازمہ نے ایک دوپہر مجھے برآمدے میں بلایا۔ اس کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ برآمدے میں دو ناقابل فراموش چہروں والے نوجوان کھڑے تھے جنہوں نے بڑے

دوستانہ انداز میں مجھے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ وہ مجھے کہاں لے جا رہے تھے، ظاہر ہے میڈرڈ کے پولیس اسٹیشن۔ وہاں لے جا کر انہوں نے مجھے ایک کونے میں بٹھا دیا۔

''کیا میں خود کو زیر حراست سمجھوں؟'' میں نے پوچھا۔

''ایک یا دو گھنٹے کے لئے۔'' جواب ملا۔

اپنی جگہ بدلے بغیر میں پولیس سٹیشن کے انچارج کے کمرے میں سات گھنٹے بیٹھا رہا۔ شام کے نو بجے مجھے اوپر لیجایا گیا۔ میرے سامنے ایک مضبوط آدمی بیٹھا تھا۔

''مجھے کس لئے پکڑا گیا ہے؟''

اس سادہ سوال نے پولیس چیف اور اس کے پاس بیٹھے دوسرے پولیس افسروں کو الجھن میں ڈال دیا۔ وہ کئی مفروضے بیان کرنے لگے۔ ان میں سے ایک نے پاسپورٹ کی وہ مشکلات بیان کیں جو غیر ملکیوں کو روس جاتے وقت روسی حکومت کی طرف سے پیش آتی تھیں۔

شاید آپ کو معلوم نہیں کہ ہم انتشار پسندوں کو پکڑنے پر کس قدر رقم خرچ کر رہے ہیں۔'' ایک نے میری ہمدردی حاصل کرنے کے لئے کہا۔

''لیکن روسی پولیس اور ہسپانوی انتشار پسندون سے میرا کیا تعلق ہے؟''

''کوئی نہیں'' ''کوئی نہیں، یہ تو آپ کو یونہی آپ کی اطلاع کے لئے بتایا تھا''

''آپ کے نظریات کیا ہیں؟'' پولیس چیف نے تھوڑے تامل کے بعد آخر پوچھ ہی لیا۔

میں نے جس قدر ممکن ہو سکا سادہ زبان میں اسے اپنے نظریات بتائے۔

''اچھا تو یہ بات ہے۔'' ان سے کے منہ سے نکلا۔

آخر میں پولیس چیف نے مجھے اطلاع دی کہ مجھے یہاں سپین کو فوری طور پر چھوڑ دینے کے لئے لایا گیا تھا۔ اور جب تک میں یہاں سے نہیں جاؤں گا میری ''آزادی'' پر چند قدغنیں لگی رہیں گی۔ ''آپ کے نظریات سپین کے لئے بہت زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔'' اس نے ترجمان کے ذریعے خوش دلی سے کہا۔

نصف رات کو ایک پولیس ولا مجھے گاڑی میں قید خانے لے گیا۔ وہاں میری اشیاء کا بغور معائنہ کیا گیا۔ یہ معائنہ ایک ایسی مرکزی جگہ پر کیا گیا تھا جو ''پانچ بازوؤں'' کے سنگم پر واقع تھا اور ہر بازو کی چار منزلیں تھیں۔ زینے آہنی اور متعلق قسم کے تھے۔ قید خانے کی رات اپنی مخصوص خاموشی، بھاری نمی اور ایک

دلدل جیسی کیفیت سے بھری ہوئی تھی۔ برآمدوں کی روشنی زرد تھی۔ ہر چیز مانوس سی، کھلتے اور بند ہوتے آہنی دروازوں کی وہی گڑگڑاہٹ، بڑا کمرہ نیم اندھیرا۔ قید خانے کی وہی بھاری بو، ایک نفرت انگیز بستر۔ مجھے ابھی اور کتنی قیدیں دیکھنی ہوں گی؟ میں نے آہنی جالی کے پیچھے کھڑکی کے پٹ کھولے، ہوا کا ایک ٹھنڈا جھونکا اندر داخل ہوا، میں کپڑے تبدیل کیے بغیر بستر پر لیٹ گیا اور خود کو اپنے اوورکوٹ سے ڈھانپ لیا۔ اب مجھے ٹھیک طرح سے احساس ہوا کہ میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔ میڈرڈ کے قید خانے میں میں اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا ازوولسکی نے اپنا کارنامہ بڑی خوبی سے سرانجام دیا تھا۔ پھر میں ہنسنے لگا اور ہنستا رہا حتیٰ کہ مجھے نیند آ گئی۔

جب میں قید خانے میں ٹہل رہا تھا تو دوسرے قیدیوں نے مجھے بتایا کہ قید میں دو قسم کے سیل تھے، ایک آزاد سیل تھا جس کی قیمت ادا کرنی پڑتی تھی۔ فرسٹ کلاس سیل کے لئے ڈیڑھ پیاسٹ یومیہ دینا پڑتا تھا۔ دوسرے درجے کی سیل کے لئے پچھتر سینٹائمز۔ ہر قیدی کو کرائے کے سیل میں رہنے کا حق حاصل تھا۔ لیکن اسے عام سیل میں جانے سے انکار کرنے کا حق حاصل نہیں تھا۔ میرا سیل کرائے والا تھا اور اول درجے کا تھا۔ میں پھر خوب قہقہے لگا کر ہنسا۔ یہ ہنسنا بڑا منطقی تھا۔ ایک ایسا معاشرہ جس کی بنیاد عدم مساوات پر تھی اس کے قید خانے میں مساوات کی کیا ضرورت تھی۔ مجھے بتایا گیا کہ کرائے والے سیلوں کے باسیوں کو دن میں دو دفعہ ایک ایک گھنٹہ سیر کی اجازت تھی جب کہ دوسرے قیدیوں کو یہ سہولت نصف گھنٹے کے لئے ملتی تھی۔ یہ اس لحاظ سے درست تھا کہ جو چورا چکے رقم کی ادائیگی کی استطاعت رکھتے تھے ان کے پھیپھڑے زیادہ وہوا کے حق دار تھے جب کہ عام قیدیوں کو سہولت محدود حد تک دی گئی تھی۔

تیسرے دن مجھے ایک ایسی جگہ لے جایا گیا جہاں میری انگلیوں کے نشان ایک کارڈ پر جانے تھے۔ میں نے انکار کر دیا۔ پھر ایک نرمی کے ساتھ مجھے اس کام کے لئے مجبور کیا گیا۔ جب ایک سپاہی میری انگلیوں اور ہاتھوں پر سیاہی مل رہا تھا تو میں کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ اس نے دس مرتبہ میرے دونوں ہاتھوں کے باری باری نشانات لیے، اس کے بعد مجھے بوٹ اتارنے کے لئے کہا گیا۔ میں نے پھر انکار کر دیا۔ پیروں کے نشانات لینا مشکل تھا لہٰذا جیل انتظامیہ بڑی پریشان دکھائی دیتی تھی۔ پھر بالکل غیر متوقع طور پر مجھے گیبئر اور اینگولانو سے ملنے کی اجازت دے دی گئی جو مجھے ملنے وہاں آئے تھے۔ اینگولانو کو ایک دن پہلے جیل سے رہا کیا گیا تھا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ میری رہائی کے لئے تمام ادارے متحرک ہو گئے

تھے۔ برآمدے میں مجھے قید خانے کا پادری ملا جس نے میرے ٹھنڈے مزاج پر مذہبی ہمدردیوں کا اظہار کیا، وہ مجھے ''صبر کرو، صبر کرو'' کی تلقین کرنے لگا۔ میں اسے کیا کہہ سکتا تھا۔

بارہویں دن کی صبح کو ایک پولیس والے نے مجھے اطلاع دی کہ اسی شام مجھے کاڈز کے لئے روانہ ہونا پڑے گا۔ مجھے بتایا گیا کہ مجھے ریل کی ٹکٹ خود خریدنی پڑے گی۔ لیکن کاڈز جانے کی میری کوئی خواہش نہیں تھی اور میں نے ٹکٹ خریدنے سے بھی انکار کر دیا۔ قید خانے میں سیل کرائے پر لینا میرے لئے بڑی بات تھی۔ شام کو ہم میڈرڈ سے کاڈز روانہ ہو گئے۔ ہماری ٹکٹوں کا بوجھ ہسپانوی حکومت پر پڑ گیا۔ لیکن مجھے کارڈ کیوں لے جایا جا رہا تھا؟ میں نے نقشہ دیکھا جس میں کاڈز یورپ کے جنوب مغربی جزیرہ نما کی انتہا پر واقع ہے۔ وہاں پہنچنے کے لئے بیری زوف سے برف گاڑی کے ذریعے یورال اور پھر سینٹ پیٹرز برگ جانا پڑتا تھا۔ وہاں سے چکر کاٹ کا آسٹریا سے سوئٹزرلینڈ اور وہاں سے فرانس اور پھر کاڈز۔ یہ شمال مشرق سے جنوب مغرب کی سمت بنتی تھی۔ وہاں براعظم ختم ہو کر سمندر شروع ہو جاتا ہے اور مجھے صبر کی تلقین کی گئی تھی۔

میرے ساتھ پولیس کے جو سپاہی تھے انہوں نے سفر کو بڑا پراسرار بنانے کی ذرا بھی کوشش نہ کی۔ اس کے برعکس وہ ہر کسی کو میری کہانی بڑی دلچسپی سے سناتے اور میرے کردار کی تعریف کرتے رہتے۔ ہر کوئی کاڈز کی بہترین آب و ہوا کی تعریف کر کے مجھے تسلی دیتا رہا۔

''تم لوگوں کو میرا پتہ کیسے چلا؟'' میں نے پولیس والوں سے پوچھا۔

''بڑی آسانی سے۔ پیرس سے ہمیں تار آ گیا تھا''۔

میرا بھی یہی خیال تھا۔ میڈرڈ پولیس کو پیرس کی پولیس نے تار بھیجا تھا جس میں لکھا تھا ''ایک خطرناک انتشار پسند جس کا نام فلاں فلاں ہے، سان سبطیان سرحد عبور کر چکا ہے۔ وہ میڈرڈ میں رہائش اختیار کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔'' لہٰذا میڈرڈ کی پولیس میرے انتظار میں تھی۔ اور مجھے ہر جگہ ڈھونڈ رہی تھی اور اس بات پر پریشان تھی کہ ایک ہفتے تک میرا کوئی سراغ نہ لگا سکی تھی۔ فرانسیسی پولیس نے بڑے رکھ رکھاؤ سے مجھ باڈر عبور کرایا تھا۔ موٹیگنی اور ریناں کے مداح نے مجھ سے بھی پوچھا تھا کہ بارڈ عبور کرنے تک مجھے کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی تھی۔ اور پھر اسی پولیس نے میڈورڈ تار بھیج دیا تھا کہ ایک خطرناک ''انتشار پسند'' سان سبطیان میں داخل ہو گیا تھا۔

اس سارے قصے میں فرانسیسی پولیس کے چیف بیڈٹ نے بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔ وہ میرے تعاقب اور فرانس سے بے دخلی میں مرکزی کردار تھا اور اپنی کینہ پروری اور غیر معمولی بدتمیزی کے سبب اپنے دوسرے ساتھیوں سے الگ پہچانا جاتا تھا۔ اس نے میرے ساتھ ایسے لہجے میں بات کرنے کی کوشش کی تھی جس میں زار کی خفیہ پولیس کے افسر بھی ہمت نہیں کر سکتے تھے۔ ہم دونوں کی گفتگو ہمیشہ دھماکہ خیز ہوتی تھی۔ پیرس چھوڑتے وقت میں نے اس کی طرف مڑ کر نہایت نفرت سے دیکھا تھا۔ میڈ ورڈ کے قید خانے میں میں نے گیبئر سے اس اندیشے کا اظہار کیا تھا کہ میری گرفتاری میں بیڈٹ کا ہاتھ ہو سکتا تھا۔

دو سال سے بھی تھوڑے عرصے بعد تقدیر نے مجھے بالکل غیر متوقع طور پر بیڈٹ کا ایسا حشر دیکھنے کا موقع فراہم کر دیا جس سے میری تسلی ہو گئی۔ 1918 کے موسم گرم میں وزارت جنگ کی طرف سے ایک ٹیلیفون پر مجھے اطلاع دی گئی کہ بیڈٹ، خوفناک بیڈٹ سوویت روس کی کسی جیل میں قید تھا۔ میں اپنے کانوں پر اعتبار نہ کر سکا۔ معلوم ہوا کہ فرانسیسی حکومت کی طرف سے اسے جاسوسی اور سازش کے کسی مشن پر جمہوریہ سوویت بھیجا گیا تھا اور وہ اتنا غیر محتاط نکلا کہ گرفتار ہو گیا۔ پھر اس سے بھی زیادہ تسلی کی بات اور کیا ہو سکتی تھی کہ فرانسیسی وزیر داخلہ مالوی جس نے میری بے دخلی کے حکم پر دستخط کیے تھے، ایک سازش کے الزام میں حکومت سے نکال دیا گیا تھا۔ حالات کی کیسی ستم ظریفی تھی۔ جیسے کسی فلم کے لئے پلاٹ تیار ہو رہا ہو۔

جب بیڈٹ کو میرے سامنے لایا گیا تو پہلی دفعہ میں اسے پہچان نہ سکا۔ ایک آدمی جو کسی وقت انتہائی خوفناک ہوتا تھا، ایک عام فانی انسان کی شکل میں میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے اسے حیرت سے دیکھا۔

''موسیو، مجھے معاف کر دیں'' اس نے اپنا سر جھکا ہوئے کہا۔

ہاں، یہ بیڈٹ تھا لیکن یہ سب کیسے ہو گیا تھا۔ میں بالکل بجا طور پر حیران تھا۔ پھر میری آنکھوں کے سامنے اس سیاہ فام انسپکٹر کی شکل گھوم گئی جو مجھے سان سطبیان تک لایا تھا۔ اس کے یہ الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ ''کوئی اپنی مرضی نہیں کر سکتا۔ حالات ہر چیز کا پہلے ہی تعین کر دیتے ہیں۔

''موسیو بیڈٹ، تم نے پیرس میں میرے ساتھ کیا سلوک روا رکھا تھا؟''

''مجھے اس کا اعتراف ہے۔ میں بے حد شرمندہ ہوں۔ میں جیل میں اپنے سیل میں اس کے متعلق اکثر سوچتا رہتا تھا۔ جیل جانا انسان کے لئے بعض اوقات اچھا ثابت ہوتا ہے۔ مجھے اب بھی امید ہے کہ

میرا پیرس کا طرزِ سلوک میرے لیے خوشگوار نتائج کا حامل نہیں ہوگا۔‘‘

میں نے اسے یقین دلایا۔’’میں فرانس جاتے ہی اپنا پیشہ تبدیل کرلوں گا۔‘‘ وہ لجاجت سے بولا۔

’’آپ واقعی ایسا کریں موسیو بیڈٹ؟‘‘

یہ مکالمے میں دوستوں کے سامنے اتنی دفعہ دہرا چکا ہوں کہ مجھے ازبر ہو چکے ہیں اور کل کی بات لگتے ہیں۔ بعد میں بیڈٹ قیدیوں کے تبادلے میں فرانس واپس چلا گیا۔ پھر وہاں اس کے ساتھ کیا ہوا مجھے کچھ معلوم نہیں۔

مگر اب ہمیں کاڈز کی طرف جانا ہوگا۔

گورنر سے مشورے کے بعد کاڈز کے ناظم نے مجھے بتایا کہ خوش قسمتی سے اگلی صبح آٹھ بجے ایک سٹیمر ہوانا جارہا تھا۔

’’کہاں جارہا تھا؟‘‘

’’ہا___وا___نا؟‘‘

’’ہوانا‘‘

’’میں وہاں رضا کارانہ طور پر نہیں جاؤں گا۔‘‘

’’ہمیں آپ کو زبردستی سٹیمر کے عملے کی تحویل میں دینا پڑے گا۔‘‘

جرمن قونصل کا سیکریٹری جو ناظم کا دوست بھی تھا اور بطور ترجمان وہاں موجود تھا، اس نے مجھے حقائق تسلیم کرلینے کا مشورہ دیا۔

’’صبر کرو، صبر کرو‘‘ میرے ذہن میں پادری کے الفاظ گونجنے لگے۔ لیکن یہ بڑی زیادتی تھی۔ میں نے انہیں دوبارہ بتایا کہ میں جانے کو بالکل تیار نہیں تھا۔ جاسوسوں کی ہمراہی میں میں شہر کی خوبصورت اور جادو بھری گلیوں (مگران پر توجہ نہ دیتے ہوئے) سے گزرتا ہوا تار گھر گیا اور کاغذ کے اوپر ’’فوری‘‘ لکھوا کر گیپئر، انیگولانو، خفیہ پولیس کے چیف، وزیر داخلہ، وزیر اعظم، اور آزاد خیال اخبارات کو تار بھجوا دیے۔ تار میں جو کچھ لکھا جاسکتا تھا میں نے لکھ دیا۔ پھر جہاں تک ممکن ہوسکا میں نے مزید خط لکھے۔ میں نے اطالوی رکن اسمبلی سراتی کو لکھا۔’’میرے دوست! ذرا تصور میں لاؤ کہ اس وقت تم پر میں روسی پولیس کی زیر نگرانی ہو اور تمہیں ٹوکیو کی طرف لے جایا جارہا ہو۔ یقیناً ایسی جگہ جہاں تمہارے جانے کا کوئی ارادہ نہ ہو۔ کاڈز

میں میری یہی صورتحال ہے۔ مجھے زبردستی ہوانا بھیجا جا رہا ہے'' پھر میں پولیس کے ساتھ ناظم کے دفتر میں واپس آ گیا۔ اس نے میرے خرچے پر میڈرڈ تار بھیجا کہ کیا میں نیویارک سے سٹیمر کے آنے تک کاڈز کی جیل میں رہنا پسند کروں گا۔ میں ہتھیار ڈالنے کو تیار نہیں تھا۔ وہ بڑا ہیجانی دن ثابت ہوا۔

اس دوران میں رپبلیکن رکن، اسمبلی کاسترو ویڈو نے حکومت سے عدالت میں جا کر پوچھ لیا کہ مجھ کس لیے گرفتار کیا گیا تھا اور کیوں باہر بھیجا جا رہا تھا اخبارات میں ایک بحث چھڑ گئی۔ بایاں بازو پولیس پر حملہ آور ہو گیا مگر فرانکو کے چیلے مجھ پر نکتہ چینی کرنے لگے۔ دائیں بازو کو میرے ساتھ ہمدردی تھی۔ لیکن وہ میری ''انتشار پسندی'' سے ڈرتے تھے۔ اس افراتفری میں کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس کے باوجود نیویارک سے سٹیمر آنے تک مجھے کاڈز میں ٹھہرنے کی اجازت مل گئی۔ یہ ایک ٹھیک ٹھاک فتح تھی۔

اس کے چند ہفتے بعد تک میں کاڈز پولیس کی زیرنگرانی رہا۔ لیکن پیرس کی نگرانی کے برعکس یہ بڑی پرامن اور پدرانہ شفقت سے بھری نگرانی تھی۔ پیرس کے قیام کے آخر دو ماہ میں نے یوسوسی ''کتوں'' کو دھوکہ دینے کی کوشش میں اپنی بہت سی طاقت خرچ کر دی تھی۔ میں کوئی ٹیکسی پکڑ کر سینما چلا جاتا، وہاں سے ایک دم نکل کر زیرزمین ریل میں سوار ہو جاتا، پھر اچانک اس سے باہر آ جاتا، بس اسی قسم کی حرکتیں کرتا رہتا۔ جاسوس بھی بڑے چوکنے تھے۔ وہ بھی ہر ممکن ہوشیاری سے میرا تعاقب کرتے رہتے۔ وہ میرے سامنے ٹیکسی پکڑ لیا اور ایک دم سینما پہنچ کر گیٹ کو اندر سے چٹخنی چڑھا دیتے۔ زیرزمین ریل (میٹرو) میں بھی وہ یہی حرکت کرتے جس سے مسافروں اور گارڈ کو غصہ آ جاتا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ یہ سب کچھ میں ''فن برائے فن'' کر رہا تھا۔ میری سیاسی سرگرمیاں پولیس کے سامنے تھیں۔ لیکن جاسوسوں کے تعاقب سے میں چڑ گیا تھا جس نے میری کھیل کی حس کو بیدار کر دیا تھا۔

اس کے برعکس کاڈز میں جاسوس مجھے بتا جاتا تھا کہ وہ فلاں وقت آئے گا تاکہ میں ہوٹل کے برآمدے میں اس کا منتظر رہوں۔ اسے میرے مفادات کا بڑا دھیان تھا۔ وہ اشیا خریدنے میں میری مدد کرتا اور اردگرد ہونے والے تمام ملے غلے اور واقعات کی طرف میری توجہ مبذول کرائے رکھتا۔ جب مجھ سے کوئی دکاندار کسی چیز کی زیادہ قیمت مانگ لیتا تو اس کی بھویں تن جاتیں، وہ مٹھیوں کو بھینچ لیتا اور دکاندار کو مارنے دوڑتا۔ لوگ تماشا دیکھنے جمع ہو جاتے۔

میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتا تھا۔ لائبریری جا کر سپین کی تاریخ پر کام کرتا رہتا، اس کے مختلف

رابطوں کو جوڑتا اور یاد کرتا رہتا اور امریکہ جانے کی تیاری میں اپنے انگریزی لفظوں کا ذخیرہ بڑھاتا رہتا۔ دن غیر محسوس طریقے سے گزر رہے تھے۔ شام کے وقت مجھے اکثر یہ غم ناک احساس ہوتا کہ میرے جانے کا دن نزدیک آ رہا تھا اور میں نے اپنے مطالعے میں کوئی خاص اضافہ نہیں کیا تھا۔ میں لائبریری میں کتابوں کے وہ کیڑے گننے تو نہیں جاتا تھا جو اٹھارویں صدی کی کتابوں کو کھا رہے تھے۔ ان کیڑوں کی مہربانی سے کسی وقت کوئی نام یا عدد پڑھنا مشکل ہو جاتا تھا۔

میری نوٹ بک میں اس زمانے کی یہ تحریر موجود ہے۔ ''ہسپانوی انقلاب کے متعلق ہسپانیہ کا مورخ لکھتا ہے کہ کس عوامی تحریک کے وقت یہاں کے راہنما اس کی کامیابی سے پانچ منٹ پہلے تک اسے دیوانگی قرار دیتے تھے۔ مگر یونہی یہ تحریک کامیاب ہو جاتی، وہ صف اول میں جا کر کھڑے ہو جاتے۔ پرانا مورخ بتاتا ہے کہ ایسے موقع پرست شریف لوگ ہر انقلاب کے موقعے پر موجود ہوتے تھے اور وہ دوسروں کو پرے دھکیل کر آگے آ جاتے تھے۔ ہسپانوی لوگ انہیں ''پیٹ کے بل رینگنے والے'' کہتے تھے۔ ہمارے یار غار سانچو پینزا کا نام بھی وہیں سے نکلا ہے۔ اس نام کا ترجمہ کرنا تو مشکل ہے مگر اس کی سیاسی اہمیت کو سمجھنا مشکل نہیں ہے۔ ایسے لوگ بین الاقوامی حیثیت کے مالک ہیں۔'' 1917 کے بعد اب بھی ایسے لوگ تعداد میں مل جاتے ہیں۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ کاڈز کے اکلوتے اخبار میں جنگ کی کوئی خبر شائع نہیں ہوتی تھی۔ جیسے اس کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ جب میں نے اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ ان کے مقبول عام اخبار ''ال ڈایودی کاڈز'' فوجی خبروں سے خالی تھا تو وہ حیرت سے بولے۔ ''کیا واقعی ایسا ہے؟'' اس سے پہلے انہوں نے اس طرف کبھی توجہ نہیں دی تھی۔ جیسے جنگ سپین اور فرانس کے پہاڑوں سے پرے کہیں لڑی جا رہی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ میں بھی جنگ کو بھولنے لگا تھا۔

نیویارک کے لئے کشتی بارسلونا سے روانہ ہوئی۔ میں یہ اجازت نامہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ میں وہاں اپنے کنبے کے افراد سے ملنے جا رہا تھا۔ بارسلونا ناظم کی اپنی نئی مشکلات تھیں نئے احتجاج ہو رہے تھے، نئے تار آ رہے تھے اور نئے جاسوس میرے پیچھے لگ گئے تھے۔ اس دوران میں میری بیوی اور بچے بھی پیرس سے پہنچ گئے۔ پیرس میں ان کی اپنی مشکلات تھیں۔ لیکن اب ہر چیز ٹھیک ہو گئی تھی۔ ہم جاسوس کی صحبت میں بارسلونا کی سیر کو گئے۔ بیٹوں کو یہاں کا سمندر اور پھل بہت پسند آئے۔ ہم

سب نے امریکہ جانے کے خیال سے مطابقت پیدا کر لی تھی۔ میں نے اٹلی کے راستے سوئٹزرلینڈ جانے کی جو کوشش کی تھی اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا۔ یہ درست تھا کہ آخراطالوی اور سوئس سوشلسٹوں کے دباؤ کے تحت مجھے سوئٹزرلینڈ جانے کی اجازت مل گئی تھی، مگر یہ اس وقت ہوا جب میں بیوی بچوں کے ساتھ بار سلونا سے امریکہ جانے والی کشتی میں سوار ہو چکا تھا۔ کشتی نے 25 دسمبر کو روانہ ہونا تھا۔ مگر اس کی روانگی میں دانستہ تاخیر کی جا رہی تھی۔ اس سلسلے میں از ولسکی چیزوں کو بڑی عمدگی سے ترتیب دینے میں مصروف تھا۔

بارسلونا سے روانگی کے بعد مجھ پر یورپ کے دروازے بند ہو گئے۔ پولیس نے مجھے اور میرے خاندان کو ایک ہسپانوی کمپنی کے سٹیمر ''مونسرات'' میں بٹھا دیا جس نے سترہ روز بعد ہمیں نیو یارک پہنچا دیا۔ سترہ دن کے بعد ہمارا سٹیمر نیو یارک کے ساحل سے لگ گیا۔ سترہ دن! کوسٹوفر کولمبس کے زمانے میں وقت بڑا دلچسپ ہوتا ہو گا جس کا مینار بارسلونا کی بندرگاہ میں کھڑا ہے۔ سال کے ان دنوں میں سمندر میں بڑی اتھل پتھل تھی جس سے انسانی زندگی کے فانی ہونے کا یقین ہر لمحہ بڑھتا جا رہا تھا۔ مونسرات (سٹیمر کا نام) ایک پرانے ٹب جیسا تھا جو بحری سفر کے لئے ناموزوں تھا جنگ کے زمانے میں غیر جانب___دار سپین کے جھنڈے نے کئی مرتبہ جہاز کو ڈوبنے سے بچا لیا۔

سٹیمر کے اندر ہر نسل ہر رنگ کے لوگ جمع ہیں۔ ان میں سے بعض مختلف ممالک سے نکالے ہوئے ہیں اور ان کا رتبہ اپنے ملک میں خاصا بلند ہے۔ ایک آرٹسٹ اپنی پینٹنگز اپنے ہنر اپنے کنبے اور اپنی پونجی کے ساتھ اپنے بوڑھے باپ کی ہمراہی میں جنگ سے حتیٰ الامکان دور جانے کی کوشش میں ہے۔ ایک باکسر جو ایک ناول نگار بھی ہے اور آسکر وائلڈ کا کزن بھی، کھلم کھلا کہہ رہا ہے۔ کہ وہ کسی جرمن کے ہاتھوں پسلیاں تڑوانے کے بجائے امریکہ میں کسی یانکی کا جبڑا توڑنے کو ترجیح دے گا۔ ایک بلیئرڈ چمپیئن جو معمر اور نفیس آدمی ہے، اپنے ہی جیسے کسی ہم عمر سے بلیئرڈ کھیلنے کے لئے بے تاب ہے۔ یہ سب کیوں ہے؟ یہ ساری بے مقصد دیوانگی کس لئے ہے؟ بلیئرڈ کا چمپئن بوڑھا میرے خیالات سے متفق ہے۔ دوسرے بھی مجھ سے ایک حد تک اتفاق کرتے ہیں۔ یہ لوگ جو مہم باز ہیں، اپنے ملکوں سے نکالے ہوئے ہیں اور مستقبل کو دیکھنے کے خواہشمند ہیں، ان میں سے زیادہ ''ناپسندیدہ'' ہیں جنہیں یورپ سے باہر پھینک دیا گیا ہے۔ ان لوگوں کے سوا کون شدید اور طوفانی موسم میں ایک بوسیدہ جہاز پر بحرالکاہل کو عبور کرنے کی جرات

کر سکتا ہے؟۔

تیسرے درجہ کا مسافر ہونا بھی ایک اذیت سے کم نہیں ہے۔ وہ سب لوگ ساتھ ساتھ لیٹے ہوئے ہیں۔ ملنے جلنے کے لئے بھی جگہ نہیں ہے۔اور نہ ہی ان کے پاس کھانے کے لئے وافر مقدار میں خوراک ہے۔ان کے چہرے سنولائے ہوئے ہیں اور وہ ایک تلخ اور قابل نفرت افلاس سے بھاگنے کی کوشش میں کسی ایسی جگہ جا رہے ہیں جو غیر یقینی میں لپٹی ہوئی ہے۔امریکہ حالت جنگ میں یورپ کے لئے کام کر رہا ہے اور اسے نئے مزدوروں کی ضرورت ہے۔لیکن اسے ایسے مزدوروں کی ضرورت ہے جو انتہا پسندی اور انتشار پسندی کی بیماریوں سے پاک ہوں۔

کشتی میرے بیٹوں کے لئے ایک بے کراں مشاہدہ گاہ ہے۔ وہ نئی نئی چیزیں دریافت کر رہے ہیں۔

''تم جانتے ہو کہ فائر مین بڑا اچھا آدمی ہے۔وہ ''جمہوریہ پسند ہے۔''

یہ ایک ملک سے دوسرے ملک میں دیس نکالے کا نتیجہ ہے کہ وہ اپنی ایک خاص قسم کی زبان بولنے لگے ہیں۔

''تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ وہ جمہوریت پسند ہے؟تمہیں یہ کیسے پتہ چلا؟''

''وہ ہر بات بڑے اچھے انداز میں کرتا ہے۔اس نے الفانسو کہا اور پھر پف، پف کہنے لگا۔''

''اچھا پھر تو وہ واقعی جمہوریت پسند ہے۔'' میں متفق ہو جاتا ہوں۔میرے بیٹے فائر مین کے لئے خشک انگور اور دوسرے پھل لے کر جاتے ہیں۔ہم ایک دوسرے سے متعارف ہوتے ہیں۔''جمہوریت پسند'' کوئی بیس برس کا ہے اور بادشاہت کے متعلق اس کے نظریات بڑے واضح ہیں۔

یکم جنوری 1917____ کشتی میں موجود ہر کوئی ایک دوسرے کو نئے سال کی مبارکباد دیتا ہے۔ جنگ کے ابتدائی دو سالوں کے پہلے دو سال نو، میں نے فرانس میں گزارے اور تیسرے سمندر میں۔ 1917 نہ جانے ہمارے لئے کیا لے کر آئے گا۔

اتوار 13 جنوری 1917 ہم نیویارک کے قریب پہنچ رہے ہیں۔صبح کے تین بجے ہیں اور ہر کوئی جاگ رہا ہے۔کشتی رک گئی ہے۔سخت اندھیرا ہے، سخت سردی ہے، بارش ہو رہی ہے۔سامنے زمین پر عمارتوں کا ایک پہاڑ کھڑا ہے۔یہ ایک نئی دنیا ہے۔

نیویارک

میں نیویارک پہنچ گیا تھا۔ نیورک شاعری، نثر اور سرمایہ دارانہ ریل پیل کا شہر تھا جس کی گلیاں مصوری کی علامت تھیں اوراس کا اخلاقی فلسفہ ڈالر کا فلسفہ تھا۔ نیویارک نے مجھے بے حد متاثر کیا کیونکہ دنیا دنیا کے کے کسی دوسرے شہر کے مقابلے میں یہ شہر جدید دور کا بھرپور تاثر ہے۔

میری زندگی کے ساتھ جو کہانیاں اور قصے وابستہ ہیں ان کا زیادہ تعلق میری نیویارک کی زندگی سے ہے۔ ناروے جس سے گزرتے وقت کچھ عرصہ کے لئے میں ٹھہر گیا تھا، وہاں بارسوخ صحافیوں نے مجھے مچھلیوں کے بڑے بڑے ڈبے صاف کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ نیویارک جہاں میں نے دو ماہ قیام کیا تھا، اس کے اخبارات نے مجھ ایک سے بڑھ کر ایک عجیب وغیریب کام دیا۔ ان تمام اخبارات نے مجھ سے جس قسم کے کام لیے اگر میں انہیں جمع کر کے ایک کتاب کی شکل دے دوں تو وہ میری موجودہ کتاب سے زیادہ دلچسپ ہو گی۔

لیکن میں اس سلسلہ میں اپنے امریکی قارئین کو مایوس کروں گا۔ نیویارک میں میرا پہلا اور آخری کام ایک سوشلسٹ انقلابی کا تھا۔ یہ ''جنگ آزادی'' اور ''جمہوریت'' سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا۔ میں مضمون لکھتا، ایک اخبار کی ادارت کرتا، اور مزدوروں کے اجلاس سے خطاب کرتا رہتا۔ میں گردن تک کام میں دھنسا رہتا اور نتیجتاً خود کو ہرگز اجنبی محسوس نہیں کرتا تھا۔ نیویارک کی ایک لائبریری میں میں بڑی جانفشانی اور محنت سے امریکہ کی اقتصادی تاریخ کا مطالعہ کرتا رہتا۔ جنگ کے زمانے میں امریکہ کی برآمدات میں ترقی نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ اصل میں یہ میرے لئے ایک نکشاف تھا۔ یہی وہ اعداد وشمار تھے جنھوں نے امریکہ کو جنگ میں شامل ہونے کے لئے فقط ترغیب ہی نہیں دی تھی بلکہ جنگ کے بعد ایک فیصلہ کن کردار ادا کرنے پر بھی مائل کیا تھا۔ میں نے اس موضوع پر کئی مضامین لکھے اور تقاریر کیں۔ اس وقت سے ''امریکہ بمقابلہ یورپ'' میرا ایک پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ اب بھی اس سوال پر میں اپنا زیادہ وقت صرف کرتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ میں اس پر ایک علیحدہ کتاب لکھوں گا۔ اگر کسی نے انسانیت کے مستقبل کو سمجھنا ہے تو اس کے لئے یہ ایک بہت اہم موضوع ہے۔

نیویارک پہنچنے کے دوسرے دن میں نے روسی اخبار ''نووی میر'' (نئی دنیا) میں یہ سطریں تحریر کیں ''میں یورپ کو خون میں لت پت چھوڑ کر آیا ہوں۔لیکن میں نے اسے آنے والے انقلاب کی مضبوط امید پر چھوڑا ہے۔ یہ ایک ''جمہوری سراب نہیں تھا جس نے مجھے اس نئی دنیا میں آنے کی ترغیب دی تھی۔'' دس دن بعد اپنے اعزاز میں منعقد ہونے والے ایک بین الاقوامی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے میں نے کہا۔''یہ بڑی اہم حقیقت ہے کہ یورپ کی معاشی زندگی کی بنیادی ہلا دی گئی ہیں جب کہ امریکہ کی دولت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ایک یورپی باشندے کی حیثیت سے نیویارک کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے میں اپنے آپ سے پوچھتا ہوں''کیا یورپ یہ سب کچھ برداشت کر سکے گا؟ کیا یورپ ایک قبرستان نہیں بن جائے گا۔کیا معاشی اور ثقافتی مراکز امریکہ منتقل نہیں ہو جائیں گے؟'' نام نہاد یورپی ! استحکام کی کامیابی کے باوجود میرا یہ سوال آج بھی برقرار ہے۔

میں نیویارک،فلاڈلفیا اور دوسرے نواحی شہروں کی روسی اور جرمن بستیوں میں لیکچر دیتا رہا۔میری انگریزی اس وقت بھی اتنی وقت بھی اتنی ہی خراب تھی جتنی آج ہے۔لہٰذا مجھے انگریزی میں عوامی جگہوں پر لیکچر دینے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔اس کے باوجود نیویارک میں میں انگریزی تقریروں کے حوالے دیکھنے اور سننے میں ملتے تھے۔ابھی کل کی ہی کی بات ہے کہ استنبول کے ایک اخبار کے ایڈیٹر نے میری ایک ایسی تقریر کا حوالہ دیا جو اس نے امریکہ میں بطور ایک سٹوڈنٹ سنی تھی۔میں اعتراف کرتا ہوں کہ میرے اندر اسے یہ بتانے کی جرات نہیں تھی۔کہ وہ اپنے تصور کا قیدی تھا۔لیکن وہ بڑے اعتماد کے ساتھ میری امریکہ کی تقریریں اپنے اخبار میں دہراتا رہتا تھا۔

ہم نے محنت کشوں کے علاقے میں ایک اپارٹمنٹ کرائے پر لیا۔پھر اسے قسطوں پر لیے جانے والے فرنیچر سے سجانا تھا۔اٹھارہ ڈالر ماہانہ کرائے پر لیے جانے والے اس اپارٹمنٹ میں وہ ساری سہولتیں موجود تھیں جن کے متعلق ہم یورپ، والے کم ہی سوچ سکتے تھے۔اس میں بجلی، گیس کا کوکنگ رینج، غسل خانہ، ٹیلیفون، برقی زینہ اور کوڑا اپھینکنے کے لئے ایک بڑا ڈرم بھی تھا۔ان اشیاء نے میرے بیٹوں کو نیویارک کا گرویدہ بنا دیا۔ایک عرصہ تک ٹیلیفون ان کی دلچسپی کا سبب بنا رہا۔ہم ویانا اور پیرس میں ابھی اس پراسرار آلے سے آشنا نہیں ہوئے تھے۔

ہماری عمارت کا نگران ایک نیگرو تھا۔میری بیوی نے اسے تین ماہ کا کرایہ پیشگی ادا کر دیا، اس نے

رسید نہ دی کیونکہ مالک مکان نے رسید بک کی جانچ پڑتال کے لئے اسے اپنے اپنے ہاتھ لے لیا تھا۔ جب دو دن بعد ہم اس اپارٹمنٹ میں رہنے کے لئے آئے تو ہمیں معلوم ہوا کہ وہ کالا نگران ہمارے علاوہ چند دوسرے کرایہ داروں کا بھی کرایہ لے کر رفو چکر ہو گیا تھا۔ کرایے کے علاوہ ہم اپنی بعض دوسری چیزیں بھی اس کے پاس بطور امانت رکھ گئے تھے۔ اس حادثے نے ہمیں ہلا کر رکھ دیا۔ آغاز ہی ہوا تھا۔ پھر ہمیں ہمارا سامان مل گیا، اور لکڑی کے جس صندوق میں ہمارا سامان اور کرا کری تھی۔ اسی کے پیندے میں ہماری رقم بھی موجود تھی۔ اسے بڑی احتیاط سے کاغذ میں لپیٹ کر رکھا گیا تھا۔ عمارت کا نگران کرائے داروں کے پیسے لے گیا تھا جو مالک مکان سے رسیدیں حاصل کر چکے تھے۔ مالک مکان کو لوٹنے میں اسے کوئی قباحت نظر آئی تھی۔ لیکن دوسرے کرائے داروں کی طرف اس کا رویہ ہمدردانہ ثابت ہوا۔ میں اور میری بیوی اس کے متعلق سوچتے رہتے تھے۔ اس چھوٹے سے واقعہ کی میری نزدیک بڑی اہمیت تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے نقاب نے امریکہ میں سیاہ فاموں کے مسئلے کو ڈھانپ رکھا تھا، اس کا ایک کونہ اٹھ گیا تھا۔

ان دنوں امریکہ جنگ کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ اسے ہمیشہ کی طرح ٹھنڈا ذہن رکھنے والوں سے مدد مل رہی تھی۔ جنگ کے مقابلے میں امن قائم رکھنے کے متعلق ان کی فضول قسم، کی تقریریں ''ضرورت'' پڑنے پر جنگ کی حمایت کرنے کے وعدے پر ختم ہوتی تھیں۔ ''بریاں تحریک'' کا یہی لب لباب تھا۔ سوشلسٹ بھی اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ یہ بڑا مشہور مقولہ ہے کہ ٹھنڈے دماغ کے لوگ (Pacifists) امن کے زمانے میں جنگ کو دشمن سمجھتے ہیں۔ جب جرمن آب دوز کشتیاں بلا امتیاز سمندر میں کھلم کھلا دیکھی جانے لگیں تو فوجی رسد کا پہاڑوں جتنا سامان ریلوے سٹیشنوں پر دکھائی دینے لگا۔ جن سے مشرق کی جانب کی سٹیشن اور بندرگاہیں اٹ گئیں۔ اشیا کی قیمتیں بڑھ گئیں، ہزاروں عورتیں، مائیں دنیا کے امیر ترین شہر کی سڑکوں پر نکل آئیں اور انہوں نے دکانیں توڑ دیں اور سٹالوں کو تہ و بالا کر دیا۔ جنگ کے بعد دنیا میں کیا ہوگا؟ میں نے اپنے آپ سے پوچھا۔

3 فروری کو جرمنی کے ساتھ روس کے سفارتی تعلقات منقطع ہو گئے۔ یہ اقدام بڑی دیر سے متوقع تھا۔ جنگجو آنہ وطن پرستی کا میوزک روز بروز تیز ہو رہا تھا۔ ٹھنڈے ذہن کے لوگ اس دھن کا سر ما کم نہ کر سکے۔ میں یہ سب کچھ یورپ میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ یہاں اس کو دہرایا جا رہا تھا۔ میں روسی اخبار میں تمام مرحلوں کی نشاندہی کی اور لوگوں کی اس حماقت پر غور کرتا رہا کہ وہ اپنا سبق سیکھنے میں کس قدر دیر لگا

دیتے ہیں۔

میں نے ایک دفعہ اپنے اخبار کے دفتر کی کھڑکی سے باہر ایک بوڑھے آدمی کو دیکھا جو اپنی متلاشی آنکھوں اور بکھری ہوئی سفید ڈاڑھی کے ساتھ کوڑا گھر سے روٹی کا ٹکڑا ڈھونڈ رہا تھا۔ اس نے روٹی کو اپنے ہاتھ سے توڑنے کی کوشش کی، پھر وہ اس خوفناک چیز کو اپنے دانتوں سے توڑنے لگا۔ اس ناکامی کے بعد وہ اسے کوڑا گھر کی دیواروں کے ساتھ مارنے لگا۔ لیکن روٹی نے ٹوٹنے سے انکار کر دیا۔ اس نے اپنی طرف دیکھا۔ جیسے ڈر گیا تھا یا پریشان ہو گیا تھا۔ پھر اس نے اپنی اس ''متاع'' کو اپنے گھسے ہوئے کوٹ کے اندر چھپایا اور سینٹ مارک پیلس کی طرف گھسٹتا ہوا چل پڑا۔ یہ 2 مارچ 1917 کا واقعہ ہے۔ لیکن اس سے حکمران طبقے کے منصوبوں میں کوئی فرق نہ پڑا۔ جنگ ناگزیر تھی اور ٹھنڈے دماغ والے لوگوں کو اس کی حمایت کرنی پڑی۔

بخارن ان پہلے لوگوں میں سے تھا جس سے نیویارک میں میری ملاقات ہوئی۔ وہ تھوڑا عرصہ پہلے سکنڈے نیویا سے بے دخل ہو کر یہاں آیا تھا وہ ہمیں ویانا کے دنوں سے جانتا تھا۔ اس نے اپنے مخصوص بچگانہ والہانہ پن سے ہمارا استقبال کیا۔ اگرچہ ہمیں دیر ہو چکی تھی اس کے باوجود وہ ہمیں پبلک لائبریری سے کھینچ کر اپنے ساتھ لے گیا۔ یہ اس حرارت بھری اور پر جوش رفاقت کا آغاز تھا جو 1923 تک جاری رہی جب بخارن کے خیالات مخالف سمت میں چلے گئے۔

بخارن فطری طور پر کسی نہ کسی سے جڑا رہنا پسند کرتا تھا۔ ایسے حالات میں وہ اپنے ساتھی کا ترجمان بن کر رہ جاتا۔ آپ کو اس پر مسلسل آنکھ رکھنی پڑتی تھی ورنہ وہ غیر محسوس طریقے سے آپ کے مخالف کے اثر میں جا سکتا تھا۔ پھر وہ اسی جذبے سے آپ کی مخالفت پر اتر آتا جس جوش وخروش سے اس نے آپ کو آسمان پر چڑھایا تھا۔ میں نے بخارن کو کبھی سنجیدگی سے نہیں لیا تھا اور اسے اس کے حال پر چھوڑ رکھا تھا۔ میرا مطلب ہے دوسروں پر۔ لینن کی موت کے بعد پہلے وہ زینوشیف اور بعد میں سٹالن کا حواری بن گیا۔ اس وقت جب میں یہ سطریں تحریر کرنے میں مصروف ہوں، بخارن ایک اور بحران سے گزر رہا ہے۔ بعض ایسے سیال مادے اس کے اندر کی چھلنی سے گزر رہے ہیں جن کا مجھے ابھی کوئی پتا نہیں چل سکا۔

مادام کلونتے اس وقت امریکہ میں تھی۔ مگر وہ مسلسل سفر میں رہتی تھی اور اس سے ملنا مشکل تھا۔ جنگ کے دوران میں وہ بڑی تیزی سے پلٹ گئی۔ وہ منشویکوں کو چھوڑ کر بائیں طرف کے شدت پسند

بالشویکوں میں آ گئی۔اس کے مزاج اور غیر ملکی زبانوں کے علم نے اسے ایک اچھا احتجاج کرنے والا بنادیا تھا۔مگر اس کے نظریات ہمیشہ قدرے مبہم ہوتے تھے۔اس نے نیویارک کے قیام کے دوران میں کوئی چیز بھی اس کے خیال کے مطابق انقلابی ثابت نہ ہوسکی۔اس کی لینن سے خط وکتابت رہتی تھی۔اور جو کچھ امریکہ میں ہوتا تھا (جس میں میری سرگرمیاں بھی شامل تھیں) اسے بتاتی رہتی تھی۔وہ حقائق اور نظریات کو بے حد انقلابی آنکھ سے دیکھتی تھی۔لینن کے جوابات سے پتا چلتا تھا کہ مادام کلونتے کی ارسال کردہ اطلاعات بے وقت ہوتی تھیں۔بعد میں میرے خلاف لڑائی میں اگلی نسل نے لینن کی غلطی پر مبنی باتوں کو بھی استعمال کرنے سے گریز نہ کیا۔ایسی باتیں جن کی لینن خود قول اور فعل سے تردید کر چکا تھا۔روس میں مادام کلونتے انتہائی بائیں بازو سے وابستہ تھی۔وہ میرے ہی نہیں لینن کے خلاف بھی موقف اختیار کر لیتی تھی۔اس نے ''لینن ٹراٹسکی'' حکومت کے خلاف کئی لڑائیاں لڑیں،مگر بعد میں سٹالن حکومت کی طرف حرکت کرگئی۔

امریکہ کی سوشلسٹ پارٹی نظریات کے اعتبار سے یورپ کے محبّ الوطن سوشلزم سے بھی گئی گزری تھی۔ہلکٹ جیسے آدمی امریکہ سوشلسٹ ''چچا'' کی حیثیت سے ایسے موقع کی تلاش میں تھے کہ یورپ جا کر دوسری انٹرنیشنل کے متحارب فریقوں کے درمیان صلح کرا سکیں۔میں آج بھی امریکی سوشلسٹوں کو ذہن میں لا کر ہنستا رہتا ہوں۔جن تارکین وطن نے یورپ میں اپنی جوانی کے دنوں میں کام کیا تھا، وہ مادی کامیابی کی جدوجہد میں بڑی تیزی سے نظریاتی بنیاد کھو رہے تھے۔ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں کامیاب اور نیم کامیاب ڈاکٹروں، وکیلوں، دندان سازوں، انجینئروں اور ایسے ہی دوسرے لوگوں کا ایک طبقہ ہے جو اپنا آرام کا وقت یورپ کی نمایاں ہستیوں کو ملنے اور امریکی سوشلسٹ پارٹی میں گزارتا ہے۔زندگی کی طرف ان کا رویہ علم کی ان ٹکڑوں اور چیتھڑوں پر مبنی ہے جو ان لوگوں نے طالب علمی کے زمانے میں حاصل کیا تھا۔چونکہ وہ کاروں کے مالک ہیں لہٰذا اپنی معاشی حیثیت کی بدولت پارٹی کی کسی نہ کسی کمیٹی، کمیشن یا وفد کے ممبر منتخب ہو جاتے ہیں۔انہی لوگوں نے امریکی سوشلزم پر اپنی ذہنیت کی خاص مہر ثبت کر رکھی ہے۔ان کا خیال ہے کہ ولسن مارکس سے زیادہ معتبر تھا۔سچی بات تو یہ ہے کہ گروہ ''بابٹ'' ہی کی کوئی قسم ہے جو اپنی کاروباری سرگرمیوں سے تنگ آ کر اپنی بے جان اور بے ثمر اتواروں کو انسانیت کے مستقبل کے بارے میں سوچ کر جان دار بنانے میں لگا رہتا ہے۔یہ لوگ اپنے چھوٹے چھوٹے قومی

گروہوں میں رہتے ہیں جن میں ان کے خیالات کی ہم آہنگی ان کے کاروباری رشتوں کے لئے مفید ثابت ہوتی ہے۔ ہر گروہ کا اپنا ایک رہنما ہے جو عام طور پر سب سے زیادہ خوشحال ''بابٹ'' ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کے نظریات کو برداشت کر لیتے ہیں بشرطیکہ وہ ان کی روایتی حاکمیت اور ذاتی آرام کو تکلیف نہ پہنچائیں۔ ہل کٹ بھی بابٹوں کا ایک بڑا بابٹ تھا جو کامیاب دندان سازوں کا محبوب راہنما تھا۔

ان لوگوں سے پہلی ملاقات ہی میں میں ان کی نفرت کا نشانہ بن گیا۔ میرے خیالات اور جذبات بھی ان کے خلاف تھے اگرچہ ان میں شدید مخالفت کے بجائے ہمدردی کا عنصر زیادہ غالب تھا۔ ہم مختلف دنیاؤں کے باسی تھے۔ میرے نزدیک وہ ہماری دنیا کا سب سے زیادہ گلا سڑا حصہ تھے جس کے خلاف میں برسر پیکا اور اب بھی ہوں۔

پرانی نسل میں سے بوڑھا اور جین ڈبز اپنی سوشلسٹ تصور پرستی کے داخلی روشن شعلے کی وجہ سے سرکردہ حیثیت کا مالک تھا۔ اگرچہ وہ ایک رومانی اور مبلغ قسم کا آدمی تھا اور ایک سیاسی رہنما نہیں تھا، اس کے باوجود وہ ایک پرخلوص انقلابی تھا۔ المیہ یہ ہوا کہ وہ اپنے سے کمتر حیثیت کے لوگوں کے زیر اثر آ گیا۔ ہل کٹ کا کمال یہ تھا کہ اس نے ڈبز کو اپنے بائیں باز پر رکھا ہوا تھا جب کہ اس نے گومپرز سے کاروباری قسم کی دوستی بنائی ہوئی تھی۔ ڈبز کی شخصیت بڑی مسحور کن تھی۔ وہ جب بھی مجھے ملتا بغل گیر ہوتا اور چوم لیتا۔ وہ خشک قسم کے لوگوں میں سے نہیں تھا۔ جب بابٹ نے میرا راستہ بند کیا تو ڈبز نے اس میں کوئی حصہ نہ لیا۔ وہ غم کی حالت میں ایک طرف ہو گیا۔

میں نے نیویارک آتے ہی ''نوی میر'' کے ادارتی بورڈ میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ ادارتی بورڈ میں بخارن اور میرے علاوہ وولوڈرسکی اور چڈنوسکی بھی شامل تھے۔ وولوڈرسکی کو بعد میں سوشلسٹ انقلابیوں نے پیٹروگراڈ میں ہلاک کر دیا تھا۔ چڈنوسکی پیٹروگراڈ کے باہر زخمی ہوا اور آخر یوکرائن میں مارا گیا۔ ہمارا اخبار بین الاقوامیت پسندوں کے انقلابی پروپیگنڈہ کا مرکز تھا۔ سوشلسٹ پارٹی کی قومی فیڈریشنوں میں ایسے ارکان بھی تھے جو روسی زبان بولتے تھے۔ اسی طرح روسی فیڈریشنوں میں انگریزی بولی جاتی تھی۔ ''نووی میر'' کے خیالا امریکی محنت کشوں کے وسیع حلقے میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس پر سرکاری سوشلزم کے دعویدار چوکنے ہو گئے۔ میرے خلاف سازشوں کا جال بچھ گیا اور کہا جانے لگا کہ ایک یورپی مہاجز جس نے ابھی کل ہی امریکہ کی سرزمین پر قدم رکھا تھا، امریکیوں کی نفسیات کیسے سمجھ سکتا تھا۔ وہ

اپنے عجیب وغریب طریقے امریکیوں پر آزما رہا ہے۔تصادم تلخ ہوتا گیا۔روسی فیدریشن میں ''آزمائے ہوئے اور بااعتماد بابوں کو کونے میں دھکیل دیا گیا۔جرمن اخبار ''واکس زی تنگ'' کا چیف ایڈیٹر سلوٹر ہل کٹ کا یار غار تھا، جونیئر ایڈیٹر لور پر زیادہ سے زیادہ دباؤ بڑھانے لگا کیونکہ لور ہمارے نظریات کا حامی تھا۔فن لینڈ کی فیڈ ریشن بھی ہماری طرف گھوم گئی۔ہم طاقتور یہودی فیڈ ریشن کی چودہ منزلہ عمارت میں بتدریج سرایت کررہے تھے جہاں سے ''فارووڈ'' کی دولاکھ کاپیاں روزانہ شائع ہورہی تھیں۔اس اخبار سے متعصب اور جذباتی سوشلزم کی بوآتی اور جو کسی وقت بھی غداری پر تیار رہتا تھا۔

امریکی محنت کشوں میں سوشلسٹ پارٹی اور خصوصاً ہمارے انقلابی فریق کے اثرات اور روابط بہت کم تھے۔پارٹی کے انگریزی پرچے ''دی کال'' پر غیر جانب دار ٹھنڈے دماغ والوں کا قبضہ تھا۔ہم نے ایک سخت نظریات والا مارکسی ہفت روزہ نکالنے کا فیصلہ کیا۔اس سلسلے میں زور شور سے تیاریاں جاری تھیں کہ روسی انقلاب نے رخنہ ڈال دیا۔

تارگھروں کی دوتین دن کی پراسرار خاموشی کے بعد پیٹروگراڈ کی شورش کی مبہم سی اور غیر واضح رپورٹ آئی۔نیویارک کے محنت کشوں میں ہیجان پھیل گیا۔لوگ امید باندھنے اور امید سے ڈرنے بھی لگے۔امریکی پریس مکمل طور پر بوکھلا گیا۔صحافی، رپورٹر، انٹرویو لینے والے ہر طرف سے ''نووی میر'' کے دفتر میں بھاگے آرہے تھے۔ایک لمحے کے لئے ہمارا اخبار نیویارک پریس کا مرکز بن گیا۔سوشلسٹ اخباروں اور تنظیموں سے دھڑادھڑ ٹیلیفون آرہے تھے۔

''ایک تار آیا ہے جس میں لکھا ہے کہ پیٹروگراڈ نے ایک وزارت بنائی ہے جس کا نام ہے گوچوف ___ ملوکوف ___ اس کا کیا مطلب ہے؟''

کل کو ملوکوف اور کرنسکی کی وزارت بنے گی۔''

''کیا یہ ٹھیک ہے؟ آگے کیا ہوگا؟''

''آگے کیا ہوگا؟ ہماری باری آئے گی؟''

''اوہو''

ایسی باتیں درجنوں کی تعداد میں دہرائی جارہی تھیں۔میں جس سے بات کرتا، وہ اسے ایک مذاق سمجھتا۔''قابل احترام اور بے حد قابل احترام'' روسیوں کے ایک اجلاس میں میں نے ایک مضمون پڑھا

جس میں دلیل دی کہ روسی انقلاب کے دوسرے مرحلے میں پرولتاریہ ناگزیرطور پر اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لے گی۔اس مضمون نے ایسا تاثر پیدا کیا جیسے بڑے بڑے مینڈکوں سے بھرے گندے تالاب میں پتھر پھینک دیا جائے۔ڈاکٹر انگرمان نے یہ کہنے میں ذرا تعمل نہ برتا کہ میں سیاسی ریاضی کے چار پہلے اصولوں سے بے خبر تھا۔اور میرے احمقانہ خوابوں کو جھٹلانے میں پانچ منٹ سے زیادہ عرصہ درکار نہیں تھا۔

محنت کش عوام نے انقلاب کے امکانات کو بالکل دوسرے طریقے سے لیا۔نیویارک میں ان کی جم سے بڑے بڑے غیر معمولی اجلاس منعقد ہونے لگے۔ ہر جگہ اس خبر نے خوشی سے ہیجان پیدا کر دیا کہ ''سرمائحل'' پر سرخ جھنڈا لہرانے لگا تھا۔روسی مہاجرین ہی نہیں بلکہ ان کے بچے بھی جو روسی زبان سے بمشکل آشنا تھے،انقلاب کی خوشی کی فضا میں سانس لینے لگے۔

گھر میں بیٹوں سے میری کبھی کبھار ملاقات ہوتی تھی۔ ان کی اپنی ایک پیچیدہ قسم کی زندگی تھی۔میری بیوی ایک گھونسلہ بنانے میں لگی ہوئی تھی۔ بیٹوں کے نئے دوست بن گئے تھے۔ان کا سب سے گہرا دوست ڈاکٹر۔ایم۔ کا شوفر تھا۔ڈاکٹر کی بیوی میری اور بچوں کو کار میں باہر سیر کرانے لے جاتی۔وہ ان سے بڑی شفقت سے پیش آتی۔مگر وہ خاتون تو ایک فانی شے تھی جب کہ اس کا شوہر ایک جادوگر،ایک سپر مین جو ہاتھ کے ہلکے سے اشارے سے ایک مشین (کار) کو حرکت میں لاسکتا تھا۔اس کے ساتھ بیٹھنا خوشی کی انتہا تھی۔ جب وہ چائے پینے کمرے میں گئے تو بچے ماں سے مطالبہ کرنے لگے۔ ''شوفر کو اندر کیوں نہیں بلاتے۔''

بچوں کے اندر نئے حالات میں ڈھلنے کی حیرت ناک صلاحیت ہوتی ہے۔ویانا میں ہم زیادہ عرصہ محنت کشوں کے علاقے میں قیام پذیر رہے تھے۔میرے بیٹوں نے وہاں کی مقامی زبان بولنے میں کمال حاصل کرلیا تھا۔اس کے علاوہ وہ روسی اور جرمن زبان بھی بول لیتے تھے۔ڈاکٹر الفریڈ ایڈلر یہ دیکھ کر بڑا خوش ہوتا کہ وہ بوڑھے کوچوانوں جیسی زبان بولتے تھے۔زیورچ مین وہ زیورچ بولی بولنے لگے جو زیریں جماعتوں میں رائج تھی جب کہ جرمن زبان بطور غیرملکی زبان پڑھائی جاتی تھی۔ پیرس میں وہ فرانسیسی میں اظہار خیال کرتے اور جلد ہی اس میں کمال حاصل کرلیا تھا۔جس روانی سے وہ فرانسیسی میں بات چیت کرتے مجھے اس پر رشک آتا۔اگر چہ انہوں نے سپین میں ایک ماہ اور کچھ عرصہ سٹیمر پر گزارا تھا مگر اس عرصے میں وہ عمدہ ہسپانوی زبان بولنے لگے تھے۔اور پھر وہ نیویارک میں ایک امریکی سکول میں دو ماہ

کے لئے گئے اور فر فر انگریزی بولنے لگے۔ فروری انقلاب کے بعد وہ پیٹروگراڈ میں سکول جانے لگے لیکن وہاں کی سکول کی زندگی بڑی بے ترتیب تھی جس کے باعث غیر ملکی زبانیں ان کے ذہن سے اسی سرعت کے ساتھ غائب ہو گئیں جس جلدی سے انہوں نے سیکھی تھیں۔ روس آ کر وہ روسی غیر ملکیوں کی طرح بولتے تھے۔ ہم اس بات پر حیران ہوتے کہ وہ کوئی روسی جملہ یوں بولتے جیسے کسی فرانسیسی فقرے کا ترجمہ کر رہے تھے، حالانکہ اب وہ فرانسیسی میں کوئی فقرہ بنانے سے قاصر تھے۔ ہماری غیر ملکی آوارہ گردی کی داستان ہمارے بچوں کے ذہنوں پر اس طرح رقم تھی جیسے کسی تختی پر مٹا مٹا کر دوبارہ لکھا جا رہا ہو۔

جب میں نے اخبار کے دفتر سے فون کر کے اپنی بیوی کو بتایا کہ پیٹروگراڈ میں انقلاب برپا ہو چکا تھا تو اس وقت میرا سب سے چھوٹا بیٹا سروزا گلے کی بیماری کی وجہ سے بستر میں تھا۔ اس وقت وہ نو برس کا تھا لیکن اسے یقینی طور پر احساس ہو گیا کہ انقلاب کی بدولت انہیں کوئی رعایت ملنے والی تھی۔ روس کی طرف واپسی اور اس کے علاوہ ہزاروں دوسری چیزیں اور نعمتیں ___ وہ انقلاب کی تعظیم اٹھ کھڑا ہوا اور بستر پر ناچنے لگا۔ یہ اس کے صحت یاب ہونے کی علامت تھی۔

ہم پہلی کشتی ہی سے روانہ ہو جانا چاہتے تھے۔ میں ویزے کی غرض سے ایک قونصل خانے سے دوسرے قونصل خانے میں بھاگنے لگا۔ ہمارے جانے سے پہلے ڈاکٹر نے ہمارے زیر علاج بیٹے کو چلنے پھرنے کی اجازت دے دی۔ میری بیوی نے اسے نصف گھنٹے کے لئے باہر جانے دیا اور خود سامان باندھنے لگی۔ اسے یہ کام کتنی دفعہ کرنا پڑا تھا۔ لیکن سروزا مقررہ وقت کے بعد واپس نہ آیا۔ میں دفتر میں تھا۔ تین گھنٹے تشویش میں گذر گئے۔ پھر ایک ٹیلیفون آیا جسے میری بیوی نے سنا۔ پہلے ایک غیر مانوس مردانہ آواز اس کے بعد بیٹے کی آواز ''میں یہاں ہوں۔'' یہاں کا مطلب پولیس اسٹیشن تھا جو نیویارک کے دوسرے کنارے پر تھا۔ لڑکے نے اپنی سیر کے دوران میں ایک ایسا سوال حل کرنا چاہا جو اسے ایک عرصے سے پریشان کر رہا تھا۔ کیا کوئی پہلی گلی بھی تھی؟ ہم 164 گلی میں رہتے تھے، اگر میں غلطی نہیں کر رہا) وہ راستہ بھول گیا۔ لوگوں سے پوچھنے لگا اور اسے پولیس سٹیشن پہنچا دیا گیا۔ خوش قسمتی سے اسے اپنا فون نمبر یاد تھا۔

جب ایک گھنٹے بعد میری بیوی اپنے بڑے بیٹے کے ساتھ اسے لینے پولیس سٹیشن گئی تو اس کا ایک ایسے مہمان کی طرح خوش دلی سے استقبال کیا گیا جس کا عرصے سے انتظار تھا۔ سروزا ایک پولیس والے

کے ساتھ کسی کھیل میں مصروف تھا اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اپنی پریشانی اور ہراس چھپانے کے لئے وہ اپنے نئے امریکی دوست کے عقب میں کھڑا چیونگم چبا رہا تھا۔ اسے آج بھی نیویارک میں اپنے اپارٹمنٹ کا فون یاد ہے۔

یہ کہنا کہ میں نے نیویارک کے متعلق بہت سی معلومات حاصل کر لی تھیں، بے حد مبالغہ آرائی ہوگی۔ میں نے جلدی ہی امریکی سوشلزم کے معاملات میں خود کو الجھا لیا اور ان میں گردن تک ڈوب گیا تھا۔ روسی انقلاب اتنی جلدی آ گیا کہ میں اس عفریت کی زندگی کی ابتدائی نوعیت ہی سمجھ سکا تھا جس کا نام نیویارک ہے۔ میں ایک ایسے آدمی کے احساس کے ساتھ یورپ روانہ ہو رہا تھا جیسا اس فونڈری میں فقط ایک دفعہ جھانکنے کا موقع ملا جس میں انسان کی تقدیر بنتی بگڑتی رہتی ہے۔ مجھے بس ایک ہی تسلی تھی کہ شاید کبھی واپس آ جاؤں۔ اور میں نے یہ امید آج تک نہیں چھوڑی۔

ایک ریاستی اذیت گاہ میں

25 مارچ کو میں نیویارک میں روسی قونصل جنرل کے دفتر میں گیا۔ اس وقت تک زار نکولاس کا پورٹریٹ وہاں سے ہٹا دیا گیا تھا، مگر کسی بھاری نفری والے پولیس اسٹیشن کی فضا ابھی تک وہاں معلق تھی۔ عام تاخیر اور سوال جواب کے بعد قونصل جنرل نے روس جانے کے لئے مجھے ویزا جاری کر دیا۔ برطانوی کونصلیٹ میں بھی جب میں ان کا سوال نامہ بھر رہا تھا تو مجھے بتایا گیا کہ اگر میں برطانیہ کے راستے روس جانا چاہوں تو برطانوی حکام کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ ہر چیز ہموار طریقے سے جا رہی تھی۔

میں 27 مارچ کو اپنے کنبے اور بعض دوسرے روسیوں کے ساتھ ''کرسچن فورڈ'' نامی ناروے کے جہاز پر سوار ہو گیا۔ ہمیں پھولوں کی بوچھاڑ اور تقریروں کے جوش و خروش میں روانہ کیا گیا کیونکہ ہم انقلاب والے ملک میں جا رہے تھے۔ ہمارے پاس پاسپورٹ اور ویزے تھے۔ انقلاب، ویزے اور پھول ہماری روحوں کو تقویت پہنچا رہے تھے۔ ہالی فکس کے مقام پر برطانوی نیوی نے ہمارے سٹیمر کا معائنہ کیا اور پولیس نے امریکی، ڈچ اور ناروی مسافروں کے کاغذات وغیرہ چیک کیے۔ روسی مسافروں سے تو انہوں نے براہ راست تحقیق شروع کر دی۔ ان کے نظریات، مستقبل کے منصوبوں اور اعتقادات کے بارے میں پوچھا جانے لگا۔ میں نے ان کے ساتھ ایسے معاملات میں بات چیت کرنے سے صاف انکار

کر دیا۔'' آپ لوگ میری شناخت کے متعلق پوچھ سکتے ہیں، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔'' روسی سیاست ابھی تک برطانوی بحری پولیس کے قبضے میں نہیں آئی تھی۔ جب ان کا دوسرا حملہ بھی ناکام ہو گیا تو برطانوی جاسوس میرے بارے میں دوسرے مسافروں سے پوچھ گچھ کرنے لگے۔ ان کا اصرار تھا کہ میں کوئی خطرناک قسم کا سوشلسٹ تھا۔

دوسرے مسافروں کے مقابلے میں روسی کے ساتھ ان کا طرز سلوک اس قدر نفرت انگیز اور نسلی امتیاز پر مبنی تھا کہ بعض روسیوں نے برطانوی حکام کو اپنا بردست احتجاج نوٹ کرایا۔ ایک ایسی قوم کے ساتھ ان کا رویہ انتہائی غیر مناسب تھا جو جنگ میں ان کی اتحادی تھی۔ میں اس احتجاج میں شامل نہ ہوا کیونکہ اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس وقت تک ہمیں مستقبل کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔

13 اپریل کو برطانوی افسر نیلی وردیوں والے بحری اہل کاروں کے ہمراہ آئے اور مقامی ایڈمرل کا حکم سناتے ہوئے مجھے، میری فیملی اور پانچ دوسرے مسافروں کو جہاز سے اتر جانے کو کہا۔ ہمیں یقین دلایا گیا کہ ہائی فکس میں سارا معاملہ صاف ہو جائے گا۔ ہم نے حکم کو غیر قانونی کہہ کر ماننے سے انکار کر دیا۔ پھر ہمیں دوسرے مسافروں کی طرف سے ''شرم، شرم'' کے نعروں کے درمیان ایک کشتی میں زبردستی ڈال کر ہائی فکس پہنچا دیا گیا۔ جب چند جہاز رانوں نے مجھے پکڑا ہوا تھا تو میرا بڑا بیٹا میرے پاس آیا اور اس نے غصے میں ایک افسر کو مکا مار دیا۔ وہ اس وقت گیارہ سال کا تھا۔ برطانوی جمہوریت میں یہ اس کا پہلا سبق تھا۔

پولیس نے میری بیوی اور بچوں کو ہائی فکس میں رکھ لیا۔ اور ہم سب کو ٹرین کے ذریعے ایمبرسٹ لے جایا گیا جو جرمن قیدیوں کا کیمپ تھا۔ وہاں ہم سے اس برے طریقے سے پوچھ گچھ کی گئی کہ اس کے سامنے سینٹ پال قلعے تفتیش ماند پڑ گئی۔ زار کے قلعے میں تو پولیس مجھے علیحدگی میں برہنہ کر کے تلاشی لیتی تھی جب کہ یہاں ہمارے جمہوری اتحادی نے درجنوں لوگوں کے سامنے مجھے ننگا اور بے عزت کر کے بے شرمی کا مظاہرہ کیا۔ مجھے آج بھی وہ سویڈن _ کینیڈین سارجنٹ اولسن یاد ہے جو مجرمانہ نوعیت کا پولیس مین تھا اور جامہ تلاشی کا انچارج تھا۔ جس منحوس اور بدتمیز آدمی نے اس سارے تماشے کا انتظام کیا تھا وہ ایک فاصلے پر کھڑا تھا اور تاسف سے دیکھ رہا تھا۔ کہ یہ اوبیات انقلابی لوگ انقلاب کے بعد آزاد ہو کر اپنے ملک واپس جا رہے تھے۔

ہمارے متعدد مطالبوں اور احتجاجوں کے بعد کیمپ کمانڈر کرنل مورس نے ہمیں ہماری گرفتاری کی وجہ بتائی۔ مگر ایسا ہونے میں اگلی صبح آ گئی۔ ''تم موجودہ روسی حکومت کے لئے خطرناک ہو''۔ اس نے مختصر طور پر کہا۔ ''لیکن نیویارک میں روسی قونصل خانے نے میں باقاعدہ ویزے جاری کیے ہیں۔ روسی حکومت کو یہ سب معلوم ہے۔'' ہم نے احتجاج کیا۔ کرنل نے تھوڑی دیر تک اپنا جبڑا اوپر نیچے کرنے کے بعد کہا۔ ''تم لوگ اتحادیوں کے لئے بھی خطرناک ہو۔''

ہماری گرفتاری کا تحریری حکم ہمیں کبھی نہ دکھایا گیا۔ کرنل نے ہماری تسلی کی خاطر وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ چونکہ ہم سیاسی مہاجر تھے اور ہم نے کسی معقول وجہ کے بغیر اپنا ملک چھوڑا تھا، لہٰذا اب ہمارے ساتھ جو کچھ بھی ہو رہا تھا اس پر ہمیں حیران ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ جہاں تک اس کی اپنی ذات کا تعلق تھا، اس کے لئے روسی انقلاب کا کہیں کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ ہم نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ زار جس وزیر نے ہمیں سیاسی مہاجر بنا دیا تھا وہ اب جیل کے اندر تھا۔ لیکن کرنل کی کھوپڑی میں یہ بات آنے سے رہی۔ اس نے برطانوی نوآبادیوں اور جنوبی افریقہ میں بوئر جنگ میں اپنا مستقبل بنایا تھا۔ میں بات کرتے وقت اس کی کچھ زیادہ عزت نہیں کرتا تھا جس کے سبب وہ میرے جانے کے بعد بڑبڑاتا رہتا تھا۔ ''کاش یہ مجھے افریقہ میں کہیں مل جاتا۔''

یہ اس کا میرے متعلق مخصوص جملہ تھا۔

میری بیوی سیاسی مہاجر نہیں تھی کیونکہ اس نے جائز اور قانونی پاسپورٹ پر روس چھوڑا تھا۔ لیکن اسے بھی میرے گیارہ اور نو سالہ بیٹے کے ساتھ حراست میں لے لیا گیا تھا۔ جب میں کہتا ہوں کہ لڑکوں کو گرفتار کر لیا گیا تھا تو اس میں ہرگز کوئی مبالغہ آرائی نہیں ہے۔ سب سے پہلے کینیڈین حکام نے انہیں ماں سے جدا کر کے بچوں کے ایک گھر میں رکھنے کی کوشش کی۔ میری بیوی نے شور مچا دیا کہ وہ ایسا ہرگز نہیں ہونے دے گی۔ یہ اس کے احتجاج کا نتیجہ تھا کہ اسے بیٹوں کے ہمراہ ایک اینگلو_روسی پولیس ایجنٹ کے گھر میں رکھ دیا گیا۔ اس خدشے کے پیش نظر کہ لڑکے خفیہ طور یا تار وغیرہ نہ بھیج دیں، جب وہ باہر جاتے تو کوئی نہ کوئی پولیس والا ان کے ساتھ ہوتا۔ آخر گیارہ دنوں بعد ان تینوں کو ایک ہوٹل میں منتقل ہونے کی اجازت مل گئی۔ شرط یہ تھی کہ وہ ہر روز پولیس اسٹیشن حاضری دیا کریں گے۔

ایمبرسٹ کا فوجی قید خانہ ایک ایسی پرانی اور خستہ حال فونڈری میں واقع تھا جو اس کے جرمن مالک

سے چھینی گئی تھی۔ سونے کا انتظام ایک بڑے ہال میں اوپر نیچے تین تین بستروں کی شکل میں کیا گیا تھا۔ تقریباً آٹھ سولوگوں کو وہاں رکھا گیا تھا۔ اتنے زیادہ لوگوں کی موجودگی میں اس ہال کی فضا کا کیا حال ہوگا، بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ لوگ ناامیدی کی حالت میں راہ داریوں میں ایک دوسرے کا راستہ روکے کھڑے رہتے، انہیں دوسرے کو کہنی مار کر راستہ پڑتا یونہی بیکار لیٹے رہتے یا ایک دم اٹھ بیٹھتے اور تاش یا شطرنج کھیلنے لگتے۔ بعض پنسل سے تصویریں بنانے لگتے جن میں سے کئی بڑی فنی مہارت کا نمونہ تھیں۔ ان میں سے بعض تصویریں اور سکیچ میرے پاس بڑی دیر تک ماسکو میں موجود رہے۔ ان ساری ذہنی اور جسمانی سرگرمیوں کے باوجود پانچ آدمی پاگل ہو گئے۔ ہمیں ان پاگلوں کے ساتھ ایک ہی جگہ کھانا اور رہنا پڑتا تھا۔

ان آٹھ سو قیدیوں میں سے جن کے ساتھ میں نے تقریباً ایک ماہ گزارا، پانچ سو جرمن جہاز ران تھے جن کی کشتیوں کو انگریزوں نے ڈبو دیا تھا۔ دو سو محنت کش تھے جو جنگ کے دنوں میں کینیڈا میں پھنس گئے تھے ایک سو کے قریب سول اور بورژوا طبقے سے تعلق رکھنے والے افسر اور دوسرے قیدی تھے۔ جب جرمن قیدیوں کو معلوم ہوا کہ ہم بطور سوشلسٹ انقلابی گرفتار کئے گئے تھے تو ان کا ردعمل معلوم کرنا کچھ زیادہ مشکل نہ تھا۔ انہوں نے ہمیں ایک دم اپنا دشمن سمجھ لیا۔ اس کے برعکس نچلے طبقے کے قیدیوں سے ہمارے تعلقات بڑے دوستانہ تھے اور وہ ہر وقت ہمارے گرد جمع رہتے تھے۔ وہ ایک مہینہ جو جیل میں رہا یوں محسوس ہوا جیسے میں کسی مسلسل اجلاس میں شریک تھا۔ میں نے قیدیوں کو روسی انقلاب، لینن، پرانے انٹرنیشنل کے انہدام کی وجوہات اور جنگ میں امریکہ کی مداخلت کے بارے میں بہت ساری باتیں بتائیں۔ اس کے علاوہ ہم مسلسل گروہوں کی شکل میں مباحثہ کرتے رہتے۔ ہماری دوستی میں ہر روز گرمجوشی بڑھتی رہتی۔ اپنے رویے سے قیدی دو گرہوں میں منقسم دکھائی دیتے تھے۔ ایک تو وہ گروہ تھا جو کہتا تھا ''بہت ہو چکا اب ہم یہ سب کچھ برداشت نہیں کریں گے۔'' یہ لوگ سڑکوں اور چوراہوں پر نکلنے کو تیار تھے۔ دوسرے گروہ کا کہنا تھا۔ ''ان سب چیزوں کا ہمارے ساتھ کیا تعلق ہے۔ ایک مرتبہ یہاں سے نکل گیا تو پھر وہ مجھے دوبارہ پکڑ نہیں سکیں گے۔''

''تم اپنے آپ کو ان سے کیسے چھپاؤ گے''؟ دوسرے ان سے پوچھتے۔ دراز قد اور نیلی آنکھوں والا کوئلے کا کان کن بے بنکسی کہنے لگتا ''میں میری بیوی اور میرے بچے ایک گھنے جنگل میں اپنا گھر بنائیں

گے۔ ہم اپنے گرد ایک پھندا تعمیر کریں گے اور میں بندوق کے بغیر کبھی باہر نہیں جاؤں گا۔ کسی کو میرے قریب آنے کی جرات نہیں ہوگی۔

''بے ہنکسی تم مجھے بھی اپنے قریب نہیں آنے دو گے؟''

''نہیں بالکل نہیں! مجھے کسی پر اعتبار نہیں''

''جہاز ران میری زندگی کو آسان بنانے کے لئے ہر طرح میری مدد کرتے رہتے۔ یہ میرے مسلسل احتجاجوں کا نتیجہ تھا کہ مجھے قطار میں کھڑے ہو کر کھانا حاصل کرنے کا حق مل گیا تھا اور میں اپنے حصے کا لازمی کام جیسے فرش صاف کرنا، آلو چھیلنا' برتن دھونا اور غسل خانہ صاف کرنا، کرتا رہتا تھا۔ افسروں اور نچلے درجے کے قیدیوں کے تعلقات بڑے مخالفانہ تھے۔ کرنل مورس سے میرے وطن دشمنی پر مبنی پروپیگنڈا کرنے کی شکایات ہوتی رہتی تھیں۔ اس نے مجھے عوامی تقریریں کرنے سے منع کر دیا۔ لیکن ایسا میرے جیل کے آخری دنوں میں ہوا۔ اس سے پہلے میں قیدیوں سے اپنے تعلقات استوار کر چکا تھا۔ انہوں نے کرنل کے میرے متعلق حکم پر تحریری احتجاج کیا اور جو احتجاجی نوٹ اسے دیا اس پر پانچ سو قیدیوں کے دستخط تھے۔ اس قسم کے احتجاج نے یمبرسٹ قیدخانے کی میری ساری تکالیف کو رفع کر دیا۔

ہم سارا وقت کیمپ کے اندر رہتے تھے اور ہمیں روسی حکومت سے رابطہ قائم کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ ہمارے ٹیلیگرام پیٹروگراڈ نہیں بھیجے جاتے تھے۔ ہم نے برطانوی وزیراعظم لائیڈ جارج سے بھی رابطہ قائم کرنے کوشش کی مگر ہمارا یہ تار بھی روک لیا گیا۔ کرنل مورس نوآبادیوں میں تعینات رہنے کی وجہ سے ''جنس بیجا'' کا عادی ہو چکا تھا۔ جنگ نے اسے مزید تحفظ مہیا کر دیا تھا۔ اس نے مجھے خبردار کیا کہ اگر میں نے اپنی بیوی کے ذریعے روسی قونصل سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی تو وہ مجھے میری بیوی سے ملنے نہیں دے گا۔ یہ بات ناقابل یقین لگتی ہے مگر ہے درست۔ اس شرط پر میں نے اپنی بیوی سے ملنے سے بھی انکار کر دیا۔ قونصل کو بھی ہماری مدد کی کچھ ایسی جلدی نہیں تھی۔ وہ بھی ہدایات کا منتظر تھا اور ہدایات تھیں کہ کہیں رینگ رہی تھیں۔

مجھے معلوم نہیں تھا کہ جب میں فرانس میں سرگرم عمل تھا تو برطانوی حکومت نے مجھے بلیک لسٹ کر دیا تھا۔ اس نے مجھے یورپ سے نکلوانے کے لئے زار حکومت کی ہر ممکن مدد کی تھی۔ بلیک لسٹ ہونے اور امریکہ میں میری غیر محبّ الوطنی پر مبنی سرگرمیوں کی وجہ سے برطانیہ نے مجھے ہالی فکس میں گرفتار کیا

تھا۔ جب میری گرفتاری کی خبر روسی انقلابی پریس میں شائع ہوئی تو پیٹروگراڈ میں برطانوی سفارت خانے نے جسے میری واپسی کی اتنی جلدی امید نہیں تھی، پیٹروگراڈ کے اخبار میں یہ بیان شائع کرایا کہ وہ روسی جو کینیڈا میں گرفتار کئے گئے تھے، جرمن سفارت خانے کی مالی مدد سے سفر کر رہے تھے اور انہوں نے عبوری روسی حکومت کا تختہ الٹنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ اس سادگی پر کسی کا مرنے کو جی نہیں چاہتا ہوگا۔ ''پراودا'' جو لینن کی زیر ہدایات شائع ہوتا تھا، اس نے بکانن کو 16 اپریل کو یہ جواب دیا کہ ''کیا اس بات کا ایک لمحے کے لئے بھی یقین کیا جا سکتا ہے کہ ٹراٹسکی جو 1905 میں سینٹ پیٹرز برگ کی ''سوویٹ آف ورکرز ڈیلی گیٹس'' کا چیئر مین تھا اور جس نے انقلاب کی خاطر اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا، جرمن حکومت کے کسی اس قسم کے منصوبے میں شامل ہوگا۔ یہ بھی انقلابی نوعیت کا ایک مکروہ جھوٹ اور بہتان تراشی تھی۔ مسٹر بکانن تمہیں اطلاع کہاں سے ملی؟ تم اس کا انکشاف کیوں نہیں کرتے کہ عبوری روسی حکومت کی دوستی کے نام پر چھ افراد کامریڈ ٹراٹسکی کو لاتوں اور ہاتھوں سے پکڑ کر گھسیٹ کر لے گئے۔

اس میں عبوری حکومت نے جو کردار ادا کیا وہ بھی زیادہ واضح نہیں تھا۔ اس بات کے لئے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں تھی کہ ملی کوف جو ان دنوں روس کا وزیر خارجہ تھا، مجھے ہر حال میں گرفتار کرانا چاہتا تھا۔ اس نے 1905 ہی سے ''ٹراٹسکی ازم'' کے خلاف جنگ جاری کر رکھی تھی۔ یہ اصطلاح بھیا سی کی گڑی ہوئی تھی۔ لیکن وہ سوویت کا محتاج تھا اور کھلی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا کیونکہ اس کے سوشل محبّ الوطن اتحادیوں نے ابھی بالشویکوں کو دانہ ڈالنا شروع نہیں کیا تھا۔

اس سارے قصے کے متعلق بکانن اپنی یادداشتوں میں کچھ اس طرح لکھتا ہے۔ ''ٹراٹسکی اور دوسرے روسی پناہ گزینوں کو اس وقت تک ہالی فکس میں رکھا گیا جب تک اس سلسلے میں عبوری حکومت کی رائے حاصل نہ کر لی گئی۔'' برطانوی سفیر کے مطابق ملی کوف کو ہماری گرفتاری کے متعلق فوری طور پر آگاہ کر دیا گیا تھا۔ برطانوی سفیر کا کہنا تھا کہ اس نے 8 اپریل کو ہماری رہائی کے متعلق ملی کوف کی درخواست اپنی حکومت کو پہنچا دی تھی۔ لیکن دو دن بعد اس نے اپنی یہ درخواست واپس لے لی اور یہ امید ظاہر کی کہ ہالی فکس میں ہمارا قیام طویل ہو جائے گا۔'' بکانن نتیجہ اخذ کرتے ہوئے مزید لکھتا ہے ''یہ عبوری حکومت تھی جو ان کی گرفتاری کی طوالت کی ذمہ دار تھی۔'' حقیقت یہی معلوم ہوتی ہے بچانان اپنی یادداشتوں میں یہ حقیقت درج کرنا بھول گیا ہے کہ اس مالی معاونت کا کیا بنا جو میں نے جرمن عبوری حکومت کا تختہ الٹنے

کے لئے حاصل کی تھی۔اس میں بھی حیرت کی کوئی بات نہیں ہے کہ میرے پیٹروگراڈ پہنچنے پر بچانان نے پریس میں بیان دیا کہ اسے اس قسم کی مالی معاونت کی کوئی خبر نہیں تھی۔لوگوں نے اس قدر جھوٹ کبھی نہیں بولا تھا جتنا آزادی کی خاطر لڑی جانے والی جنگ'' کے دوران میں ان کے منہ سے برآمد ہوا تھا۔اگر جھوٹ دھماکہ خیز ہوتا تو معاہدہ ورسیلز سے پہلے ہی ہمارا یہ سیارہ دھماکہ سے اڑ چکا ہوتا۔

انجام کار سوویت کو مداخلت کرنا پڑی اور ملی کوف کو جھکنا پڑا۔29اپریل کو ہم فوجی کیمپ سے رہا ہوئے۔رہا کرتے وقت بھی ہم پر تشدد روا رکھا گیا۔ہمیں اپنا سامان باندھنے اور کانوائے کے ساتھ روانہ ہونے کا حکم ملا۔ہمیں کب اور کہاں جانا تھا، یہ بالکل نہ بتایا گیا۔قیدی جوش میں آ گیا انہیں محسوس ہوا جیسے ہمیں کسی قلعے میں لے جایا جا رہا تھا۔ہم نے نزدیک ترین روسی قونصل خانے میں جانے کے لئے کہا۔ہمارا مطالبہ رد کر دیا گیا۔سمندر کے ان باسیوں پر سے ہمارا اعتبار اٹھ گیا اور ہم اصرار کرنے لگے کہ جب تک ہمیں بتایا نہیں جائے گا کہ ہمیں کہاں لے جایا جا رہا تھا۔ہم اپنی جگہ سے نہیں ہلیں گے۔کمانڈر نے ہمیں زبردستی لے جانے کا حکم جاری کر دیا۔سپاہیوں نے ہمارا سامان اٹھا کر کانوائے میں رکھ دیا مگر ہم اپنے مورچوں پر ڈٹے رہے۔جب سپاہیوں کو ہمیں جسمانی طور پر اٹھا لینے کی ذمہ داری سونپ دی گئی جیسا ایک ماہ پہلے سٹیمر میں ہمارے ساتھ ہوا تھا اور یہ سب کچھ جہاز رانوں کے ہجوم میں کیا گیا تھا،تو کمانڈر نے ہمیں اپنے مخصوص اینگلو نوآبادیاتی لہجے میں بتایا کہ ہمیں ڈنمارک کی کشتی کے ذریعے روس لے جایا جا رہا تھا۔یہ کہتے وقت کرنل کا سرخ چہرہ خاصا بگڑ رہا تھا۔یہ اس سے برداشت نہیں ہو رہا تھا کہ ہم اس کے ہاتھ سے نکل رہے تھے۔جب ہم کیمپ سے جا رہے تھے تو ہمارے ساتھی قیدیوں نے بڑے خوش وخروش سے ہمیں الوادع کہا۔افسروں نے خود کو اپنے کمروں میں بند کر لیا اور وہ دروازے کی درزوں سے اپنی ناکیں نکال کر ہمیں جھانک رہے تھے۔جب ہمیں لے جایا رہا تھا تو ہمارے دونوں طرف ہمارے قیدی ساتھیوں کی قطاریں بندھ گئیں۔ان کا اپنا بنایا ہوا ایک بینڈ انقلابی مارچ کی دھن بجا رہا تھا۔ہر کوئی ہم سے ہاتھ ملانے کو بے تاب تھا۔قیدیوں میں سے ایک نے مختصر سی تقریر کی جس میں روسی انقلاب کی تعریف اور جرمن بادشاہت کی مذمت کی گئی تھی۔یہ یاد آج بھی میری لئے خوشی کا باعث ہے کہ ایمہر سٹ میں جنگ کے عین درمیان میں ہم جرمن جہاز رانوں سے دوستی گانٹھ رہے تھے۔بعد میں ان میں سے کئی جہاز رانوں نے جرمنی سے مجھے خط بھیجے۔

برطانوی پولیس افسر ماچن جس نے ہمیں گرفتار کیا تھا وہ بھی ہماری رخصت کے وقت موجود تھا۔ جاتے وقت میں نے اس پر ایک فقرہ کسا کہ دستور ساز اسمبلی میں، میں وزیر خارجہ ملی کوف سے پہلا سوال اس بدتمیزی کے بارے میں پوچھوں گا جو اینگلوکینیڈین پولیس نے روا رکھی تھی۔ ماچن نے برجستہ جوابی حملہ کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے امید ہے تم دستور ساز اسمبلی میں کبھی نہیں پہنچ سکو گے۔''

پیٹروگراڈ میں

ہیلی فکس سے پیٹروگراڈ تک کا سفر بڑی یکسانیت میں گزرا جیسے میں کسی سرنگ میں سے گزر رہا تھا۔ اور یہ واقعی انقلاب کی سرنگ تھی۔ سویڈن سے گزرتے وقت میں نے پہلی دفعہ ''روٹی کے کارڈ'' دیکھے جو مجھے ہمیشہ یاد رہے۔ فن لینڈ میں میں ٹرین میں وینڈر رویلڈے اور ڈی مان سے ملا۔ وہ بھی پیٹروگراڈ جا رہے تھے۔

''تم نے ہمیں پہچانا'' ڈی مان نے پوچھا۔

''بالکل پہچان لیا___ اگرچہ جنگ کے عرصے میں لوگ خاصے تبدیل ہو جاتے ہیں۔'' ہماری گفتگو کچھ اچھے انداز میں اختتام پذیر نہ ہوئی۔

جوانی کے دنوں میں ڈی مان نے مارکسسٹ بننے کی کوشش کی تھی۔ وینڈر رویلڈے سے اس کا بڑا مقابلہ رہتا تھا۔ مگر جنگ کے دنوں میں وہ جوانی ہی میں سیاست کی ساری سحر کاریاں بھلا بیٹھا تھا۔ جنگ کے بعد اس نے اپنے نظریے کو بھی ایک طرف رکھ دیا۔ وہ اپنی حکومت کا ایجنٹ بن گیا اور اس سے آگے کچھ نہ کر سکا۔ جہاں تک وینڈر رویلڈے کا تعلق تھا، انٹرنیشنل کے بڑے گروہوں میں وہ سب سے کم اہمیت کا مالک تھا۔ وہ اس لیے انٹرنیشنل کا چیئرمین چیئرمین منتخب ہو گیا کہ نہ تو کوئی جرمن اور نہ ہی کوئی فرانسیسی یہ عہد حاصل کر سکتا تھا۔ ایک نظریہ ساز کی حیثیت سے وہ صرف ایک مدون کا درجہ رکھتا تھا۔ وہ مختلف سوشلسٹ نقطہ ہائے نظر میں اپنی جگہ بنانے میں لگا رہا، جیسے اس کی حکومت عظیم طاقتوں کے اندر جگہ بنانے میں لگی ہوئی تھی۔ روسی مارکسسٹوں میں اس کی کبھی کوئی امتیازی حیثیت حاصل نہ ہو سکی۔ ایک مقرر کی حیثیت سے وہ ایک اوسط درجے کا اچھا مقرر تھا۔ جنگ چھڑی تو وہ انٹرنیشنل کی چیئرمین شپ چھوڑ کر

حکومت کا وزیر بن گیا۔ میں اپنے پیرس کے اخبار میں اس کی خبر لیتا رہتا تھا۔ وہ مجھے تنگ کرنے کی خاطر روسی انقلابیوں سے زاریت کی مطابقت پیدا کرنے کی اپیل کرتا رہتا تھا۔ میرا خیال تھا اب وہ پیٹروگراڈ اس لیے جارہا تھا کہ اتحادیوں کی صفوں میں زاریت کی جگہ روسی انقلاب کو دلا سکے۔ ٹرین میں ہم تینوں خاموش بیٹھے رہے۔ ہمارے درمیان کہنے کو کچھ نہیں تھا۔

فن لینڈ کے بارڈر پر بلوسٹروف کوسٹیشن پر متحدہ انٹرنیشنلسٹ اور بالشویکوں کی مرکزی کمیٹی کے وفد نے ہمارا استقبال کیا۔ منشویکوں کی طرف سے کوئی نہیں آیا تھا۔ اور نہ ہی ان کے انٹرنیشنلسٹ بازو کی طرف سے (مارٹوف وغیرہ کی جانب سے) میں نے اپنے دوست یوریٹز کی سے بغل گیر ہوا جسے میں صدی کے آغاز میں سائبیریا میں ملا تھا۔ وہ سکنڈے نیویا کے لئے ''ناشے سلوو'' کا مستقل نمائندہ تھا اور جنگ کے زمانے میں اس کی وساطت سے روس میں ہمارا رابطہ قائم تھا۔ بلوسٹروف پر ملاقات کے ایک سال بعد یوریٹز کی کو ایک نوجوان سوشلسٹ انقلابی نے قتل کر دیا☆ میں کاراخان کو پہلی مرتبہ استقبالیہ کمیٹی کے وفد میں ملا تھا۔ بعد میں وہ نامور روسی سفارت کار بن گیا۔ بالشویکوں کی نمائندگی لوہے کا ایک کاریگر خود وروف کر رہا تھا جو جلد ہی بعد میں پیٹروگراڈ سوویٹ میں کارکنوں کے سیکشن کا چیئر مین بن گیا تھا۔ پیٹرو گراڈ میں فنس ٹرمینل پر ہمارا زبردست استقبال کیا گیا۔ یوریٹز کی اور فیدوروف نے تقریریں کیں جن کے جواب میں میں نے

☆سوشلسٹ انقلابی پاپولسٹ تحریک کے بائیں بازو کی نمائندگی کرتی تھی۔ یہ سوشلسٹ ڈیموکریٹوں اور مارکسسٹوں سے عمومی طور پر اس لیے مختلف تھی کہ یہ پرولتاریہ اور کسانوں کے مفادات میں تمیز روا رکھتی تھی اور زار حکومت کے خلاف دہشت پسندانہ طریقوں پر اصرار کرتی تھی۔ (مترجم)

ایک دوسرے انقلاب کی تیاری پر زور دیا جو ہمارا اپنا انقلاب ہونا تھا۔ انہوں نے جب اچانک مجھے ہوا میں اٹھا لیا تو مجھے ہالی فکس یاد آ گیا۔ وہاں بھی میں اسی قسم کے تجربات سے دوچار ہوا تھا۔ لیکن اس دفعہ ہاتھ دوستوں کے تھے۔ ہمارے چاروں طرف جھنڈے اور بینر تھے۔ میں اپنی بیوی کا تمتماتا ہوا چہرہ اور بیٹوں کے زرد پڑتے ہوئے چہروں کی طرف دیکھ رہا تھا جنہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ خوشی کا موقع تھا یا غم کا۔ وہ ایک مرتبہ بھی انقلاب سے دھوکہ کھا چکے تھے۔

پلیٹ فارم کے آخر پر عین میرے پیچھے ڈی مان اور وینڈ رویلڈے ہوئے تھے۔ وہ دانستہ عقب

میں بیٹھے تھے کہ کہیں ہجوم میں مل نہ جائیں۔ نئے روسی وزیر نے اپنے بیلجیئم کے ساتھیوں کے لئے کسی استقبالیہ تقریب کا اہتمام نہیں کیا تھا۔ وینڈ رویلڈے اس سے پہلے کیا تار رہا تھا، اس کی یاد ہر ذہن میں ابھی تک تازہ تھی۔

سٹیشن کے استقبالیہ کے فوراً بعد میں ایک ایسے گرداب میں پھنس گیا جس میں آدمی اور واقعات مجھے پانی کے تیز دھارے کے میں تنکے کی طرح بہاتے چلے گئے۔ بے حد اہم واقعات اب دھندلا رہے ہیں کہ میرا ذہن ان کی یادوں کی شدت کا متحمل نہیں ہو سکا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں سٹیشن سے سیدھا سوویٹ کی مجلس عاملہ کی میٹنگ میں چلا گیا تھا۔ شدیز جو اس وقت کمیٹی کا چیئر مین تھا، اس نے بڑے خشک انداز میں مجھے خوش آمدید کہا۔ بالشویکوں نے تحریک پیش کی کہ 1905 میں سوویٹ کا چیئر مین ہونے کی حیثیت سے مجھے کمیٹی کا رکن چن لیا جائے۔ اس تحریک سے کمیٹی پریشانی کا شکار ہو گئی۔ منشویک اور پالولسٹ کانا پھوسی کرنے لگے۔ اس وقت تمام انقلابی اداروں میں ان کی اکثریت تھی۔ آخر مجھے بطور مشیر رکھ لین کا فیصلہ کیا گیا۔ مجھے کالی چائے اور ڈبل روٹی کے ساتھ رکنیت کا کارڈ دے دیا گیا۔

ہمارے بیٹے جس انداز میں پیٹروگراڈ کی سڑکوں پر روسی زبان بول اور دوکانوں کے سائن بورڈ پڑھ رہے تھے، ہمیں اس پر خوشی اور حیرت کا ملا جلا احساس ہو رہا تھا۔ ہمیں دارالحکومت سے نکلے دس برس ہو چکے تھے۔ ہمارا بڑا بیٹا اس وقت بمشکل ایک سال کا تھا چھوٹا بیٹا ویانا میں پیدا ہوا تھا۔

پیٹروگراڈ کا گیریژن بہت وسیع تھا مگر اس میں زیادہ سختی نہیں برتی جاتی تھی۔ سپاہی مارچ کرتے وقت انقلابی گیت گا رہے تھے۔ ان کی ٹوپیوں پر سرخ ربن لہراتے دکھائی دیتے تھے۔ یہ کوئی ناقابل یقین خواب تھا۔ ٹرام کاریں سپاہیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ بڑی سڑکوں پر فوجی پریڈ جاری تھی۔ سپاہی رائفلیں پکڑے ایک قطار میں چلتے اور پھر پیچھے مڑ جاتے۔ جنگ کا خوفناک عفریت ابھی تک انقلاب کے پیچھے کھڑا اس پر اپنا سایہ ڈال رہا تھا لیکن عوام کا جنگ پر سے اعتبار اٹھ گیا تھا۔ جنگ اس لیے جاری تھی کہ اسے روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ یہ ناگزیر ہو چکی تھی، یہ بات سمجھنے والا کوئی نہیں تھا۔ ''انقلابی جمہوریت'' کے نام نہاد راہنما بھی کیونکہ وہ ملکوں کے باہمی تعلقات خراب کرنے سے ہلاکت ناک حد تک خوفزدہ تھے۔

میں کرنسکی کو بالکل نہیں، تزرتلی کو تھوڑا سا اور شدیز کو خاص حد تک جانتا تھا۔ سکوبی لوف میرا پرانا شاگرد تھا۔ چرنوف سے بیرون ملک میرے کئی تقریری مقابلے ہوتے رہے تھے۔ گوتز سے میں پہلی مرتبہ

ملا تھا۔ یہ سوویت جمہوریت کا حکمران گروہ تھا۔ تزرتلی بلاشبہ دوسرے سے بہت بہتر تھا۔ میں اسے 1907 میں لندن کانگریس کے موقع پر پہلی مرتبہ ملا تھا۔ اس وقت وہ دوسرے ڈوما میں سوشل ڈیموکریٹک فریق کی نمائندگی کر رہا تھا۔ ان ابتدائی دنوں میں بھی وہ ایک شاندار مقرر تھا جس کی اخلاقی برتری بڑی پُراثر تھی۔ سائبیریا میں اس کے سخت محنت کے دنوں نے اس کی سیاسی حاکمیت میں اضافہ کیا تھا۔ اس نے یک پختہ خیال آدمی کی حیثیت سے انقلابی حلقے میں واپس آ کر اپنے ساتھیوں اور اتحادیوں کی پہلی صف میں جگہ بنالی تھی۔ میرے مخالفوں میں ایک ایسا شخص تھا جس سنجیدگی سے لینے کی ضرورت تھی۔ لیکن جیسا کہ اکثر تاریخ میں ہوتا ہے، انقلاب نے ثابت کر دیا کہ تزرتلی انقلابی نہیں تھا۔ کسی کنجلک میں پڑنے سے بچنے کے لئے روسی انقلاب کو فقط روسی نقطہ نظر سے نہیں بلکہ عالمی زاویہ نگاہ سے دیکھنے کی ضرورت تھی۔ مگر تزرتلی نے اسے جارجیا اور دوسرے ڈوما میں اپنے تجربے کے پس منظر میں دیکھا۔ اس کا سیاسی نقطہ نظر بڑا تنگ اور تعلم ادبی لحاظ سے فالتو قسم کی ثابت ہوئی۔ وہ آزاد خیالی کی بے حد عزت کرتا تھا اور انقلاب کے بے پناہ امکانات کو ایک نیم تعلیم یافتہ بورژوا کی آنکھ سے دیکھتا اور ثقافت کی سلامتی کا بے حد فکرمند تھا۔ عوام اسے بتدریج ایک باغی ہجوم نظر آنے لگا۔ اس کے پہلے لفظ ہی سے میں نے جان لیا کہ وہ ایک دشمن شخص تھا۔ لینن اسے کند ذہن کہا کرتا تھا۔ یہ بڑا بے رحمانہ لقب تھا۔ تزرتلی ایک باصلاحیت مگر محدود نوعیت کا آدمی تھا۔

لینن کرنسکی کو ''بچارہ شیخی باز'' کہا کرتا تھا۔ اب بھی اس میں کسی ردوبدل کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ بڑا آگے آگے رہنے والا شخص تھا اور ابھی تک ایسا ہی ہے۔ تاریخی لمحے میں حکومت ہاتھ میں لینے کا شوقین۔ انقلاب کی طاقتور لہر نے ایسے ہیرو اپنے اوپر بٹھائے ہوئے ہیں جن کی اپنی ہی ایک چمک دمک ہوتی ہے مگر عوام نے انہیں پہچانا نہیں ہوتا۔ کرنسکی پادری گوپان اور خرستل یوف کا پیروکار نکلا۔ وہ حالات کی پیداوار تھا اور واقعات کے دھارے میں اتفاقیہ داخل ہو گیا تھا۔ اس کی تقریریں پانی کا ایک ریلا ہوتی تھیں۔ 1917 میں اس پانی میں ابال آ گیا اور یہ بھاپ کا بادل بن گیا۔ اسی بادل کے کناروں پر وہ روشنی کے ایک ہالے مانند چمکتا رہا۔

سکوبیلیف جب ویانا میں ایک طالبعلم تھا تو وہ میری راہنمائی میں سیاست میں داخل ہوا۔ وہ ''پراودا'' کا ادارتی بورڈ چھوڑ کر کوہ قاف چلا گیا تا کہ چوتھے ڈوما کے انتخاب میں اپنی قسمت آزما سکے۔

وہاں وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ ڈوما میں وہ منشویکوں کے زیر اثر آ گیا۔ فروری انقلاب میں وہ ان کے ساتھ تھا۔ عرصے سے ہمارے درمیان کوئی رابطہ نہیں تھا۔ وہ مجھے پیٹروگراڈ میں نیا نیا وزیر محنت کی حیثیت سے ملا اور مجلس عاملہ کے اجلاس میں بڑے والہانہ انداز میں میری طرف آیا اور پوچھا کہ یہ جو سب کچھ ہو رہا تھا، اس کے بارے میں میرا خیال تھا۔ ''ابھی تو تمہاری صلاحتیں چمکنی ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ میری یہ پیشین گوئی چھ ماہ درست ثابت ہوئی اور سکوبیلیف نے ہنس کر بعد میں مجھے یاد دہانی کرائی۔ اکتوبر انقلاب کی فتح کے فوراً بعد اس نے بالشویک ہونے کا اعلان کر دیا۔ لینن اور میں اسے پارٹی میں لینے کے مخالف تھے۔ اب وہ سٹالن کا آدمی ہے۔ ایسا ہوتا رہتا ہے۔

مجھے اور میری بیوی بچوں کو کیف ہوسٹل میں بڑی مشکل سے رہنے کو ایک کمرہ ملا۔ دوسرے دن ایک بارعب نوجوان افسر مجھے ملنے آیا۔ ''آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟ میں واقعی ایسا نہیں کر سکا تھا۔'' جناب میں لوگی نوف ہوں۔'' اس نوجوان افسر کو دیکھ کر مجھے 1905 کا ایک لوہار یاد آ گیا۔ وہ ہمارے لڑاکا یونٹ کا ایک رکن تھا۔ وہ سڑکوں پر پولیس سے لڑتا اور میرے بہت قریب ہوتا تھا۔ 1905 کے بعد مجھے معلوم نہیں کہ وہ کہاں چلا گیا تھا۔ بعد میں اس نے بتایا کہ وہ پرانا لوگی نوف نہیں رہا تھا بلکہ ٹیکنالوجی انسٹیٹیوٹ کا ایک طالبعلم بن گیا تھا اس کا تعلق ایک کھاتے پیتے گھرانے سے ہو گیا اور اس نے اپنا نام سری بروسکی رکھ لیا تھا۔ وہ جوانی میں محنت کشوں کے ساتھ وابستہ رہا تھا۔ 1905 کے انقلاب کی ناکامی کے بعد وہ انجینئر بن گیا اور انقلاب سے قطع تعلق کر لیا۔ جنگ کے دنوں میں وہ پیٹروگراڈ کے دو بڑے پلانٹوں کا ڈائریکٹر تھا۔ فروری انقلاب نے اسے اس کا ماضی یاد دلا دیا تھا۔ اسے اخبارات کے ذریعے میری واپسی کا پتہ چل گیا تھا۔ وہ مجھے اور میرے کنبے کو بلا تاخیر اپنے ساتھ چلنے کو کہہ رہا تھا۔ تھوڑی ہچکچاہٹ کے بعد ہم رضامند ہو گئے۔

ڈائریکٹر بننے کے بعد سری بروسکی اور اس کی بیوی کو حکومت کی طرف سے ایک بڑا اپارٹمنٹ مل گیا تھا۔ ان کا کوئی بچہ نہیں تھا۔ وہاں ہر چیز ہماری منتظر تھی۔ نیم فاقہ کشی اور شکستہ شہر میں ہم خود کو جنت میں محسوس کرنے لگے۔ لیکن سیاست میں چیزیں بڑی جلدی بدل جاتی ہیں۔ سری بروسکی ایک محبّ الوطن تھا۔ اسے احساس ہونے لگا کہ وہ بالشویکوں سے نفرت کرتا تھا اور لینن ایک جرمن ایجنٹ تھا۔ سب سے پہلے تو اسے میری مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر باہر بھی اس کی مخالفت ہونے لگی۔ اب اس کے ساتھ ایک

گھر میں رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ اس کی خاطر مدارات ہمیں راس نہ آئی اور ہم وہاں سے دوبارہ کیف ہوسٹل میں اپنے کمرے میں منتقل ہو گئے۔ چند دنوں بعد وہ ہمارے بیٹوں کو دوبارہ اپنے گھر لے گیا۔ ان کی چائے سے خاطر تواضع کی۔ میرے بیٹوں نے بڑی خوشی اور گرم جوشی سے اسے لینن کی اس تقریر کے بارے میں بتایا جو انہوں نے ایک عوامی جلسے میں سنی تھی۔ ان کے چہرے تمتما رہے تھے۔

''لیکن لینن تو ایک جرمن جاسوس ہے۔'' ان کے میزبان نے کہا۔

یہ کیا؟ کیا کوئی ایسے لفظ کہہ سکتا تھا؟ لڑکے چائے وغیرہ چھوڑ کر کھڑے ہو گئے۔

''ایسا کہنا بڑی غلط بات ہے۔'' بڑے بیٹے نے کہا۔ وہ مناسب الفاظ کی تلاش میں تھا۔ ان کا میزبان ناراض ہو گیا اور یوں ان کی دوستی ختم ہو گئی۔ اکتوبر انقلاب کی فتح کے بعد میں نے سری برووسکی سے کہا کہ وہ سوویٹ کے کام میں شامل ہو جائے۔ سوویٹ سروس اسے بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح کمیونسٹ میں لے آئی۔ آج کل وہ سٹالن کی پارٹی کی مرکزی کمیٹی کا رکن اور اس کی حکومت کا بڑا استون ہے۔ اگر 1905 میں وہ ایک پرولتاری بن سکتا تھا تو بالشویکوں کے ساتھ آنا اس کے لئے کیا مشکل تھا۔ بات میری سمجھ سے آگے کی تھی۔

جولائی کے دنوں کے بعد جن کا ذکر میں بعد میں کروں گا، پیٹروگراڈ کی سڑکیں اور گلیاں بالشویکوں کے خلاف بہتانوں اور الزام تراشیوں سے بھر گئیں۔ کرنسکی حکومت نے مجھے گرفتار کر لیا۔ اور یوں جلاوطنی سے واپسی کے دو ماہ بعد میں نے خود کو کرسٹی کے جانے پہچانے قید خانے میں پایا۔ ایمہرسٹ کے کرنل مورس نے اخبارات میں میری گرفتاری کی خبر بڑے اطمینان سے پڑھی ہو گی۔ وہ اکیلا ہی نہیں اس کے اطمینان میں اور لوگ بھی شامل ہوں گے۔ گھر پر میرے بیٹے بڑے غیر مطمئن تھے۔ یہ کس قسم کا انقلاب تھا۔ وہ ماں سے ملامت بھرے لہجے میں پوچھتے۔ باپ کو پہلے فوجی نظر بندی میں اور اب جیل میں ڈال دیا گیا تھا۔ یہ سب کیا تھا؟ ماں نے انہیں بتایا کہ یہ حقیقی انقلاب نہیں تھا۔ لیکن تشکیک ان کے دلوں میں گھر بنا چکی تھی۔

''انقلابی جمہوریت'' کی قید سے رہائی کے بعد ہم ایک بڑی بورژوا عمارت کے ایک چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں کرائے پر رہنے لگے۔ یہ عمارت ایک آزاد خیال صحافی کی بیوہ کی تھی۔ اکتوبر انقلاب کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ مجھے پیٹروگراڈ سوویٹ کا چیئرمین بنا دیا گیا تھا۔ پریس نے ہر ممکن طریقے سے مجھ

پر حملے شروع کر دیے۔ ہم ہر روز دشمنی اور نفرت میں گھرتے جا رہے تھے۔ ہماری باورچن آنا اوسی پوفنا جب ''ہاؤس کمیٹی'' میں راشن وغیرہ لینے جاتی تو اسے دوسری عورتوں کے لعن طعن کا نشانہ بننا پڑتا۔ میرے بڑے بیٹے کا سکول میں مذاق اڑایا جاتا اور اسے ''چیئر مین'' کہا جاتا۔ جب میری بیوی کام سے واپس آتی تو عمارت کا نگران اسے نفرت بھری نظروں سے دیکھتا۔ زینہ چڑھنا ایک عذاب بن گیا تھا۔ ہماری مالکہ مکان فون پر ہم سے پوچھتی رہتی کہ اس کا فرنیچر کیا ابھی تک ٹوٹ پھوٹ سے بچا ہوا تھا۔ مگر ہم کہاں جاتے؟ شہر میں کوئی اور خالی مکان نہیں تھا۔

صورتحال بتدریج ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ پھر ایک دن میرے گھر کا گھیراؤ ایک دم ختم ہو گیا جیسے کسی طاقتور ہاتھ نے اسے ہٹا دیا تھا۔ اب جب کبھی عمارت کا نگران میری بیوی سے ملتا تو وہ اسے بڑے آداب سے جھک کر سلام کرتا۔ ہاؤس کمیٹی میں ہماری باورچن کو اب راشن کسی تاخیر کے بغیر ملنے لگا۔ اب کوئی ہمارے منہ پر دروازہ بند نہیں کرتا تھا۔ یہ تبدیلی کیسے آ گئی تھی؟ اس میں کس جادوگر کا ہاتھ تھا؟ وہ جادوگر نکولائی مارکن تھا مجھے اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ بتانا پڑے گا۔ کیونکہ یہ مارکن ہی تھا جس کی وساطت سے اکتوبر انقلاب فتح سے ہم کنار ہوا تھا۔

مارکن بالٹک کی بحری فوج میں ایک جہاز ران تھا۔ وہ توپچی تھا۔ اور ایک بالشویک بھی۔ شروع میں اسے اپنے بارے میں بھی کچھ معلوم نہیں تھا۔ آگے کی طرف بڑھنا اور پہل کرنا اس کی فطرت نہیں تھی۔ وہ کوئی مقرر بھی نہیں تھا لفظ بڑی مشکل سے اس کی زبان پر چڑھتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ شرمیلا اور کاہل الوجود بھی تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ کاہلی اس کے وجود میں رچی ہوئی تھی۔ وہ بڑا خشک مزاج تھا۔ جب اس نے میرے کنبے کی دیکھ بھال کی ذمہ داری لے لی تو میں اسے بمشکل جانتا تھا۔ وہ میرے بیٹوں کو باہر لے کر جاتا۔ انہیں چائے پلاتا۔ کسی کنٹین سے سینڈوچ کھلاتا اور انہیں وہ ساری خوشیاں مہیا کرتا جن کا ان تاریک دنوں میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ کسی تکلف کے بغیر ہمارے گھر آ جاتا اور پوچھتا رہتا کہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک تو تھا۔ مجھے اس کی موجودگی کا کبھی احساس نہیں ہوا تھا۔ میرے بیٹوں اور ہماری باورچن اوسی پوفنا سے اسے معلوم ہوا کہ ہم دشمنوں میں گھیرے ہوئے تھے۔ مارکن جہاز رانوں کے ایک گروہ کے ساتھ نگران اعلیٰ اور ہاؤس کمیٹی کو ملا۔ اس نے یقیناً کوئی بہت اچھے الفاظ استعمال کیے ہوں گے کہ ہمارے اردگرد کی ہر چیز اچانک تبدیل ہو گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ اکتوبر انقلاب سے پہلے میں جس

عمارت میں رہتا تھا وہاں پرولتاریہ کی آمریت قائم تھی۔ بعد میں مجھے اپنے بچوں کی وساطت سے معلوم ہوا کہ مارکن جوان کا دوست بن چکا تھا، اس کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا تھا۔

جب سوویت پر بالشویکوں کا قبضہ ہو گیا تو بالشویکوں کی مخالفت مرکزی مجلس عاملہ نے سوویت کو کسی اخبار سے محروم کرنے کی خاطر سارے میڈیا کی حمایت حاصل کر لی۔ ہمیں ایک نئے اخبار کی ضرورت تھی۔ میں نے مارکن سے مشورہ طلب کیا، وہ نجانے کہاں غائب ہو گیا۔ اخبار کے مالکوں سے ملتا رہا اور چند دنوں میں اس نے ہمارے لئے ایک اخبار کا انتظام کر دیا۔ ہم نے اس اخبار کا نام ''کارکن اور سپاہی'' رکھا۔ مارکن اخبار کو ٹھیک طرح چلانے کے لئے دن رات کام کرتا رہتا۔ اکتوبر انقلاب کے خطرناک دنوں میں اس کا مضبوط جسم اور سنولایا ہوا چہرہ ہر نازک لمحہ پر دکھائی دیتا۔ وہ مجھے صرف یہ بتانے کے لئے آتا رہتا کہ ہر کام طریقے سے ہو رہا تھا۔ اور پوچھتا کیا مجھے کسی چیز کی ضرورت تھی؟ وہ اپنا دائرہ وسیع کر رہا تھا اور پیٹروگراڈ میں پرولتاریہ کی آمریت مضبوط کرنے میں مصروف تھا۔

لچے لفنگوں اور بھوکے ننگوں نے شراب کے بڑے بڑے سٹور لوٹنے شروع کر دیے۔ اس خطرناک تحریک کے پیچھے کچھ ایسے ہاتھ تھے جو انقلاب کو شراب کے شعلوں میں جلا دینا چاہتے تھے۔ مارکن کو ایک دم خطرے کا احساس ہو گیا اور وہ اس سے مقابلہ کرنے نکل پڑا۔ اس نے شراب کی دوکانوں کی اس وقت حفاظت کی جب یہ کام بڑا مشکل تھا۔ وہ اپنے لمبے لمبے بوٹوں میں شراب کی دکانوں میں شراب کی بوتلوں کی حفاظت کرتا رہتا لیکن ٹوٹی ہوئی بوتلوں سے بہتی ہوئی شراب گلیوں میں سے ہوتی ہوئی دریائے نیوا میں آ کر برف پر جم جاتی۔ شراب کے شیدائی نالیوں میں منہ ڈال کر شراب پیتے رہتے۔ مارکن پستول ہاتھ میں لیے اکتوبر انقلاب کی حفاظت کرتا رہتا۔ شراب میں مکمل طور پر بھیگا اور اس کی بو میں لتھڑا ہوا وہ گھر واپس آتا جہاں میرے دونوں بیٹے سانس روکے اس کے انتظار میں ہوتے۔ مارکن نے ردِ انقلاب کی کوشش کا مقابلہ شراب کی بو سے مقابلے کی طرح کیا۔

جب مجھے وزارت خارجہ کا سربراہ بنایا گیا تو میرا خیال تھا کہ میرے لیے کام کرنا بہت مشکل ہو گا۔ نائب وزیر سے ٹائپسٹ تک ہر کوئی میرے خلاف سازش میں مصروف تھا۔ فائلیں الماریوں میں بند کر کے چابیاں گنوا دی گئی تھیں۔ میں نے مارکن کو بلایا جو راست اقدام کا راز جانتا تھا۔ اس نے دو تین سفارت کاروں کو چوبیس گھنٹے کے لئے کمروں میں بند کر دیا۔ اگلے دن مارکن نے چابیاں میرے سامنے

رکھ دیں اور مجھے دفتر خارجہ آنے کی دعوت دی۔ میں سمولنی میں انقلاب کے کام میں مصروف تھا اور میرے پاس دفتر خارجہ جانے کا وقت نہیں تھا۔ لہٰذا میں نے مارکن کو قائم مقام وزیر خارجہ بنا دیا۔ وہ اپنا کام بڑی جلدی سیکھ گیا۔

اس نے نک چڑھے اہلکاروں کو باہر نکال دیا۔ دفتر کی ترتیب نو کی۔ سفارت کاروں کے سامان میں جو ناجائز آشیا آتی تھیں انہیں ضبط کر کے ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیں۔ محافظ خانے سے بے حد خفیہ دستاویزات نکلوائیں اور انہیں اپنی ذمہ داری پر شائع کروایا۔ مارکن کے پاس کوئی تعلیمی سند نہیں تھی۔ اور نہ ہی اس کی تحریر غلطیوں سے خالی تھی۔ اس کا تبصرہ بعض اوقات غیر متوقع ہوتا تھا۔ لیکن مجموعی طور پر جہاں ان کی سخت ضرورت تھی۔ بیرن بون، کوہل مان اور کاونٹ زرنن اس کے کتابچے برسٹ ــــ لٹووسک جیل میں بڑے شوق سے پڑھتے رہتے تھے۔

پھر خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ مارکن نے کئی شگاف پر کر دیے۔ مارکن نے مشرقی علاقے میں دریائے وولگا پر نیوی کی کمان سنبھال لی اور دشمن کو دور تک پیچھے دھکیل دیا۔ جب مجھے معلوم ہوتا کہ نازک اور خطرناک مواقع پر مارکن موجود تھا تو مجھے اطمنانیت کے ساتھ سکھ کا سانس لینے کی مہلت مل جاتی۔ لیکن اس کا وقت آ گیا تھا۔ کاما کے محاذ پر دشمن کی ایک گولی نے اس مضبوط جہاز ران کے پاؤں لرزا دیے۔ جب مجھے اس کی موت کا تار ملا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی بہت بڑا ستون دھڑام سے گر پڑا تھا۔ اس کی تصویر میرے بیٹوں کی میز پر پڑی تھی جس میں اس کی جہاز رانوں والی ٹوپی میں سرخ ربن لگا ہوا تھا۔

میرے سامنے اچانک دو زرد چہرے ایک دم مسخ ہو گئے۔ ''بیٹو! میرے بیٹو مارکن مر گیا ہے'' نکولائی کی ان کے ساتھ بڑی دوستی تھی۔ اس نے انہیں اپنی زندگی کے واقعات، بھید اور منصوبے بتا کر بڑا ولولہ خیز بنا رکھا تھا۔ اس نے ایک دفعہ اپنی آنکھوں میں آنسو بھر کر میرے چھوٹے نو سالہ بیٹے سروزا کو بتایا تھا کہ جس عورت سے اس نے شدت سے پیار کیا تھا، عرصہ ہوا وہ اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ بعض اوقات اس کی اداسی اور مایوسی کی وجہ تھی۔ سروزا نے آنسو بھری آنکھوں سے یہ بات اپنی ماں کو بتائی تھی۔ یہ نرم مزاج دوست جس نے میرے بیٹوں کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا تھا، جیسے وہ اس کے ہم عمر تھے ایک بحری بھیڑیا ہونے کے علاوہ ایک انقلابی بھی تھا، ایک سچا بہادر جو آپ کو پریوں کی کہانیوں میں ملتا ہے۔ کیا یہ واقعی سچ تھا کہ وہ مارکن جس نے میرے بیٹوں کو وزارت خارجہ کے تہہ خانے میں ریوالور چلانا سکھایا تھا

اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا؟ رات کی تاریکی میں دو ننھے معصوم بدن اپنے بستروں میں لپٹے کمبلوں میں منہ چھپائے خاموشی سے ہچکیاں لیتے رہے۔ان کی ہچکیوں کی آواز ان کی ماں تک آ رہی تھی۔

میری زندگی بڑے بڑے جلسے جلسوں کا بھنور بن کر رہ گئی۔جب میں پیٹروگراڈ پہنچا تو میں نے دیکھا کہ سارے مقرروں کی آوازیں رندھ چکی تھیں اور وہ بے آواز ہو چکے تھے۔1905 کے انقلاب نے مجھے اپنی آواز کی حفاظت کرنا سکھا دی تھی۔اور یہی وجہ تھی کہ میں کبھی اپنے آپ سے باہر نہیں ہوا تھا۔ہر جگہ جلسے ہو رہے تھے،سڑکوں پر،چوراہوں میں،سکولوں میں،کالجوں میں،تھیٹروں میں اور صنعتی اداروں میں۔میں تھکا ٹوٹا عموماً آدھی رات کو گھر لوٹتا تھا۔آدھی نیند کی حالت میں بھی دشمن کے خلاف میرے ذہن میں بہترین دلائل در آتے تھے۔صبح کے سات بجے یا اس سے دروازے پر کوئی پوشیدہ طاقت ایک دم ابھر کر سامنے آ جاتی اور کہیں کسی نہ کسی میٹنگ میں جانا پڑ جاتا۔ہر دفعہ مجھے ایسے محسوس ہوتا جیسے میری ہمت جواب دے جائے گی۔ایسے موقعہ پر کوئی پوشیدہ طاقت ایک دم ابھر کر سامنے آ جاتی اور میں گھنٹہ دو گھنٹے متواتر بولتا چلا جاتا۔اس وقت مجھے دوسرے اضلاع سے آئے ہوئے پارٹی کے کارکنوں اور نمائندوں نے گھیرے میں لیا ہوتا۔میں نے ان کے علاقوں میں بھی تقریر کے لئے جانا تھا جو گھنٹوں سے میرے منتظر ہوتے تھے۔وہ لوگ نئے لفظ سننے کے کس قدر مشتاق تھے۔

ماڈرن سرکس میں بڑے بڑے جلسے میرے لئے خاص اہمیت کے حامل تھے۔میرے مخالفوں کے نزدیک بھی وہ بڑے جلسے تھے مگر وہ اسے کسی دوسری نگاہ سے دیکھتے تھے۔وہ ماڈرن سرکس کو میرا خاص قلعہ سمجھتے اور وہاں بولنے کی جرات نہ کرتے۔جب میں سوویت کے اجلاس میں مصالحت پسندوں پر حملہ آور ہوتا تو نعرے لگنے لگتے کہ ''یہ تمہارا ماڈرن سرکس نہیں ہے۔'' میں سرکس میں عموماً شام کے وقت یا رات گئے تقریر کرتا تھا۔میرے سامعین محنت کشوں،فوج کے سپاہیوں،محنت کرنے والی ماؤوں اور دارالحکومت کے آفتادگان خاک پر مشتمل ہوتے تھے۔سارا چوک بھر جاتا۔انسانی بدن ممکن حد تک سکڑ کر ایک دوسرے کے لئے جگہ بناتے رہتے۔نوعمر لڑکے اپنے باپوں کے کندھوں پر چڑھے ہوتے۔مائیں دودھ پیتے بچوں کو سینے سے لگائے ہوتیں،کوئی سگریٹ نہ پیتا۔اردگرد کے مکانوں کی بالکونیاں انسانی جسموں کے زیادہ بوجھ سے گرنے کے خطر میں مبتلا ہو جاتیں۔میں سٹیج پر پہنچنے کے لئے انسانوں کی ایک تنگ سرنگ میں سے گزر کر جاتا۔بعض اوقات مجھے ہاتھوں پر اٹھا کر سٹیج تک لے جایا جاتا۔لوگوں کے ہجوم اور سانسوں کی وجہ

سے ماڈرن سرکس کی فضا بھاری ہو جاتی۔ اور میرے آنے پر خاص قسم کے جذباتی نعروں سے بھر جاتی۔ میرے اردگرد کہنیوں، چھاتیوں اور سروں کا دباؤ بڑھتا چلا جاتا۔ جب میں تقریر کے دوران اپنا ہاتھ اوپر اٹھاتا تو وہ کسی نہ کسی دوسرے ہاتھ یا بدن سے چھو جاتا۔ پھر تشکر بھری کوئی آنکھ میرے طرف اٹھ جاتی جو کہہ رہی ہوتی کہ میرا ہاتھ لگنے سے اس نے برا نہیں منایا تھا اور میں اپنی تقریر جاری رکھوں۔ کوئی مقرر خواہ کتنا ہی تھکاوٹ سے چور ہو اپنے چاہنے والوں کی اتنی بڑی تعداد دیکھ کر تازہ دم ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات مجھے محسوس ہوتا جیسے میں اس بڑے ہجوم کے دل کی بات کہہ رہا تھا۔ ایسے مواقع پر میرے لاشعور کی تہہ میں چھپی ہوئی کئی باتیں ابھرا بھر کر سامنے آتی رہتیں اور یوں لگتا کہ میں اپنے آپ سے باہر کھڑا اپنے آپ کو سن رہا تھا۔ اور اپنے خیالوں کے ساتھ چلنے کی کوشش میں مصروف تھا۔

ماڈرن سرکس اسی قسم کا تھا۔ اس کی اپنی ہی خاصیتیں تھیں، آتشیں نرم و نازک اور ولولہ خیز___ نو مولود خاموشی سے ماؤں کی چھاتیاں چوستے رہتے جو خوشی اور ناراضی کے نعرے لگاتی رہتیں۔ سارا مجمع ہی نومولود بچوں کی طرح تھا جو خشک ہونٹوں میں انقلاب کی چوسنی کو پکڑے ہوئے تھا۔ لیکن یہ نومولود بڑی جلدی جوان ہو گیا۔

ماڈرن سرکس سے باہر آنا داخل ہونے سے کہیں زیادہ مشکل تھا۔ ہجوم اپنا نیا دریافت شدہ اتحاد توڑنے کو تیار نہ ہوتا منتشر ہونے سے انکار کر دیتا۔ باہر آنے کے لئے مجھے نیم بیہوشی کی حالت میں بہت سے بازوؤں اور سروں پر سے تیر کر آنا پڑتا۔ بعض اوقات ان میں میں دو چہروں کو پہچان جاتا۔ وہ میری بیٹیوں کے چہرے ہوتے جو قریب ہی اپنی ماں کے ساتھ رہتی تھیں۔ بڑی سولہ اور چھوٹی پندرہ سال کی تھی۔ میں ان کی محبت بھری آنکھوں کا جواب دینے، ان کے نزدیک جانے یا انہیں انے ساتھ لگا کر پیار کرنے یا ان کے گرم ہاتھ دبانے سے قاصر رہتا۔ درمیان میں آجانے والا ہجوم مجھے اسکی اجازت نہیں دیتا تھا۔ میں باہر آجاتا تو مجمع میرے پیچھے آنے لگتا۔ سڑکیں اور گلیاں نعروں اور پیروں کو زور زور سے زمین پر مارنے کی آوازوں سے بھر جاتیں۔ پھر کوئی دروازہ مجھ پر کھل جاتا مجھے اندر لے جاتا اور میرے پیچھے بند ہو جاتا۔ یہ سب کیا دھرا میرے دوستوں کا ہوتا تھا۔ وہ دروازہ رقاصہ شیسنسکایا کا کے محل کا ہوتا جسے زار نکولاس نے اس کے لئے تعمیر کیا تھا۔ بالشویکوں کے جنرل سٹاف نے اس پر قبضہ کر لیا تھا اور اب اس کے قیمتی صوفے اور دوسرا فرنیچر عام استعمال میں تھا اس کے شفاف فرش فوجیوں کے بوٹوں کی زد میں رہتے تھے۔

ہجوم چھٹنے تک میں وہاں بیٹھا رہتا اور پھر گھر چلا جاتا۔

جلسے کے بعد ویران سڑکوں پر اندھیرے میں چلتے ہوئے مجھے اپنے پیچھے قدموں کی آواز سنائی دیتی۔ گذشتہ رات اور اس سے پہلی رات بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ اپنے ریوالور پر ہاتھ رکھتے ہوئے میں تیزی سے مڑا اور چند پیچھے کی طرف چل کر کھڑا ہو گیا۔

''تم کیا چاہتے ہو؟'' میں نے سختی سے پوچھا۔ ایک پرخلوص چہرے والا نوجوان میرے کھڑا تھا۔

''آپ مجھے اپنی حفاظت کرنے کی اجازت دیں، سرکس میں آنے والے بعض لوگ آپ کے دشمن بھی ہیں۔'' وہ ایک طالب علم تھا جس کا نام پوزنسکی تھا۔ اس کے بعد وہ ہمیشہ میرے ساتھ ہوتا تھا۔ وہ انقلاب کا سارا عرصہ میرے ساتھ بڑے خاص خاص مواقع پر جاتا رہا اور بڑی ذمہ داری سے اپنا فرض نبھاتا رہا۔ وہ میرے ذاتی تحفظ کا ذمہ دار تھا۔ فوجی کارروائیوں کے دوران میں میرے انتظامی امور کا ذمہ دار بن جاتا۔ دوکانوں سے میرے لئے ضروری کتابیں لے کر آتا۔ جنگ کے لئے دستوں کو تیار کرتا اور خود بھی محاذ جنگ پر لڑتا۔ بعد میں وہ میرے دشمنوں کی صف میں شامل ہو گیا۔ اب وہ جلاوطنی کی زندگی گزار رہا ہے، مجھے امید ہے مستقبل ہمیں پھر اکٹھا کر دے گا۔ دسمبر کو ماڈرن سرکس میں لوگوں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے میں نے سوویت حکومت کی کارکردگی پر ایک رپورٹ پیش کی۔ میں نے زار اور کرنسکی کی حکومتوں کے دوران میں ہونے والی خط وکتابت کو شائع کرنے کی اہمیت کی وضاحت کی۔ میں نے اپنے وفادار سامعین کو بتایا کہ لوگ ایسے معاہدوں کے لئے اپنا خون نہیں بہاتے جو ان کی مرضی سے طے نہ پائے ہوں، جو انہوں نے پڑھے اور دیکھے نہ ہوں۔ اس پر سوویت کے اندر موجود مصالحت پسندوں نے مجھے ملامت کا نشانہ بناتے ہوئے کہا ''ہمارے ساتھ ایسی زبان میں گفتگو مت کرو یہ تمہارا ماڈرن سرکس نہیں ہے'' میں نے انہیں جواب دیتے ہوئے کہا ''مجھے ایک ہی زبان آتی ہے اور وہ ہے انقلاب کی زبان۔ میں یہ زبان عوامی جلسوں میں بولتا ہوں۔ یہی زبان میں اتحادیوں اور جرمنوں کے لئے استعمال کروں گا۔'' اخباروں کی رپورٹ کی مطابق اس موقع پر دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔ ماڈرن سرکس سے میرا رابطہ فروری میں ختم ہو گیا جب میں ماسکو چلا گیا۔

بہتان تراشیوں کے بارے میں

آغاز مئی 1917ء میں جب میں پیٹروگراڈ میں پہنچا تو اس وقت اس ''پراسرار کار'' کے متعلق چہ میگوئیاں زوروں پر تھیں جن میں لینن جرمنی کے راستے روس آیا تھا۔ جرمنی کے نئے سوشلسٹ وزرا برطانوی وزیراعظم الائیڈ جارج سے ملے ہوئے تھے جس نے لینن کو روس میں داخل ہونے سے روکا ہوا تھا۔ یہی ثبوت کی بنا پر میرے واپسی کے سفر نے تجربے نے لینن کے واپسی کے سفر کے تجربے کی تصدیق کر دی تھی۔ اس کے باوجود میں بہتان تراشی سے محفوظ نہ رہ سکا۔ بات بچانان نے شروع کی۔ وزیر خارجہ (اس وقت ملی کوف نہیں ترسے سکنچکو تھا) کے نام ایک کھلے خط میں میں نے بحرہ اوقیانوس میں اپنے سفر کی داستان بیان کی جو اس سوال پر ختم کی۔ ''جناب وزیر! کیا آپ یہ مناسب سمجھتے ہیں کہ ایک ایسا آدمی برطانیہ کی نمائندگی کا حقدار ہو جو ایک شرمناک حرکت کا مرتکب ہوا ہے اور اس نے اپنی حیثیت واضح کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہ کی ہو؟'' کوئی جواب نہ آیا۔ مجھے بھی جواب کی کوئی توقع نہیں تھی۔ لیکن ملی کوف نے ایک اتحادی سفیر کے دفاع میں جو کاغذات تیار کیے ان میں اس نے اپنی طرف سے میرا ہی الزام دہرایا تھا۔ پھر میں نے بہتان تراشیوں کی ہر ممکن حد تک نشاندہی کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ روسی سوویٹوں کی پہلی کل کانگریس کا اجلاس جاری تھا۔ 5 جون کو ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ میٹنگ کے اختتام پر میں ایک ذاتی بیان دینے کیلئے کھڑا ہو گیا۔ گورگی کا اخبار جو بالشویکوں کے خلاف تھا' اس نے اگلے روز میرے بیان کے متعلق اپنی اخباری رپورٹ ان لفظوں پر ختم کی۔

''ملی کوف نے ہم پر الزام لگایا ہے کہ ہم جرمن حکومت کے تنخواہ دار ایجنٹ ہیں۔ میں ایمان دار روسی پریس سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ میرے صحیح الفاظ درج کرے۔ جب تک وہ ایسا نہیں کرے گا اس کے ماتھے پر گھٹیا بہتان تراشی کا لیبل چسپاں رہے گا۔''

اخبار نے اپنی رپورٹ جاری رکھی۔ ''تمام حاضرین نے ٹراٹسکی کی رپورٹ کا متفقہ طور پر بڑے جوش اور جذبے سے استقبال کیا۔ اور وہ کسی تفریق کے بغیر چند منٹ تک تالیاں بجاتے رہے۔ مم

کانگریس میں دس میں سے نو ہمارے مخالف تھے۔ لیکن یہ کامیابی آنے والے واقعات کی روشنی میں وقتی اور گریز پا ثابت ہوئی۔ پارلیمانی نظام میں اس قسم کی سچائیاں عموماً جھوٹی ثابت ہوتی ہیں۔ اگلے دن اخبار ''رچ'' (تقریر) نے آستین چڑھا کر یہ بیان شائع کیا کہ نیویارک میں ایک جرمن محب الوطن ''ورین'' نے عبوری حکومت کا تختہ الٹنے کیلئے مجھے دس ہزار ڈالر دیے تھے۔ یہ بڑی سادگی پر مبنی بات تھی۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ یورپ روانہ ہونے سے دو دن پہلے نیویارک میں مقیم جرمن محنت کشوں نے جنہیں میں گاہے بگاہے لیکچر دیتا رہتا تھا' میرے لئے ایک الوداعی تقریب منعقد کی جس میں میرے امریکی' روسی' لاطینی' یہودی' لتھونوی اور فنس دوست اور پیروکار موجود تھے۔تقریب میں روسی انقلاب کیلئے چندہ جمع کیا گیا۔کل ملا کر 310 ڈالر جمع ہوئے جن میں سے ایک سو ڈالر جرمن محنت کشوں نے تقریب کے منتظمین کی رضا مندی اور مشورے سے میں نے وہ 310 ڈالر ان روسی مہاجروں کو دے دیے جو میرے ساتھ روس واپس جا رہے تھے اور مالی تنگ دستی کا شکار تھے۔ یہ کہانی ہے ان دس ہزار ڈالروں کی۔ میں نے یہ قصہ 27 جون کو گورگی کے اخبار ''نوایازم'' میں ایک مضمون کی شکل میں اس اخلاقی اختتام کے ساتھ بیان کیا تھا:

''واقعہ کی وضاحت کے بعد میں بہتان تراشوں اور بلیک میل کرنے والوں کی اطلاع کیلئے عرض کرتا ہوں کہ میں نے زندگی میں کبھی دس ہزار ڈالروں کا دسواں حصہ بھی بیک وقت نہیں دیکھا۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ میرا اس قسم کا اعتراف ''کیڈٹ''* میں میری شہرت برباد کر دے گا۔لیکن میں نے آزاد خیال بورژوازی کی منظوری کے بغیر زندگی گزارنے کے خیال سے سمجھوتہ کر رکھا ہے۔

اس کے بعد بہتان تراشی کی کہانیاں دم توڑ گئیں۔ میں نے اس ساری تحریک کا لب لباب ''بہتان تراشوں کے نام'' ایک کتابچے کی صورت میں بیان کیا اور اسے اشاعت کیلئے پرنٹر کے پاس بھیج دیا۔ایک ہفتے کے بعد جولائی شروع ہو گیا اور 23 جولائی کو عبوری حکومت نے مجھے اس الزام میں گرفتار کر لیا کہ میں جرمن قیصر کا تنخواہ دار ملازم تھا۔اس کیس کی تحقیق زار کی حکومت کے گھاگ اور آزمودہ کار قانون دانوں کے ہاتھ میں آ گئی۔انہیں حقائق اور دلائل کو ایمانداری سے پرکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ یہ بڑا ہنگامہ خیز وقت تھا۔ جب مجھے پتہ چلا کہ میرے خلاف جھوٹے مواد کی بنا پر مقدمہ بنایا گیا تھا تو میں ان بے بس احمقوں کی حماقت سے لطف اندوز ہونے لگا۔ میں نے یکم ستمبر کو ابتدائی تفتیش میں مندرجہ ذیل بیان رقم کرایا۔

---

* دستوری جمہوری پارٹی جس کی بنیاد پروفیسر ملی کوف نے رکھی تھی' مقامی زبان میں ''کیڈٹ'' پارٹی کہلاتی تھی اور اس کے ارکان کو کیڈٹس کہا جاتا تھا۔ روسی زبان میں یہ اصطلاح آزاد خیالی کے مترادف سمجھی جاتی ہے۔(مترجم)

''یہ حقیقت ہے کہ اس کیس میں جو پہلی دستاویز پیش کی گئی ہے (کارپورل ہرمولینکو کا تحریری بیان جس پر استغاثہ نے سارے کیس کی بنیاد رکھی تھی اور اس میں محکمہ انصاف کے اہل کاروں نے اس کی مدد کی تھی) بلاشبہ دانستہ طور پر ایک خود ساختہ دستاویز سے متعلق سوالات اور حالت کو نظر انداز کیا ہے۔ اگر ان کا تجزیہ کیا جائے تو جو ثبوت میر مولینکو نے مہیا کیے ہیں وہ ناگزیر طور پر جھوٹ پر مبنی پائے جائیں گے۔ میر مولینکو کو میں بالکل نہیں جانتا۔ ان حالات کے پیش نظر میں اخلاقی اور سیاسی طور پر اس بات کا پابند ہوں کہ تفتیش کے عمل میں حصہ نہ لوں۔ میں یہ حق بھی رکھتا ہوں کہ اپنے خلاف الزامات کا کھلے طور پر عوام کے سامنے جواب دوں۔''

بعد میں جو بڑی واقعات منظر عام پر آئے انہوں نے میرے تفتیش کنندگان کو نہیں بلکہ پورے پرانے روس اور اس کے نئے ''ہیرو'' کرنسکی کو ہڑپ کرلیا۔

میرا خیال تھا کہ میں اس موضوع پر دوبارہ بات نہیں کروں گا لیکن ایک نیا ادیب پیدا ہوگیا اور وہ 1928ء میں اس موضوع کو دوبارہ زیر بحث لے آیا اور پرانے بہتان کی حمایت میں پھر سے نکل آیا۔ اس کا نام کرنسکی ہے۔ 1928ء میں انقلاب کے گیارہ برس بعد' جس نے اسے اپنے دھارے پر اٹھا کر دور کہیں پھینک دیا تھا' کرنسکی نے یقین دلانے کی کوشش کی کہ لینن اور دوسرے بالشویک جرمن حکومت کے ایجنٹ تھے' ان کا جرمن جنرل سٹاف سے رابطہ تھا' اس سے رقم حاصل کرتے تھے اور اس سے خفیہ ہدایات وصول کرکے روسی فوج کی شکست اور روسی ریاست کو توڑنے میں مصروف تھے۔ یہ سب کچھ اس نے اپنی دلچسپ کتاب* میں تحریر کیا ہے جس کی تفصیلات صفحہ 310-290 پر درج ہیں۔ 1917ء کے واقعات کو سامنے رکھتے ہوئے میں نے کرنسکی کے فکری اور اخلاقی رتبے کا ایک تصور اپنے ذہن میں قائم کرلیا تھا۔ لیکن یہ بات میرے ذہن میں کبھی نہیں آئی تھی کہ اس قدر وقت گزر جانے کے بعد وہ ان الزمات کو دہرانے کی حرکت کا مترکب ہوگا۔ مگر اس نے ایسا ہی کیا۔

وہ لکھتا ہے: ''جنگ کے دوران ایک نازک وقت پر لینن کی غداری ایک ناقابل تردید اور مسلمہ حقیقت ہے۔'' یہ ناقابل تردید حقائق کس نے مہیا کیے اور کب؟ کرنسکی ایک من گھڑت کہانی سے اس بات کا آغاز کرتا ہے کہ کس

----

*اوپر کے الزامات کرنسکی کی کتاب سے روسی زبان سے براہ راست ترجمہ کیے گئے ہیں۔صفحات کے نمبر بھی اسی کتاب کے ہیں۔اس کتاب کا انگریزی مس ترجمہ نیویارک سے ڈی' اپسلٹن اینڈ کمپنی نے شائع کیا ہے جس کا نام ''تباہی'' رکھا گیا ہے۔اس ترجمے میں یہ الزامات صفحہ 233-229 پر درج ہیں۔(مترجم)

طرح جرمن جنرل سٹاف نے روس کے جنگی قیدیوں میں سے جاسوس بھرتی کیے اور انہیں روسی فوج میں داخل کر دیا۔ان جاسوسوں میں سے ایک وہ حقیقی تھا یا فرضی (یہ انہیں خود بھی پتا نہیں ہوتا تھا) خود کرنسکی کے پاس گیا اور اسے جاسوسی کے پورے نظام کے متعلق اطلاعات فراہم کیں۔اب کرنسکی مایوسی کی حالت میں بتاتا ہے کہ ''ان انکشافات کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔'' بالکل ٹھیک۔اس کے اپنے کہنے کے مطابق کسی مہم باز نے اسے ناک کی سیدھ میں چلانے کی کوشش کی تھی۔کیا اس کہانی کا لینن یا بالشویکوں سے کوئی تعلق بنتا ہے؟ کہیں بھی نہیں کرنسکی کے اپنے کہنے کے مطابق اس کہانی کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔پھر اسے یہ سب کچھ بتانے کی کیا ضرورت تھی فقط اس لیے کہ اس نے آگے چل کر جو نقشہ بتانا ہے وہ اہم دکھائی دے۔اپنے مخبر کی طرح کرنسکی اپنے قارئین کو بھی ناک کی سیدھ میں چلانا چاہتا ہے۔

جیسا کہ وہ خود کہتا ہے اس کی پہلی کہانی کی کوئی اہمیت نہیں تھی' پھر ایک دوسرے ذریعے سے اسے ایک بڑی قیمتی اطلاع ملی جو شک وشبہ سے بالا ثابت ہوئی۔اطلاع یہ تھی کہ بالشویکوں کا جرمن جرنل سٹاف سے رابطہ تھا۔ذرا ان الفاظ پر غور کریں ''شک وشبہ سے بالاتر''۔آگے لکھتا ہے رابطے قائم کرنے کے ذرائع کو بھی ثابت کیا جا سکتا تھا۔یعنی ثابت ''کیا جا سکتا تھا۔'' یہ بھی ذومعنی ہے۔کیا رابطے قائم کئے گئے تھے؟ ہم ابھی بتاتے ہیں۔ذرا سے صبر کی ضرورت ہے۔اس انکشاف کو تخلیق کار کے دل کی گہرائیوں میں پکنے میں گیارہ برس لگ گئے۔

اپریل میں ایک یوکرانی افسر جس کا نام یارمویسنکو تھا' ہیڈ کوارٹرز میں جرنیل الیگثیف سے ملنے آیا۔ہم نیہ یہ نام سن رکھا تھا۔اس سارے قصے میں اس کا فیصلہ کن کردار ہے۔کرنسکی صحیح بات کہنے کی کوشش میں بھی صحیح بات نہیں کہہ سکا۔اس بدمعاش کا نام یارمویسنکو نہیں بلکہ * میرمویسنکو تھا۔مسٹر کرنسکی کی عدالت کے تفتیشی افسر نے اس کا یہی نام لکھا تھا۔

کارپورل ہرمویسنکو ایک جرمن ایجنٹ کے روپ میں اصلی جرمن ایجنٹوں کا انکشاف کرنے ہیڈ

کوارٹرآیا تھا۔اس عظیم محبّ الوطن نے جو بیان دیا اس سے پتا چلا کہ لینن تاریخ کی عظیم ترین ہستیوں میں ہونے کی بجائے جرمن حکومت کا ایک تنخواہ دار ایجنٹ تھا۔کارپول ریمیوینسکو کو یہ راز کیسے معلوم ہوا اور اس نے اس سلسلے میں کرنسکی کو کیا ثبوت مہیا کیے؟ ریمویسنکو کے اپنے بیان کے مطابق اسے یوکرائن میں علیحدگی پسندانہ پراپیگنڈا جاری رکھنے کی ہدایات موصول ہوئی تھیں۔کرنسکی لکھتا ہے''اسے کنٹرول کرنے والے جرمن نمائندوں سے رابطہ رکھنے کے ذرائع بتائے گئے تھے'اور انہی ذرائع سے اسے

----

*روسی زبان میں''یا''اور''زی''سے بڑا فرق پڑ جاتا ہے۔(مترجم)

ضروری فنڈز مہیا ہونے کے ساتھ دوسرے اہم ایجنٹوں کے نام بھی بتائے جاتے جن میں بعض یوکرانی علیحدگی پسند اور لینن بھی شامل تھا۔''

یہ سب اس''عظیم کتاب''کے صفحہ 96-295 پر حرف بہ حرف درج ہے۔ہمیں کم از کم یہ تو معلوم ہوگیا کہ جرمن جنرل سٹاف کا پانے جاسوسوں کے ساتھ کیسا برتاؤ تھا۔جب جاسوسی کیلئے جرمن جنرل سٹاف کو ایک بے نام اور نیم تعلیم یافتہ کارپورل مل گیا تو اس نے اسے تربیت کی خاطر اپنے کسی جونیئر افسر کی تحویل میں دینے کی بجائے براہ راست''کنٹرول کرنے والے جرمن نمائندوں''کی صوابدید پر رکھ دیا اور اسے جرمنی کے سارے جاسوسی نظام سے متعارف کرادیا۔اس کے علاوہ اسے یہ بھی بتادیا گیا کہ وہ اپنے خفیہ فنڈز کیسے استعمال کرتے تھے۔اس سے تو صاف یہ مطلب نکلتا ہے کہ جرمن جنرل سٹاف بے حد احمق اور کند ذہن تھا۔ممکن ہے ایسا نہ ہو مگر انہیں ایسا دکھایا گیا ہے'اور وہ بھی دو کارپورلوں کی وساطت سے۔ایک کارپورل ریمویسنکو اور دوسرا کارپورل کرنسکی۔

دیکھنے کی بات یہ ہے کہ بے نام اور نیم تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود کیا ریمویسنکو کو جرمن جاسوسی نظام میں کوئی اہم جگہ مل سکی تھی؟ کرنسکی نے ہمیں کچھ اسی قسم کا یقین دلانے کی کوشش کی ہے۔لیکن ہم کرنسکی ہی سے نہیں'اس کی کتاب کے ذرائع سے بھی واقف ہیں۔کرنسکی سے زیادہ ریمویسنکو سادہ لوح ہے۔اس مہم جو نے جس احمقانہ لہجے میں اپنا بیان دیا ہے اس سے اس کی قیمت کا پتہ چل جاتا ہے۔جرمن جنرل سٹاف نے اسے پندرہ سو روبل دیے جن کی قیمت اس زمانے میں خاصی گری ہوئی تھی۔اس رقم میں یوکرائن کی علیحدگی اور کرنسکی کی حکومت کا تختہ الٹنا بھی شامل تھا۔وہ بڑی خوش دلی سے اپنی گواہی میں بتاتا

ہے(جواب شائع شدہ شکل میں دستیاب ہے) کہ اس نے جرمنوں کی کنجوسی کی بڑی شکایت کی جو بے سود ثابت ہوئی۔ ''اتنی تھوڑی رقم''، لیکن اس کی کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ یرمویسنکو نے ہمیں یہ نہیں بتایا کہ کیا وہ اس معاملے میں جرمن حکومت کی بالائی سطح پر بھی گیا تھا کہ نہیں نہیں۔ اور اس کی ملاقات لنڈن ڈورف 'ہنسیڈن برگ یا خود ولی عہد قیصر سے ہوئی تھی کہ نہیں۔ وہ دانستہ طور پر اسے ''کنٹرول اور ہدایت دینے والے'' لوگوں کے نام بتانے سے گریز کرتا ہے جنہوں نے اسے سگریٹ اور شراب سفر کرنے اور روس کو توڑنے کیلئے پندرہ سو روبل دیے تھے۔ ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ رقم زیادہ تر شراب کی نذر ہوگئی ہوگی۔ برلن کے ایک بینک میں جمع کرانے کی ہدایت کے خلاف جب وہ رقم کارپورل کی جیب سے اڑنے لگی تو اس نے مزید حب الوطنی پر مبنی مدد حاصل کرنے کی غرض سے خود کو روسی جنرل سٹاف کے سامنے پیش کر دیا۔ عین ممکن ہے کہ جب وہ روسی جنرل سٹاف کی طرف جا رہا تھا تو راستے میں روسی خفیہ پولیس کے کسی افسر نے جس کی ڈیوٹی بالشویکوں کا پیچھا کرنے پر لگی ہوگی' اسے اپنے ساتھ لگالیا اور اس کے کہنے پر وہ کام کرنے لگا۔ نتیجتاً گارپورلوں کے ذہن میں دو خیال اٹے ہوں گے۔ ایک اس جرمن لفٹیننٹ کی کمینگی اور کنجوسی کا جس نے اسے پندرہ سو روبل سے زیادہ ایک کوپک نہیں دیا تھا۔ دوسرا' اسے ''کنٹرول کرنے والے جرمن نمائندوں'' کا جنہوں نے اسے جرمن خفیہ نظام میں شامل کر کے ایک بہت بڑا ''اعزاز'' بخشا تھا۔

مگر وہ ''چند علیحدگی پسند یوکرانی'' کون تھے جن کا انکشاف اس نے کرنسکی کے سامنے کیا تھا؟ کرنسکی کی کاتب اس بارے میں کچھ نہیں بتاتی۔ یرمویسنکو کے جھوٹوں کو وزن دینے کیلئے وہ چند اپنے جھوٹ بھی ان میں شامل کر لیتا ہے۔ یرمویسنکو نے فقط ایک علیحدگی پسند کا ذکر کیا ہے اور اس کا نام ہے سکوروپس۔آئی اور لتوخوسکی۔ لیکن کرنسکی اس نام کا کہیں ذکر نہیں کرتا۔ کیونکہ ایسا کرنے سے اسے یہ اعتراف کرنا پڑ جانا تھا کہ یرمویسنکو کے پاس انکشافات کیلئے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں تھا۔ آئی اولتوخوسکی کوئی ڈھکا چھپا نام نہیں تھا۔ جنگ کے زمانے میں یہ نام اخبارات میں آتا رہتا تھا۔ اس نے خود بھی جرمن جنرل سٹاف سے اپنے رابطے چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں نے 1914ء میں پیرس میں اپنے اخبار ''ناشے سلوو'' میں اس چھوٹے سے علیحدگی پسند یوکرانی گروہ کا ذکر کیا تھا جن کا جرمن فوجی حکام سے رابطہ تھا۔ میں نے آئی اولتوخوسکی کے علاوہ دوسرے علیحدگی پسندوں کے نام بھی لکھے تھے۔ لیکن ہمیں

یاد دلایا جاتا ہے کہ ان کے علاوہ لینن کا نام بھی اس زمرے میں آتا ہے۔ سمجھنے کی بات یہ ہے کہ علیحدگی پسندوں کا ذکر آخر کیوں کیا گیا تھا؟ یرمویسنکو کو تو خود علیحدگی پسندانہ پراپیگنڈہ کیلئے بھیجا جاتا تھا۔لینن کا نام درمیان میں کہاں سے آ گیا؟ کرنسکی اس بارے میں خاموش ہے۔ یہ نظر کی بھول چوک نہیں ہو سکتی۔

یرمویسنکو بغیر وجہ احمقانہ طور پر لینن کا نام درمیان میں گھسیٹ لایا تھا۔کرنسکی کو مسحور کرنے والا بطور تنخواہ دار جرمن ایجنٹ بھرتی ہوا' کیسے اس نے اپنے خفیہ فنڈ (پندرہ سو رل) میں اضافے کا مطالبہ کیا اور اسے کیسے اس کے مستقبل کے فرائض سے آگاہ کیا گیا۔یعنی جاسوسی کرنا اور پل وغیرہ اڑانا۔ پھر اس کے اپنے بیان کے مطابق اس نے آگے جو کچھ کہا ہے اس کا مرکزی کہانی سے کوئی تعلق نہیں بنتا۔اسے بتایا گیا (کس نے بتایا؟) کہ وہ روس میں کام کرے گا مگر ''اکیلا نہیں''۔لینن اور اس کے ساتھی بھی اس جیسا ہی وہاں کام کر رہے ہوں گے۔ یہ وہ ہے جو اس نے خود کہا ہے۔ یہ کیسی فضول بات لگتی ہے کہ ایک معمولی سے جاسوس کو ان قریبی تعلقات کا علم ہو جو لینن اور لنڈن ڈورف کے مابین ہو سکتے تھے۔ یرمویسنکو کہانی سے بظاہر کسی تعلق کے بغیر اپنی شہادت میں بیان کرتا ہے کہ اسے بتایا گیا تھا (کس نے بتایا تھا؟) کہ لینن برلن میں کانفرنسوں میں شرکت کیا کرتا تھا (جرمن جنرل سٹاف کے آدمیوں کے ساتھ) اور جیسا کہ اسے بعد میں معلوم ہوا وہ سکوپوپس-آئی اولتوخوسکی کے گھر ٹھہرا کرتا تھا۔مگر وہ کہیں بھی نہیں بتاتا کہ اس کی اطلاع کے ذرائع کیا تھے۔

عدالتی تفتیشی افسر الیگزینڈر روف نے یرمویسنکو کی اس ''حقیقت پر مبنی'' شہادت کو رتی بھر وزن نہ دیا۔اس نے اس سے بھی یہ نہ پوچھا کہ لینن جنگ کے دنوں میں برلن میں کیا کر رہا تھا اور وہ کیسے سکوپوپس -آئی اولتوخوسکی کے گھر ٹھہرا تھا۔یا پھر کارپورل نے جو جواب دیا ہوگا اسے الیگزینڈر روف نے ریکارڈ پر لانا مناسب خیال نہ کیا ہوگا۔لیکن کیا ہمیں اتنا حق بھی نہیں ہے کہ طوطا مینا کی اس کہانی کے متعلق کچھ پوچھ سکیں۔کون احمق اسے سچ مانے گا؟ اس کے باوجود کئی نام نہاد سیاست دان اسے سچ مانتے ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ ان کے پڑھنے والے بھی اسے سچ مانیں۔

تو کیا کہانی بس اتنی ہے؟ جی ہاں فوجی کارپول کے پاس کہنے کو اور کچھ نہیں ہے۔ سیاسی کارپورل اب مفروضوں پر اپنی بات چلاتا ہے۔ہم اس کے ساتھ ساتھ چلیں گے۔کرنسکی بیان کرتا ہے۔''عبوری

حکومت کوایک اور مشکل مسئلے کا سامنا تھا۔ وہ لینن اور لنڈن ڈورف کے درمیان ایجنٹوں کے ذریعے تبادلہ خیال کی فکر لگی ہوئی تھی۔اس کے علاوہ ان ایجنٹوں سے جن کے کاغذات وغیرہ پکڑے جاتے تھے انہوں نے بھی عبوری حکومت کو پریشان کر رکھا تھا۔''

بڑی ہوشیاری اور ذہانت سے گھڑے گئے یہ جملے دو دھاگوں سے بنے گئے ہیں۔ دروغ اور بزدلی کے دھاگے۔ کہانی میں لنڈن ڈورف کا نام پہلی مرتبہ متعارف کرایا جاتا ہے۔اس سے پہلے یرمویسنکو کسی جرمن کا نام نہیں لیتا۔ کارپورل کا ذہن چھوٹا ہونے کے باوجود تیز تھا۔کرنسکی ان ایجنٹوں کا ذکر بڑے ابہام کے ساتھ کرتا ہے جو لنڈڑ ڈورف اور لینن کے درمیان رابطہ قائم کرائے ہوئے تھے۔ایک طرف تو یہ لگتا ہے کہ کرنسکی ان ایجنٹوں کے بارے میں یقینی طور پر جانتا تھا۔مگر دوسری طرف وہ اس کے ذحن کی پیداوار لگتے ہیں۔اگر وہ ان کے قدم ناپ کر ان کی ایڑیوں پر ان کا پیچھا کر رہا تھا تو پھر یہ گم نام اور خیالی قسم کی ایڑیاں تھیں۔دوسرے لفظون میں یہ اس کے اپنے''گدھے کے کھر''ہوں گے۔

کرنسکی کے اپنے کہنے کے مطابق تفتیش اس قدر خفیہ اور خفیہ راز میں رکھی گئی کہ فقط چار وزیروں کو اس کا علم تھا۔ بچارے وزیر انصاف پیری زوشیف کو بھی پتا نہیں تھا۔ یہ واقعی ایک''سیاست دانوں''والا کام تھا۔ جب جرمن جنرل سٹاف ہرایرے غیرے نتھو خیرے کو عظیم انقلابی پارٹی کے راہنماوں سے اپنے رابطوں کے بارے میں بتا رہا تھا تو کرنسکی اس کے عین برعکس جا رہا تھا۔اپنے علاوہ اس تین ہی معتبر اور بااعتبار وزیر ملے تھے۔

کرنسکی مزید ارشاد فرماتا ہے۔''کام بڑا مشکل' طویل اور پیچیدہ تھا''چلو ہم یہ بھی مان لیتے ہیں آخر اس کی محنت پھل لائی۔ کرنسکی اس محنت کا بیان ان لفظوں میں کرتا ہے۔''ہماری کامیابی لینن کیلئے بدنامی کا باعث تھی۔ جرمنی سے اس کا رابطہ بلاشبہ ثابت ہو گیا تھا۔''

''بلاشبہ ثابت''ہو گیا تھا۔ کب ثابت ہوا اور کس نے ثابت کیا؟

یہ وہ مقام ہے جہاں کرنسکی اپنے کرائم ناول میں دو نامور پولش انقلابیوں گانتسکی اور کوزلووسکی کو متعارف کراتا ہے۔ان کے علاوہ ایک تیسرا کردار بھی داخل ہوتا ہے جس کا نام ہے مادام سومن سن۔ یہ وہ خاتون ہے جسے کوئی شخص اس وقت کوئی اطلاع دیتا جب اس کے متعلق کسی کو کچھ خبر ہوتی۔ یہ تین جاسوس پیش پیش تھے۔ کرنسکی کے پاس کیا ثبوت ہیں کہ کوزلووسکی اور گانتسکی (جو ابھی تک زندہ ہے) لینن اور

لنڈن ڈورف کے درمیان رابطہ بنے ہوئے تھے؟ یہ بالکل نہیں بتایا جاتا۔ یرمویسنکو نے تو ان ناموں کا کبھی ذکر ہی نہیں کیا تھا۔ ان ناموں نے کرنسکی کی کتاب میں اسی طرح اچانک جگہ حاصل کی ہے جیسے جولائی 1917ء کے دنوں میں اخبارات * میں اچانک دکھائی دیے تھے۔

کرنسکی کی کہانی اس بارے میں یہ کہتی ہے۔ ''سٹاک ہوم سے تعلق رکھنے والا بالشویک جرمن ایجنٹ جو لینن اور جرمن اعلیٰ حکام کے درمیان رابطوں کے کاغذات لے کر جا رہا تھا' روس-سویڈن سرحد پر پکڑا گیا۔ ہم بھی ان کاغذات کے متعلق جانتے تھے۔''

معلوم ہوا کہ وہ ایجنٹ کانتسکی تھا۔ چار وزیر جن میں سے ایک وزیراعظم خود تھا' سب سے زیادہ عقل مند تھا اور وہ بے سود جدوجہد نہیں کر رہا تھا۔ سٹاک ہوم کا بالشویک ایجنٹ ایسے کاغذات اٹھائے پھرتا تھا جن کے بارے میں کرنسکی کو پہلے ہی علم تھا۔ کاغذات جو اس بات کا پکا ثبوت تھے کہ لینن لنڈن ڈورف کا ایجنٹ تھا۔ لیکن کرنسکی ہمیں ان کاغذات کے متعلق اپنے خفیہ راز میں شریک کیوں نہیں کرتا؟ وہ کیوں نہیں بتاتا کہ ان کی نوعیت کیا تھی؟ اسے ان کاغذات کے مواد کے بارے میں کیسے علم ہوا؟ بالشویک ایجنٹ کو وہ کاغذات اپنی جیب میں لیے پھرنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی تھی جو یہ ثابت کر رہے تھے کہ ایک بالشویک جرمنی کا ایجنٹ تھا؟ کرنسکی اس سلسلے میں ایک لفظ بھی نہیں کہتا۔ کون احمق ان تمام باتوں پر یقین لائے گا؟

بعد میں معلوم ہوا کہ سٹاک ہوم کا ایجنٹ کبھی پکڑا ہی نہیں گیا تھا۔ اس کی جیب سے برآمد ہونے والے کاغذات 1928ء میں بھی اتنے ہی بے نام ہیں جتنے 1917ء میں تھے۔ بالشویک ایجنٹ سویڈن کی سرحد کی طرف جا رہا تھا مگر وہ وہاں کبھی نہ پہنچ سکا۔ آخر کیوں؟ وزیر انصاف پیری زرشیف جو اس کا تعاقب نہیں کر سکتا تھا' یرمویسنکو کے بھید سے جلد ہی واقف ہو گیا اور پوری بات کھل گئی۔

بالشویک سازش کو بے نقاب کرنے کیلئے عبوری حکومت نے دو ماہ تک جدوجہد کی ناکامی سے دوچار ہو گئی۔'' کرنسکی کے ہو بہو یہی الفاظ ہیں۔ پہلے کہیں کہا گیا تھا کہ اس کامیابی نے لینن کو بدنام کر دیا تھا' لنڈن ڈورف سے اس کے رابطے بلا تردید ثابت ہو گئے۔ اور اب کہا جاتا ہے کہ دو ماہ کی جدوجہد ناکامی سے دوچار ہو گئی تھی۔ کیا یہ سب ایک مسخرہ پن نہیں لگتا؟

داستان ساز کرنسکی مادام سومن سن کا تعاقب کرنے والے چار وزیروں کی ناکامی کے باوجود دل

برداشتہ نہیں ہوتا۔''میں نے تاریخ کے سامنے پوری ذمہ داری سے اپنے ضمیر کو حاضر ناظر جان کر بڑے فخر سے بالشویکوں کے لنڈن ڈورف سے رابطوں کا انکشاف کیا ہے۔'' یہ کرنسکی کا کہنا ہے۔میں یہاں پیٹرگراڈ کی عدالت میں وکیل استغاثہ کے الفاظ دہرانے پر اکتفادہ کروں گا۔''یہ اس کا (کرنسکی) کا عروج ہے۔وہ 1927ء میں ایک عوامی جسلے میں سٹیج پر نمودار ہوا اور اس نے بورژوا رضا کاروں' کالج کے طلبا اور جمہوریت پسند نوجوان خواتین کو مسحور کردیا۔اس نے اپنے پورے جوہر دکھائے۔''وکیل استغاثہ کے اس بیان کو اپنی تعریف میں درج کرنے کے بعد کرنسکی کتاب میں آگے چل کر لکھتا ہے اور ایک دوسرا بڑا زبردست اعتراف کرتا ہے۔''اس کے باوجود عبوری حکومت لینن کے خلاف غداری کا مقدمہ دستاویزی مواد ہونے کے باوجود فیصلہ کن انداز میں ہمیشہ کیلئے ہار گئی۔

''ہمیشہ کیلئے ہار گئی۔'' یرمویسنکو کے شانوں پر کھڑا کیا گیا ڈھانچہ ایک دھڑام سے گر پڑا اور پیچھے کیا رہ گیا؟'' تاریخ کے سامنے پوری ذمہ داری کے ساتھ اپنے ضمیر کو حاضر ناضر جان کر'' کہے گئے الفاظ۔

لیکن اختتام یہاں بھی نہیں ہوتا۔اس مقدمے کو وہ جس انداز میں لڑا اس سے اس کی بزدلی اور دورغ گوئی مکمل طور پر سامنے آجاتی ہے۔اس کے حکم پر جرمن جاسوس پکڑے جانے تھے' ان کی فہرست مکمل کرتے ہوئے وہ بڑے عاجزانہ انداز میں کہتا ہے۔''چندروز بعد ٹراٹسکی اور لوناچرسکی گرفتار کر لیے گئے۔'' یہ وہ مقام ہے جہاں وہ مجھے جرمن جاسوسی نظام میں شامل کرتا ہے۔مگر بڑی مبہم طور پر اور اپنے ''الفاظ کے عزت'' بچالیتا ہے۔اس کی بھی معقول وجہ ہے۔دراصل وہ میرا نام لیے بغیر رہ نہیں سکتا تھا اس نے مجھے بھی اسی الزام پر گرفتار کیا تھا جو لینن پر لگایا تھا۔لیکن وہ مجھ پر عائد الزام سے مطمئن نہیں تھا۔کیونکہ اس کا اس کے پاس کوئی واضح ثبوت نہیں تھا۔

سرکاری وکیل میرے خلاف فقط ایک الزام عدالت میں پیش کر سکا۔اور وہ الزام یہ تھا کہ میں لینن کے ساتھ ایک بند کار میں جرمنی سے گزرا تھا۔زار حکومت کے محکمہ انصاف کے ان نگران کتے کو اتنا بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ میں نہیں منشویکوں کا راہنما مارٹوف تھا' جب کہ میں ایک ماہ بعد نیویارک سے نظر بند کیمپ سے رہا ہو کر براستہ سکنڈے نیویا روس پہنچا تھا۔حکومت کے نکمے اور نااہل اہلکاروں نے اخبارات پڑھ کر یہ معلوم کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی کہ میں کس راستے سے روس واپس آیا تھا۔یہ معلومات میں نے سرکاری وکیل کو عدالت میں فراہم کیں۔ میں نے اس کے فرد جرم اس کے منہ پر ماری اور منہ

دوسری طرف کرلیا۔ پھر میں نے عبوری حکومت کو ایک احتجاجی مراسلہ بھیجا۔ کرنسکی کا احساس گناہ واضح طور پر اس کی کتاب کے قارئین پر کھل گیا۔ اس کی عدالت میرے خلاف الزامات ثابت کرنے میں کس شرمناک طریقے سے ناکام ہوئی تھی۔

کرنسکی کتاب میں مزید لکھتا ہے۔ ''اگر جرمنی کا پورا جاسوسی نظام لینن کی تحویل میں نہ ہوتا تو وہ اس کو تباہ کرنے میں کبھی کامیاب نہ ہوتا'' وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ روس کی پرانی حکومت کا تختہ انقلابیوں نے نہیں بلکہ جرمن جاسوسوں نے الٹا تھا۔ اپنے ہی ملک کی تاریخ کو مسخ کرتے وقت کرنسکی کو ذرا شرم نہ آئی۔ اس نے روس میں تبدیلی کا سارا انعام ہمسایہ ملک کے جاسوسوں کو دے دیا۔ اگر ایسا ہی تھا تو بعد میں جرمنی کے علاوہ اس کے حواری ممالک روس سے بالشویک ازم کو اکھاڑنے میں کامیاب کیوں نہ ہو سکے؟ میرا خیال ہے ہمیں تاریخ فلسفے میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں حقائق کی دنیا ہی میں رہنا چاہیے۔ جرمنی کی فنی اور مالی امداد جس جگہ سامنے آئی تھی؟ کرنسکی نے اس کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ 1917ء میں بالشویک پیٹروگراڈ سے ایک چھوٹا سا اخبار نکال رہے تھے۔ اسی قسم کا اخبار انہوں نے 1912ء میں جنگ سے پہلے بھی نکالا تھا۔ وہ ہینڈ بل بھی جاری کرتے تھے۔ ان کے پاس احتجاجی مواد بھی تھا۔ دوسرے لفظوں میں ہم ایک انقلابی پارٹی تھے۔ یہاں کس جگہ جرمن کا جاسوسی نظام اپنا کردار ظاہر کرتا ہے؟ اس کے بارے میں بھی کرنسکی کی کتاب خاموش ہے۔ اب اور کیا کہا جائے۔

ہم ''تاریخ کے سامنے'' کرنسکی کو شہادت کا تجزیہ کر چکے ہیں۔ ہم نے کئی شکوک وشبہات کے باوجود کتاب کا مکمل جائزہ لیا ہے۔ سوچتا ہوں کے اس غلاظت کو سمیٹنا واقعی ضروری تھا؟ لنڈن ڈورف، ہنڈن برگ اور جرمن جرنل سٹاف کے دوسرے بہت سے اہلکار اور ورکرز ابھی تک زندہ ہیں۔ وہ بالشویکوں کے دشمن ہیں۔ پرانے راز کھولنے سے انہیں کون روکتا ہے؟ جرمنی میں اب سوشل ڈیموکریسی کی حکومت ہے۔ تمام خفیہ دستاویزات اور انہیں رکھنے والی جگہوں تک ریموینسکو سے پوشیدہ نہیں رکھ سکا تو پھر جرمن میں ایسے بہت سے لوگ موجود ہوں گے جو روسی کارپورل (کرنسکی) جتنا تو جانتے ہی ہوں گے۔ بالشویکوں اور اکتوبر انقلاب کے یہ دشمن اب تک خاموش کیوں ہیں؟

یہ درست ہے کہ کرنسکی نے لنڈن ڈورف کی یادداشتوں کا ذکر کیا ہے۔ لیکن ان یاداشتوں سے فقط ایک حقیقت سامنے آتی ہے۔ لنڈن ڈورف کو امید تھی کہ انقلاب سے روسی فوج میں انتشار پھیل جائے

گا۔ پہلے فروری اور بعد میں اکتوبر انقلاب کے موقع پر۔ مگر یادداشتوں میں کسی ایسی سکیم کا انکشاف کرنے کی کیا ضرورت تھی یہی بتادینا کافی تھا کہ اس نے انقلابیوں کے ایک گروہ کو جرمنی سے گزرنے کی اجازت دی تھی۔ جرمنی میں تشویش ناک فوجی صورتحال کے پیش نظر یہ بڑی بات تھی۔ لینن نے اس سے فائدہ اٹھا کر اپنے منصوبے آگے بڑھائے۔ ممکن ہے لنڈن ڈورف خود سے کہہ رہا ہو: ''لینن جب محبّ الوطنوں کا تختہ الٹ دے گا تو اس وقت میں لینن اور اس کے ساتھیوں کا گلا دبادوں گا۔'' ممکن ہے لینن بھی عین اسی وقت خود سے کہہ رہا ہو: ''میں لنڈن ڈورف کی کار میں بیٹھ کر اس کے علاقے سے گزروں گا اور پھر اس نیکی کا اسے مزہ چکھاؤں گا۔''

یہ ثابت کرنے کیلئے کرنسکی کی جاسوسی کی صلاحیت کی ضرورت نہیں ہے کہ ایک خاص جگہ پر دو متحارب تاریخی منصوبے ایک دوسرے کا راستہ کاٹ رہے تھے۔ اور وہ جگہ ''بندکار'' تھی۔ اصل حقیقت تاریخ ہے۔ تاریخ ان دنوں منصوبوں کی پڑتال کر چکی ہے۔ 25 اکتوبر (7 نومبر) کو بالشویکوں نے اقتدار پر قبضہ کر لیا تھا۔ عین ایک سال بعد روسی انقلاب کے اثر کے تحت جرمن عوام نے لنڈن ڈورف اور اس کے آقاؤں کا تختہ الٹ دیا۔ دس برس بعد جمہوریت کے خود پرست جن کے جذبات کو تاریخ نے مجروح کیا تھا' ایک احمقانہ حرکت کے مرتکب ہوئے۔ لینن کے خلاف نہیں' ایک عظیم قوم اور اس کے انقلاب کے خلاف۔

جولائی سے اکتوبر تک

میرا یہ اعلان کہ کرنسکی محاذ کھولنے کی تیاریاں کر رہا تھا' 4 جون کو بالشویکوں کے ایک فریق نے سوویٹوں کی مشترکہ کانگریس میں پڑھ کر سنایا۔ ہم نے واضح طور پر کہا کہ حملہ ایک ایسی مہم جویانہ حرکت ہوگی جو روسی فوج کے وجود کیلئے خطرہ ثابت ہوگی۔ لیکن عبوری حکومت اپنی تقریروں کے نشے میں اندھی ہو رہی تھی۔ وزیروں کا خیال تھا کہ وہ انقلاب سے متحرک سپاہیوں کو جس طرح چاہیں گے گیلی مٹی کی طرح ڈھال لیں گے۔ کرنسکی محاذ پر گیا' سپاہیوں سے ملا' انہیں ڈرایا دھمکایا' ان کے سامنے گھٹنے جوڑے' دوزانو ہو گیا' زمین کو چوما' قصہ مختصر ہر قسم کی مسخرانہ حرکتیں کیں مگر ان کے کسی سوال کا جواب نہ دے سکا۔ خود فریبی میں مبتلا ہو کر اس نے سوویٹوں کی کانگریس کی حمایت کی امید پر حملے کا حکم دے دیا۔ بالشویکوں کو

قربانی کا بکرا بنایا جانے لگا۔ ان کا شدت سے تعاقب ہونے لگا۔ کیڈٹ پارٹی جس ردعمل کے سامنے ڈھال بنی ہوئی تھی، چاروں طرف اس پر دباؤ بڑھ گیا اور ہمارے سروں کا مطالبہ ہونے لگا۔

عبوری حکومت پر عوام کے اعتماد کا غلط اندازہ کیا گیا۔ انقلاب کے دوسرے مرحلے میں بھی پیٹروگراڈ آگے آگے تھا۔ جولائی میں کرنسکی حکومت سے اس کا کھلا تصادم ہو گیا جسے ابھی شورش کا نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ یہ ایک طرح کی بیداری تھی جو بتدریج گہری ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن جولائی کی جھڑپوں میں اتنا پتا ضرور چل گیا کہ ''جمہوریت پسند'' فوج کرنسکی کی پشت پر نہیں تھی۔ ہمارے خلاف جو فوج اس کی حمایت کر رہی تھی، انقلاب دشمن فوج تھی۔

3 جولائی کو تورڈ عمل میں ہونے والے اجلاس کی شہری نشست میں مجھے معلوم ہوا کہ توپ خانے کی رجمنٹ مظاہرے پر اتر آئی تھی اور اس نے دوسرے فوجیوں اور فیکٹری ورکروں کو بھی مظاہرے کی ترغیب دی تھی۔ یہ خبر میرے لیے حیرانی کا باعث تھی۔ مظاہرہ عوام کی طرف اشارہ ملنے پر یک دم ہوا تھا۔ پھر یہ بڑھتا گیا اور ہماری پارٹی اس میں شامل ہو گئی۔ عوام نے تورڈ محل کو تہس نہس کر دیا۔ ان کا ایک ہی نعرہ تھا۔ ''سوویتوں کا اقتدار دیا جائے۔

محل کے سامنے مشتبہ قسم کے لوگوں کا ایک گروہ عوام سے الگ کھڑا تھا۔ اس نے وزیر زراعت چرنوف کو پکڑا اور ایک گاڑی میں ڈال دیا۔ عوام نے اس طرف زیادہ توجہ نہ دی۔ وہ بے تعلقی سے دیکھتے رہے۔ انہیں وزیر سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ چرنوف کے پکڑے جانے اور اس کی زندگی کو لاحق خطرے کی خبر محل کے اندر پہنچی۔ پاپولسٹوں نے اپنے راہنما کی مدد کیلئے بکتر بند گاڑیاں استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان کی مقبولیت کا زوال انہیں پریشان کر رہا تھا۔ وہ اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنا چاہتے تھے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ چرنوف کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ جاؤں اور اسے لوگوں سے پرے لے جا کر رہا کرا دوں۔ لیکن رسکلنیکوف نامی ایک بالشویک جو جہازرانوں کو مظاہرے میں شرکت کیلئے لایا تھا، چرنوف کی فوری رہائی کا مطالبہ کرنے لگا۔ میں نے رسکلنیکوف کی خواہش کو عملی لباس پہنا دیا۔ بعد میں وہ اپنی یادداشتوں میں اس واقعے کے متعلق یوں لکھتا ہے۔

''یہ کہنا مشکل ہے کہ عوام کا مظاہرہ کتنی دیر جاری رہتا۔ کامریڈ ٹراٹسکی نے مداخلت کر کے معاملہ ٹھنڈا کیا۔ وہ گاڑی کے سامنے کھڑا ہو گیا اور بڑے تحکمانہ انداز میں عوام کو خاموش ہونے اور بکھر جانے کو

کہا۔لوگ ایک دم خاموش ہوگئے۔ پھراس کے حق میں میں اپنے ہاتھ کھڑے کر دیے۔‘‘ کوئی ہاتھ نہ اٹھا۔کسی کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا۔’’چرنوف آپ آزاد ہیں۔‘‘اس نے ہاتھ کے اشارے سے وزیر زراعت کو گاڑی سے باہر آنے کو کہا۔ چرنوف آدھا زندہ آدھا مردہ تھا۔میں نے اسے گاڑی سے باہر آنے میں مدد دی۔وہ جھجھکتا ہوا گاڑی سے باہر نکلا اور تھکے تھکے قدموں سے محل کے برامدوں میں غائب ہوگیا۔ٹراٹسکی بھی مطمئن حالت میں اس کے ساتھ چل رہا تھا۔‘‘

مذکورہ واقعہ میں سے جذباتی پہلو نکال دیا جائے تو یہ بالکل صحیح ہے۔لیکن حاسد پریس نے چرنوف کے عوامی گھیراؤ کے عقب میں میرا ہاتھ دکھا دیا اور چرنوف عیاری سے خاموش رہا۔ایک ’’عوامی‘‘ وزیر اپنی مقبولیت کھونے اور ایک بالشویک کی مدد سے اپنا سر بچانے کا اعتراف کیسے کرسکتا تھا۔

ایک کے بعد ایک وفد مطالبہ کرنے لگا کہ مجلس عاملہ اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لے۔چدزی‘ تزتلی‘ ڈان اور چوفے‘ بت بنے پریزیڈم میں بیٹھے تھے۔وہ وفد کو جواب دیے بغیر خالی آنکھوں سے دور کہیں دیکھ رہے تھے۔ بالشویک راہنما محنت کشوں اور سپاہیوں کی حمایت میں بولتے رہے۔ پریزیڈم کے ممبر چپ بیٹھے رہے۔وہ منتظر تھے‘ مگر کس کے؟ وقت گزرتا رہا۔ پھر نصف شب کو اچانک پورا ہال فتح کے نقاروں سے گونج اٹھا۔ پریزیڈم کے ممبر ایک دم جاگ اٹھے‘ جیسے انہیں برقی تار نے چھو گیا تھا۔کسی نے بتا کہ وولنر جمنٹ مرکزی مجلس عاملہ کی حمایت کرنے محاذ جنگ سے آ گئی تھی۔ پیٹروگراڈ کے پورے گیریزن میں ’’جمہوریت‘‘ کسی ایک سپاہی پر بھی بھروسہ نہیں کرسکتی تھی۔اسے اپنی کمک محاذ جنگ سے حاصل کرنی پڑی۔

پھر سارا منظر ایک دم بدل گیا۔خود کو باہر نکال دیا گیا۔ بالشویکوں کو تقریریں کرنے سے روک دیا گیا۔جمہوریت کے راہنما ہم پر فقرے کسنے لگے کہ ہم عوام کو ان کے خلاف بھڑکا رہے تھے۔مجلس عاملہ کے پلیٹ فارم سے بتایا گیا کہ انقلاب کی وفادار فوجوں نے ایک بغاوت کچل دی تھی۔ بالشویکوں کو انقلاب دشمن پارٹی قرار دے دیا گیا۔ایک وولن رجمنٹ کی آمد نے یہ کارنامہ انجام دے دیا تھا۔ساڑھے تین ماہ بعد اسی رجمنٹ نے کرنسکی کی حکومت کا تختہ الٹنے میں بھرپور حصہ لیا۔

میں پانچ جولائی کی صبح کو لینن سے ملا۔عوام کا حملہ پسپا کر دیا گیا تھا۔’’اب وہ ہمیں ایک ایک کر کے گولی مار دیں گے۔‘‘لینن نے کہا۔’’یہ ان کیلئے صحیح وقت ہے۔‘‘اپنی ہمت اور جرات کا اندازہ

کرنے کے بجائے وہ دشمن کی طاقت کے متعلق زیادہ ہی غلط فہمی کا شکار تھا۔مگر وہ ہمیں ایک ایک کر کے گولی نہ مار سکے اگرچہ وہ ایسا کر سکتے تھے' بالشویکوں کو سڑکوں پر مارا اور ہلاک کیا جا رہا تھا۔''پراودا'' کے دفتر اور چھاپے خانے کو تباہ کر دیا گیا۔ چھاپے خانے سے باہر سڑک کاغذوں اور مسودوں سے بھر گئی۔ان میں میرا پمفلٹ ''بہتان تراشی کے متعلق'' بھی شامل تھا۔ جولائی کی بیدار یک طرفہ جنگ میں بدل گئی تھی۔ہم لڑ نہیں رہے تھے لہذا دشمن آسانی فتح یاب ہو گیا۔اب پارٹی سخت سزا بھگت رہی تھی۔لینن اور زینوئیف کہیں چھپ گئے۔مگر گرفتاریوں اور مار پیٹ کی حکمرانی تھی۔کوسک اور فوج کے زیر تربیت طلباء گرفتار ہونے والوں سے اس بہانے رقم چھین رہے تھے کہ وہ ''جرمن مال'' تھا۔ ہمارے ہمدردوں اور نیم دوستوں نے ہم سے منہ موڑ لیا۔تورڈ محل میں ہمیں انقلاب دشمن کہہ کر قانون کے دائرے سے باہر رکھا جا رہا تھا۔

پارٹی کے اندر صورتحال بڑی خراب تھی۔لینن موجود نہیں تھا کامینیف فریق اپنا سر اٹھا رہا تھا۔ سٹالن اور دوسرے لوگ واقعات کا خاموشی سے جائزہ لے رہے تھے تاکہ وقت آنے پر موقعہ پرستی کا مظاہرہ کر سکیں۔تورڈ محل میں بالشویک فریق مرکزی مجلس عاملہ میں کو دکو یتیم محسوس کر رہا تھا۔اس فریق نے مجھے حکمران فریق سے صورتحال کے متعلق بات کرنے کو کہا' میں نے ابھی تک بالشویک فریق میں شمولیت اختیار نہیں کی تھی اور یہ معاملہ پارٹی کانگریس تک التو میں ڈال دیا تھا۔مگر میں شمولیت پر متفق ہو چکا تھا۔ بالشویک فریق سے میرا اخلاقی رشتہ اس نوعیت کا تھا جو دشمن کی بھاری ضرب سے زیادہ استوار ہو رہا تھا۔اس وقت میں نے کہا تھا کہ موجودہ بحران سے ہماری مقبولیت کا خط زیر اوپر کی طرف جائے گا۔جب عوام ہمارے اعلان کردہ حقائق کی چھان پھٹک کریں گے تو ہماری طرف خود ہی کھنچے چلے آئیں گے۔اس وقت ہر انقلابی پر نظر رکھنی بڑی ضروری تھی کیونکہ ایسے لمحات میں لوگوں کو ایسے میزانوں میں تولا جاتا ہے جو اکثر غلطی نہیں کرتے۔ پارٹی کے بالشویک ارکان نے جس گرم جوشی اور محبت سے میرا شکریہ ادا کیا' مجھے آج بھی یاد ہے۔مارٹوف نے کہا تھا۔''لینن ہمارے درمیان نہیں ہے۔جو دوسرے موجود ہیں ان میں ٹراٹسکی ہی عقل کی بات کرتا ہے۔''

اگر مختلف حالات کے تحت یہ یادداشتیں لکھ رہا ہوتا-- یہ الگ بات ہے کہ پھر میں انہیں لکھ ہی نہ پاتا-- اگر لکھتا بھی تو بہت کم لکھتا۔ماضی کی وسیع پیمانے پر منظم دروغ گوئی کو میں فراموش نہیں کر سکتا جو ہم

سے پہلی نسل کا ایک محبوب مشغلہ تھا۔ میرے دوست یا تو زنداں میں تھے یا جلاوطنی میں میں اپنے بارے میں جس طرح بات کر رہا ہوں' شاید دوسرے حالات میں ایسا ہرگز نہ کرتا۔ میرے لئے تاریخ اب سچائی ہی کا سوال نہیں سیاسی جدوجہد کا بھی ہے جو اب تک جاری ہے۔

یہ وہی زمانہ ہے جب مورالوف سے میری نہ ٹوٹنے والی سیاسی اور ذاتی دوستی کا آغاز ہوا۔ اس شخص کے بارے میں مجھے چند لفظ ضرور کہنے چاہیں۔ مورالوف ایک پرانا بالشویک ہے جو 1905 ء کے انقلاب کے دنوں میں ماسکو میں تھا۔ 1906 ء میں وہ سرپوکوف میں بلیک ہنڈرڈ کے پروگرام میں گرفتار کر لیا گیا۔ جیسا کہ ہر کوئی جانتا ہے یہ پروگرام پولیس چلا رہی تھی۔ مارالوف ترقامت میں دیو جیسا ہے ' بے خوف بھی اور مہربان بھی۔ زمتوں کی انتظامیہ کی عمارت میں وہ اپنے چند دوسرے ساتھیوں کے ساتھ دشمن کے نرغے میں آ گیا۔ پھر وہ ریوالور ہاتھ میں پکڑے عمارت سے باہر نکلا اور دشمنوں کی طرف چل پڑا۔ دشمنوں نے ہجوم تھوڑا پیچھے ہٹ گیا۔ بلیک ہنڈرڈ کے بعض لوگ اس پر طعنہ زنی کرنے لگے۔ ''میں کہتا ہوں راستہ چھوڑ دو۔'' دیو آگے بڑھتا ہو گرجا۔ ریوالور اس کے ہاتھ میں لہرا رہا تھا۔ چند لوگ اس پر ٹوٹ پڑے۔ اس نے ایک کو ہلاک اور دوسرے کو زخمی کر دیا۔ ہجوم پیچھے ہٹ گیا۔ وہ اپنے نپے تلے قدموں سے یوں چل رہا تھا جیسے کوئی برف توڑنے والی مشین برف کو توڑتی ہوئی آگے بڑھتی جاتی ہے۔ وہ ماسکو پہنچ گیا۔

اس پر دو سال تک مقدمہ چلتا رہا۔ ملک میں 1905 ء کے انقلاب کے خلاف ردعمل کے طور پر جو وحشیانہ لہر چلی ہوئی تھی اس کی موجودگی میں بھی وہ بری ہو گیا۔ تعلیم کے لحاظ سے ایک زرعی ماہر' سامراجی جنگ میں بکتر بند رجمنٹ کا ایک سپاہی' ماسکو کے فوجی علاقے کا پہلا کمانڈر بن گیا۔ وہ انقلابی جنگ کا ایک نڈر سپاہی تھا جس پر حالات کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ اپنے کاموں میں ایک زندہ مثال تھا۔ وہ زرعی مشورے دیتا' اناج کو گاہتا او آرام کے لمحات میں مویشیوں اور لوگوں کا علاج کرتا۔ مشکل صورتحال میں وہ بڑا پرسکون اور پراعتماد رہتا۔ شکار کے شوق نے ہمیں جوڑ رکھا تھا۔ ہم شمال اور جنوب میں ریچھوں اور بھیڑیوں اور تیتر کا شکار کرتے رہتے۔ ان دنوں مورالوف سائبیریا میں جلاوطنی کی زندگی میں شکار کا شوق پورا کر رہا ہے

جولائی 1917 ء کے ایام میں مورالوف نے اپنا حوصلہ قائم رکھا اور دوسروں کو بھی حوصلہ دیا۔ ان

دنوں ہمیں خود اعتمادی کی اشد ضرورت تھی۔ ہم تورڈ محل کے برآمدوں میں پھرتے وقت اپنے دشمن ساتھیوں کی تیز نظروں کا مقابلہ کرتے رہتے۔ اس سے زیادہ مایوسی اور دل برداشتگی کی اور کیا بات ہوگی کہ انقلاب آپ کو اوپر لے جا کر ایک دم نیچے پھینک دے۔

ان دنوں مجلس عاملہ کی کنٹین کی طرف جانے والا راستہ چند قبروں میں سے ہو کر گزرتا تھا۔ کنٹین میں چائے کے ساتھ کالی ڈبل روٹی کے پنیر والے سینڈوچ ملتے تھے۔ کنٹین کا انچارج گرافوف نامی ایک سپاہی تھا۔ جب بالشویکوں پر برے دن آئے ہوئے تھے' لینن کو ایک جرمن جاسوس قرار دے دیا گیا تھا اور وہ کہیں چھپا بیٹھا تھا' تو گرافوف مجھے دوسرے لوگوں سے بہتر چائے اور سینڈوچ دیتا اور میری طرف دیکھنے کی کوشش نہ کرتا۔ ظاہر ہے اسے بالشویکوں سے ہمدردی تھی اور وہ اسے اپنے حکام بالا سے پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا۔ میں ں نے اردگرد زیادہ غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔ گرافوف اکیلا ہی ہمارے ساتھ نہیں تھا۔ تورڈ محل کے دوسرے چھوٹے ملازمین بھی ہمارے ساتھ تھے۔ اس وقت میں نے محسوس کیا کہ ہم آدھی جنگ جیت گئے تھے' فقط آدھی

پریس بالشویکوں کے خلاف غیر معمولی طور پر گھٹیا اور نفرت بھری مہم چلا رہا تھا۔ یہ ویسی ہی تحریک تھی جو چند برس بعد سٹالن نے اپنے مخالفوں کے خلاف چلائی تھی۔ لونا چرسکی نے جولائی میں چند بیانات دیے جسے پریس نے فطری طور پر بالشویکوں کی مذمت پر مبنی قرار دیا۔ بعض اخبارات نے اسی قسم کی تقریریں میرے نام لگا دیں۔ 10 جولائی کو میں نے عبوری حکومت کو ایک خط میں لکھا جس میں میں نے خود کو لینن سے پورا متفق قرار دیا۔ خط کا اختتام اس سطروں پر ہوتا تھا۔ ''اگر لینن' زینوشیف اور کامینیف گرفتاری کے حقدار ہیں تو مجھے کس بنیاد پر اس حق سے محروم رکھا گیا ہے؟ اس شعبے کی کوئی بنیاد نہیں ہونی چاہیے کہ میں بھی اپنے مذکورہ کامریڈوں کی طرح عبوری حکومت کی پالیسیوں کا غیر مصالحانہ طور پر مخالف ہوں۔'' وزیروں نے اس خط سے اپنا ضروری مطلب نکال کر مجھے گرفتار کر لیا۔

مئی میں جب تنزتلی جہاز رانوں کا تعاقب اور بکتر بند گاڑیوں کو غیر مسلح کر رہا تھا تو اس جرنیل کے خلاف مدد حاصل کرنی پڑے گی جو انقلاب کے بعد اس کیلئے پھانسی کا رستہ تیار کر رہا ہوگا۔ اگست میں وہ جرنیل کارنیلوف کی شکل میں نمودار ہوا۔ تنزتلی نے جہاز رانوں سے مدد طلب کی۔ انہوں نے انکار نہ کیا۔ بحری بیڑہ ''ارورا'' دریائے نیوا کے پانیوں میں داخل ہو چکا تھا۔ میں نے کرسٹی جیل میں اپنی پیشن

گوئی کو اس قدر جلدی پورے ہوتے ہوئے دیکھ لیا۔ اورا کے جہاز رانوں نے مجھ سے ہدایت حاصل کرنے کی خاطر اپنا ایک خاص وفد میرے پاس جیل میں بھیجا۔ وہ سرما ''محل کا دفاع کریں یا حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیں؟ میں نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ کرنسکی سے حساب بے باق کرنے سے پہلے کارنیلوف کا خاتمہ کریں۔ ''جو ہمارے ہاتھ میں ہے وہ کیسے بھاگ سکتا ہے؟''

''بالکل نہیں بھاگ سکتا۔''

''بھاگے گا بھی نہیں''

جب میں جیل میں تھا تو میری بیوی اور بیٹے مجھے ملنے آئے۔ اس وقت لڑکے کچھ سیاسی تجربہ حاصل کر چکے تھے۔ وہ ایک ریٹائرڈ کرنل کے دیہی گھر میں اسکی فیملی کے ساتھ رہ رہے تھے۔ کرنل کے زیادہ تر مہمان فوجی ہوتے اور وہ واڈکا پیتے وقت بالشویکوں کو تنقید کا نشانہ بناتے رہتے۔ جولائی میں یہ تنقید اور مذاق اپنے عروج پر پہنچ گیا (ان میں سے بعض افسر جنوب میں چلے گئے جہاں مستقبل کی سفید نام رجعتی فوجیں جمع ہو رہی تھیں) ایک دفعہ کھانے کے دوران میں جب ایک نوجوان محبّ الوطن فوجی نے لینن اور ٹراٹسکی کو جرمن جاسوس کہا تو میرا بیٹا کرسی اور چھوٹا بیٹا چاقو لے کر اس کی طرف لپکے۔ بڑوں نے بیچ بچاؤ کر دیا۔ میرے دونوں بیٹے خود کو کمروں میں بند کر کے روتے رہے۔ انہوں نے پیدل پیٹروگراڈ آنے کا فیصلہ کر لیا تا کہ دیکھ سکیں کہ وہاں بالشویکوں پر کیا بیت رہی تھی۔ مگر خوش قسمتی سے ان کی ماں وہاں آ گئی، اس نے انہیں ٹھنڈا کیا اور پانے ساتھ لے گئی۔ لیکن شہر میں حالات ٹھیک نہیں تھے۔ ان کا باپ جیل میں تھا، اخبارات بالشویکوں کی مذمت کر رہے تھے اور انقلاب کی حالت یقیناً مایوس کن تھی۔ اس کے باوجود جب میری بیوی ان کی موجودگی میں جیل کے استقبالیہ کمرے میں بڑی صفائی سے میں جیب میں ایک چھوٹا سا چاقو ڈال رہی تھی تو وہ بڑے خوش ہو رہے تھے۔ میں انہیں یہ کہہ کر تسلی دیتا رہا کہ اصلی انقلاب تو ابھی آنے والا تھا۔

میری بیٹیاں زیادہ سرگرمی سے سیاست میں داخل ہو رہی تھیں۔ وہ ماڈرن سرکس کے جلسوں میں آئیں اور مظاہروں مس شرکت کرتیں۔ جولائی کے دنوں مس ایک دفعہ ایک ہجوم میں پھنس گئیں۔ ایک اپنی عینک اور دونوں اپنے ہیٹ گنوا بیٹھیں۔ وہ ڈرتی تھیں کہ کہیں اپنے باپ کو نہ کھو بیٹھیں جو ایک بار پھر دیر کے بعد ان کی زندگیوں کے افق پر نمودار ہوا تھا۔

پیٹروگراڈ کی طرف کارنیلوف کی پیش قدمی سے جیل انتظامیہ ہوا میں معلق ہو کر رہ گئی۔ ہر ایک کا خیال تھا کہ اگر کارنیلوف شہر میں داخل ہو گیا تو وہ کرنسکی کے گرفتار کیے ہوئے تمام بالشویکوں کو ذبح کر دے گا۔ مرکزی مجلس عاملہ بھی خوف زدہ تھی کہ دارلحکومت میں موجود سفید فام لوگ جیل پر ہلہ بول سکتے تھے۔ اس خطرے کے پیش نظر فوج کا ایک بڑا دستہ کرسٹی جیل کی حفاظت پر مومور کر دیا گیا مگر وہ ''جمہوریت پسند'' نہیں بلکہ بالشویک ثابت ہوا۔ وہ ہمیں کسی وقت جیل سے رہا کرنے کو تیار تھا۔ مگر ایسے کسی اقدام سے فوری شورش نے جنم لے لیتا تھا جس کا وقت ابھی نہیں آیا تھا پھر حکومت خود ہمیں رہا کرنا شروع ہو گئی۔ اس نے بالشویک جہاز رانوں کو ''سرمائی محل'' کے تحفظ کیلئے بلا لیا تھا۔ میں کرسٹی جیل سے سیدھا انقلاب کے تحفظ کیلئے نوساختہ کمیٹی کے پاس گیا جہاں مجھے اس شخص کے ساتھ بیٹھنا پڑا جس نے مجھ پر جرمن جاسوس ہونے کا الزام لگا کر جیل میں بند کیا تھا۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھری رنہیں کہ پاپولسٹوں اور منشویکوں کے چہروں کو دیکھتے ہیے جی چاہتا تھا کہ کورنیلوف شہر میں داخل ہو کر انہیں گردنوں سے دبوچ لے اور ہوا میں لٹکا دے۔ مگر ایسی کوئی خواہش بے محل ہی نہیں غیر سیاسی بھی تھی۔ کارنیلوف کی بغاوت میں پورا جولائی ختم ہو گیا کرنسکی اور اس کے حواریوں نے اس حقیقت کو مان لیا کہ ان کی پشت پر فوج نہیں تھی۔ کورنیلوف کی فوج سے جو فوج مقابلہ کر رہی تھی وہ اکتوبر انقلاب کی فوج تھی۔ ہم نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر محنت کشوں کو مسلح کرنا شروع کر دیا۔ اس سے پہلے تیز تلی انہیں بڑی بے چینی سے غیر مسلح کرنے میں لگا ہوا تھا۔

دارلحکومت ان دنوں بڑا خاموش تھا۔ بعض لوگ امید اور خوف کی حالت میں کورنیلوف کے شہر میں داخلے کے منتظر تھے۔ میرے بیٹوں نے کسی کو یہ کہتے ہوئے سنا ''وہ کل شہر میں داخل ہو سکتا ہے۔'' اگلی صبح جب وہ لباس بدل رہے تھے تو انہوں نے کھڑکی سے باہر دیکھا کہ کہیں وہ آ تو نہیں گیا تھا۔ مگر کانیلوف کہیں دکھائی نہ دیا۔ عوام کی انقلابی شورش اس قدر بڑھ گئی تھی وہ بھاپ کی طرح ہوا میں کہیں تحلیل ہو گیا تھا۔ مگر اپنے نشانات چھوڑے بغیر نہیں۔ شورش بالشویک چکی کا پسان ثابت ہوئی تھی۔

''مکافات عمل میں دیر نہیں لگتی'' میں نے ان دنوں میں لکھا تھا۔ ''ہزاروں گرفتاریوں اور بہتان تراشیوں کے باوجود ہماری پارٹی جتنی اب بڑھ رہی تھی پہلے کبھی نہیں بڑھی تھی۔ یہ عمل دارلحکومتوں سے صوبوں، شہروں سے دیہات اور فوج میں پھلتا چلا جائے گا۔ پارٹی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پرولتاریہ اور افتادگان خاک کی پارٹی میں تبدیل ہوتی جائے گی۔''

بڑھتی ہوئی موج کے ساتھ ہمارا چلنا مشکل ہوگیا۔ پیٹروگراڈ میں بالشویکوں کی تعداد بڑھ رہی تھی۔ہماری رکنیت زیادہ ہوگئی۔اس کے باوجود پریزیڈم میں ہمارا کوئی ممبر نہیں تھا۔ہم نے سوویت پریزیڈم کے انتخابات نو کا سوال اٹھادیا۔ہم پاپولسٹوں اور منشویکوں کے ساتھ مل کر مشترکہ پریزیڈم بنانے کو تیار تھے۔جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا لینن اس تجویز پر ناراض ہوگیا تھا۔یہ مصالحت کی طرف پیش قدمی تھی۔مگر مصالحت نہ ہوسکی۔کورنیلوف کے خلاف ہماری مشترکہ جدوجہد کے باوجود تنزتلی نے مشترکہ پریزیڈم بنانے سے انکار کردیا۔

ہمیں پہلے ہی اس کی امید تھی۔پریزیڈم میں ہمارا ایک ممبر بھی ہوتا تو ہمارا مسئلہ حل کرسکتا تھا۔میں نے پوچھا کہ ہمارے مخالفوں کی فہرست میں کرنسکی کا نام شامل تھا کہ نہیں۔کرنسکی پریزیڈم کا ممبر تھا اگرچہ اس نے سوویٹ کے اجلاس میں شرکت کرنے کی کبھی تکلیف گوارہ نہیں کی تھی۔اس مسئلے نے پریزیڈم کو پریشان کردیا۔کرنسکی کو نہ تو کوئی پسند کرتا تھا اور نہ ہی اس کی کوئی عزت تھی۔مگر چونکہ وہ وزیراعظم تھا لہٰذا ہر کوئی خاموش تھا۔پریزیڈم نے ارکان نے ایک دوسرے سے مشورہ کرنے کے بعد جواب دیا''وہ پریزیڈم میں شامل ہے۔''ہمارے لیے اس سے بہتر کیا ہوسکتا تھا۔یہاں میں پیٹروگراڈ سوویٹ کی کاروائی کا ایک اقتباس پیش کررہا ہوں۔''ہم جان گئے کہ کرنسکی پریزیڈم کا ممبر نہیں ہے۔تالیاں)ہمیں اب اپنی غلطی کا احساس ہوا۔کرنسکی کا سایہ چڈزی اور زینویری کے درمیان منڈلا رہا ہے۔جب آپ پریزیڈم کے سیاسی موقف کی منظوری کی بات کرتے ہیں تو آپ اصل میں کرنسکی کی حمایت کررہے ہوتے ہیں(تالیوں کا شور)''اس کے بعد سینکڑوں مندوبین ہماری طرف آگئے۔

سوویٹ کے ارکان کی تعداد تقریباً ایک ہزار تھی۔ووٹنگ کا طریقہ کار دروازے سے باہر چلے جانا تھا۔سوال اب پریزیڈم کی رکنیت کا نہیں بلکہ انقلاب کا تھا اور اس سلسلے میں ارکان میں بڑا ولولہ پایا جارہا تھا۔میں دوستوں کے ایک گروہ کے ساتھ مختلف لابیوں میں گھوم رہا تھا۔ہمارا خیال تھا کہ ہم ووٹوں کی نصف تعداد سے کوئی ایک سو ووٹ کم تھے۔مگر ہم اسے بھی اپنی کامیابی سمجھتے تھے۔پھر ایسا ہوا کہ ہم نے سوشلسٹ-انقلابیوں اور منشویکوں کے مشترکہ ووٹوں سے ایک سو ووٹ زیادہ حاصل کرلیے۔میں صدر بن گیا۔تنزتلی نے اپنا عہدہ چھوڑ دیا اور ایسا کرتے وقت اس نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ ہم سوویٹ میں اتنا ہی عرصہ رہیں جتنا وہ لوگ رہے تھے اور انقلاب کو کامیاب بنائیں۔اس کا مطلب یہ تھا کہ ہمارے

مخالف کم از کم تین ماہ کیلئے ہمارا کھاتہ کھول گئے تھے۔

ان کا اندازہ سخت غلط تھا۔ ہم اقتدار کی طرف بلاشبہ ایک سیدھ میں بڑھ رہے تھے۔

فیصلہ کن رات

انقلاب کا قطعی وقت آ پہنچا تھا۔ سمولنی (مجلس عاملہ کا دفتر) کو ایک قلعے میں تبدیل کیا جا رہا تھا۔ اس کی چھتوں پر دو درجن مشین گن نصب کر دی گئی تھیں۔ یہ پرانی مجلس عاملہ کی روایت تھی۔ سمولنی کا کمانڈنیٹ کپٹن گریکوف ایک بہادر سپاہی تھا۔ دوسری طرف مشین گنوں کا چیف میرے پاس مجھے یہ بتانے آیا کہ اس کی کمپنی بالشویکوں کے ساتھ تھی۔ میں نے کسی کو شاید مارکن کو مشین گنوں کا معائنہ کرنے کو کہا۔ جو بیکار پڑی رہنے سے ناکارہ ہو چکی تھیں۔ سپاہی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے۔ کرنسکی کو تحفظ دینے کا ان کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ مجھے ایک زیادہ بہتر اور قابل اعتماد مشین گن کمپنی وہاں لانی پڑی۔

24 اکتوبر (رائج کیلنڈر کے حساب سے 6 نومبر) کی صبح صادق تھی۔ میں ایک منزل گھوم رہا تھا۔ یہ دیکھنے کیلئے کہ ہر چیز ٹھیک ٹھاک تھی۔ اس سے دوسروں کا حوصلہ بڑھانا بھی مقصود تھا۔ ابھی تھوڑا تھوڑا اندھیرا تھا۔ اس کے باوجود سپاہی اپنی مشین گنوں کو درست کرنے اور انہیں برآمدوں میں ادھر ادھر لے جانے میں لگے ہوئے تھے۔ ان کے بوٹوں کی چست آواز مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ یہ وہ کمپنی تھی جسے میں نے بلایا تھا۔ چند سوشلسٹ - انقلابی اور منشویک جو ابھی تک سمولنی میں موجود تھے، اپنی نیند میں ڈوبے خوفزدہ چہروں سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ توپوں کی موسیقی ان کے نازم کانوں کو گراں گزر رہی تھی۔ ایک کے بعد ایک وہ جلدی سے سمولنی سے چلے گئے۔ اب عمارت پر ہمارا مکمل قبضہ تھا۔ یہاں سے ایک بالشویک سر نے پورے شہر اور ملک کو دیکھنا تھا۔

صبح صبح پارٹی کے چھاپے کے دو کارکن جن میں ایک مرد اور ایک عورت تھی۔ بھاگے بھاگے میرے پاس آئے اور سیڑھیوں میں مجھ سے ٹکرا گئے۔ حکومت نے پیٹروگراڈ سوویٹ اور پارٹی کا اخبار بند اور پرنٹنگ پریس کا احاطہ سر بمہر کر دیا تھا۔ لمحہ بھر کیلئے اس خبر نے ہمیں حیران کر دیا۔

''ہم مہر کو توڑ نہیں سکتے؟'' عورت نے پوچھا۔

''توڑ دو'' میں نے جواب دیا ''ہم آپ کے ساتھ با اعتبار آدمی بھیجتے ہیں۔''

''ہم سے تھوڑے فاصلے پر سپاہیوں کی ایک بٹالین ہے۔ مجھے امید ہے وہ ہماری مدد کرے

گی۔''عورت نے کہا۔

فوجی انقلابی کمیٹی نے فوری طور پر ایک حکم جاری کیا۔(1) انقلابی اخبار کی اشاعت کا کام جاری رہے۔(2) ادارتی سٹاف اور کمپوزر اپنا کام جاری رکھیں۔(3) پرنٹنگ پریس کی حفاظت کا کام لوٹووسکی رجمنٹ اور چھٹی لیپر ریزو بٹالین کے حوالے کر دیا جائے۔اس کے بعد دونوں اخبارات کی اشاعت کا کام کسی رکاوٹ کے بغیر جاری رہا۔

24 اکتوبر کو ٹیلی فون ایکسچینج پر گڑبڑ تھی۔زیر تربیت فوجی کیڈٹوں نے اس پر قبضہ کر لیا اور انہوں نے آپریٹروں کو ہمارے فون ملانے سے منع کر دیا یہ سبوتاژ کی پہلی علامت تھی۔فوجی انقلابی کمیٹی نے جہاز رانوں کی ایک کمپنی وہاں بھیج دی جس نے ایکسچینج کے دروازے پر دو چھوٹی توپیں نصب کر دیں۔ٹیلی فون سروس بحال ہوگئی۔اس طرح انتظامیہ کے اداروں کو تحویل میں لینے کا کام شروع ہو گیا۔

سمولنی کی تیسری منزل پر کونے والے ایک چھوٹے سے کمرے میں کمیٹی کا اجلاس مسلسل جاری تھا۔ فوجوں کی نقل وحرکت، محنت کشوں اور سپاہیوں کا رویہ، بارکوں میں مظاہرہ، قتل عام کے منصوبہ سازوں کے ادارے، بورژوا سیاست دانوں اور غیر ملکی سفارت کاروں کی سازشیں، ''سرمامحل'' میں ہونے والے واقعات --یہ سب رپورٹیں اور سابق سوویٹ میں شامل پارٹیوں کے اجلاس کی خبریں اس چھوٹے سے کمرے میں آ رہی تھیں۔ محنت کش، سپاہی، مزدور، سوشلسٹ فوجی طلباء، نوکر، چھوٹے ملازموں کی بیویاں--سب ہمارے پاس آ رہے تھے اچھی اور بری ہر قسم کی خبریں لے کر۔

وہ سارا ہفتہ میں بمشکل سمولنی سے باہر نکل سکا۔ میں نے لباس تبدیل کیے بغیر چمڑے کے ایک صوفے پر اپنی راتیں گزار دیں۔تھوڑی دیر کیلئے میری آنکھ لگ جاتی اور پھر جاگ جاتا۔ ہرکارے، سائیکلوں والے پیغام رساں، تار والے اور لگاتار ٹیلی فون کالیں، مجھے پل بھر آرام نہ لینے دیتیں۔فیصلہ کن لمحہ بہت نزدیک آ رہا تھا۔اب پلٹ کر دیکھنے کی مہلت نہ رہی تھی۔

24 اکتوبر کی رات کو انقلابی کمیٹی کے رکان مختلف علاقوں مں چلے گئے۔ میں اکیلا رہ گیا۔ بعد میں کامینیف آ گیا۔وہ شورش کے خلاف تھا۔وہ رات میرے ساتھ گزارنے آیا تھا۔ہم دونوں اس چھوٹے سے کونے والے کمرے میں فیصلہ کن رات کو بیٹھے رہے۔جیسے کوئی کپتان پل کی حفاظت پر مامور ہو۔

ہمارے کمرے کے ساتھ ہی ایک بڑی کمرے میں ٹیلی فون بوتھ تھا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی چھوٹے بڑے ہر کام کیلئے لگاتار بجتی رہتی جو خاموشی کو چونکا دیتی۔ پیٹروگراڈ کی ویران' نیم روشن سڑکیں جن پر سمندر سے آنے والی خزاں کی ہوا دندناتی پھر رہی تھی۔ ذرا یہ منظر ذہن میں لائیں۔ بورژوازی اور افسر اپنے بستروں میں بے چین تھے۔ وہ اندازہ لگا رہے تھے کہ ان خطرناک اور پراسرار سڑکوں کو کیا ہو رہا ہوگا۔ محنت کشوں کی آبادیاں جنگی کیمپ میں نیند کی حالت میں تھیں۔ زار کے محلات میں حکومتی جماعتوں کی کانفرنسیں مسلسل تھکاوٹ کی حالت میں جاری تھیں' جہاں جمہوریت بادشاہت کے ابھی تک منڈلانے والے بھوت سے شانے رگڑ رہی تھی ہال کی ریشمی اور مخملی فضا اندھیرے میں ڈوب جاتی ہے۔ اسے روشن رکھنے والے کوئلے کی رسد تھوڑی پڑ گئی ہے۔ اضلاع میں محنت کشوں' سپاہیوں اور جہاز رانوں کی برچمیٹن کھلی آنکھوں سے ہر شے دیکھ رہی ہیں۔ نوجوان پرولتاریوں نے اپنے کندھوں پر رائفلیں اور چھوٹی گنیں رکھی ہوئی ہیں۔ سڑکوں پر ناکے والے خود کو الاؤ سے گرم کر رہے ہیں۔ خزاں کی اس رات کو دارالحکومت کی زندگی ایک واقعہ کے بعد دوسرے واقعہ سے گزر رہی ہے' ٹیلی فون کی چند کالوں کی منتظر ہے۔

شہروں' قصبوں اور دیہی علاقوں سے ساری رپورٹیں شہری منزل پر واقع اس چھوٹے سے کمرے میں آ رہی ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے ہر چیز کا پہلے سے تعین کیا جا چکا ہے۔ ہر راہنما اپنی جگہ پر ہے۔ رابطے پر یقینی طور پر درست ہیں۔ بھول چوک کا کوئی امکان نہیں ہے۔ ہم ہر بات کو ایک مرتبہ پھر ذہن میں دہراتے ہیں۔ یہ فیصلہ کن رات ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے شام کے وقت میں نے سوویٹوں کی دوسری کانگریس کے مندوبین سے کہا تھا۔ ''اگر آپ مضبوطی سے کھڑے ہیں تو خانہ جنگی نہیں ہوگی۔ ہمارا دشمن ہار تسلیم کر لے گا اور آپ کو وہ جگہ مل جائے گی جس کے آپ حق دار ہیں۔'' فتح میں کوئی شک نہیں رہا۔ اس کے باوجود یہ لمحات بڑے نازک اور ہیجان خیز ہیں۔ حکومت نے کل ہی فوج کو نقل و حمل کا حکم دیتے ہوئے جنگی جہاز ''ارورا'' کو نیوا کے پانیوں سے نکل جانے کو کہا ہے۔ یہ وہی بالشویک جہاز ران ہیں جنہیں سکوبی لیف نے ٹوپی ہاتھ میں پکڑ کر اگست میں درخواست کی تھی کہ وہ ''سرمائی محل'' کو کورنیلوف سے بچائیں۔ جہاز رانوں نے فوجی انقلابی کمیٹی سے ہدایت مانگیں۔ ''ارورا'' کو اسی جگہ کھڑا رہنے کیلئے کہا گیا جہاں وہ کھڑا تھا۔ پفلووسک سے ایک ٹیلی فون کال مجھے بتاتی ہے کہ حکومت مختلف جگہوں سے فوج دارالحکومت میں لا رہی ہے۔ کرنسکی نے سرمائی محل میں فوجی طلبا' افسروں اور خواتین کے حفاظتی دستوں کو جمع کر لیا ہے۔ میں

کمساروں کوحکم دیتا ہوں کہ وہ پیٹروگراڈ کی طرف آنے والے ہر راستے پر سرکاری فوجوں کے مقابلے کیلئے مسلح عوام جمع کر دیں۔ ہماری تمام ہدایات اور رپورٹیں ٹیلی فون کے ذریعے آ جا رہی ہیں۔ حکومت کے ایجنٹ انہیں سنتے رہتے ہیں۔ لیکن کیا وہ انہیں روک سکتے ہیں؟

''اگر وہ زبان سے نہ رکیں تو ہتھیار استعمال کرو۔ اس میں جان جانے کا بھی خطرہ ہے۔''

میں وقفے وقفے بعد یہ جملہ دہراتا رہتا ہوں۔ لیکن دل سے نہیں چاہتا کہ ایسا ہو۔ انقلاب وسیر دل رجائی اور نرم خو ہوتا ہے۔ وہ اس میں کامیاب بھی رہتا ہے۔ دشمن عناصر اس کی گرم سانس میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ دن کے آغاز کے وقت (24 اکتوبر کو) حکم جاری کیا جاتا ہے کہ سڑکوں اور گلیوں میں فساد برپا کرنے والوں کو دیکھتے ہی گولی سے اڑا دیا جائے۔ ہمارے دشمن سڑکوں پر آنے کی جرات نہیں کر سکتے۔ وہ چھپ گئے ہیں اب سڑکیں ہماری ہیں ہمارے کمسار پیٹروگراڈ کی طرف آنے والے ہر راستے پر ہوشیار بیٹھے ہیں۔ فوجیوں اور توپچیوں نے حکومت کے حکم کی تعمیل نہیں کی۔ فوجی طلب کا ایک مختصر سا گروہ ہمارا حصار توڑ کر شہر میں داخل ہو جاتا ہے۔ لیکن میں فون پر ان کی نقل وحرکت پر دھیان دیے ہوئے ہوں۔ آخر میں وہ سمولنی میں اپنا وفد بھیج دیتے ہیں۔ حکومت مدد حاصل کرنے میں لگی ہوئی ہے۔ مگر اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین سرک رہی ہے۔

سمولنی کے بیرونی حصار کو مشین گنوں کی ایک نئی رجمنٹ سے دہرا کو مضبوط کر دیا گیا ہے۔ تمام گریژنوں سے رابطہ بغیر کسی رکاوٹ کے بحال ہے۔ ڈیوٹی پر موجود سپاہی پوری طرح چوکنے ہیں۔ اور مخالف فوجوں پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ کمسار اپنی اپنی جگہوں پر ہیں۔ ہر گیریژن سے سپاہی سمولنی آئے ہوئے ہیں تا کہ کسی گیریژن سے رابطہ ٹوٹ جانے پر انہیں استعمال کیا جا سکے۔ اضلاع سے آئے ہوئے مسلح لوگوں کی ٹولیاں سڑکوں پر مارچ کر رہی ہیں۔ وہ ایک کے بعد دوسرے ادارے پر قابض ہو رہی ہیں۔ ان کا ہر جگہ دوستوں کی طرح بے صبری سے انتظار کیا جا رہا ہے۔ ریلوے ٹرمینلوں پر خاص طور پر متعین کیے گئے کمسار آنے جانے والی ٹرینوں کی نگرانی کر رہے ہیں۔ یہاں سے کوئی پریشان کن خبر نہیں آ رہی۔ ہم شہر کی ہر اہم جگہ پر کسی مزاحمت اور قتل وغارت کے بغیر قبضہ کر رہے ہیں۔ ٹیلی فون بتاتا رہتا ہے۔ ''ہم یہاں ہیں۔''

سب کچھ ٹھیک طرح ہو رہا ہے۔ اس سے زیادہ اور کیا ٹھیک طور پر ہو سکتا تھا۔ اب مجھے ٹیلی فون

سے اٹھ جانا چاہیے۔ میں صوفے پر بیٹھ جاتا ہوں۔ اعصابی تناؤ کم ہو جاتا ہے۔ تھکاوٹ کی ایک مردہ سرسراہٹ مجھے دبوچ لیتی ہے۔

''مجھے ایک سگریٹ دو۔'' میں کامینیف سے کہتا ہوں۔ (ان دنوں میں سگریٹ پیتا تھا مگر کبھی کبھار) میں دو ایک کش لیتا ہوں۔ پھر میرے منہ سے یہ لفظ نکلتے ہیں۔ اسی کی کمی تھی۔'' اور میں بے ہوش ہو جاتا ہوں۔ (بیماری یا جسمانی تکلیف کی حالت میں بے ہوش ہو جانے کی بیماری میں نے اپنی ماں سے ورثے میں پائی تھی۔ اسی لیے بعض امریکی ڈاکٹروں نے مجھے مرگی کا مریض کہا تھا) ہوش میں آنے پر میں کامینیف کا خوف زدہ چہرہ خود پر جھکا ہوا دیکھتا ہوں۔

''کوئی دوا لاؤں؟'' وہ پوچھتا ہے۔

''ٹھیک ہو جاوں گا۔'' میں جواب دیتا ہوں ''کھانے کو کچھ ہے؟'' میں پوچھتا ہوں۔ میں یاد کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ آخری بار میں نے کب کچھ کھایا تھا۔ کچھ یاد نہیں آتا۔ بہر حال کل تک تو میں نے کچھ نہیں کھایا تھا۔

دوسری صبح میں بورژوا اور منشویک پاپولسٹ اخباروں پر جھپٹ پڑتا ہوں- شورش کے بارے میں ان میں ایک لفظ بھی نہیں تھا۔ اس سے پہلے وہ قتل و غارت شورش اور خون کے دریا بہ جانے کی باتیں کرتے رہتے تھے۔ اب جب کہ شورش واقعی برپا ہو چکی تھی وہ اس کے متعلق مجرمانہ خاموشی اختیار کیے ہوئے تھے۔ وہ جنرل سٹاف سے ہامری بات چیت کو ہماری کمزوری اور ہمارے سفارتی بیانات کو ہماری متلون مزاجی سمجھ رہے تھے۔ اس دوران میں کسی افراتفری، سڑکوں پر لڑائی یا خون خرابے کے بغیر ایک ادارے کے بعد دوسرے ادارے پر ہمارے سپاہی، جہاز ران اور سرخ گارڈ سمولنی سے جاری ہونے والے احکامات پر عمل کر کے قبضہ کرتے جا رہے تھے۔

اگلی صبح پیٹروگراڈ کے شہری ایک نئی حکومت کی خبر کے تحت اپنی حیرت زدہ آنکھیں ملتے ہوئے بیدار ہوئے۔ یہ کیسے ممکن ہوا کہ اقتدار بالشویکوں کے ہاتھ میں آ گیا تھا؟ میونسپل ڈوما کا ایک وفد مجھے ملنے کیلئے آیا اور مجھ سے چند عجیب قسم کے سوال پوچھے۔'' آپ لوگ کوئی فوجی اقدام کریں گے۔؟ اگر ایسا ہے تو کس لیے اور کب؟ ڈوما کو معلوم ہے؟ چوبیس گھنٹوں میں کیا ہونے والا ہے؟ سوویٹ نے امن و امان بحال کرنے اور عوام کو تحفظ کیلئے کیا کیا ہے؟'' اسی قسم کے دوسرے سوالات۔

میں نے انقلاب کا جدلیاتی پہلو سامنے رکھتے ہوئے جوابات دیے اور ڈوما کو دعوت دی کہ وہ فوجی انقلابی کمیٹی کے کام میں حصہ لینے کیلئے اپنا وفد بھیجے۔ اس بات نے انہیں شورش سے زیادہ خوف زدہ کر دیا۔ میں نے اپنے دفاع پر بات ختم کی۔ اگر رہی سہی حکومت نے طاقت کا استعمال کی تو جواب طاقت سے دیا جائے گا۔''

''ہم سوویٹوں کو اقتدار دینے کے خلاف تھے۔ کیا آپ ڈوما ختم کر دیں گے؟''

میں نے جواب دیا۔''موجودہ ڈوما گزر جانے والے کل کی ترجمانی کرتا ہے۔ اگر کوئی جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا تو ہم عوام سے کہیں گے کہ وہ اقتدار کے مسئلے پر نیا ڈوما چن لیں۔'' وفد جیسے خالی ہاتھ آیا تھا ویسے ہی چلا گیا۔ مگر وہ اپنے ساتھ ہماری یقینی فتح کا احساس لے کر گیا۔ راتوں رات بہت کچھ بدل گیا تھا۔ تین ہفتے پہلے ہم نے پیٹروگراڈ سوویٹ میں اکثریت حاصل کی تھی۔ ہمارے پاس کچھ بھی نہیں تھا' نہ پرنٹنگ پریس، نہ فنڈز، نہ کوئی شاخ۔ کل رات ہی حکومت نے فوجی انقلابی کمیٹی کے ارکان کی گرفتاری کے احکام جاری کیے تھے اور وہ ہمارا سراغ لگا رہی تھی۔ مگر آج میونسپل ڈوما کا ایک وفد اسی کمیٹی سے اپنی قسمت کے متعلق پوچھنے آ گیا تھا۔

سرمامحل میں حکومت کا اجلاس ابھی تک جاری تھا۔ مگر اب یہ ایک شیڈو حکومت تھی۔ سیاسی طور پر اس کا وجود ختم ہو چکا تھا۔ 25 اکتوبر کو ہماری فوجوں نے سرمامحل کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ایک بجے دوپہر کو میں نے صورتحال کے بارے میں پیٹروگراڈ سوویٹ کے سامنے ایک بیان دیا۔ اخبارات نے اسے کچھ اس طرح شائع کیا۔''فوجی انقلابی کمیٹی کی طرف سے میں اعلان کرتا ہوں کہ عبوری حکومت کا اب کوئی وجود نہیں ہے۔ (تالیاں) بعض وزیروں کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ (بہت خوب) دوسرے بھی چند گھنٹوں یا دنوں میں گرفتار کر لیے جائیں گے۔ (تالیاں) فوجی انقلابی کمیٹی کے حکم پر گیریژن نے پارلیمنٹ کا اجلاس ختم کر دیا ہے۔ (بلند تالیاں) ہم ساری رات چوکسی کی حالت میں انقلابی سپاہیوں کو رجمنٹوں اور محنت کشوں کے دستوں کو ٹیلی فون پر ہدایات دیتے رہے۔ وہ خاموشی سے اپنا کام کرنے میں مصروف رہے۔ شہری ساری رات امن سے سوئے رہے۔ انہیں معلوم ہی نہیں ہوا کہ اقتدار ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں چلا گیا تھا۔ ریلوے سٹیشن' ڈاک خانہ' تار گھر' پیٹروگراڈ' ٹیلی فون ایجنسی اور سٹیٹ بینک -- سب پر ہمارا قبضہ ہو چکا ہے۔ (بلند تالیاں) سرمامحل پر ابھی قبضہ نہیں ہوا۔ اس کی قسمت کا بھی

چند منٹ میں فیصلہ ہو جائے گا۔(تحسین کے نعرے)''

ممکن ہے کہ سادہ بیان اجتماع کے موڑ کے متعلق کوئی غلط تاثر قائم کر دے۔ میرے حافظے میں اس کی بعض تفصیلات موجود ہیں۔ جب میں نے سوویت کے اجلاس میں رات کے دوران میں وقوع پذیر ہونے والی تبدیلی کا ذکر کیا تو چند لمحوں تک ایک گھمبیر خاموشی چھا گئی۔ پھر تالیاں بجنے لگیں، پر زور نہیں بلکہ سوچ سے بھری تالیاں۔ اجتماع ہیجان کیفیت میں تھا اور خود کو جدوجہد کیلئے تیار کر رہا تھا۔ دوسری طرف محنت کش طبقے کو ایک ناقابل بیان ولولے نے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ لیکن جب ہم نے اقتدار کی دہلیز پر قدم رکھا تو یہی بے قابو ولولہ ایک پریشان قسم کے تفکر میں ڈھل گیا۔ ایک اندیشے نے اس لمحے خود کو ظاہر کیا۔ پرانے لوگوں اور نظام نے ہماری سخت مزاحمت کرنی تھی۔ ہمارے سامنے جدوجہد تھی، بھوک تھی، سردیاں آ رہی تھیں، خون اور موت دکھائی دے رہے تھے۔ ''کیا ہم ان سب پر قابو پالیں گے؟'' ہم اپنے آپ سے پوچھ رہے تھے۔ یہ سب ایک پریشان کن صورتحال کا ردعمل تھا۔ ''ہم قابو پالیں گے'' سب کا ایک ہی جواب تھا۔ نئے خطرے ابھی دور کہیں منڈلا رہے تھے۔ لیکن ایک عظیم فتح کا احساس ہمارے دل میں اتر گیا تھا اور خون کے اندر کہیں سرسرا رہا تھا اس احساس نے اس استقبالیے میں اپنا اظہار پایا جس کا انتظام لینن کی آمد پر کیا گیا تھا۔ لینن چار ماہ کی غیر حاضری کے بعد لوگوں کے سامنے آیا تھا۔

اسی شام جب ہم سوویٹوں کی کانگریس کے افتتاح کا انتظار کر رہے تھے تو لینن اور میں ہال سے ملحقہ ایک کمرے میں آرام کر رہے تھے۔ کمرہ بالکل خالی تھا، ماسوا کرسیوں کے۔ کسی نے ہمارے لیے فرش پر کمبل بچھا دیا۔ شاید وہ لینن کی بہن تھی جو ہمارے لئے سرہانے لائی تھی۔ ہم ساتھ ساتھ لیٹے ہوئے تھے۔ جسم اور روح تنے ہوئے تاروں کی طرح تھے۔ ہم نے یہ آرام بڑی محنت کے بعد کمایا تھا۔ نیند نہیں آ رہی تھی۔ لہٰذا ہم مدھم آواز میں باتیں کرنے لگے۔ شورش ختم کرنے خیال سے لینن اب مصالحت کر چکا تھا۔ اس کے اندر پلنے والے ڈر دور ہو گئے۔ اس کی آواز میں ایک ایسا خلوص تھا جو شاذ ہی نظر آتا تھا۔ وہ سرخ گارڈوں، سپاہیوں اور جہاز رانوں کے ان ملے جلے ناکوں کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ جو شہر ی ہر جگہ لگے ہوئے تھے۔ ''یہ کیسا حیرت ناک نظارہ ہے۔ محنت کش نے سپاہی کے پہلو بہ پہلو ہاتھ میں پکڑی ہوئی ہے اور آگ تاپ رہے رہے ہیں'' وہ اپنے گہرے احساس کو دہرائے جا رہا تھا۔ آخر کار محنت کش اور سپاہی ایک جگہ اکٹھے ہو گئے تھے۔

پھر وہ اچانک بولنے لگا۔''سرمامحل کا کیا ہوگا؟ اس پر ابھی تک قبضہ نہیں ہوا۔اس میں کوئی خطرہ تونہیں ہے؟''

میں سرمامحل آپریشن کے متعلق فون پر پوچھنے کیلئے اٹھا مگر اس نے مجھے روک دیا۔''تم لیٹے رہو۔میں کسی اور کو بھیج دیتا ہوں۔''ہم زیادہ دیر تک آرام نہ کر سکے۔سوویٹوں کی کانگریس کا اجلاس ہال میں شروع ہورہا تھا۔لینن کی بہن الانوفا مجھے لینے بھاگی بھاگی آئی۔

''ڈان تقریر کررہا ہے۔لوگ تمہاری تقریر سننا چاہتے ہیں۔''

ڈان اپنی بار بار ٹوٹ جانے والی آواز میں سازشیوں کو لعن طعن کرنے کے علاوہ شورش کے ناگزیر انہدام کی پیشن گوئی کررہا تھا۔اس کا مطالبہ تھا کہ ہم سوشلسٹ انقلابیوں اور منشویکوں کے ساتھ اتحاد کرلیں۔جو پارٹیاں کل تک اقتدار میں تھیں اور جو شکاری کتوں کی طرح ہمارا پیچھا کرکے ہمیں جیل میں ڈال رہی تھیں' اب اقتدار چھن جانے پر ہمارے ساتھ اتحاد کا مطالبہ کررہی تھیں۔

میں نے ڈان کا جواب دیا۔اس جواب میں انقلاب کا گزر جانے والا کل بھی شامل تھا۔''ایک شورش برپا ہوئی ہے۔یہ کوئی سازش نہیں ہے۔عوام کی بیداری کی کوئی منطق نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کا جواز تلاش کیا جاتا ہے۔ہم محنت کشوں کی اور سپاہیوں کی انقلابی طاقت کو مضبوط کررہے تھے۔ایک عوامی شورش کیلئے ہم کھلم کھلا لوگوں کی رضا کو آگے لے جارہے تھے۔ہماری شورش جیت گئی ہے۔اب ہم سے کہا جارہا ہے کہ ہم اپنی فتح کو بھول جائیں' اتحاد کرلیں۔مگر کس کے ساتھ؟ تم تو بکھرے اور ٹوٹے ہوئے لوگ ہو۔تم دیوالیہ ہو چکے ہو۔تمہارا کام ختم ہو چکا ہے۔اب جہاں تمہاری جگہ ہے وہاں چلے جاؤ۔تاریخ کے کوڑا گھر میں۔

3 'اپریل کو جو مکالمہ شروع ہوا تھا' پیٹروگراڈ میں لینن کی آمد کے دن وہ مکمل ہوگیا۔

''ٹراٹسکی ازم'' 1917ء میں

1904ء کے بعد میں نے دونوں سوشل ڈیمو کریٹک دھڑوں سے باہر رہنا پسند کیا۔1905-1907ء کے انقلاب میں میں بالشویکوں کے ساتھ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کھڑا تھا۔پسپائی اور ردعمل کے دنوں میں میں مارکسی لٹریچر کے ذریعے منشویکوں کی مخالفت میں انقلابی طریقہ کار کا دفاع کرتا

رہا۔۔مجھے امید تھی کہ منشویک تھوڑا زیادہ بائیں جانب جھک جائیں گے‘ میں پارٹی کو متحد کرنے میں اپنی کوشش میں لگا رہا۔مگر جنگ چھڑنے تک میں اپنی کوشش سے قطعی طور پر مایوس ہو چکا تھا۔ نیو یارک میں مارچ 1917ء کے آغاز میں میں روسی انقلاب کے تناظر اور طبقاتی طاقتوں کے موضوع پر مضامین کا ایک سلسلہ لکھتا رہا۔انہیں دنوں میں لینن جنیوا سے ’’باہر سے خطوط‘‘ کے نام سے مضامین پیٹروگراڈ روانہ کرتا رہا۔ اگر چہ ہم دونوں ایک دوسرے سے جدا تھے اور دنیا کے مختلف علاقوں میں بیٹھے ہوئے تھے مگر صورتحال کے بارے میں ہمارا تجزیہ اور پیشن گوئی ایک جیسے ہی تھے۔ اس کے علاوہ کسانوں بورژازی‘ عبوری حکومت‘ جنگ اور عالمی انقلاب کی طرف ہمارے نقطہ ہائے نظر بھی ایک جیسے تھے۔ یہی وہ مقام تھا جہاں ’’ٹراٹسکی ازم‘‘ اور لینن ازم کے درمیان تاریخ کے سنگھم پر ایک تعلق پیدا ہوا۔ پھر میں کیماوی طور پر ایک صاف ستھرے تجربے میں لگ گیا۔ اس وقت لینن کیا کر رہا تھا مجھے کچھ علم نہیں تھا۔ میں نے انقلاب کے اپنے تجربے اور اپنے نظریے کے مطابق استدلال قائم کیا تھا اور بالکل لینن جیسی ہی حکمت عملی اور نقطہ نظر اپنائے تھے۔

میرے خیال میں مسئلہ سب کے سامنے واضح تھا اور اس کا قابل قبول عالمی حل بھی سب کے سامنے تھا۔لیکن 4 اپریل 1917ء سے پہلے جب لینن باہر سے پہلی مرتبہ پیٹروگراڈ آیا تو اس کا ایک ذاتی نقطہ نظر تھا جس کا کوئی حامی نہیں تھا۔اس وقت روس کے اندر موجود پارٹی کا کوئی راہنما بھی پرولتاریہ کی آمریت کو اپنی پالیسی کا حصہ بنانے کو تیار نہیں تھا۔ لینن کے آنے پر جو پارٹی کانفرنس بلائی گئی اس میں تقریباً تیس بالشویک شریک ہوئے اور ہر ایک جمہوریت قائم کرنے کے حق میں تھا۔اس کانفرنس کی کاروائی اگر ابھی تک خفیہ راز میں رکھی گئی ہے تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ سٹالن‘ گجکوف اور ملی کوف کی عبوری حکومت اور منشویکوں اور بالشویکوں کے ادغام کے حق میں تھا۔اسی سے ملتا جلتا بلکہ کچھ موقع پرستانہ موقف ریکوف‘ کامینیف‘ مولوٹوف‘ ٹامسکی اور آج کے دوسرے راہنماؤں اور نیم راہنماؤں کا تھا۔فروری انقلاب کے دوران میں یوکرانی مجلس عاملہ کا چیئرمین یارسلاوسکی دوسرے منشویکوں کے ساتھ مل کر سوشل ڈیموکریٹ نامی ایک پرچہ یاکوتست سے شائع کر رہے تھے جس میں بے ہودہ قسم کی موقع پرستی اور صوبائیت کا مظاہرہ کیا جا رہا تھا۔اس سے شائع ہونے والے یارسلاوسکی کے مضامین اگر آج کتاب کی شکل میں شائع کیے جائیں تو بطور سیاسی مفکر اس کا ستیاناس ہو جائے۔اس قسم کے لوگ آج

لینن ازم کے محافظ بنے بیٹھے ہیں۔

میں جانتا ہوں لینن کی زندگی میں اپنی وفاداری ثابت کرنے کی خاطر یہ لوگ کس کس طرح اس کے سوانگ بھرا کرتے تھے۔لیکن 1917ء کے آغاز ہی سے وہ اپنی من مانی پراتر آئے۔سیاسی صورتحال بڑی مشکل تھی۔ان کے لئے اب یہ دکھانے کا موقع کیا تھا کہ انہوں نے لینن سے کیا سیکھا تھا اور لینن کے بغیر وہ کیا کر سکتے تھے۔وہ اپنے اندر سے کسی ایک آدمی کا نام لے کر دکھائیں جس نے جنیوا میں لینن یا نیویارک میں مجھ جیسی حیثیت حاصل کی تھی۔وہ کوئی نام لے ہی نہیں سکتے۔لینن کے آنے سے پہلے پیٹرو گراڈ میں ''پراودا'' کے ایڈیٹر سٹالن اور کامینیف تھے۔ان کی ادارت میں شائع ہونے والے ''پراودا'' کے سارے پرچے نکال کر دیکھ لیں۔وہ تنگ نظری، اندھے پن اور موقع پرستی سے بھرے ہوں گے۔اس کے باوجود عوام اپنے اقتدار کی جنگ کی طرف دوڑ رہے تھے۔اس کے سوا اور کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔

پسپائی اور ردعمل میں نظریاتی پیش بینی کی ضرورت ہوتی ہے تا کہ مستقل انقلاب کے امکانات کا جائزہ لیا جا سکے۔مارچ 1917ء میں اقتدار حاصل کرنے کے سیاسی نعرے سے زیادہ کسی اور چیز کی ضرورت نہیں تھی۔موجودہ راہنماؤں میں سے کسی کے اندر بھی آنے والے حالات دیکھنے کی صلاحیت نہیں تھی۔وہ بورژوا جمہوریت سے آگے دیکھ ہی نہیں سکتے تھے۔وہ تاریخ کی آزمائش پراترنے کے اہل ہی نہیں تھے۔

میں لینن کے ایک ماہ بعد پیٹروگراڈ آیا تھا۔یہ ایک ماہ لائیڈ جارج نے مجھے کینیڈا میں روکے رکھا تھا۔اس وقت تک پارٹی میں صورتحال خاصی تبدیل ہو چکی تھی۔لینن نے عوام سے اپنے نااہل راہنماؤں کے متعلق معذرت کا اظہار کیا تھا۔اس نے پارٹی کے اندر ''پرانے بالشویکوں'' کے خلاف ایک باقاعدہ جنگ شروع کر دی تھی۔یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے ایک سے زیادہ مرتبہ پارٹی کی تاریخ میں پرانی غلطیاں دہرا کر اپنی نااہلی کا ثبوت دیا تھا اور نئی صورتحال اور نئی حقیقتوں کو سمجھنے سے قاصر رہے تھے۔کامینیف اور ریکوف نے مزاحمت کی کوشش کی۔سٹالن خاموشی سے ایک طرف ہو گیا۔اس زمانے میں اس کے تحریر کردہ مضامین مین سے ایک بھی یہ ظاہر نہیں کرتا کہ اس نے اپنی سابقہ پالیسی پر نظر ثانی کر کے لینن کے موقف کی تائید کرنے کی کوشش کی تھی۔وہ فقط خاموش رہتا تھا۔وجہ یہ تھی کہ وہ انقلاب کے پہلے ماہ میں اپنی پرانی

قیادت سے ضرورت سے زیادہ سمجھوتہ کر چکا تھا۔اوراب پس منظر میں چلے جانا بہترخیال کیا تھا۔اس نے لینن کے نقطہ نظر کے دفاع میں کوئی عوامی تقریر نہ کی۔ وہ پیچھے کھڑاانتظار کرتا رہا۔شورش کیلئے نظریاتی اور سیاسی تیاریوں کے بے حد اہم دنوں میں سٹالن کا سیاسی وجودہمیں دکھائی نہ دیا۔

روس میں میری آمد کے وقت بہت سی جمہوری سیاسی پارٹیاں موجود تھیں جن میں بالشویک اور منشویک کے دھڑے بھی شامل تھے۔ یہ اس موقف کا منطقی نتیجہ تھا جو سٹالن' کامینیف اور دوسروں نے انقلاب کے ابتدائی دنوں میں ہی نہیں بلکہ جنگ کے دوران میں بھی اختیار کیے رکھا تھا۔ یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ جنگ کے دنوں سٹالن کی حیثیت کا کسی کو کچھ علم نہیں تھا۔اس اہم مسئلے پرتواس نے کبھی ایک سطر بھی نہیں لکھی تھی۔آج دنیا کی تمام مارکسی نصاب کی کتابوں میں یہ لکھا ہوا ہے کہ ٹراٹسکی نے 1912ء میں بالشویکوں اورمنشویکوں کے درمیان اتحاد قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔لیکن اس حقیقت کا کبھی کسی نے ذکر نہیں کیا کہ سٹالن مارچ 1917ء میں تسزتلی کی پارٹی سے اتحاد کی وکالت کرتا رہا تھا۔ یہ لینن ہی تھا جس نے 1917ء کے وسط میں پارٹی کو اس دلدل سے باہر نکالا تھا جس میں پارٹی کے آج کے تخریب کاروں نے اسے دھکیل دیا تھا۔ان میں سے کوئی بھی انقلاب کی اہمیت اورسمت کوسمجھنے کا اہل نہیں تھا۔ یہ ٹراٹسکی ازم ہی تھا جوصورتحال کوکل بھی اورآج بھی واضح طور پرسمجھتا ہے۔

پیٹروگراڈ آنے پر جب میں نے کامینیف کو بتایا کہ میں لینن کے ''اپریل نظریے'' سے پوری طرح متفق تھا جس نے پارٹی کوایک نئی راہ دکھائی تھی' تو وہ بولا۔''میرا جواب انکار میں ہے'' پارٹی میں شرکت کرنے سے پہلے میں نے اس کی بے حد اہم دستاویزیں تیار کیں۔اس وقت کسی کے ذہن میں یہ نہیں آیا تھا کہ مجھ سے پوچھے کہ کیا میں نے ''ٹراٹسکی ازم'' چھوڑ دیا تھا' جیسا کہ بعد میں پارٹی کے زوال پذیر ٹھیکے دار پوچھتے رہے تھے۔ان دنوں ٹراٹسکی ازم اورلینن ازم میں تصادم کی باتیں پارٹی کا ایک نمایاں گروہ کر رہا تھا جس کا کہنا تھا کہ لینن ازم پرٹراٹسکی کی چھاپ لگتی جارہی تھی۔کامینیف یہ بات کھلم کھلا اور اصرار کے ساتھ کہتا پھرتا تھا۔ دوسرے احتیاط سے ساتھ اور پیٹھ پیچھے کہتے تھے۔ روس آنے پر بہت سے ''پرانے بالشویکوں'' نے مجھ سے کہا۔''اب تو گلیوں اورسڑکوں پرتمہارا جشن منایا جانا چاہیے۔'' مجھے ان کو بتانا پڑتا تھا کہ لینن میرے نقطہ نظر کی طرف نہیں آیا تھا بلکہ اس نے نقطہ نظر اپنے طور پرواقعات کے پیش نظر وضع کیا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ دونوں نقطہ ہائے نظر میں مماثلت پیدا ہوگئی تھی۔اورواقعی ایسا ہی ہوا تھا۔

ہماری ابتدائی اور جولائی کے بعد کی میٹنگوں میں بھی لینن اپنی ظاہری خاموشی کے باوجود اپنے داخلی ارتکاز کی جھلک دکھا جاتا تھا۔ جس تحریک کی علامت ان دنوں کرنسکی بنا ہوا تھا وہ کبھی بڑی طاقت ور تھی۔ بالشویک ان دنوں ایک غیر اہم فریق کی شکل میں تھے اور سرکاری طور پر بھی انہیں ایسا ہی سمجھا جاتا تھا۔ پارٹی کو بھی احساس نہیں تھا کہ کل یہ فریق کس قدر مضبوط ہو جائے گا۔ لینن کی قیادت میں یہ اپنے عظیم ترین کاموں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں لینن سے کام سیکھنے کے ساتھ اس کی مدد بھی کرتا رہتا تھا۔

اکتوبر انقلاب سے دو ماہ پہلے میں نے لکھا۔ ''بین الاقوامیت ہمارے لئے کوئی تجریدی خیال نہیں ہے کہ موقع آنے پر اس سے غداری کی جائے (تزتلی اور چرنوف نے ایسا ہی کیا تھا) یہ تو ایک راہنما اور عملی اصول ہے۔ یورپ میں انقلاب کے بغیر ہمارے لئے ایک پائیدار اور فیصلہ کن کامیابی کا تصور محال ہے۔'' اس وقت تک میں سٹالن کو ''سوشلزم کے فلسفی'' کے طور پر کوئی جگہ نہیں دیتا تھا۔ تزتلی اور چرنوف بھی اس کے ساتھ شامل ہیں۔ میں نے اپنے مضمون کا اختتام ان الفاظ پر کیا۔ ''مستقبل قتل و غارت گری کے مقابلے میں مستقل انقلاب، یہی وہ جدوجہد ہے جس میں انسان کا مستقبل داؤ پر لگا ہوا ہے۔'' یہ مضمون پارٹی کے مرکزی رسالے میں 7 ستمبر کو شائع ہوا بعد میں اسے کتابچے کی شکل میں بھی شائع کیا گیا۔ میرے موجودہ نکتہ چینی اس وقت میرے مستقل انقلاب کے نعرے پر کیوں خاموش بیٹھے رہے؟ اس وقت وہ کہاں تھے؟ سٹالن جیسے بعض لوگ ایک محتاط خاموشی سے ادھر ادھر جھانکتے رہتے۔ زینوشیف جیسے لوگ میزوں کے نیچے چھپ کر بیٹھ گئے۔ ہر اہم سوال یہ ہے: لینن میرے مستقل انقلاب کا نعرہ کیسے خاموشی سے برداشت کر سکتا تھا؟ وہ بے اعتنائی اور درگزر کا بالکل قائل نہیں تھا۔ پارٹی کے مرکزی ترجمان پرچے میں وہ ''ٹراٹسکی ازم'' کی تبلیغ کیسے گوارا کر سکتا تھا؟

یکم نومبر 1917ء کو پیٹروگراڈ کمیٹی کے تاریخی اجلاس میں (تاریخ اس لحاظ سے کہ اسے ابھی تک خفیہ رکھی گئی ہے) لینن نے کہا تھا کہ ٹراٹسکی کو یہ یقین ہو جانے کے بعد کہ منشویکوں سے اتحاد کا کوئی امکان باقی نہیں رہا، اس سے بڑا کوئی بالشویک ہے ہی نہیں۔ یہ بات اس نے ایک دفعہ نہیں بار بار وضاحت سے کہی تھی۔ یہ مستقبل انقلاب کا نظریہ نہیں تھا جس نے ہمارے راستے الگ کیے تھے بلکہ منشویکوں کی طرف رویے کا چھوٹا موٹا اختلاف تھا۔

انقلاب کے دو سال بعد لینن نے نگاہ واپسی ڈالتے ہوئے لکھا تھا۔ ''اقتدار حاصل کرنے اور

سوویٹ جمہوریہ تشکیل دیتے وقت بالشویک ازم نے ان سارے سوشلسٹ خیالات کو اپنے اندر سمولیا تھا جو اس کے قریب ترین تھے۔'' کیا اس وقت لینن کے ذہن میں کوئی ایسی چیز موجود تھی جسے اب ''تاریخی ٹراٹسکی ازم'' کا نام دیا جا رہا ہے؟ جو کچھ میں کہہ رہا تھا اس سے زیادہ بالشویک ازم کے نزدیک ترین کیا ہوسکتا تھا؟ اور پھر لینن نے ذہن میں اور کون ہوسکتا تھا؟ کیا مارسل کا چن یا تھال مان؟ جب لینن نے ماضی میں پارٹی میں داخل ہونے والے نئے خیالات کا مجموعی طور پر جائزہ لیا تو اسے ٹراٹسکی ازم سوشلسٹ نظریے کا متحارب یا اجنبی نظریہ نہیں بلکہ بالشویک ازم کے بالکل نزدیک دکھائی دیا۔

پارٹی کے اندر خیالات کے پروان چڑھنے کا وہ حقیقی طریقہ نہیں ہے جو ہم آج دیکھ رہے ہیں۔ لینن کی موت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے تخریب کاروں اور قتل و غارت کے حامیوں نے پارٹی کا حلیہ بگاڑ دیا ہے۔

اقتدار میں آنا

ملک کی زندگی میں اور فرد کی زندگی میں وہ غیر معمولی دن تھے۔ سماجی اور ذاتی جذبات میں تناؤ عروج پر پہنچا ہوا تھا۔ عوام ایک دستان رقم کر رہے تھے۔ رہنما تاریخ کے قدموں پر قدم رکھ کر چل رہے تھے۔ ان دنوں جو فیصلے اور حکم جاری کیے جا رہے تھے ان پر پوری قوم کی تقدیر کا انحصار تھا۔ اس کے باوجود وہ فیصلے کسی مشترکہ سوچ بچار کے بغیر ہو رہے تھے۔ میں تو یہ بھی کہوں گا کہ انہیں مناسب طور پر جانچا اور پرکھا بھی نہیں جاتا تھا۔ وہ فوری طور پر کی جاتے اس کے باوجود کچھ ایسے بڑے بھی نہیں ہوتے تھے۔ واقعات کا دباؤ اور کام اس قدر زیادہ تھا کہ اہم سے اہم فیصلہ بھی ایک دم کرنا پڑتا اور لوگ بھی اسے خوش دلی سے قبول کر لیتے۔ راستے کا تعین ہو چکا تھا۔ میں یہ بتانے کی ضرورت تھی کہ کرنا کیا تھا۔ کسی بحث کی ضرورت نہیں تھی اور ایسا ہوتا بھی نہیں تھا۔ صورتحال کے پیش نظر عوام کو جو کچھ کرنے کو کہا جاتا وہ فوراً تیار ہو جاتے۔ حالات کے دباؤ کے تحت ان کے ''راہنما'' بھی ان کی اور تاریخ کی ضروریات کو مدنظر رکھے ہوئے تھے۔

مارکسزم کا خیال ہے کہ وہ تاریخ کے لاشعوری عمل کا شعوری اظہار ہے نفسیاتی طور پر نہیں بلکہ تاریخی فلسفیانہ اصطلاح میں لاشعوری عمل کسی بلند ترین نکتے پر اپنے شعوری اظہار سے مل جاتا ہے۔ مگر یہ اس

وقت ہوتا ہے جب عوام کسی غیر معمولی دباؤ کے تحت اپنا سماجی روزمرہ توڑ کر تاریخی ترقی کی بڑی ضرورتوں کو ایک فتح مندانہ اظہار دیتے ہیں۔ ایسے وقت میں عوام کو کسی نظریے وغیرہ کا خیال نہیں رہتا۔ وہ لاشعوری طور پر تاریخ کی ضرورتیں پوری کر رہے ہوتے ہیں۔ شعور اور لاشعور کے اتحاد کو عام طور پر ''الہام'' کا نام دیا جاتا ہے۔ تاریخ کے پرجوش ہیجان کا نام ہے۔

ہر حقیقی ادیب کو اپنے تخلیقی لمحات کا علم ہوتا ہے۔ اس وقت کوئی مضبوط شے اس کے ہاتھ کی راہنمائی کر رہی ہوتی ہے۔ ہر حقیقی مقرر کو بھی ایسے لمحات کا تجربہ ہوتا ہے جب اس کی روزمرہ کی ذات سے زیادہ مضبوط کوئی چیز اس کے اندر سے بولنے لگتی ہے۔ اس چیز کا نام ''الہام'' ہے۔ یہ انسان کی اپنی تخلیقی قوتوں کا بلند ترین مقام ہوتا ہے۔ پھر لاشعور اپنے گہرے کنویں سے نکلتا ہے اور شعور کو اپنا غلام بنا لیتا ہے۔ دونوں مل کر ایک بڑے ملاپ کی طرف چل پڑتے ہیں۔

اسی طرح عوام کی تحریک سے وابستہ کسی ذاتی سرگرمی میں بھی کبھی کوئی روحانی طاقت سرایت کر جاتی ہے۔ اکتوبر انقلاب کے دنوں میں اس کے راہنماؤں کے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا۔ ان کی تمام سوئی ہوئی طاقتیں بیدار ہو کر انقلاب کی نذر ہو گئی تھیں۔

بیرونی طور پر انقلاب کوئی بڑی بات دکھائی نہیں دیتا تھا۔ لوگوں کا روزمرہ وہی تھا۔ وہ کھیلتے بھی تھے، انہیں بھوک بھی لگتی تھی، وہ نہاتے بھی نہیں تھے، ان کی آنکھیں سوجھی اور داڑھی بڑھی ہوتی تھی۔ بعد میں انہیں وہ نازک دن اور لمحے یاد بھی نہیں رہے تھے۔

اس سلسلے میں میری بیوی کی ایک تحریر سے اقتباس درج کر رہا ہوں:

''اکتوبر انقلاب کی تیاریوں کے آخری ایام میں ہم تورڈ سٹریٹ میں رہتے تھے۔ لیوڈیوی وچ (ٹراٹسکی کا نام) سارا دن سمولنی میں گزار دیتا تھا۔ میں ابھی تک ترکھانوں کی یونین میں کام کر رہی تھی جو بالشویکوں کی تحویل میں تھی۔ وہاں کی فضا میں تناؤ تھا۔ سارا وقت شورش کے متعلق باتوں میں گزر جاتا۔ یونین کا چیئرمین لینن۔ٹراٹسکی نقطہ نظر کا حامی تھا۔ ہم سب مل کر احتجاج کرتے رہتے۔ ہر جگہ شورش کی بات ہو رہی تھی، سڑکوں پر کھانے کی میزوں پر، سمولنی کی سیڑھیوں میں۔ ہم کم کھاتے کم سوتے اور چوبیس گھنٹے کام میں لگے رہتے۔ ہمیں اپنے بیٹوں کو بھی دیکھنے کا موقع نہ ملتا۔ انقلاب کے دنوں میں میں ان کے متعلق فکر مند رہتی۔ وہ دونوں سکول میں اکیلے بالشویک تھے۔ ایک تیسرا لڑکا بھی تھا مگر وہ ''ہمدرد'' تھا۔ ان

تینوں کا آپس میں بڑا اتحاد تھا۔ ان کی خلاف حکمران جمہوریت اور کیڈٹ اور سوشلسٹ انقلابی تھے۔ جیسا کہ ایسے معاملات میں عام طور پر ہوتا ہے' تنقید کے ساتھ عملی دلائل بھی دینے پڑتے ہیں۔ ایک سے زیادہ مواقع پر ہیڈ ماسٹر کو میرے بیٹوں کو ''جمہوریت پسند'' لڑکوں کے نرغے سے نکالنا پڑا۔ بیٹے تو بس باپ کے نقشِ قدم پر چل رہے تھے۔ ہیڈ ماسٹر ایک کیڈٹ تھا ہو ظاہر ہے دوسرے لڑکوں کی حمایت کرتا تھا۔ وہ میرے بیٹوں کو سزا دیتا اور کہتا۔' اپنی ٹوپیاں اتار دو اور گھر چلے جاؤ۔'' انقلاب کے بعد میرے بیٹوں کا وہاں رہنا مشکل ہو گیا اور وہ عوامی سکول میں چلے گئے۔ وہاں تعلیم تو زیادہ بہتر نہیں تھی مگر کم از کم کھلی فضا میں سانس تو لے سکتے تھے۔

ایل' ڈی اور میں گھر پر کم ہی ہوتے تھے۔ سکول سے واپس آنے اور ہمیں گھر پر نہ پانے کے بعد بیٹے گھر کی چار دیواری میں بند ہونا پسند نہیں کرتے تھے۔ مظاہروں' لڑائیوں اور گولیاں چلنے کے ان دنوں میں ہم ان کی سلامتی کیلئے فکر مند رہتے وہ بھی بڑے انقلابی موڑ میں تھے۔ جب کبھی ہمارے درمیان کوئی سرسری سی ملاقات ہو جاتی تو وہ بڑی خوشی کے ساتھ کہتے۔'' آج ہم بس میں چند کاسکوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ڈیڈ کا کتابچہ ''کاسک بھائیو' پڑھ رہے تھے۔

''پھر؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ پڑھ کر دوسروں کو دیتے جاتے تھے۔''

''واقعی؟''

''بالکل''

ایل' ڈی کے جاننے والے ایک انجینئر ''کے'' نے جس کے اپنے کنبے میں ہر عمر کے بچے تھے اور ایک خادمہ بھی تھی' ہمارے بیٹوں کو اپنے پاس رکھنے کی پیش کش کی جہاں ان کی اچھی دیکھ بھال ہو سکتی تھی۔ میں اس پیش کش پر بڑی خوش ہوئی۔ مجھے دن میں کم از کم پانچ دفعہ سمولنی مختلف کاموں کے لئے جانا پڑتا تھا۔ ہم اپنے گھر تورڈ سٹریٹ رات گئے آگئے اور صبح ہوتے ہی بچھڑ جاتے۔ ایل' ڈی سمولنی اور میں یونین کے دفتر چلی جاتی۔ واقعات کے عروج پر ہم سمولنی ہی میں رہنے لگے۔ ایل' ڈی کئی دن گھر نہ آتا۔ میں بھی سمولنی میں رک جاتی۔ ہم کپڑے بدلے بغیر صوفے اور کرسیوں پر سو جاتے۔ موسم کچھ ایسا گرم نہیں تھا۔ خزاں کے دن تھے۔ دن خشک اور بے مزہ تھے' ہوا تیز اور ٹھنڈی تھی۔ بڑی سڑکیں ویران اور خاموش

تھیں۔ ایسی خاموشی میں ہوشیار رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔سمولنی ایک ہنگامہ پرور جگہ بنی ہوئی تھی۔ بڑا ہال بڑی بڑی روشنیوں سے بقعہ نور بنا رہتا۔دن ہو یا رات لوگوں سے بھرا رہتا۔ ملوں اور فیکٹریوں میں زندگی زوروں پر تھی۔لیکن سڑکوں پر خاموشی تھی۔ یوں لگتا تھا۔جیسے شہر نے خوف کے مارے اپنا سر اپنے شانوں میں چھپا لیا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ شورش کے دوسرے یا تیسرے دن کی صبح کو میں نے سمولنی کے ایک کمرے میں ولادیمیر ایلچ (لینن)اور لیوڈیوی ڈورچ کو موجود پایا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ان کے ساتھ دزرزسکی' جوفے اور دوسرے لوگ بھی تھے۔نیند کی کمی کی وجہ سے ان کے چہرے ستے ہوئے اور آنکھیں سوجھی ہوئی تھیں۔ ان کی قمیضوں کے کالر میلے تھے اور کمرہ دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔لوگوں سے گھرا ہوا ایک آدمی میز پر بیٹھا تھا۔پس اس کے حکم کے منتظر تھے۔

لینن اور ٹراٹسکی بھی منتظر ہجوم میں شامل تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے سوئے ہوئے لوگ حکم جاری کرر ہے تھے۔ ہر کوئی نیند کی حالت میں چل رہا تھا۔میں بھی جیسے یہ سب نیند کی حالت میں دیکھ رہی تھی۔ پھر مجھے ایک دم خیال آیا کہ اگر ان لوگوں کی حالت یہی رہی تو انقلاب خطرے میں پڑ سکتا تھا۔ اگلے دن میں لینن کی بہن ماریہ ایلنشا سے ملی اور اسے بتایا کہ لینن کو صاف کپڑوں کی ضرورت تھی۔''ہاں' ہاں تم ٹھیک کہتی ہو' اس نے وجاب دیا۔لیکن میں نے محسوس کیا کہ صاف کپڑوں کا مسئلہ تو اپنی اہمیت کھو چکا تھا۔''

پیٹروگراڈ میں تو اقتدار ہمارے ہاتھ میں آ گیا ہے۔لینن کے پاس کپڑے تبدیل کرنے کا وقت نہیں ہے۔ اسکی آنکھیں پھٹی ہوئی ہیں' اس کا چہرہ تھکاوٹ سے نڈھال ہے۔ وہ میری طرف نرمی سے دیکھتا ہے اور ذرا جھجک کر کہتا ہے۔''چھپے پھرنے اور زیر زمین زندگی گزارنے سے ہم ایک دم اقتدار میں کیسے آ گئے؟'' وہ لمحہ بھر کیلئے مناسب لفظ تلاش کرتا ہے اور پھر کہتا ہے''+++++++++'' وہ ایک دم جرمن زبان بولنی شروع کر دیتا ہے اور اپنے سر کے گرد ہاتھ دائرے کی شکل میں گھماتا ہے۔ ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں اور ہلکا سا قہقہ لگاتے ہیں۔ یہ سب کچھ ایک یا دومنٹ میں ہو جاتا ہے۔ پھر وہ کہتا ہے۔''چلو اگلا کام کریں۔''

اب حکومت قائم کرنی ہے۔ مرکزی کمیٹی کے بعض ارکان موجود ہیں۔ کمرے کے ایک کونے میں

ہنگامی اجلاس شروع ہو جاتا ہے۔

''ہمیں ان کا کیا نام رکھنا چاہیے؟'' لینن پوچھتا ہے۔''وزیروں کے علاوہ کوئی اور نام یہ حقیر اور گھسا پٹا لفظ ہے۔''

''ہم انہیں کمسار کہہ سکتے ہیں۔'' میں تجویز دی۔''لیکن ہمارے پاس تو پہلے ہی بہت سے کمسار ہیں۔ سپریم کمسار؟ نہیں۔ سپریم اچھا نہیں لگتا۔ اس کی آواز ہی خراب ہے۔ عوامی کمسار کیسا رہے گا؟'' میں نے کہا۔

''عوامی کمسار' میرا خیال ہے اس سے کام چل سکتا ہے۔'' لینن اتفاق کرتا ہے۔ اور حکومت کا نام کیا رکھا جائے؟''

''سوویٹ- عوامی کمساروں کی سوویٹ۔'' لینن کو یہ نام پسند آتا ہے۔''بہت خوب- یہ انقلابی نام لگتا ہے۔'' وہ کہتا ہے۔

لینن انقلاب کی جمالیات یا اس کی رومانی خوبیوں کا زیادہ دلدادہ نہیں تھا۔ وہ جس قدر گہرائی میں جا کر انقلاب کو مجموعی طور پر محسوس کرتا تھا' اتنی ہی حسی تیزی سے کسی غلطی کے بغیر اس کی ''خوشبو' بھی سونگھ لیتا تھا۔

ابتدائی ایام کے دوران میں اس نے ایک دفعہ غیر متوقع طور پر مجھ سے پوچھ لیا۔''اگر سفید فام فوج نے مجھے اور تجھے قتل کر دیا تو؟ کیا سرورڈلوف اور بخارن صورتحال کو سنبھال لیں گے؟''

''میرا خیال ہے وہ ہمیں قتل نہیں کریں گے۔'' میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا۔

''یہ تو شیطان ہی جانتا ہے کہ انہوں نے کیا کرنا ہے۔'' لینن نے بھی جوابی قہقہہ لگایا۔

1924ء میں لینن کے بارے میں باتیں کرتے وقت یہ قصہ میں نے پہلی مرتبہ سنایا تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ سٹالن' زینوشیف اور کامینیف کے ٹولے نے اس کا بہت برا منایا تھا' اگرچہ اس وقت وہ خاموش رہے تھے۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ لینن نے سرورڈلوف اور بخارن کا نام لیا تھا۔

لینن نے اپنی دو جلاوطنیوں میں پندرہ برس باہر گزارے تھے۔ وہ روس کے اندر پارٹی کے بڑے راہنماؤں کو فقط خط و کتابت کے ذریعے جانتا تھا۔ یا ان سے ان کی چند ملاقاتیں باہر ہوئیں تھیں۔ انقلاب کے بعد ہی اسے انہیں اور ان کے کام کو نزدیک سے دیکھنے کا موقع ملا تب اسے اپنی پرانی رائے تبدیل کرنی

پڑی۔لوگوں ل ءطرف بے اعتنائی لینن جیسے عظیم اخلاقی آدمی کیلئے ناقابل برداشت تھی۔ایک مفکر'ایک مشاہد اور ایک منصوبہ ساز کی حیثیت سے اس کا دل عوام کے جذبات سے بھرا ہوا تھا۔کروپسکایا نے بھی اپنی یادداشتوں میں لینن کی ایک خوبیوں کا ذکر کیا ہے۔لینن نے کبھی ایک نظر میں کسی کو تول کر اس کے متعلق اندازہ نہیں لگایا تھا۔اس کی آنکھ باریک بین تھی۔وہ ایک لمحے میں آدمی کو بہت سی خوبیاں اور برائیاں دیکھ لیتی وہ اکثر لوگوں کی محبت میں گرفتار ہو جاتا۔اس وقت میں اسے چھیڑنے لگتا۔''میں جانتا ہوں آپ ایک نیا رومانس لڑا رہے ہیں۔''لینن اپنی شخصیت کے اس پہلو سے واقف تھا۔وہ ہنس کر بات ٹال رہا دیتا۔کبھی تھوڑا سا بوکھلا کر ہلکی سی ناراضگی بھی ظاہر کر دیتا۔

1917ء کے دوران میں میری طرف لینن کا رویہ متعدد بار تبدیل ہوا۔پہلی دفعہ وہ مجھے گھٹا گھٹا اور محتاط ہو کر ملا۔پھر جولائی کے دن ہمیں اچانک ایک دوسرے کے قریب لے آئے۔جب بالشویکوں کی اکثریت کے خلاف میں نے پارلیمان کے بائیکاٹ کی تجویز پیش کی تو لینن نے اپنی پناہ گاہ سے مجھے لکھا''شاباش' کامریڈ ٹراٹسکی:''پھر بعض حادثاتی اور غلط اشاروں کی بنا پر اس نے میرے بارے میں نتیجہ اخذ کیا کہ میں مسلح شورش کے معاملے میں شش و پنج میں گرفتار تھا'اور اس شبہے کا اظہار اس نے اکتوبر کے دوران میں لکھے جانے والے خطوط میں کیا۔اس کے برعکس انقلاب والے دن جب ہم نیم تاریک خالی کمرے کے فرش پر لیٹے آرام کر رہے تھے تو اس کا رویہ بلاشبہ گرم اور دوستانہ تھا۔اگلے دن پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے اجلاس میں اس نے مجھے عوامی کمساروں کی سوویٹ کا چیئرمین چن لینے کیلئے تجویز پیش کی۔میں اچھل پڑا اور احتجاج کرنے لگا۔یہ تجویز بڑی غیر متوقع اور غیر مناسب تھی۔اس میں کیا ہرج ہے۔''لینن نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔''تم پیٹروگراڈ سوویٹ کے چیئرمین تھے جس نے اقتدار پر قبضہ کیا ہے۔''میں نے کسی بحث سے بغیر یہ تجویز رد کر دی۔لیکن تحریک منظور ہوگئی۔یکم نومبر کو پیٹروگراڈ پارٹی کمیٹی کی میٹنگ کے دوران میں گرما گرم بحث کے وقت لینن نے کہا۔''ٹراٹسکی سے بہتر کوئی بالشویک نہیں ہے۔''لینن کی زبان سے نکلے ہوئے یہ لفظ بڑے معنی خیز تھے۔اس اجلاس کی کاروائی ابھی تک عوام سے پوشیدہ رکھی گئی ہے۔

اقتدار پر قبضے کے بعد یہ سوال سامنے آیا کہ مجھے کون سا سرکاری عہدہ دیا جائے۔عجیب بات ہے کہ میں اس طف کبھی دھیان نہیں دیا تھا۔1905ء کے تجربے کے باوجود کبھی کوئی ایسا موقع پیدا نہیں ہوا

تھا کہ میں نے اپنا مستقبل کسی سرکاری عہدے سے جوڑنے کے بارے میں سوچا تھا۔ میں نے جوانی ہی سے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ بچپن ہی سے ادیب بننے کا خواب دیکھا تھا۔ پھر میں نے اپنے ادبی کام کو اپنے دوسرے کاموں کی طرح انقلاب کا تابع بنا دیا۔ پارٹی کا اقتدار پر قبضہ کرنا ہمیشہ میرے پیش نظر رہا۔ میں انقلابی حکومت کے پروگراموں کے متعلق بہت کچھ لکھتا رہا لیکن اقتدار حاصل کرنے کے بعد میں نے ذاتی طور پر کون سا عہدہ لینا تھا' یہ خیال کبھی میرے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ لہٰذا اس قسم کی کوئی تجویز یا پیش کش میرے لیے بڑی غیر متوقع تھی۔

اقتدار پر قبضے کے بعد میں نے حکومت سے باہر رہنے کی ترجیح دی اور پریس کی نگرانی اور اسے ہدایت جاری کرنے کی پیش کش کی۔ ممکن ہے فتح کے بعد اس کا کچھ تعلق اعصابی ردعمل سے ہو۔ انقلاب سے پہلے کے مہینے انقلاب کی تیاری کے کام میں گزر گئے تھے۔ میرے بدن کا ہر تار اپنے پورے تناؤ پر تھا۔ لونا چرسکی نے کسی اخبار میں لکھا تھا کہ ٹراٹسکی ایک بیٹری کی طرح تھا جو بھی اس کے ساتھ چھوتا اس میں برقی رو بھر جاتی۔ 25 اکتوبر نے مجھے بالکل توڑ کر رکھ دیا۔ میں خود کو اس سرجن کی طرح محسوس کر رہا تھا جو ایک مشکل اور خطرناک آپریشن کے بعد اپنے ہاتھ دھوتا ہے' ایپرن اتارتا ہے اور آرام کیلئے لیٹ جاتا ہے۔

لینن کی مختلف حیثیت تھی۔ وہ ساڑھے تین ماہ بعد اپنی پناہ گاہ سے نکل کر آیا تھا اور اس عرصے میں عملی کام سے کٹا رہا تھا۔ ایک کام دوسرے کام سے جڑتا جا رہا تھا جس نے میری اس خواہش کو تیز کر دیا کہ پس منظر میں جا کر تھوڑی دیر کو آرام کر لوں۔ لینن اس سے متفق نہیں تھا۔ اس کا اصرار تھا کہ میں وزارت داخلہ لے لوں۔ یہ سب سے مشکل کام تھا کیونکہ اس میں ردانقلاب کے خلاف جنگ کرنی پڑنی تھی۔ میں نے اعتراض کرتے ہوئے قومیت کا سوال اٹھا دیا۔ میں یہودی تھا اور دشمنوں کے ہاتھ میں کوئی نیا ہتھیار نہیں دینا چاہتا تھا۔

لینن غصے میں آ گیا۔ ''ہم نے ایک عظیم بین الاقوامی انقلاب برپا کیا ہے۔ ایسی چھوٹی باتوں کی کیا اہمیت ہے؟''

پھر اچھے مزاج میں چھیڑ چھاڑ شروع ہوگئی۔ ''بلاشبہ انقلاب برپا ہو گیا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''مگر ابھی بہت سے احمقوں سے نمٹنا باقی ہے۔''

''لیکن ہمیں احمقوں کے ساتھ تو نہیں چلنا۔''

''شاید ایسا نہ ہو۔لیکن حماقت کی کچھ نہ کچھ رعایت دینی پڑتی ہے۔ہمیں شروع ہی میں پھڈے بازی کی کیا ضرورت ہے۔''

میں پہلے ہی دیکھ چلا ہوں کہ قومی مسئلہ جو روس کی زندگی میں اس قدر اہمیت رکھتا تھا' میرے لیے عملی طور پر اہم نہیں تھا۔ جوانی میں بھی قومی تنگ نظری اور تعصّبات میرے استدلال کی جس کو پریشان کر دیتے اور مجھے ان سے نفرت کے علاوہ ایک قسم کی اخلاقی قے آنے لگتی۔میری مارکسی تعلیم نے میرے اس احساس کو گہرا کر کے میرے رویے کو ایک سرگرم بین الاقوامیت میں بدل دیا تھا۔دوسرے ممالک میں میرا قیام'اتنی ساری مختلف زبانوں سے میری شناسائی' سیاسی نظاموں اور ثقافتوں نے بین الاقوامیت کو میرے گوشت اور خون میں رچا بسا دیا تھا۔1917ء میں اور اس کے بعد بھی میں اگر اپنی کسی تقرری کے خلاف اپنے یہودی ہونے کی دلیل پیش کرتا تو ایسا سیاسی وجود کی پر کرتا تھا۔

سورِیڈلون اور مرکزی کمیٹی کے بعض ارکان کو میں نے اپنی طرف کر لیا۔لینن اقلیت میں رہ گیا۔وہ کندھے اچکتے آہیں بھرنے اور میری طرف ملامت سے دیکھنے لگا۔مگر ایک خیال میرے لیے اطمینان کا باعث تھا کہ میں نے جس محکمے میں بھی کام کرنا تھا' ردِ انقلاب کے خلاف کرنا تھا۔لیکن سوریڈلوف نے میری پریس کی نگرانی پر تعیناتی کی بھی سخت مخالفت کی۔یہ کام بخارن لینا چاہتا تھا۔''لیوڈیویڈووچ کو یورپ کے خلاف نبرد آزمائی پر لگا دینا چاہیے۔بہتر ہوگا کہ اسے خارجہ امور کا محکمہ دے دیا جائے۔''

''اب خارجہ امور رہ ہی کیا گئے ہیں۔'' لینن نے جواب دیا۔بہرحال وہ تھوڑے پس وپیش کے بعد اس پر متفق ہو گیا۔میں نے بھی رد و کد کے بعد اس پر اتفاق کر لیا۔اس طرح سوریڈلوف کے کہنے پر میں کچھ عرصے کیلئے خارجہ امور کا انچارج بن گیا۔

خارجہ امور کا انچارج ہونے کا اصل مقصد محکمانہ کام سے آزادی تھی۔جو کامریڈ اس کام میں میری مدد کرنا چاہتے تھے انہیں میں تجویز کرتا تھا کہ وہ کسی اور شعبے میں اپنی طاقت صرف کریں۔ان میں سے ایک نے سوویٹ حکومت بننے کے بعد اپنی یادداشتوں میں میرے ساتھ اپنی ایک پر لطف گفتگو کا ذکر کیا ہے۔اس کے کہنے کے مطابق میں نے اس سے کہا تھا''اب ہم نے کون سا سفارتی کام کرنا ہے؟ میں دنیا بھر کے لوگوں کیلئے چند انقلابی اعلانات جاری کر دوگا اور پھر اپنی دکان بڑھا دوں گا۔'' اسے میرے سفارتی شعور کی کمی سے واقعی تکلیف پہنچی تھی۔لیکن میں نے تو دانستہ طور پر مبالغہ آرائی تھی۔میں بتانا چاہتا

تھا کہ اس وقت خارجہ امور مرکزی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔

اصلی کام اکتوبر انقلاب کو آگے بڑھانا' ملک میں پھیلانا اور پیٹروگراڈ پر کرنسکی اور جنرل کراسنوف کے حملوں کو روکنا تھا۔ یہ سب مسائل محکموں سے باہر کے تھے اور ہم سب انہیں حل کرنے میں لینن سے مسلسل اور بھرپور تعاون کر رہے تھے۔

سمولنی میں لینن کا کمرہ میرے کمرے سے عمارت کی مخالف سمت میں تھا۔ ہمیں آپس میں جوڑنے یا تقسیم کرنے والا برآمدہ اس قدر طویل تھا کہ لینن مذاق میں کہا کرتا تھا کہ ہمیں سائیکل پر آنا جانا چاہیے۔ ہم دن میں متعدد بار فون پر بات کرتے تھے۔ مگر کسی کانفرنس کے سلسلے میں لینن کے کمرے میں جانے کیلئے برآمدے کو عبور کرنا بڑا مسئلہ بن جاتا۔ ایک نوجوان جہاز ران جو لینن کا سیکریٹری تھا لینن کے مراسلے لے کر اس برآمدے میں مسلسل دوڑتا رہتا۔ ان مراسلوں میں حکم نامے ہوتے جنہیں فوری طور پر جاری کرنا ہوتا تھا۔ سوویٹ کے عوامی کمسار کے ریکارڈ روم میں اس زمانے کی ایسی بہت سی دستاویزیں موجود ہوں گی جن میں میرے یا لینن کے ہاتھ سے لکھی ہوئی ترمیمات پائی جائیں گی۔

پہلے دور میں' اندازاً اگست 1918ء تک میں سوویٹ کے عوامی کمسار کے امور میں مصروف رہا۔ سمولنی کے زمانے میں لینن معاشی' سیاسی' تنظیمی اور ثقافتی مسائل حل کرنے میں شدت سے مصروف رہا۔ وہ یہ مسائل نوکر شاہی کے طریقوں سے نہیں بلکہ پارٹی پروگرام کے مطابق حل کرنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ انقلابی احکام پوری طرح بجا نہیں لائے جا رہے تھے۔ ان کی تکمیل کیلئے ایک متحرک مشینری' وقت اور تجربے کی ضرورت تھی۔ کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ ہمارے پاس کتنا وقت تھا۔ ابتدائی ایام میں ہمارے احکام تنظیمی اقدامات کے بجائے پراپیگنڈہ نوعیت کے تھے۔ لینن عوام کو یہ بتانے کی جلدی میں تھا کہ نئی حکومت کیا تھی' یہ کیا چاہتی تھی اور یہ کیسے اپنے مقاصد کی تکمیل کرے گی۔ وہ حیران کن بے تکانی سے ایک کے بعد دوسرے سوال کا جواب دیتا رہتا۔ وہ کانفرنس منعقد کرتا' تجربہ کار لوگوں کو بلاتا اور کتابوں میں گم ہو جاتا۔ میں اس کی مدد کرتا رہتا۔

لینن کو اپنے کام پر سخت اعتماد تھا۔ ایک عظیم انقلابی ہونے کے ناطے وہ تاریخی روایت کا رطلب سمجھتا تھا۔ ہمارے لیے یہ بتانا مشکل تھا کہ ہم اقتدار میں رہیں گیا نہیں۔ ہر دو حالتوں میں ہم اپنے انقلابی تجربے کو عوام کے سامنے واضح حالت میں رکھنا چاہتے تھے تاکہ ہمارے بعد جو بھی آئے ہمارے

تجربے کو ایک قدم آگے ہی بڑھائے۔ پہلے مرحلے میں قانون سازی کا بڑا مقصد یہی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ لینن مادیت اور سوشلزم کی پرانی کتابوں کا روسی ترجمہ جلد از جلد شائع کرنے کیلئے بے چین تھا۔ وہ ممکن حد تک زیادہ سے زیادہ انقلابی مینار کھڑے کر دینا چاہتا تھا تاکہ ہم جو کام کر رہے تھے وہ لوگوں کے ذہنوں پر نقش ہو جائے۔

سوویٹ کے عوامی کمسار * کا ہر اجلاس ارکان کے ردوبدل سے قانون سازی کے کام میں بری طرح مصروف رہتا۔ ہر کام شروع سے کرنا پڑتا تھا۔ ہمارے انقلاب کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں تھی۔ لینن سوویٹ اور عوامی کمساروں کے اجلاس میں ہر روز پانچ چھ گھنٹے بے تکان بیٹھا رہتا

----

* عوامی کمسار کی سوویٹ (مجلس) یو-ایس-ایس-آر کی مجلس عاملہ کا با اختیار ادارہ ہے۔ یہ سوویٹوں کی کانگریس کے جلسوں میں قانون سازی کا کام کرتی ہے۔ مرکزی مجلس عاملہ کو ''مرکزی کمیٹی'' سے غلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔ اکثر یوں ہو جاتا ہے۔ موخر الذکر کا تعلق روسی کمیونسٹ پارٹی سے ہے۔ (مترجم)

مسئلے کسی تیاری کے بغیر لائے جاتے اور وہ فوری نوعیت کے ہوتے بعض اوقات سوویٹ کے ارکان کو یہ بھی معلوم نہ ہوتا کہ وہ سوویٹ میں کس مسئلے پر بات کرنے جا رہے تھے۔ مباحث بڑے گرما گرم ہوتے۔ گزشتہ اجلاس کی کاروائی پڑھنے کیلئے فقط دس منٹ دیے جاتے۔ وقت بچانے کی خاطر لینن ارکان سے کہتا کہ ان کے پاس جو اطلاع تھی فوری طور پر لکھ کر بھجوا دیں۔ ارکان کی طرف سے جو مواد آتا وہ بعض اوقات قانونی نقطہ نظر سے بڑا مزے دار ہوتا۔ مگر بدقسمتی سے ان کا زیادہ حصہ اب موجود نہیں ہے۔ یہ مواد اس نوٹ کی پچھلی طرف لکھا ہوتا تھا جو لینن ارکان کو بھجواتا تھا۔ لینن پڑھ کر ان میں سے اکثر کاغذ پھاڑ دیتا۔ مناسب وقت پر لینن اپنے فیصلے سنا دیتا۔ اس وقت اس کی آواز بڑی گھمبیر ہوتی۔ اس کے بعد بحث بند ہو جاتی۔ کسی نے کوئی تجویز دینی ہوتی تو دے دیتا۔ اس کے بعد لینن کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ قانون کا درجہ حاصل کر لیتے۔

اس کام میں دوسری خوبیوں کے علاوہ تخلیقی فکر کی بے حد ضرورت تھی۔ ایسے فکر کی ایک بڑی خوبی لوگوں، اشیا اور واقعات کو نہ دیکھنے کی صورت میں بھی ان کو ان کے اصلی روپ میں دیکھنا ہوتا ہے۔ یعنی

کوئی چیز حقیقت میں کس طرح وقوع پذیر ہوسکتی ہے۔لینن کا تصور حقیقت پسندانہ تھا' اور یہی اس کی سب سے بڑی خوبی تھی۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ قانون سازی میں غلطیوں اور تضادات کا ارتکاب نہیں ہوتا تھا۔لیکن لینن نے مجموعی طور پر سمولنی کے ایام میں جو قانون سازی کی انقلاب کا بحرانی اور طوفانی زمانہ ہونے کے باوجود وہ تاریخ میں ہمیشہ کیلئے ایک نئی دنیا کے قوانین کی حیثیت اختیار کر جائے گی۔اس سے ماہرین عمرانیات اور مورخ ہی نہیں' قانون ساز ادارے بھی استفادہ کریں گے۔

اس دوران میں عملی مسائل' خاص طور پر خانہ جنگی' خوراک اور رسل وسائل کے مسائل بڑی اہمیت اختیار کر گئے تھے۔ایسے مسائل حل کرنے کیلئے پہلی دفعہ نئے کمیشن قائم کیے گئے اور ان محکموں کو زیادہ فعال بنایا گیا جو کسی میرس اور بے یارومددگاری کی حالت میں اپنے مسائل کی دہلیز پر کھڑے تھے۔ایسے بہت سے کمیشنوں کی صدارت مجھے کرنی پڑتی تھی۔

برسٹ۔لٹووسک امن مذاکرات کے ماسوا اور دوسرے سفارتی معاملات میرا تھوڑا وقت لیتے تھے۔کام میری توقع سے کچھ زیادہ مشکل اور پیچیدہ ثابت ہوا۔ابتدائی دنوں ہی میں سفارتی گفت وشنید کا ایفل ٹاور میرے سامنے کھڑا تھا۔شورش کے دوران میں غیر ملکی ریڈیو سننے کا ہمارے پاس وقت ہی نہیں تھا۔مگر اب امور خارجہ کا عوامی کمسار ہونے کی حیثیت سے مجھے انقلاب کی طرف سرمایہ دارانہ دنیا کے رد عمل کو دیکھنا پڑتا تھا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہمیں کہیں سے کوئی دوستانہ پیغام مل رہا تھا۔ برلن حکومت اگرچہ بالشویکوں سے دوستانہ چھیڑ چھاڑ کر رہی تھی' اس کے باوجود جب میں ریڈیو پر کرنسکی کی فوجوں کے خلاف فتح کا اعلان کر رہا تھا تو جرمنی کے کسی ریڈیو سٹیشن سے اس اعلان میں متواتر مداخلت جاری تھی۔ برلن اور ویانا کسی منافع بخش امن معاہدے کی امید میں انقلاب کے خلاف زہر اگلنے میں مصروف تھے۔اس کے علاوہ دنیا کے باقی ممالک' وہ ملک نہیں جو جنگ میں مصروف تھے' بلکہ غیر جانب دار ممالک بھی اپنی اپنی زبانوں میں سابقہ روسی حکمران طبقے کے متعلق ہمدردی کے جذبات کا اظہار کر رہے تھے۔اس کورس میں فرانس کی آواز سب سے اونچی تھی۔ وہ روسی زبان بھی بولتا' شاید روسی عوام کے دل موہ لینے کیلئے۔ ان دنوں جب میں پیرس ریڈیو سنتا تو مجھے یوں لگتا جیسے فرانسیسی وزیراعظم کلیمنکو خود ایفل ٹاور پر بیٹھا نشریات میں مصروف تھا۔ میں بطور صحافی اسے بخوبی جانتا تھا اور اس کے

جذبے سے بخوبی واقف تھا۔لیکن فرانسیسی ریڈیو کی نفرت اپنی آگ میں آپ ہی بھسم ہو رہی تھی۔بغض اور حسد اپنے انتہا تک پہنچ گئے تھے۔بعض اوقات مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے ایفل ٹاور پر بیٹھا ہوا ریڈیو کا بچھو اپنے سر پر اپنی ہی دم سے ڈنگ مار رہا تھا۔

تسارسکوی سیلو کا ریڈیو سٹیشن ہماری تحویل میں تھا۔لہذا کوئی ہم پر خاموشی مسلط نہیں کر سکتا تھا۔چند روز تک ہم کلیمنکو کی یاوہ گوئی کا براہ راست جواب دیتے رہے۔میں فرانس کی سیاسی تاریخ بخوبی جانتا تھا اور میرے پاس گھڑے گھڑائے جواب تھے۔میں نے انہیں ان کے ماضی کی تاریخ کے بعض فراموش شدہ حقائق یاد دلائے' اور اس کا آغاز پانامہ کے کاروبار سے کیا۔چند دنوں تک پیرس اور تسارسکوئی سیلو ریڈیو کے مابین گھمسان کی جنگ ہوتی رہی۔ہوا غیر جانب ہونے کی حیثیت سے دونوں جانب پیغام رسانی کے فرائض ادا کرتی رہی۔اور پھر کیا ہوا؟ مجھے اتنی جلدی نتائج برآمد ہونے کی توقع نہیں تھی۔پیرس نے اپنا لہجہ ایک دم بدل لیا۔اب وہ گرم مگر مہذب انداز میں بات کرنے لگا۔بعد میں میں خوشی کے ایک جذبے کے ساتھ یاد کیا کرتا کہ میں نے اپنی سفارت کاری کا آغاز پیرس کو سبق سکھانے سے شروع کیا تھا۔

18 نومبر کو امریکی مشن کا چیف جنرل گدسن غیر متوقع طور پر مجھے ملنے سمولنی میں آ گیا۔اس نے مجھے بتایا کہ ابھی وہ امریکی حکومت کے نام پر کچھ کہنے کو تیار نہیں تھا۔مگر اسے امید تھی کہ چند روز میں سب کچھ ''ٹھیک'' ہو جائے گا۔اس نے پوچھا کہ کیا سوویٹ حکومت اتحادیوں کے ساتھ مل کر جنگ ختم کرنے پر تیار تھی؟ میں نے جواب دیا کہ متوقع مذاکرات کی جو پبلسٹی ہو رہی تھی' اتحادی اس پر نظر رکھیں وہ کسی مرحلے میں بھی ان میں شامل ہو سکتے تھے۔آخر میں امن پسند جرنیل نے کہا۔''سوویٹ حکومت کے خلاف احتجاج اور دھمکیوں کا وقت گزر گیا ہے اگر کبھی کوئی ایسا وقت تھا''۔لیکن جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے' خواہ وہ جرنیل ہی کیوں نہ ہو' اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔

فرانسیسی سفیر نولنز سے میرے آخری ملاقات دسمبر کے آغاز میں ہوئی۔وہ ایک سابق انقلابی رکن اسمبلی تھا اور اسے فروری کے راہنماؤں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی خاطر بھیجا گیا تھا۔اس سے پہلے اصل میں شاہ پرست سفیر اپلولوگ جمہوریہ فرانس کی طرف سے زارشاہی سے تعلقات استوار کرنے آنا تھا۔نولنز کی جگہ کوئی دوسرا کیوں نہ بھیجا گیا' اس بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں۔لیکن اس نے

اپنے حکمرانوں کا انسانی تقدیر کے متعلق کوئی اچھا تاثر نہ چھوڑا۔اس کے کہنے پر جو کانفرنس منعقد کی گئی اس کے کچھ اچھے نتائج برآمد نہ ہوئے۔چند پلٹے کھانے کے بعد کلیمنکو بھی ''خاردار حکومت'' کی طرف چلا گیا۔

فرانسیسی مشن کے سربراہ جنرل نیسل سے میری ملاقات کو بھی دوستانہ ملاقات نہیں کہا جا سکتا تھا۔وہ فقط اپنے بچاؤ کیلئے تیز لہجہ استعمال کر رہا تھا۔کرنسکی کے عہد میں اسے تحمکانہ لہجے میں بات کرنی آ گئی تھی اور وہ اپنی اس بدعادت کو چھوڑ نہیں رہا تھا۔میں نے آغاز یوں کیا کہ اسے سمولنی سے نکال دیا۔فرانسیسی مشن سے تعلقات زیادہ خراب ہو گئے۔نتیجتاً اس کا شعبہ اطلاعات انقلاب کے خلاف بدزنی پر اتر آیا۔اخبارات میں الٹی سیدھی خبریں شائع ہونے لگیں۔جب میں نے اس سلسلے میں جنرل نیسل سے وضاحت طلب کی تو اس نے مندرجہ ذیل شاندار جواب دیا۔

''ہر قسم کی رائے رکھنے والے متعدد صحافی ہمارے مشن میں آتے ہیں۔میں انہیں جنگ کے متعلق فوجی اطلاعات دینے کا مجاز ہوں۔خاص طور پر سلونیکا' ایشیا اور فرانس کے بارے میں ان ملاقاتوں میں ایک نوجوان افسر نے ایک ایسی افواہ نما بات کہی جو سارے شہر میں پھیل گئی۔اس خبر کا منبع سٹاک ہوم تھا۔'' آخر میں جرنیل نے وعدہ کیا کہ ''وہ آئندہ اس قسم کی غلطیوں کو صرف نظر ہونے سے روکے گا۔''

یہ سراسر زیادتی تھی۔ہم نے پیرس ریڈیو کو شائستگی اس لئے نہیں سکھائی تھی کہ جنرل نیسل ماسکو میں آخر جھوٹ کے انبار لگا دے۔میں نے اسی دن جرنیل کو لکھا:

1- چونکہ فرانسیسی فوجی مشن سے منسلک شعبہ اطلاعات دانستہ طور پر جھوٹ اور افواہیں پھیلا رہا ہے لہذا اسے فوری طور پر بند کر دیا جائے تاکہ عوام کے ذہنوں کو انتشار اور پراگندگی سے دور رکھا جا سکے۔

2- جس ''نوجوان افسر'' نے زیر بحث جھوٹی اور من گھڑت خبریں اخباروں میں بھجی ہیں' اسے روس سے فوری طور پر نکل جانے کو کہا جاتا ہے۔میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اس افسر کا نام کسی تاخیر کے بغیر مجھے بتایا جائے۔

3- مشن کے دفتر سے ریڈیو اور ٹیلی گراف کی تنصیبات ہٹا دی جائیں۔

4- خانہ جنگی والے علاقوں میں موجود فرانسیسی افسر فوری طور پر پیٹروگراڈ بلا لیے جائیں اور یہ حکم اخبارات میں شائع کیا جائے۔

5- میری درخواست ہے کہ ان اقدامات پر عمل درآمد کے بعد مجھے مطلع کیا جائے۔

جرنیل نے اپنے بچاؤ کیلئے کسی بے نام ''نوجوان افسر'' کو روس سے نکال دیا۔ ریڈیو تنصیبات بھی مشن کے دفتر سے ہٹادی گئیں۔ تمام فرانسیسی افسروں کو مشن کے مرکزی دفتر میں بلا لیا گیا۔ لیکن یہ تو ''محاذ جنگ'' پر ابتدائی چھوٹی موٹی چھڑپیں تھیں۔ جو میرے جنگ کا کمسار بننے کے بعد تھوڑے عرصے کیلئے غیر مستحکم صلح میں بدل گئیں۔ پھر جرنیل نیسل بھی چلا گیا اور اس کی جگہ جرنیل لیورنی آ گیا۔ فرانسیسی سفارت خانے کی طرح فوجی مشن سوویٹ اقتدار کے خلاف سازشوں اور مسلح حملوں کا مرکز بن گیا۔ لیکن ایسا برسٹ-لٹووسک معاہدے کے بعد میرے ماسکو کے دنوں میں 1918ء کے موسم بہار اور گرمیوں میں ہوا۔

ماسکو میں

برسٹ-لٹووسک امن معاہدے کے بعد میں امور خارجہ کے کمسار کی حیثیت سے سبک دوش ہو گیا۔ اس کی کوئی سیاسی اہمیت نہیں تھی۔ یہ عہدہ لینے کیلئے چیچیرن کو عرصہ دراز سے جانتا تھا۔ پہلے انقلاب کے زمانے میں وہ اپنی سفارتی حیثیت چھوڑ کر سوشل ڈیموکریسی کی طرف چلا گیا تھا۔ ایک منشویک ہونے کے ناطے وہ بیرون ملک اپنے فریق کو منظّم کرتا رہا تھا۔ جنگ شروع ہونے پر وہ ایک پکے محبّ الوطن ہونے کی حیثیت سے ملک کا دفاع کرتا اور لندن سے خط لکھتا رہا۔ اس کے ایسے دو ایک خط مجھے بھی آئے تھے۔ بہرحال وہ جلدی ہی بین الاقوامیت پسندوں کی طرف آ گیا اور ''ناشے سلوو'' کا سرگرم نمائندہ بن گیا۔ یہ اخبار ان دنوں پیرس سے میری ادارت میں نکلتا تھا۔ پھر وہ برطانیہ میں قید ہو گیا۔ میں اخبار میں اس کی رہائی کا مطالبہ کرتا رہا۔ معاملہ طوالت پکڑتا گیا۔ میں نے ہرجانے کے دعوے کی دھمکی دے دی۔ برطانوی سفیر بچانان اس کے متعلق اپنی ڈائری میں لکھتا تھا۔ ''ٹراٹسکی کی اس دلیل میں وزن ہے اگر ہم جنگ جاری رکھنے پر تلے ہوئے ہیں اور اس حقیقت سے ہمارے خلاف پراپیگنڈا کرنے والے کسی روسی کو گرفتار کرنے کا حق رکھتے ہیں تو پھر روس کے اندر جنگ کا پراپیگنڈا کرنے والے کسی برطانوی کو روس بھی گرفتار کرنے کا حق رکھتا ہے کہ وہ امن کا خواہاں ہے۔''

چچیرن کو رہا کر دیا گیا۔ وہ بڑی مناسب موقع پر ماسکو پہنچا تھا۔ میں نے سکھ کا سانس لیتے ہوئے

امور خارجہ کا شعبہ اس کے حوالے کر دیا۔ ان دنوں میں امور خارجہ کی وزارت میں بالکل نہیں جاتا تھا۔ چچیرن کبھی کبھی فون پر مجھ سے مشورہ طلب کر لیتا تھا۔ 13 مارچ کو مس نے خارجہ امور کے کمسار کے عہدے سے استعفیٰ دیا تا اوراسی دن میرے تقرری بطور کمسار جنگ سے ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ مجھے سپریم جنگ کونسل کا چیئرمین بھی بنا دیا گیا تھا۔ یہ کونسل میرے ہی کہنے پر قائم کی گئی تھی۔

لینن نے آخر اپنا مقصد پا لیا تھا۔ یعنی اس نے برسٹ۔لٹووسک معاہدے پر میرے اختلافات کو بدلتے ہوئے حالات میں اپنے خیال کو عملی لباس پہنانے کیلئے استعمال کر لیا۔ اندر بیٹھے دشمنوں نے فوج تیار کر کے کئی محاذ جنگ کھول دیے تھے۔ لہذا لینن نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں فوجی آپریشن کی کمان سنبھال لوں۔ میں نے اس کے خلاف دلیل دینے کی کوشش کی۔ '' پھر کس آدمی کا تقرر کیا جا سکتا ہے؟ اس کا نام بتاؤ۔'' لینن نے اپنا جملہ جاری رکھا۔ میں نے لمحہ بھر کے لئے سوچا اور پھر اسی سے متفق ہو گیا

کیا میں فوجی کام کرنے کو تیار تھا؟ بالکل نہیں۔ میں نے تو زار کی فوج میں تربیت بھی حاصل نہیں کی تھی۔ یہ سارے سال تو مس نے قید، جلاوطنی اور بیروب ملک گزار دیے تھے۔ 1906ء میں ایک عدالتی سزا نے مجھے تمام شہری اور فوجی حقوقسے محرم کر دیا تھا۔ بلقان جنگ کے دوران میں چند ماہ سربیا، بلغاریہ اور رومانیہ میں گزارنے سے مجھے فوجی معاملات کا کچھ پتا چل گیا تھا۔ مگر میں ں انہیں فوجی کے بجائے سیاسی نقطہ نظر سے ہی دیکھتا تھا۔ عالمی جنگ میرے علاوہ دوسروں کو بھی عسکریت کے قریب لے آئی تھی '' ناشے سلووُ'' اور '' کیف سکایا میسل'' میں مسلسل مضامن تحریر کرنے سے مجھے اس نئے علم اور مشاہدات کا ایک حد تک باقاعدہ تجربہ ہو گیا تھا۔ لیکن ان مضامین میں بھی جنگ کو سیاست ہی کا تسلسل سمجھتا تھا اور فوج سیاست ہی کی آلہ کار تھی۔ لیکن میرے لئے فوج کے فنی اور تنظیمی معاملات تو بڑی دور کی بات تھے۔ دوسری طرف جب کوئی فوجی بارکوں، مورچوں، میدان جنگ، ہسپتال یا کسی اور جگہ ہوتی تو اسکی نفسیات میرے لئے بڑی دلچسپی کا باعث بن جاتی۔ یہ بات بعد میں میرے لئے بڑی مفید ثابت ہوئی۔

جن ممالک میں پارلیمانی نظام حکومت ہے وہاں جنگ اور نیوی کی وزارتیں عموماً وکیلوں کو دی جاتی ہیں جو فوج کو زیادہ تر اپنے دفتروں کی کھڑکیوں سے دیکھتے ہیں۔ ممکن ہے وہ خود کو مجھ سے بہتر محسوس کرتے ہوں۔ اس میں ایک واضح فرق ہوتا ہے۔ سرمایہ دار ممالک میں جو فوج پہلے سے موجود وہتی ہے اسی کو برقرار رکھا جاتا ہے اور اس کی دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں مس ایک سیاسی نظام کو در پردہ فوج

کی مدد سے قائم رکھا جاتا ہے۔ ہمارے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ ہم نے ایک پرانی فوج کو ختم کر کے آگ کے شعلوں میں ایک نئی فوج تیار کرنی تھی۔ اور ایسی فوج تیار کرنے کا کوئی منصوبہ کسی کتاب میں دستیاب نہیں تھا۔ اس وضاحت سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ میں فوجی ذمہ داری قبول کرنے سے کیوں ہچکچا رہا تھا' اور اسے فقط اس لیے قبول کیا تھا کہ کوئی دوسرا اس کیلئے تیار نہیں تھا۔

میں فوجی حکمت عملی کا ہرگز ماہر نہیں ہوں۔ مگر انقلاب کے بعد پارٹی جس قسم کے حکمت عملی کے ماہروں سے بھر گئی تھی وہ میری برداشت سے باہر تھے۔ یہ درست ہے کہ میں نے تین مواقع پر -- یعنی ڈینی کن جنگ' پیٹروگراڈ کے دفاع اور پلسدسکی کے ساتھ جنگ میں -- میں نے بالکل آزاد حکمت عملی اختیار کی تھی اور مرکزی کمیٹی کی اکثریت کے خلاف نازک فیصلے خود کیے تھے۔ لیکن ان معاملات میں میری صربی پوزیشن کا تعین سیاسی اور معاشی مسائل نے کیا تھا' نہ کہ فقط جنگی حکمت عملی نے۔ یہ بتانا ضروری ہے کہ ان مسائل کو مدنظر رکھے بغیر کوئی بھی اعلیٰ سے اعلیٰ جنگی حکمت عملی کامیاب نہیں ہوتی۔

میرے کام کی تبدیلی کے ساتھ ہی حکومت کی جگہ بھی تبدیل ہو گئی۔ حکومت کا ماسکو منتقل ہو جانا پیٹرو گراڈ پر ایک بھاری ضرب تھی۔ اس نقل مکانی کی سب سے زیادہ مخالف زینوشیف نے کی جو اس وقت پیٹروگراڈ سوویٹ کا چیئرمین تھا۔ اس کی حمایت لونا چرسکی نے کی جو انقلاب کے چند روز بعد اس بنا پر حکومت سے الگ ہو گیا تھا کہ وہ ماسکو میں سینٹ باسل چرچ کی تباہی (بالکل خیالی) کی ذمہ داری نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔ اب اپنی جگہ پر واپس آنے کے بعد وہ سمولنی سے جدا ہونے کو تیار نہیں تھا جو اسکے نزدیک ''انقلاب کی علامت'' تھا۔

دوسرے لوگوں نے زیادہ سنجیدہ دلائل پیش کیے۔ اکثریت کو یہ خدشہ تھا کہ اس تبدیلی کا پیٹروگراڈ کے محنت کشوں پر برا اثر پڑے گا۔ ہمارے دشمن اس وقت یہ افواہ پھیلا رہے تھے کہ ہم پیٹروگراڈ قیصر ولیم کے حوالے کر رہے تھے دوسری طرف لینن کا اور میرا اصرار تھا کہ حکومت ماسکو منتقل ہو جانے سے حکومت ہی نہیں پیٹروگراڈ بھی زیادہ محفوظ ہو جائے گا۔ انقلابی دارالحکومت اور اس کی حکومت کو ایک ہی حملے میں فتح کر لینے کی زبردست خواہش جرمنی کی بھی تھی اور اتحادیوں کی بھی۔ بھوک سے نڈھال پیٹروگراڈ کو دارالحکومت نہ ہونے کی صورت میں فتح کرنا بالکل دوسری بات تھی۔ آخر حکومت کی منتقلی کی مزاحمت ختم ہو گئی اور مرکزی کمیٹی کے ارکان کی اکثریت نے یہ قرارداد منظور کر دی۔ حکومت 12 مارچ 1918ء کو ماسکو

چلی گئی۔ یہ تاثر دور کرنے کیلئے کہ اکتوبر انقلاب کے دارالحکومت کی تنزلی کی گئی تھی' میں دو یا تین ہفتے وہیں رہا۔ ریلوے انتظامیہ نے مزید چند گھنٹوں کیلئے مجھے ریلوے سٹیشن پر روک لیا۔ سبوتاز کا اب بھی خطرہ تھا مگر کم ہوتا جا رہا تھا۔ جنگ کا کمسار مقرر ہونے کے ایک دن بعد میں ماسکو پہنچا۔

اپنی قرون وسطیٰ کی دیواروں اور بے شمار سنہری گنبدوں کے ساتھ کریملن بظاہر کچھ اور اندر سے کچھ انقلابی آمریت کا ایک قلعہ لگتا تھا۔ سمولنی جو پہلے اشرافیہ کا ایک گرلز سکول تھا، محنت کشوں، سپاہیوں' کسانوں اور پارلیمان کے ارکان کیلئے نہیں تھا۔ مارچ 1918ء سے پہلے میں کبھی کریملن کے اندر نہیں گیا تھا اور نہ ہی ماسکو کو جانتا تھا ماسوا اس کی ایک عمارت کے' اور وہ تھی بٹلی رسکی عارضی جیل۔ اس کے ایک مینار میں مس نے 99-1898ء کے موسم سرما کے چھ ماہ گزارے تھے۔ ایک سیاح کی حیثیت سے ممکن تھا میں کریملن جو ایوان' ڈی بیٹر بل کا محل تھا' کی شان وشوکت کی مداح سرائی کرتا۔ لیکن ہم نے یہاں ایک طویل عرصے تک رہنا تھا۔ دو تاریخی تضادتیں' دو غیر مصالحتی ثقافتیں -- میرے لئے حیران کن مگر پر لطف تھیں۔ نکولائی وسکی محل کے قریب سے چوبی تختوں والے سڑک پر کارمس گزرتے وقت میں زار کی توپوں اور گھنٹیوں کی طرف دیکھنے لگتا گھنٹیوں کی آواز میں سے مجھے ماسکو کی بربریت جھانکتی ہوئی دکھائی دیتی ۔ پرنس ہملٹ یہاں ہوتا تو یقیناً یہ الفاظ دہراتا۔ ''وقت اپنے حلقہ زنجیر سے باہر ہے۔ اے منحوس حسد! میں اسے درست کرنے کیلئے پیدا ہوا ہوں۔'' لیکن ہم میں ہملٹ والی کوئی بات نہیں تھی۔ اہم ترین سوالوں پر بھی لینن ہمیں دو منٹ سے زیادہ بولنے نہیں دیتا تھا۔ اس عرصے میں تو ایک پسماندہ ملک کی ترقی کے تضادات کے بارے ہی میں سوچا نہیں جا سکتا تھا۔ پھر کریملن کے ماضی کو دھیان میں رکھتے ہوئے ہم ایک میٹنگ سے دوسری میٹنگ میں جاتے رہتے۔ مگر دو منٹ سے زیادہ نہیں۔

پوٹی شنی محل کے بالکل سامنے کا والرسکی عمارت انقلاب سے پہلے کریملن کے سرکاری اہلکاروں کی رہائش گاہ تھی۔ اس کی پوری نچلی منزل کمانڈگ افسر کے پاس تھی۔ اب اس میں مختلف اپارٹمنٹ بنا دیے گئے تھے۔ لینن کا اور میرا اپارٹمنٹ برآمدے سے آگے اور کھانے کا کمرہ مشترکہ تھا۔ اس وقت کریملن کھانا بڑا خراب تھا۔ تازہ گوشت کی جگہ ڈبوں میں بند گائے کا گوشت استعمال کیا جاتا' آٹے اور جو میں ریت ملی ہوتی۔ جوار بہت زیادہ تھی کیونکہ اس کی برآمد بند ہو گئی تھی۔ انقلاب کا پہلا پورا سال ہمیں اسی خوراک پر گزارہ کرنا پڑا۔

سپاسکی مینار کا۔موسیقی والا کلاک ہمیں ٹھیک کرانا پڑا اب اس کی گھنٹیوں میں سے ہر پندرہ منٹ بعد ''خدازار کوسلامت رکھے'' کی بجائے ''انٹرنیشنل'' کی آواز مدھم طور پر نکلتی تھی۔کریملن میں داخلے کا راستہ سپاسکی مینار کے نیچے ایک محراب دار سرنگ کے ذریعے تھا۔سرنگ کے اوپر ایک پرانی صلیب تھی جس کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا۔صلیب کے سامنے ایک لیمپ تھا جو مدت سے بجھ چکا تھا۔کریملن سے باہر آتے وقت ہر کسی کی آنکھ صلیب پر پڑ جاتی اور کانوں میں ''انٹرنیشنل'' کی آواز گونجنے لگتی۔مینار کے اوپر دوسرا اوالا ایک سنہری عقاب تھا جو پہلے ہی کی طرح تھا مگر اب اسکا تاج اتار دیا گیا تھا۔میں نے تجویز کیا کہ عقاب کے سر کے اوپر درانتی ہتھوڑا بنادیا جائے تاجہ سپاسکی مینار کی بلندیوں سے دوعہدوں میں فرق دکھائی دینے لگے۔مگر کسی وجہ سے ایسا نہ کیا جا سکا۔

دن میں کئی بار برآمدے میں آتے جاتے لینن سے میری ملاقت ہوتی رہتی اور ہم متعدد باتیں زیر بحث لاتے۔بعصد فعہ یہ گفتگو دس سے پندرہ منٹ تک جاری رہتی۔لینن قدرے باتونی تھا مگر سوچ سمجھ کر بات کرتا۔بہت سی باتیں ہمارے لئے بالکل نئی تھیں۔ان کے لئے تیار ہونا پڑتا تھا۔خود کو دوسروں کو تیار کرنا پڑتا تھا۔برسٹ۔لٹووسک معاہدے پر لینن اور میرے درمیان جو اختلاف رائے پیدا ہوا تھا اب وہ ایک بادل کی طرح چھٹ گیا تھا۔لینن کے میرے اور میری فیملی کے ساتھ تعلقات بڑے خوشگوار تھے۔وہ اکثر ہمارے بیٹوں کو برآمدے میں روک کر ان سے کھیلتے لگتا۔

میرے کمرے کا فرنیچر کاریلن لکڑی کا بنا ہوا تھا۔آتش دان کے اوپر ایک کلاک کیوپڈ کے نیچے سے اپنی مہینی چاندی جیسی آواز میں گنگناتا رہتا۔ہر کرسی سے حکمران طبقے کی بہترین زندگی کی فضا لپٹی ہوئی تھی۔پھر میں نے اپنا اپارٹمنٹ عمارعت کے بازو والے حصے میں لے لیا۔محاذ جنگ سے مختصر دورے پر ماسکو آنے پر میں وہیں سوتا تھا۔

میرا خیال ہے میں اسی دن پیٹروگراڈ سے ماسکو پہنچا تھا۔ہم انہیں کاریلین لکڑی کی بنی ہوئی کرسیوں پر بیٹھے آپس میں باتیں کررہے تھے۔کیوپڈ کے نیچے سے کلاک کی مہین چاندی جیسی آواز ہمارے کانوں میں پڑ رہی تھی۔ہم نے ایک دوسرے کی طرف یوں دیکھا جیسے دونوں ایک ہی چیز کے متعلق سوچ رہے تھے۔کمرے کے کونے میں چلتا پھرتا ماضی ہمیں سن رہا تھا۔ہم چاروں طرف سے اس میں گھرے ہوئے تھے،ہم اسے اگر عزت نہیں دے رہے تھے تو اس کے دشمن بھی نہیں تھے۔ہمارے لبوں

پر ایک طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ یہ کہنا غلط ہوگا کہ ہم کریملن کی فضا اور گردوپیش کے عادیہ ہو گیے تھے۔ ہماری زندگیاں اس کے بہت آ گے تھیں۔ ہمارے پاس ان سے عادی ہونے کا وقت ہی کب تھا۔ ہم اپنی آنکھوں کے گوشوں سے گردوپیش کو دیکھتے اور تصور ہی میں ایک طنزیہ مگر امید بھری آواز سے کیوپڈ سے کہتے رہتے۔ ''ہم تمہاری توقع کے خلاف یہاں آ گئے ہیں۔ کیا کیا جا سکتا ہے۔ اب ہمارے عادی ہو جاؤ'' پھر اپنے گردوپیش کو اپنا عادی بنانے میں لگے رہے۔

کریملن کے پرانے نچلے درجے کے ملازمین کو بحال رکھا گیا۔ انہوں نے خود زدگی کی حالت میں ہمارا استقبال کیا تھا۔ یہاں کی فضا سخت قسم کی تھی۔ جاگیرداری کے دنوں سے چلی آ رہی تھی۔ ملازم بھی نسل در نسل ایک ہی تھے۔ بعض ایسے بوڑھے ملازم بھی تھے جنہوں نے کئی بادشاہوں کے زمانے دیکھے تھے۔ ان میں ایک سٹوپسیشن تھا۔ وہ داڑھی منڈا مگر بڑا فرض شناس تھا۔ اپنے زمانے میں دوسرے سارے ملازمی اس سے ڈرتے تھے۔ جوان نسل کے ملازمین اگرچہ اب بھی اسے عزت سے دیکھتے تھے مگر یہ نگاہ جیسے کہہ رہی ہوتی کہ اب وہ نئے تقاضوں کا ساتھ دینے کا اہل نہیں رہا تھا۔ وہ سارا دن بے تکان برآمدوں میں پھرتا رہتا' چیزوں کی جھاڑ پونچھ کرتا رہتا اور پرانے نظام کی ظاہری صورت کو قائم رکھنے میں لگا رہتا۔ کھانے میں ہمیں سبزیوں کا سوپ اور گیہوں کی روٹی ایسی تھالیوں میں دی جاتی جن پر عقاب بنا ہوا تھا۔ سروزا ماں سے سرگوشی کرتا ''دیکھو ماں' یہ یہاں کیا کر رہا ہے؟'' بوڑھا آدمی ایک سائے کی طرح کرسیوں کے عقب میں پھرتا اور خاموشی سے پلیٹوں کو میز پر لگاتا اور سیدھا کرتا رہتا۔ سروزا نے پہلی مرتبہ غور کیا۔ اس کا خیال تھا کہ دہرے سروں والے عقاب والی پلیٹ کا منہ مہمان کی طرف ہونا چاہیے تھا۔

'' آپ نے سٹوپیشن کو دیکھا ہے؟'' میں نے لینن سے پوچھا۔

''اسے دیکھے بغیر کون رہ سکتا ہے۔'' اس نے ہلکے طنز سے جواب دیا۔

کبھی کبھی پرانے ملازمین کو دیکھ کر دکھ بھی ہوتا تھا۔ انہیں ان کی جڑوں' تنوں اور شاخوں سے الگ کر دیا گیا تھا۔ سٹوپیشن جلد ہی لینن کے ساتھ جڑ گیا۔ جب لینن سوویٹ کمسار کی قریبی عمارت میں منتقل ہو گیا تو سٹوپیشن کی خدمات میں نے حاصل کر لیں۔ وہ میرا' میری بیوی اور بیٹوں کا بڑا خیال رکھتا دوسری طرف اسے بھی احساس تھا کہ ہم اس کا بہت خیال رکھتے تھے۔

جلد ہی پرانا سٹاف ہٹا دیا گیا۔ نئے لوگوں نے بڑی جلدی خود کو نئے ماحول میں ڈھال لیا۔

سٹوپشن ابھی پنشن پر جانا نہیں چاہتا تھا۔ لہذا اس کا تبادلہ ایک میوزیم میں کر دیا گیا جو پہلے ایک بڑا محل ہوتا تھا۔ وہ اکثر ہمیں ملنے ہمارے اپارٹمنٹ میں آتا رہتا۔ پھر کانگرسوں اور کانفرنسوں کے دوران میں اسے محل کے اندر اینڈری زی وسکی ہال کے دروازے پر بطور چوکیدار لگا دیا گیا۔ وہ نظم و نسق برقرار رکھتا۔ یہاں بھی وہ وہی فرائض انجام دیتا جو زاروں اور ڈیوکوں کی تقریبات میں انجام دیتا آیا تھا۔ فرق بس اتنا تھا کہ اب یہ کمیونسٹ انٹرنیشنل تھی۔ اس کی تقدیر میں لکھا تھا کہ اس نے سپاسکی مینار کے کلاک کی گنگناہٹ کو زار سے انقلاب کی گنگناہٹ میں تبدیل کرنا تھا۔ 1926ء میں جب وہ ہسپتال میں ایک طویل اور گرتی پڑتی موت مر رہا تھا تو میری بیوی اس کیلئے تحائف لے کر گئی۔ شکریہ ادا کرتے وقت اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

سوویٹ ماسکو نے ہمارا استقبال نری افراتفری اور ابتری میں کیا۔ ماسکو کی اپنی عوامی کمسار کی سوویٹ تھی جس کا چیئرمین مورخ پڑروسکی تھا۔ آخری آدمی جو اس عہدے کیلئے مناسب ثابت ہوسکتا تھا۔ ماسکو سوویٹ کی حاکمیت ماسکو کے سارے علاقے پر تھی اور اس علاقے کی حدیں متعین نہیں تھیں۔ شمال میں یہ آرچنگل اور جنوب میں کرش صوبے سے ملتی تھیں۔ لہذا ماسکو میں ایسی ایسی حکومت تھی جس کی حاکمیت سوویٹ علاقے کے بڑے حصے پر مشکوک تھی۔ ماسکو اور پیٹروگراڈ کا روایتی تصادم انقلاب میں کسی نہ کسی طرح قائم رہ گیا تھا۔ ایک زمانے میں ماسکو ایک بڑا گاؤں اور پیٹروگراڈ ایک شہر تھا۔ ماسکو جاگیرداروں اور سوداگروں کی نمائندگی کرتا تھا جب کہ پیٹروگراڈ فوج اور سرکاری اہلکاروں کا شہر تھا۔ ماسکو روس کا پر تپاک دل تھا۔ پیٹروگراڈ کا مزاج یورپی تھا۔ غیر ذاتی، متکبر اور ملک کی نوکرشاہی کا دماغ۔ ماسکو سوتی کپڑے کی صنعت کا مرکز تھا جب کہ پیٹروگراڈ دھات کی صنعت میں آگے تھا۔ ان فرقوں کو کچھ زیادہ ہی بڑھا چڑھا دیا گیا تھا۔ مگر ہمیں یہ فوراً محسوس ہو گئے۔ مقامی حب الوطنی ماسکو کے بالشویکوں میں صاف دکھائی دیتی تھی۔ ماسکو کے سوویٹ کمساروں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کیلئے فوری طور پر ایک کمیشن بنایا گیا جس کا چیئرمین مجھے نامزد کیا گیا۔ یہ بڑا عجیب کام تھا۔ ہم نے علاقائی کمساروں کو بڑے صبر کے ساتھ تقسیم کیا اور مرکزی حکومت میں ان کا جو حصہ بنتا تھا نہیں دے دیا۔ کام کو آگے بڑھانے کے ساتھ محسوس ہوا کہ مقامی ماسکو حکومت غیر ضروری تھی۔ ماسکو والوں نے خود ہی اپنی کمساری کی سوویٹ کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

روسی تاریخ میں دوسری دفعہ ماسکو کا یہ عہدہ ریاست کی شیرازہ بندی کرنے اور تنظیمی ادارے کا عہد تھا۔ ہمارے جو ساتھی ابھی تک پراپیگنڈا کے طریقے استعمال کرنے پر یقین رکھتے تھے' لینن کا ان سے طرز سلوک بے صبری اور طنز پر مبنی ہوتا۔ یہ طنز کبھی کبھی تلخ قسم کے مذاق میں بھی بدل جاتی۔''میرے دوست ذرا بتائیں تو سہی آپ کہاں رہ رہے ہیں؟ سمولنی میں؟ اسی پرانی سمولنی میں؟'' کسی مداخلت کار کو وہ روک کر اپنی بات دوبارہ شروع کر دیا ت۔''جناب والا! جاگ پڑیں۔ اب ہم سمولنی میں نہیں ہیں۔ بہت آگے نکل چکے ہیں۔'' جب اگلے دن کی تیاری مقصود ہوتی تو لینن ماضی کو کبھی معاف نہیں کرتا۔ ہم سب مل کر کام کر رہے تھے۔ لینن بڑے طریقے اور اصول کے مطابق کام کرتا۔ میں اس کی نقل اتارتا رہتا۔ ہم کاہلی اور سستی کا پاس نہیں بھٹکنے دیتے تھے۔ میری تجویز پر دیر سے آنے والوں اور دیر سے اجلاس کا آغاز کرنے والوں کے لیے سخت قوانین بنا دیے گئے۔ بتدریج ابتری کی جگہ نظم لیتا گیا۔

جن میٹنگوں میں محکموں کے درمیان تصادم کا مسئلہ زیر بحث آنا ہوتا' لینن فون پر مجھے کہہ دیتا کہ میں مسئلے کی نوعیت پہلے ہی دیکھ لوں۔ ہمارے دونوں کے اختلافات پر جو لکھا گیا ہے وہ غیر معتبر ہے۔ کسی مسئلے پر بحث کے بعد ہم آخر میں متفق ہو جاتے۔ یا پھر آزادانہ سوچ کر ایک دوسرے کو فون پر مطلع کر دیتے۔ جب ہمیں معلوم ہوتا کہ کسی معاملے پر ہماری ایک ہی رائے تھی تو پھر ہم ضروری فیصلے پر جلد پہنچ جاتے۔ لیکن جب لینن کو جانتا کہ اس کے کسی منصوبے کی سخت مخالفت ہوگی تو وہ مجھے فون پر کہتا۔''میٹنگ میں آنا مت بھولنا۔ میں تمہیں سب سے پہلے بولنے کو کہوں گا۔'' میں تھوڑی دیر بولتا۔ پھر لینن کہتا۔''ٹھیک ہے۔'' میری تقریر کے دوران وہ دو دفعہ ''ٹھیک ہے'' کہتا اور بات کا فیصلہ ہو جاتا۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ دوسرے ہماری مخالفت سے ڈرتے تھے۔ اس وقت آج جیسی صورتحال نہیں تھی کہ اپنے سے بڑے راہنماؤں کی ہر بات سن کر چپ رہو اور ان کی ہاں میں ہاں ملاتے جاؤ۔ اس وقت نوکرشاہی کی کم اور قیادت کی حاکمیت زیادہ ہوتی تھی۔

جب میں لینن کی کسی بات پر متفق نہ ہوتا تو ہمیشہ تو نہیں' کبھی کبھی ہمارے درمیان تیز و تند بحث چھڑ جاتی۔ اتفاق کرنے پر بحث مختصر ہو جاتی۔ اگر کسی وجہ سے کسی مسئلے پر ہم پیشگی بات نہ کر پاتے تو اجلاس کے دوران میں نوٹس کا تبادلہ کرتے رہتے اگر ہمارے درمیان کوئی اختلاف رائے ہوتا تو لینن اجلاس ملتوی کر دیتا۔ کبھی کبھی میں اختلافی نوٹس کو مزاحیہ بنا دیتا جسے پڑھ کر لینن کا پورا بدن ہلنے لگتا' خاص طور پر جب وہ

تھکا ہوتا۔ یہ اس کی ایک بچگانہ عادت تھی۔اس کی بہت سی مردانہ خاصیتوں کے اندر کئی ایک بچگانہ خاصتیں بھی پوشیدہ تھیں۔میں بھی مسرت کے ایک احساس کے تحت اس کے بدن کو ہلتا ہوا دیکھتا رہتا۔وہ اسی حالت میں اجلاس کو بڑی سنجیدگی میں چلانے کی کوشش میں لگا رہتا۔اس کے گالوں کی ہڈیاں دباؤ کے تحت زیادہ باہر نکل آتیں۔

میری وزارت جنگ کریملن سے باہر تھی۔جنگی امور کے علاوہ میں اپنے دوسرے کام میں میرا ادبی کام بھی شامل تھا، وہیں بیٹھ کر کیا کرتا۔میری رہائش کاوالرسکی عمارت میں تھی۔ مجھے وہاں ملنے کوئی نہ آتا۔کام کے سلسلے میں لوگ میرے دفتر ہی ملتے جہاں تک سماجی ملاقاتوں کا تعلق تھا اس کا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ہمارے پاس ان کے لے وقت ہی کب ہوتا تھا۔میں پانچ بجے گھر واپس آتا اور سات بجے پھر اپنے دفتر چلا جاتا۔ بہت بعد جب انقلاب کا راستہ ہموار ہو گیا تو میں اپنی شامیں اپنے نظریاتی اور ادبی کاموں میں صرف کرنے لگا۔

میری بیوی وزارت تعلیم میں چلی گئی۔اسے عجائب گھروں اور آثار قدیمہ کا انچارج بنادیا گیا۔اس کا کام پرانے آثار کو خانہ جنگی سے بچانا تھا۔ یہ ایک مشکل کام تھا۔نہ ہی سفید فام اور نہ ہی سرخ فوجوں کو تاریخی عجائب کا اکچھا اتنا شعور تھا۔اس سے محکمہ جنگ اور محکمہ آثار قدیمہ میں دلائل ملتے رہتے۔محکمہ آثار قدیمہ فوج طرثقافت کا لحاظ نہ رکھنے کا الزام لگاتا رہتا۔دوسری طرف محکمہ جنگ اسے طعنہ دیتا کہ وہ زندوں کی بجائے مردوں کا زیادہ خیال رکھتا تھا۔یوں لگتا جیسے میں اپنی بیوی کے ساتھ طویل ممکنا لڑائی میں پڑ گیا تھا۔اس سلسلے میں ہمارے متعلق کئی لطیفے گھڑ لیے گئے تھے۔

اب لینن سے میری بات زیادہ تر فون پر ہوتی۔ہم تھوڑی دیر بعد اہم باتوں پر فون کرتے رہتے۔محکمے اس ست سرخ فوج کی شکایات کرتے رہتے۔لینن مجھے فوراً فون کر دیتا۔ پھر وہ محکمہ زراعت یا معائنہ ٹیم میں کسی آدمی کی تقرری کے سوال پر اس آدمی کے متعلق مجھ سے رائے طلب کرنے لگتا۔پھر ایک گھنٹے بعد وہ مجھ سے پوچھتا کہ کیا میں نے پرولتاری کلچرل پر نظریاتی بحث سنی تھی، اور کیا بخارن پر جوابی حملے کی میری نیت تھی۔کبھی یہ سوال بیدار ہو جاتا کہ کیا محکمہ جنگ خوراک کو سٹیشن تک لے جانے کیلئے اپنے جنوبی محاذ کے ٹرک محکمہ خوراک کو دے سکتا تھا؟ پھر نصف گھنٹے بعد لینن کا فون آجاتا کہ کیا میں سویڈش کمیونسٹ پارٹی میں اختلاف رائے پر نظر رکھے ہوئے تھا؟ ہر روز ایسا ہی ہوتا تھا۔ ماسکو میں یہ میرا حال تھا

جرمنوں کی پیش قدمی کے ساتھ ہی فرانس جو اتحادوں میں زیادہ سمجھ دار تھا' اس کا رویہ اچانک بدل گیا۔ اس نے ہوین زولرنوں سے ہماری خفیہ بات چیت کے احمقانہ پن کو محسوس کر لیا تھا۔ اسے پتا چل گیا کہ ہم جنگ میں نہیں کود یں گے۔ بعض فرانسیسی افسر وقت حاصل کرنے کی غرض سے ہمیں امن معاہدے پر دستخط کرنے پر مجبور کرنے لگے۔ پھر فرانسیسی خفیہ محکمے کا ایک افسر جس کا تعلق اشرافیہ سے تھا اور جو شاہ پرست تھا اور جس کی ایک آنکھ تھی' اس بات پر زیادہ زور دینے لگا۔ اس نے نہایت خطرناک کاموں کیلئے مجھے اپنی خدمات بھی پیش کیں۔

جنرل لیورجنی جو جنرل نیسل کی جگہ آیا تھا' مجھے بڑے محتاط اور نرم لہجے میں مشورے دیتا رہتا تھا۔ ان مشوروں کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی تھی مگر بظاہر وہ میرے فائدے کیلئے ہوتے تھے۔ اس کے کہنے کے مطابق فرانسیسی حکومت نے برسٹ-لٹوسک امن معاہدے کو قبول کر لیا تھا اور وہ ہمیں ہماری فوج کی تعمیر نو میں کسی مفاد کے بغیر مدد دینا چاہتی تھی۔ وہ رومانیہ سے واپس آنے والے کئی فوجی افسر میری تحویل میں دینے کو تیار تھا۔ ان میں سے دو نے جن میں ایک کرنل اور ایک کیپٹن تھا' میرے دفتر کے سامنے رہائش اختیار کر لی تاکہ ضرورت پڑنے پر میں انہیں بلا سکوں۔ مجھے شک تھا کہ وہ فوجی معاملات کے بجائے جاسوسی کے معاملات میں زیادہ تاک تھے۔ انہوں نے مجھے اپنی درخواستیں بھی دے دیں جنہیں میں افراتفری کے ان دنوں میں نہ جانے کہاں رکھ کر بھول گیا۔

اس مختصر ''صلح نامے'' کی داستانوں میں سے ایک داستان اتحادی فوجی مشنوں کا میرے پاس آنا تھا۔ وہ تعداد میں بہت تھے اور ہر مشن کئی افراد پر مشتمل تھا۔ ان کے تقریباً بیس نمائندے مجھے میرے چھوٹے سے کمرے میں ملنے آئے۔ جرنیل لیونگی انہیں لایا تھا۔ ان میں سے بعض کی باتیں مایوس کن تھیں۔ ایک ملائم صورت جنرل نے ماسکو کو ڈاکوؤں سے نجات دلانے پر مبارک باد دے کر خود کو نمایاں کرنے کی کوشش کی۔ اس نے دل موہ لینے والی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''اب ماسکو میں کسی دوسرے دارالحکومت کی طرح بے خوف اور حفاظت سے رہا جا سکتا ہے۔'' میں نے اسے بتایا کہ وہ مبالغہ آمیزی سے کام لے رہا تھا۔ اس کے بعد ہم دونوں کے پاس کہنے کو کچھ نہ رہا۔ لیکن ملاقاتی اٹھ کر جانے کا نام نہیں کر رہے تھے' اور مجھے پتا نہیں چل رہا تھا کہ میں ان سے کیسے نجات حاصل کروں' آخر جنرل لیونگی نے مجھے اس مشکل صورت حال سے یہ کہہ کر نکالا کہ اگر فوجی نمائندے میرا مزید وقت نہ لیں تو مجھے کوئی

اعتراض تو نہیں ہوگا؟ میں نے اسے جواب دیا کہ ایسی عمدہ صحبت چھوڑنے کو میرا دل بالکل نہیں چارہ رہا تھا۔ زندگی میں بعض ایسی ملاقاتیں ہوتی ہیں جنہیں یاد کر کے گھبراہٹ ہونے لگتی ہے۔ یہ بھی ایسی ہی ایک ملاقات تھی۔

پھر فوجی معاملات میرا زیادہ وقت لینے لگے۔ وجہ یہ تھی کہ میں ان میں بالکل کورا تھا۔ فنی اور فوجی آپریشن کے شعبوں میں میرا بڑا کام وہاں صحیح آدمی کی تعیناتی اور پھر اس کے کام کی نگرانی تھی۔ میرا سیاسی کام نئی فوج بنانے کے حوالے سے پارٹی ہی کا کام تھا۔ کسی دوسرے طریقے سے کامیابی کا امکان کم تھا۔

وزارت جنگ میں پارٹی ورکروں میں ایک فوجی ڈاکٹر شکل یانسکی تھا۔ نوجوان ہونے کے باوجود (1918ء میں وہ چھبیس سال کا تھا) وہ اپنی محنت' اپنے طریقہ کار اور لوگوں اور حالات کو جانچنے میں نمایاں طور پر آ گے تھا۔ دوسرے الفاظ میں وہ ایک بہترین منتظم تھا۔ سورڈلوف سے مشورے کے بعد جو ایسے معاملات میں بے حد مفید تھا' میں نے سکل یانسکی کو اپنا ڈپٹی بنا لیا۔ بعد میں مجھے اس کا کبھی افسوس نہ ہوا۔ میرا نائب ہونا بڑی ذمہ داری کا کام تھا کیونکہ میں زیادہ وقت محاذ پر رہتا تھا۔ میری عدم موجودگی میں سکل یانسکی انقلابی جنگی کونسل کی صدارت کرتا' محکمے کے تمام امور میں ہدایات جاری کرتا جن میں زیادہ تر محاذ کی ضرورتوں کا خیال رکھنا ہوتا تھا' اور دفاعی کونسل میں وزارت جنگ کی نمائندگی کرتا جس کا چیئرمین لینن تھا۔

انقلاب فرانس کے مزارے کارنٹ کا موازنہ اگر کسی شخص سے ہوسکتا ہے تو وہ سکل ناسکی ہے۔ وہ ہمیشہ درست' بے تکان' چوکنا اور باخبر ثابت ہوتا۔ وزارت جنگ کے بہت سے آرڈر اسی کے دستخطوں سے جاری ہوتے۔ چونکہ یہ آرڈر تمام اخبارات اور پارٹی کے ترجمان رسالے میں شائع ہوتے تھے لہذا سکل یانسکی کا نام ہر جگہ پہنچ گیا اور اسے ہر کوئی جاننے لگا۔ جیسا کہ ہوتا ہے کہ ایک محنتی منتظم ہونے کی وجہ سے اس کے بہت سے دشمن پیدا ہو گئے۔ اس کی صلاحیتوں نے بہت سے لوگوں کو بیخ پار کر دیا۔ سٹالن پس پردہ ان سب کو شہ دینے لگا۔ اس پر رکیک حملے کیے جانے لگے' خاص طور پر جب میں باہر ہوتا۔ لینن دفاعی کونسل کی وساطت سے سکل یانسکی کو بخوبی جانتا تھا اور ہمیشہ بڑے خلوص سے اس کی طرف داری کرتا رہتا۔ ''شاید کارکن۔ عمدہ کارکن'' لینن لفظوں میں اسے داد دیتا رہتا۔ سکل یانسکی سازشوں سے دور اپنے کام میں لگا رہتا۔ وہ کوارٹرز ماسٹروں کی رپورٹیں سنتا' صنعتوں سے اطلاعات جمع کرتا اور کارتوس کا

حساب رکھتا جن کی ہمیشہ کمی پڑ جاتی تھی۔ لگا تار سگریٹ پھونکنے کے ساتھ وہ تار پر تار بھیجتا جاتا اور ٹیلی فون پر چیف افسروں سے کونسل برائے دفاع کیلئے اعداد وشمار جمع کرتا رہتا۔ صبح کے دو یا تین بجے فون کرنے طر بھی وہ آپ کی وزارت دفاع میں بیٹھا مل جاتا۔ ''تم کب سوتے ہو؟'' میں اس سے پوچھتا۔ وہ مذاق سے میرا سوال ٹال دیتا۔

یہ یاد کر کے مجھے خوشی ہوتی ہے کہ وزارت دفاع ان ریشہ دوانیوں سے پاک تھی جو دوسرے محکموں میں عام پائی جا رہی تھیں۔ کام کی سخت نوعیت' قیادت کی حاکمیت' ورکروں کا درست انتخاب (اقربا پروری اور نرمی کے بغیر) وفاداری کا جذبہ۔ یہی وہ عناصر تھے جس سے ہماری وزارت کا مشکل اور تھکا دینے والا کام چل رہا تھا۔ ان سب خوبیوں کا سکل یانسکی مستحق تھا۔

خانہ جنگی نے مجھے کمساروں کی سوویٹ کے کام سے دور کر دیا تھا۔ میں ریل کے ڈبے یا کسی کار ہی میں رہتا۔ ہفتوں بلکہ مہینوں مسلسل سفر میں رہنے سے میں اپنے سرکاری امور سے بالکل کٹ جاتا اور جب کبھی مختصر عرصے کیلئے ماسکو آتا تو مجھے اپنا کام سمجھنے میں بڑی مشکل پیش آتی۔ سب سے اہم سوالوں کا فیصلہ ''پولٹ * بورو'' ہی کرتا۔ بعض اوقات مجھے اس کے اجلاس میں شرکت کیلئے لینن کے خاص بلاوے پر آنا پڑتا۔ یا پھر محاذ کے بے حد اہم مسائل زیر بحث لانے کی خاطر مجھے سورڈ لوف کی وساطت سے پولٹ بورو کا اجلاس بلانے کی ضرورت پڑ جاتی۔ ان برسوں کے دوران میں لینن سے میری خط وکتابت زیادہ تر خانہ جنگی کے معاملات پر ہوتی تھی۔ چھوٹے مراسلوں یا طویل ٹیلی گراموں کا تعلق گذشتہ سے پیوستہ معاملات یا مستقبل کے معلات کی بنیاد رکھنے پر ہوتا تھا۔ سرکاری نوعیت کی ہونے کے باوجود یہ دستاویزیں بالشویکوں کے بڑے گروہ کے اندر کے اصلی تعلقات کی ترجمانی کرتی تھیں۔ میں اس لمبی چوڑی خط وکتابت کو ضروری تبصروں کے ساتھ مستقبل میں شائع کروں گا۔ یہ سٹالن سکول کے مورخوں کا ایک منہ بولتا جواب ہوگا۔

جب ولسن روس کی تمام سوویٹوں کی حکومتوں کے درمیان ایک خیالی جنت جیسی عمدہ کانفرنس کے بارے میں سوچ رہا تا تو میں اس وقت جنوبی محاذ پر تھا۔ لینن نے مجھے وہاں ایک خفیہ تار بھیجا۔ اس نے لکھا۔ ''ولسن روس کی تمام سوویٹوں کی حکومتوں کی ایک کانفرنس بلانا چاہتا ہے۔

----

* پولٹ بورہو، پولیٹیکل بورہو کا مخفف ہے۔ یہ کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے اندر ایک ادارہ ہے جو پارٹی کی پالیسی کو کنٹرول کرتا ہے۔ مترجم

میرا خیال ہے تمہیں ولسن کے پاس جانا ہوگا۔'' برسٹ۔لٹووسک مذاکرات میں سفارتی فرائض انجام دینے کیلئے لینن کو مجھے ہی بلانا پڑا' حالانکہ میں اس وقت اپنے فوجی کام میں بری طرح پھنسا ہوا تھا۔جیسا کہ ہر کوئی جانتا ہے' ولسن کی امن کوششوں کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔لہذا مجھے اس کانفرنس میں جانے کا موقع ہی نہ ملا۔

لینن کے سینکڑوں تحریری ثبوتوں کے علاوہ میکسم گورکی نے بھی میرے جنگی کام کے متعلق لینن کی رائے کو بڑے واضح اور عمدہ لفظوں میں لکھا ہے۔میز کو اپنے ہاتھ سے بجاتے ہوئے وہ (لینن) بولا۔''کیا کوئی ایسا آدمی ہے جو ایک سال کے اندر فوج کو منظم کر کے اسے مثالی فوج بنا دے اور فوجی ماہروں جیسی عزت حاصل کر لے؟ ہمارے پاس ایسا کوئی آدمی ہے۔ ہمارے پاس سب کچھ ہے۔ہم معجزات دکھائیں گے۔''

گورکی کے مطابق لینن نے اسی گفتگو کے دوران میں اس سے کہا تھا۔''ہاں' ہاں' میں جانتا ہوں۔ اس سے میرے تعلقات کے متعلق بعض جھوٹ بولے جا رہے ہیں۔ بہت زیادہ جھوٹ۔ میرے اور ٹراٹسکی کے بارے میں۔'' اگر آج لینن زندہ ہوتا تو ریاستی سطح پر ہمارے تعلقات کے متعلق دروغ گوئی کو جو فیشن رواج پا گیا ہے' اسے دیکھ کر کیا کہتا؟

انقلاب کے دوسرے دن جب میں وزارت داخلہ لینے سے انکار کر رہا تھا تو میں نے دوسری باتوں کے علاوہ قومیت کا سوال بھی اٹھایا تھا صاف ظاہر ہے کہ داخلی امور کی نسبت جنگی امور میں یہ سوال زیادہ پیچیدہ نوعیت کا بن جاتا ہے۔لیکن لینن درست ثابت ہوا۔انقلاب کی پیش رفتگی کے دنوں میں اس سوال نے ذرا بھر اہمیت اختیار نہ کی۔ اگرچہ سفید فاموں نے سرخ فوج کے اندر میرے یہودی النسل ہونے کا پروپیگنڈا کیا مگر کامیاب نہ ہو سکے۔اس کے کئی ثبوت موجود ہیں' حتیٰ کہ سفید فام پریس میں بھی۔''روسی انقلاب کے محافظ خانے میں'' نامی کتاب جو برلن سے شائع ہوئی تھی' اس میں ایک سفید گارڈ مصنف یہ قابل غور واقعہ درج کرتا ہے۔''ایک کاسک جو ہمیں ملنے آیا کسی کے اس طعنے پر بڑا دل برداشتہ ہوا کہ وہ ٹراٹسکی نامی ایک یہودی کی کمان میں لڑا تھا۔اس کاسک نے بڑی برجستگی سے جواب دیا۔''ایسی کوئی

بات نہیں ہے۔ٹراٹسکی یہودی نہیں ہے۔وہ ایک جنگ جو ہے وہ ہمارا ہے۔وہ روسی ہے ۔لینن ایک کمیونسٹ ہے'ایک یہودی ہے ۔لیکن ٹراٹسکی ہمارا ہے ایک جنگ جو......... روسی....... ہمارا اپنا آدمی۔''

باسل کی کتاب ''گھوڑا فوج'' سے بھی یہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے۔ہماری جوان نسل کا یہ سب سے ذہن مصنف ہے۔میرے یہودی ہونے کے سوال نے فقط اس وقت اہمیت اختیار کی جب میرے گرد سیاسی جال پھیلایا گیا۔پھر میری صہونیت کی مخالفت کے ساتھ میرے ٹراٹسکی ازم کی بھی مخالفت ہونے لگی۔دونوں کا منبع ایک ہی تھا۔اکتوبر انقلاب کے خلاف پٹی بورژوا ردعمل۔

برسٹ-لٹووسک مذاکرات

وہ اعلان جس پر ہم نے امن قائم کرنے پر رضا مندی کا اظہار کیا تھا' 26 اکتوبر کو سوویٹوں کی کانگریس میں منظور کیا گیا تھا۔اس وقت تک پیٹروگراڈ ہمارے پاس تھا۔ 7 نومبر کو میں نے ریڈیو پر اتحادی ملکوں اور مرکزی طاقتوں کو ایک عمومی امن قائم کرنے کی دعوت دی۔اتحادی حکومتوں نے اپنے ایجنٹوں کے ذریعے روسی فوج کے کمانڈر-ان-چیف جنرل ڈکھونن کو جواب دیا کہ علیحدہ مذاکرات کی صورت میں اسے خطرناک نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔میں نے اس دھمکی کا جواب تمام محنت کشوں' سپاہیوں اور کسانوں سے اپیل کرنے کی صورت میں دیا۔یہ ایک قطعی درخواست تھی۔ہم نے اپنی بورژوازی کا تختہ اس لیے نہیں الٹا تھا کہ ہماری فوج کیسی بیرونی بورژوازی کیلئے اپنا خون بہائے۔

22 نومبر کو ہم نے بالٹک سے لے کر بحر ظلمات تک پھیلے ہوئے محاذ کے متعلق ایک صلح نامے پر دستخط کر دیے۔ہم نے ایک مرتبہ پھر اتحادیوں کو امن مذاکرات میں شامل ہونے کی دعوت دی۔کوئی جواب نہ آیا۔مگر دھمکیاں بھی رک گئیں۔اتحادی حکومتوں کو کچھ سمجھ آ گئی تھی۔ان مذاکرات 9 نومبر کو شروع ہوئے یعنی ہماری طرف سے امن کا اعلان کرنے کے چھ ہفتے بعد۔اس مسئلے پر اتحادیوں کیلئے اپنا نقطہ نظر قائم کرنے کیلئے خاصا وقت تھا۔ہمارے وفد نے آغاز ہی میں جمہوری امن کے اصولوں کا عمومی اعلان کر دیا تھا۔

مخالف فریق نے اجلاس ملتوی کرنے کا مطالبہ کر دیا۔کانگریس کا دوبارہ آغاز بار بار التوا میں ڈالا

جانے لگا۔ چاروں اتحادی قوموں کو ہمیں جواب دینے میں داخلی مشکلات کا سامنا تھا۔ آخر انہوں نے 5 2 دسمبر کو جواب دے دیا۔ اتحادی قوموں نے جمہوری امن فارمولا میں یہ اضافہ کیا کہ کسی کا کوئی علاقہ چھینا نہیں جائے گا' کوئی تاوان ادا نہیں کیا جائے گا اور لوگوں کو حق خود ارادیت دیا جائے گا۔ 28 دسمبر کو پیٹرو گراڈ میں جمہوری امن معاہدے کے حق میں ایک بڑا مظاہرہ کیا گیا۔ اگرچہ عوام کو جرمنوں کے جواب پر اعتبار نہیں تھا' اس کے باوجود وہ اسے انقلاب کی ایک عظیم فتح سمجھتے تھے۔ اگلی صبح جب ہمارا وفد برسٹ لٹووسک سے واپس آیا تو وہ اپنے ساتھ خوفناک مطالبوں کی ایک فہرست لایا۔ یہ مطالبات کہل مان نے مرکزی طاقتوں کی طرف سے پیش کیے تھے۔

اس موقع پر لینن نے کہا۔ ''مذاکرات میں تاخیر کیلئے کوئی تو تاخیر کرنے والا ہونا چاہیے۔'' اس کے اصرار پر میں برسٹ۔لٹووسک چلا گیا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں کسی ٹارچر چیمبر کی طرف جا رہا تھا۔ اجنبی اور نامانوس لوگوں سے ملنا میرے لیے ہمیشہ تکلیف دہ ہوتا۔ اس موقع پر تو مجھے خاصطور پر ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ میں ایسے انقلابی کو قطعی طور پر سمجھنے سے قاصر ہوں جو سفارتی عہدے قبول کر لیتے ہیں اور خود کو بے حد پرسکون محسوس کرتے ہیں۔

برسٹ۔لٹووسک میں پہلے روسی وفد کے ساتھ جس کی قیادت جوفے کر رہا تا' جرمنوں نے بڑا غلط قسم کا سلوک کیا باویریا کے شہزادے لیوپولڈ نے روسی وفد کا استقبال اپنے ''مہمانوں'' کے طور پر کیا۔ تمام وفود نے اکٹھے کھانا کھایا۔ جنرل ہوف مان نے وفد میں شامل خاتون رکن وتشرنکو کو یقیناً دلچسپی سے دیکھا ہوگا جس نے جنرل سیکسارو کو قتل کیا تھا۔ جرمن ہمارے آدمیوں سے گھل مل گئے اور ان سے ممکن حد تک خبریں اور اطلاعات حاصل کرنے کی کوشش میں لگے رہے۔ وفد میں ایک محنت کش' ایک کسان اور ایک سپاہی بھی شامل تھا جو اتفاقاً سے اس میں شامل ہو گئے تھے اور انہیں سفارتی داؤ پیچ کا کچھ پتا نہیں تھا۔ کسان جو کہ ایک بوڑھا آدمی تھا' اسے اس کے ظرف سے زیادہ شراب پلا دی جاتی۔

جنرل ہوف مان ماسٹاف روسی قیدیوں کیلئے ایک اخبار نکالتا تھا جس کا نام ''روسی پیغام رساں'' تھا۔ یہ اخبار اپنے ابتدائی شماروں میں بالشویکوں کیلئے ہمدردی کے بڑے کلمات لکھتا رہتا۔ ''ہمارے قارئین پوچھتے ہیں کہ ٹراٹسکی کون ہے۔'' پھر ہوف مان بڑے پیاس سے زاریت کیخلاف میری جدوجہد اور جرمن زبان میں میری کتاب ''روس انقلاب کے دنوں میں'' کا ذکر کرتا۔ وہ اس قسم کے جملے بھی لکھتا

۔‘‘اس کے کامیاب قرار پر پوری انقلابی دنیا میں ایک ولولہ دوڑ گیا۔ زاریت کا تختہ الٹنے کے بعد جب وہ طویل جلاوطنی سے واپس آیا تو اس کے دوستوں ہی نے اسے جیل میں ڈال دیا۔‘‘اسی قسم کے دوسرے جملے۔اس سے یہ محسوس ہوتا کہ باویریا کے شہزادے لیوپولڈ اور جنرل ہوف مان سے بڑھ کر کوئی اور انقلابی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

لیکن یہ خیال پرستی زیادہ عرصہ جاری نہ رہ سکی۔ 7 فروری کو برسٹ-لٹووسک کانفرنس کے وقت میں نے ماضی کا حوالہ دیتے ہوئے کہا۔‘‘ہم قبل از وقت کوئی ایسی تعریف قبول کرنے سے معذرت کا اظہار کرتے ہیں جو جرمن افسر اور آسٹرو-ہنگری اخبارات ہم پر نچھاور کر رہے ہیں۔ امن مذاکرات جس کامیابی سے آگے بڑھ رہے ہیں اس کیلئے یہ تعریف غیر ضروری تھی۔‘‘

ان مذاکرات میں شوشل ڈیموکریسی' ہوہن لرزن اور ہاپس برگ حکومتوں کے پیش نظر زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ شیلڈ مان' ایبرٹ اور دوسروں نے بڑی شفقت سے ہماری پشت پھپتھپانے کی کوشش کی۔ وی آنا کے اخبار‘‘ آربیٹر ذی تنگ‘‘ نے اپنے 15 دسمبر کے شمارے میں بڑے جذبے سے تحریر کیا۔‘‘ٹراٹسکی اور بچانان کے درمیان ڈوئل آج کے زمانے میں پرولتاریہ کی سرمایہ داری کے خلاف جدوجہد کی علامت ہے۔‘‘ جب برسٹ-لٹووسک میں روسی انقلاب کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی جا رہی تھی تو آسٹروی مارکسسٹوں کو یہ ایک‘‘ڈوئل‘‘ دکھائی دیا تھا۔ ایسی مکاری پر بیزاری کا اظہار ہی کیا جا سکتا ہے۔

پاپس برگ کے مارکسسٹوں نے لکھا۔‘‘ٹراٹسکی روسی محنت کش طبقے کی پرامن رہنے کی خواہش کا نمائندہ ہے۔ یہ طبقہ اس آہنی طلائی نما زنجیر کو توڑنے کی کوشش میں مصروف ہے جس سے برطانوی سرمائے نے اسے باندھ رکھا ہے۔‘‘ سوشل ڈیموکریسی کے راہنما نے رضا کارانہ طور پر کود کو آسٹروی- جرمن سرمائے سے باندھا تھا اور اپنی حکومتوں کو مجبور کر رہے تھے کہ روسی انقلاب کو بھی زنجیر پہنا دیں۔ برسٹ-لٹووسک مذاکرات کے مشکل ترین مرحلوں میں برلن کا اخبار‘‘ورورٹ‘‘اور ویانا کا اخبار‘‘آربرٹر ذی ژونگ‘‘ ایسی تحریریں لکھ رہے تھے کہ لینن اور میں ان پر رنگین پینسل سے نشان لگا کر ایک دوسرے کو دکھاتے' لمحہ بھر کیلئے آپس میں نظریں ملاتے اور پھر شرم سے دوسری طرف دیکھنے لگتے یہ تحریر ان لوگوں کی ہوتی جو ایک دن پہلے انٹرنیشنل میں ہمارے ساتھی تھے۔ اس مرحلے سے گزرنے والے ہر شخص نے شعوری طور پر محسوس کر لیا تھا کہ بدلتی ہوئے سیاسی صورتحال میں سوشل ڈیموکریسی تاریخی طور پر

مر چکی تھی۔

یہ مناسب مظاہرہ ختم کرانے کی خاطر میں نے اپنے اخبارات کے ذریعے جرمن جنرل سٹاف سے پوچھا کہ وہ جرمن سپاہیوں کو کارل لب نخت اور روسا لکشمبرگ کے بارے میں کچھ بتانا پسند کرے گا۔ اس موضوع پر ہم نے جرمن سپاہیوں کیلئے ایک خاص پمفلٹ لکھا جس پر جنرل ہوف مان اپنے ہی دانتوں سے اپنی زبان کاٹنے لگا۔۔ برسٹ لٹووسک ہی میری آمد کے فوری بعد ہوف مان انے اپنی فوجوں کے اندر ہمارے پراپیگنڈے پر احتجاج کیا۔ میں نے اس موضوع پر بات کرنے سے انکار کرتے ہوئے جنرل کو تجویز کیا کہ وہ بھی ہماری فوجوں کے اندر اپنا پراپیگنڈا جاری رکھ سکتا تھا۔ شرائط وہیں تھیں، پراپیگنڈا میں فرق ہوسکتا تھا۔ میں نے اسے بعض سوالات پر ہم دونوں کے درمیان نقطہ نظر کا اختلاف بھی یاد دلایا اور یہ بھی اسے بتایا کہ نقطہ نظر کے اسی اختلاف پر ایک جرمن عدالت نے مجھے بے ادبی کی سزا بھی دی تھی۔ اس گستاخ یاددہانی نے ایک سنسنی پھیلا دی۔ سرکاری القاب رکھنے والے متعدد حضرات کا منہ کھلا رہ گیا۔ ہوف مان کی طرف دیکھتے ہوئے کہل مان نے پوچھا۔'' آپ جواب دینا پسند کریں گے؟'' اس پر ہوف مان غرایا۔'' نہیں بس یہی کافی ہے۔''

سوویٹ وفد کے چیئر مین ہونے کی حیثیت سے میں نے اس آشنائی اور جان پہچان کو فوری طور پر ختم کرنے کا فیصلہ کیا جو مذاکرات کے ابتدائی دور میں غیر محسوس طریقے سے ہمارے درمیان پیدا ہو رہی تھی۔ میں نے اپنے فوجی نمائندوں کی وساطت سے بات دھیان میں رکھ لی گئی۔ پھر میں نے اس بہانے الگ کھانے کا مطالبہ کر دیا کہ ہم نے آپس میں گفت وشنید کرنی ہوتی تھی۔ یہ مطالبہ بھی خاموشی سے قبول کر لیا گیا۔ 7 جنوری کو زونن نے اپنی ڈائری میں لکھا'' ٹراٹسکی کی قیادت میں تمام روسی کھانے کے وقت سے پہلے آ گئے۔ انھوں نے کہا کہ اگر وہ دوسرے وفود کے ساتھ مل کر کھانا نہ کھا سکیں تو ان کی طرف سے معذرت قبول کر لی جائے۔ وہ عموماً نظر سے پرے رہتے۔ محسوس ہو رہا تھا جیسے پہلے کے مقابلے میں اب کوئی مختلف ہوا چل پڑی تھی۔'' پھر معمولی سی جان پہچان سرکاری تکلف میں بدل گئی۔ ایسا کرنا بہت ضروری تھا کیونکہ ہم نے ابتدائی تکلفات کے بعد امن معاہدے کے سنجیدہ سوال کو زیر بحث لانا تھا۔

کہل مان سفارت کاری میں رونن سے بہت آگے تھا۔ زرنن ہی کیا باقی تمام سفارت کاروں سے بھی آگے تھا جنہیں مابعد جنگ کے زمانے میں ملا تھا۔ ایک باکردار آدمی کی حیثیت سے اس نے مجھے

متاثر کیا تھا۔اس کا ذہن باعمل اور اوسط درجے سے اوپر تھا۔اس میں ایک تعصب بھی تھا یہاں ہم اس کے ہم پلہ تھے مگر اتحادیوں سے وہ بازی لے گیا تھا۔مقبوضہ علاقوں کے سوال پر بحث کے دوران میں کہل مان نے خود کو پوری طرح پھیلاتے اور اپنی آواز بلند کرتے ہوئے کہا۔''خدا کا شکر ہے کہ کسی بھی جرمن علاقے پر کسی غیر ملکی فوج کا تسلط نہیں ہے۔''اس پر زرنن کا چہرہ زرد پڑ گیا اور ہاتھوں کی انگلیاں سکڑ گئیں۔کہل مان دانستہ طور پر اس پر چڑھائی کر رہا تھا۔اس کے تعلقات ایک اچھی دوستی سے بہت دور تھے۔جب بعد میں ایران کا سوال اٹھا جو دونوں طرفوں سے غیر ملکی فوجوں کا تسلط میں تھا' تو مس نے کہا کہ چونکہ آسٹرو ہنگری کے برعکس ایران کسی کا اتحادی ملک نہیں تھا تو کسی کو اس وجہ سے یہ خوشی زیب نہیں دیتی کہ ہمارا علاقہ نہیں بلکہ ایران کا علاقہ دشمن کے قبضے میں تھا۔اس پر زرنن اچھل پڑا اور اس کے منہ سے ایک دم نکل گیا۔''یہ تو کبھی سنا ہی نہیں تھا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ دیکھ تو میری طرف رہا تھا مگر اس کا اشارہ کہل مان کی طرف تھا۔اس قسم کے واقعات ہوتے رہتے تھے۔

شطرنج کا ایک اچھا کھلاڑی جب ایک عرصے تک کمزور کھلاڑیوں سے کھیلتا رہے تو وہ اپنی مہارت کھو دیتا ہے۔یہی حال کہل مان کا تھا اس کا آسٹرو۔ہنگری ترکی' بلغارین اور غیر جانب دار سفارت کاروں سے سابقہ پڑ تا رہا تھا۔اس نے اپنے انقلابی حریفوں کا غلط اندازہ کیا اور بڑ کاہلی سے چال چلتا رہا۔مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی کہ اس کے طریقے بڑے دقیانوسی تھے اور وہ اپنے مقابل کی نفسیات سمجھنے کی اہلیت سے بیگانہ تھا۔

سفارت کاروں سے پہلی ملاقات کے بعد میں خاصا ناخوش ہو گیا اور طیش میں آ گیا۔جب میں ہال میں اپنا کوٹ لٹکا رہا تھا تو میرا سامنا کہل مان سے ہو گیا۔اس سے پہلے میں اسے شکل سے نہیں جانتا تھا اس نے اپنا تعارف کرایا اور کہا کہ میرے آنے سے اسے بڑی خوشی ہوئی تھی۔اس کا خیال تھا کہ ماتحتوں سے بات کرنے کے بجائے مالک سے بات کرنا بہتر ہوتا ہے۔وہ اپنی اس ''عمدہ چال'' پر بڑا خوش تھا جو ایک نئے سفارت کار کو متاثر کرنے کی خاطر بڑے نپے تلے انداز میں چلی گئی تھی۔مجھے بالکل یوں محسوس ہوا جیسے کسی ناصاف چیز پر میرا پاؤں پڑ گیا تھا۔میں نے لاشعوری طور پر جوابی حملہ کر دیا۔کہل مان کو اپنی غلط حرکت کا احساس ہو گیا۔اس نے خود کو سمیٹا اور تکلف سے بات کرنے لگا۔لیکن وہ اپنی عادت سے مجبور تھا۔میری موجودگی ہی میں وہ ترکی کے سفارت کار سے دوبارہ اپنے پرانے طرز گفتگو پر اتر آیا۔

اپنے ہم پیشہ کا مجھ سے تعارف کراتے وقت کہل مان نے انتظار کیا کہ ترکی سفارت کار ذرا پرے ہٹ جائے۔ پھر اس نے اس کے متعلق ''یورپ کا بہترین سفارت کار'' کے لفظ یوں کہے کہ وہ فاصلے کے باوجود انہیں سن سکے۔ جب میں نے کہل مان کی یہ حرکت جوفے کو بتائی تو اس نے قہقہہ لگا کر جواب دیا۔ ''اس نیہ پہلی ملاقات میں میرے بارے میں بھی بالکل یہی کہا تھا۔'' یوں لگتا تھا جب کہل مان ''بہترین سفارت کار'' کا خطاب ہر کسی کو دینے پر تلا بیٹھا تھا۔ شاید وہ ایک پنتھ دو کاج کر رہا تھا اور یہ سب کچھ زرنن کو سنانے کیلئے تھا۔ 28 دسمبر کو کہل مان نے زرنن سے کہا۔ ''جرمن کا بادشاہ جرمنی کا ذہین ترین آدمی ہے۔'' مجھے یہ زرنن نے بتایا تھا مگر یہ بات کسی طریقے سے بادشاہ تک پہنچانے کیلئے کہی گئی تھی۔ تعریفوں کو ان کی منزلوں تک پہنچانے کیلئے سفارت کار بلاشبہ ایک دوسرے کی مدد کرتے رہتے ہیں۔

میں اس سماجی حلقے سے پہلی دفعہ متعارف ہوا تھا۔ میں پہلے بھی اس کے بارے میں کسی قسم کے فریب میں مبتلا نہیں تھا۔ مجھے زبردست شبہ رہتا تھا کہ ''دیوتا اپنے برتن نہیں جلاتے'' مس اعتراف کرتا ہوں کہ میرا ان لوگوں کے متعلق کچھ زیادہ ہی اچھا خیال تھا۔ انہیں مل کر میرا تاثر کچھ اس قسم کا تھا: لوگ دوسروں کے متعلق تو کسی قسم کی سوچ رکھتے ہیں مگر اپنے بارے میں بھی کوئی اچھا خیال نہیں رکھتے۔

اس سلسلے میں مندرجہ ذیل واقعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ وکٹر ایڈلر ان دنوں ہر ممکن طریقے سے مجھ سے ہمدردی جتانے میں لگا ہوا تھا۔ اس کی ترغیب پر کاونٹ زرنن نے مجھ سے کہا کہ جنگ کے آغاز میں میری جو لائبریری وی آنا میں رہ گئی تھی وہ اسے ماسکو بھجوانے پر تیار تھا۔ لائبریری کی میرے نزدیک بڑی اہمیت تھی کیونکہ جلاوطنی کے طویل عرصے میں میں نے اس میں روسی انقلاب کے متعلق بہت سی کتابیں جمع کر رکھی تھیں۔ مجھے شکریہ ادا کرنے کا موقع دینے سے پہلے ہی آسٹروی سفیر نے ان دو قیدیوں کی بات چھیڑ دی جن سے جیل میں برا سلوک کیا جا رہا تھا۔ یہ براہ راست سودہ بازی مجھے کچھ اچھی نہ لگی۔ میں نے جواب دیا کہ اگر کاونٹ کی اطلاع درست تھی تو میں اس کی شکایت دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا لیکن اس کا لائبریری کے معاملے سے کوئی تعلق نہ ہونا چاہیے۔ کاونٹ زرنن نے اپنی یادداشتوں میں اس واقعہ کا بالکل درست انداز میں بیان کرتے ہوئے لکھا کہ اس نے واقعی قیدیوں کے معاملے کو لائبریری کے معاملے سے جوڑنے کی کوشش کی تھی۔ اسے اس میں کوئی عیب نظر نہیں آیا تھا۔ وہ اس قصے کو اس مبہم جملے پر

ختم کرتا ہے۔'' آخر اسے لائبریری کی ضرورت تھی۔'' یہاں میں فقط یہ اضافہ کرنا چاہوں گا کہ لائبریری جب ماسکو پہنچی تو میں نے اسے ایک خیراتی ادارت کو دے دیا۔

قسمت کی ستم ظریفی تھی کہ انسانیت کی سب سے بڑی انقلابی حکومت کو انسانیت کی سب سے بڑی رجعت پسند حکومت سے ایک ہی میز پر بیٹھنا پڑ رہا تھا۔ ہمارے حریف بالشویکوں کی دھماکہ خیز طاقت سے اس قدر خوفزدہ تھے کہ مذاکرات کو کسی غیر جانب دار ملک میں منتقل کرنے کے بجائے منقطع کر دینے پر تیار تھے۔ زرنن نے اپنی یاداشتوں میں صاف طور پر لکھا ہے کہ کسی غیر جانب دار ملک میں مذاکرات لے جانے سے بالشویکوں نے اپنے بین الاقوامی دولتوں کی مدد سے ان کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لینی تھی۔ سرکاری طور پر اس نے یہ بہانہ تراشا کہ غیر جانب دار ملک میں فرانس اور برطانیہ نے سازشیں شروع کر دینی تھیں'' کھلم کھلا اور پس پردہ'' میں نے جواب دیا کہ ہم ایسی حرکتوں کے قائل نہیں ہیں روسی لوگوں نے سفارت کاری کے پرانے ہتھیاروں کو ختم کر دیا ہے۔ لیکن ہمیں ایک الٹی میٹم کے سامنے جھکنا پڑ جانا تھا۔ لہذا ہم نے برسٹ-لٹووسک ہی میں رہنے کو بہتر جانا۔

پرانے قصبے سے پرے چند عمارتیں جن پر جرمنوں کا قبضہ تھا' برسٹ-لٹووسک کا ان کے علاوہ صحیح معنوں میں کہیں کوئی وجود نہیں تھا۔ زار کی فوجوں نے پسپائی کے وقت قصبے کو جلا کر راکھ کر دیا تھا۔ ہوف مان نے اپنے سٹاف کیلئے یہ اس لیے منتخب کی ہوگی کہ وہ یہاں سے ارکان کو اپنی گرفت میں رکھ سکتا تھا۔ کھانا بے حد سادہ ہوتا اور جرمن سپاہی انہیں میزوں پر لگاتے تھے۔ ان کیلئے ہم امن کے پیامبر تھے۔ وہ ہماری طرف امید بھری نظروں سے دیکھتے رہتے۔ عمارتوں کے گرد اونچی خاردار باڑ لگاری گئی تھی۔ صبح کی سیر کے وقت مجھے اس قسم کے نوٹس پڑھنے کو ملتے: ''یہاں کوئی روسی دکھائی دیا تو اسے گولی ماردی جائے گی۔'' یہ قیدیوں کے متعلق تھا۔ میں ڈرتا تھا کہ کہیں اس کا اطلاق ہم پر بھی نہ ہو جائے۔ کیونکہ ہم بھی اس جگہ پر نیم قیدی تھے۔ برسٹ-لٹووسک کے بیچوں بیچ عسکری اہمیت کی ایک بڑی عمدہ سڑک تھی۔ اپنے قیام کے ابتدائی دنوں میں ہم گاڑیوں میں بیٹھ کر اس سڑک پر سیر کو نکل جاتے۔ نتیجہ ایک دن ہمارے وفد کے ایک رکن سے ایک جرمن سارجنٹ کا جھگڑا ہو گیا۔ ہوف مان نے شکایت نامہ بھیج دیا۔ میں نے جواب دیا کہ ہماری تحویل میں جو کاریں دی گئی ہیں ہم ان کے استعمال سے معذرت خواہ ہیں۔ مذاکرات گھٹتے رہے۔ ہر فریق کو اپنی حکومت کو ہر روز کی رپورٹ تار کے ذریعے بھیجنی ہوتی۔ مگر تار گھر اکثر کام نہ کرتا

وہ واقعی خراب تھا یا اسے مذاکرات کو طول دینے اور وقت حاصل کرنے کیلئے خراب کیا گیا تھا' اس بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ بہر حال میٹنگوں کے درمیان وقفے بکثرت تھے اور کئی کئی دن جاری رہتے۔ ان میں سے ایک وقفے کے دوران میں میں واسا بھی ہو آیا ان دنوں یہ شہر جرمن تلواروں کی چھاؤں میں رہ رہا تھا۔ شہریوں کو روسی سفارت کاروں میں بڑی دلچسپی تھی' مگر وہ اس کا اظہار کرنے سے معزور تھے۔ اس ڈر سے کہ نہ جانے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔

مذاکرات میں تاخیر ہمارے مفاد میں تھی۔ برسٹ-لٹووسک جانے کا میرا مقصد بھی یہی تھا۔ لیکن میں اس پر شاباش لینے کو تیار نہیں ہوں۔ میری ساتھیوں نے ممکن حد تک میری مدد کی۔ زرنن اپنی ڈائری میں ادا لہجے میں لکھتا ہے۔ ''یہاں وقت کی بہتان ہے۔ اب ترک نہیں مان رہے' اب بلغاری اڑے ہوئے ہیں۔ کبھی روسیوں کو منانا پڑتا ہے۔ اجلاس ملتوی کیے جا رہے ہیں' یا شروع ہوتے ہی ختم کر دیے جاتے ہیں۔'' پھر آسٹروی وفد مذاکرات میں تاخیر پیدا کرنے لگا کیونکہ یوکرانی وفد سے اس کو کوئی مشکل پیش آ رہی تھی۔ لیکن کہل مان اور زرنن مذاکرات میں تاخیر کی ذمہ داری روسی وفد پر ڈال رہے تھے۔ میں مسلسل احتجاج کر رہا تھا' مگر بے سود۔

مذاکرات جب اپنے اختتام کی طرف جا رہے تھے تو اس وقت بھی جرمن پریس بالشویکوں کو لتاڑے جا رہا تھا۔ ایک جرمن اخبار نے لکھا کہ ''ٹراٹسکی نے برسٹ-لٹووسک میں اپنے لیے ایک ایسا پلیٹ فارم بنا لیا جہاں سے اس کی آواز ساری دنیا کو سنائی دے رہی تھی۔'' لہٰذا اس نے مذاکرات فوری طور پر ختم کر دینے کا مطالبہ کر دیا۔ اس نے یہ بھی لکھا: ''لینن اور ٹراٹسکی دونوں امن کے خواہاں نہیں ہیں۔ شاید وہ پھانسی یا قید کے خواہش مند ہیں۔'' سوشل ڈیموکریٹک پریس کا لہجہ بھی کچھ اسی قسم کا تھا۔ جرمنی کے اندر ہماری انقلاب کی خواہش کو ہمارا سب سے بڑا جرم سمجھا جا رہا تھا۔

میں نے جرمن اخبارات کا ایک مدت سے مطالعہ بند کر رکھا تھا۔ لیکن برست-لٹووسک آ خر میں انہیں دوبارہ دلچسپی سے پڑھنے لگا۔ ان میں امن مذاکرات کے ساتھ پراپیگنڈے جیسا سلوک کیا جا رہا تھا۔ میں نے سارا وقت اخبار پڑھنے کے بجائے آرام کے اس قوت سے پورا فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ میں جانتا تھا کہ مستقبل قریب میں مجھے اس کا پھر موقع نہیں ملے گا۔ ہمارے ساتھ ایسے اچھے سٹینوگرافر آئے تھے جو کبھی ریاستی ڈوما کے سٹاف پر ہوتے تھے۔ میں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی

یاداشت کے ذریعے انہیں اکتوبر انقلاب کا خاکہ لکھنا شروع کر دیا۔اس طرح ایک کتاب بن گئی جو غیر ملکی محنت کشوں کیلئے بڑی مفید ثابت ہوسکتی تھی۔انہیں یہ بتانے کی سخت ضرورت تھی کہ آخرہوا کیا تھا۔لینن اور میں اس ضرورت کو متعدد بار زیر بحث لا چکے تھے' مگر دونوں کے پاس اسے ضابطہ تحریر میں لانے کا وقت نہیں تھا۔ یہ بات میرے وہم وگمان میں نہیں تھی۔کہ برسٹ-لٹووسک میرے ادبی کام کی جگہ بن جائے گا۔جب میں روسی انقلاب پر ایک مکمل مسودہ لے کر واپس آیا تو لینن بہت خوش ہوا۔اس میں ہمیں سخت جان امن کی جھلکیاں بھی دکھائی دیتی تھیں۔جلد ہی کتاب کے درجن سے زیادہ یورپی اور ایشیائی زبانوں مں ترجمے ہوگئے۔

کمیونسٹ انٹرنیشنل میں شامل تمام پارٹیوں نے روسیوں کی تقلید میں کتاب کے ان گنت ایڈیشن شائع کر دیے۔مگر 1923ء کے باوجود متعصب اور رجعت پسندوں نے اس کتاب کو ٹراٹسکی ازم کا ایک زہریلا ہتھیار قرار دے دیا۔آج کل یہ سٹالن کی بلیک لسٹ پر ہے۔اس چھوٹے سے واقعے میں انقلاب دشمنوں کی نظریاتی تیاری اپنا اظہار پا رہی ہے۔ان کی کامیابی اسی بات میں تھی کہ اکتوبر انقلاب کی نال کو کاٹ دیا جائے۔

برسٹ-لٹووسک میں ہمارے مخالف سفارت کار بھی فالتو وقت کو اپنے طور پر گزارنے کر طریقے تلاش کرنے لگے۔کاؤنٹ زرنن کی ڈائری کے مطابق وہ شکار کھیلنے ہی نہ جاتا بلکہ انقلاب فرانس کے متعلق متعدد یاداشتیں پڑھ کر اپنے علم میں اضافہ کرتا رہتا۔وہ بالشویکوں کا جیکو بینز سے موازنہ کرکے خود کو تسلی دیتا رہتا۔سفارت کار ہاپس برگ لکھتا ہے۔''شارلٹ کارڈے کہتا ہے کہ اس نے ایک جنگلی جانور کا مارا تھا' ایک آدمی کو نہیں۔یہ بالشویک جلد غائب ہو جائیں گے۔کیا کہا جا سکتا ہے؟ کیا خبر پھر کسی ٹراٹسکی کیلئے کوئی کارڈے پیدا ہو جائے۔''ان دنوں میں اس نیک دل اور پاکباز کاونٹ کے خیالات سے واقف نہیں تھا۔لیکن ان میں جو''خلوص'' تھا اس پر مجھے یقین تھا۔

جب جرمن سفارت کاروں نے 25 دسمبر کو اپنا جمہوری فارمولا پیش کیا تو پتا نہیں چل رہا تھا کہ ان کا مقصد کیا تھا۔لیکن چند دنوں بعد ان کی بھیڑیے جیسی بھوک سامنے آ گئی۔قومیتوں کے حق خود ارادیت پر نظریاتی بحث کی اجازت دینا جرمنوں کیلئے ایک خطرہ تھا۔لیکن کہل مان اس سلسلے میں پہل کر چکا تھا۔ہوہن زولرن کے سفارت کاروں کو معلوم ہو چکا تھا کہ اس سمت میں وہ کوئی بڑی فتح حاصل نہیں کر سکیں

گے۔ مثال کے طور پر کہل مان یہ ظاہر کرنے کو بے تاب تھا کہ پولینڈ' لتھونیا' بالٹک صوبہ جات اور فن لینڈ پر جرمنوں کا قبضہ ان میں سے ہر ملک کیلئے حق خود ارادیت کی ایک شکل بن جاتی تھی اور اس شکل کو جرمن فاتح ان ممالک میں اپنے اخبارات کے ذریعے ہوا دے رہے تھے۔ لیکن یہ کوئی ایسا آسان کام نہیں تھا۔ کہل مان ہار ماننے والا نہیں تھا۔ وہ مجھ سے تواتر سے پوچھے جا رہا تھا کہ کیا نظام حیدر آباد اپنے عوام کی مرضی کی علامت نہیں تھا۔ میں نے جواب دیا کہ انگریزی فوج ہندوستان سے نکل جائے تو نظام حیدر آباد چوبیس گھنٹوں میں اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں رہ سکے گا۔ کہل مان نے بدتمیزی سے اپنے شانے اچکائے۔ جنرل ہوف مان دانت نکالنے لگا۔ ترجمان ترجمہ کرتا گیا' سٹینو گرافر اپنے نوٹس بناتا رہا۔ پھر بحث غیر معینہ عرصے کیلئے ملتوی ہو گئی۔

جرمن سفارت کاروں کے اس طرز سلوک کے عقب میں یہ راز تھا کہ شاید ہم کہل مان کی بچھائی ہوئی بساط کے مطابق کھیلنا شروع کر دیں گے۔ ممکن ہے اس کا استدلال کچھ اس قسم کا ہو: ''بالشویکوں نے امن کا پرچار کر کے اقتدار حاصل کیا' وہ امن قائم کر کے ہی اقتدار پر قابض رہ سکتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ انہوں نے جمہوری شرائط پر امن قائم رکھنا ہے۔ لیکن آخر سفارت کاری کے روپ میں کہل مان' بالشویکوں کو انقلابی فارمولا ایک مناسب سفارت کاری کے روپ میں پیش کر دوں تو کیا وہ مجھے کسی دوسرے بہانے اپنے صوبوں اور عوام پر قابض ہونے کا موقع دے سکتے تھے؟ اس صورت میں دنیا کی آنکھ میں جرمن توسیع پسندی روسی انقلاب کی منظوری حاصل کرے گی۔ جہاں تک بالشویکوں کا تعلق ہے' انہیں ان کا امن مل جائے گا۔ اس قسم کی امیدیں پالنے میں بلاشبہ کہل مان کو ہمارے آزاد خیال منشویکوں اور پاپولسٹوں نے دھوکہ دیا تھا جو برسٹ-لٹووسک مذاکرات میں پہلے سے متعین شدہ مزاحیہ کردار ادا کر رہے تھے۔

برسٹ-لٹووسک میں ہم نے اپنے مخالف ساتھیوں کو کسی ڈھکے چھپے طور طریقوں سے نہیں بلکہ واضح طور پر بتا دیا کہ ہم کسی چور راستے سے کوئی بھی سودا کرنے کو تیار نہیں تھے۔ اس پر کہل مان نے کچھ اس قسم کے ردعمل کا اظہار کیا جیسے ہم اس کے تصور میں موجود کسی معاہدے کی خلاف ورزی کر بیٹھے تھے۔ وہ 25 دسمبر کے جمہوری اصولوں پر شدت سے اصرار کرنے لگا۔ اجتہاد کی اچھی خاصی صلاحیت رکھنے پر اسے یہ ثابت کر دینے پر یقین تھا کہ گورے بھی کالوں جیسے ہوتے ہیں۔ کاؤنٹ زرنن اپنے طریقے سے کہل مان کا بغل بچہ بنا ہوا تھا اور اس کی ہدایات پر نازک وقت پر کوئی نہ کوئی احمقانہ بیان دے دیتا۔ اسے امید تھی کہ

اس طریقے سے وہ اپنی کمزوری چھپالے گا۔ دوسری طرف جنرل ہوف مان مذاکرات میں ایک تازہ عنصر لے آیا۔ سفارت کاری کی نزاکتوں کوایک طرف رکھتے ہوئے وہ اکثر اپنے فوجی بوٹ مذاکرات کی میز پر رکھ دیتا۔ جہاں تک ہمارا تعلق تھا ہم ایک لمحے کیلئے بھی کبھی نہ بھولے کہ ہون مان کے بوٹ ہی اصل حقیقت تھے جیسے سنجیدگی سے لینا چاہیے تھا۔

بعض ایسے لمحے بھی ہوتے جب جرنیل بحث کے اندر خاص سیاسی چیزیں ڈال دیتا اور وہ بھی اپنے خاص انداز میں۔ جب لوگوں کے حق خود ارادیت پر چلنے والی گھسی پٹی بحث پر اس کا صبر جواب دے گیا تو وہ ایک دن غالباً 14 جنوری کو اپنے بریف کیس میں روسی اخبارات بھر کر لے آیا۔ ان میں زیادہ تر سوشلسٹ انقلابی پارٹیوں کے اخبار تھے۔ ہوف مان روسی زبان آسانی سے پڑھ سکتا تھا۔ جرنیل بے ربط جملوں میں یوں بولنے لگا۔ جیسے کسی کو حکم دے رہا تھا۔ وہ ہمیں گھور بھی رہا تھا۔ اس نے الزام لگایا کہ بالشویک عوام کو بولنے اور اجتماع کی شکل میں اکٹھے ہونے کے حق سے محروم کرکے جمہوری اصولوں کی خلاف ورزی کے مرتکب ہو رہے تھے۔ پھر وہ ایک روسی دہشت پسند پارٹی کے مضامین کے حوالے دینے لگا۔ یہ پارٹی 1902ء سے جرنیل کی طرز فکر کے لوگ پیدا کر رہی تھی۔ اس کے منہ سے یہ جملے بڑے ''شاندار'' لگ رہے تھے۔ زرنن کی ڈائری اس سلسلے میں یہ کہتی ہے۔ ''ہوف مان کی تقریر بڑی فضول تھی۔ وہ کئی دنوں سے اس کی تیاری میں لگا ہوا تھا اور پنی کامیابی پر بڑا خوش تھا۔''

میں نے ہوف مان کے جواب میں کہا کہ ہر طبقاتی معاشرے میں حکومت طاقت کے زور پر ہی قائم رہتی ہے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ جنرل ہوف مان بڑی بڑی جائیدادوں کے مالکوں کو تشدد کے ذریعے تحفظ مہیا کرتا تھا جب کہ ہم ایسا محنت کشوں کے دفاع میں کرتے ہیں۔ تھوڑی دیر کیلئے یوں لگا جیسے امن کانفرنس مبتدیوں کیلئے مارکسزم کے پراپیگنڈہ کی کلاس بن گئی تھی۔ میں کہنے لگا۔ ''جو بات دوسری حکومتوں کو حیران کرتی اور ہم سے پرے رکھتی ہے' وہ یہ ہے کہ ہم ہڑتالیوں کے بجائے سرمایہ داروں کو گرفتار کرتے ہیں جو محنت کشوں کو جیل میں ڈالتے ہیں۔ ہم ان کسانوں پر گولی نہیں چلاتے جو زمین مانگتے ہیں بلکہ ان جاگیرداروں اور افسروں کو گولی مارتے ہیں جو کسانوں پر گولی چلاتے ہیں۔'' ہوف مان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

اس قسم کے ہر موقع پر کہل مان بڑی مکار عاجزی سے جرنیل سے پوچھا کرتا کہ وہ کچھ کہنا تو نہیں

چاہتا تھا۔ جرنیل جلدی سے جواب دیتا ''نہیں' کہو نہیں۔'' وہ غصے کی حالت میں کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتا۔ ہوہن زولرن' ہاپس برگ' سلطانوں' جرنیلوں' ایڈمرلوں اور سفارت کاروں کی موجودگی میں انقلابی طاقت کے استعمال کی اس بحث میں ایک قسم کی تندی ہوتی تھی۔ ایسے موقعوں پر وہ خطاب یافتہ حضرات بے بسی میں چپ رہتے۔ وہ گھبراہٹ کی حالت میں کبھی مجھے اور کبھی کہل مان اور زرنن کو دیکھنے لگتے۔ وہ چاہتے کہ کوئی انہیں بتائے کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا تھا۔ کہل مان پس پردہ انہیں یقین دلاتا رہتا تھا کہ ہماری زندگی کے دن گنے چنے تھے اور یہ مختلف وقت ''جرمن امن'' معاہدے کیلئے استعمال کرنے کی ضرورت تھی تاکہ بالشویکوں کے جانشین بعد میں نتائج کی ذمہ داری قبول کرسکیں۔

بحثوں میں اصول کے معاملے میں میری حیثیت کہل مان سے اسی طرح بہتر تھی جیسے ہوف مان فوجی معاملات میں مجھ سے بہتر حیثیت رکھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جرنیل بڑی بے صبری سے تمام سوالوں کو فوجوں کے تناسب پر لاکر ختم کرنا چاہتا تھا جب کہ کہل مان کی خواہش تھی کہ جنگی نقشے کے مطابق امن قائم ہو جائے جیسے یہ نقشہ کسی اصول کے تحت بنایا گیا تھا۔ ایک موقع پر ہوف مان کی تقریر کے تاثر کو زائل کرنے کی خاطر کہل مان نے کہا کہ ایک فوجی ایک سفارت کار جیسی تقریر کیسے کرسکتا ہے۔ میں نے جواب دیا۔ ''روسی وفد کے موجودہ ارکان کا سفارت کاری سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بلکہ ہمیں انقلاب کے سپاہی سمجھنا چاہیے۔ لہذا ہماری زبان میں کوئی ترشی آ جائے تو اسے نظرانداز کردیا جائے۔''

کہل مان کی سفارت کارانہ شائستگی اپنی جگہ بالکل درست تھی۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ اس کا مسئلہ ہمارے آپریشن کے بغیر حل نہیں ہوسکتا تھا۔ یہی وہ چیز تھی جس کی کمی تھی۔ میں نے کہل مان سے اس کی وضاحت یوں کی۔ ''ہم انقلابی ہیں مگر ہم حقیقت پسند بھی ہیں۔ لہذا ہم توسیع کے مسئلے کو چوری چھپے حل کرنے بجائے کھلے طور پر زیر بحث لانا پسند کریں گے۔'' اس کے بعد کہل مان سفارت کاری کا نقاب اتار کر مجھ پر دانت کٹکٹانے لگتا۔ مجھے اس کے لہجے کا اتار چڑھاؤ اب تک یاد ہے جب وہ کہہ رہا تھا کہ جرمن انتہائی خلوف کے ساتھ اپنے طاقت ور مشرقی ہمسائے کے ساتھ دوستانہ تعلقات بحال کرنے کا خواہش مند تھا۔ لفظ ''طاقت ور'' کچھ ایسے طنزیہ اور اشتعال انگیز انداز میں کہا گیا کہ کہل مان کے اتحادی بھی ایک دوسرے کو آنکھ مارنے لگے۔ مذاکرات کے تعطل کے خوف سے زرنن بے حد پریشان تھا۔ میں نے بھی آستین چڑھا لیا اور انہیں وہ کچھ یاد دلایا جو کچھ میں نے اپنی پہلی تقریر میں کہا تھا۔ وہ کچھ یوں تھا۔ ''ہم اس

حقیقت کی تردید کرنے کی حالت میں نہیں ہیں کہ ہمارا ملک سابق حکمرانوں کی پالیسیوں کی وجہ سے کمزور پڑ چکا ہے۔لیکن کسی ملک کی عالمی حقیقت کا تعین اس کی موجودہ کمزور حالت سے نہیں بلکہ اس میں پوشیدہ صلاحیتوں سے لگایا جاتا ہے' جیسا کہ جرمن کی موجودہ خراب غذائی حالت دیکھ کر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ایک کمزور ملک ہے۔ایک وسیع البنیاد اور دوربین پالیسی کا انحصار ترقی کی صلاحیت پر ہوتا ہے۔یا پھر ان داخلی طاقتوں پر جو جلد یا بدیر منکشف ہو کر اپنی مضبوطی دکھا دیتی ہیں۔''

اس کے نو ماہ سے کم عرصے کے بعد میں نے برسٹ۔لٹووسک میں کہل مانکے چیلنج کو یاد کرتے ہوئے آل یونین مرکزی مجلس عاملہ کے ایک اجلاس میں کہا تھا۔''ہمیں اس بات پر کوئی بغض آمیز خوشی نہیں ہے کہ جرمنی اس وقت ایک زبردست تباہی اور مصیبت سے گزر رہا ہے۔''ان ثبوتوں کا ذخر بے سود ہوگا جو جرمن سفارت کاری' عسکری اور سول انتظامیہ نے یہ تباہی لانے میں برسٹ۔لٹووسک میں مہیا کیے۔

ہمارے سوالوں کی درشتگی دیکھ کر ہوف مان کہل مان پر زیادہ چڑھائی کرنے لگتا۔دونوں سے اپنا غصہ چھپایا نہیں جا رہا تھا' خاص طور پر جرنیل سے۔اس کے ایک حملے کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا تھا کہ جرمن حکومت کے ارادے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ہوف مان نے غصے بھری کھردری آواز میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔''میں یہاں جرمن حکومت کی نہیں' جرمن ہائی کمانڈ کی نمائندگی کر رہا ہوں۔''یوں لگا جیسے کسی نے شیشے پر پتھر مار دیا تھا۔میں نے اپنے مخالفوں کی میز کی طرف دیکھا۔کہل مان کا چہرہ بگڑ گیا تھا۔اس نے سر جھکا لیا تھا۔اور وہ نیچے دیکھ رہا تھا۔زرنن کے چہرے پر گھبراہٹ اور ایک مکار خوشی کے ملے جلے تاثرات تھے۔میں نے جواب میں کہا کہ میں جرمن اور جرمن ہائی کمانڈ کے باہمی تعلقات کو دیکھنے نہیں بلکہ جرمن سفارت سے مذاکرات کرنے آیا تھا۔کہل مان دانت کٹکٹانے لگا۔اسے مجھ سے متفق ہونا پڑا۔

جرمن سفارت کاری اور جرمن ہائی کمانڈ میں جو اختلافات تھے انہیں مبالغہ آرائی کی حد تک بیان کیا جا سکتا ہے۔کہل مان یہ ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا کہ روسی مقبوضہ علاقوں کے لوگ پہلے ہی اپنے خود ارادیت'' کے ذریعے جرمنی کے حق میں فیصلہ دے چکے تھے اور اس کا ثبوت روسی قومی ادارے تھے۔اس کے برعکس ہوف مان کا کہنا تھا کہ جب تک ان علاقوں کے ادارے جرمنی سے الحاق کا اعلان نہیں کرتے' وہاں

سے فوجیں ہٹانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ دونوں دلیلیں ایک دوسرے کی ضد میں تھیں مگر عملی نتیجہ ایک ہی تھا۔

اس سلسلے میں کہل مان نے ایک حکمت عملی استعمال کرنے کی کوشش کی جو پہلی نظر میں نا قابل یقین تھی۔ ہمارے سوالوں کے ایک تحریری جواب میں (وان روزن برگ کی طرف سے) کہا گیا کہ جب یک مغربی محاذ پر جنگ ختم نہیں ہوتی' مقبوضہ علاقوں سے جرمن فوجیں نہیں ہٹائی جاسکتیں۔ میں نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ فوجیں جنگ کے بعد ہٹائی جائیں گی۔ لہذا میں نے صحیح وقت کے تعین کا مطالبہ کر دیا۔ کہل مان برانگیختہ ہوگیا۔ ظاہر ہے اس نے تو اپنے اس تاخیری ارخواب آور فارمولے پر تکیہ کر رکھا تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ لفظوں سے کھیل کر الحاق کو چھپانا چاہتا تھا۔ جب اس کا یہ حربہ نا کام ہوگیا تو اس نے ہوف مان کے ذریعے یہ وضاحت کر دی کہ فوجیں جنگ کے دوران یا جنگ کے بعد بھی نہیں ہٹائی جائیں گی۔

جنوری کے آخر میں کسی امید کے بغیر آسٹری حکومت سے ویانا جانے کی اجازت طلب کی تا کہ آسٹروی پرولتاریہ کے نمائندہوں سے بات چیت کر سکوں۔ میری اس قسم کی آمد پر آسٹروی سوشل ڈیمو کریسی کسی اور سے زیادہ خود بڑی خوف زدہ تھی۔ میری درخواست اس نا قابل یقین وجہ سے رد کر دی گئی کہ میں اس قسم کی بات چیت کا مجاز نہیں تھا۔ اس پر میں نے زرنن کو یہ جواب دیا۔

''جناب وزیر: مجھے آپ کا قونصل خانے کی طرف سے میری اس درخواست کا جواب موصول ہوگیا ہے جو میں نے آسٹروی پرولتاریہ کے نمائندوں سے جمہوری امن قائم کرنے کی غرض سے بات چیت کرنے کیلئے ویزا حاصل کرنے کی خاطر دی تھی۔ اس سے میں یہی نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہوسکتا ہوں کہ روسی حکومت کے محنت کشوں اور کسانوں کے نمائندے آسٹروی پرولتاریہ کے نمائندوں سے کسی قسم کی بات چیت کا مجھے کوئی اختیار حاصل نہیں ہے تو اس بات کا تعین کا حق فقط میری حکومت کو حاصل ہے۔''

مذاکرات کے آخری مرحلوم میں کہل مان اور زسرنن نے کیف راڈ* کو ترپ کے پتے کے طور پر استعمال کرنے کی کوشش کی۔ جو ماسکو حکومت کے خلاف تھی۔

---

* فروری انقلاب کے بعد یہ یوکرائن میں مختلف عوامی تنظیموں کی ایک اسمبلی تھی۔ جو خود کو یوکرانی عوام کی ترجمان کہتی تھی۔ بالشویکوں نے اقتدار میں آکر اسے توڑ دیا تھا۔ رادا نے جرمن تسلط کی حمایت کی

تھی۔ بعد میں جرمنوں نے بھی اس کی حکومت کو تحلیل کر کے ہوف مان سکوروپڈسکی کو حکمران بنا دیا تھا۔(مترجم)

اس کے راہنما یوکرانی امیروں کا ایک ٹولہ تھا۔ برسٹ-لٹووسک مذاکرات میں اس کے وفد کو جرمن سفارت کار ناک سے پکڑ کر جدھر چاہتے لے جاتے کہل مان اور زرنن اس قابل نفرت کام میں آگے آگے تھے۔ رادا کے جمہوری سربراہ یہ سمجھتے تھے جیسے وہ ہوا پر چل رہے تھے۔ جب یوکرانی وفد کا سربراہ گولووچ تقریر کر کے اپنی کرسی پر آ کر بیٹھا تو یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنی اندر کی خوشی سے پھٹ جائے گا۔

انجام کار زرنن یوکرانی وفد کو سوویٹ وفد کے خلاف کھلم کھلا بیان دلوانے کی اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا۔اس کا ذکر اس نے اپنی ڈائری میں بھی کیا ہے۔اس کا مقرر ہم پر الزامات کی بوچھاڑ کرتا رہا حتیٰ کہ اس کا جرمن ترجمان بھی پریشان ہو گیا۔اس منظر کو بیان کرتے وقت ہاپس برگ نے میری گھبراہٹ' پیلے پن' پیچ وتاب اور پسینے کے قطروں کا ذکر کیا ہے جو یوکرانی مقرر کی تقریر کے دوران میں میری پیشانی پر آ رہے تھے۔ مبالغہ آرائی ایک طرف یہ منظر ہی بڑا کریہہ تھا۔ زرنن کے کہنے کے برعکس' کریہہ اس لحاظ سے نہیں تھا کہ ایک ہمارے ہی ملک کا آدمی غیر ملکیوں کی موجودگی میں ہمارے بےعزتی کر رہا تھا' بلکہ شرم ناک بات یہ تھی کہ فروری انقلاب میں اقتدار کیسے لوگوں کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔اس کی زبان سے کمینگی کا ایک فوارہ پھوٹ رہا تھا۔ یہ لوگ خود کو جمہوریت پسند کہلوانا پسند کرتے تھے۔کہل مان' زرنن' ہوف مان اور دوسرے تقریر کے دوران میں یوں لمبے سانس رہے تھے جیسے انہوں نے ریس کے کسی گھوڑے پر بہت بڑی بازی لگا رکھی تھی۔ یوکرانی مقرر اپنے ہر جملے کے بعد اپنے سرستوں کی طرف داد حاصل کرنے والی نگاہوں سے دیکھتا۔اس کی تقریر یوکرانی وفد نے اڑتالیس گھنٹوں کی محنت کے بعد تیار کی تھی۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ اس سے زیادہ مکروہ منظر میں نے اپنی زندگی میں اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔حقارت اور حسد آمیز خوشی سے بھری ہوئی وہ ساری نگاہیں جو اس وقت میری طرف اٹھ رہی تھیں' ان کے باوجود مجھے اس میں ذرا بھر شک نہیں تھا کہ یہ ضرورت سے زیادہ ولولے سی بھرے ہوئے احمق ایک دن اپنے ہی فتح مند مالکوں کے ہاتھوں سے باہر پھینک دیے جائیں گے۔مگر اس کے ساتھ ہی ان کے مالک بھی اپنی صدیوں پرانی جگہیں کھو دیں گے۔

اس وقت انقلابی سوویٹ دستے یوکرائن میں فتح مندی سے آگے بڑھ رہے تھے اور دنی پور پہنچنے

والے تھے۔ پھر یوں ہوا کہ جس دن یوکرائی وفد کہل مان اور زرنن سے یوکرائن کا سودا کر رہے تھے اسی دن سوویٹ فوجوں نے کیف پر قبضہ کرلیا۔ جب راڈک نے صورتحال معلوم کرنے کی خاطر دارالحکومت تار بھیجا تو ٹیلی گراف آپیریٹر نے اس پہچاننے میں غلطی کرتے ہوئے کہا۔''کیف مر چکا ہے۔''7 فروری کو میں نے مرکزی طاقتوں کے راہنماؤں کی توجہ لینن کے اس تار کی طرف دلائی جس میں اس نے اطلاع دی تھی کہ کیف پر 29 جنوری کو سوویٹ افواج کا قبضہ ہو چکا تھا۔اور یہ کہ رادا کی حکومت کو ہر کسی نے چھوڑ دیا تھا اور وہ روپوش ہو گئی تھی۔ یہ بھی کہ یوکرائی حکومت نے روس سے وفاقی تعلق قائم کر کے داخلی اور خارجی امور میں مکمل ہم آہنگی پیدا کر لی تھی۔اگلے اجلاس میں میں نے کہل مان اور زرنن کو اطلاع دی کہ وہ ایک ایسی حکومت کے وفد سے بات کر رہے تھے جس کا علاقہ فقط برسٹ-لٹووسک رہ گیا تھا (معاہدے کے مطابق یہ قصبہ یوکرائن میں شامل ہو جانا تھا) لیکن اس وقت تک جرمن حکومت بلکہ جرمن ہائی کمانڈ نے جرمن فوجوں کی مدد سے یوکرائن پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔مرکزی طاقتوں کی سفارت کاری ان کے داخلے کیلئے فقط پاسپورٹ حاصل کرنے میں لگی ہوئی تھی۔لنڈن ڈورف بڑے شاندار طریقے سے ہوہن زولرن فوج کیلئے ایک اذیت کا اہتمام کرنے میں مصروف تھا۔

انہی دنوں جرمنی کی کسی جیل میں ایک ایسا شخص قید تھا جسے سوشل ڈیموکریسی کے سیاست دان خیالی جنت کا تصور رکھنے پر لعن طعن کر رہے تھے۔ریاستی ججوں نے بھی اسے غداری کا مرتکب قرار دے دیا تھا۔ اس قیدی کا نام کارل بخ منسٹ تھا اس نے اپنی کتاب ++++++++++++ میں لکھا تھا۔ ''برسٹ-لٹووسک مذاکرات بے ثمر نہیں ہیں' خواہ جبری امن ہی کیوں نہ نافذ کیا گیا ہو۔ یہ روسی وفد کا کمال ہے کہ برسٹ-لٹووسک ایک ایسا انقلابی ٹریبونل بن گیا ہے جس کے فیصلوں کا دائرہ بڑا وسیع ہے۔ اس نے مرکزی طاقتوں کو ننگا کر دیا ہے۔اس نے جرمن ہوس' مکاری پر مبنی جھوٹ اور چالاکی کو بے نقاب کر دیا ہے۔اس نے جرمنوں کی امن پالیسی پا تباہ کن فیصلہ سنا دیا ہے۔ یہ پالیسی ایک پاکیزہ عیاری کی نسبت کلبی زیادہ ہے۔ یہ متعدد ممالک میں عوامی تحریکوں کا سبب بنے گی۔اس نے انقلاب میں جو مداخلت کی ہے وہ اس کا آخری الم ناک فعل ہے۔اس نے سوشل ڈیموکریسی کے ریشے ریشے دھڑکتا ہوا سوشلزم بھر دیا۔ یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ برسٹ-لٹووسک جانے والے ان بیجوں سے کس قسم کی فصل کاٹیں گے۔ مگر اتنا ضرور ہے کہ وہ اس فصل کے اگنے پر خوش نہیں ہوں گے۔''

سارے موسم خزاں میں محاذ سے وفود روزانہ یہ کہتے پیٹروگراڈ سوویٹ مس آتے رہے کہ اگر یکم نومبر تک معاہدہ امن پر دستخط نہ ہوئے تو پھر سپاہی خندقوں سے باہر نکل کر اپنے طریقے سے امن قائم کریں گے۔ محاذ پر اب یہی نعرہ گونجنے لگا۔ سپاہیوں نے جوق در جوق جندقیں خالی کرنی شروع کر دیں۔ اکتوبر انقلاب نے اسے وقتی طور پر روکا مگر کب تک۔

فروری انقلاب کا یہ احسان ضرور تھا کہ اس نے سپاہیوں کو یہ احساس دلا دیا تھا کہ حکمران راسپوتین ٹولے نے انہیں ایک بیکار اور بے مقصد جنگ میں الجھا رکھا تھا۔ اسے جاری رکھنے کی انہیں کوئی وجہ دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ایک نوجوان وکیل کرنسکی انہیں جنگ لڑنے کیلئے کہتا جا رہا تھا۔ وہ اپنے گھروں، اپنے بیوی بچوں اور اپنی زمینوں پر واپس جانا چاہتے تھے۔ جس انقلاب نے انہیں زمین اور آزادی دینے کا وعدہ کیا تھا، انہیں کچھ دینے کے بجائے محاذ جنگ پر سخت سردیوں میں کیڑے مکوڑوں سے بھری خندقوں میں ڈال رکھا تھا۔ کرنسکی سپاہیوں، محنت کشوں اور کسانوں کو ''باغی غلام'' کہہ کر ان کی بے عزتی کرتا۔ وہ ایک چیز سمجھنے میں ناکام رہا تھا۔ یعنی انقلاب اسی چیز میں پوشیدہ تھا۔ غلام کہنے سے انکار کر دے تو انقلاب کا آغاز ہو جاتا ہے۔ بچانان جو کرنسکی کے پیچھے بڑی طاقت تھا، اپنی یادداشتوں میں ہمیں یہ بتانے میں کوتاہی سے کام لے گیا کہ جنگ اور انقلاب اس اور اس جیسے لوگوں کیلئے کیا معنی رکھتے تھے۔ اکتوبر انقلاب کے چندہ ماہ پہلے کی 1916ء کے روس کی حالت بچانان نے یوں بیان کی ہے۔ ''وہ یہ بے رحم اور خوفناک سال تھا جب زار کی فوجیں شکست پر شکست کھا رہی تھیں۔ معاشی زندگی مفلوج ہو چکی تھی، روٹی کے لئے لوگوں کی قطاریں لگ گئی تھیں اور راسپوتین کی زیر کمان حکومت مینڈک کی طرف چھلانگیں لگا رہی تھی۔ بچانان مزید لکھتا ہے۔ ''جن خوبصور محلات میں ہم گئے (وہ 1916ء میں کریمیا کے دورے کی بات کر رہا تھا) ان میں سے ایک میں ہمیں چاندی کی ایک پلیٹ میں نمک اور روٹی رکھ کر دیے گئے۔ اس کے علاوہ جاتے وقت ہماری موٹر میں برگنڈی کی ایک درجن بوتلیں رکھ دی گئیں۔ وجہ یہ تھی کہ میں نے کھانے کی میز پر اس شراب کی بے حد تعریف کی تھی۔ ان پر مسرت ایام کو یاد کر کے دل اداس ہو جاتا ہے (؟) دل اس بات پر بہت دکھتا ہے کہ جن لوگوں نے ہماری اس قدر خاطر مدارات کی اور شفقت سے پیش آئے ان کا کیا حشر ہوا۔''

بچانان خندقوں میں سڑنے والے سپاہیوں اور روٹی کی قطاروں میں لکڑی بھوکی ماؤں کا ذکر نہیں کرتا۔ بلکہ کریمیا کے خوبصورت محلات اور چاندی کی پلیٹوں کے مالکوں کی بدقسمتی پر آنسو بہاتا ہے۔ ایسی شرم نام سطریں پڑھ کر آدمی یہی کہہ سکتا ہے کہ اکتوبر انقلاب بے سود نہیں تھا۔ وہ محلات کے باسیوں ہی کو نہیں، بچانوں اور کرنسکیوں کو بھی اپنے ساتھ بہا کر لے گیا تھا۔

جب میں برسٹ-لٹووسک جاتے وقت پہلی دفعہ خط جنگ عبور کر رہا تھا تو ہمارے ہمدردوں کے پاس اتنی جرات بھی نہیں تھی کہ وہ جرمنوں کے ظالمانہ مطالبوں کے خلاف احتجاج ہی کر سکیں۔ اس وقت مورچے تقریباً ویران ہو چکے تھے۔ بچانان اور کرنسکی کے تجربوں کے بعد کوئی بھی جنگ کو مشروط طور پر بھی جاری رکھنے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ ہر قیمت پر امن کا مطالبہ ہو رہا تھا۔ ایک مرتبہ برسٹ-لٹووسک سے ماسکو واپس آنے پر میں نے محاذ سے واپس آنے والے مرکزی مجلس عاملہ کے ایک نمائندے کو ہمارے وفد کا حوصلہ بڑھانے کیلئے پرزور تقریر کرنے کی ترغیب دی۔ ''ناممکن، بالکل ناممکن'' اس نے جواب دیا۔ ''ہم مورچوں میں واپس نہیں جائیں گے۔ وہ ہم سے بدگمان ہو جائیں گے اور کہیں گے کہ ہم بھی کرنسکی کی طرح انہیں فریب دے رہے تھے۔''

جنگ جاری رکھنا ناممکن ہو گیا تھا۔ اس نکتے پر لینن اور میرے درمیان رتی بھر اختلاف نہیں تھا۔ ہم بخارن اور اس جیسے دوسرے ''انقلابی جنگ'' کے پیغمبروں کی باتیں سن کر پریشان ہو جاتے۔ لیکن ایک دوسرا سوال بھی تھا، بے حد اہم سوال۔ ہوہن زولرن حکومت ہمارے خلاف کہاں تک جدوجہد کر سکتی تھی؟ زرنن نے اپنے ایک دوست کو خط میں لکھا تھا کہ اگر وہ مضبوط ہوتے تو بالشویکوں سے مذاکرات کرنے کے بجائے پیٹروگراڈ فوج بھیج کر وہاں امن و امان قائم کر سکتے تھے۔ یقیناً بدنیتی کی کوئی کمی نہیں تھی۔ لیکن کیا واقعی وہ مضبوط تھے؟ کیا ہوہن زولرن انقلابیوں کے خلاف فوج بھیج سکتا تھا جو واقعی امن کے خواہاں تھے؟ پہلے فروری اور پھر اکتوبر انقلاب نے جرمن فوج کو کیسے متاثر کیا تھا؟ کوئی اثر اتنی جلدی خود کو کیسے ظاہر کر سکتا ہے؟ ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا تھا۔ مگر مذاکرات کے دوران ہی میں ہم نے ان کے جواب تلاش کرنے تھے۔ اسی لئے ہم مذاکرات میں ممکن حد تک تاخیر پیدا کر رہے تھے تاکہ یورپی محنت کشوں کو سوویٹ انقلاب اور اس کی امن پالیسی ہضم کرنے کا موقع مل سکے۔ یہ اس لئے اور بھی زیادہ اہم تھا کہ اتحادی قوموں کا پریس روس کے ''مصالحتی'' اور بورژوا پریس کی طرح امن مذاکرات کو

ایک کامیڈی قرار دے کر ان کا پہلے ہی سے مذاق اڑا رہا تھا۔

جرمنی کے اندر بھی سوشل ڈیموکریسی میں حریف گروپ کو جو اپنی ساری کمزوریاں ہمارے اندر دیکھ رہا تھا' بالشویک جرمن حکومت کی باہوں میں بالیں ڈالے کام کرتے دکھائی دے رہے تھے۔فرانس اور برطانیہ تو اس پر یقین کیے بیٹھے تھے۔اس سے ظاہر تھا کہ اتحادی ممالک کی بورژوازی اور سوشل ڈیموکریسی ہمارے بارے میں مذکورہ غلط خیال اپنے عوام اور محنت کشوں کے اندر پھیلانے میں کامیاب ہوگئی تھی تاکہ مستقبل میں ان کی فوجی مداخلت زیادہ آسان ہو جائے۔لہٰذا میں اس بات پر اڑ گیا کہ اگر علیحدہ طور پر صلح نامے پر دستخط ناگزیر ہو جائیں تو اس صورت میں ہمیں یورپ کے محنت کشوں کو یہ ناقابل تردید ثبوت مہیا کرنا پڑے گا کہ ہماری اور جرمن حکمران طبقات کے درمیان سخت دشمنی ہے۔اسی بات نے مجھے برسٹ۔لٹووسک میں یہ نعرہ لگانے کا خیال سمجھایا۔''ہم جنگ ختم کرتے ہیں' ہم فوج کو واپس -- بلاتے ہیں۔مگر ہم امن معاہدے پر دستخط نہیں کریں گے۔'' میں نے دلیل دی کہ اگر جرمن سامراج ہمارے خلاف فوج نہیں بھیجتا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم نے دوررس نتائج کی زبردست فتح حاصل کر لی تھی۔اور اگر جرمن فوج ہم پر حملہ آور ہوتی ہے تو ہمیں جم کر اس کا مقابلہ کرنا ہوگا۔میں نے وفد کے دوسرے ارکان بشمول کامینیف کو خط لکھ دیا۔اس نے جواب میں لکھا۔''جب تم ماسکو آؤ گے تو اس مسئلے پر بات کریں گے۔''

''اگر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ ہوف مان کی فوج ہم پر حملہ آور ہونے کی پوزیشن میں نہیں ہے تو اس سے بہتر کیا بات ہو سکتی ہے۔'' لینن نے میری دلیل کا جواب دیتے ہوئے کہا۔''مگر مجھے اس کی امید کم ہی ہے وہ اس کیلئے معمول باویرین کسانوں کی خاص رجمنٹیں تیار کرے گا۔اور پھر اسے ویسے بھی کتنی فوج کی ضرورت ہوگی؟ تم خود ہی تو کہہ رہے ہو کہ ہمارے مورچے خالی ہیں۔جرمنوں نے دوبارہ جنگ شروع کر دی تو کیا ہوگا؟''

اس صورت میں ہم معاہدے پر دستخط کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔لیکن ہر ایک کو پتا چل جائے گا کہ ہمارے سامنے کوئی اور راستہ نہیں تھا۔اس طرح جرمن حکومت سے ہمارے خفیہ تعلقات پر بھی بھاری چوٹ پڑے گی۔''

''اس میں یقیناً'' بعض فائدے ہیں۔لیکن اس میں خطرہ بھی بہت زیادہ ہے۔اگر اس طرح

جرمن انقلاب کی کامیابی کے کچھ امکان بڑھ جاتے ہیں تو ایسا کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔ ہمارے انقلاب کی نسبت جرمن انقلاب زیادہ اہم ہے۔مگر یہ کب آئے گا؟کسی کو خبر نہیں۔مگر اس وقت تو ہمارا انقلاب سب سے اہم ہے۔اسے ہر خطرے سے بچانا بے حد ضروری ہے۔‘‘

پارٹی کی اندرونی حالت نے مشکلات کو بڑھا دیا تھا۔ اس کے بڑے بڑے راہنما برسٹ-لٹووسک امن معاہدے پر دستخط کرنے کے سخت مخالف تھے اخبارات میں شائع ہونے والی رپورٹوں نے ان کے موڈ بے حد خراب کر دیے تھے۔بائیں بازو کے کمیونسٹ گروپ نے تو انقلابی جنگ کا نعرہ لگا دیا تھا۔

ہر دن گزرنے کے ساتھ داخلی تصادم تیز ہوتا گیا۔افواہ کے برخلاف یہ جھگڑا میرے اور لینن کے درمیان نہیں بلکہ لینن اور پارٹی کے دوسرے راہنماؤں کے درمیان چل رہا تھا۔اس قسم کے سوالوں پر کہ کیا ہم انقلابی جنگ جاری رکھنے کی پوزیشن میں تھے کہ نہیں' یا پھر انقلابی طاقت کو سامراجیوں کے ساتھ امن معاہدے پر دستخط کرنے چاہیں کہ نہیں' میں لینن کے ساتھ تھا۔ پہلے سوال پر مثبت اور دوسرے پر منفی انداز میں۔

اختلافات پر پہلی بحث 21 جنوری کو ورکروں کے ایک بڑے اجلاس میں ہوئی۔اس وقت تین نقطہ ہائے نظر سامنے آئے۔لینن کا خیال تھا کہ ہمیں مذاکرات مں تاخیر کرنی چاہیے۔مگر الٹی میٹم کی صورت میں مخالف کی بات مان لینی چاہیے۔میرا خیال تھا کہ ہمیں مذاکرات توڑ دینے چاہیں'اور اگر جرمن فوجیں پیش قدمی کریں تو ہتھیار ڈال دینے چاہیں' مگر کچھ مزاحمت کرنے کے بعد بخارن انقلاب کو آگے بڑھانے کیلئے جنگ کے حق میں تھا۔لینن انقلابی جنگ کے حامیوں نے بتیس'لینن نے پندرہ اور میں نے سولہ ووٹ حاصل کیے۔لیکن یہ اعداد و شمار پارٹی کے موڈ کی ترجمانی نہیں تھے۔پارٹی کے بالائی حصے میں اس خاص اجلاس میں ’’بایاں بازو‘‘ زیادہ مضبوط تھا۔اسی چیز نے میری تجویز کو عارضی فتح دی۔ جو لوگ بخارن کے نقطہ نظر سے متفق تھے وہ بھی میری تجویز کو اپنی جانب ہی سمجھتے تھے۔دوسری طرف لینن کو یقین تھا'اور بجا طور پر تھا' کہ قطعی فیصلے کا التوا' ہمیں فتح کی جانب لے جائے گا۔

اس وقت ہماری پارٹی کو جس میں یورپ کے محنت کش بھی شامل تھے' صحیح صورتحال سامنے لانے کی ضرورت تھی۔ پارٹی اور حکومت کے تمام دھڑوں میں لینن اقلیت میں تھا۔تقریباً دوسو سوویٹوں نے

سوویٹ کمساری کی دعوت پر جنگ اور امن کے موضوع پر ووٹنگ میں حصہ لیا۔ ان میں سے دو بڑی سوویٹوں، پیٹروگراڈ اور سبستول (موخرالذکر تحفظ کے ساتھ) امن کے حق میں ووٹ دیا دوسری طرف محنت کشوں کے چند بڑے بڑے ورکروں نے مثلاً مسکو، خرکوف، ایوانووُ، ایکاترن برگ وغیرہ نے اکثریت سے مذاکرات ختم کر دینے کو کہا۔ یہی رویہ پارٹی کی دوسری تنظیمون اور سوشلسٹ انقلابیوں کا تھا۔ لینن کا نقطہ نظر پارٹی میں پھوٹ یا پرٹی کا تختہ ہی الٹ دینے کی صورت میں کامیاب قرار دیا جا سکتا تھا۔ اس کے باوجود لینن کے پیروکاروں میں ہر روز اضافہ ہو رہا تھا۔ ان حالات میں ''نہ امن نہ جنگ'' کا فارمولا لینن کے نقطہ نظر کیلئے ایک پل کا کام دے سکتا تھا۔

''چلو فرض کر لیتے ہیں کہ ہم نے امن معاہدے پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا ہے اور امن فوجوں کی پیش قدمی شروع ہوگئی ہے۔ پھر تم کیا کرو گے؟'' لینن نے مجھ سے پوچھا۔

''ہم سنگین کی نوک پر امن معاہدے پر دستخط کر دیں گے۔ صورتحال دنیا پر واضح ہو جائے گی۔''

''اس صورت میں تم انقلابی جنگ کے نعرے کی حمایت نہیں کر سکو گے۔''

''بالکل نہیں۔''

''اس صورت میں ممکن ہے تجربہ زیادہ خطرناک نہ ہو۔ ہمیں استھونیا لالتویا کھو دینے کا خطرہ ہوگا۔'' پھر لینن نے قدرے عیاری سے ہنستے ہوئے کہا۔ ''ٹراٹسکی سے ایک اچھے معاہدے کی امید میں یہ دو علاقے کھو دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔'' کئی دنوں تک وہ یہی بات کہتا رہا۔

22 جنوری کے فیصلہ کن اجلاس میں مرکزی کمیٹی نے میری یہ تجاویز منظور کر لیں (1) مذاکرات میں تاخیر کی جائے۔ (2) جرمن الٹی میٹم کی صورت میں ایک طرف اعلان جنگ اور دوسری طرف معاہدہ امن پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا جائے۔ (3) اس کے بعد حالات کے مطابق عمل کیا جائے۔ 25 جنوری کی رات گئے بالشویک مرکزی کمیٹی اور سوشلسٹ انقلابیوں (بایاں بازو جو اس وقت ہمارا اتحادی تھا) کا اجلاس طلب کیا گیا جس میں بھاری اکثریت سے مذکورہ بالا فارمولے کے حق میں ووٹ ڈالے گئے۔ جیسا کہ ہمارا طریقہ تھا۔ ہم نے اعلان کر دیا کہ دونون مرکزی کمیٹیوں کے فیصلے کو عوامی کمسارکی سوویٹ کا فیصلہ سمجھا جائے۔

31 جنوری کو میں نے برسٹ-لٹووسک سے لینن کو براہ راست سمولنی تار بھیجا جس میں لکھا تھا:

''جرمن پریس میں ان گنت افواہوں اور رپورٹوں کے ہجوم میں یہ فضول بیان بھی شائع ہوا ہے کہ ہمارا ادارہ امن معاہدے پر دستخط کرنے کا نہیں ہے' اور یہ کہ اس معاملے میں بالشویکوں کے مابین اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ اس قسم کی دوسری خبریں۔ میں سٹاک ہوم سے موصول ہونے والے ایک تار کا حوالہ دے رہا ہوں جو ''پولوٹیکن'' میں شائع ہوا ہے۔ اگر میں غلطی پر نہیں تو تو ''پولوٹیکن'' ہوگلنڈ کا ترجمان ہے۔ کیا آپ اس سے پوچھ سکتے کہ اس کے ایڈیٹروں نے اس قسم کی فضول اور بے ہودہ خبر کیوں شائع کی ہے؟ اگر یہ سچی بھی ہے تو پھر بھی اس نوعیت کی خبر شائع کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ چونکہ اخبارات پہلے ہی اس قسم کی فضولیات سے بھرے ہوتے ہیں لہذا مجھے امید ہے جرمن اسے زیادہ اہمیت نہیں دیں گے۔ مگر زیر بحث خبر ایک بائیں بازو اخبار میں شائع ہوئی جس کا ایک ایڈیٹر پیٹروگراڈ میں بیٹھتا ہے۔ اس سے خبر معتبر بن جاتی ہے جو ہمارے مخالفوں کے ذہن پریشان کر سکتی ہے۔

'' آسٹری اور جرمن پریس ماسکو پیٹروگراڈ اور پورے روس میں خوف و ہراس سے بھرا ہوا ہے۔ اس کے مطابق سینکڑوں لوگ ہلاک ہو گئے ہیں اور ہر طرف مشین گنیں گرج رہی ہیں۔ ملکی صورتحال پر روزانہ رپورٹ شائع کرنے کیلئے ایک متوازن ذہن آدمی مقرر کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ رپورٹ اخباروں میں شائع اور ریڈیوں پر نشر ہونی چاہیے۔ اگر کامریڈ زینوشیف یہ ذمہ داری قبول کر لیں تو بہت اچھا ہوگا۔ رپورٹ پہلے وروسکی اور لٹونوف کو دکھالی جایا کریں۔ ایسا چچرن کی وساطت سے ممکن ہے۔

''یہاں ابھی سرکاری سطح پر ایک اجلاس ہوا ہے۔ جرمن مذاکرات میں تاخیر کر رہے ہیں۔ اس کی وجہ ان کا داخلی بحران ہے۔ جرمن پریس شور مچا رہا ہے کہ ہم امن کے خواہاں نہیں ہیں' اور چاہتے ہیں کہ انقلاب دوسرے ممالک تک پہنچ جائے۔ یہ فضول لوگ یہ بات سمجھنے کے نااہل ہیں کہ یورپی ممالک تک انقلاب کو لے جانے کیلئے امن بے حد ضروری ہے۔

''رومانیہ کے سفارت خانے کو بند کرنے کا کوئی اقدام کیا گیا ہے؟ میرا خیال ہے رومانیہ کا بادشاہ اس وقت آسٹریا میں ہے۔ ایک جرمن اخبار کی اطلاع کے مطابق اس نے ماسکو میں رومانیہ کا قومی خزانہ ہی نہیں بلکہ سونا بھی جمع کیا ہوا ہے۔ ویسے جرمن کی ساری سرکاری ہمدردیاں رومانیہ کے ساتھ ہیں۔''

--ٹراٹسکی--

اس مراسلے کی قدرے وضاحت کی ضرورت ہے۔ برسٹ-لٹووسک سے ارسال کیے جانے والے تار ٹیپ ہونے سے محفوظ سمجھے جاتے تھے۔مگر ہمارے پاس یقین کرنے کی ہر وجہ موجود تھی کہ جرمن ہمارے تار پڑھ لیتے تھے۔ان کی فنی ترقی نے ہمیں اس یقین پر مجبور کیا تھا۔ہم اپنا ہر پیغام کوڈ نہیں کر سکتے تھے'اور نہ ہی کوڈ نگ بھی تحفظ کا کوئی بڑا ذریعہ تھا۔دوسری طرف ''پولوٹیکن' معتبر خبریں شائع کر کے ہماری کوئی خدمت نہیں کر رہا تھا۔

یہ تار میں نے لینن کو یہ بتانے کیلئے ارسال نہیں کیا تھا کہ ہمارا خفیہ فیصلہ پکڑ کر باہر نشر کر دیا جاتا ہے۔ بلکہ ایسا جرمنوں کو غلط راستے پر لگانے کیلئے کیا گیا تھا۔میں نے جرمن اخبار نویسوں کو فضول قسم کے آدمی جان کر کہا تھا تاکہ وہ اپنی حیثیت جان سکیں۔میں نہیں جانتا کہ میرا یہ حربہ کہل مان کو کس حد تک دھوکہ دینے میں کامیاب ہوا تھا۔بہر حال میرا 10 فروری کا بیان ہمارے حریفوں کیلئے بے حد غیر متوقع تھا۔ زرنن نے 11 فروری کو اپنی ڈائری میں لکھا۔''ٹراٹسکی نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا ہے۔جنگ ختم ہو گئی ہے۔لیکن امن بھی قائم نہیں ہوا۔

یقین کرنا تو مشکل ہے مگر 1924ء میں سٹالن اور زینوشیف فریق نے اس معاملے کو یوں ہوا دی جیسے میں نے برسٹ-لٹووسک میں پارٹی اور حکومت کے فیصلے کے خلاف عمل کیا تھا۔جھوٹ بولنے والوں نے اتنی زحمت بھی گوارا نہ کی کہ وہ پرانی کاروائی اور اپنے بیانات پر ہی ایک نظر ڈال لیتے۔ برسٹ-لٹووسک میں میرے اعلان کے ایک دن بعد 11 فروری کو زینوشیف نے پیٹروگراڈ میں بولتے ہوئے کہا۔''ہمارے وفد نے صورتحال سے نکلنے کا بالکل درست راستہ نکالا ہے۔''اور یہ زینوشیف ہی تھا جس نیامن معاہدے پر دستخط کرنے کے خلاف قرارداد پیش کی جو اکثریت سے منظور ہوگئی۔اس اجلاس میں منشویک اور سوشلسٹ انقلابیوں نے ووٹنگ میں حصہ نے لیا۔

14 فروری کو مرکزی مجلس عاملہ میں میرے رپورٹ پیش کرنے کے بعد سیورڈلوف نے منشویک فریق کی طرف سے ایک قرارداد پیش کی جس کا آغاز ان الفاظ سے ہوا۔''امن وفد کی طرف سے رپورٹ پیش کیے جانے اور اس پر مکمل غور کرنے کے بعد ہم برسٹ-لٹووسک میں وفد کی طرف سے کیے جانے والے اقدام کی توثیق کرتے ہیں'' کوئی بھی پارٹی یا مقامی تنظیم کی سوویت ایسی نہیں تھی جس نے 11 فروری سے 15 فروری کے درمیان کیے گئے اقدام کو نہ سراہا ہو۔مارچ 1918ء میں پارٹی کانگریس

میں زینوشیف نے اعلان کیا ''ٹراٹسکی جب یہ کہتا ہے کہ اس نے مرکزی کمیٹی کی اکثریت کے فیصلے پر عمل کیا ہے تو وہ درست کہتا ہے۔ کوئی بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا۔'' لینن نے بھی اس کانگریس میں کہا تھا۔ ''مرکزی کمیٹی میں امن معاہدے پر دستخط نہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا'' اس سارے ثبوتوں کی موجودگی میں کمیونسٹ انٹرنیشنل میں یہ نئی بات منظور کرالی گئی کہ برسٹ-لٹووسک میں امن معاہدہ پر دستخط نہ کرنے کا واحد ذمہ دار ٹراٹسکی تھا۔

جرمن اور آسٹریا میں اکتوبر ہڑتالوں کے بعد جرمن حکومت کا یہ فیصلہ کرنا کہ وہ حملہ کرے گی کہ نہیں' جرمن حکومت کی صوابدید پر تھا۔ لیکن وقت گزر جانے کے بعد اب ہمارے بہت سے ''ذہین'' دوست جرمن پیش قدمی کے حق میں باتیں کر رہے ہیں۔ 10 فروری کو برسٹ-لٹووسک میں جرمنی اور آسٹرو-ہنگری کے نمائندوں نے کہا کہ ''ٹراٹسکی نے جو صورتحال تجویز کی ہے اسے قبول کر لینا چاہیے۔'' فقط جنرل ہوف مان نے اس کی مخالفت کی۔ اگلے دن کانفرنس کے اختتامیہ اجلاس میں زرنن کے مطابق ''کہل مان نے ''ڈی فیکٹو'' امن قبول کرنے لینے پر زور دیا۔'' اس کی بازگشت ہم تک بھی پہنچ گئی۔ ہمارا وفد یہ تاثر لے کر ماسکو واپس آ گیا کہ جرمن حملہ نہیں کریں گے۔ لینن اس پر بڑا خوش ہوا۔

''وہ ہمیں دھوکہ تو نہیں دے رہے؟'' اس نے پوچھ ہی لیا۔

ہم کندھے اچک کر رہ گئے۔ بظاہر یہ ممکن دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

''اگر ایسا ہے تو بہت اچھی بات ہے ہم شکل دکھانے کے قابل رہ گئے۔'' لینن نے کہا۔ ''اس کا مطلب یہ لینا چاہیے کہ جنگ ختم ہو گئی ہے۔''

جس ہفتے میں جرمنوں نے جواب دینا تھا اس کے ختم ہونے سے دو دن پہلے برسٹ-لٹووسک میں موجود جنرل سمولو نے ہمیں مطلع کیا کہ جرمنوں نے جنرل ہوف مان کی وساطت سے 18 فروری سے روس سے حالت جنگ کا اعلان کر دیا تھا اور اسے واپس بلا لیا گیا تھا۔ میں اس وقت اس کمرے میں تھا جہاں سوشلسٹ انقلابیوں سے ایک کانفرنس چل رہی تھی۔ اس نے کچھ کہے بغیر تار میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس کے چہرے سے مجھے ایک دم پتا چل گیا کہ کچھ ہو گیا تھا۔ اس نے سوشلسٹ انقلابیوں سے جلدی سے بات ختم کی تاکہ صورتحال پر بات کی جا سکے۔

''انہوں نے آخر ہمیں دھوکہ دے ہی دیا--- پانچ دنوں کی مہلت حاصل کر لی-- یہ وحشی درندہ

اب کچھ نہیں چھوڑے گا۔ اب پرانی شرائط پر دستخط کرنے ہی پڑیں گے۔ شرطیکہ جرمن ان پر رضا مند ہو جائیں۔''

میرا اب بھی اصرار تھا کہ ہوف مان کو حملہ کرنے دیا جائے تا کہ جرمنی اور دوسرے اتحادی ممالک کا محنت کش طبقہ جان جائے کہ یہ خالی دھمکی نہیں تھی۔

''نہیں'' لینن نے کہا'' اب ہم ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کر سکتے۔ آزمائش ہو چکی ہے۔ ہوف مان لڑ سکتا ہے اور وہ لڑنا چاہتا ہے۔ تاخیر ناممکن ہے۔ درندے کی چھلانگ بہت بڑی ہے۔''

مارچ میں لینن نے پارٹی کانفرنس میں کہا۔ ''ہمارے درمیان۔ لینن اور میرے) اتفاق ہوا تھا کہ جرمنوں کے الٹی میٹم تک ہم انتظار کریں گے' مگر الٹی میٹم کے بعد ہتھیار ڈال دیں گے۔'' میں معاہدے کا ذکر پہلے کر چکا تھا۔ لینن نے میرے نقطہ نظر کو پارٹی میں زیر بحث نہ لانے پر اتفاق کیا کیونکہ میں نے انقلابی جنگ شروع کرنے کے حامیوں کی طرف داری نہ کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس گروپ کے سرکاری نمائندے جن میں یوتر کی' راڈک کے علاوہ شاید اوسنسکی بھی شامل تھا' میرے پاس ''واحد محاذ'' کی پیشکش لے کر آئے۔ میں نے ان پر واضح کرنے کی کوشش کی کہ ہمارے درمیان کوئی بھی مشترکہ بات نہیں تھی۔ جب جرمن ہائی کمان نے معاہدہ امن ختم ہونے کا نوٹس بھجوا دیا تو لینن نے مجھے ہمارا معاہدہ یاد دلایا۔ میں نے جواب دیا کہ الٹی میٹم سے میرا مطلب زبانی بیان نہیں بلکہ حقیقی جرمن حملہ تھا جو ملکوں کے حقیقی تعلقات کے پیش نظر کسی شک کی گنجائش نہیں چھوڑتا۔

17 فروری کو مرکزی کمیٹی کے اجلاس میں لینن نے یہ سوال ووٹنگ کیلئے پیش کر دیا۔ ''اگر جرمن حملہ ایک حقیقت بن جاتا ہے اور جرمنی میں کوئی انقلابی ہلچل پیدا نہیں ہوتی' تو کیا ہمیں امن معاہدے پر دستخط کر دینے چاہئیں؟'' بخارن اور اس کے ساتھیوں نے اس اہم سوال پر ووٹ نہ دینے کا فیصلہ کیا۔ کرسٹنسکی نے بھی یہی وطیرہ اختیار کیا۔ جوفے نے امن کے خلاف ووٹ دیا۔ لینن اور میں نے حق میں اگلے دن میں نے امن معاہدے پر دستخط کرنے کی رضامندی ظاہر کرنے کی خاطر فوری طور پر ٹیلی گرام دینے سے اتفاق نہ کیا' جیسا کہ لینن نے تجویز کیا تھا۔ سارا دن ہمیں تار کے ذریعے رپورٹیں ملتی رہیں کہ جرمنوں نے حملہ شروع کر دیا تھا' انہوں نے ہماری رسد پکڑ لی تھی اگر دونسک کی طرف پیش قدمی کر رہے تھے۔ اسی شام میں نے لینن کے حق میں ووٹ دے دیا۔ اب اس میں کوئی شک نہیں رہا تھا کہ جرمن حملہ

ساری دنیا میں نشر ہو جائے گا۔

21 فروری کو ہمیں جرمنی کی طرف سے اپنی نئی شرائط موصول ہوئیں جنہوں نے امن معاہدے پر دستخط ناممکن بنا دیے۔ اس وقت تک ہمارا وفد دوبارہ برسٹ-لٹووسک جا چکا تھا۔ نئی شرائط بہت ہی سخت تھیں۔ ہم بشمول لینن اس نتیجے پر پہنچے کہ جرمنوں نے اپنے مخالف اتحادیوں سے مل کر سوویٹ روس کو کچلنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور مغربی محاذ پر روسی انقلاب کی راکھ پر امن قائم کیا جانا تھا۔ اس صورت میں ہماری طرف سے کوئی بھی رعایت کسی کام کی نہیں تھی۔ فن لینڈ اور یوکرائن کی صورت حال کا پلڑا جنگ کی طرف جھک رہا تھا۔ ہر لمحہ غیر موافق صورتحال سامنے لا رہا تھا۔ جرمنوں کے فن لینڈ میں اترنے اور وہاں کی فوج کو تباہ کرنے کی خبر ہم تک پہنچ گئی۔ میں لینن سے اس کے کمرے کے نزدیک برآمدے میں ملا۔ وہ زبردست ہیجانی حالت میں تھا۔ ایسی حالت میں میں نے اسے نہ پہلے کبھی اور نہ بعد میں دیکھا تھا۔

''ہمیں لڑنا پڑے گا'' اس نے کہا۔ ''اگر ہمارے پاس لڑنے کو کچھ نہیں ہے۔ مگر دوسرا راستہ بھی نہیں۔''

دس پندرہ منٹ بعد جب میں اس کمرے میں گیا تو اس نے کہا۔ ''نہیں، ہمیں اپنی پالیسی تبدیل نہیں کرنی چاہیے۔ ہماری طرف سے فوجی اقدام فن لینڈ ہی انقلاب کو بچانے کے بجائے اسے تباہ کر دے گا۔ ہم نفس محنت کشوں کی ہر ممکن طریقے سے مدد کریں گے۔ مگر ہم ایسا امن کو چھوڑے بغیر کریں گے۔ مجھے یقین نہیں کہ ایسا کرنے سے ہمارا بچاؤ ہو جائے گا۔ لیکن نجات کا یہی ایک ممکن راستہ ہے۔''

مکمل طور پر ہتھیار ڈال دینے سے بھی امن کا امکان مشکوک دکھائی دیتا تھا۔ لیکن لینن نے یہ طریقہ ممکن حد تک استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ چونکہ مرکزی کمیٹی میں اس کی اکثریت نہیں تھی اور فیصلہ میرے ووٹ پر ہونا تھا لہذا میں نے ووٹنگ میں حصہ نہ لینے کا فیصلہ کر کے اسے ایک ووٹ کی برتری سے محروم کر دیا۔ میں نے بعد میں اپنے اس فیصلے کی بڑی تفصیل سے وضاحت کی۔ میری دلیل تھی کہ اگر ہتھیار ڈالنے سے بھی ہم امن حاصل نہ کر سکے تو پھر پارٹی کی صفیں سیدھی کر کے کے انقلاب کے دفاع نکل پڑیں گے۔ ایسا ہم نے مجبوری کی حالت میں کرنا تھا۔

میں نے لینن کو علیحدگی میں بتایا۔ ''اگر میں وزارت خارجہ سے استعفیٰ دے دوں تو سیاسی لحاظ سے یہ عقل مندی ہوگی۔''

''وہ کیسے؟ میں پارلیمانی طریقہ کار رائج کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔''

''لیکن میرے استعفیٰ کو جرمن حکام ہماری خارجہ پالیسی میں ایک بہت بڑی تبدیلی سمجھیں گے اور اسے امن معاہدے پر دستخط کیلئے ہماری رضامندی قرار دے سکتے ہیں۔''

''لگتا ہے تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' لینن نے میری بات پر دوبارہ غور کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ ایک سنجیدہ سیاسی وجہ بن سکتی ہے۔''

22 فروری کو مرکزی کمیٹی کے اجلاس میں میں نے بتایا کہ فرانسیسی فوجی کمیشن نے پیشکش کی ہے کہ فرانس اور برطانیہ جنگ میں جرمنی کے خلاف مدد کرنے پر تیار تھے۔ میں نے تجویز پیش کی کہ ہم یہ پیشکش اس شرط پر قبول کر لیں کہ ہمارے امور خارجہ کی پالیسی میں کوئی مداخلت نہ کی جائے۔ بخارن سامراجیوں سے ایسے کسی انتظام میں شامل ہونے کو تیار نہیں تھا۔ لینن بڑی تیزی اور سرگرمی سے میری مدد کو آیا۔ مرکزی کمیٹی نے پانچ کے مقابلے میں چھ ووٹوں سے میری تجویز منظور کر لی۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے' لینن نے ان الفاظ میں قرارداد لکھوائی تھی۔ ''کامریڈ ٹراٹسکی کو جرمن فوجوں کے خلاف فرانسیسی سامراجی فوجوں کی مدد حاصل کرنے کا اختیار دیا جاتا ہے۔ اس کی تجویزیں شک وشبہ سے بالا ہوتی ہیں۔''

میٹنگ سے باہر آ کر بخارن نے مجھے سمولنی کے طویل برآمدے میں آ لیا۔ وہ میرے گلے میں باہیں ڈال کر رونے لگا۔ ''ہم یہ کیا کر رہے ہیں؟ ہم پارٹی کو گوبر کا ڈھیر بنا رہے ہیں۔'' بخارن کے آنسو ایک حقیقت پسند کی طرح ہر وقت نکلنے کو تیار رہتے۔ اس وقت تو صورتحال واقعی المناک بن رہی تھی۔ انقلاب ہتھوڑے اور درانتی کے درمیان پھنس گیا تھا۔

3 مارچ کو ہمارے وفد نے امن معاہدہ کو پڑھے بغیر اس پر دستخط کر دیے۔ برسٹ-لٹووسک ہمارے لئے جلاد کی رسی بن گیا۔ 22 مارچ کو جرمن پارلیمان نے امن معاہدے کی منظوری دے دی۔ جرمن سوشل ڈیموکریٹ ورسیلز کے مستقبل کے اصولوں کی منظوری پہلے ہی دے چکے تھے۔ آزاد ارکان نے اس کے خلاف ووٹ دیے۔ وہ اس ایک دائرے میں گھوم رہے تھے جس نے انجام کار انہیں نقطہ آغاز کی طرف لے آنا تھا۔

مارچ 1918ء میں پارٹی کی ساتویں کانگریس میں میں نے اپنی پوزیشن وضاحت کے ساتھ بیان کی۔ بہتر شرائط پر امن معاہدہ حاصل کرنے کے لئے ہمیں گذشتہ نومبر ہی میں متفق ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن

زینوشیف کے سوا کسی نے آواز بلند نہ کی۔ہم سب جرمنی، آسٹرو-ہنگری اور پورے یورپ کے عوام میں انقلاب پھیلانے کے حق میں تھے۔جرمنوں سے ہمارے تمام سابقہ مذاکرات فقط اسی صورت میں انقلابی اہمیت کے حامل ہو سکتے تھے کہ جرمن انہیں سنجیدگی سے لیتے۔میں نے سوویٹوں کی کل روسی کانگریس میں بالشویک فریق کو بتا دیا تھا کہ سابق آسٹروی وزیر گراٹز کے کہنے کے مطابق جرمن کس طرح ہمیں الٹی میٹم دینے کا بہانہ تلاش کر رہے تھے۔ان کا خیال تھا کہ ہم خود عذاب کو دعوت دے رہے تھےاور جانتے تھے کہ ہمارے سامنے جیسا کاغذ بھی رکھ دیا جائے گا ہم اس پر دستخط کر دیں گے۔جیسے ہم کسی انقلابی مزاحیہ ڈرامے میں کوئی کردار ادا کر رہے تھے۔

دوسری طرف امن معاہدے پر دستخط کرنے سے انکار کی صورت میں ہم نے یورال اور دوسرے علاقوں سے ہاتھ دھو بیٹھنے کی دھمکی میں آ جانا تھا۔اگر جلد بازی میں دستخط کر دیتے تو عالمی پرولتاریہ کی ہمدردیوں سے محروم ہو جانا تھا۔ میں ان لوگوں میں سے تھا جس کا خیال تھا کہ جرمن پیش قدمی نہیں کریں گے۔اگر وہ ایسا کریں گے تو ہمارے پاس پھر بھی امن معاہدے پر دستخط کرنے کا وقت ہونا تھا، خواہ اس کی شرائط سخت ہی کیوں نہ ہو جاتیں۔تب میں نے کہا۔''وقت گزرنے کے ساتھ ہر کوئی جان جائے گا کہ اس کے سوا ہمارے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔''

یہ کتنی عمدہ بات ہے کہ اسی زمانے میں میں کارل لب نخت قید خانے میں بیٹھا یہ سطریں لکھ رہا تھا۔''اگر فروری میں برسٹ-لٹووسک میں امن معاہدے پر دستخط کر دیے جاتے تو کسی لحاظ سے بھی یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ مسئلے کا موجودہ حل آنے والے حالات کے پیش نظر اس وقت زیادہ موافق ہوتا۔میں یہ ماننے کو تیار نہیں ہوں۔اس نے ہتھیار ڈالنے کے فعل نے پچھلی تمام مزاحمت پر پانی پھیر دینا تھا اور فوج کی اطاعت گزاری نے سن کے سر جھکا دینے تھے۔جرمنوں کے وحشیانہ فعل نے تمام شکوک وشبہات کو پس منظر میں دھکیل دیا ہے۔''

جنگ کے دوران میں لب نخت کے اندر حیرت ناک طور پر ذہنی بالیدگی آئی تھی۔اس نے اپنے اور ایمان دار مگر بے کردار پیسے کے درمیان ایک خلیج بنانی سیکھ لی تھی۔یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ لب نخت ایک بے کراں جرات والا انقلابی تھا۔مگر اب وہ ایک حربی حکمت ساز میں تبدیل ہو رہا تھا۔اس کا انکشاف اس کی ذاتی زندگی اور انقلابی پالیسی میں ہوتا ہے۔اسے کبھی اپنے ذاتی تحفظ کا خیال نہیں آیا تھا۔اس کے

اندر جو ایک بے رحمانہ سرفروشی کا جذبہ تھا اس پر اس کے دوست اسے سمجھاتے رہتے تھے۔ اسکے برعکس لینن قیادت کے تحفظ پر زیادہ زور دیتا تھا۔ وہ جنرل سٹاف کا سربراہ تھا اور جنگ کے دنوں میں یہ بات ہمیشہ یاد رکھتا تھا۔ اسے ہائی کمان کو چلانے کی فکر رہتی تھی۔ لب نخت ایک ایسا جرنیل تھا جو بذات خود فوجوں کو لے کر میدان جنگ میں اتر جاتا ہے۔

متعدد وجوہات کی بنا پر اس کیلئے برسٹ-لٹووسک میں ہماری پالیسی کو سمجھنا مشکل تھا۔ اس کی فقط یہ خواہش تھی کہ ہم سرفروشی کی تمنا لیے آگے بڑھیں اور موت سے بغل گیر ہو جائیں۔ ان دنوں وہ ''لینن -ٹراٹسکی پالیسی'' کی مسلسل مذمت کر رہا تھا۔ اسے میرے اور لینن کے موقف میں کوئی فرق دکھائی نہیں دیتا تھا۔ لیکن بعد میں وہ ہماری برسٹ-لٹووسک پالیسی کو مختلف زاویہ نگاہ سے دیکھنے لگا۔ مئی کے ابتدا میں اس نے لکھا۔ ''روسی سوویٹوں کیلئے ایک چیز سب چیزوں سے زیادہ ضروری ہے۔ آرائش وزیبائش سے ہٹ کر ایک سخت قسم کا نظم ونسق۔ اس کے لئے سوویٹوں کو ذہانت' وقت اور قوت کی ضرورت ہے۔ ذہانت اس لیے کہ وقت حاصل کر سکیں جو ذہین ترین قوت کیلئے بہت ضروری ہوتا ہے۔'' یہ لینن کی برسٹ-لٹووسک پالیسی کی مکمل ترین اور درست پالیسی کی حمایت تھی جس نے تحت وقت لینے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

سچائی اپنا راستہ خود بنا لیتی ہے۔ مگر حماقت بھی بڑی دانا ہوتی ہے۔ امریکی پروفیسر فشر نے سوویٹ روس کے پہلے سال پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے ''سوویٹ روس میں قحط'' اس کتاب میں اس نے ایک جگہ یہ بیان مجھ سے منسوب کیا ہے کہ سوویٹیں بورژوا حکومتوں سے کبھی جنگ مول نہیں لیں گی' اور نہ ہی ان سے امن کی حالت میں رہیں گی۔ فشر نے یہ احمقانہ فارمولا زینوشیف اور کئی دوسرے رجعت پسندوں سے لے کر اس میں اپنے خیال کے فقدان کو بھی شامل کر دیا ہے۔ میرے دیر سے بیدار ہونے والے نقادوں نے میری برسٹ-لٹووسک تجویز کو اس کے سیاق وسباق اور وقت سے نکال کر ایک عالمی فارمولے میں بدل دیا ہے کہ تا کہ اسے آسانی سے لایعنی بنا سکیں۔ ایسا کرتے وقت انہیں یہ یاد نہیں رہتا کہ ''نہ جنگ نہ امن'' بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا ''نہ امن معاہدہ نہ جنگ'' میں بذات خود کوئی غیر فطری بات نہیں ہے۔ اس وقت سوویٹ روس اور دنیا کے دو عظیم ملکوں اور امریکہ اور برطانیہ* کے مابین یہی صورتحال چل رہی ہے۔ ہم تعلقات کی اس نوعیت کے حق میں ہرگز نہیں ہیں۔ لیکن اس طرح

معاملات تبدیل نہیں ہو جاتے۔

----

* یہ سطریں سوویٹ روس اور برطانیہ کے درمیان سفارتی تعلقات کی بحالی سے پہلے لکھی گئی تھیں۔ (مترجم)

ایک ایسا ملک بھی ہے جس کے ساتھ ہم نے ''نہ امن، نہ جنگ'' کی بنیاد پر تعلقات قائم کر رکھے ہیں۔ میرا اشارا رومانیہ کی طرف ہے۔ یہ عالمی فارمولا میرے نام سے منسوب کرتے وقت، جسے وہ لایعنی کہتے ہیں، میرے نقاد اس حقیقت سے مکمل طور پر بے خبر رہتے ہیں کہ اس وقت سوویٹ یونین کے تعلقات بہت سے ممالک کے ساتھ اس ''لا یعنیت'' کی بنیاد پر چل رہے ہیں۔

اب جب کہ برسٹ-لٹووسک کا قصہ ایک داستان پارنیہ بن چکا تھا تو لینن نے اسے کیوں یاد رکھا ہوا تھا۔ لینن اپنے اور میرے داستان اختلافات کو قابل ذکر نہیں سمجھتا تھا۔ لیکن اسے متعدد دفعہ ''برسٹ-لٹووسک مذاکرات'' کی زبردست پراپیگنڈا اہمیت کا ذکر کیا تھا۔ (مثلاً 17 مارچ 1918ء والی اس کی تقریر) امن کے ایک سال بعد اس نے پارٹی کانگریس میں کہا تھا۔ ''مغربی یورپ اور دوسرے ممالک سے ہماری تنہائی نے ہمیں اس قابل نہیں رہنے دیا کہ ہم وہاں کی معاشی ترقی یا مغرب میں پرولتاری انقلاب کی رفتار دیکھ سکیں۔ اس ساری پیچیدہ صورتحال کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ برسٹ-لٹووسک ست پیدا ہونے والے امن نے ہماری پارٹی کے اندر بہت سارے اختلافات رائے کو جنم دے دیا ہے۔'' (18 مارچ 1919ء کی تقریر)

اب ان دنوں کے نقادوں اور دشنام طرازوں کے طرز سلوک کا سوال باقی رہ جاتا ہے۔ بخارن ایک ال تک لینن اور مجھ سے سخت لڑتا اور پارٹی کو تقسیم کرنے کی دھمکی دیتا رہا۔ کوبی شیف، یاروسلووسکی، بئنوف اور کئی دوسرے جو اس وق سٹالن ازم کے ستون بنے ہوئے ہیں، اس کے ساتھ تھے۔ اس کے برعکس زینوشیف فوری طور پر امن معاہدے پر دستخط کرنے کے میں تھا لینن اور میں یک زبان ہو کر اس موقف کے خلاف تھے۔ کامینیف جب برسٹ-لٹووسک میں میرے پاس تھا تو اس وق میرے فارمولے سے اتفاق کرتا تھا۔ لیکن واپس آ کر وہ لینن سے مل گیا۔ ریکوف اس وق مرکزی کمیٹی کا رکن نہیں تھا۔ لہذا فیصلہ کن کانفرنس میں وہ شرکت نہیں کر سکتا تھا۔ ڈیژرنسکی لینن کے خلاف تھا مگر ووٹ

ڈالتے وق اس سے مل گیا۔ آخر سٹالن کی حیثیت کیا تھی؟ حسب معمول کچھ بھی نہیں۔ وہ انتظار کر اور صورتحال کو تول رہا تھا۔ ''یہ بڈھا ابھی تک امن کی امید لگائے بیٹھا ہے۔'' وہ سر ہلا کر لینن کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے کہتا۔ ''اسے امن نہیں مل سکتا۔'' پھر وہ لینن کے پاس جاتا اور کچھ اسی قسم کی بات میرے متعلق کرتا۔ وہ عوام کے سامنے کبھی زبان نہ کھولتا۔ کسی کو بھی اس کے تضادات میں دلچسپی نہیں تھی۔ میرا بڑا مقصد عالمی پرولتاریہ کو بہترین انداز میں امن کا مسئلہ سمجھانا تھا۔ سٹالن کیلئے یہ مسئلہ ثانوی حیثیت رکھتا تھا۔ اسے ''ایک فلک میں امن'' سے دلچسپی تھی' جیسے بعد میں وہ ''ایک ملک میں سوشلزم'' کے حق میں تھا فیصلہ کن ووٹ میں وہ لینن کے ساتھ مل گیا۔ کئی برس بعد اس نے برسٹ-لٹووسک واقعات کے متعلق اپنا ایک خاص ''نقطہ نظر'' گھڑا۔ اور وہ بھی ٹراٹسکی ازم کے خلاف جدوجہد کے وقت۔

ان سب باتوں کا زیادہ ذکر کرنا اب ضروری نہیں رہا۔ میں نے برسٹ-لٹووسکو واقعات پر اختلافات رائے پر کچھ زیادہ ہی وقت صرف کر دیا ہے۔ لیکن ایک قابل بحث قصے کو اس کے پورے سیاق و سباق میں مکمل طور پر بیان کرنا ضروری ہے تاکہ یہ پتا چل سکے کہ اصل بات کیا تھی اور بعد میں سے کیا بنا دیا گیا۔ اس کا دوسرا مقصدہ ہے کہ حاسدوں متعصب لوگوں کو ان کے اصلی مقام پر رکھ دیا جائے جہاں تک لینن کا تعلق ہے' کوئی بھی سنجیدہ آدمی اس بات پر شک نہیں کرے گا کہ اس کی طرف میرا رویہ ایک ایسے جزبے پر مشتمل تھا جسے جرمن اپنی زبان میں ''Rechthalevei'' کہتے ہیں۔ برسٹ-لٹووسکو واقعات میں لینن کا کیا حصہ تھا' سب سے پہلے میں نے اس کے متعلق عوام میں بات کی تھی۔ 3 اکتوبر 1918ء کو سوویت حکومت کے بالائی اداروں کی ایک غیر معمولی مشترکہ میٹنگ میں میں نے کہا تھا۔ ''میں اس بااختیار اجتماع میں یہ بتانا اپنا صرض سمجھتا ہوں کہ ایک ایسے وقت میں جب ہم میں سے بہت سے لوگ جن میں میں بھی شامل ہوں' اس سوچ میں مبتلا تھے کہ برسٹ-لٹووسک امن معاہدے پر دستخط کرنا دانائی ہوگی کہ نہیں' فقط کامریڈ لینن بڑی دور بین نگاہ سے ہماری مخالفت کے باوجود عالمی پرولتاریہ کو انقلاب سے جوڑے رکھنے کی خاطر اس معاہدے پر دستخط کرنے کے حق میں تھا۔''

لینن نے برسٹ-لٹووسک میں جس طرح پرولتاریہ کی آمریت کو بچایا اور جس طرح بعد کی نسل نے اسکی ذہانت کا اعتراف کیا' اس کا انتظار کیے بغیر میں نے پہلے ہی سب کچھ کہہ دیا ہے۔ جو الفاظ میں نے ابھی ابھی کہے ہیں ان میں میں نے اپنے حصے کے علاوہ دوسروں کی بہت سی غلطیاں اپنے ذمے لے

لی ہیں۔ میں نے ایسا دوسروں کو مثال بن کر دکھانے کیلئے کیا ہے۔ سیٹو گرافر کے نوٹس نے بتاتے ہیں کہ اس موقع پر دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔ اس طرح پارٹی نے لینن کی طرف میرے رویے کی تعریف کا ثبوت مہیا کر دیا۔ ایک ایسا رویہ جو حسد یا چھوٹی موٹی کدورتوں سے پاک تھا۔ میں ہی جانتا تھا کہ لینن انقلاب، تاریخ اور مجھے کس طرح سمجھتا تھا۔ وہ میرا آقا تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں اس کے الفاظ اور حرکات وسکنات کی نقل کرتا تھا۔ میں نے تو اس سے آزادانہ طور پر اس جیسا فیصلہ کرنا سیکھا تھا۔

سوی یازسک میں ایک ماہ

1918ء کی سرمیں اور موسم بہار غیر عمومی طور پر سخت ثابت ہوئے۔ جنگ کے مابعد اثرات نے خود کو محسوس کرانا شروع کر دیا تھا۔ بعض اوقات یوں محسوس ہوتا جیسے ہر چیز پھسل رہی تھی، ٹوٹ رہی تھی، سہارے لینے کو کچھ نہیں بچا تھا۔ حیرت ہوتی تھی کہ ایک ایسا خستہ حال ملک، معاشی طور پر تباہ، سماجی لحاظ دسے برباد -- کیا اس میں اتنا دم رہ گیا تھا کہ آزادرہ کر ایک نئی حکومت کو سہارا دے سکے۔ خوراک کہیں نہیں تھی، فوج کہیں نہیں تھی، ریلوے بدحالی کا نمانہ بن گئی تھی۔ حکومت کی مشینری نئی شکل لے رہی تھی۔ ہر جگہ سازشیں پل رہی تھیں۔

مغرب میں جرمنوں نے پولینڈ، لتھونیا، لٹویا، سفید فام روس اور عظیم روس کے ایک بڑے حلے پر قبضہ کر لیا تھا۔ پسکوف ان کے ہاتھوں میں تھا۔ یوکرائن آسٹرو- جرمن نوآبادی بن گیا تھا۔ 1918ء کے موسم سرما میں دریائے وولگا کے کنارے پر فرانس اور برطانیہ کے ایجنٹوں نے سابق جنگی قیدیوں پر مشتمل چیکوسلاواک رجمنٹ کو بغاوت پر اکسار کھا تھا۔ جرمن ہائی کمان نے اپنے فوجی نمائندوں کے ذریعے مجھے بتایا تھا کہ اگر سفید فام رجمنٹ پسندوں نے مشرق کی طرف سے ماسکو کی جانب پیش قدمی کی تو جرمن ایک نیا مشرقی محاذ قائم ہونے سے روکنے کیلئے مغرب میں اورشا اور پسکو کی جانب آگے بڑھیں گے۔ ہم ہتھوڑے اور درانتی کے درمیان پھنس گئے تھے اور ولودا کی طرف خطرناک طریقے سے بڑھ رہے تھے۔ یاروسلاول میں سفید فام گارڈوں نے شورش بپا کر دی تھی جن کے ساتھ ماؤنکوف تھا جو فرانسیسی سفیر لولنز اور برطانوی سفیر لاک ہارٹ کا چھو بنا ہوا تھا۔ اس شورش اور بغاوت کا مقصد یاروسلاول اور ولودا کے راستے سں الی فوجوں کو وولگا کے کنارے پر چیکوسلاواک کی فوجوں اور سفید فام گارڈوں سے ملا دینا تھا۔ یورال

میں ڈوٹوف کے ڈاکو دندناتے پھر رہے تھے۔ جنوب میں دریائے دون کے کنارے جنرل کراس نوف کی قیادت میں ایک شورش پھیل رہی تھی۔ جرنیل اس وقت جرمنوں کا اتحادی تھا۔ بائیں بازو کے سوشلسٹ انقلابیوں نے جولائی میں ایک سازش کے ذریعے کاؤنٹ مرباچ کو قتل کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے مشرقی محاذ پر ایک نئی شورش برپا کرنے کی کوشش کی۔ وہ ہمیں جرمنی سے لڑانا چاہتے تھے۔ کانہ جنگی پھانسی کے رسے کی طرح ماسکو کے گرد اپنا گھیرا تنگ کر رہی تھی۔

سمبرسک پر قبضہ ہو جانے کے بعد مجھے وولگا بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا جہاں ہمیں سب سے بڑا خطرہ درپیش تھا۔ میرے لئے ایک خاص ترین تیار کی گئی جو ان دنوں کوئی آسان بات نہیں تھی۔ ہر چیز غائب تھی۔ یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ ہر چیز کہاں تلاش کی جا سکتی تھی۔ آسان کام بھی مشکل بنتا جا رہا تھا۔ اس وقت میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس ٹرین میں مجھے اڑھائی برس گزارنے پڑیں گے۔ میں 7 اگست کو ماسکو سے روانہ ہوا' اور مجھے بالکل معلوم نہیں تھا کہ ایک دن پہلے قازان پر قبضہ ہو چکا تھا۔ راستے میں مجھے ہر پریشان کن خبر ملتی گئی۔ جلدی میں منظم کیے گئے سرخ دستے کسی لڑائی کے بغیر اپنی پوسٹوں سے ہٹ رہے تھے اور قازان کو دفاع کے بغیر چھوڑ دیا گیا۔ ان کا ایک حصہ غدار ثابت ہوا۔ دوسرے بے خبری میں مارے گئے اور گولیوں کی بوچھاڑ میں بھاگ گئے۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ نڈر-ان-چیف یا دوسرے کمانڈنگ افسر کہاں تھے۔ میری ٹرین سوی یازسک ٹھہر گئی تا قازان سے نزدیک ترین ریلوے سٹیشن تھا۔ وہاں پورا ایک ماہ انقلاب کی تقدیر ہوا میں معلق رہی۔ وہ ایک ماہ میرے لئے بہت بڑا تربیتی سکول ثابت ہوا۔

سوی یازسک میں موجود فوج ان رجمنٹوں پر مشتمل تھی۔ جو سمبرگ اور قازان سے پسپائی اختیار کر کے آئی تھیں۔ ان میں وہ یونٹ بھی شامل تھے جو ان کی مدد کیلئے چاروں طرف سے بلائے گئے تھے۔ ہر یونٹ کی اپنی منفرد زندگی تھی۔ ان میں ایک شے مشترکہ تھی' اور وہ تھی پسپائی پر رضامندی۔ دشمن تنظیم اور تجربے دونوں لحاظ سے ان سے برتر تھا۔ بعض سفید فام کمپنیاں ایسے افسروں پر مشتمل تھیں جنہوں نے معجزے کر دکھائے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہاں کی زمین ہی سے افراتفری اگ رہی تھی۔ سرخ فوج کے تازہ یونٹ یہاں بڑے ولولے کے ساتھ آتے مگر آتے ہی پسپائی کی عادت اپنا لیتے۔ یہاں کے کسانوں میں یہ افواہ پھیل گئی تھی کہ سوویٹیں ختم ہو جائیں گی۔ پادریوں اور تاجروں نے پھر سے اپنے سر اونچے کر لیے تھے۔ دیہاتوں میں انقلابی عناصر چھپ گئے تھے۔ ہر چیز بکھر رہی تھی۔ ٹھہرنے کو زمین نہیں مل رہی

تھی۔صورتحال بڑی مایوس کن تھی۔

اس چھوٹے سے خطہ زمین کی انسانی تاریخ میں بہت سے متضاد اور مختلف نوعیت کے عناصر ملتے تھے۔ جو یہاں دکھائی جانے والی بزدلی کے خلاف جاتے تھے۔اصل بات یہ تھی کہ یہاں قانون بہت کمزور پڑ چکا تھا۔جس کے سبب یہاں لوگوں کی زندگیاں کسی جذبے سے محروم ہو چکی تھیں۔کیا اس سے زیادہ کوئی چیز انقلاب کے خلاف جاسکتی تھی؟ سوی یازسک کا علاقہ سکڑ کر ماسکو کی پرانی میونسپلٹی کی حدود جتنا رہ گیا تھا۔اس کی اپنی کوئی فوج ہی نہیں تھی۔اسے چاروں طرف سے دشمن نے گھیر رکھا تھا۔قازان کے بعد نجنی نوگوراڈ کی باری آجاتی تھی اور وہاں سے سیدھا ماسکو کو جاتا تھا۔انقلاب کی قسمت کا فیصلہ یہیں سوی یازسک میں ہی ہونا تھا۔اور یہ ایک بٹالین کی کارکردگی پر منحصر تھی۔قصہ مختصر سب کچھ ایک دھاگے سے معلق ہو کر رہ گیا تھا۔دن اور رات یہی صورت حال تھی۔

اس کے باوجود انقلاب کی بچالیا گیا۔آخر کس چیز کی ضرورت تھی؟ایک معمولی سی چیز کی۔عوام کی اگلی صفوں کو صورتحال میں پوشیدہ خطرے محسوس کرنے کی ضرورت تھی۔پہلی ضرورت یہ تھی کہ کوئی چیز چھپائی نہ جائے۔کم از کم اپنی کمزوریاں۔عوام کو ناچیز نہ سمجھا جائے بلکہ ان کو ان کے صحیح نام سے پکارا جائے۔انقلاب ابھی تک بڑا غیر ذمہ دار واقع ہوا تھا۔اکتوبر کی فتح آسانی سے حاصل کر لی گئی تھی۔مگر اس نے اپنے راستے کی کوئی رکاوٹ ابھی تک نہیں ہٹائی تھی۔اگرچہ دباؤ میں تھوڑی سی کمی آ گئی تھی۔دشمن کی فوج منظم تھی اور اسی وجہ سے کامیابیاں حاصل کر رہی تھی۔ہم میں اسی چیز کا فقدان تھا۔لیکن انقلاب اب یہی کمی پوری کر رہا تھا۔

سوی یازسک سے ٹیلی گراف کے ذریعے سارے ملک میں پراپیگنڈا پھیلایا جا رہا تھا۔سوویٹوں' پارٹی اور ٹریڈ یونینوں سے کہا جا رہا تھا کہ وہ تازہ یونٹ بھرتی کریں اور ہزاروں کی تعداد میں کمیونسٹ قازان کے محاذ پر روانہ کریں۔پارٹی کے بہت سے نوجوانوں کو اسلحہ چلانا نہیں آتا تھا لیکن ان کے اندر جیتنے کا جذبہ تھا اور یہی سب سے اہم چیز تھی۔وہ کمزور فوج میں ریڑھ کی ہڈی بن گئے۔

مشرقی محاذ کا کمانڈر-ان-چیف کرنل وٹنیرٹس تھا جو لٹوین رائفلز کا کمانڈر رہا تھا۔پرانی فوج میں سے یہی ایک یونٹ رہ گیا تھا۔لٹویا کے مزدور اور غیر کسان بالٹک کے سرداروں سے نفرت کرتے تھے۔زار نے جرمنوں سے لڑائی میں اسی چیز سے فائدہ اٹھایا تھا۔لٹوین رجمنٹیں زار کی فوج کا بہترین حصہ تھیں۔

فروری انقلاب کے بعد وہ ایک آدمی کی وساطت سے بالشویک اثر کے تحت آ گئی تھیں اور اکتوبر انقلاب میں انہوں نے بڑا اہم کردار انجام دیا تھا۔ وٹ زی ئس بٹا جوشیلا اور بارسوچ شخص تھا۔ وہ بائیں بازو کے سوشلسٹ انقلابیوں میں نمایاں حیثیت کا مالک تھا اس نے سازشوں کے ہیڈکوارٹرز کے سامنے چند ہلکی توپیں نصب کر دیں۔ سازشی چند گولوں کی آواز سن کر پاؤں سر پر رکھ کر بھاگ گئے۔ مشرق میں غداری کی مہم کے بعد مورایوف کی جگہ وٹ زی ئس کو لگا دیا گیا۔ انقلاب کے نازک دنوں میں اس نے بڑی سرگرمی سے اپنے فرائض انجام دیے تھے۔ جہاں دوسرے سرکاری افسر اپنے اختیارات کی حدود سے تجاوز کرنے سے ڈرتے تھے، وی زی ئس ان کے مقابلے میں یوں حکم جاری کرتا جیسے سوویٹ کمساری اور مرکزی مجلس عاملہ کا کہیں وجود ہی نہیں تھا۔ کوئی ایک سال بعد اسے مشکوک قسم کے رابطوں اور منصوبے کے سبب نکال دیا گیا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس کے خلاف کوئی زیادہ سنجیدہ الزام نہیں تھا۔ شاید سونے سے پہلے وہ نپولین کی سوانح عمری پڑھتا ہے۔ اس نے اپنے کچھ خواب نوجوان افسروں کو بتا دیے۔ ان دنوں وٹ زی ئس فوجی اکیڈیمی میں پروفیسر ہے۔

6 اگست کو قازان سے پسپائی پر جب سفید فام سپاہی ہیڈکوارٹرز کی عمارت میں داخل ہو رہے تھے تو وہاں سے نکلنے والا یہ آخری آدمی تھا۔ وہ قازان سے سوی یازسک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ قازان تو اس کے ہاتھ سے جاتا رہا تھا مگر اس کا ولولہ اس کے پاس رہا۔ ہم نے بیٹھ کر اہم سوالوں پر غور کیا اور لٹوین افسر سلاون کو پانچویں فوج کا کمانڈر بنا دیا۔ اس کے بعد ہم نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ دیا۔ وٹ زی ئس سٹاف ہیڈکوارٹرز چلا گیا اور میں سوی یازسک ہی میں رہ گیا۔

میرے ساتھ ٹرین میں جو پارٹی ورکرز آئے تھے ان میں کوسیف نام کا ایک آدمی تھا۔ 1905ء کے انقلاب میں اس کی شمولیت کے سبب اسے ''پرانا بالشویک'' کہا جاتا تھا۔ اگلے دس برس وہ ایک بورژوا قسم کی زندگی گزارتا رہا۔ لیکن دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح وہ بھی 1917ء کے انقلاب میں واپس آ گیا۔ لینن اور میں نے چھوٹی موٹی سازشوں کی وجہ سے اسے فوجی زندگی سے ریٹائر کر دیا تھا۔ بعد میں سٹالن نے اسے فوری طور پر لے لیا۔ آج کل اس کا سب سے بڑا کام خانہ جنگی کی تاریخ کو غلط سیاق و سباق میں بیان کرتے رہنا ہے۔ سٹالن کے مکتبہ فکر کے دوسرے لوگوں کی طرح اسے بھی یاد نہیں رہتا کہ اس نے پیچھے کیا لکھا تھا۔ 1924ء کے آغاز میں جب میرے خلاف تحریک بڑے زوروں پر تھی تو

گوسیف نے ایک کاہل دورغ گو کا کردار انجام دیا۔ چھ برس پہلے وہ سوی یازسک میں تھا۔ اس زمانے کی اس کی یادیں ابھی تازہ تھیں جنہوں نے اسے ابتدا میں قدرے روکے رکھا۔ قازان سے پہلے کے واقعات کے بارے میں وہ کچھ اس طرح رقم طراز ہوتا ہے۔'' کامریڈ ٹراٹسکی کے آنے سے صورتحال میں فیصلہ کن تبدیلی آ گئی۔ جب کامریڈ ٹراٹسکی کی ٹرین گم نام سٹیشن سوی یازسک پہنچی تو فوج میں ایک نیا جذبہ بیدار ہو گیا۔

'' پہلے دن ہی سے یہ محسوس کیا جانے لگا جیسے ایک دم کوئی تبدیلی آ گئی تھی۔ سیاسی اور فوجی دونوں شعبوں میں۔ فوجی یونٹ دھڑا دھڑ پہنچنے لگے۔ پندرہ میل دور مقیم فوجی یونٹ بھی الرٹ ہو گئے۔ پہلی مرتبہ تنظیم نامی کوئی چیز دکھائی دینے لگی۔ اس وقت کامریڈ ٹراٹسکی کے مجوزہ سخت طریقے نافذ کرنے کی اشد ضرورت تھی۔ اب ترغیب کی ضرورت نہیں تھی اور نہ ہی اس کیلئے وقت تھا۔ کامریڈ ٹراٹسکی 25 دن سوی یازسک میں رہا۔ ان دنوں میں بہت زیادہ کام کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فوج میں ایک تنظیم اور جذبہ پیدا ہو گیا۔ پانچویں فوج ایک جنگ جو فوج میں بدل گئی اور اس نے قازان پر دوبارہ قبضہ کر لیا'' غداری کے گھونسلے فوج کے اندر ہی ہوتے ہیں۔ بلکہ ہر جگہ ہوتے ہیں۔ دشمن جانتا تھا کہ کہاں ضرب لگانی تھی' اور اس کا نشانہ بالکل درست ہوتا تھا۔ یہ بڑی حوصلہ شکن بات تھی۔ اپنے آنے کے فوراً بعد میں محاذ پر گیا اور فوج کا معائنہ کیا۔ فوج کی جو صورتحال تھی' ایک تجربہ کار افسر مجھ سے بیان کر رہا تھا۔ بے رحم ہواؤں نے اس کے چہرے کو کھردرا بنا دیا تھا۔ نیند سے اس کی آنکھیں تقریباً بند تھیں۔ اس نے مجھ سے لمحہ بھر کیلئے اجازت طلب کی۔ وہ فیلڈ ٹیلی فون پر کوئی آرڈر دینے گیا تھا۔ چند منٹ بعد جس جگہ پر ہم کھڑے تھے اس سے ذرا پرے دو بم کانٹے کی شکل میں گرے۔ تیسرا ہمارے بالکل نزدیک گرا۔ مجھے زمین پر لیٹنے کا بمشکل موقع مل سکا۔ وہ افسر چند قدم پرے بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ عجیب بات تھی کہ مجھے اس وقت کوئی شک نہ گزرا۔ میں نے اسے ایک اتفاق قرار دیا۔ دو سال بعد مجھے یہ واقعہ اپنی ساری تفصیلات کے ساتھ مجھے یاد آیا تو مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ افسر دولت کے روپ میں ایک دشمن تھا اور اس نے کسی ذریعے سے دشمن کو بتا دیا تھا کہ کہاں گولہ باری کرنی تھی۔ اس نے دہرا خطرہ مول لیا تھا۔ دشمن کی گولہ باری سے مارا جاتا یا پھر سرخ فوج کے ہاتھوں ہلاک ہو جاتا۔ میں نہیں جانتا بعد میں اسکے ساتھ کیا ہوا۔

میں اپنے ڈبے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ ہر طرف گولیاں چلنے لگیں۔ میں دروازے کی طرف بھاگا۔ سفید فام ہوائی فوج کا ایک ہوائی جہاز ہمارے اوپر چکر لگا رہا تھا۔ ظاہر ہے وہ ٹیرن کو نشانہ بنانا چاہتا تھا۔ تین بم خم دار شکل میں ایک دوسرے کے بعد گرے مگر وہ ٹرین کو نشانہ نہ بنا سکے۔ ٹرین کی چھت سے رائفلیں اور مشین گنیں دشمن پر گولیاں برسا رہی تھیں۔ ہوائی جہاز نظروں سے دور چلا گیا مگر گولیاں چلتی رہیں۔ یوں لگتا تھا جیسے ہر کسی نے شراب پی رکھی تھی۔ میں نے بڑی مشکل سے فائر بند کرائی۔ ممکن تھا اسی افسر نے ٹرین پر میری واپسی کے وقت سے دشمن کو آگاہ کر دیا تھا۔ یا پھر دشمن کے پاس دوسرے ذرائع بھی ہو سکتے تھے۔

انقلاب کی صورت جس قدر مایوس کن تھی، غداری کے امکانات اسی تناسب سے زیادہ تھے۔ لیکن خود کار پسپائی کے مرض پر جلد از جلد قابو پانے کی ضرورت تھی۔ اسی حالت میں آدمی کو خود پر یقین نہیں رہتا کہ وہ دشمن کے دوبدو کھڑا ہو کر اس کے سینے میں گولی مار سکتا ہے۔ میں اپنے ساتھ ٹرین پر ماسکو سے پارٹی کے پچاس نوجوان ورکرز لایا تھا۔ نا تجربہ کار ہونے کے باوجود انہوں نے جس بہادری اور جرات کا مظاہرہ کیا وہ حیران کن تھا۔ ان سے آگے والی پوسٹوں پر چوتھی لٹوین رجمنٹ تھی۔ تمام لٹوین رجمنٹوں میں یہ سب سے خراب تھی۔ وہ بارش میں کیچڑ میں لیٹے ریلیف مانگ رہے تھے مگر انہیں ریلیف کیسے دیا جاتا۔ رجمنٹ کے کمانڈر نے مجھے لکھ بھیجا کہ اگر انہیں ریلیف نہ دیا گیا اور ان کی جگہ دوسرے آدمی نے بھیجے گئے تو نتائج انقلاب کے حق میں خطرناک ہو سکتے تھے۔ یہ ایک دھمکی تھی۔ میں نے کمانڈر اور کمیٹی کے چیئر پرسن کو اپنے پاس ٹرین میں بلایا۔ وہ اپنی بات پر اڑے رہے۔ میں نے دونوں کی گرفتاری کا حکم جاری کر دیا۔ ٹرین کے رابطہ افسر نے آج کل کریملن میں کمانڈر ہے، دونوں سے ہتھیار لے لیے۔ اس وقت ٹرین میں ہم دونوں ہی تھے۔ باقی ورکرز محاذ پر لڑ رہے تھے۔ اگر وہ دونوں حکم عدولی کر دیتے اور محاذ سے اپنے دوسرے آدمیوں کو اپنے دفاع میں بلا لیتے تو صورتحال بے حد خراب ہو جاتی۔ ہمیں سویازسک دشمن کے حوالے کرنا پڑ جانا تھا اور وولگا کا پل بھی کھو دینا تھا۔ میری ٹرین پر قبضے کی صورت میں ہماری فوج کے حوصلے بالکل پست ہو جانے تھے۔ پھر دشمن کیلئے ماسکو تک کا راستہ بالکل صاف تھا۔ لیکن گرفتاریاں بلا چوں، چرا عمل میں آ گئیں۔ پھر فوج کی موجودگی میں میں نے دونوں پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلانے کا حکم سنا دیا۔ رجمنٹ اپنی پوسٹوں پر قائم رہی۔ بعد میں کمانڈر کی سزا کو قید سخت میں بدل دیا گیا۔

بالشویک وضاحت اور مثالوں کے ذریعے سپاہیوں کو سمجھانے اوران کے حوصلے بلند کرنے میں لگے رہتے۔لیکن ایسی مساعی سے فوج کے رویے میں ایک دم انقلابی تبدیلی کیسے پیدا ہوسکتی تھی؛ اورصورتحال اس کی اجازت بھی نہیں دیتی تھی۔ ہمیں اس سے زیادہ سخت اقدام کا فیصلہ کرنا پڑنا تھا۔ میں نے ایک حکم جاری کیا جوٹرین ہی میں پریس پر شائع ہوااورفوج میں تقسیم کیا گیا۔حکم یہ تھا۔''میں خبردار کرتا ہوں اگرکسی یونٹ نے آرڈر کے بغیر پسپائی اختیار کی تو پہلے اس کے کمساراور بعد میں کمانڈرکوگولی ماردی جائے گی۔ ان کی جگہ بہادر سپاہی مقرر کیے جائیں گے۔ بزدل؛ نامرداورغدار بھی گولی سے نہ بچ سکیں گے۔ یہ ساری سرخ فوج کی موجودگی میں میرا حلیفہ وعدہ ہے۔''

ظاہر تبدیلی ایک دم نہیں آتی تھی۔انفرادی گروہ کسی وجہ کے بغیر پسپائی اختیار کرتے رہے۔ یا پھر دشمن کے بھاری دباؤ کے تحت پیچھے ہٹ جاتے۔سوی یازسک چاروں طرف سے حملے کیلئے کھلا تھا۔وولگا کے کنارے ایک بھاپ کشتی سٹاف کیلئے تیار کھڑی تھی۔سٹاف ہیڈکوارٹرزاورسٹیمر کے درمیان دس آدمی ہر وقت سائیکلوں پرتیار کھڑے رہتے۔پانچویں فوج کی فوجی سوویٹ نے مجھے سٹیمر میں منتقل ہونے کا مشورہ دے دیا۔ یہ ایک اچھا مشورہ تھا۔لیکن اس پرعمل کرنے سے پہلے بے دل اور حوصلہ ہاری ہوئی فوج پر برا اثر پڑنا تھا۔عین اسی وقت صورت حال ایک دم خراب ہونی شروع ہوگئی۔جس تازہ رجمنٹ پرہم نے بھروسہ کررکھا تھا؛ وہ اپنے مورچے چھوڑکرآ گئی اوراس نے زبردستی سٹیمر پرقبضہ کرلیا جس نے نجنی-نوگوروڈھے جانا تھا۔

چونکاہٹ کی ایک لہر سارے محاذ پردوڑگئی۔ ہرکوئی دریا کی طرف دیکھنے لگا۔صورتحا تقریباً مایوس کن تھی۔سٹاف اپنی جگہوں پر کھڑا رہا۔دشمن ہم سے ایک یا دو کلومیٹر دور تھااوراسکے گولے ہمارے قریب پھٹ رہے تھے۔میں نے قابل اعتبار مارکن سے بات کی۔وہ چند بااعتمادلوگوں کواپنے اتھ لےکرایک گن بوٹ پرسٹیمر کی طرف گیااوراس پرقابض سپاہیوں کوبندوق کی نوک پرہتھیارڈالنے کوکہا؛ اس ایک لمحے پر ہر چیز کا انحصار تھا۔فقط ایک گولی کی آواز بڑی تباہی کا سبب بن سکتی تھی۔قابضین نے کسی مزاحمت کے بغیر ہتھیارڈال دیے۔سٹیمر دریا کے ایک طرف کھڑا کرکے وہ اتر گئے۔ میں نے ایک فیلڈ-ٹریبونل مقررکردیا جس نے کمانڈر؛ کمسار؛ اور چند دوسرے سپاہیوں کوموت کی سزاسنادی۔ میں نے کچھ چھپائے بغیر رجمنٹ کے سامنے صورتحال کی وضاحت کردی۔رجمنٹ میں کئی کمیونسٹ داخل کردیے گئے جوایک تازہ جذبے

اور نئے کمانڈر کے ساتھ واپس محاذ پر چلے گئے۔ سب کچھ اتنی سرعت سے ہوا کہ دشمن کو اس صورتحال سے فائدہ اٹھانے کا موقع ہی نہ مل سکا

ایک بحری سروس منظّم کرنے کی ضرورت تھی۔ میں نے ایک انجینئر - پائلٹ آ کاشف کو بلایا۔ اگرچہ وہ عقیدے کے لحاظ سے انتشار پسند تھا مگر پھر بھی ہمارے لیے کام کر رہا تھا۔ آ کاشف نے جلدی سے جنگی ہوائی جہازوں کے ایک سکواڈرن کا انتظام کر لیا جس کی مدد سے محاذ دشمن کی پوزیشن کی مکمل تصویر ہمارے سامنے آ گئی اور پانچویں فوج کی کام پر دشمنی کی پوزیشن واضح ہو گئی۔ جہاز ہر روز قازان پر حملے کرنے لگے جس سے شہر چوکنا ہو گیا۔ قازان پر دوبارہ قبضے کے بعد مجھے ایک بورژوا لڑکی کی ڈائری ملی جو اس سارے عرصے میں شہر میں محصور رہی تھی۔ ڈائری کے صفحات کے صفحات ہمارے ہوائی حملوں سے پیدا ہونے والی افراتفری سے بھرے ہوئے تھے۔ ان صفحوں کی بھی کمی نہیں تھی جو محبت میں اس کے حال دل کے ترجمان تھے۔ زندگی یونہی چلتی رہتی ہے۔ چیک افسر روسیوں سے شرطیں لگاتے رہے۔ قازان کے ڈرائنگ روموں میں معاشقے پلتے رہے اور محبت کرنے والے بم باری کے دوران میں پناہ گاہوں میں بیٹھے محبت کرتے رہے۔

28 اگست کو سفید فاموں نے ہماری فوج کے دونوں بازوؤں کی طرف سے حملہ کر دیا۔ کرنل کیپل جو بعد میں سفید فاموں کا نامور جرنیل بن گیا اس نے ہماری فوج کے عقبی حصے سے رات کی تاریکی میں داخل ہو کر ایک چھوٹے سے ریلوے سٹیشن پر قبضہ کر کے ریلوے لائن اور ٹیلی گراف پول تباہ کر دیے۔ پھر ہماری پسپائی کا راستہ روک کر وہ سوی یازسک کی طرف بڑھنے لگا۔ اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو اس کے سٹاف میں ساونکوف بھی شامل تھا۔ اس حملے نے ہمیں بے خبری میں ان لیا تھا۔ ہمیں خطرہ تھا کہ محاذ پر موجود ہماری فوج میں ابتری پھیل جائے گی۔ ہم نے دو یا تین کمپنیاں واپس بلا لیں۔ میری ٹرین کے کمانڈر نے ایک دفعہ پھر ہر ایک کو حرکت میں لانے کیلئے جوش دلانا شروع کر دیا۔ میرا باورچی بھی اس کام میں اس کے ساتھ تھا۔ ہمارے پاس رائفلوں، مشین گنوں اور دستی بموں کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود تھا۔ ٹرین کا عملہ بذات خود بڑا عمدہ جنگ جو تھا۔ وہ ٹرین سے ایک ورست کے فاصلے پر مورچے سنبھال کر بیٹھ گئے۔ لڑائی آٹھ گھنٹے جاری رہی۔ دونوں طرف سے نقصان ہوا۔ آخر دشمن پیچھے ہٹ گیا۔ اس عرصے میں ماسکو سے رابطے کی منقطعی نے ماسکو اور تمام دوسری لائنوں میں ہلچل پیدا کر دی۔ ہماری مدد کیلئے چھوٹے یونٹ

بھاگے۔تاروں کی جلد مرمت کردی گئی۔اس وق قازان کے اخبارات خبریں شائع کررہے تھے کہ مجھے گرفتار یا ہلاک کر کے ہوائی جہاز میں کہیں لے جایا گیا تھا۔

صبح کے تین بجے میں سٹاف ہیڈ کوارٹر کا دورہ کر رہا تھا۔وہ رات سوی یازسک پر بڑی بھاری تھی۔ میں نے سٹاف روم سے ایک مانوس آواز جو کہہ رہی تھی۔''وہ یہ کھیل اس وقت تک کھلتا رہے گا جب تک اسے قیدی نہیں بنالیا جاتا۔یادرکھو وہ خود بھی اور ہمیں بھی تباہ کردگا''میں دہلیز پر رک گیا۔میرے سامنے جنرل ستاف کے دونو جوان افسر میز پر ایک نقشے پر جھکے ہوئے تھے۔بولنے والے نوجوان کی پشت میری جانب تھی اور وہ میز پر جھکا ہوا تھا۔اس نے اپنے ساتھی کے چہرے پر چونکا دینے والی کوئی تحریر پڑھ لی اور ایک دم پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا۔وہ بلا گونزافوف تھا جوزار کی فوج میں سابق لفٹیننٹ تھا اور اب ایک بالشویک تھا۔شرم اور خوف کے ایک تاثر نے اس ے چہرے کو جکڑ لیا۔ایک کمسار کی حیثیت سے فوج کے حوصلے بلند رکھنا اس کا اخلاقی فرض تھا۔اس کے برعکس اس نازک وقت میں وہ فوج کو میرے خلاف کر رہا تھا یعنی فوج مجھے چھوڑ جائے۔میں نے اسے موقع پر پکڑ لیا تھا۔مجھے اپنی آنکھوں اور کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

1917ء کے دوران میں اس نے خود کو ایک جنگ جو انقلابی ثابت کیا تھا۔انقلاب کے ایام میں وہ پیٹر پال قلعے کا کمسار تھا۔بعد میں اس نے فوجی طلبا کی شورش کو کچلنے میں حصہ لیا تھا۔سمولنی کے دنوں میں میں اسے بڑے اہم فرائض سونپتا رہا جنہیں وہ خوش اسلوبی سے انجام دیتا رہتا تھا۔ایک دن اس کے متعلق میں نے مذاق میں لینن سے کہا تھا۔''کیا خبر اتنے اچھے لفٹیننٹ سے ایک نپولین برآمد ہو جائے۔اس میں سے ایک اچھا بلاگو-نزافوف (اچھی فطرت والا) بھی نکل سکتا ہے۔''لینن پہلے تو میرے اس غیر متوقع موازنے پر ہنس پڑا۔پھر اپنی گال کی ہڈی ہلاتے ہوئے کسی سوچ میں ڈوب گیا۔تھوڑی دیر بعد اس نے قدرے سنجیدہ ہوکر دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔''ہم بونا پارٹ کو سنبھال سکتے ہیں' کیا خیال ہے تمہارا؟''

''ہر چیز خدا کے ہاتھ میں ہے۔''میں نے مذاق میں جواب دیا۔یہ وہی بلا گونزفو تھا جسے میں نے اس وقت مشرق میں بھیجا تھا جب وہاں کے لوگ مورایوف کی غداری کی وجہ سے بے عمل ہو گئے تھے۔ جب کریملن میں لینن کے استقبالیہ کمرے نے مایوس لہجے میں جواب دیا تھا۔''اصل بات یہ ہے کہ

انقلاب زوال کی طرف جارہا ہے۔'' یہ 1918ء کے وسط کی بات ہے۔''کیا تم اتنی جلدی خرچ ہو گئے ہو؟'' میں نے غصے میں پوچھا۔ بلاگرنزفوف نے اپنے آپ کو ایک دم سنبھالا' اپنا لہجہ تبدیل کیا اور مجھ سے وعدہ کیا کہ اس سے جو کچھ بن پڑا کرے گا۔ میری تسلی ہوگئی۔

اور اب میں نے اسے ایک نہایت نازک وقت پر غداری کا مرتکب پایا تھا۔

ہم برآمدے میں چلنے لگے تا کہ افسروں کے سامنے کوئی بات نہ زیر بحث لائی جا سکے۔ بلاگونزافوف پیلا پڑ چکا تھا۔ وہ خوف سے کانپ رہا تھا اور بار بار ہاتھ سے اپنی ٹوپی چھو رہا تھا۔''مہربانی کر کے مجھے ٹربیول کے سامنے پیش نہ کریں۔'' وہ سخت پریشانی اور مایوسی کے حالت میں بار بار کہہ رہا تھا۔''اگر آپ نے مجھے واپس بھیجا تو میں قتل کر دیا جاؤں گا۔'' میری پیشن گوئی سچ ثابت نہیں ہوئی تھی۔ میں جسے نپولین دیکھنا چاہتا تھا وہ میرے سامنے ایک بھیگی ہوئی مرغی کی طرح سرنگوں کھڑا تھا۔ پھر اسے فوج سے خارج کر کے کسی معمولی کام پر لگا دیا گیا۔

انقلاب بڑے بڑے لوگوں کو نگل جاتا ہے۔ یہ بہادروں کو تباہی کی طرف لے جاتا ہے اور کم حوصلہ لوگوں کو برباد کر دیتا ہے۔ بلاگونزافوف آج کل حکمران ریاستی سیاسی بورڈ* کا رکن اور موجودہ حکومت کے ستونوں میں سے ایک ہے۔ جب وہ سوی یازسک میں تھا تو اس نے شاید اسی وقت''مستقل انقلاب'' سے نفرت کرنا سیکھ لیا ہوگا۔

اور اس وقت انقلاب کی تقدیر قازان اور سوی یازسک کے درمیان کہیں معلق تھی۔ وولگا کے سوا پسپائی کا کوئی نہیں رہ گیا

----

8 یہ روسی خفیہ پولیس سروس ہے۔ (مترجم)

تھا۔ فوج کی انقلابی سوویٹ نے مجھے اطلاع دی کہ میرے تحفظ کا مسئلہ فوج کی نقل وحمل میں رکاوٹ بن رہا تھا۔ لہذا مجھے دریا پر ایک جہاز میں منتقل ہو جانے کا مشورہ دیا گیا۔ فوج اس قسم کے مطالبے کی حق دار تھی کیونکہ میں نے سوی یازسک آتے ہی اسے بتا دیا تھا کہ وہاں میری موجودگی اس کیلئے کسی قسم کی پریشانی کا باعث نہیں ہونی چاہیے تھی۔ میں مختلف محاذوں پر اپنے قیام کے دوران میں اپنے اس اصول پر قائم رہا۔ لہذا میں نے اس کی بات مانتے ہوئے وولگا میں ایک مسافر جہاز میں منتقل ہونے کے بجائے ایک

تارپیڈو کشتی میں چلا گیا جو بڑی مشکل سے مارینسک کے نہری نظام کے ذریعے وولگا میں چلائی گئی تھی۔اس وقت تک دریا میں بعض سٹیمروں کو بھی توپوں اور مشین گنوں سے لیس کر دیا گیا تھا۔

راسکلینی کوف کی زیر کمان چھوٹا بحری بیڑہ اسی رات قازان پر حملے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔اسے دو بلند پشتوں کے درمیان سے گزرنا پڑنا تھا جس پر سفید فام فوج نے توپیں نصب کر رکھی تھیں۔ان بلند پشتوں سے پرے دریا بل کھا کر چوڑا ہو جاتا ہے اور وہیں دشمنی کا بھی چھوٹا بحری بیڑہ کھڑا تھا۔دوسری طرف قازان کھلا پڑا تھا۔منصوبہ یہ تھا کہ رات کی تاریکی میں بلند پشتوں سے گزر کر دشمن کے بیڑے اور توپوں کو تباہ کرنے کے بعد شہر پر گولہ باری کی جائے۔

بیڑہ ایک دزدِ شب کی طرح اپنی روشنیاں گل کر کے جنگی ترتیب میں چل پڑا۔وولگا کے دو پرانے جہاز ران کی ہلکی داڑھیاں تھیں' کپتان کے ساتھ کھڑے تھے۔بیڑے پر زبردستی لائے جانے پر وہ ہم سے نفرت اور اپنی تقدیر کو کوس اور بید مجنوں کی طرح کانپ رہے تھے۔اب ہر شے کا انحصار ان پر تھا۔ کپتان انہیں وقتاً فوقتاً یاد دلاتا رہتا کہ اگر جہاز کہیں زمین میں دھنس گیا تو وہ انہیں گولی مار دے گا۔ہم نے ایک بلند جگہ سامنے آ کر اندھیرے میں ذرا دکھائی دیے ہی تھے کہ دریا کی طرف سے ایک گولی کوڑے کی طرح ہماری طرف لپکی۔پھر پہاڑی سے ایک دوسری گولی نے اس کا تعاقب کیا ہم خاموشی سے آگے بڑھتے گئے۔ہمارے عقب سے گولی جواب دیا گیا۔پھر اس آہنی چادر پر گولیاں برسنے لگیں جسکے تحفظ میں ہم ''کپتان کے پل'' کے پاس کھڑے تھے۔ہم جھک گئے۔دونوں جہاز ران بھی نیچے ہو گئے۔وہ اپنی تیز نظروں سے اندھیرے کو ٹٹول رہے تھے اور کپتان سے تناؤ کے عالم میں سرگوشی کر رہے تھے۔بلند چشمے سے گزر کر ہم دریا کے قدرے باہر نکلے ہوئے کھلے حصے میں داخل ہو گئے۔ہم سے پرے دوسرے ساحل پر قازان کی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ہمارے عقب میں اوپر اور نیچے سے بھاری فائرنگ ہو رہی تھی۔

ہم سے کوئی دو سو گز دور دائیں جانب پہاڑی نما ساحل کے سائے میں دشمن کا بیڑہ کھڑا تھا اور اس کی کشتیاں کسی سائے کی طرح ادھر ادھر منڈلا رہی تھیں۔راسکلنی کوف نے کشتیوں پر پر گولیاں چلانے کا حکم دے دیا۔ہماری تارپیڈو اپنی ہی توپ کے پہلے گولے کی آواز سے گونج اٹھی۔ہم جھٹکے کھا کر آگے بڑھ رہے تھے۔جیسے توپ کی آہنی کوکھ گولیوں کو جنم دیتے وقت سخت قسم کے دردِ زہ میں مبتلا تھی۔پھر اچانک

رات کی ظلمت کو ایک تیز روشنی نے برہنہ کر دیا۔ ہمارے ایک گولے نے ایک گولے نے ایک تیل بردار کشتی میں آگ لگا دی تھی۔ وولگا پر ایک غیر متوقع مگر بے حد روشن مشعل جلنے لگی۔ اب ہم بھی بلند پشتے پر گولیاں چلانے لگے۔ پشتے پر توپیں موجود تھیں۔ مگر وہ ہمارا جواب نہیں دے رہی تھی۔ لگتا تھا توپچی بھاگ گئے تھے۔ دریا کا پورا پھیلاؤ روشن ہو چکا تھا۔ ہم دیکھ رہے تھے کہ ہماری عقب میں آنے والی ہماری کشتیوں کا راستہ تھا روک لیا تھا۔ ہماری تارپیڈو کشتی دریا کے پل پر یوں کھڑی تھی جیسے سفید پلیٹ پر کوئی مکھی بیٹھی ہو۔ لگ رہا تھا کہ دونوں پشتوں پر سے ہم پر فائرنگ شروع ہو جائے گی۔ ہم آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔ مسئلہ یہ آن پڑا کہ ہم اپنی کشتی پر سے کنٹرول کھو بیٹھے۔ اس کا سٹرینگ ٹوٹ گیا تھا۔ شاید گولی لگی تھی۔ ہم نے اسے ہاتھ سے گھمانا چاہا مگر اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ پھر ہم نے اس کے انجن بند کر دیے۔ کشتی آہستہ آہستہ قازان کے ساحل کی طرف جا رہی تھی کہ ایک ڈوبی ہوئی مال بردار کشتی سے ٹکرا گئی۔ فائرنگ ایک دم بند ہو گئی۔ ہر طرف دن جیسی روشنی اور رات جیسی خاموشی تھی۔

ہمیں ایک دم احساس ہوا کہ ہم پھندے میں پھنس کر رہ گئے تھے۔ ایک بات جو ناقابلِ فہم تھی یہ تھی کہ ہم پر گولہ باری نہیں ہو رہی تھی۔ ہمارے حملے نے جو تباہی مچائی تھی ہمیں اس کا اندازہ نہیں تھا۔ دونوں نوجوان جہاز رانوں نے کشتی کے دائیں اور بائیں انجن کا باری باری چلا کر اسے ڈوبی ہوئی کشتی سے باہر نکالنے اور اس کی حرکت کو باقاعدہ بنانے کا فیصلہ کیا۔ یہ طریقہ کامیاب ثابت ہوا۔ تیل بردار کشتی کی مشعل ابھی تک روشن تھی۔ ہم پشتے کی طرف چل پڑے۔ ادھر سے کوئی گولی نہیں آ رہی تھی۔ پشتے کے گرد چکر لگا کر ہم دوبارہ اندھیرے میں چلے گئے۔ ایک جہاز ران بے ہوش ہو گیا۔ اسے انجن روم سے باہر لایا گیا۔ پہاڑی پر نصب توپ نے ہم پر کوئی گولہ نہ چلایا۔ ظاہر ہے ہماری نگرانی نہیں ہو رہی تھی۔ شاید ہماری نگرانی کرنے والا کوئی تھا ہی نہیں۔ لگتا تھا ہم بچ گئے تھے۔ لفظ ''بچ گئے'' لکھنا اب کس قدر آسان لگتا ہے۔ پھر ہم نے اطمینان سے سگریٹ جلا لیے۔ ہماری ایک خود ساختہ گن بوٹ کا جلا ہوا ڈھانچہ افسردگی کی حالت میں ساحل پر پڑا تھا۔ دوسری کشتیوں میں چند زخمی آدمی پڑے تھے۔ ہمیں معلوم ہوا کہ ہماری تارپیڈو کشتی کے سٹرینگ میں تین انچ لمبی گولی چھید گئی تھی۔ اس وقت صبح نمودار ہو رہی تھی۔ ہم سب کو یوں لگا جیسے ہم نے ایک نیا جنم لیا تھا۔

ایک چیز کے تعاقب میں دوسری چیز تھی۔ ایک ہواباز جو ابھی ابھی جہاز لے کر اترا تھا' ایک اچھی خبر

لایا تھا۔شمال مشرق سے ایک دوسری فوج کا ایک دستہ کاسک آ زن کی قیادت میں قازان پہنچ گیا تھا۔اس نے دو بکر بند گاڑیاں اور دو توپیں تباہ کر دی تھیں اور دشمن کے ایک دستے کو روندکر قازان سے بارہ میل دور دو دیہات پر قبضہ کر لیا تھا۔ ہواباز چند ہدایات اور ایک اپیل لے کر واپس چلا گیا۔ قازان اب ہماری گرفت میں تھا۔جیسا کہ ہمارے جاسوسوں نے ہمیں بتایا'ایک شب خون نے سفید فام فوج کی مزاحمت کے پرخچے اڑا دیے تھے۔ دشمن کا بحری بیڑہ تقریباً تباہ اور اس کی ساحلی توپیں خاموش ہوگئیں۔سفید فاموں''تارپیڈو-کشتی'' کا وہی اثر اہوا جو کچھ عرصہ پہلے لفظ''ٹینک'' کا پیٹروگراڈ میں ہوا تھا۔ یہ افواہیں پھیل گئیں کہ جرمن بالشویکوں کے ساتھ مل کر لڑ رہے ہیں جس پر خوشحال طبقہ قازان سے بھاگنے لگا۔ضلعی محنت کشوں کے سراوپر کو اٹھ گئے۔ دشمن بارودخانے میں بغاوت ہوگئی۔ ہماری فوج کے اندر زبردست روح بھر گئی۔

سوی یازسک میں میرا ایک ماہ کا قیام پر ہیجان واقعات سے بھرا ہوا تھا۔ ہر روز کچھ نہ کچھ وقوع پذیر ہو جاتا۔اس سلسلے میں راتیں بھی دونوں سے پیچھے نہیں تھیں۔ میں نے جنگ تو پہلی مرتبہ اس درقریب سے دیکھا تھا۔اگرچہ یہ ایک چھوٹے پیمانے کی جنگ تھی۔ ہمارے پاس پچیس سے تیس ہزار سپاہی تھے۔لیکن بڑی اور چھوٹی جنگ میں پیمانے ہی کا فرق ہوتا ہے۔ہم نے جو جنگ لڑی تھی وہ ایک زندہ نمونہ تھی۔ہم نے اس کا اتار چڑھاؤ اور حیرتیں براہ راست محسوس کی تھیں۔ یہ ایک چھوٹی سی جنگ میرے لئے ایک بڑی تربیت گاہ ثابت ہوئی۔

اس دوران میں قازان میں صورتحال حیران کن طور پر بدل گئی۔بکھرے ہوئے فوجی دستے باقاعدہ یونٹ بن گئے۔ پیٹروگراڈ'ماسکو اور دوسری جگہوں سے کمیونسٹ محنت کشوں کے دستے پہنچنے لگے۔رجمنٹوں میں ایک تیزی آ گئی۔ یونٹوں کے اندر کمساروں کو انقلابی راہنماؤں جیسی اہمیت حاصل ہوگئی اور وہ پرولتاری آمریت کے براہ راست نمائندے بن گئے۔ٹربیونلوں کے اندر بتایا جانے لگا کہ جب انقلاب کو جان کا خطرہ پیش آ جائے تو یہ بڑی قربانیاں طلب کرتا ہے۔ پراپیگنڈا'تنظیم'انقلابی مثال اور دباؤں نے چند ہفتوں میں ضروری تبدیلی پیدا کر دی۔ایک بے حوصلہ اور مردہ ہجوم ایک حقیقی فوج میں بدل گیا۔ ہمارے توپ خانے نے نمایاں طور پر اپنی برتری ثابت کر دی تھی۔ دریا پر ہمارے بحری بیڑے کا تسلط قائم ہوگیا تھا۔ ہمارے ہوابازوں نے ہوا پر قبضہ جما لیا تھا۔اب قازان کا دوبارہ ہمارے پاس آنا شک سے

باہر ہوگیا تھا۔

یکم ستمبر کو اچانک ماسکو سے تار آ گیا۔ ''فوراً پہنچو ولادیمیر ایلچ زخمی ہوگیا ہے۔ زخم کس قدر گہرا ہے ابھی پتا نہیں چلا۔ مکمل امن و امان ہے۔'' میں فوراً چل پڑا۔ ماسکو میں پارٹی حلقوں کا موڈ غمگین اور دکھ بھرا تھا۔ لیکن راہنما اور کارکن غیر متزلزل تھے۔ اس کی بہترین مثال ہورڈ لوف تھا۔ ڈاکٹروں نے بتا دیا کہ لینن کی زندگی خطرے سے باہر تھی اور وہ جلد ہی صحت یاب ہو جائے گا۔ میں نے پارٹی کو مشرق میں کامیابی کے امکانات سے حوصلہ دیا اور سوی یازسک واپس چلا گیا۔

10 ستمبر کو قازان پر ہمارا دوبارہ قبضہ ہوگیا۔ دو دن بعد ہماری پہلی فوج نے سمبرسک بھی لے لیا۔ تھکاوسکی نے اگست کے آخر میں وعدہ کیا تھا کہ وہ 12 ستمبر تک سمبرسک پر قوضہ کرلے گا۔ قصبے کو ہاتھ میں لینے کے بعد اس نے تار بھیجا۔ ''حکم کی تعمیل ہوگئی ہے۔ سمبرسک پر قبضہ کرلیا گیا ہے۔'' اس اثنا میں لینن صحت یاب ہو رہا تھا۔ اس نے خوشی سے بھرپور مبارک باد کا تار بھیجا۔ محاذ پر حالات بہتر ہو رہے تھے۔

پانچویں فوج کی کمان اب ایوان نکیتچ سمرنوف کے ہاتھ میں تھی۔ اس کی بہت اہمیت تھی۔ سمرنوف ایک مکمل اور عمدہ انقلابی تھا۔ وہ تیس سال پہلے ہمارے ساتھ آیا تھا اس نے کبھی کوئی رعایت طلب نہیں کی تھی۔ پہلے انقلاب کی ناکامی کے تاریک ترین دنوں میں وہ زیر زمین کام کر کے پیغامات بھیجتا رہا تھا۔ جب اس کے پیغامات پکڑے جاتے تو وہ حوصلہ نہ ہارتا اور نئے سرے سے کام شروع کر دیتا۔ سمرنوف ایک فرض شناس انسان تھا۔ اس لحاظ سے ایک انقلابی ایک اچھا سپاہی بھی ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ ایک اچھا انقلابی بھی ثابت ہوتا ہے۔ ایوان نکیتچ اپنی فطرت کے تقاضوں کے مطابق چلتا تھا اور بے رحمی کے بغیر بہادری کا ایک نمونہ تھا۔ فوج کے دوسرے عمدہ نوجوان بھی اس کے نقش قدم پر چلنے لگے۔ ''ایوان نکیتچ سے زیادہ کسی کی عزت نہیں ہے۔'' لاریئیسہ رسنر نے قازان کے محاصرے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا۔ ''وہ ہر نازک لمحے میں استحکام اور بہادری کا نمونہ ثابت ہوتا۔'' سمرنوف میں ذرا سا بھی تفع نہیں ہے وہ بڑا مہذب، خوش مزاج اور لطیف حس رکھنے والا آدمی ہے۔ لوگ اس کی تعظیم کرتے ہیں کیونکہ اس کی عزت کسی تنازع سے باہر ہے۔

پانچویں فوج کے نوجوانوں کے سمرنوف کی وجہ سے ایک الگ شناخت حاصل کر لی تھی۔ چند برس بعد اس فوج کی تحلیل کے بعد بھی آج یہی کیا جاتا ہے۔ ''وہ پانچویں فوج کا آدمی ہے۔'' انقلاب کو

کامیاب بنانے میں ان الفاظ کا ایک خاص مطلب ہے۔سمرنوف ایک بے لوث اور فرض شناس انسان ہے۔خانہ جنگی ختم ہونے پر ایوان نکیتچ اور اس کے آدمی ملک کی معاشی ترقی میں جت گئے۔سمرنوف کو فوجی صنعت کا سربراہ بنادیا گیا۔پھر پوسٹ اینڈ ٹیلی گراف کی کمساری بھی اس کے پاس آ گئی۔آج کل وہ کا کیتیا میں میں جلاوطنی کے دن گزار رہا ہے۔پانچویں فوج کے بہت سے بہادر اس کے ساتھ جلاوطنی یا جیل میں ہیں۔واقعی انقلاب بڑے بڑے آدمیوں اور کرداروں کو نگل جاتا ہے۔سمرنوف کے بارے میں آخری رپورٹ یہ ہے کہ وہ جدوجہد سے ٹوٹ چکا ہے اور ہتھیار ڈالنے پر آمادہ ہوگیا ہے۔

لاریئیسہ رسز جس نے سمونوف کو''سوی یازسک کا ضمیر'' کہا تھا' خود بھی پانچویں فوج کی ایک نمایاں ہستی تھی اور انقلاب کی کامیابی میں اس کا بڑا کردار تھا۔وہ انقلاب کے آسمان پر ایک روشن ستارے کی مانند نمودار ہوئی اور اس کی چمک نے بہت سوں کو اندھا کردیا۔وہ ایک اولمپک دیوی تھی۔اس کے اندر ایک جنگ جو سپاہی جیسی بہادری تھی اور اس کا ذہن بڑا باریک بین تھا۔قازان پر سفید فاموں کے قبضے کے بعد وہ ایک کسان عورت کے بیس میں دشمنوں کے راز لیتی رہی۔مگر غیر معمولی خدوخال کی مالک تھی لہذا پکڑی گئی۔جب جاپانی خفیہ سروس کا ایک افسر اس سے پوچھ گچھ کررہا تھا تو ایک وقفے کے دوران میں نگرانی پر مامور عملے کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر وہ دروازے سے باہر کھسک گئی اور غائب ہوگئی اس کے بعد وہ جاسوسی کے کام میں لگ گئی۔پھر جنگی کشتیوں میں سوار ہوکر لڑائیوں میں حصہ لینے لگی۔خانہ جنگی پر اس کی تحریریں ادب کا عمدہ نمونہ ہیں۔وہ اسی جذبے کے ساتھ یورال کی صنعتوں اور رہور کے محنت کشوں کے متعلق بھی لکھتی ے۔وہ ہر ایک سے ملنے اور ہر کام میں حصہ لینے کی خواہش برسوں ہی میں وہ ایک بہترین ادیب بن گئی۔لیکن گرم اور سرد پانیوں سے گزرنے کے بعد انقلاب کا یہ روشن ستارہ ماسکو کے پرامن گردو نواح میں جل کر راکھ ہوگیا۔وہ ایک مہلک بیماری میں مبتلا ہوگئی۔ابھی وہ تیس برس کی بھی نہیں ہوئی تھی۔

ایک اچھا ورکر دوسرے اچھے ورکر سے ملنا پسند کرتا ہے۔خاک وخون کی آزمائشوں میں آدمی ایک ہفتے ہی میں بہت کچھ سیکھ جاتا ہے۔فوج بڑی عمدگی سے تیار ہورہی تھی۔قازان ہمارے ہاتھ میں آجانے کے بعد انقلاب کا نچلا طبقہ ہمارے پیچھے تھا۔کسانوں میں بھی ایک زبردست تبدیلی نمودار ہورہی تھی۔اگلے ساتھ ماہ میں سرخ فوج نے تقریباً دس لاکھ مربع کلومیٹر علاقے پر قبضہ کرلیا جس میں چار کروڑ لوگ آباد تھے۔انقلاب اب پھر آگے کی سمت بڑھنے لگا تھا۔سفید فام قازان سے بھاگتے وقت وہاں سے

جمہوریہ کا سونے کا خزانہ بھی ساتھ لے گئے۔ یہ خزانہ فروری میں جنرل ہوف مان کے حملے کے وقت وہاں رکھا گیا تھا۔ بہت بعد یہ دوبارہ ہمارے پاس آ گیا۔اس کے ساتھ ہی ایڈمرل لو لچک کو بھی گرفتار کرلیا گیا۔
جب آخر کار مجھے سوی یا زسک کے معاملات سے آنکھ اٹھانے کی مہلت ملی تو میں نے دیکھا یورپ میں خاصی تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ جرمن فوج بڑی مایوس کن اور خراب حالت میں تھی۔

ٹرین

اب فوجی انقلابی کونسل کے چیئرمین کی ٹرین کا ذکر کرنے کا وقت آ گیا ہے۔انقلاب کے سخت برسوں میں میری زندگی اس ٹرین کی زندگی سے نا قابل علیحدگی جڑ گئی تھی۔دوسری طرف ٹرین کو سرخ فوج کی زندگی سے کسی طرح الگ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ٹرین نے محاذ جنگ کو عقبی لائن سے جوڑا ہوا تھا۔ یہ اہم جنگی نوعیت کے مسائل موقع پر ہی حل کر دیتی تھی۔ یہ ایک تربیت گاہ بھی تھی اور سزا بھی جزا کا مرکز بھی۔
پاداش کے بغیر فوج کی تعمیر ممکن نہیں ہے۔ جب تک فوج کے اندر سخت سزائیں رائج نہ کی جائیں عوام موت کے منہ میں جانے کو تیار نہیں ہوتے۔ ہوتا یہ ہے کہ سپاہی عموماً محاذ جنگ پر لڑتے ہیں اور افسر پیچھے رہ کر انہیں ہدایات جاری کرتے رہتے ہیں۔افسروں کا عقب میں رہنا ناگزیر ہوتا ہے۔لیکن فوجوں کی تعمیر خوف پر تو نہیں کی جاسکتی۔زار کی فوج اس لیے تباہ نہیں ہوئی تھی کہ اس کے اندر پاداش کا نظام نہیں تھا۔کرنسکی نے فوج کے قوانین ہی سے موت کی سزا ختم کر کے سے تباہ کر دیا تھا۔ جنگ کی راکھ سے بالشویکوں نے ایک نئی فوج بنائی تھی۔ جو شخص روسی تاریخ کا علم رکھتا ہے اسکے لئے یہ مسئلہ کسی وضاحت کے ساتھ بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔نئی فوج کو مضبوط کرنے اور جوڑنے والا مسالہ انقلاب کا نظریہ تھا اورٹرین نے اس مسالے کی سپلائی محاذ پر جاری رکھی ہوئی تھی۔
کالوگا، دوری نژ اور ریزان کے صوبوں میں لاکھوں نوجوان کسان سوویٹوں کی پہلی آواز پر فوج میں بھرتی ہونے کیلئے نہ آئے۔ بات یہ تھی کہ جنگ ان کے صوبوں سے بہت دور تھی۔لہذا فوج میں بھرتی ہونے کیلئے نہ آئے۔ بات یہ تھی کہ جنگ ان کے صوبوں سے بہت دور تھی۔لہذا فوج میں بھرتی ہونے کو کوئی بھی سنجیدگی سے نہیں لے رہا تھا۔ جو لوگ بھرتی ہونے نہیں آ رہے تھے؟ انہیں بھگوڑا قرار دیا جارہا تھا۔ان غیر حاضر رہنے والوں کے خلاف تحریک چلانے کی ضرورت تھی۔ ریزاں کی کمساری ایسے کوئی

پندرہ ہزار بھگوڑے جمع کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ وہاں سے گزرتے وقت میرے اندر انہیں دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ بعض لوگوں نے مجھے اس سے منع کیا۔ ''کچھ بھی ہوسکتا ہے۔'' انہوں نے مجھے خبردار کیا۔ لیکن کوئی ناخواش گوار واقعہ پیش نہ آیا۔ ان سے بس کہا گیا کہ کامریڈ ٹراٹسکی ان سے بات کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنی بیرکوں سے نکل کر باہر جمع ہو جائیں۔ وہ سکول کے سڑکوں کی طرح شور مچاتے ہوئے بیرکوں سے باہر آ گئے۔ میرا خیال تھا وہ بہت بری حالت میں ہوں گے۔ دوسری طرف وہ مجھے بڑا خوف ناک سمجھتے تھے۔ مگر تھوڑی دیر بعد ہی وہ میرے گرد جمع ہو گئے اور مجھے اپنا دوست سمجھنے لگے۔ وہ ''بھگوڑے'' مجھے اس قدر تجسس بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ جیسے ان کی آنکھیں کھوپڑیوں سے باہر نکل آئیں گی۔ میں صحن میں ایک میز پر چڑھ گیا اور ڈیڑھ گھنٹے تک ان کے سامنے بولتا رہا۔ وہ بڑے زبردست سامعین ثابت ہوئے۔ میں ان کی آنکھوں میں ان کی عزت بڑھا دی۔ آخر میں میں نے ان سے انقلاب سے وفاداری کے ثبوت میں ہاتھ اٹھانے کو کہا۔ میری تقریر میرے سامنے ہی انہیں لڑ گئی۔ ان کے دل ایک سچے جذبے سے بھر گئے۔ وہ میری کار تک میرے ساتھ آئے' مجھے بھرپور نظروں سے دیکھتے رہے' خوف سے نہیں محبت کے ساتھ۔ پھر وہ اپنی پوری آواز سے نعرے لگانے لگے وہ مجھے جانے نہیں دے رہے تھے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ لوگوں کی تربیت کا بہترین طریقہ ہے کہ ان کو ان کا وعدہ یاد دلایا جائے اور پوچھا جائے۔ ''تم نے کامریڈ ٹراٹسکی سے کیا وعدہ کیا تھا؟'' بعد میں یہی لوگ محاذ پر جان لڑا کر مڑے۔

میرے ذہن میں اوڈیسہ میں سینٹ پال سکول کی دوسری جماعت آ رہی ہے۔ وہ چالیس لڑکے کسی دوسری جماعت کے چالیس لڑکوں سے زیادہ مختلف نہیں تھے۔ لیکن جب سکول کی انتظامیہ نے جماعت کے چند ذہین لڑکوں کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی کرنے کی کوشش کی تو پچھلی نشتوں پر بیٹھنے والے کند ذہن لڑکے ان کے حمایت میں سامنے گئے۔ وہ پوری جماعت کی قیادت کرنے لگے۔

ہر رجمنٹ اور کمپنی میں مختلف صلاحیت کے سپاہی ہوتے ہیں۔ ذہین اور جان نثار کم ہی ہوتے ہیں۔ دوسری طرف کم ہمت اور ڈرپوک بھی زیادہ نہیں ہوتے۔ ان دونوں اقلیتوں کے درمیان ایک اکثریت ہوتی ہے جو تذبذب کا شکار رہتی ہے۔ جب ذہین اور جان نثار سپاہی میدان جنگ میں کام آ جاتے ہیں تو باقی رجمنٹ تتر بتر ہو جاتی ہے۔ اکثریت کو پتا نہیں چلتا کہ وہ کیا کرنے اور نازک وقت پر

افراتفری کا شکار ہو جاتی ہے۔ 24 فروری 1919ء کو میں نے ماسکو کے ستونوں والے ہال میں فوج کے نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''مجھے تین ہزار بھگوڑے دے دیں۔ ان کی ایک رجمنٹ بنا دیں۔ میں انہیں ایک بہترین رجمنٹ بن جائے گی۔'' میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''ہم نے گذشتہ ہفتوں میں یہ فارمولا نارووا اور پس کوف کے محاذوں پر آزما کر دیکھا ہے۔ ہم نے منتشر یونٹوں کو جمع کیا اور کامیاب و گئے۔''

میں نے اڑھائی برس، ماسوا مختصر وقفوں کے ایک ایسی ٹرین میں گزارے جو پہلے سابقہ وزیر موصلات کے تعرف میں ہوتی تھی۔ اس میں آرام کی ہر شے موجود تھی۔ مگر یہ میرے کام کے قابل نہیں تھی۔ اس کے باوجود میں اسی میں اپنا ہر کام کرتا رہا۔ وہیں ساری رپورٹیں آتیں، مختلف حکام سے کانفرنسیں بھی اسی کے اندر منعقد ہوتیں۔ وہیں تار کے ذریعے آنے والے سارے پیغام پڑھتا، حکم جاری کرتا اور اسی میں بیٹھ کر اپنے مضامین لکھتا۔ اسی سے اتر کر میں نے جیپ مین ورکروں کے ساتھ محاذوں کے طویل دورے کیے۔ اپنے فالتو وقت میں یہیں بیٹھ کر کٹسکی پر اپنی کتاب اپنے سٹینوگرافر کو لکھواتا اور دوسرے کام کرتا۔ اس زمانے میں میں ریلوے انجن کے موجدوں اور ٹرین کے ڈبے بنانے والوں کے بارے ہی میں سوچتا رہتا تھا۔

میری ٹرین کو 7 اگست 1918ء کو جلدی سے دوبارہ تیار کیا گیا اور اگلی صبح ہی میں سیوی یازسک اور چیکوو-سلاوک محاذ کی طرف چل پڑا۔ ٹرین ضرورت کے مطابق اندر سے مسلسل بدلتی رہتی یہ وزارت جنگ کی انتظامیہ کا ''اڑن کھٹولہ'' بن گئی۔ اس کے اندر سکریٹریٹ، پرنٹنگ پریس، تارگھر، ریڈیو سٹیشن، بجلی گھر، لائبریری، گیراج اور غسل خانہ غرض کہ ضرورت کی ہر شے موجود تھی۔ ٹرین اتنی بھاری ہوگئی کہ اسے چلانے کیلئے دو انجنوں کی ضرورت پڑ گئی۔ بعد میں اسے دو ٹرینوں میں بدل دیا گیا۔ جب محاذ پر کچھ عرصے کیلئے ٹھہرنا ہوتا تو ایک انجن ٹرین کے ساتھ لگا رہتا اور دوسرا ہرکارے کے فرائض انجام دیتا۔ محاذ مسلسل بدلتے رہتے اور کوئی خطرہ مول نہ لیا جاتا

ٹرین کی تحریری تاریخ اس وقت میرے پاس موجود نہیں ہے۔ یہ وزارت جنگ کے ریکارڈ روم میں دفن ہے۔ میرے نوجوان نائبوں نے بڑی محنت سے اسے تیار کیا تھا۔ ٹرین جن راستوں سے گزرتی جہاں جہاں جاتی ان کے خاکے تیار کیے گئے تھے اور بہت سے لوگ انہیں دیکھنے آتے تھے۔ یہ خاکے اخبارات

میں بھی شائع ہوتے۔ پھر انہیں خانہ جنگی کے عجائب گھر میں رکھ دیا گیا۔ آج انہیں بھی بہت سی دوسری اشیا مثلاً ''اعلانات' جھنڈوں' پلے کارڈوں' تصویروں' فلموں' کتابوں اور تقریروں کے ساتھ کہیں دفن کر دیا گیا ہوگا تاکہ پتا نہ چل سکے کہ اس ساری رزمیہ داستان میں میرا کیا حصہ تھا۔

1922ء اور 1924ء کے دوران میں حزب مخالف کو کچلنے سے پہلے فوجی اشاعت گھر نے خانہ جنگی اور فوج کے متعلق پانچ جلدوں پر مشتمل میری ایک کتاب شائع کی۔ ان جلدوں میں ٹرین کی تاریخ شامل نہیں ہے۔ شاید میں اخبار ''ان روٹ'' میں شائع ہونے والے مضامین کی مدد سے ٹرین کے راستے کا دھندلا سا خاکہ بنانے میں کامیاب ہو جاؤں۔ یہ سمارا سے چل کر چلیابنکس' ویاتکا' پیٹروگراڈ' بالاشوف' دوبارسمارا' روستوف-آن-ڈون' نوووچرک کاش' کیف' زتو میر اور رکے بغیر آگے چلتی جاتی تھی۔ خانہ جنگی کے دوران میں اس نے کتنا فاصلہ طے کیا تھا اب مجھے یاد نہیں رہا۔ میری ایک کتاب میں 36 دوروں کا ذکر ہے۔ یہ کوئی ڈیڑھ لاکھ کلومیٹر کا فاصلہ بنتا ہے۔ میرا ایک سابقہ ہم سفر اپنی یادداشت کی مدد سے بتاتا ہے کہ ہم نے دنیا کے ساڑھے پانچ چکر لگائے تھے۔ اس طرح تو یہ فاصلہ میں وہ ہزاروں کلومیٹر شامل نہیں ہیں جب میں ٹرین سے اتر کر کار کے ذریعے جنگ کے مختلف محاذوں پر جایا کرتا تھا۔ چونکہ ٹرین بڑی اہم اور نازک جگہوں پر جاتی تھی' لہٰذا اس کے سفر کی جو خاکے اور نقشے بنائے گئے ہیں وہ مختلف محاذوں کی بڑی درست اور دلچسپ تصویر پیش کرتے ہیں سب سے زیادہ دورے 1920ء میں کیے گئے جو جنگ کا آخری سال تھا۔ جنوبی محاذ پر میرے دورے خصوصاً زیادہ ہوتے تھے کیونکہ یہ سب سے زیادہ خطرناک طویل اور تھکا دینے والا محاذ تھا۔

انقلابی فوجی کونسل کے چیئر مین کی ٹرین خانہ جنگی کے محاذوں پر کیا لینے جاتی تھی؟ عام جواب یہ ہوگا کہ یہ فتح کی تلاش میں تھی۔ لیکن یہ محاذوں پر کیا کرتی تھی؟ اس کا طریقہ کار کیا تھا؟ ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک اس کے ختم نہ ہونے والے سفر کا مقصد کیا تھا۔ ان دوروں کا مقصد فوج کی تعلیم و تنظیم اور محاذوں پر رسد پہنچانا تھا۔ ہم فوج کی تعمیر نو کر رہے تھے' اور وہ بھی آتش و آہن کی بارش میں۔ فقط سوی یازسک کے محاذ پر ہی ایسا نہیں تھا' ٹرین اپنا پہلا ایک مہینہ رکی رہی تھی' بلکہ تمام محاذوں پر یہی کیفیت تھی۔ بے قائدہ سپاہیوں' سفید فام فوج کے ڈر سے بھاگے ہوئے مہاجروں' دیہات سے آئے ہوئے کسانوں اور صنعتی اداروں سے بھیجے ہوئے محنت کشوں۔ ان سب سے ہم یونٹ' کمپنیاں' بٹالینیں اور بعض

اوقات ڈویژن تشکیل دے رہے تھے۔ شکست اور پسپائی کے بعد بھی حوصلہ ہارے ہوئے لوگوں کو ہم نئی تربیت دے کر دو یا تین ہفتے میں ایک جواں ہمت فوج میں بدل دیتے تھے۔ اس کیلئے کس چیز کی ضرورت تھی؟ یہ چیز بڑی بھی تھی اور چھوٹی بھی۔ چند درجن بھر اچھے کمانڈر، تجربہ کار جنگ جو، چند درجن جان پر کھیل جانے والے کمیونسٹ، ننگے پیروں کیلئے جوتے، نہانے کیلئے غسل خانے، خوراک، زیر جامے، تمبا کو اور اچھا پراپیگنڈا۔ ٹرین یہ سب چیزیں مہیا کرتی تھی۔ ہمارے پاس اک سو کے قریب جان پر کھیل جانے والی کمیونسٹ تھے، جوتوں کا ایک سٹاک تھا، چمڑے کی جیکٹیں تھیں، دوائیاں تھیں، مشین گنیں تھیں، عینکیں، نقشے، گھڑیاں اور اس قسم کی دوسری اشیا اور تحفے تھے۔ یہ سب کچھ فوج کی ضرورت سے کم تھا۔ لیکن ان کی رسد مسلسل جاری تھی۔

سب سے بڑی رسد کوئلے کی تھی جو آگ بجھنے نہیں دے رہی تھی۔ ٹرین کے اندر ایک تار گھر تھا۔ جس کے ذریعے ماسکو سے ہمارا براہ راست رابطہ تھا۔ میرا نائب سلیانسکی پر ہر کمی کی فہرست تیار رکھتا اور اسے فوراً ماسکو سے منگوا لیتا۔ حیرت یہ تھی کہ اشیا کسی رکاوٹ کے بغیر پہنچ جاتی تھیں۔ لیکن محکمہ رسد کا کوئی اہل کا یہ بتا سکتا تھا کہ جس طریقے سے ہم رسد منگوار ہے تھے وہ مناسب اور منظم طریقہ ہرگز نہیں تھا۔ اور یہ بالکل درست بات تھی۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ اس سلسلے میں مجھ سے بھی غلطی سرزد ہو جاتی تھی۔ لیکن ایک باقاعدہ نظام رسد بنانے سے پہلے ہم اپنا خاتمہ نہیں چاہتے تھے۔ لہذا ابتدائی دنوں میں ہمیں اپنے طریقے ایجاد کرنے پڑتے تاکہ بعد میں ہم انہیں بنیاد بنا کر کوئی موثر نظام وضع کر سکیں۔

میرے تمام دوروں میں محکمہ جنگ کے تمام شعبہ جات کے بڑے بڑے کارکن میرے ساتھ ہوتے تھے، خصوصاً شعبہ سپلائی کا سربراہ۔ پرانی فوج کے شعبہ رسد سے ہمیں ایسے افسر ملے تھے جو برے حالات میں بھی اپنے پرانے اور گھسے پٹے طریقوں پر چلتے تھے جس سے ہمارے کئی مشکلات پیدا ہو رہی تھیں۔ ان دوروں میں وہ نئے طریقے سیکھتے اور نئے لوگ بن کر نئی صورتحال میں تجربہ حاصل کرتے۔ کسی ڈویژن کا دورہ کرنے اور اس کی ضروریات کا اندازہ لگانے کے بعد میں ٹرین کے سٹاف یا کھانے کے ڈبے میں کانفرنس بلا لیتا جس میں جنگ کے تمام شعبوں کے اہل کاروں، فوج کے نمائندوں، پارٹی تنظیموں، ٹریڈ یونینوں اور سوویٹ انتظامیہ کے نمائندے شامل ہوتے۔ اس طرح مجھے صورتحال کی ایک ایسی تصویر مل جاتی جو نہ تو زیادہ رنگین اور نہ ہی اتنی تاریک ہوتی۔ ایسی کانفرنسیں فوری عملی نتائج برآمد کرتیں۔ کسی مقامی

ادارے کی انتظامیہ کتنی ہی کمزور کیوں نہ ہوتی' ایسی کانفرنس کے بعد وہ قدرے مضبوط ہو جاتی اور اپنی چند ضرویات کم کر کے فوج کی کچھ نہ کچھ مدد ضرور کر دیتی۔

مقامی اداروں نے سب سے زیادہ قربانیاں دیں۔ ان سے نئے کمیونسٹوں کا ایک گروپ لے کر ناقابل اعتبار رجمنٹ میں بھیج دیا جاتا۔ پھر انہیں ضرورت کی ہر شے مہیا کر دی جاتی۔ مگر مقامی ذرائع کافی نہیں ہوتے تھے۔ کانفرنس کے بعد میں ماسکو براہ راست تار ارسال کر دیتا۔ جو اشیا سب سے زیادہ ضروری ہوتیں وہ انہیں کسی نہ کسی طرح اکٹھا کر کے ہمیں بھیج دیتے۔ محاذ سے جو کمانڈر واپس ہمارے پاس آتے وہ ٹرین کے اندر بہت کچھ سیکھتے' صرف فوجی تربیت ہی حاصل نہ کرتے' انہیں انصاف کرنا بھی سکھایا جاتا۔

بتدریج فوج اور محاذوں کیلئے ایک مرکزی سپلائی لائن قائم کر دی گئی۔ لیکن یہ اکیلی ساری ضرورتیں پوری نہیں کر سکتی تھی۔ جنگ میں اچھی سے اچھی تنظیم بھی کبھی نہ کبھی کوئی خامی ظاہر کر دیتی ہے۔ اور ہماری و ساری جنگ ہی دکھائی نہ دینے والی انجام کی جنگ تھی۔ اور یہ نہ بھولنا چاہیے کہ ہم منظّم رسد کے بغیر لڑ رہے تھے۔ 1919ء میں مرکزی ڈپوؤں میں کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ درزیوں کی دکانوں سے قمیصیں براہ راست محاذوں پر بھیجی جاتی تھیں۔ سب سے مشکل رسد رائفلوں اور کارتوسوں کی تھی۔ تولا میں قائم اسلحہ فیکٹری فقط ایک دن کی ضرورت پوری کرتی تھی۔ کمانڈر۔ان۔چیف کے خاص حکم کے بغیر کارتوسوں کی ایک گاڑی بھی کہیں نہیں بھیجی جا سکتی تھی۔ اسلحے کی سپلائی بھی تنے ہوئے دھاگے جیسی تھی۔ جب یہ دھاگہ ٹوٹ جاتا تو ہم علاقہ کھونے کے ساتھ اپنے آدمی بھی کھو بیٹھتے۔

نت نئی تبدیلیوں اور اختراعوں کے بغیر ہمارے لئے جنگ لڑنا بالکل ناممکن تھا۔ ان کا منبع ٹرین ہی تھی اور وہی انہیں موثر بناتی تھی۔ اگر ہم اگلے مورچوں اور عقبی فوج کو کوئی حکم دیتے تو درمیانی نظام اور ذرائع کو بھی متحرک رکھتے۔ یہ طریقہ کار ہمیشہ کارگر ثابت نہیں ہوتا تھا۔ لیکن جیسا کہ خانہ جنگی نے ظاہر کر دیا' ہم اکثر اپنے مقصد میں اکثر کامیاب ہو جاتے۔ یعنی فتح حاصل کر لیتے۔

محاذ کے دورے زیادہ اہم ہوتے جہاں بعض اوقات کی نڈنگ افسر کی غداری مسئلہ پیدا کر دیتی۔ 23 اگست 1918ء کو قازان کی جنگ کے سب سے اہم موڑ سے مجھے لینن اور ہورڈ لوف کا یہ خفیہ پیغام ملا ''سوی یازسک ٹراٹسکی۔ ساراتوف محاذ پر غداری ہو رہی ہے۔ اس کا بروقت پتا چل گیا ہے

مگر گڑ بڑ جاری ہے۔ آپ کا وہاں جانا اشد ضروری ہے۔ آپ کے جانے سے سپاہیوں اور فوج پر بڑا مثبت اثر پڑے گا۔ دوسرے محاذوں پر بھی آپ کے جانے کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ اپنی روانگی کی تاریخ سے مطلع کریں۔ 22 اگست 1918ء لینن، ہورڈلوف۔''

اس وقت میرا سوی یازسک چھوڑنا بے حد ناممکن تھا۔ ایسا کرنے سے قازان کا محاذ خطرے میں پڑ جاتا تھا جہاں ہم بڑی مشکل میں پھنسے ہوئے تھے۔ ساراتوف سے قازان زیادہ اہم تھا۔ جلد ہی لینن اور سیورڈلوف مجھ سے متفق ہو گئے۔ قازان پر دوبارہ قابض ہونے کے بعد میں ساراتوف چلا گیا۔ اس قسم کے تار ٹرین کے سفر کے ہر مرحلے میں آتے رہتے تھے۔ کیف، وی آتکا، سائبیریا اور کریمیا کے محاذ بھی مشکل وقتوں میں ٹرین کی مدد کا مطالبہ کرتے رہتے تھے۔

جنگ ملک کے دور دراز علاقوں میں ہزاروں کول میٹر طویل محاذوں پر پھیلی ہوتی تھی۔ رجمنٹیں اور ڈویژن کئی کئی ماہ باقی دنیا سے کٹے رہتے۔ اکثر یوں ہوتا کہ ان کے داخلی رابطے کیلئے بھی ٹیلی فون نہیں ہوتے تھے جس سے فوج ناامیدی کا شکار ہو جاتی۔ ایسے موقعوں پر ٹرین ان لوگوں کیلئے دوسری دنیاؤں کی پیغام بر ہوتی تھی۔ ہمارے پاس ہمیشہ ٹیلی فون آلات اور تاروں کا ذخیرہ ہوتا تھا۔ ٹرین کے ایک ڈبے میں ایک بے تار ایرٹیل کا انتظام تھا جو تیرہ ریڈیو سٹیشنوں سے جڑا ہوا تھا جن میں ا یفل ٹاور اور ماسکو ریڈیو سٹیشن پیش پیش تھے۔ دنیا میں کیا کچھ ہو رہا تھا، ٹرین میں اس کا پتا چلتا رہتا تھا۔ ٹرین کے اپنے اخبار میں اہم تبصرے، خبریں، مضامین اور حکم نامے شائع ہوتے رہتے تھے۔

اخبار کے اہم مضامین اور خبریں تار کے ذریعے ماسکو بھیج دیے جاتے جہاں وہ ملک کے دوسرے اخبارات میں شائع ہوتے رہتے۔ ٹرین کے آنے سے الگ تھلگ پڑے فوجی یونٹ ایک دم ملک کے باقی حصے سے جڑ جاتے۔ پھر نہیں ملک ہی میں نہیں باقی دنیا میں بھی وقوع پذیر ہونے والے واقعات کی خبر میں بھی پتا چل جاتیں۔ ایسے مواقع پر افواہیں دم توڑ جاتیں اور جوانوں کے حوصلے بلند اور مضبوط ہو جاتے۔ حوصلوں میں یہ تبدیلی ٹرین کے دوبارہ آنے تک کئی ہفتے جاری رہتی۔ ٹرین کے وقفوں کے دوران میں انقلابی فوجی کونسل کے ارکان اور فوج کے دوسرے اعلیٰ افسر محاذوں پر چھوٹے پیمانے پر دورے کرتے رہتے۔

ٹرین کے اندر میرا ادبی اور دوسرا کام میرے دو سٹینوگرافروں گلازمان اور سرمشک اور نوجوان نائب

نچیف کے بغیر ناممکن ہوجاتا۔ وہ دن رات کام کرتے رہتے ٹرین ستر یا اس سے زیادہ کلومیٹر کی رفتار سے چلتی رہتی۔ ڈبوں کے اندر آویزاں جنگی نقشے ٹرین کے چلنے سے ہلتے رہتے۔ تینوں بھاگ کر ان کی طرف جاتے' وہاں سے کچھ دیکھ کر آتے اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو جاتے۔ وہ ٹرین کے جھٹکوں سے بے نیاز رہتے۔ جب نصف گھنٹے بعد ٹائپ شدہ مسودہ میرے ہاتھ میں ہوتا تو اس میں غلطیوں کی گنجائش نہیں ہوتی تھی۔ یہ کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ اس میں بڑی لگن اور محنت کی ضرورت تھی۔ بعد میں گلازمان اور سرمشک کو انقلاب کی خدمات بڑی مہنگی پڑیں۔ سٹالن کے چیلوں نے گلازمان کو خودکشی پر مجبور کر دیا اور سرمشک سائبیریا کے ویرانوں کہیں کھو گیا۔

ٹرین کے اندر ایک بڑا گیراج تھا جس میں چند گاڑیاں اور پیٹرول کا ٹینک موجود رہتا تھا۔ اس طرح ہم ریلوے سٹیشن سے سینکڑوں میل دور تک سفر کر سکتے تھے۔ میرے ساتھ تقریباً بیس یا تیس بہترین نشانہ بازوں کا گروپ ہوتا جنہوں نے اپنی گاڑیوں پر مشین گنیں نصب کی ہوتی تھیں۔ دستی مشین گنیں بھی کار میں رکھ لی جائیں۔ ایک متحرک جنگ اپنے اندر بڑی حیرانیاں لیے ہوتی ہے۔ کھلے میدانوں میں کاسک ڈاکوؤں سے مٹھ بھیڑ ہونے کا خطرہ ہوتا تھا۔ ایسے مواقع پر گاڑیوں پر نصب مشین گنیں ہمیں بڑا حوصلہ دیتیں۔ لیکن جب یہ میدان دلدل اور کیچڑ سے بھر جاتے تو ہماری مشکلات میں اضافہ ہو جاتا۔ ایک دفعہ 1919ء کے موسم خزاں میںورونز کے صوبے میں ہم تین کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے گاڑیاں چلاتے رہے۔ ہماری گاڑیاں بارش کی ساری کالی زمین میں دھنس جاتی تھیں۔ پھر تیس آدمی باہر نکل کر انہیں دھکا لگانے میں لگ جاتے۔ ایک بار جب ہم ایک دریا کے اندر سے گھر رہے تھے تو عین دریا کے وسط میں پھنس گئے۔ میں نے غصے میں سارا الزام اپنی نیچی باڈی والی گاڑی پر رکھ دیا۔ میرے شوفر یووی جو استھونیا کا رہنے والا تھا' اس کے خیال کے مطابق وہ دنیا کی بہترین گاڑی تھی۔ وہ اپنا ہاتھ اپنی ٹوپی کے پاس لایا اور ٹوٹی پھوٹی روس زبان میں بولا۔

''جناب گاڑی بنانے والوں کو یہ علم نہیں تھا کہ ہم نے اس سے پانی میں تیرنے کا کام بھی لینا تھا۔''

مشکل وقت کے باوجود اس کے لہجے کا طنز کام کر گیا۔ ٹرین ایک فوجی تنظیمی اور سیاسی ادارہ ہی نہیں تھا بلکہ ایک لڑاکا یونٹ بھی تھا۔ اسے ایک چلتا پھرتا ہیڈ کوارٹرز کہنے کے بجائے ایک بکتر بند ٹرین کہنا زیادہ مناسب تھا۔ عملے کے تمام اہل کار اسلحہ چلا سکتے تھے۔ سب نے چمڑے کی یونیفارم پہنی ہوتی جس میں وہ

بڑے فٹ دکھائی دیتے۔ ان کا وائیں بازو پر کندھے کے نیچے لوہے کا ایک بیج لگا ہوتا جسے بڑی نفاست سے ٹیکسال سے بنوایا گیا تھا اور جس نے فوج میں بڑی مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ تمام گاڑیاں ٹیلی فون اور سنگل کے نظام سے موبوط تھیں۔ سفر دن کا ہوتا یا رات کا' راستے میں جا بجا الام بجتے رہتے تھے۔ کسی خطرناک جگہ پر چمڑے کی وردی میں ملبوس یونٹ کے ایک دم پہنچ جانے سے بڑے مثبت اثرات مرتب ہوتے۔ جب محاذ پر موجود جوانوں کو معلوم ہو جاتا کہ ان سے تھوڑے فاصلے پر ٹرین کھڑی تھی تو ان کے حوصلے بڑھ جاتے۔ میزان کے پلڑے برابر ہونے کی صورت میں ذرا سا وزن بھی اپنا کام دکھا جاتا ہے۔ ٹرین کے عملے نے اپنے اڑھائی سالہ سفر کے دوران میں یہ کام اکثر کیا۔ جب یہ عملہ ٹرین سے اتر کر کہیں جاتا تو اکثر یوں ہوتا کہ ایک آدھا آدمی کہیں کھو جاتا۔ ٹرین کی ساری مدت کے دوران میں پندرہ آدمی ہلاک اور زخمی ہوئے۔ ان میں وہ ان میں وہ شامل نہیں ہیں جو محاذ پر رہ جاتے اور ہماری نظروں سے اوجھل ہو جاتے۔ لینن کیلئے ایک بکر بند ٹرین تیار کی گئی۔ اس میں ہماری ٹرین کا زیادہ عملہ تھا۔ پیٹروگراڈ پہنچنے سے پہلے اور لوگ بھی اس میں شامل ہو گئے۔ ساری ٹرین کو سرخ جھنڈوں اور جھنڈیوں سے سجایا گیا تھا۔

بعض اوقات ٹرین پر ہوائی حملہ ہو جاتا اور یہ دوسری سے کٹ جاتی اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں تھی کہ اس کے گرد حقیقی اور خیالی فتوحات کی ایک فضا لپٹی ہوئی تھی۔ یوں بھی ہوتا تھا کہ کسی ڈویژن' بریگیڈ' رجمنٹ یا کمپنی کا کوئی کمانڈر ٹرین کو مقررہ وقت سے کچھ زیادہ عرصہ اپنے حلقے میں رک جانے کیلئے کہہ دیتا تا کہ ٹرین کی خبر نزدیک و دور پھیل جائے۔ پھر وہ کہتا۔ ''یہ خبر ایک ڈویژن ریزرو فوج سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔'' ٹرین کی خبر دشمنوں کی صفوں تک پہنچ جاتی تھی۔ وہاں ایک خیالی خوف کی لہر دوڑ جاتی جو اصلی ڈر سے زیادہ موثر ثابت ہوتی۔ اس سے ہمارے جوانوں کے حوصلوں پر بڑا اچھا اثر پڑتا۔

دشمن ٹرین سے نفرت کرتے تھے اور ہمیں یہ بات قابل فخر لگتی تھی۔ سوشلسٹ انقلابیوں نے کئی دفعہ اسے تباہ کرنے کے منصوبے بنائے۔ ان کے خلاف عدالتی کارروائی کے دوران میں یہ پوری کہانی سمونوف نے سنائی جس نے لینن پر حملہ اور ولوڈرسکی کے قتل کا منصوبہ بنایا۔ اس شخص نے ٹرین کو تباہ کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ اصل میں ایسے منصوبے تیار کرنے میں کوئی زیادہ مشکل پیش نہیں آئی۔ ویسے بھی اس وقت سوشلسٹ انقلابی سیاسی طور پر کمزور ہو چکے تھے' ان کا اپنے آپ پر سے اعتماد اٹھ چکا تھا اور نئی نسل میں ان

کا کوئی اثر نہیں رہا تھا۔

جنوب کی طرف ایک دوسرے کے دوران میں گورکی ریلوے سٹیشن پر ٹرین کو زبردست جھٹکا لگا۔ رات کے وسط میں میں اچانک بستر سے باہر جا گرا۔ میرا پہلا احساس یہ تھا کہ جیسے کسی زلزلے نے ٹرین کو ہلا دیا تھا۔ میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ سہارا لینے کو کوئی چیز نہیں تھی۔ جاگنے سونے کی حالت میں میں نے بستر کو ایک طرف سے پکڑ لیا۔ پھر مانوس تھرتھراہٹ کم ہو گئی۔ میرا ڈبہ ایک طرف کو جھک گیا تھا۔ رات کی خاموشی میں ایک دکھ بھری آواز تھی جو سنی جا سکتی تھی۔ ڈبے کا بھاری دروازہ اس قدر مڑ گیا تھا کہ میں اسے کھول کر باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ کوئی مدد کو نہ آیا۔ اس پر میں زیادہ چوکنا ہو گیا۔ کیا یہ دشمن

کا حملہ تھا؟ میں نے ہاتھ میں ریوالور لے کر کھڑکی سے باہر چھلانگ لا دی اور اس آدمی کی طرف بھاگا جس کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ وہ ٹرین کا کمانڈر تھا۔ وہ مجھ تک پہنچ نہیں سکا تھا۔

میرا ڈبہ ایک ڈھلوان پر کھڑا تھا۔ اس کے تین پہیے زمین میں دھنس گئے تھے اور تین ہوا میں معلق تھے۔ ڈبے کا اگلا اور پچھلا حصہ پچک گیا تھا۔ ایک زوردار گڑ نے میری حفاظت پر مامور سپاہی کو دروازے میں دبا دیا تھا' اور یہ وہی کسی بچے کے رونے جیسی دکھ بھری آواز تھی جسے میں نے رات کے اندھیرے میں سنا تھا۔ پھنسی ہوئی جگہ سے اسے نکالنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ جب وہ چھوٹی موٹی خراشوں کے ساتھ خود ہی کو باہر نکل آیا تو ہر ایک کو سخت تعجب ہوا۔ آٹھ ڈبے تباہ ہو گئے تھے۔ کھانے والا ڈبہ جو بطور تفریح گاہ بھی استعمال ہوتا تھا' لکڑیوں کے ڈھیر میں بدل گیا۔ بعض لوگ اپنی ڈیوٹی کے انتظار میں پڑھ یا شطرنج کھیل رہے تھے۔ وہ حادثے سے دس منٹ پہلے وہاں سے اٹھ کر گئے تھے۔ ٹرین کے اندر جن لڑکوں میں کتابیں اور محاذوں پر بھیجنے والا دوسرا سامان تھا' انہیں بھی نقصان پہنچا تھا۔ مگر کسی آدمی کو بھی زیادہ چوٹ نہیں آئی تھی۔ حادثہ کسی غفلت یا تخریبی کاروائی کی وجہ سے پیش آتا تھا' یہ کبھی معلوم نہ ہو سکا۔ خوش قسمتی سے ٹرین حادثے کے وقت ایک سٹیشن کے پاس سے گزر رہی تھی اور اس کی رفتار 30 کلومیٹر فی گھنٹہ تھی۔

ٹرین کا عملہ اپنے مخصوص فرائض کے علاوہ اور بھی بہت سے کام انجام دیتا تھا۔ وہ قحط اور متعدی بیماریوں کے وقت طبی مدد دیتا۔ پراپیگنڈا کا کام کرتا اور بین الاقوامی کانگریس کے موقع پر ہر ممکن مدد مہیا کرتا۔ ٹرین ایک دیہی علاقے اور چند بچوں کے گھروں کی اعزازیہ سربراہ بھی تھی۔ اس کے مقامی کمیونسٹ اپنا

ایک اخبار نکالتے تھے جس کا نام ''آن گارڈ'' تھا۔ اس میں بڑے معرکہ آرا اور مہم ساز واقعات پر مضامین شائع ہوتے۔ لیکن بد قسمتی سے دوسرے بہت سے ریکارڈوں کی طرح یہ ریکارڈ بھی میرے سفری سامان میں نہیں ہے۔

جب میں رینگل کے خلاف جس نے کریمیا میں قدم جما لیے تھے، ایک حملے کی تیاری کے سلسلے میں جا رہا تھا تو میں نے 27 اکتوبر 1920ء کو ٹرین کے اخبار ''راستہ'' میں لکھا:

''ہماری ٹرین ایک مرتبہ محاذ کی طرف جا رہی ہے۔''

''ہماری ٹرین کے جنگ جو 1918ء کے گھمبیر ہفتوں میں اس وقت قازان کی دیواروں کے سامنے کھڑے تھے جب ہم وولگا پر قبضے کی جنگ لڑ رہے تھے۔ وہ لڑائی ختم ہوئے ایک عرصہ ہو گیا۔ اب سوویٹ اقتدار بحرالکاہل کے کناروں کو چھو رہا ہے۔''

''ہماری ٹرین کے جنگجو پیٹروگراڈ کی دیواروں کے سامنے نہایت بہادری اور جرات سے لڑے۔ پیٹروگراڈ کو بچا لیا گیا۔ اس وقت سے اب تک عالمی پرولتاریہ کے بہت سے نمائندے یہ شہر دیکھنے آ رہے ہیں۔

''ہماری ٹرین مغربی محاذ پر ایک دفعہ سے زیادہ مرتبہ گئی۔ آج پولینڈ سے ابتدائی نوعیت کا ایک امن معاہدہ طے پا گیا ہے۔''

''ہماری ٹرین کے بہادر جوان ڈون کے وسیع میدانوں میں لڑے اسی وقت لڑے جب کراسنوف اور بعد میں ڈینکن کی فوج نے جنوب کی طرف سے سوویٹ روس کی طرف پیش قدمی کی تھی۔ کراسنوف اور ڈینکن کے دنوں کو گزرے اب ایک زمانہ ہو چکا ہے۔''

''اب کریمیا رہ گیا ہے جسے فرانسیسی حکومت نے اپنا قلعے کا سفید فام گارڈ گریژن کرائے کے ایک جرمن، روسی جرنیل بیونی رمنیگل کی زیر کمان ہے۔''

''ہماری ٹرین کا دوست گھرانہ اب ایک نئی مہم پر جا رہا ہے۔ امید ہے یہ ہماری آخری مہم ہو گی۔''

کریمیا کی مہم واقعی خانہ جنگی کی آخری مہم ثابت ہوئی۔ چند ماہ بعد ٹرین موقوف کر دی گئی۔ ان صفحات کے ذریعے میں اپنے سابقہ ساتھیوں کو اپنا پیغام محبت بھیج رہا ہوں۔

پیٹروگراڈ کا دفاع

سوویٹ جمہوریہ کے انقلابی محاذوں پر ہماری سولہ فوجیں لڑ رہی تھیں۔ انقلاب فرانس میں چودہ فوجیں لڑی تھیں۔ان سولہ فوجوں کی اپنی مختصر مگر شاندار تاریخ تھی۔کسی فوج کو بھی لے لیں اس سے درجنوں باکمال اور عمدہ کہانیاں وابستہ ہیں۔ ہر فوج کی واضح مگر ہر دم متغیر اپنی بعض خصوصیات تھیں۔

ساتویں فوج نے پیٹروگراڈ کی طرف آنے والے مغربی راستے کی ناکہ بندی کر رکھی تھی۔طویل خاموشی اور بے حرکتی نے اس کے حوصلوں پر منفی اثرات ڈالے تھے۔اس کی نگرانی اور چوکسی میں کاہلی آ گئی تھی۔لہذا اس ساری فوج کو وہاں سے اٹھا کر مصروف محاذ پر بھیج دیا گیا۔ایک انقلابی فوج جسے ہر وقت ولولہ انگیزی کی ضرورت ہوتی ہے'یوں بے کار پڑے رہنا ایک عذاب بن جاتا ہے۔ساتویں فوج کی بالکل یہی حالت ہوگئی تھی

جون 1919ء میں فن لینڈ کی خلیج میں ''کرس نایا گورکا'' (سرخ پہاڑی) نامی ایک قلعے پر سفید فام فوج کے ایک یونٹ نے قبضہ کر لیا۔ چند دنوں بعد سرخ بحری فوج نے اسے واپس لے لیا۔پھر معلوم ہوا کہ ساتویں فوج کا چیف آف سٹاف کرنل لنڈ وسٹ سفید فاموں کو اطلاعات فراہم کر رہا تھا۔بعض دوسرے سازشی بھی اس سے ملے ہوئے تھے۔اس خبر نے فوج کا ہلا کر رکھ دیا۔

جولائی میں جنرل یوڈنیچ کو سفید فاموں کی شمال مغربی فوج کا کمانڈر-ان-چیف بنا دیا گیا۔کولچک نے بھی اسے اپنا نمائندہ تسلیم کر لیا۔اگست میں برطانیہ اور استھونیا کی مدد سے روسی ''شمال مغربی حکومت'' قائم کر دی گئی۔فن لینڈ کی خلیج میں موجود برطانوی بحری فوج نے یوڈنیچ کو حمایت کا یقین دلایا۔یوڈنیچ نے حملے کیلئے ایسا وقت منتخب کیا جب ہم دوسرے محاذوں پر بری طرح مصروف تھے۔ڈینیکن نے اورل پر قبضہ کر لیا تھا اور وہ تولا کی طرف خطرناک انداز میں بڑھ رہا تھا۔تولا جو ہماری اسلحہ سازی کا مرکز تھا وہاں سے ماسکو تھوڑے فاصلے پر تھا۔لہذا جنوب ہماری تمام تر توجہ کا طالب تھا۔عین اسی وقت جنوب سے ایک زبردست حملے نے ساتویں فوج کا توازن بگاڑ دیا اور یہ کسی قسم کی مزاحمت کے بغیر پسپا ہونے لگی اور اپنے پیچھے اپنا اسلحہ اور رسد بھی چھوڑتی گئی۔پیٹروگراڈ کے راہنما' خاص طور پر زینوشیف لینن کو دشمن کے عمدہ ہتھیاروں' ہوائی جہازوں' ٹینکوں' خودکار رائفلوں اور نہ جانے کس کس چیز کے متعلق بتاتا رہا۔لینن اس نتیجے پر پہنچا کہ ہم دشمن کی بہترین اسلحہ ست لیس فوج کا مقابلہ دوسرے محاذوں کو بشمول مغربی محاذ کمزور

کر کے ہی کر سکتے تھے۔لیکن یہ ناممکن تھا۔اب یہی راستہ سامنے رہ گیا تھا کہ پیٹروگراڈ کو چھوڑ کر محاذ چھوٹا کر دیا جائے۔فیصلہ ہوا کہ یہ بہت ضروری تھا۔لینن بھی دوسرے لیڈروں کی رضا حاصل کرنے میں لگ گیا۔جب میں ماسکو پہنچا تو میں نے اس منصوبے کی سخت مخالفت کی۔یودنیچ اوراس کے مالکوں نے پیٹرو گراڈ پر ہی اکتفانہیں کرنا تھا' انہوں نے ڈینیکن سے ماسکو میں ملنے کا وعدہ لینا تھا۔یوڈنیچ کو پیٹروگراڈ میں صنعتی دولت کے علاوہ آدمیوں کی قوت بھی مل جانی تھی۔اس کے علاوہ پیٹروگراڈ سے ماسکو جاتے وقت اسے راستے میں کوئی بڑی رکاوٹ پیش نہیں آنی تھی۔لہذا میں نے فیصلہ کیا کہ ہمیں پیٹروگراڈ کو ہر قیمت پر بچانا ہوگا اس کیلئے سب سے پہلے پیٹروگراڈ کے شہریوں کی حمایت کی ضرورت تھی۔کرٹنسکی جو اس وقت پولٹ بیورو کا رکن تھا' وہ میری طرف تھا۔میرا خیال ہے شاید سٹالن نے بھی میرے موقف کی حمایت کی تھی۔ان چوبیس گھنٹوں میں میں نے لینن پر متعدد جارحانہ حملے کیے۔آخر وہ بولا''چلو کوشش کر کے دیکھتے ہیں۔''

15 اکتوبر کو پولٹ بورو نے محاذوں کے متعلق میری قرارداد منظور کر لی۔''سخت فوجی خطرات کے پیش نظر ہمیں روس کو فوجی کیمپ میں تبدیل کرنے کا اقدام کرنا پڑے گا۔لہذا ہر سیاسی اپارٹی' ہر ٹریڈ یونین اور ہر سوویٹ سے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے ارکان کے نام فوجی تربیت کیلئے درج کرائیں۔''اس کے بعد عملی اقدامات کی ایک فہرست تیار کی گئی۔پیٹروگراڈ کے متعلق فیصلہ ہوا کہ اسے خالی نہیں کیا جائے گا۔اسی دن میں ل ے دفاعی کونسل کے سامنے ایک قانون کا ڈرافٹ پیش کیا۔وہ قانون یہ تھا''خون کے آخری قطرے تک پیٹروگراڈ کا دفاع کیا جائے۔ایک قدم جگہ نہ چھوڑی جائے اور شہر کی گلیوں میں اور سڑکوں پر جدوجہد جاری رکھی جائے۔'' مجھے اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ دشمن کی 25 ہزار سپاہیوں کی فوج کا اگر شہر کے لاکھوں لوگ منظم طریقے سے مقابلے کریں تو اکا قیمہ بنا کر رکھ دیں گے۔اس کے ساتھ ہی استھونیا اور فن لینڈ کی طرف سے کسی مداخلت کے پیش نظر فوج اور محنت کشوں کی جنوب مشرق کی طرف واپسی کو بھی ضروری سمجھا گیا کیونکہ پیٹروگراڈ کی پرولتاریہ کو ختم ہونے سے ایسے ہی بچایا جا سکتا تھا۔

16 تاریخ کو میں پیٹروگراڈ چلا گیا۔دوسرے دن لینن نے مجھے لکھا:

17 اکتوبر 1919ء

''کامریڈ ٹراٹسکی! دفاعی کونسل کا فیصلہ بھجوا رہا ہوں۔جیسا کہ آپ دیکھیں گے' آپ کا منصوبہ

منظور کر لیا گیا ہے۔ پیٹروگراڈ کے محنت کشوں کی جنوب کی طرف واپسی رد نہیں کی جاتی۔ (مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ نے اس سلسلے میں کراسن اور ری کوف سے بات کی تھی) اگر ضرورت پیش آنے سے پہلے یہ معاملہ زیر بحث لایا گیا تو اس سے دو بدو لڑائی سے توجہ ہٹ جائے گی۔ پیٹروگراڈ کو بالکل علیحدہ کرنے کی کوشش اپنے ساتھ کئی تبدیلیاں لائے گی جن سے آپ موقع کی مناسب سے نمٹ لیں گے---- میں ایک اعلان بھی بھیج رہا ہوں جو میں نے دفاعی کونسل کی تجویز پر جاری کیا ہے۔ میں نے اسے جلدی میں جاری کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ کچھ درست نہیں ہے۔ بہتر ہوگا آپ نیا اعلان بنا کر نیچے میرا نام لکھ دیں۔ خوش رہیں لینن۔

اس خط سے سنجیدہ نوعیت کا وہ اختلاف صاف ظاہر ہوتا ہے جو لینن اور میرے درمیان پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن یہ اختلاف ہمارے ذاتی تعلقات یا مشترکہ کام پر اثر انداز نہ ہوا۔ اگر اس وقت پیٹروگراڈ کو چھوڑ دینے کا خیال میری طرف آیا ہوت اور لینن نے اس کی مخالفت کی ہوتی تو آج میرے خلاف ایک طوفان کھڑا ہو گیا ہوتا' اخبارات دشنام طرازیوں سے بھرے ہوتے اور اسے ''ٹراٹسکی ازم'' کی تغیت قرار دیا گیا ہوتا۔

1918ء کے دوران میں اتحادی ہم پر ایک خانہ جنگی نافذ کرنے کی فکر میں تھے تاکہ جرنی پر فتح حاصل کی جا سکے۔ لیکن اب 1919ء آ گیا تھا۔ جرمنی کو شکست ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود اتحادی انقلاب روس میں قحط' موت اور بیماریوں پھیلانے میں کثیر رقم خرچ کر رہے تھے۔ یوڈینچ برطانیہ اور فرانس کا کرائے کا سپاہی تھا۔ استھونیا اس کی پیٹھ تھپتھپا رہا تھا۔ فن لینڈ بائیں طرف سے اس کی حفاظت کر رہا تھا۔ اتحادیوں کا مطالبہ تھا کہ یہ دونوں ملک جو انقلاب نے آزاد کرائے تھے' مل کر انقلاب کو ذبح کر دیں۔ ہلنگ فورس کی طرح یورال میں بھی مسلسل مذاکرات ہو رہے تھے۔ ترازو کا پلڑا کبھی ایک طرف اور کبھی دوسری طرف جھک جاتا۔ ہم بڑے چوکنے ہو کر ان دونوں چھوٹے ملکوں کو دیکھ رہے تھے جن کے ارادے پیٹروگراڈ کی طرف نیک نہیں تھے۔

میں نے یکم ستمبر کو ''پراودا'' میں تنبع کے طور پر لکھا۔ ''ہم دوسری فوجوں کے ساتھ پیٹروگراڈ کے محاذ پر باشکر گھڑ سواروں کے دستے بھی لا رہے ہیں۔ اگر فنس بورژوازی نے پیش قدمی کی کوشش کی تو سرخ باشکر طبل جنگ بجاتے ہوئے یہ للکاریں گے۔ ''ہلسنگ فورس کی طرف لوٹ جاؤ۔''

باشکر گھڑ سوار ڈویژن تھوڑا عرصہ پہلے تشکیل دیا گیا تھا میں شروع ہی سے اسے چند ماہ کیلئے پیٹرو گراڈ لانا چاہتا تھا تا کہ دیہاتی میدانوں کے یہ باسی شہر کی ثقافتی فضا میں رہ کر کچھ مجلسی آداب سیکھ جائیں۔ وہ شہری محنت کشوں سے رابطہ قائم کریں' ان کے جلاسوں میں جائیں' ان کے کلب دیکھیں اور تھیٹر وغیرہ کی سیر کریں۔ اب اس میں ایک اور ضروری عنصر داخل ہو گیا تھا۔ یعنی فنس بورژوازی کا باشکر جذبے کے ساتھ مقابلہ۔

لیکن یوڈینچ کو جو تیز رفتار کامیابیاں حاصل ہو رہی تھیں ان کے سامنے ہماری ساری تنبع بیکار ثابت ہوئی۔ یوڈینچ 13 اکتوبر کو لا گا اور 16 اکتوبر کو کراسنووی سیلو اور کت چائنا پر قبضہ کرنے کے بعد اس طرح پیٹرو گراڈ کی طرف بڑھا کہ وہ پیٹرو گراڈ اور ماسکو کو ملانے والی ریلوے لائن کو کاٹ سکتا تھا۔ اپنے حملے کے دسویں دن یوڈینچ بڑھتا ہوا تسر سکوئی سیلو تک پہنچ گیا۔ اس کا کوئی بھی گھڑ سوار پہاڑی پر چڑھ کر سینٹ اسحاق کلیسا کا سنہری گنبد دیکھ سکتا تھا۔

فنس ریڈیو نے پیشن گوئی کرتے ہوئے پیٹرو گراڈ پر یوڈینچ کی فوجوں کے قبضے کا اعلان کر دیا۔ ہلسنگ فورس میں اتحادیوں کے سفیروں نے بھی اخبر سے اپنی حکومتوں کو مطلع کر دیا۔ پورے یورپ اور دنیا میں یہ خبر پھیل گئی کہ سرخ پیٹرو گراڈ فتح ہو گیا تھا۔ ایک سویڈش اخبار نے لکھا: ''پیٹرو گراڈ کے بخار کا عالمی ہفتہ'' فن لینڈ کا حکمران طبقہ خاص طور پر بڑی ہیجانی کیفیت میں تھا۔ حکومت اور فوج مداخلے کی باتیں کر رہی تھیں۔ کوئی بھی سونے کی کان کو اپنے ہاتھ سے چھوڑنے کے حق میں نہیں تھا۔ توقع کے مطابق فنس سوشل ڈیموکریسی نے ''غیر جانب دار'' رہنے کا وعدہ کیا۔ ایک سفید فام مورخ لکھتا ہے۔ ''فقط مالی نقطہ نظر سے مداخلت کا سوال زیر بحث ہے۔ اب فقط پچاس ملین فرانک کی گارنٹی کی تصدیق باقی رہ گئی تھی۔'' اتحادیوں کی منڈیوں میں پیٹرو گراڈ کے خون کی یہ قیمت لگی تھی۔

استھونیا کا مسئلہ بھی کچھ کم گھمبیر نہیں تھا۔ میں نے 17 اکتوبر کو لینن کو لکھا۔ ''اگر ہم پیٹرو گراڈ کو بچانے میں کامیاب ہو گئے جس کی مجھے امید ہے' تو یہ یوڈینچ کا خاتمہ ہو گا پھر مسئلہ یہ ہو گا کہ اسے استھونیا میں سیاسی پناہ ملتی ہے کہ نہیں۔ استھونیا کو اس پر اپنی سرحدیں بند کر دینی چاہیں۔ اگر وہ استھونیا پر حملہ کرنے کا حق محفوظ رکھتے ہیں۔'' جب ہماری فوج نے یوڈینچ کو پیچھے دھکیلنا شروع کر دیا تو میری یہ تجویز منظور کر لی گئی۔ لیکن اسے پیچھے ہٹانے میں کچھ وقت لگ گیا۔

پیٹروگراڈ میں اس شہر کے راہنما کم ہمتی اور بے حوصلگی کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ جیسے ہر چیز ان کے ہاتھوں سے پھسل رہی تھی۔ ہماری فوج پسپائی اختیار کر کے چھوٹے چھوٹے یونٹوں میں تقسیم ہو رہی تھی۔ کمانڈنگ آفیسر کمیونسٹوں کی طرف دیکھ رہے تھے اور کمیونسٹ زینوشیف کی طرف۔ زینوشیف ابتری اور پریشانی کی تصویر بنا ہوا تھا۔ سیورڈلوف نے مجھ سے کہا۔ ''اس کی حالت تو بہت خراب ہے۔'' سیورڈلوف کو انسانوں کی خوب پہچان تھی۔ اچھے وقتوں میں جب کبھی لینن کہا کرتا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں تھی تو زینوشیف ساتویں آسمان پر چڑھ جاتا۔ لیکن جب حالات خراب ونے لگتے تو وہ صوفے پر لیٹ کر بدل ڈھیلا چھوڑ دیتا اور آہیں بھرنے لگتا۔ 1917ء سے مجھے متعدد بار ایسے مواقع حاصل ہوئے تھے کہ خود کو یہ یقین دلا سکوں کہ زینوشیف کوئی معتدل مزاج بھی رکھتا تھا۔ یا وہ ساتویں آسمان پر ہوتا' یا پھر فوصے پر دراز ہو جاتا۔ اس دفعہ وہ صوفے پر لیٹا ہوا تھا۔ اسے دکھائی نہیں دے رہا تھا کہ اس کے آس پاس بہادر لوگ بھی موجود تھے۔ مثلاً لیش وچ۔ مگر وہ بھی مایوسی کا شکار رہتے تھے۔ میں نے سمولنی سے فون کر کے ایک فوجی گاڑی منگوائی۔ گاڑی وقت پر نہ پہنچی۔ گیراج کے انچارج کی آواز میں ایک مایوسی' نا امیدی او رخود کو تقدیر کے سپرد کرنے کی کیفیت تھی جو نچلے ملازمین کو بھی بے حوصلہ بنا رہی تھی۔ اب غیر معمولی اقدامات کی ضرورت تھی۔ دشمن دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ اس پھندے جیسی صورتحال میں میں نے اپنی ٹرین کے سٹاف کی طرف دیکھا۔ یہ وہ لوگ جن پر ہر قسم کے حالات میں اعتماد کیا جا سکتا تھا۔ انہوں نے اپنا جائزہ لیا' رابطے قائم کیئے' ان فٹ لوگوں کو ہٹایا اور یہ خلا پورا کیا۔ سرکاری مشینری مکمل طور پر حوصلہ ہار چکی تھی۔ میں نے اسے چھوڑ کر دو قدم نیچے اترا اور ضلعی سطح پر ملوں' فیکٹریوں اور بارکوں میں چلا گیا۔

ہر کسی کو امید تھی کہ شہر جلد ہی دشمن کے حوالے کر دیا جائے گا۔ لہذا لوگ سامنے آنے سے ڈر رہے تھے۔ لیکن جب لوگوں کو یہ معلوم ہونا شروع ہو گیا کہ شہر دشمن کے حوالے نہیں کیا جائے گا' اور اگر ضرورت پڑی تو چوکوں' سڑکوں اور گلیوں میں اس کا دفاع کیا جائے گا تو لوگوں کی رح ایک دم بدل گئی۔ بہادروں اور جان نثاروں نے اپنے سر اونچے کر لیے۔ کرالیس اٹھائے مرد اور عورتوں نے ملوں اور فیکٹریوں کو بھرنا شروع جو دیا۔ ان کی حالت قابل رحم تھی۔ ان کے پیٹ روٹی کے محتاج تھے' ان کے جسموں پر چیتھڑے لٹک رہے تھے' ان کے جوتے ایک دوسرے سے ملتے نہیں تھے' اور ان میں سوراخ تھے جن سے ان کے پاؤں باہر نکلے ہوئے تھے۔

''کامریڈو! ہم پیٹروگراڈ نہیں دیں گے۔''

''بالکل نہیں۔'' عورتوں کی آنکھوں میں ایک خاص جذبے کی جلتی ہوئی لو تھی۔ مائیں، بیویاں اور بیٹیاں اپنی گرہستی چھوڑنے کو تیار تھیں مگر اپنے گرم آشیانے نہیں۔ ''نہیں، ہم پیچھے نہیں ہٹیں گے۔'' عورتوں کی آواز چیخوں کی شکل میں بلند ہو رہی تھی۔ انہوں نے اپنی کرالیس اور بیلچے رائفلوں کی طرح اوپر اٹھائے ہوئے تھے۔ فقط چند لوگوں کے پاس رائفلیں تھیں۔ مشین گنیں کہیں کہیں دکھائی دیتی تھیں۔ تمام شہر نے خود کو مختلف حصوں میں تقسیم کر لیا۔ محنت کش اسے کنٹرول کر رہے تھے۔ اہم جگہوں کے گرد خاردار تار لگا دیے گئے تھے۔ چند جگہیں توپیں نصب کرنے کیلئے چن لی گئیں۔ اور یہ اندازہ بھی کر لیا گیا کہ ان کی مار کتنی دور تک ہوگی۔ تقریباً ساٹھ توپیں کھلے چوکوں اور اہم چوراہوں میں لگا دیں گئیں۔ نہروں، باغوں، دیواروں، باڑھوں اور گھروں کو مضبوط کر دیا گیا۔ شہر کے نواح اور دریائے نیوا کے کناروں پر خندقیں کھود دی گئیں۔ شہر کے سارے جنوبی حصے کو ایک قلعے میں بدل دیا گیا۔ بہت سی سڑکوں اور چوکوں میں رکاوٹیں کھڑی کر دی گئیں۔ محنت کشوں، کسانوں، بارکوں، عقبی یونٹوں حتیٰ جگ فوج کے اندر ایک نیا جذبہ بھر گیا۔

یوڈینچ پیٹروگراڈ سے دس ورسٹ کے فاصلے پر پلکوو کی بلندیوں پر کھڑا تھا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں میں دو سال پہلے اس وقت گیا تھا جب انقلاب نیا نیا اقتدار میں آیا تھا اور وہ اپنی زندگی کی خاطر کرنسکی اور کراسنوف کی فوجوں سے نبرد آزما تھا۔ ایک مرتبہ پھر پیٹروگراڈ کی قسمت ہوا میں معلق تھی ہم نے پسپائی کے مرض سے ہر حال میں نجات حاصل کرنی تھی۔

18 اکتوبر کو میں نے یہ آرڈر جاری کیا۔ ''ایسی غلط رپورٹیں مت بھیجیں کہ سخت لڑائی ہو رہی ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ افراتفری پھیلی ہوئی ہے۔ جھوٹ کی سزا غداری ہوگی۔ فوج میں غلطی کی تو گنجائش ہے مگر جھوٹ، فریب اور خود فریبی کی نہیں۔'' دباؤ کے ان لمحات میں میں نے یہ ضروری سمجھا کہ فوج اور ملک کے سامنے تلخ حقیقت رکھ دوں۔ جس قسم کی بے ہودہ پسپائیاں رروز ہو رہی تھیں انہیں عوام کے سامنے لانا ضروری تھا۔ ایک رائفل رجمنٹ پر جب دشمن نے اس کے بازوؤں کی طرف سے حملہ کیا تو وہ پریشان ہوگئی۔ اس کے کمانڈر نے پیچھے ہٹ جانے کا حکم دیا۔ رجمنٹ دس ورسٹ تک مسلسل بھاگ کر الیگنڈ روفا پہنچ گئی۔ بعد میں پڑتال کرنے پر معلوم ہوا کہ بازو پر آنے والا یونٹ ہمارا اپنا ہی تھا۔ افسوس کی یہ بات تھی

کہ بھگوڑا رجمنٹ کوئی ایسی بری بھی نہیں تھی۔ جب اس کی خود اعتمادی بحال ہوگئی تو وہ سردی کے باوجود اسی رفتار سے واپس محاذ پر چلی گئی جس رفتار سے اس نے پسپائی اختیار کی تھی۔ وہاں جا کر اس نے دشمن کو مار بھگایا اور اپنی پوزیشن دوبارہ حاصل کر لی۔ ایسا کرنے میں اس کا تھوڑا سا نقصان بھی ہوا۔

اس ساری کہانی میں پوری جنگ کے دوران میں مجھے پہلی مرتبہ ایک رجمنٹ کا کردار ادا کرنا پڑا۔ جب پسپائی اختیار کرنے والی رجمنٹ الیگنڈ روفا کے ڈویژنل ہیڈ کوارٹر کے سامنے پہنچی تو میرے ہاتھ جو گھوڑا لگا میں اس پر سوار ہوگیا اور رجمنٹ کو واپس چلنے کو کہا۔ پہلے چند لمحے تو ایک افراتفری سی پھیل گئی۔ بہت سوں کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا ہو رہا تھا۔ بعض سپاہی ابھی تک بھاگ رہے تھے۔ لیکن میں نے گھوڑے پر ان کا تعاقب کیا اور ایک ایک کو واپس لایا۔ اس وقت مجھے پتا چلا کہ میرا اردلی کوزلوف جو ماسکو کا کسان اور پرانا سپاہی تھا' میرے پیچھے پیچھے تھا۔ وہ بڑی ہیجانی حالت میں تھا۔ وہ ریوالور لہراتا ہوا سپاہیوں کی طرف جا رہا تھا۔ اور میرے الفاظ دہراتا ہوا انہیں اپنی طرف سے کہہ رہا تھا۔ ''میرے بچو' حوصلہ کرو۔ کامریڈ ٹراٹسکی خود تمہارے ساتھ ہے۔'' اب وہ اسی رفتار سے آگے بڑھ رہے تھے۔ جس رفتار سے پسپا ہوئے تھے۔ کوئی بھی پیچھے نہ رہا۔ دو ورسٹ بعد گولیاں چلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ہمارا پہلا آدمی زخمی ہو کر گر پڑا۔ رجمنٹ کے کمانڈر میں حیرت ناک تبدیلی آ گئی۔ وہ سب سے خطرناک جگہ پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی دونوں ٹانگیں زخمی ہوگئیں۔ اتنے میں ہم نے اپنی کھوئی ہوئی جگہ حاصل کر لی تھی۔ میں ایک ٹرک میں بیٹھ کر ہیڈ کوارٹر واپس آ گیا۔ راستے میں ہم نے زخمیوں کو اٹھایا۔ جس جذبے کی ضرورت تھی وہ سپاہیوں کے اندر پھونک دیا گیا تھا۔ اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ ہم پیٹروگراڈ کو بچا لیں گے۔

اس جگہ لمحہ بھر رک کر میں ایک ایسے سوال کی طرف آنا چاہوں گا جو قاری اپنے آپ سے کئی دفعہ پوچھ چکا ہوگا۔ جب ایک آدمی پوری فوج کا انچارج ہو تو وہ خود کو کیسے کسی خطرے میں ڈال سکتا ہے؟ میرا جواب ہوگا کہ جنگ اور امن کے کوئی قطعی قوانین نہیں ہوتے۔ ہر چیز کا انحصار حالات پر ہوتا ہے۔ میرے ساتھ دوروں پر جانے والے افسر اکثر یہ کہا کرتے تھے۔ ''پرانے وقتوں میں بھی ایک ڈویژنل کمانڈر اس طرح اپنی ناک آگے نہیں گھسیڑتا تھا'' بورژوا صحافیوں نے اسے ''ذاتی مشہوری'' کا نام دے دیا۔ انہوں نے اپنی مانوس زبان میں ایک ایسی بات کہنے کی کوشش کی جس کو سمجھنے کی ان میں صلاحیت ہی نہیں

تھی اصل بات یہ ہے کہ جن حالات میں سرخ فوج بنائی گئی تھی اور خانہ جنگی کی جو نوعیت تھی' اسکے پیش نظر مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ تنظیم' جنگی روایت' فوجی حاکمیت -- ہر شے تو نئے سرے سے وضع کی گئی تھی۔ فوج کو منصوبے کے مطابق ہر شے مہیا کرنا ہماری اختیار میں نہیں تھا' خاص طور پر ابتدا میں۔ ہم اسے آڈروں اور درخواستوں سے حرکت میں نہیں لا سکتے تھے۔ یہاں انقلابی جذبہ ہی کارگر ثابت ہو سکتا تھا۔ سپاہیوں کی نظروں میں وقار حاصل کرنا بے حد ضروری تھا تاکہ کل کو اعلیٰ حکام نے ان سے جو کام لینا تھا اس کا کوئی جواز نکل سکے۔ جہاں روایت کی کمی ہو وہاں ایک اچھی مثال قائم کرنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ فتح کے راستے پر ذاتی خطرہ مول لینا ناگزیر بن جاتا ہے۔

رجمنٹوں اور یونٹوں کے کمانڈنگ افسر جو مسلسل شکستوں سے بددل ہو چکے تھے' انہیں ذرا ہلانے' تازہ دم کرنے اور نئی تربیت دینے کی ضرورت تھی۔ اس کے علاوہ کمساروں کے اندر بھی تبدیلیوں کی ضرورت تھی۔ تمام یونٹوں کے اندر کمیونسٹ داخل کر کے انہیں مضبوط کیا گیا تھا۔ تازہ یونٹ بھی آنا شروع ہو گئے تھے۔ تربیت کیلئے فوجی سکولوں کا عملہ محاذ پر بھیجا گیا تھا۔ دو تین دنوں کے اندر سپلائی لائن جو بے حد خراب ہو چکی تھی' اسے درست کر دیا گیا۔ سرخ فوج کے جوانوں کو اچھا کھانا' نیا لباس اور بوٹ مہیا کیے گئے۔ میری ایک دو تقریروں نے ان پر جادو جیسا اثر کیا۔ انہوں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور وہ بالکل مختلف دکھائی دینے لگے۔

21 اکتوبر بڑا نازک دن تھا۔ ہماری فوجیں پلکوو کی بلندیوں سے واپس آ چکی تھیں۔ مزید پسپائی کا مطلب لڑائی کو پیٹروگراڈ کی سڑکوں پر لے جانا تھا۔ اب تک سفید فام یونٹ کسی بڑی مزاحمت کے بغیر آگے بڑھ رہے تھے۔ 21 ' اکتوبر کو ہماری فوج پلکوؤ محاذ پر ڈٹ گئی اور اس نے زبردست مزاحمت کا مظاہرہ کیا۔ دشمن کی پیش قدمی رک گئی۔ 22 اکتوبر کو سرخ فوج نے حملہ شروع کر دیا۔ یوڈینچ کے پاس ریزو فوج لانے اور محاذ کو مضبوط کرنے کا وقت تھا۔ لڑائی تیز ہو گئی۔ لیکن 23 اکتوبر کی شام تک ہم نے تسار کوئی سیلو اور پفلووسک واپس لے لیے تھے۔ اس دوران میں پندرھویں فوج جو قریب ہی تھی' اس نے جنوب کی جانب سے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ جس سے سفید فاموں کے عقب اور دائیں بازو کو خطرہ پیدا ہو گیا۔ پھر پانسہ پلٹنے کا وقت آ گیا۔ ہمارے یونٹ جو پہلے بے خبری کی حالت میں حملے کی زد میں آ جاتے تھے اور پسپائیوں سے سخت بیزار ہو چکے تھے' اب وہ ایک دوسرے سے مطابقت پیدا کر کے جان نثاری کے

جوہر دکھا رہے تھے۔ان کا بڑا نقصان ہوا۔ بعد میں سفید فام فوج کی ہائی کمان نے بتایا کہ ان کا نقصان ہمارے نقصان سے زیادہ تھا۔ یہ ممکن ہوسکتا تھا۔ان کے پاس تجربہ اور اسلحہ ہم سے زیادہ تھا۔لیکن ہماری فوج کے اندر قربانی دینے کا جذبہ زیادہ تھا۔ پیٹروگراڈ اور ماسکو کے نوجوان محنت کش' کسان اور فوجی طلبا اپنی جانوں سے بے نیاز ہوگئے تھے۔وہ ریوالور ہاتھ میں لیے مشین گنوں کی گولیوں کی بوچھاڑ میں آگے بڑھتے جاتے۔سفید فام فوج کے جنرل سٹاف نے بعد میں سرخوں کی ''دیوانگی پر مشتمل بہادری'' کا اعتراف کیا۔

پہلے شاید ہی کوئی قیدی پکڑا جاتا تھا۔سفید فاموں میں کوئی بھگوڑا نہیں تھا اب ان کے بھگوڑوں اور قیدیوں کی تعداد میں ایک دم اضافہ ہوگیا۔ 24 اکتوبر کو جنگ کی سنجیدہ صورتحال دیکھ کر میں نے یہ آرڈر جاری کیا۔''مجھے اس سپاہی پر افسوس ہوگا جو کسی نہتے بھگوڑے یا قیدی پر ہاتھ اٹھائے گا۔''

ہماری پیش قدمی جاری رہی۔ان استھونیا اور فن لینڈ نے مداخلت کے متعلق سوچنا بند کردیا تھا۔ہم نے سفید فام یونٹوں کو تباہ کر کے مکمل پست ہمتی کی حالت میں انہیں استھونیا کی سرحدوں کی طرف دھکیل دیا تھا۔سرحد پار کرتے ہی استھونیا کی حکومت نے انہیں غیر مسلح کردیا۔لندن اور پیرس نے اس کے بارے میں کوئی خبر نہ دی۔اب تک جسے اتحادیوں کی ''شمال مغربی فوج'' کہا جاتا تھا' اب وہ سردی اور بھوک سے تباہ حالی کا شکار تھی۔چودہ ہزار سفید فام سپاہی بیماریوں کا شکار ہوکر ہسپتالوں میں داخل ہوگئے۔ یہ ''پیٹروگراڈ بچار کے عالمی ہفتے'' کا اختتام تھا۔

سفید فام راہنماؤں نے بعد میں ایڈمرل کووان کے طرز سلوک کی شکایت کی جس نے انہیں فن لینڈ کی خلیج سے مدد دینے کا وعدہ کیا تھا۔یہ شکائتیں بڑی حد تک مبالغہ آمیز تھیں۔کہا گیا کہ شب خون کے نتیجے میں ہماری تین تارپیڈو کشتیاں ڈبو دی گئی تھیں جن میں ساڑھے پانچ سو جہاز ران تھے۔ برطانوی ایڈمرل کو اس پر کچھ تو شاباش دینے کی ضرورت تھی۔اس دن نقصانات کے متعلق جو آرڈر جاری کیا گیا اس کے یہ الفاظ تھے۔''سرخ سپاہیو! تمام محاذوں پر سفید فاموں نے تمہارا جم کر مقابلہ کیا۔ردانقلاب کی حامی فوج تم پر برطانوی بندوقوں سے گولیاں چلاتی رہی۔جنوبی اور مغربی محاذوں کے شن کروشک اور ہنا کے اسلحہ خانوں میں تمہیں برطانوی طرز کا اسلحہ ملا۔تم نے جو قیدی پکڑے وہ انگریزی یونیفارم میں ملبوس ہیں۔ استراخان اور ملک الملکوت میں عورتوں اور بچوں کے بدن جس اسلحے سے چھلنی کیے گئے وہ بھی انگریزی

اسلحہ تھا۔ان کے جہازوں نے ہمارے ساحلوں پر بم باری کی۔

آج جب ہم برطانیہ کے پٹھو یوڈنیچ کے ساتھ سخت لڑائی میں مصروف ہیں' تمہیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ دوقسم کے برطانیہ ہیں۔ایک برطانیہ منافع خوروں' رشوت خوروں اورخون چوسنے والوں کا ہے۔ اور دوسرا برطانیہ محنت کشوں اور بین الاقوامی اخوت پر یقین رکھنے والوں کا ہے۔ جو برطانیہ ہم سے برسرپیکار ہے وہ کمینے اور بددیانت سٹاک ایکسچینج مالکوں کا ہے۔محنت کشوں اورعوام کا برطانیہ ہمارے ساتھ ہے۔(بری اوربحری فوج کے نام آرڈر'24' اکتوبر 1919ء)

ہمارے لئے سوشلزم کی تعلیم کا کام لڑائی سے جڑا ہوا ہے۔خاک وخون کی بارش میں جو خیالات ذہن میں داخل ہوتے ہیں۔ہمیشہ کے لئے محفوظ ہوجاتے ہیں۔

شکسپیئر کے ڈراموں میں ٹریجڈی اور کامیڈی ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں۔یہی حاصل زندگی کا ہے۔اچھائی کے ساتھ برائی جڑی ہوئی ے۔زینوشیف جواس وق تک صوفے سے اٹھ کر دوسرے یا تیسرے آسمان تک پہنچنے کے قابل ہوگیا تھا' اس نے کمیونسٹ انٹرنیشنل کی طرف سے یہ دستاویز میرے ہاتھ میں دی۔''سرخ پیٹروگراڈ کو بچالینا عالمی پرولتاریہ اورکمیونسٹ انٹرنیشنل کی بہت بڑی خدمت ہے۔ کامریڈ ٹراٹسکی! پیٹروگراڈ کو بچانے کی جدوجہد میں آپ سب سے آگے ہیں۔کمیونسٹ انٹرنیشنل کی مجلس عاملہ کی طرف سے میں آپ کو یہ بینرز اس درخواست کے ساتھ دے رہا ہوں کہ آپ اپنے ہاتھ سے انہیں سرخ فوج کے مستحق یونٹوں کو دے دیں۔''

چیئرمین مجلس عاملہ' کمیونسٹ انٹرنیشنل

جی-زینوشیف

اس قسم کی متعدد دستاویزات مجھے پیٹروگراڈ سوویٹ' ٹریڈ یونینوں اور دوسری تنظیموں کی طرف سے ملیں۔میں نے بینرز یونٹوں میں تقسیم کردیے اور یہ ساری دستاویزات ریکارڈ روم میں محفوظ کرادیں۔لیکن جب زینوشیف نئے ساز کی لے پر رقص کرنے لگا تو اس نے یہ دستاویزات نہ جانے کہاں رکھوادیں۔

اس وقت پیٹروگراڈ میں جو جشن منایا گیا' اب اسے ضابطہ تحریر میں لانا مشکل ہے۔انقلاب نے ایک مرتبہ پھر اپنا سر اوپر اٹھالیا تھا۔یوڈنیچ پر ہماری فتح لینن کی آنکھ میں بے حد اہم تھی پیٹروگراڈ کا دفاع کرنے پر پولٹ بورو نے مجھے سرخ پرچم کے اعزاز سے نوازنے کا فیصلہ کیا۔یہ میرے لیے بڑی مشکل

صورتحال تھی۔ کیونکہ ہم نے پرانی حکومت کے اعزازات دینے کے تمام آرڈرز منسوخ کر دیے تھے۔ سرخ پرچم دینے کا حکم جاری کراتے وقت مجھے یہ امید تھی کہ جو لوگ انقلابی شعور کے تحت زیادہ تن دہی سے فرائض انجام دینا چاہتے تھے ان کیلئے ایک انعام بھی موجود تھا۔ یہاں لینن نے میری حمایت کی۔ اس اعزاز کی منظوری دے دی گئی۔ میں اسے لینے سے انکار نہ کر سکا۔ پھر سرخ پرچم بہادری کی علامت بن گیا۔

اس سلسلے میں مجھے ایک واقعہ یاد آ رہا ہے جسے میں نے بعد میں اس کے صحیح سیاق و سباق میں دیکھا۔ پولٹ بورو کے اجلاس کے اختتام پر کامینیف نے سٹالن کو بھی اسی قسم کا اعزاز دینے کی تجویز پیش کی۔ کس لئے؟'' کالینن نے غصے سے پوچھا''سٹالن کو کس بات طر دیا جائے؟'' پھر مذاق مذاق میں اس کا غصہ ٹھنڈا کیا گیا اور تجویز منظور کر لی گئی۔ اجلاس کے بعد بخارن کالی نن پر برس بڑا۔ ''تمہیں سمجھ نہیں آ رہی؟ یہ لینن کی خواہش ہے۔ جو کچھ دوسروں کو ملتا ہے جب تک سٹالن اسے حاصل نہ کر لے اسے چین نہیں آتا۔ وہ کسی کو معاف نہیں کرے گا۔ میں لینن کی بات سمجھتا تھا اور اندر سے اس سے متفق تھا۔

اعزاز دینے کی تقریب بڑی پروقار تھی اسے گرینڈ اوپرا تھیٹر میں منعقد کیا گیا۔ میں نے تمام بڑے سوویٹ اداروں کے مشترکہ اجلاس کے سامنے فوجی صورتحال پر رپورٹ پیش کی۔ جب اجلاس کے اختتام کے قریب چیئرمین نے سٹالن کا نام لیا تو میں نے بھی تالی بجانے کی کوشش کی۔ میرے بعد دو یا تین ہچکچاتے ہوئے ہاتھوں نے بھی تالیاں بجائیں سارے ہال میں ایک سرد مہر حیرت سی پھیل گئی۔ تالیوں کے بعد یہ خاص طور پر محسوس کی جا رہی تھی۔ سٹالن نے تقریب میں غیر حاضر رہ دانائی کا ثبوت دیا تھا۔

جب سرخ پرچم کا ایوارڈ میری ٹرین کو بھی دیا گیا تو مجھے بے انتہا خوشی ہوئی۔ 14 نومبر کے آرڈر میں میں نے لکھا۔ ''17 اکتوبر سے 3 نومبر تک ساتویں فوج نے جو بہادرانہ جنگ لڑی ہے اس میں ہماری ٹرین کے عملے نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ کامریڈ کلیگر' ایوانوف اور زستار میدان جنگ میں داد شجاعت دیتے ہوئے کام آئے۔ کامریڈ پریڈی' درودن' پورن چرنی وتشیف' کوپری وچ اور تسنسک زخمی ہوئے۔ کامریڈ ایڈم سن' پورن اور کسیلس کے گولوں کے صدموں میں مبتلا ہیں۔ میں دوسرے ناموں کا ذکر نہیں کروں گا کیونکہ پھر مجھے تمام ناموں کا ذکر کرنا پڑے گا۔ محاذ پر جو نمایاں تبدیلی وقوع پذیر ہوئی ان میں ٹرین کے عملے نے بڑا اہم کردار انجام دیا تھا۔

چند ماہ بعد لینن نے مجھ سے فون پر پوچھا۔ ''تم نے کردیتو وف کی کتاب پڑھی ہے؟'' اس نام سے مجھے کچھ پتا نہ چلا۔ ''وہ ایک سفید فام فوجی ہے' ایک دشمن۔ اس نے پیٹروگراڈ پر یوڈینچ کی پیش قدمی کے متعلق لکھا ہے۔'' لینن سفید فاموں کی کتابوں کی اشاعت پر میری نسبت زیادہ نظر رکھتا تھا۔ ایک دن بعد اس نے پھر پوچھا۔ ''تم نے وہ کتاب پڑھی ہے؟''

''نہیں''

''میں تمہیں پڑھ کر سناؤں؟'' ہم دونوں کو اسی دن برلن سے نئی کتابیں آئی تھیں۔ لہذا میں نے خود کتاب پڑھنے کا فیصلہ کیا۔ لینن نے دوبارہ کہا۔'' آخری باب ضرور پڑھنا۔ یہ دشمن کی طرف سے تعریف ہے۔ اس میں تمہارے بارے میں بھی کچھ لکھا ہے۔'' مجھے کتاب پڑھنے کا موقع نہ مل سکا۔ پھر قسطنطنیہ میں مجھے یہ کتاب دیکھنے کا موقع مل گیا اس کا آخری باب پڑھنے کے متعلق مجھے لینن کا اصرار یاد آ گیا۔ یوڈینچ کے اک وزیر کی طرف سے بطور دشمن میری تعریف کچھ اس طرح کی گئی تھی۔

16 اکتوبر کو ٹراٹسکی تیزی سے پیٹروگراڈ کے محاذ پر آیا۔ اس کی شعلہ فشاں تقریر کے بعد سرخ فوج کی گھبراہٹ اور افراتفری ختم ہوگئی۔ گست چائنا پر قبضے سے چند گھنٹے پہلے وہ سفید فاموں کی پیش قدمی روکنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ لیکن جب اسے یہ ناممکن لگا وہ وہاں سے نکل کر جلدی سے تراس کوئے کے دفاع کیلئے چل پڑا۔ ریزو فوج ابھی تک نہیں آئی تھی۔ لیکن اس نے فوجی طلبا اور پیٹروگراڈ کی ساری آبادی کو متحرک کر کے سرخ فوج کے تمام یونٹوں کو دوبارہ محاذ کی طرف دھکیل دیا۔ پھر اس نے طاقت ور ذرائع استعمال میں لاتے ہوئے پیٹروگراڈ کے تمام راستوں کا دفاع ممکن بنا دیا۔

''ٹراٹسکی نے کمیونسٹ محنت کشوں کے گروہ منظّم کیے۔ یہ ایسے لوگ تھے جو بڑے پر اعتماد جذبے کے مالک تھے۔ وہ انہیں محاذ پر لے آیا۔ یوڈینچ کے سٹاف کا کہنا ہے کہ یہ لوگ دوسرے فوجی یونٹوں کے ساتھ مل کر شیروں کی طرح لڑتے رہے۔ وہ ٹینکوں پر سینگنوں سے حملہ کر رہے تھے۔ مشین گنیں انہیں دانوں کی طرح بھونتی رہیں مگر وہ اپنے مورچوں کا دفاع کرنے میں لگے ہوئے۔ وہ جذبہ شہادت سے سرشار تھے۔''

ہمارے آدمیوں کے پاس مشین گنیں نہیں تھیں۔ اس کے باوجود ہم نے پیٹروگراڈ کو بچا لیا۔

فوجی مخالفت

پورے ملک میں پرولتاریہ اور کسانوں کے تعلقات سرخ فوج کی بتدریج کامیاب تعمیر کی بنیاد و بن رہے تھے۔ بعد میں 1923ء میں یہ احمقانہ قصہ گھڑ لیا گیا کہ میں کسان طبقے کی اہمیت کو ''کم تر'' سمجھتا تھا۔ اس کے برعکس حقیقت یہ تھی کہ 1918ء سے 1921ء تک دیہی زندگی کے مسائل سے میرا زیادہ قریبی اور براہ راست تعلق رہا تھا کیونکہ فوج زیادہ تر کسانوں کے اندر ہی سے بنائی جا رہی تھی اور ان کی زندگی سے میرا مسلسل تعلق رہتا تھا۔ مسئلہ اس قدر گھمبیر ہے کہ اسے یہاں تفصیل سے زیر بحث نہیں لایا جاسکتا۔ لہذا میں دو یا تین مثالوں پر ہی اکتفا کروں گا۔

22 مارچ 1919ء کو میں نے بذریعہ تار ماسکو سے مطالبہ کیا کہ مرکزی کمیٹی وولگا کے علاقت میں مرکزی مجلس عاملہ کے تحت ہونے والی ایک انکوائری کا فیصلہ کرے اور اس سلسلے میں مرکزی کمیٹی اور مرکزی مجلس عاملہ کے ارکان سے ایک بااختیار کمیشن مقرر کرے۔ کمیشن کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ وہ مرکزی سوویٹ اقتدار پر کسانوں کا اعتماد پختہ کرے، مقامی بے قاعدگیوں کو دور کرے۔ سوویت حکومت کے مجرم اہل کاروں کو ان کی بے قاعدگیوں پر سزائیں دے اور عوام سے شکائیتیں اور دوسرا مواد جمع کر کے اس کی بنیاد پر درمیانے درجے کے کسانوں کے حق میں قوانین کا اجراء کرے۔

یہ گفتگو براہ راست سٹالن سے کی تھی۔ میں نے اس درمیانے درجے کے کسان کی اہمیت سے بھی آگاہ کیا تھا۔ اسی سال میرے کہنے پر کالی نن کو مرکزی مجلس عاملہ کا چیئر مین چنا گیا۔ وہ درمیانے درجے کے کسانوں کے زیادہ نزدیک تھا۔ اور ان کی ضروریات کو سمجھتا تھا۔ زیادہ اہم بات یہ تھی کہ میں فروری یورال کے کسانوں کی زندگیوں کا مشاہدہ کرنے کے بعد نئی اقتصادی پالیسی میں تبدیلی پر مسلسل اصرار کر رہا تھا۔ اس سوال پر میں مرکزی کمیٹی میں گیارہ کے مقابلے میں فقط چار ووٹ حاصل کر سکا۔ اس وقت لینن خوراک پر ٹیکس ختم کرنے کے حق میں بالکل نہیں تھا۔ سٹالن نے بھی میرے خلاف ووٹ دیا تھا۔ اگرچہ ایک سال بعد نئی اقتصادی پالیسی میں ردوبدل متفقہ طور پر منظور کر لیا گیا۔ یہ اقدام کرونسٹاف بغاوت اور فوج میں ناراضگی کی لہر کے بعد کیا گیا تھا۔

بعد میں آنے والے برسوں میں سوویٹوں میں جاری تعمیراتی کام کے سلسلے میں پیش آنے والی مشکلات اور اصولوں کا مسئلہ سب سے پہلے فوج کے اندر ابھرا اور وہ بھی ایک گھمبیر شکل میں۔ اس کا حل اسی وقت تلاش کرنے کی ضرورت تھی۔ ازالہ فوری طور پر ہونا چاہیے تھا۔ اسی سلسلے میں اگر کوئی مخالفت تھی تو

اسے بھی بروقت دیکھا جاتا۔ یہ ایک نظام سے دوسرے نظام میں داخل ہونے کے لیے ایک بڑی چھلانگ کا مسئلہ تھا۔ اگر ہمارے پاس بحث کے لیے زیادہ وقت ہوتا تو ممکن تھا ہم زیادہ غلطیاں کر جاتے۔

اس کے باوجود پارٹی کے اندر لڑائی تھی، اور لڑائی بھی سخت قسم کی۔ اس کے بغیر چارہ بھی نہیں تھا اور اسی تناسب سے مشکلات بھی زیادہ تھیں۔ پرانی فوج ابھی تک ٹوٹنے کے عمل میں تھی۔ اور وہ جنگ کے خلاف ہر جگہ نفرت پھیلا رہی تھی۔ دوسری طرف ہم نئی فوج بنانے میں مصروف تھے۔ زار کے افسر فوج سے نکالے جا رہے تھے، اور وہ بھی بڑی بے رحمی کے ساتھ۔ ہم انہیں سرخ فوج میں انسٹرکٹروں کے طور پر رکھ رہے تھے۔ پرانی رجمنٹوں میں کمیٹی سسٹم برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ بصورت دیگر نے انتشار کی علامت نہیں جانا تھا۔ جب ہم نیا نظام وضع کرنے میں مصروف تھے تو پرانے نظام کو دی جانے والی گالیاں ہمارے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ تھوڑے ہی عرصے میں ہم نے رضا کارانہ بھرتی سے جبری بھرتی اور غیر منظم گروہوں سے منظّم تنظیموں کی طرف چلے جانا تھا۔ بے قاعدگیوں کے خلاف ہمیں مسلسل جہاد کرنا تھا۔ اس جہاد میں مصالحت کی ذراسی بھی گنجائش نہیں تھی۔ کچھ زیادہ ہی سخت اقدام کی ضرورت تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ پارٹی کی صفوں کے اندر بھی بے قاعدہ قسم کی لڑائیاں جگہ پانے لگی تھیں۔

سرخ فوج کی تنظیم کے پہلے مہینوں میں فوجی مسئلے پر حزب مخالف نے یادہ سخت رویہ اختیار نہیں کیا تھا جو انتخابی طریقہ کار کے دفاع کے علاوہ ماہرین کے نام کا اندراج، فوجی تنظیم کا نفاذ اور فوج کی مرکزیت کے خلاف تھا۔ حزب مخالف اپنے موقف کیلئے کسی عام نظریاتی فارمولے کی تلاش میں تھا۔ اس کا اصرار تھا کہ فوج کی مرکزیت دینے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ انقلاب جکا لب لباب ہی سریع حرکتی، چالوں اور حملے میں تیزی اور پدھرتی ہوتا ہے۔ اس کی لڑاکا طاقت چھوٹے چھوٹے آزاد یونٹوں کی شکل میں ہونی چاہیے جو اسلحے میں بھی خومختار ہوں۔ فوج کو ایک جگہ باندھ کر نہیں رکھنا چاہیے۔ حملے کی صورت میں اسے ایک ہمدرد آبادی پر تکیہ کرنا چاہیے۔ یہ جب چاہے دشمن پر عقبی حمل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ قصہ مختصر چھوٹی جنگ کے حربوں کو انقلاب کے حربے بتایا گیا۔

یہ سب تجریدی اور بے معنی باتیں تھیں اور اپنی کمزوریوں کو خیال پرستی کا لباس پہنانے کی کوشش تھی۔ خانہ جنگی کے تجربے نے انہیں غلط قرار دے دیا تھا۔ مرکزی تنظیم اور حکمت عملی نے فوج کو چھوٹے چھوٹے مقامی یونٹوں میں تقسیم کرنے کے خیال کو باطل ثابت کر دیا تھا۔

سرخ فوج میں شروع میں ہزاروں اور بعد میں لاکھوں چھوٹے بڑے افسر تھے۔ دو سال پہلے وہ اوسط درج کے آزاد خیال لوگوں کو انقلابی سمجھتے تھے۔ اس لحاظ سے تو بالشویک ان کیلئے کسی اور ہی دنیا کی مخلوق تھے۔ اس وقت میں نے حزب مخالف کے خلاف لکھا تھا۔ ''اگر ہم ہزاروں ماہرین کو بشمول فوجی ماہرین کے اپنے نظریے کی اخلاقی طاق اور انقلاب کی بلند حوصلگی کے قائل نہ کر سکے تو ہمارا اور ہماری پارٹی کا کیا فائدہ۔'' ہم اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب تو ہوگئے مگر آسانی سے نہیں' اور نہ ہی اختلافات کے بغیر۔

کمیونسٹوں کو فوجی طرز زندگی اپنانے میں مشکل پیش آئی۔ یہاں سلیکشن اور تربیت ضروری تھی۔ جب اگست 1918ء میں ہم قازان کے سامنے کھڑے تھے تو میں نے لینن کو تار بھیجا تھا۔ ''جو کمیونسٹ حکم ماننا جانتے ہیں اور مصائب اٹھانے اور مرنے کیلئے تیار ہیں' انہیں یہاں بھیجا جائے۔ مظاہرے کرنے والوں کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔'' ایک ال بعد جب یوکرائن اور خود پارٹی کے اندر انتشار پھیلا ہوا تھا' میں نے ایک حکم نامہ جاری کیا۔ ''پارٹی نے جس کمیونسٹ کو فوج میں شمولیت کیلئے کہا ہے وہ اب فوج کا حصہ بن گیا ہے اور اس کے وہی فرائض اور حقوق ہیں جو ایک سپاہی کے ہیں۔ جس کسی نے بھی اس حکم کی خلاف ورزی کی وہ سزا کا مستوجب ہوگا۔'' اس حکم کر بڑا شور شرابا پیدا ہوا۔ شر پسندوں کی کہیں کمی نہیں ہوتی۔

فوجی مخالفوں میں پاتاکوف بھی شامل تھا جو آج سٹیٹ بینک کا ڈائریکٹر بنا بیٹھا ہے۔ وہ سرکاری عہدہ لینے کی خاطر ہر قسم کے حزب مخالف میں شامل ہو جاتا تھا۔ تین یا چار سال پہلے جس گروپ میں میں تھا اسی میں پاتاکوف بھی تھا میں نے مذاق کے طور پر کہا تھا کہ اگر فوج حکومت کا تختہ الٹ دے تو پاتاکوف اگلے دن بریف کیس ہاتھ میں پکڑے نئی حکومت کی طرف سے دفتر جا رہا ہوگا۔ اس میں اب میں اتنا ہی اضافہ کر سکتا ہوں کہ اگر ایسا نہیں ہوتا تو اس میں قصور فوج کا ہی ہوگا' پاتاکوف کا ہرگز نہیں۔ یوکرائن میں اس کا بڑا اثر تھا۔ یہ کوئی اتفاقیہ بات نہیں تھی۔ وہ ایک پڑھا لکھا مارکسسٹ ہے' خاص طور پر معیشت کے حوالے سے۔ وہ بلاشبہ ایک اچھا منتظم بھی ہے۔ ابتدائی دنوں میں پاتاکوف کے اندر بڑا انقلابی جذبہ تھا۔ مگر بعد میں یہ جذبہ نوکر شاہی قدامت پسندی میں بدل گیا۔ پاپاکوف کو اس کے نیم انتشار پسندانہ نظریات سے باہر نکالنے کیلئے میں نے شروع میں اسے ایک عہدہ دے دیا تھا تاکہ وہ قول سے فعل میں بدل

جائے۔ یہ طریقہ نیا نہیں ہے مگر کارگر ضرور ہے۔اس کے انتظامی شعور نے اسے وہی کچھ کرنے پر مجبور کر دیا جس کے خلاف اس نے بظاہر لفظوں کی جنگ شروع کر دی تھی۔ ایسا ہوتا رہتا ہے۔

فوجی مخالف کے تمام عناصر کو جلد ہی کام میں لگا دا گیا۔اس کے ساتھ ہی میں نے انہیں یہ بھی کہہ دیا کہ اگر وہ چاہیں تو اپنے نظریے کے مطابق چند فوجی یونٹ تیار کر سکتے تھے۔ میں انہیں ہر طرح کی مدد مہیا کرنے کو تیار تھا۔ وولگا کے ایک ضلع نے ایسا کرنے پر اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔مگر اس نے جو رجمنٹ تیار کی وہ فوج کی دوسری رجمنٹوں سے کسی طرح بھی مختلف نہیں تھی۔ سرخ فوج ہر محاذ پر جیت رہی تھی۔ جس کے سبب مخالفت بتدریج ختم ہوتی گئی۔

تسارتسن میں وروسیلوف کا یونٹ سرخ فوج میں خاص اہمیت کا حامل تھا۔اس کی فوجی مخالفت بھی خاص نوعیت کی تھی۔ان فوجی یونٹوں کے سربراہ شمالی کاکیشیا کے سابق کمشنڈ کسان تھے۔ جنوبی میدانی علاقے کے کسانوں اور کاسکوں نے درمیان دشمنی کے اس علاقے میں چاپانہ جنگی میں سخت تیزی پیدا کر رکھی تھی جو دیہات تک پھیل اور کنبے کے کنبے ختم کیے جا رہے تھے۔ یہ کسانوں کی جنگ تھی جس کی جڑیں مقامی زمین میں بہت گہری تھیں اور یہ اپنی تندی میں ملک کے تمام حصوں میں انقلابی جدوجہد سے بھی آگے بڑھ گئی تھی۔اس جنگ نے انفرادی طور پر بڑے عمدہ بہادر پیدا کیے تھے مگر جب انہیں بڑی سطح پر فوجی ذمہ داریاں سونپی جاتیں تو وہ ناکام ثابت ہوتے۔

وروسلوف اس کی ایک اچھی مثال تھا۔ وہ ایک محنت کش انقلابی تھا جس نے ہڑتالوں، زیرزمین کاموں، قید اور جلاوطنی میں اپنی قیادت کے جوہر دکھائے تھے۔آج کے بہت سے دوسرے حکمرانوں کی طرح وروسیلوف بھی محنت کشوں میں سے ایک قومی جمہوریت پسند انقلابی تھا، اس سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ یہ بات عالمی سامراجی جنگ اور بعد میں فروری انقلاب میں ثابت ہو گئی۔ وروشیلوف کی سرکاری سوانح عمری میں 1914-17ء کے سال بالکل خالی ہیں، جیسے موجودہ راہنماؤں کے خالی ہیں اس خالی پن کا راز یہ ہے کہ جنگ کے زمانے میں یہ سب لوگ بڑے محبّ الوطن تھے انہوں نے انقلابی جدوجہد ترک کر دی تھی۔ فروری انقلاب میں وروشیلوف نے سٹالن کی طرح چکوف اور ملی کوف کی حکومت کی بطور بائیں جسنب کے راہنما کے حمایت کی تھی۔ یہ سارے انتہائی انقلابی جمہوریت پسند تھے مگر بین الاقوامیت پسند نہیں تھے۔ جو بالشویک جنگ کے دنوں میں محبّ الوطن تھے، وہ فروری انقلاب کے بعد جمہوریت پسند بن

گئے اور آج وہ سٹالن کے قومی سوشلزم کے پیروکار ہیں۔ وروشیلوف بھی انہی میں شامل ہے۔

اگرچہ وہ لگنسک محنت کشوں کے قدرے مرارات یافتہ حصے سے تعلق رکھتا تھا مگر وہ اپنی عادات اور مزاج میں پرولتاری کے بجائے ایک چھوٹی نوعیت کا صنعت کار تھا۔ اکتوبر انقلاب کے بعد وہ فوج کی مرکزیت کے خلاف نان-کمیشنڈ افسروں میں مرکزی حیثیت اختیار کر گیا اور وہ اسی حیثیت سے فوجی تربیت کا مطالبہ کرنے لگا۔ تسارتسن میں فوجی مرکزیت کا مخالف وہی تھا۔

وروشیلوف کے حلقہ اثر میں فوجی اکیڈمی سے تربیت یافتہ افسروں اور ماسکو کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ چونکہ ان کا اپنا کوئی فوجی علم نہیں تھا لہٰذا اس قسم کے سارے لوگ بہتر فوجی تعلیم یافتہ افسروں کے تحت ثانوی حیثیت رکھتے تھے۔ لیکن ان کا اپنے افسروں کے بارے میں وہی رویہ تھا جو ان کا سفید فام فوجیوں کی طرف تھا۔ ماسکو سے ان کا بس اتنا رابطہ تھا کہ اسلحہ کا مسلسل مطالبہ کرتے رہتے تھے۔ ہمارے اسلحہ کے ذخائر کم تھے۔ اسلحہ فیکٹریاں جو کچھ بناتی تھیں فوج کو بھیج دیا جاتا تھا۔ لیکن تسارتسن کی فوج کارتوس اور رائفلیں بہتات سے استعمال کر رہی تھیں۔ جب کبھی ان کا کوئی مطالبہ رد کر دیا جاتا تو وہ ہم ماسکو والوں پر غداری کا الزام عاید کر دیتے۔ تسارتسن فوج کا ماسکو میں اپنا ایک نمائندہ بھی تھا جس کا نام زیوڈور تھا۔ پہلے وہ ایک ڈاکو ہوتا تھا۔ میرا خیال ہے بعد میں اسے پکڑ کر گولی ماردی گئی تھی۔

سٹالن چند ماہ تسارتسن میں رہا۔ وہاں وہ وروشیلوف اور اس کے ساتھیوں سے مل کر میرے خلاف سازش کرنے میں لگا رہا ایسی حرکتیں اس وقت بھی اس کی سرگرمیوں میں نمایاں حیثیت رکھتی تھیں۔ لیکن وہ پیچھے ہٹ جانے کی گنجائش بھی رکھ لیتا تھا۔

تسارتسن کے محاذ سے ہوئی کمانڈ یا کمانڈنگ افسر کی طرف سے مجھے تسارتسن کے جونیئر افسروں کے خلاف شکایات ملتی ہی رہتی تھیں۔ کبھی کسی حکم کی خلاف ورزی ہو جاتی تھی، کبھی یہ بھی بتایا جاتا تھا کہ وہاں کیا ہو رہا تھا، کبھی کسی انکوائری کی رپورٹ نہیں بھیجی جاتی تھی۔ لینن اس حکم عدولی کو بڑی تشویش سے دیکھ رہا تھا۔ وہ سٹالن کو مجھ سے بہتر طور پر جانتا تھا اور اسے شک تھا کہ حال ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے تسارتسن میں حکم نافذ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ تسارتسن کے جونیئر افسروں اور ہائی کمان کے مابین چند جھڑپوں کے بعد میں نے سٹالن کو وہاں سے واپس بلا لیا۔ لینن اس تصادم کو جلد از جلد ختم کرنا چاہتا تھا اور وہ ٹھیک سوچتا تھا۔ جہاں تک میرا تعلق تھا، میں نے سٹالن کو کبھی اہمیت نہیں دی تھی۔ مجھے تسارتسن والو

ں کی ضرورت تھی کیونکہ جنوبی محاذ پر مجھے ایک قابل اعتماد فوج کی ضرورت تھی۔ میں ایسی فوج ہر قیمت پر تیار کرنے کیلئے چل پڑا۔ راستے میں میری ملاقات لیورڈلوف سے ہوگئی۔ اس نے بڑی احتیاط سے میرے ارادوں کے متعلق پوچھا اور مشورہ دیا کہ میں سٹالن سے بات کروں جو اسی ٹرین میں اتفاق سے سیورڈلوف کے ساتھ واپس آ رہا تھا۔

''کیا آپ ان سب کو فوج سے نکال دینا چاہتے ہیں؟'' سٹالن نے مبالغہ آمیر عاجزی کے لہجے میں پوچھا۔ ''وہ تو بہت عمدہ لڑکے ہیں۔''

''یہ عمدہ لڑکے انقلاب کو برباد کر دیں گے۔ انقلاب ان کے جوان ہونے کا انتظار نہیں کر سکتا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میں تسارتسن کو سوویٹ روس میں شامل کرنا چاہتا ہوں۔''

چند گھنٹوں بعد میں وروشیلوف سے ملا۔ سارا سٹاف الرٹ تھا۔ افواہ تھی کہ میں ایک بڑا جھاڑو لے کر آ رہا تھا۔ میں نے چھوٹتے ہی وروشیلوف سے پوچھا کہ محاذ اور ہائی کمانڈ کی طرف سے آنے والے احکام کے بارے میں اس کا کیا خیال تھا۔ اس نے کھل کر بات کی اور کہا کہ وہ فقط ایسے حکم بجا لائے گا جنہیں وہ ضروری سمجھے گا۔ یہ بہت بڑی زیادتی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ اگر وہ احکام کے مطابق فوجی فرائض انجام نہیں دے گا تو میں اسے فوری طور پر انقلابی ٹربیونل کے سامنے پیش ہونے کے لئے ماسکو بھیج دوں گا۔ میں نے کسی کو فوج سے نہ نکالا۔ سب نے مجھے تابعداری کی یقین دہائی کرائی۔ تسارتسن کے تمام کمیونسٹوں نے کسی ڈر سے نہیں بلکہ پورے خلوص سے تعاون یقین دلایا۔ میں نے تمام یونٹوں کا معائنہ کیا جن میں بے قاعدہ یونٹ بھی شامل تھے۔ میں نے دیکھا کہ ان میں بہترین سپاہی موجود تھے جنہیں صحیح تربیت اور قیادت کی ضرورت تھی۔ میں ماسکو واپس آ گیا۔

اس سارے معاملے میں کہیں کوئی ذاتی بغض یا نیت کی خرابی نہیں تھی میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اپنے سارے سیاسی زمانے میں ذاتیات کو کہیں مخل نہیں ہونے دیا۔ جس عظیم جدوجہد میں ہم سب مصروف تھے اس میں کسی لمحے کسی کو ایسی باتوں کا سوچنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ لہذا میں نے کبھی ذاتی حسد، اقربا پروری اور تکبر کو پاس نہ آنے دیا۔ لیکن سٹالن ان ساری باتوں کا بڑا دھیان رکھتا تھا۔ اس کے پاس ان کیلئے بہت وقت تھا۔ اس دن کے بعد اس نے تسارتسن کے حکمرانوں کو اپنا حلیف بنالیا اور وہ بھی اس کا بڑا اہتھیار بن گئے۔ لینن کے بیمار پڑتے ہی سٹالن نے اپنے حلیفوں سے مل کر تسارتسن کا نام سٹالن

گراڈ رکھوالیا۔لوگوں کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کا مطلب کیا تھا۔اگر آج وروشیلوف پولٹ بورو کا رکن ہے تو اس کی وجہ اس کے سوا کوئی دوسری نہیں ہے کہ 1918ء میں میں نے اسے ماسکو بھیجنے کی دھمکی دی تھی۔

میرے خیال میں فوجی طریقہ کار اور اس کی وجہ سے پارٹی کے اندر پیدا ہونے والی کشمکش پر کچھ لکھنا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔اس سلسلے میں پارٹی خط وکتابت غیر شائع شدہ اقتباسات اور سیورڈلوف کو لکھا:

''میں سٹالن کو واپس بلانے پر اصرار کروں گا۔فوج کی افراتفری کے باوجود تسارتسن کا کمانڈر رہنے دیا تھا کہ وہ مغربی محاذ کے کمانڈروں کا حکم بجالائے گا۔ابھی تک وہاں سے کورلوف آپریشن کی کوئی رپورٹ نہیں آئی۔میں نے انہیں فوری طور پر رپورٹ ارسال کرنے کیلئے کہا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ وہ دن میں دو دفعہ مجھ سے رابطہ رکھیں۔اگر کل صبح تک ایسا نہ کیا گیا تو میں وروشیلوف پر مقدمہ چلانے کے حکم سے فوج کو آمادہ کردوں گا۔اس سے پہلے کہ سڑکیں برف باری سے پیدل گھوڑے پر چلنے کے قابل نہ رہیں حملے کیلئے بہت تھوڑا وقت رہ گیا ہے۔ہمارے پاس سفارتی مذاکرات کیلئے وقت نہیں ہے۔''

سٹالن کو واپس بلالیا گیا۔لینن جانتا تھا کہ میرے سامنے صرف فوجی تحفظات تھے جن کے سبب میں نے سٹالن کی واپسی کا مطالبہ کیا تھا۔مگر لینن ہمارے تعلقات کے بگاڑ پر پریشان تھا اور انہیں ٹھیک کرنا چاہتا تھا۔جب میں بالاشوف میں تھا تو اس نے 23 اکتوبر کو لکھا:

''سٹالن واپس آگیا ہے اور اپنے ساتھ فوج کی تین بڑی فتوحات کی خبریں لایا ہے (یہ فتوحات افسانوی نوعیت کی تھیں) سٹالن کے نزدیک وروشیلوف اور سنن گرں قیمت اور غیر متبدل ہیں۔وہ انہیں کہہ آیا ہے کہ وہ وہیں رہیں اور مرکز کے حکم کی تعمیل کریں۔ستالن کے کہنے کے مطابق ان کی غیر اطمینانیت کی وجہ اسلحے کی رسد میں تاخیر ہے جس کے سبب دو لاکھ کا کیشائی فوج تباہ ہورہی ہے۔(اس بے قائدہ فوج نے پہلے ہی حملے میں تتر بتر ہوکر اپنی نااہلی ثابت کردی تھی۔) سٹالن جنوبی محاذ پر کام کرنے کا خواہش مند ہے۔اسے امید ہے کہ کام کے دوران وہ اپنے نقطہ نظر کی درست وضاحت کرسکے گا۔یہ سب کچھ بتانے کا یہ مقصد ہے کہ تم سٹالن سے مل کر حالات درست کرلو۔وہ تمہیں ملنے ذاتی طور پر آئے گا۔اس پر وہ متفق ہے۔اگر تم دونوں کا واضح طور پر سمجھوتہ ہوجاتا ہے تو اس صورت میں تم دونوں کا مل کر کام کرنے کا سوچا جاسکتا ہے۔سٹالن کی یہی خواہش ہے۔میں بھی یہی چاہتا ہوں----لینن۔''

میں نے لینن سے مکمل اتفاق کیا جس کے نتیجے میں سٹالن کو مغربی محاذ کی انقلابی فوجی کونسل کا رکن نافذ کر دیا گیا۔لیکن افسوس یہ مصالحت بے ثمر ثابت ہوئی۔تسارتسن میں حالات بہتر نہ ہوئے۔24 دسمبر کو میں نے کرسک سے لینن کو تار بھیجا۔''مصالحت کی تمام مساعی کے بعد وروشیلوف کو اس کی جگہ پر رہنے دینا ناممکن ہو گیا ہے۔یہ بہت ضروری ہو گیا ہے کہ تسارتسن میں ایک نئے کمانڈر کے ساتھ نئی انقلابی کونسل بھیجی جائے اور وروشیکوف کو یوکرائن منتقل کر دیا جائے۔

یہ جویز کسی مخالفت کے بغیر قبول کر لی گئی۔لیکن یوکرائن میں بھی حالات ٹھیک نہ ہوئے۔وہاں جس قسم کا انتشار پھیلا ہوا تھا اس کے پیش نظر فوجی کام کرنا مشکل ہو گیا تھا۔یہاں پھر سٹالن وروشیلوف کی پشت پر تھا جس سے صورتحال خراب ہونے لگی۔

10 'جنوری 1919ء کو میں نے شیورڈلوف کو گریزی سے مندرجہ ذیل تار بھیجا جو اس وقت مرکزی مجلس عاملہ کا چیئرمین تھا۔''میں صاف صاف اور قطعی طور پر بتا رہا ہوں کہ تسارتسن پالیسی جو تسارتسن فوج کی مکمل تباہی کا باعث بنی تھی' یوکراین میں برداشت نہیں کی جائے گی۔جن خطوط پر سٹالن 'وروشیلوف اوران کے چیلے چل رہے ہیں وہ سارے کام کو برباد کر دیں گے----ٹراٹسکی۔''

لینن اور سیورڈلوف جو دور ہی سے تسارتسن گروپ کی کاروائی کو دیکھ رہے تھے' اب بھی مصالحت کی کوشش میں تھے۔اس وقت میرے پاس ان کا تار موجود نہیں ہے میں نے 11 'جنوری کو لینن کو جواب دیا۔''مصالحت ضروری ہے مگر گلی سڑی مصالحت نہیں۔اب تسارتسن کے سارے آدمی کرکوف میں جمع ہیں۔میں سٹالن کی تسارتسن کی پالیسی کو بے حد خطرناک سمجھتا ہوں۔کسی غداری یا فوجی بغاوت س بھی زیادہ خطرناک----ٹراٹسکی۔''

''مصالحت ضروری ہے مگر گلی سڑی مصالحت نہیں۔'' چار سال بعد لینن نے یہی فقرہ حرف بہ حرف مجھے لوٹا دیا' اور اسے سٹالن کے حوالاے سے واپس کیا تھا۔یہ پارٹی کی بارھویں کانگریس کی بات ہے۔لینن نے سٹالن ٹولے کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔اس نے اپنی بات کا آغاز ہی قومیت کے مسئلے سے کیا۔جب میں نے مصالحت کی تجویز کی تو لینن نے جواب دیا۔سٹالن ہم سے گلی سڑی مصالحت کرے گا اور پھر ہمیں دھوکہ دے گا۔''

مارچ 1919ء میں مرکزی کمیٹی کو خط لکھتے ہوئے میں نے زینوشیف کو بھی جواب دیا جو ہمارا ساتھی

ہو کر ہمارے مخالفوں سے بھی پینگیں بڑھا رہا تا۔’’میں یہ یقین کرنے کی خاطر انفرادی نفسیات کی تحقیق کرنے سے رہا کہ وروشیلوف کو مخالفوں کے کسی گروہ میں شامل کیا جائے۔ میرا قصور فقط اتنا ہے کہ میں نے اس کے خلاف تادیبی کاروائی کا فیصلہ کرنے میں ضرورت سے زیادہ تاخیر کر دی۔ تسارتسن فوج کا مسئلہ وروشیلوف کا نقطہ نظر تبدیل کرنے کا نہیں بلکہ مختصر ترین وقت میں کامیابی حاصل کرنا تھا۔‘‘

کرکوف کی جانب سے 30 مئی کو اصرار کے ساتھ لینن سے کرکوف کی جانب سے مطالبہ کیا جانے لگا کہ وروشیلوف کی قیادت میں یوکرانی فوج کا ایک الگ یونٹ بنا دیا جائے۔ میں اس وقت کشتیمی رومکا میں تھا۔ لینن نے مجھ سے وہاں رابطہ قائم کیا۔ یکم جون کو میں نے سے جواب دیا۔’’بعض یوکرانیوں کا یہ مطالبہ کہ دوسری اور تیرھویں فوج کو وروشیلوف کی کمان میں یکجا کر دیا جائے بے حد نا قابل دفاع ہے۔ ہمیں ڈولی زک ضلع میں ایک کارآمد اتحاد کی نہیں بلکہ ڈینیکن کے خلاف کارآمد اتحاد کی ضرورت ہے----وروشیلوف کا یہ مطالبہ کہ اسے فوجی اور غذائی لحاظ سے خود مختار بنا دیا جائے‘ یہ ڈوکیز ک میں علیحدگی پسندی کا نتیجہ ہے جس کا نشانہ کیف بھی ہے۔(یعنی یوکرانی حکومت) یہ منصوبہ ابتری اور افراتفری کو بڑھا دے گا اور فوجی آپریشن کی سمت کو بالکل خراب کر دے گا۔ وروشیلوف اور مزہلاگ سے کہا جائے کہ جو کام انہیں دیا گیا ہے اسی پر توجہ دیں----ٹراٹسکی۔‘‘

یکم جون کو لینن نے نہ کو تار بھیجا۔’’تمام مظاہرے ایک دم بند کر دیے جائیں اور ہر کام فوجی بنیاد پر کیا جائے‘ علیحدہ گروپ بنانے پر قیمتی وقت ضائع نہ کیا جائے اور نہ ہی یوکرانی محاذ کی بحالی کی کوشش کی جائے----لینن۔‘‘

لینن کو معلوم ہو چکا تھا کہ غیر منظّم علیحدگی پسندی کو قابو میں لانا کس قدر مشکل کام تھا۔ لینن نے اسی دن پولٹ بورو کا اجلاس طلب کیا اور اس میں مندرجہ ذیل فیصلہ کر کے فوری طور پر وروشیلوف اور دوسرے متعلقہ افراد کو بھجوا دیا گیا۔’’مرکزی کمیٹی کے پولٹ بورو کا اجلاس یکم جون کو منعقد ہوا جس میں ٹراٹسکی سے مکمل اتفاق کرتے ہوئے ڈولی زک ضلع میں علیحدہ ڈونی زک فوجی ونٹ بنانے کا یوکرانی منصوبہ رد کر دیا گیا ہے۔ وروشیلوف اور مزہلاک اپنے فرائض فوری طور پر انجام دینا شروع کر دیں ورنہ ٹراٹسکی انہیں اشوم میں اپنے پاس بلا کر تفصیلی فیصلہ سے آگاہ کر دے گا----یہ حکم مرکزی کمیٹی کے پولٹ بورو کی ہدایات ک تحت جاری ہوا----لینن۔‘‘

اگلے دن مرکزی کمیٹی میں وروشیلوف کا مسئلہ زیر بحث آیا جس نے اپنے طور پر اپنی علیحدہ فوج کی کمان سنبھال کر دشمن سے چھینا ہوا اسلحہ خود استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ مرکزی کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا۔ ''کامریڈ راداوسکی سے کہا جائے کہ وہ اشوم میں کامریڈ ٹراٹسکی کو تار کے ذریعے بتائے کہ وہ سخت اقدامات کر کے دشمن سے چھینا ہوا اسلحہ فوری طور پر جمہوریہ روس کی انقلابی فوجی کونسل کی تحویل میں دے دے۔'' اسی دن لینن نے بھی مجھے تار پر مطلع کیا۔ ''ڈیبنو کو اور وروشیلوف دونوں فوجی جائیداد کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھتے تھے۔ یہ مکمل ناانصافی ہے۔ ڈونی زک فوج کو کوئی مدد فراہم نہ کی جائے ----لینن۔'' دوسرے لفظوں میں جس چیز کے خلاف میں تارتسن میں نبرد آزما تھا وہی کچھ یوکرائن میں دہرایا جانے لگا تھا۔

میرے فوجی فرائض نے میرے اتنے سارے دشمن پیدا کر دیے تھے' میں نے اس طرف کبھی دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ جو لوگ میری عسکری کامیابی میں رکاوٹ بننے کی کوشش کرتے میں انہیں کہنی مار کر پرے ہٹا دیتا تھا اور بعد میں معذرت کی تکلیف بھی گوارا نہیں کرتا تھا۔ بعض لوگ ایسی باتیں یاد رکھتے ہیں وہ سٹالن اور زینوشیف کے پس چلے جاتے کیونکہ یہ دونوں بھی اپنے زخموں کو سہلاتے رہتے۔ تھے۔ کسی محاذ پر پسپائی کی صورت میں ان لوگوں کی طرد سے لینن پر دباؤ بڑھ جاتا۔ سٹالن بھی پس پردہ انہیں شہ دیتا رہتا۔ پھر یہ خود ساختہ فوجی ماہرین ہماری فوجی حکمت عملی پر تنقید شروع کر دیتے اور خط لکھ کر لینن کا دماغ چاٹنے لگتے۔ بعض شکست خوردہ کمانڈر بھی ان کے ساتھ مل جاتے۔

لینن انقلاب کی سمت سیدھی کرنے میں اس قدر مصروف تھا کہ اس کے پاس محاذوں پر جانے یا فوجی محکمے کے امور کو دیکھنے کا وقت ہی نہیں تھا۔ میں زیادہ وقت محاذوں پر رہتا جس سے ماسکو میں بیٹھے سازشیوں کو کانا پھونسی کرنے کا بہت سا وقت مل جاتا۔ ان کی مسلسل نکتہ چینی ہمیشہ تو نہیں' کبھی کبھی لینن پر پریشان کر دیتی۔ میرے ماسکو آنے تک اس نے متعدد سوالات جمع کیے اور شکوک پائے ہوتے لیکن نصف گھنٹے کی گفتگو کے بعد اس کے شک رفع ہو جاتے اور ہماری باہمی سمجھ بوجھ بحال ہو جاتی۔ مشرق میں ہماری پسپائیوں کے وقت جب کولچک وولگا کی طرف سے بڑھ رہا تھا تو کمساروں کے ایک اجلاس میں جہاں میں سیدھا ٹرین سے آیا تھا' لینن نے ایک پرچی لکھ کر میری طرف بھیجی۔ ''اگر ہم تمام فوجی ماہرین کو نکال کر لاشے وچ کو کمانڈر۔ ان چیف نامزد کر دیں تو کیسا رہے گا؟'' لاشے وچ ایک پرانا بالشویک تھا جو ''جرمن'' جنگ میں سارجنٹ کے عہدے کا حق دار بنا تھا۔ میں نے اسی پرچی پر لکھ دیا۔ ''یہ و

بچوں کا کھیل ہوا۔"لینن نے عیاری سے اپنی بھاری بھووں کے نیچے سے میری طرف دیکھا۔جس طرح کا اس نے چہرہ بنایا اس سے لگتا تھا کہ وہ کہہ رہا تھا۔"تم مجھ سے بڑی زیادتی کرتے ہو۔" لیکن اندر سے وہ ہمیشہ اچانک جواب طلب کرنے کا خواہش مند ہوتا جس سے شک وشبہ کی گنجائش نہ رہتی۔ہم میٹنگ سے اکٹھے باہر نکلے۔لینن مجھ سے محاذ کے متعلق مختلف باتیں پوچھتا رہا۔

"اپ نے مجھ سے پوچھا تھا کہ تمام پرانے افسر نکل دیے جائیں تو کیا رہے گا۔آپ کو معلوم ہے کہ اب وہ کتنی تعداد میں فوج میں رہ گئے ہیں؟"میں نے پوچھا۔

"نہیں مجھے معلوم نہیں"

"اندازے ہی سے بتائیں۔"

"کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"تیس ہزار"

کیا کیا؟"

"تیس ہزار۔ہر ایک سو قابل اعتماد لوگوں میں سے ایک غدار نکل آتا ہے بھگوڑوں میں سے تین مارے جاتے ہیں۔اب ان کی جگہ دوسرے لوگ جہاں سے لائے جائیں۔"

چند دن بعد لینن دولت مشترکہ بنانے کے سوال پر تقریر کر رہا تھا۔وہ کہہ رہا تھا۔"جب اگلے دن کامریڈ ٹراٹسکی نے مجھے بتایا کہ ہماری فوج میں افسر ہزاروں کی تعداد میں رہ گئے ہیں تو مجھ پر واضح ہو گیا کہ دشمن سے اس قدر"بہتر طور پر پیش آنے" کے پیچھے راز کیا تھا----یعنی ہم ان خشت وسنگ سے کمیونزم کیسے تعمیر کر سکتے ہیں جو سرمایہ دار اپنے پیچھے ہمارے لیے چھوڑ گئے ہیں۔

پھر انہیں دنوں میں میری عدم موجودگی میں-- میں محاذ پر تھا-- لینن نے اس فوجی پالیسی کا زبردست دفاع کیا جسے میں چلا رہا تھا اور جو ں مخالفوں کی سخت تنقید کا نشانہ بنی ہوئی تھی۔اسی وجہ سے پارٹی کی آٹھویں کانگریس کی کاروائی آج تک شائع نہیں کی گئی۔

ایک دفعہ جن ژنسکی مجھے محاذ پر ملنے آیا۔میں اسے عرصہ دراز سے جانتا تھا۔پہلے انقلاب کے ردعمل کے ایام میں اس کا تعلق انتہائی بائیں بازو سے تھا خود کو"میر یورورسٹ" کہلواتے تھے۔یہ ان کے اخبار کا نام تھا۔اس اخبار میں بگدانوف'لوناچرسکی اور دوسرے بھی کام کرتے تھے۔سن ژنسکی کا جھکاؤ فرانسیسی طرز

حکومت کی طرف تھا۔ پردو پووسٹوں نے بولنگا میں ان دس پندرہ روسی محنت کشوں کیلئے ایک مارکسی سکول کھول رکھا تھا جو روس سے ''انقلابی'' طور پر غیر قانونی طریقے سے وہاں پہنچے تھے۔ یہ 1910ء کی بات ہے۔ میں نے بھی وہاں ابلاغیات پر دو ہفتے پڑھایا اور پارٹی کی حکمت عملی پر کانفرنسیں منعقد کیں۔ مسن ژنسکی سے میری وہیں پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ پیرس سے آیا تھا۔ اس نے مجھ پر اپنا جو تاثر چھوڑا اسے یوں بہترین طور پر بیان کیا جا سکتا ہے کہ اس نے کوئی تاثر نہیں چھوڑا تھا۔ وہ کسی ادھورے آدمی کا سایہ تھا۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ کسی غیر مکمل مجسمے کا خاکہ تھا۔ ایسے لوگ ہوتے ہیں۔ آج بھی اس کی دل میں گھر کر جانے والی مسکراہٹ یا ابرو کا پیارا سا اشارہ بتا جاتا ہے کہ وہ اپنی بے نامی سے باہر نکلنا چاہتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اکتوبر ایام میں اسکا طرز سلوک تھا' یا پھر اس کا کوئی طرز سلوک تھا بھی کہ نہیں۔ لیکن اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد اسی گہما گہمی میں اسے وزارت خزانہ میں بھیج دیا گیا۔ وہاں اس نے اپنے کوئی جوہر نہ دکھائے۔ بلکہ اپنی نااہلیت ثابت کر دی۔ بعد میں اس کی جگہ ڈرزنسکی نے لے لی۔ ڈرزنسکی بڑا باہمت 'مضبوط ارادے اور بلند اخلاق والا آدمی تھا۔ اس کی شخصیت چی-کا* پر محیط تھی۔ مسن ژنسکی کسی کی توجہ حاصل کیے بغیر خاموشی سے اپنے کاغذات پر کام کرتا رہتا۔ ڈرزنسکی کی زندگی کے آخری ایام میں اس کا نائب ان چلی چٹ++++ اس سے جدا ہو گیا۔ ڈرزنسکی نے کوئی دوسرا آدمی نہ ملنے پر اس خالی جگہ پر مسن ژنسکی کی تعیناتی کی سفارش کر دی۔ اس تجویز نے سب کو حیران کر دیا۔ ''تو پھر میں کس کو لوں؟'' ڈرزنسکی نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ ''کوئی دوسرا بھی تو نہیں ہے۔'' لیکن سٹالن مسن ژنسکی کا حمایتی تھا۔ سٹالن ہمیشہ ان لوگوں کی مدد کیلئے بھاگا ہوا آتا جو سرکاری آلے کی مدد سے سیاسی طور پر زندہ رہتے ہیں۔

---

* ''چرزفی جاپانہ کومیسا''؟ غیر معمولی کمشن) یہ پولیس اور عدالت کے فرائض انجام دیتا تھا' خاص طور پر انقلاب کے دفاع میں ''چی-کا'' کی تنظیم نو کے بعد اس کے فرائض جی-پی-یو (ریاستی سیاسی بورڈ) نے سنبھال لیے ہیں (مترجم)

مسن زنسکی جی' پی' یو میں سٹالن کا حقیقی سایہ بن کر رہ گیا۔ ڈرزنسکی کی موت کے بعد مسن زنسکی جی پی' یو کا سربراہ ہی نہیں مرکزی کمیٹی کا رکن بھی بن گیا۔ اس طرح ایک حقیقی اور زندہ آدمی کی جگہ ایک غیر حقیقی

آدمی کا سایہ نوکرشاہی کی سکرین پر چلتا پھرتا دکھائی دینے لگا۔

دس سال پہلے مسن ژنسکی نے اپنا ایک نیا محور تلاش کرنے کی کوشش کی۔ وہ فوج کے خاص محکموں کی ایک رپورٹ لے کر میرے پاس ٹرین میں آیا۔ سرکاری کام ختم ہوجانے کے بعد وہ ادھرادھر کی ہانکنے لگا۔ اس کے لبوں پر وہی من موہنی مسکراہٹ تھی جو آدمی کو چوکنا کرنے کے ساتھ پریشان بھی کردیتی ہے۔ آخر میں اس نے مجھ سے ایک سوال پوچھ ہی لیا۔ ''کیا مجھے معلوم تھا کہ سٹالن میرے خلاف ایک پیچیدہ قسم کی سازش تیار کرنے میں مصروف تھا؟''

''کیا؟'' میں نے حیرت زدہ ہوکر پوچھا۔ اس قسم کی کوئی بات نہیں میرے وہم وگمان میں بھی نہیں آئی تھی۔

جی ہاں۔ وہ لینن کو یہ کہہ کر تمہارے خلاف بھڑکا رہا ہے کہ تم اپنے گرد ایسے لوگ جمع کررہے ہو جو لینن کے خلاف ہیں۔''

''تم کیسی پاگلوں والی باتیں کررہے ہو؟ ذرا ہوش میں آؤ۔ براہ مہربانی مجھ سے ایسی کوئی بات کرو۔'' من ژنسکی کھانستا اور شانے جھکائے گھبراہٹ کی حالت میں چلا گیا۔ اس دن کے بعد وہ کوئی دوسرا محور تلاش کرنے میں لگ گیا۔

ایک گھنٹہ کام کرنے کے بعد مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے مجھے کچھ ہوگیا تھا۔ اس آدمی نے اپنی بے وقعت سی باتوں سے مجھے بے چین کردیا تھا۔ یوں لگا جیسے میں نے کھانے کے ساتھ شیشہ نگل لیا تھا۔ میں اسی وقت واقعات کی کڑیاں جوڑنے لگا اور سٹالن ایک دم میرے سامنے ایک نئی شکل میں آ گیا۔ پھر کافی عرصے بعد کرسٹنسکی نے مجھے سٹالن کے متعلق بتایا۔ ''وہ زرد آنکھوں والا ایک پاگل آدمی ہے۔'' من ژنسکی سے گفتگو کے بعد یہ سٹالن کی اخلاقی پیلاہٹ تھی جو میرے ذہن میں ابھر آئی تھی۔ جب میں مختصر دورے پر ماسکو گیا تو حسب معمول لینن کے پاس بھی گیا۔ وہ محاذ کے متعلق باتیں کرتے رہا۔ وہ فالتو باتیں سننے کے بجائے سیدھی اور جامع بات سننے کا قائل تھا اور حقیقی زندگی کے متعلق ہیر پھیر کی بات سننا پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ درمیانی باتیں جھوٹ کر اصلی سوال پر آ جاتا اور وہ حقائق کا جس طرح کھوج لگاتا مجھے اس کی مہارت کی تعریف کرنی پڑ جاتی۔ پھر ہم ہنسنا شروع کردیتے۔ لینن عام طور پر اچھے موڈ میں رہتا تھا۔ میں بھی کوئی غم کا مارا آدمی نہیں تھا۔ آخر میں میں نے اسے جنوبی محاذ پر من ژنسکی سے اپنی ملاقات

کے بارے میں بتایا۔ ''کیا اس میں کوئی اصلیت ہوسکتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔ میں نے دیکھا کہ لینن پر ایک دم ہیجانی کیفیت طاری ہوگئی اور اس کا خون چہرے کی طرف دوڑنے لگا۔ ''سب بکواس ہے۔'' وہ بار بار یہ الفاظ دہراتا رہا۔ مگر جس لہجے میں وہ کہہ رہا تھا وہ کچھ اتنا پر یقین نہیں تھا۔

''مجھے فقط ایک بات جاننے میں دلچسپی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کیا آپ لمحہ بھر کیلئے بھی سوچ سکتے ہیں کہ میں آپ کے مخالفوں کو اپنے گرد جمع کر رہا ہوں؟''

''یہ بھی بکواس ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ لیکن اس وقت اس کے لہجے میں استحکام تھا۔ میں نے سکھ کا سانس کیا۔ ہم دونوں کے سروں پر شک کا جو ایک ہلکا سا بادل چھا گیا تھا' یک دم چھٹ گیا اور ہم حسب معمول دوستانہ انداز میں ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ من ژنسکی اپنی زبان نہیں بول رہا تھا۔ اگر لینن نے بات بڑھائے بغیر صاف انکار کر دیا تھا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ کسی تصادم' کسی جھگڑے سے بچنا چاہتا تھا۔

یہاں میں اس سے مکمل طور پر متفق تھا۔

لیکن سٹالن حالات خراب کرنے میں لگا ہوا تھا۔ بہت بعد مجھے پتا چلا کہ وہ یہ کام کس قدر منظم طریقے سے کر رہا تھا۔ اسے بس یہی کام رہ گیا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اس نے کبھی کوئی سنجیدہ کام نہیں کیا تھا۔ بخارن نے ایک دفعہ مجھے بتایا۔ ''سٹالن کی پہلی خوبی سست الوجودی ہے۔ اور دوسری خوبی اس کا ان لوگوں کی طرف ناقابل تسکین حسد ہے جو اس سے زیادہ جانتے ہیں یا بہتر کام کرتے ہیں۔ اس نے تو لینن کے پاؤں تلے سے بھی زمین کھودنے کی کوشش کی تھی۔

جنگی حکمت عملی پر اخلاقیات

ان صفحات میں میں سرخ فوج کی یا اس کی لڑائیوں کی تاریخ رقم نہیں کر رہا۔ یہ دونوں خیال ناقابل علیحدگی طور پر تاریخ سے جڑے ہوئے ہیں سوانح عمری کے دائرے سے باہر کسی نئی کتاب کے متقاضی ہیں۔ لیکن میں ان اختلافات کا ذکر کیے بغیر نہیں رہ سکتا جو خانہ جنگی کے دوران میں ابھر کر سامنے آتے رہے۔ انقلاب کی قسمت کا انحصار ہمارے فوجی آپریشنوں پر تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ مرکزی کمیٹی جنگ کے مسائل میں زیادہ منسلک ہوتی چلی گئی۔ انہیں میں ایک مسئلہ جنگی حکمت عملی کا تھا۔ بڑی کی ندنگ

پوسٹوں پر پرانے تربیت یافتہ فوجی ماہرین تعینات تھے جن میں سیاسی اور سماجی حالات کے شعور کی کمی تھی۔ دوسری طرف پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے تجربہ کار انقلابی راہنما فوجی علم سے ناواقف تھے۔ جنگی حکمت عملیاں ایک وسیع پیمانے پر تیار کرنا ایک مجموعی کام تھا۔ جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے، جھگڑے اور تصادم جنم لینے شروع ہو گئے۔

چار ایسے مواقع تھے جب مرکزی کمیٹی جنگی حکمت عملی پر منقسم ہو گئی۔ دوسرے لفظوں میں جنگی حکمت عملی پر اتنے ہی اخلاقات تھے جس قدر محاذ جنگ تھے۔ یہاں میں ان کا مختصر طور پر ذکر کروں گا اور یہ بھی بتاؤں گا کہ بعد میں میرے خلاف کیا کچھ گھڑا جاتا رہا۔

مرکزی کمیٹی میں پہلی گرما گرم بحث 1919ء کے موسم گرما میں مشرقی محاذ کے حوالے سے ہوئی۔ اس وقت فوج کا کمانڈر-ان-چیف ورتی تس میں تھا جس کا ذکر میں سیوی یازسک کے باب میں کر چکا ہوں۔ میں وزتی تس کو ان کی اتھارٹی اور حقوق کا یقین دلاتا رہتا۔ کیونکہ اس کے بغیر فوج کو چلایا نہیں جا سکتا۔ کول چک کے خلاف کامیابیوں کے بعد اس کا نقطہ نظر یہ تھا کہ ہمیں خود کو یورال کے دور دراز علاقے تک نہیں لے جانا چاہیے۔ وہ چاہتا تھا کہ مشرقی محاذ سردیوں تک پہاڑوں تک ہی محدود رکھا جائے۔ ایسا کرنے سے ہم نے اس قابل ہو جاتے کہ مشرق سے چند ڈویژن فوج نکال کر جنوب لے جاتے جہاں ڈینیکن زیادہ خطرناک ثابت ہو رہا تھا۔ میں اس منصوبے کے حق میں تھا۔ لیکن کامینیف اس کے سخت خلاف تھا۔ وہ مشرقی محاذ کا کمانڈر اور زار کی فوج کے جنرل سٹاف میں کرنل تھا۔ اس کے علاوہ وہ فوجی کونسل کے دو ارکان پرانے بالشویک سملگ اور لاشے وچ بھی اس منصوبے کے خلاف تھے۔ ان کا اصرار تھا کہ کول چک کو شکست ہو چکی تھی۔ لہذا اس کے تعاقب کیلئے زیادہ آدمیوں کی ضرورت نہیں تھی۔ اہم بات یہ تھی کہ اسے سانس لینے کا موقع نہ دیا جائے۔ اگر اسے سردیوں میں دم لینے کا موقع مل گیا تو ہمیں موسم بہار میں اس کے خلاف دوبارہ مہم شروع کرنی پڑ جائے گی۔ لہذا سارا مورال کول چک کی فوج کی صورتحال اور عقبی حالات جاننے پر تھا۔ اس کے باوجود میری نظر میں مشرقی محاذ کے بجائے مغربی محاذ کہیں زیادہ خطرناک تھا۔ بعد میں اس کی مکمل تصدیق ہو گئی۔

کول چک کی فوج کا تخمینہ وغیرہ لگانا مشرقی محاذ کی کمان کا کام تھا جس میں وہ حق بجانب تھی۔ لیکن مرکزی کمیٹی نے ہائی کمان اور میرے خلاف فیصلہ ان وجوہات کی بنا پر کیا کہ جنگی حکمت عملی کے تناسب

میں بعض گم نام عناصر بھی تھے۔لیکن سب سے اہم چیز کمانڈر-ان-چیف کی اتھارٹی کو قائم رکھنا تھا۔ مرکزی کمیٹی کا فیصلہ درست ثابت ہوا۔مشرقی محاذ نے اپنے چند یونٹ مغربی محاذ کو دے دیے جس نے سائبیریا کے وسط تک کول چک کا تعاقب جاری رکھا۔اس چیز نے ہائی کمان میں تبدیلی پیدا کردی۔ وٹ زی تس کر کامینیف کو اس کی جگہ کمانڈر-ان-چیف بنادیا گیا۔

اختلافات عملی نوعیت کا تھا جس سے میرے اور لینن کے تعلقات پر کوئی اثر نہ پڑا۔لیکن اس قسم کے چھوٹے موٹے اختلافات کی وجہ سے سازش اپنا جال بننے لگی۔4 جون 1919ء کو سٹالن نے جنوبی محاذ سے لینن کو لکھا اور اسے فوجی صورتحال کے خطرے سے ڈرانے کی کوشش کی۔اس نے لکھا۔''اب سارا مسئلہ یہ ہے کہ کیا مرکزی کمیٹی مناسب نتائج اخذ کرنے کی جرات کرسکتی ہے۔ایسا مرکزی کمیٹی کے کردار میں اتنا استحکام ہے؟'' مذکورہ سطروں کا مطلب صاف ظاہر ہے ان کا لہجہ بتا رہا تھا کہ سٹالن نے یہ سوال متعدد دفعہ اٹھایا تھا اور ہر بار اسے لینن کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔اس وقت مجھے اس کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔لیکن مجھے سازش کی بو ضرور آرہی تھی۔معاملے کی تہ میں جانے کی کوشش کے بغیر' اور میرے پاس اس کا وقت بھی نہیں تھا، میں نے معاملہ ختم کرنے کی نیت سے اپنا استعفیٰ پیش کردیا۔پانچ جولائی کو مرکزی کمیٹی نے مندرجہ ذیل جواب دیا۔

''مرکزی کمیٹی کا تنظیمی اور سیاسی بوریو کامریڈ ٹراٹسکی کے بیان کو پوری طرح زیر بحث لانے کے بعد اس نتیجے پر متفقہ طور پر پہنچا ہے کہ کامریڈ ٹراٹسکی کا استعفیٰ منظور نہ کیا جائے اور اس سلسلے میں اس کی درخواست کو قابل قبول نہ سمجھا جائے۔مرکزی کمیٹی کا سیاسی بوریو اپنی طرف سے بھرپور کوشش کرے گا کہ مغربی محاذ کے کام کو جو اس وقت سب سے زیادہ مشکل ہے اور اہم ہے اور جسے کامریڈ ٹراٹسکی نے خود چنا ہے' اس کے اور جمہوریہ روس کے حق میں آسان بنایا جائے۔جنگی کمسار اور انقلابی فوجی کونسل کے چیئرمین کی حیثیت سے کامریڈ ٹراٹسکی کو مکمل اختیار حاصل ہے کہ وہ جنوبی محاذ کی فوجی انقلابی کونسل کے ممبر کی حیثیت سے اپنے تعین کردہ کمانڈر کے تعاون سے عمل کرے۔مرکزی کمیٹی کا تنظیمی اور سیاسی بوریو کامریڈ ٹراٹسکی کو مکمل اختیار دیتا ہے کہ فوجی نقطہ نظر سے وہ جس قسم کا اقدام درست سمجھا ہے اسے بروئے کار لائے۔اگر وہ چاہے تو پارٹی کانگریس کو اپنے اقدامات سے مطلع کرسکتا ہے۔۔لینن' کامینیفکر سٹنسکی کالینن، سیر بریکوف، سٹالن، سٹاسوفا۔''

اس فیصلے میں دوسروں کے ساتھ سٹالن کا نام بھی شامل ہے۔ اگر چہ وہ پس پردہ سازش میں مصروف تھا اور لینن کو کم ہمتی کا طعنہ دیتا تھا مگر اس میں اتنی جرات نہیں تھی کہ کھلم کھلا مرکزی کمیٹی کی مخالفت کر سکے۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، مغربی محاذ خانہ جنگی میں بڑی اہم جگہ حاصل کر چکا تھا۔ دشمن کی فوج کے دو آزادانہ حصے تھے۔ کوسک اپنی سرحدوں کو محنت کشوں اور کسانوں کے حملوں سے بچانا چاہتے تھے۔ رضا کار فوج ماسکو فتح کرنے کیلئے بے چین تھی۔ یہ دونوں مفاد اسی صورت میں ایک دوسرے میں مدغم ہو سکتے تھے کہ اگر رضا کار شمالی کاکیشیا میں کوبان کاسکوں کے ساتھ مشترکہ محاذ بنا لیتے۔ لیکن ڈینیکن کیلئے یہ بہت مشکل تھا، بلکہ ناممکن تھا کہ کاسکوں کو ان کے صوبے کوبان سے باہر لے آتا۔ ہماری ہائی کمان نے اس مسئلے کی سماجی بنیاد کو نظر انداز کرتے ہوئے جنوبی محاذ کی حکمت عملی کو بڑے تجریدی انداز میں لیا۔ کوبان کو صوبہ رضا کاروں کی بڑی بیس تھا۔ لہذا ہائی کمان نے فیصلہ کیا کہ اس بیس پر وولگا کی طرف سے ضرب لگائی جائے۔ اس کی ایک وجہ تھی۔ ڈینیکن فوج کو دوڑاتا ہوا سرعت سے ماسکو پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس عرصے میں ہم اس کے پیچھے اس کی کوبان بیس کا صفایا کر دیں گے۔ ڈینیکن ہوا میں معلق ہو کر رہ جائے گا اور ہم اسے خالی ہاتھ پکڑ لیں گے۔ یہ ہماری جنگی حکمت عملی کا سیدھا سادا منصوبہ تھا۔ اگر خانہ جنگی نہ ہوتی تو یہ ایک درست منصوبہ تھا۔ لیکن جب اس کا اطلاق جنوبی محاذ پر کیا گیا تو یہ محض ایک خیالی منصوبہ نکلا۔ اس نے الٹا دشمن کی مدد کر دی۔ سب سے پہلے ڈینیکن کاسکوں کو طویل مسافت طے کر کے ہمارے شمالی محاذ پر حملہ کرنے کی ترغیب دینے میں ناکام ہو چکا تھا۔ اب جب ہم نے خود جنوب کی جانب سے آگے بڑھ کر کاسکوں کے گھونسلوں میں ہاتھ ڈال دیے تو ہمارا یہ اقدام اس کیلئے بڑا مددگار ثابت ہوا۔ اس کے بعد کاسک اپنی ہی زمین پر اپنی حفاظت نہیں کر سکتے تھے۔ ہم نے اپنے ہی ہاتھوں سے ان کی تقدیر رضا کاروں کے ساتھ باندھ دی تھی۔

اپنے حملوں کی محتاط تیاری اور فوجی اور فنی سہولتوں کی موجودگی کے باوجود ہم کامیاب نہیں ہو رہے تھے۔ ڈینیکن کی پست پر کاسکون نے ایک زبردست پشتہ باندھ دیا تھا۔ یوں لگا جیسے وہ زمین مین گڑ گئے تھے اور انہوں نے اپنے ہاتھوں اور دانتوں سے اپنی دھرتی کو پکڑ لیا تھا۔ ہمارے حملے نے پوری کاسک آباد کو اس کے قدموں پر کھڑا کر دیا تھا۔ اپنی قوت میں اضافے اور وقت ہونے کے باوجود ہم فقط اتنا کر سکے کہ جو لوگ ہتھیاروں کے ساتھ سفید فاموں کی فوج میں شامل ہونا چاہتے تھے، ہم نے انہیں روک

دیا۔اس عرصے میں ڈینیکن یوکرائن کو تاراج کرتا اور اپنی فوج میں نئے آدمی بھرتی کرتا ہوا شمال میں پیش قدمی کر رہا تھا۔کرسک اور روس پر قبضہ کرنے کے بعد وہ تولا کیلئے خطرہ بن گیا تھا۔تولا پر قبضہ ایک بہت بڑی تباہی کی علامت بن جانا تھا۔ کیونکہ اس سے رائفلیں اور کارتوس بنانے والے پلانٹ ہمارے ہاتھ سے نکل جانے تھے۔

میں جس منصوبے کی شروع سے وکالت کر رہا تھا، دراصل ہمیں اس کے بالکل برعکس منصوبہ بنانا چاہیے تھا۔ میں چاہتا تھا کہ ہم حملے میں پہل کر کے رضا کاروں کو کاسکوں سے کاٹ دیں۔ جب کاسک اکیلے رہ جائیں تو اپنی پوری قوت سے رضا کاروں پر حملہ کر دیں۔اس منصوبے کے مطابق حملہ وولگا سے کوبان کی طرف نہیں بلکہ وورونخ سے خرکوف اور ڈونی تسک علاقے کی طرف سے ہونا تھا۔ملک کا یہ حصہ جو شمالی کاکیشیا کو یوکرائن سے الگ کرتا ہے' وہاں کے محنت کش اور کسان مکمل طور پر سرخ فوج کے ساتھ تھے۔سرخ فوج کی اس جانب میں پیش قدمی گھر کی بات ہونی تھی۔کاسکوں نے اپنی جگہ پر کھڑے اپنی سرحدوں کی حفاظت کرتے رہ جانا تھا اور ہم نے انہیں چھوڑ کر بھی نہیں گزرنا تھا۔ پھر کاسکوں نے آزاد حیثیت اختیار کر لینی تھی جو فوجی کے بجائے سیاسی نوعیت کی زیادہ ہونی تھی۔لیکن اس سے پہلے ڈینیکن کی رضا کار فوج کو تباہ کرنا ضروری تھا۔ انجام کار یہی منصوبہ اختیار کیا گیا، مگر اس سے پہلے ڈینیکن کا خطرہ ہمارے سروں پر آن بیٹھا تھا۔تولا کو کھو بیٹھنے کا نقصان ماسکو کے ہاتھ سے چلے جانے کے نقصان سے زیادہ بڑا تھا۔ہم نے کئی مہینے ضائع کر دیے۔ بے ضرورت نقصانات اٹھانے کے علاوہ کئی ہفتے فضول مباحث میں پڑے رہے۔

یہاں میں یہ بھی بتا تا چلوں کہ مغربی محاذ کے متعلق اختلافات کا تعلق کسانوں کی تعریف ''یا کم تعریف'' سے بھی منسلک تھا۔ میں ایک طرف اپنا منصوبہ کسانوں اور محنت کشوں اور دوسری طرف کاسکوں کے تعلقات کو سامنے رکھ کر بناتا اور اس طرز استدلال کو سامنے رکھ کر ہائی کمان کی تعلیمی نوعیت کی سکیم کے آگے اپنے منصوبے کی خود ہی مخالفت اس لئے کرنے لگتا کہ میں جانتا تھا کہ مرکزی کمیٹی میں ارکان کی اکثریت نے ہائی کمان کی سکیم ہی کی حمایت کرنی تھی۔ میں لاکھ دلائل دیتا رہتا کہ کسانوں کو اتنی تعریف نہیں ملتی تھی جس کے وہ مستحق تھے۔مگر میری اس بات کو مذاق میں اڑا دیا جاتا تھا، اور اس مذاق میں زینوشیف، سٹالن کے علاوہ لینن نے بھی شامل ہو جانا تھا۔اس کی بڑی وجہ مغربی محاذ پر ہمارے درمیان اختلافات تھے۔

جنگی حکمت عملی پر تیسرا اختلاف پیٹروگراڈ پر یوڈینچ کے حملے کے وقت ابھر کر سامنے آیا۔ یہ اختلاف میں کتاب کے پہلے کسی باب میں بیان کر چکا ہوں۔ لہذا اب اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں میں فقط اتنا اضافہ کرنا چاہوں گا کہ جنوبی محاذ کی سنجیدہ صورتحال کے پیش نظر اور یوڈینچ کے اسلحے اور فنی مہارت کی برتری کو سامنے رکھتے ہوئے محاذ کو مختصر کرنے کے ارادے سے پیٹروگراڈ دشمن کے حوالے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب زینوشیف اور سٹالن نے لینن کے خلاف میری حمایت کی تھی۔ چند دنوں بعد لینن نے بھی اپنا غلط منصوبہ ترک کر دیا۔

آخری مگر بلاشبہ سب سے زیادہ شدید اختلاف 1920ء کے موسم گرما میں پولش محاذ سے وابستہ تھا۔ برطانوی وزیراعظم بونار لا نے دارلعوام میں فرانسیسی کمیونسٹوں کے نام میرا وہ خط بطور ثبوت پیش کیا جس میں میں نے 1920ء کے موسم خزاں میں پولینڈ کو کچل دینے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ اسی قسم کا دعویٰ پولینڈ کے متوفی وزیر جنگ سکورشکی نے اپنی کتاب میں بھی کیا تھا۔ اس دفعہ اس نے میری اس تقریر کا حوالہ دیا جو میں نے جنوری 1920ء میں انٹرنیشنل کانگریس میں کی تھی۔ لیکن یہ شروع سے آخر تک سب بے ہودہ بات ہے۔ مجھے پلسڈسکی کے پولینڈ سے کبھی ہمدردی ظاہر کرنے کا موقع حاصل نہیں ہوا تھا۔ یعنی ایک ایسا پولینڈ جس میں حب الوطنی کے پردے میں تشدد جاری تھا۔ میری کسی ایسی اکا دکا تقریر کا بے شک حوالہ دیا جا سکتا تھا جس میں میں نے یہ کہا ہو کہ اگر پلسڈسکی نے ہم پر جنگ نافذ کر دی تو اس صورت میں ہم نصف راستے میں نہیں ٹھہریں گے۔ ایسی تقریروں کا اپنا ایک تناظر ہوتا ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ ہم پولینڈ پر جنگ مسلط کرنا چاہتے تھے، یا اس کی تیاری کر رہے تھے، حقائق یا عقل سلیم کے منہ پر جھوٹ بولنے کے برابر تھا۔ ہم تو جنگ روکنے کی ہر ممکن کوشش میں تھے، اور یہ مقصد ہر طرح حاصل کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ مسکورسکی تسلیم کرتا ہے کہ ہم بڑی ''چالاکی'' سے امن میں مصروف تھے۔ لیکن وہ سمجھا نہیں تھا یا اس نے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی کہ ہماری چالاکی بڑی سادگی پر مبنی تھی۔ ہم اپنی پوری قوت سے امن حاصل کرنے میں مصروف تھے اور اس کیلئے بعض رعایات بھی دینے کو تیار تھے مجھے دوسروں کی خبر نہیں، جہاں تک میرا تعلق ہے میں جنگ کے حق میں بالکل نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ تین سال کی خانہ جنگی کے بعد ہم مزید اس کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ سورسکی کی کتاب سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ پولش حکومت بڑے پختہ ارادے کے ساتھ دانستہ طور پر ہم پر جنگ تھونپنا چاہتی تھی۔ دوسری طرف

امن اور صبر ہماری خارجہ پالیسی کے دو بڑے عناصر تھے۔ ہم واقعی خلوص نیت سے امن چاہتے تھے۔ مگر پلسڈسکی ہم پر جنگ مسلط کیے جا رہا تھا۔ ہمارے عوام بڑے صبر وتحمل سے ہماری سفارتی لڑائی کو دیکھ رہے تھے۔ وہ مکمل طور پر جان گئے تھے کہ جنگ ہم پر تھونپی جا رہی تھی۔ اور اس سوچ میں وہ بالکل حق بجانب تھے۔

ہم نے ایک اور حقیقی معنوں میں بہادرانہ کوشش کی۔ کیف پر پولوں کے قبضے نے، جس کی کوئی عسکری اہمیت نہیں تھی، ہمیں بڑا فائدہ پہنچایا۔ اس نے ملک کو بیدار کر دیا۔ مجھے پھر لوگوں کو جگانے کی خاطر شہروں اور فوجی یونٹوں کے دورے کرنے پڑ گئے۔ ہم نے کیف پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد ہماری کامیابیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پولوں کو اس بری طرح پیچھے دھکیل دیا گیا کہ میں اس کا اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ پولسڈسکی سے یہ حماقت کیسے سرزد ہو گئی تھی۔ ہماری طرف بھی بعض بڑی کامیابیوں کے بعد پیش قدمی کے امکانات کچھ زیادہ ہی مبالغہ آرائی سے پیش کیے جانے لگے۔ یہ نظریہ کہ دفاعی جنگ کو حملے میں بدل دینا چاہیے۔ کیونکہ یہ انقلابی جنگ کی بڑی خدمت ہو گی، روز بہ روز زیادہ مضبوط ہونے لگا۔ اصولی طور پر مجھے اس سے کوئی اختلاف نہیں تھا۔ مسئلہ افواج کے باہمی تعلق کا تھا۔ اس کے علاوہ پولش محنت کشوں اور کسانوں کے رویے کا بھی کوئی اندازہ نہیں تھا۔ ہمارے بعض رفیق جن میں روسالگشمبرگ اور جے، مارخ لوسکی شامل تھے، صورتحال کو بڑے تحمل سے لینے کے حق میں تھے۔ میں بھی ان کے خیال کے مطابق جلد از جلد جنگ سے نکل جانا چاہتا تھا۔ لیکن بعض مخالف آوازیں بھی تھیں۔ یہ بڑی امید بھی تھی کہ پولش محنت کش شورش برپا کر دیں گے۔ لینن نے بھی ارادہ بنا لیا تھا کہ جنگ کو اس کے منطقی انجام تک پہنچایا جائے اور وارسا میں داخل ہو کر پلسڈسکی کی حکومت کا تختہ الٹنے کے بعد اقتدار محنت کشوں کے حوالے کر دیا جائے۔ مگر میں اس کے خلاف تھا۔ پول پہلے ہی اسفاک بات کرنے لگے تھے۔ میرا خیال تھا کہ ہم اپنی کامیابیوں کے عروج تک پہنچ چکے تھے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم اس نشے میں اندھے ہو کر اپنی حد سے تجاوز کر جائیں اور اپنا کوئی نقصان کر بیٹھیں۔ چھوتھی فوج نے پانچ ہفتوں میں ساڑھے چھ سو کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا تھا۔ وہ تھکاوٹ اور بے حرکتی کا شکار ہو سکتی تھی۔ بعض اوقات اعصابی دھاگے بڑے کچے ثابت ہوتے ہیں۔ ایک بڑی ضرب انہیں توڑ کر ہماری فتوحات کو شکست میں بدل سکتی تھی۔ فوج کے تھکنے سے پہلے میں امن معاہدے پر دستخطوں کے حق میں تھا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ریکوف

نے میری حمایت کی تھی۔ میری عدم موجودگی میں دوسرے سارے لوگ لینن کے حمایتی بن چکے تھے۔ لہذا حملہ جاری رکھنے کا فیصلہ کیا گیا۔

برسٹ۔لٹووسک کے مقابلے میں صورتحال بالکل الٹ گئی تھی۔ اس وقت میں امن معاہدے پر دستخطوں میں تاخیر کر رہا تھا، خواہ ایسا کرنے میں کچھ علاقے ہاتھ سے چلا جاتا۔ ہم جرمن پرولتاریہ کو صورتحال کو سمجھنے اور اس کے مطابق عمل کرنے کا موقع فراہم کرنا چاہتے تھے۔ اب لینن چاہتا تھا کہ ہماری وج اپنی پیش قدمی جاری رکھے اور پولش پرولتاریہ کو اپنی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا موقع فراہم کرے۔ برسٹ لٹووسک کے بالکل متضاد ہو رہا تھا۔ یعنی جنگ اور عوامی انقلابی تحریک کو دو مختلف پیمانوں سے ناپا جا رہا تھا۔ جو کام فوج دنوں اور ہفتوں میں کرتی ہے، عوامی تحریک اسے مہینوں بلکہ برسوں میں انجام دیتی ہے۔ اگر رفتار کا یہ فرق مدنظر نہ رکھا جائے تو جنگ انقلاب کی گاڑی کو تیز کرنے کے بجائے اس کے گیئر کے دندانے توڑ دیتی ہے۔ برسٹ لٹووسک کی چھوٹی جنگ اور بڑی پولش جنگ میں یہی کچھ ہوا۔ ہم اپنی ہی فتح کے اوپر سے چھلانگ لگا کر بھاری شکست میں دھنس گئے۔

وارسا سے پہلے بہت بڑی تباہی کی وجوہات میں سے ایک وجہ جنوبی سوویٹوں کی فوج کا طرز سلوک بھی تھا جو لوو (لمبرگ) کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ان سوویٹوں کی انقلابی فوجی کونسل میں سب سے نمایاں شخصیت سٹالن کی تھی۔ سٹالن ہر قیمت پر فوراً اسی وقت لوو میں داخل ہونا چاہتا تھا جس وقت سلگا اور تھوچاسیوسکی وارسا میں داخل ہوئے تھے۔ بعض لوگ بڑی بڑی خواہشات پالنے کے متحمل ہو سکتے ہیں۔ جب تھوچاسیوسکی کی فوج کو خطرہ بالکل سامنے دکھائی دینے لگا اور ہائی کمان نے جنوب مغربی افواج کو حکم دیا کہ وہ اپنی پیش قدمی کی سمت تبدیل کر کے وارسا سے پہلے پولش فوج کے بازو پر حملہ کریں، تو اس وقت بھی جنوب مغربی کمان سٹالن کی شہ پر مغرب کی طرف بڑھتی رہی۔ کیا لوو کو فتح کرنے کے بجائے یہ بہتر نہیں تھا کہ وارسا کو فتح کرنے میں ''دوسروں'' کی مدد کی جاتی۔ متعدد احکام اور دھمکیوں کے بعد جنوب مغربی کمان نے اپنی سمت بدل لی۔ لیکن چند دنوں کی تاخیر اپنے مہلک اثرات چھوڑ چکی تھی۔

ہماری فوجوں کو چار سو یا اس سے زیادہ کلومیٹر پیچھے ہٹنا پڑا کل کی فتوحات کو دیکھ کر کوئی بھی اس صورتحال پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔ جب میں رینگل کے محاذ سے واپس آیا تو ماسکو دوسری پولش جنگ لڑنے پر تیار تھا۔ ریکوف بھی دوسرے کیمپ میں چلا گیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا: ''اب جب کہ جنگ شروع ہو گئی

اسے منطقی انجام تک پہنچائیں گے۔'' مغربی محاذ کی کمان حوصلے بڑھا رہی تھی۔ ریز رو فوج آ گئی تھی۔ توپ خانے کو دوبارہ منظّم کیا گیا تھا۔ اسی قسم کی دوسری باتیں ہو رہی تھیں۔ خواہشیں خیال سے بہت آگے چل رہی تھیں۔ ''مغربی محاذ پر ہمارے پر ہمارے پاس کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''اخلاقی طور پر شکست خوردہ فوج؟ جس میں نیا انسانی خمیر ڈالا جا رہا ہے۔ اس قسم کی فوج لے کر لڑنا مشکل ہے۔ اس فوج سے فقط دفاعی جنگ لڑی جا سکتی ہے۔ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتے جائیں اور عقب میں نئی فوج تیار کرتے رہیں۔ لیکن یہ سوچنا انتہائی احمقانہ بات ہوگی کہ فوج ایک ایسی راہ پر پیش قدمی کر سکتی ہے جس پر اس کے اپنے ہی ٹکڑے بکھرے ہوں۔'' میں نے صاف طور پر کہہ دیا کہ اگر اس قسم کی غلطی دہرائی گئی تو وہ ہمیں دس گنا مہنگی پڑے گی۔ اور یہ کہ جو فیصلہ تجویز کیا جا رہا تھا میں اس سے کبھی اتفاق نہیں کروں گا، بلکہ اسے پارٹی میں لے جاؤں گا۔ اگرچہ لینن جنگ جاری رکھنے کے حق میں تھا مگر اس کے لہجے میں اب اعتماد اور اصرار نہیں تھا۔ ایک امن معاہدے پر میرا اصرار' خواہ وہ گھاٹے کا سودا ہی کیوں نہ تھا، لینن پر اثر انداز ہوا۔ لینن نے تجویز کیا کہ فی الحال دوسرے حملے کا فیصلہ ملتوی کر دیا جائے، اور یہ کہ میں مغربی محاذ کی نگرانی کے علاوہ یہ بھی دیکھوں کہ پسپائی کے بعد وہاں فوج کی کیا حالت تھی۔ اس معاملے میں لینن میرے ساتھ تھا۔

محاذ پر موجود ہیڈ کوارٹر ایک اور جنگ کے حق میں تھا۔ لیکن اعتماد کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بس ماسکو کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ میں فوج کے پچھلے درجوں -- ڈویژن سے رجمنٹ، رجمنٹ سے کمپنی میں گیا تو، مجھے محسوس ہوا کہ ایک اور جنگ کے امکانات بہت کم تھے۔ میں نے ایک خط کے ذریعے لینن کو صورتحال سے آگاہ کیا اور اپنا معائنہ جاری رکھا۔ واپس آ کر میں نے اپنی رپورٹ پیش کر دی جس پر پولٹ بورو نے اتفاق رائے سے فوری امن کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

پولش جنگ میں حکمت عملی کے غلط اندازے بڑے تاریخی نتائج کی حامل ثابت ہوئے۔ پلسڈسکی کا پولینڈ غیر متوقع طور پر زیادہ مضبوط نکلا جس سے پولینڈ میں انقلاب کی پیش قدمی کو سخت دھکا لگا۔ رگا معاہدے کے تحت جو سرحدیں متعین کی گئیں ان سے سوویٹ روس جرمنی سے کٹ گیا۔ یہ حملہ کر کے جو غلطی کی گئی تھی، لینن سے زیادہ اس کی اہمیت کو کون سمجھ سکتا تھا۔ یہ اسے خیالوں میں پریشان کرتی رہتی تھی۔

بعد کی نسل نے اپنے ادب میں لینن کے تصویر نہیں بلکہ خاکہ پیش کیا۔ یہ ادبی حس اس کے ذوق کی

ترجمانی تھی۔ وہ اپنی پسند کے نقشے تیار کرتی رہی۔اس نے لینن کو اپنے ادب میں ایک عظیم انقلابی اور جنگی حکمت عملی بنانے والے کے بجائے ایک ایسی خودکار مشین کے طور پر پیش کیا جو بے خطا فیصلے کرتی تھی۔ میں نے لینن کیہ نام کے ساتھ لفظ ''جینئس'' اس وقت جوڑا جب کسی کو یہ لفظ بولنا بھی نہیں آتا تھا۔ لینن اتنا بڑا جینئس تھا جتنا ایک انسان ہوسکتا ہے۔لیکن وہ کوئی بے حس خودکار مشین نہیں تھا جو کوئی غلطی ہی نہیں کرتا تھا۔اس نے اپنی سیاسی زندگی میں غلطیاں کیں مگر دوسروں سے کم ان میں سنجیدہ نوعیت کی غلطیاں بھی شامل تھیں۔مگر اس کے سامنے جتنا بڑا اور عظیم کام تھا اس میں غلطیاں سرزد ہونا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔

لینن سے میرے تعلقات

اب میں لینن کے ساتھ اپنے تعلقات کے آخری زمانے کی طرف بڑھ رہا ہوں۔ یہ وہ زمانہ ہے جس میں بعد کی نسل نے اپنی فتوحات کی بنیادیں رکھیں۔لینن کی موت کے بعد ہمارے باہمی تعلقات کی تاریخ کو مسخ کرنے کی نیت سے ایک کثر الشاخہ ادارہ قائم کردیا گیا۔اس ادارے نے دو ''اصولوں'' کی مسلسل جنگ کے نام پر ہمارے درمیان چھوٹے موٹے اختلافات کو بہت سے جھوٹ ایجاد کرکے بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے۔قرون وسطیٰ کے عذرخواہوں نے جس شان دار طریقے سے کلیسا کی تاریخ رقم کی ہے وہ لوگ بھی لینن اور میرے تعلقات میں جدید فنی طریقے سے تاریخی تحقیقات کے ذریعے موشگافیاں تلاش کرنے والوں کے سامنے ہیچ دکھائی دیں گے۔ان کے کام کو اس بات نے زیادہ آسان بنادیا جب میں کسی پر لینن سے اختلافات کرتا تو کھل کر کرتا اور ضرورت پڑتی تو معاملہ پارٹی میں بھی لے جاتا۔اس کے برعکس یہ بے حیثیت لوگ لینن سے اختلافات کی صورت میں چپ سادھ لیتے یا سٹالن کی طرح دم دبا کر ماسکو کے مضافات میں کہیں تھوڑے عرصے کیلئے چھپ جاتے۔

زیادہ تر اختلافاتی معاملات میں آزادانہ سوچ بچار کے بعد لینن اور میں چھوٹی موٹی تفصیلات سے استثنا کے بعد تقریباً ایک جیسے فیصلے پر ہی پہنچ جاتے تھے۔ جب میں سمجھتا کہ پولٹ بورو سوویٹوں کی عوامی کمسار کا فیصلہ غلط ہوسکتا تھا تو میں میٹنگ کے دوران پرچی پر لکھ کر لینن کو بھجوادیتا۔ وہ اسی پرچی پر یہ لکھ کر واپس بھجوادیتا۔ ''تم بالکل ٹھیک کہتے ہو۔اپنی طرف پر یہ لکھ کر بھجوادو۔'' بعض اوقات وہ مجھ سے پوچھ لیتا

کہ میں اس کی تجویز سے متفق تھا کہ نہیں۔ پھر وہ مجھ سے کہتا کہ میں اٹھ کر اس کی حمایت میں تقریر کروں۔ متعدد دفعہ وہ فون پر مجھ سے پوچھ لیتا کہ کسی معاملے سے کیسے نپٹا جا سکتا تھا۔ اگر معاملہ زیادہ اہم ہوتا تو وہ اصرار کر کے کہتا۔ ''مہربانی کر کے جلدی سے آ جاؤ'' جن معاملات پر ہم مشترکہ طور پر کام کر رہے ہوتے، اصولوں کی وجہ سے ہمارے درمیان اختلاف کی صورت میں یہ لوگ خاموشی سے بیٹھے تماشا دیکھتے رہتے۔ متعدد بار کئی اہم مسائل پر سٹالن، زینوثیف یا کامینیف سے اختلافات ہو جاتا۔ لیکن جب انہیں معلوم ہوتا کہ لینن مجھ سے اتفاق کرتا تھا تو یہ لوگ دوبارہ زبان کھولنے کی جرات نہیں کرتے تھے۔ ان کی اس فرماں برداری سے یہ ہرگز پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ آزادانہ طور پر بھی کسی فیصلے پر پہنچنے کے اہل تھے کہ نہیں ۔اس کتاب میں لینن سے میرے اختلافات ی ایک اہمیت ہے مگر وہ لوگ ایسی کسی اہمیت سے محروم تھے۔ اس کی دو وجہ ہیں۔ ہمارے اختلافات اہم ہوتے اور وہ دوسروں کی توجہ کا مرکز بن جاتے۔ لینن کی موت کے بعد انہیں اس قدر بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا اور انہیں ایک ایسا سیاسی معاملہ بنا دیا گیا جس سے ہم دونوں کا کوئی تعلق تھا ہی نہیں۔

میں برسٹ-لٹووسک امن معاہدے کے سلسلے میں لینن سے اپنے اختلافات کو ایک الگ باب میں بیان کر چکا ہوں۔ اب میں ایک ایسے اختلافات کا ذکر کروں گا جو ہم دونوں کے درمیان 1920ء کے اختتام پر نئی اقتصادی پالیسی' اختیار کرنے پر ظاہر ہوا اور چند ماہ جاری رہا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ٹریڈ یونینوں کے معاملات پر ہماری بحث اکثر ہمارے تعلقات خراب کر دیتی تھی۔ ہم دونوں اتنے انقلابی یا اتنے سیاسی تھے کہ ذاتیات کو عمومی چیزوں سے الگ نہیں کر سکتے تھے۔ ایسی کوئی بحث سٹالن اور زینوثیف کو موقع فراہم کر دیتی کہ وہ اس جائز موقع سے فائدہ اٹھا کر کھلم کھلا میرے خلاف ہو جائیں۔ وہ ایسی کسی صورتحال سے پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے جو ان کیلئے ''ٹراٹسکی ازم'' کے خلاف ان کی آئندہ تحریک کی ریہرسل ہوتی تھی۔ یہی چیز لینن کو پریشان کرتی اور وہ اس سے بچنے کی کوشش کرتا رہتا۔

ہماری بحث اس قدر طویل ہوتی اور اس میں اتنا مواد جمع ہو جاتا کہ مورخ کو اس کی چھان پھٹک کر کے نیچے سے سچائی تلاش کرنے میں نہ جانے کتنی محنت کرنی پڑے۔ لینن کی موت کے بعد ان بے حیثیت اور نادان لوگوں کو اب ''معلوم'' ہوا ہے کہ میرا موقف ''کم تر کسانوں'' جیسا ہوتا تھا' اور یہ کہ

میں نئی اقتصادی پالیسی کا دشمن تھا مجھ پر بعد کے تمام حملوں کی یہی بنیاد تھی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ نئی اقتصادی پالیسی پر میرے اختلاف کی وجہ سے بالکل دوسری تھی۔ حقیقت سامنے لانے کیلئے میں اس کا ذکر تھوڑا سا ماضی سے کروں گا۔

1919ء کے موسم خزاں میں ہماری ٹرینوں کے 60 فیصد انجن خراب تھے اندیشہ تھا کہ 1920ء کے موسم بہار تک یہ انجن 75 فیصد خراب ہو جائیں گے۔ ہماری ماہرین کی کم از کم یہ رائے تھی۔ ان حالات میں ریلوے ٹریفک بے مقصد ہو کر رہ گئی تھی کیونکہ بقیہ 25 فیصد انجنوں سے کام نہیں چلایا جا سکتا تھا۔ اس وقت انجنوں کے انچارج انجینئر نے حکومت کیلئے انجنوں کی ''بیماری'' کی ایک رپورٹ تیار کی۔ ریاضی کے اصولوں پر ایک انجن کا خاکہ تیار کرتے ہوئے اس نے بتایا کہ انجنوں کی ''موت'' کی کیا وجہ تھی۔

''پھر کیا کیا جائے؟'' لینن نے پوچھا۔

''معجزہ تو ہو نہیں سکتا۔'' لومونوسوف نے جواب دیا۔ ''بالشویک بھی کوئی معجزہ نہیں دکھا سکتے۔'' ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ ہم میں سے کوئی بھی انجنوں کے فنی پہلوؤں کا علم نہیں رکھتا تھا۔ ''اس کے باوجود ہم معجزہ دکھانے کی کوشش کریں گے۔'' لینن اپنے دانتوں کو بھینچ کر خشک لہجے میں بڑبڑایا۔

بعد کے ایام میں صورتحال زیادہ خراب ہوتی چلی گئی۔ اس کی معروضی وجوہات ہو سکتی تھیں، مگر یوں لگتا تھا جیسے انجینئر بھی اس میں اپنی طرف سے کچھ حصہ ڈال رہے تھے۔ میں نے 20-1919ء کے عرصہ یورال میں معاشی امور کو سیدھا کرنے میں گزار دیا۔ لینن نے مجھے تار کے ذریعے یہ تجویز بھیجی کہ میں ریلوے کا نظام اپنے ہاتھ میں لے کر اسے ہنگامی بنیادوں پر درست کروں۔ میں نے یہ تجویز قبول کر لی۔

یورال سے واپسی پر میں بہت سے معاشی مشاہدے اپنے ساتھ لایا تھا۔ ان کا نچوڑ یہ تھا کہ ہمیں جنگی اشتراکیت چھوڑنی ہوگی۔ میرے عملی کام نے مجھے سکھا دیا تھا کہ خانہ جنگی کی وجہ سے ہم پر جو جنگ نافذ کر دی گئی تھی، اس نے ہمیں مکمل طور پر تھکا دیا تھا۔ ملک کی معاشی زندگی کی بحالی کیلئے ذاتی دلچسپی بہت ضروری تھی۔ سب سے پہلے ملکی مارکیٹ کو چلانے کی ضرورت تھی۔ میں نے مرکزی کمیٹی کو ''فوڈ لیوی'' کی جگہ جنس پر ٹیکس کی تجویز پیش کی۔ اس کے ساتھ اشیا کا تبادلہ بھی تجویز کیا۔

میں نے اس سلسلے میں مرکزی کمیٹی کو فروری 1920ء میں رپورٹ پیش کی، اس کا خلاصہ کچھ اس قسم کا تھا۔

''غذائی ذرائع ختم ہونے کا اندیشہ ہے۔ معاشی انحطاط کے سدباب کیلئے یہ طریقے اپنائے جا سکتے ہیں۔ 1- فالتو اجناس کو نقد ادائیگی کے ایک خاص تناسب سے خریدا جائے۔ (یہ ایک طرح کا ترقی یافتہ انکم ٹیکس تھا) ادائیگی کا طریق کار کچھ اس قسم کا ہو کہ اس زیر کاشت رقبے میں اضافہ ہوتا جائے۔ یعنی کاشت کاری میں فائدہ ہو۔ 2- صنعتی مال اور زرعی اجناس میں تبادلے کے نظام کو زیادہ بہتر بنایا جائے۔ اس کا اطلاق ضلعی سطح پر ہی نہیں، ہر کسان گھر پر ہونا چاہیے۔

یہ تجویزیں بڑی سوچ بچار کے بعد تیار کی گئی تھیں۔ لیکن ایک سال پہلے جو نئی اقتصادی پالیسی اختیار کی گئی تھی، اس میں اس قسم کی کوئی تجویز موجود نہیں تھی۔ لینن میری تجاویز کے خلاف۔ مرکزی کمیٹی نے انہیں گیارہ کے مقابلے میں چار ووٹوں سے رد کر دیا۔ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کمیٹی کا فیصلہ غلط تھا۔ میں نے اسے پارٹی کانگریس میں لے جانا مناسب خیال نہ کیا جو جنگی اشتراکیت کے نعرے کے تحت منعقد کی جا رہی تھی۔ پورا سال ملک کی معاشی زندگی ایک بند گلی میں بھٹکتی رہی۔ جب مارکیٹ سسٹم میں تبدیلی کو رد کر دیا گیا تو میں نے کہا کہ ''جنگی'' طریقہ کار کو مناسب طور پر استعمال کیا جائے تاکہ حقیقی معاشی بہتری حاصل کی جا سکے۔ جنگی اشتراکیت میں جس کے تحت تمام بڑے ذرائع پیداوار قومیں لئے جاتے ہیں اور انہیں حکومت کی جواب دید پر تقسیم کیا جاتا ہے، مجھے اس میں ٹریڈ یونینوں کا کوئی آزاد کردار دکھائی نہ دیا۔ اگر حکومت نے ہر شے محنت کشوں کو مہیا کرنی تھی تو پھر تقسیم کے اس نظام میں ٹریڈ یونینوں کا بھی کوئی کردار ہونا چاہیے تھا۔ میں ٹریڈ یونینوں کو حکومتی اداروں کا ایک فعال حصہ بنا دینا چاہتا تھا اور اپنے اس خیال کا دفاع کر رہا تھا۔

نویں کانگریس نے جنگی اشتراکیت کے جو اصول وضع کیے ریلوے کے نظام کی تنظیم نو کے کام میں وہی میری بنیاد تھے۔ ریلوے ٹریڈ یونین کا ریلوے کی انتظامیہ سے گہرا رشتہ تھا۔ میں نے فوجی تنظیم کا طریقہ کار ریلوے پر بھی لاگو کر دیا۔ اس سے مجھے متعدد فوائد حاصل ہوئے۔ میں ہر روز وزارت جنگ سے ریلوے کی وزارت میں جانے لگا جسے ان دنوں جنگ نے تباہ کر رکھا تھا۔ میری کوشش تھی کہ ریلوے کو مکمل تباہی سے بچا لوں اور اس کے ساتھ ہی اس میں بہتری بھی پیدا کر دوں۔

ریلوے میں ایک سال کا کام کسی سکول میں پڑھائی کے ایک سال کے برابر تھا۔ معاشی زندگی کو سوشلسٹ بنیادوں پر کھڑا کرنے کے سارے سوالوں کا جواب مجھے یہاں مل گیا۔ ٹرینوں کے انجنوں اور ڈبوں کی مختلف اقسام نے ان کی مرمت گاہوں میں کام کو بڑا پیچیدہ بنا رکھا تھا۔ سب سے پہلے تمام انجنوں کی ان کی ساخت کے مطابق مہرست تیار کی گئی۔ پھر ان انجنوں کی الگ الگ مرمت گاہیں اور کاریگر متعین کیے گئے۔ ریلوے نظام کو جنگ سے پہلے والی حالت میں لانے کیلئے ساڑھے چار برس کا عرصہ درکار تھا۔ ہم نے جو طریقے استعمال کیے وہ بڑے کامیاب ثابت ہوئے۔ 1920ء کے موسم بہار اور گرمیوں میں ریلوے نظام اپنی فالج زدگی سے صحت یاب ہونے لگا۔

لینن اس کے متعلق پوچھنے کا کبھی کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتا۔ اگر پلسڈسکی نے ہمارے ریلوے نظام کو تباہ کرنے اور اس طرح پولینڈ کیلئے متوقع نتائج حاصل کرنے کی امید پر جنگ شروع کی تھی، تو اس نے ایسا ہمارے ریلوے نظام کو بہتری کی طرف جاتے ہوئے دیکھ کر کیا تھا۔

لیکن محنت کش لوگ جو خانہ جنگی کے تین برسوں سے گزر رہے تھے، فوجی تنظیم کو قبول کرنے کو تیار نہیں تھے۔ لینن کی سیاسی حس نے اسے بتا دیا تھا کہ نازک لمحہ آ گیا تھا۔ میں نے جنگی آشترا کیت کے اصولوں کی بنیاد پر خالص معاشی عوامل کے پیش نظر ٹریڈ یونینوں کو زیادہ فعال بنانے کا موقف اختیار کر رکھا تھا، جب کہ لینن سیاسی عوامل کے پیش نظر فوجی ڈسپلن کی گرفت ہلکی کرنے کے حق میں تھا۔ دسویں کانگریس کے موقع پر ہمارے موقف ایک دوسرے سے زبردست طور پر ٹکرا گئے۔ پارٹی میں بحث چل پڑی۔ یہ بحث اصلی بات کے علاوہ تھی۔ پارٹی اس نکتے پر غور کر رہی تھی کہ ٹریڈ یونینوں کو کس تناسب سے حکومتی مشینری کا حصہ بنایا جائے، جب کہ اصلی مسئلہ عوام کو روز کی روٹی مہیا کرنے کے علاوہ صنعتوں کو خام مال مہیا کرنے کا تھا۔ پارٹی اشترا کیت کی بات کر رہی تھی جب کہ ملک معاشی تباہی کے بھنور میں پھنسا ہوا تھا۔ رونسٹسٹ اور تمبوف کے صوبے میں اٹھنے والی شورشیں ایک بڑا انتباہ تھیں۔ نئی معاشی پالیسی اپنانے کیلئے لینن نے بڑا عمدہ نظریہ وضع کیا تھا۔ میں فوراً اس سے متفق ہو گیا۔ وہ قریب قریب انہیں تجاویز جیسا تھا جو میں نے ایک سال پہلے پیش کی تھیں۔ ٹریڈ یونینوں کا جھگڑا ایک دم اپنی اہمیت کھو گیا۔ لینن نے کانگریس میں اس جھگڑے میں کوئی حصہ نہ لیا اور زینوشیف کو چلے ہوئے کارتوس سے کھیل کر خوش ہونے کو موقع فراہم کرتا رہا۔ میں نے کانگریس میں کہا کہ ٹریڈ یونینوں کے متعلق منظور کی ہوئی قرارداد اگلی کانگریس تک

موثرنہیں رہے گی کیونکہ نئی معاشی پالیسی ٹریڈ یونینوں کے متعلق ایک مکمل ترمیم شدہ حکمت عملی کی متقاضی ہوگی۔اور ایسا ہی ہوا۔ چند ماہ بعد لینن کو ٹریڈ یونینوں کے کردار اور مقصد کے بارے میں نئی معاشی پالیسی کی روشنی میں اصول وضع کرنے پڑے۔ان کے متعلق قرارداد کی میں نے مکمل حمایت کی۔ ہمارا مضبوط محاذ دوبارہ بحال ہو گیا۔لینن ڈرتا تھا کہ بحث کے نتیجے میں جو دو ماہ تک جاری رہی ، پارٹی میں مستقل طور پر متحاذب فریق پیدا نہ ہو جائیں جو پارٹی کے کام کو مشکل بنا دیں۔

کانگریس ابھی جاری تھی کہ ٹریڈ یونینوں کے سوال پر مجھ سے اتفاق کرنے والوں سے میں نے مزید بحث بند کر دی۔کانگریس کے چند ہفتوں بعد لینن کو یقین دلا دیا گیا کہ میں عارضی تفرقے دور کرنے کو تیار تھا جن کی کوئی اصولی بنیاد نہیں تھی۔لینن کی چھاتی سے جیسے کوئی بوجھ ہٹ گیا۔اس نے مولوٹوف کے میرے متعلق بعض جملوں کا برا منایا جو نیا نیا مرکزی کمیٹی میں منتخب ہو کر آیا تھا۔لینن نے موقع پر ہی اسے کہہ دیا۔''پارٹی کے اندر کے تعلقات میں کامریڈ ٹراٹسکی کی وفاداری کسی شک وشبہ سے بالا ہے۔'' یہ فقرہ اس نے متعدد بار دہرایا۔وہ مولوٹوف ہی کو نہیں کسی اور کو بھی سنا رہا تھا۔سٹالن اور زینوشیف جھگڑے کی فضا کو++طول دینے میں لگے ہوئے تھے۔

دسویں کانگریس کے موقع پر لینن کی مرضی کے خلاف زینوشیف کی طرف سے سٹالن کا نام پارٹ ء کے جنرل سیکریٹری کے عہدے کیلئے بطور امیدوار پیش کیا گیا۔کانگریس کو یقین تھا کہ اسے پوری مرکزی کمیٹی کی حمایت حاصل تھی۔لیکن کسی نے بھی اس تقرر کو زیادہ اہمیت نہ دی۔ جنرل سیکریٹری کی آسامی دسویں کانگریس نے پیدا کی تھی اور لینن کی ماتحتی میں سیاسی کے بجائے فنی نوعیت کی حامل تھی اس کے باوجود لینن کے دل میں وہ سٹالن کے متعلق کہتا تھا۔یہی وجہ تھی کہ کانگریس کے بعد مرکزی کمیٹی کے پہلے اجلاس میں وہ ''ٹراٹسکی کی وفاداری'' پر زور دیتا تھا۔یہ زیر زمین سازش کو ایک دھمکی ہوتی تھی۔لینن یہ بات یونہی نہیں کہہ دیتا تھا۔خانہ جنگی کے دوران میں لینن نے ایک دفعہ مجھ پر اپنے اخلاقی اعتماد کا اظہار کیا تھا لفظوں میں نہیں بلکہ عملی طور پر اور یہ اعتماد اس قدر مکمل تھا کہ کوئی شخص اس سے زیادہ کی خواہش نہیں کر سکتا تھا۔اس کا موقعہ بھی سٹالن کی پس پردہ فوجی مخالفت نے مہیا کیا۔ جنگ کے ایام میں مجھے عملی طور پر لامحدود اختیارات حاصل تھے۔انقلابی ٹربیونل کے اجلاس میری ٹرین میں منعقد ہوتے ،تمام محاذ میرے ماتحت تھے اور محاذوں کی ہر طرح کی ضروریات میرے ذریعے پوری کی جاتی تھیں۔روس کا سارا علاقہ

ماسوا جو سفید رجعت پسندوں کے تسلط میں تھا، فوج کی مختلف چھاؤنیوں اور قلعوں کی شکل میں میرے دوروں کا منتظر رہتا تھا۔ جو سپاہی جنگ میں کام آتے، ان کے عزیز واقارب ریلیف حاصل کرنے کیلئے میرے پاس آتے رہتے اس سلسلہ میں درخواستیں، شکایتیں اور احتجاج ماسکو میں مختلف جگہوں پر جمع ہوتے رہتے، خاص طور پر مرکزی مجلس عاملہ کے پریزیڈم کے پاس۔

یہ سلسلہ سیوی یازسک سے شروع ہوا تھا۔ میں چوتھی لٹوویں رجمنٹ کے کمانڈر کا قصہ پہلے ہی بیان کر چکا ہوں جس نے محاذ چھوڑ جانے کی دھمکی دی تھی اور میں نے اسے فوجی عدالت کے سپرد کر دیا تھا۔ فوجی عدالت نے اسے پانچ سال کی قید کی سزا دے دی تھی۔ چند ماہ بعد اسے معاف کرنے اور رہا کر دینے کی درخواستیں آنے لگیں۔ سیورڈلوف پر خصوصاً دباؤ زیادہ تھا۔ اس نے معاملہ پولٹ بورو کو بھجوا دیا۔ میں نے مختصر طور پر اس وقت کی فوجی صورتحال لکھ دی جس میں رجمنٹ کے کمانڈر نے مجھے دھمکی دی تھی اور کہا تھا کہ ''نتائج انقلاب کے حق میں خطرناک ہوں گے۔'' جب میں یہ واقعہ بیان کر رہا تھا تو لینن کا چہرہ سفید سے سفید تر ہو رہا تھا۔ میں نے واقعہ بیان کرنا ختم ہی کیا تھا کہ وہ سخت اور کھردرے ہیجان بھرے لہجے میں کہنے لگا۔ ''اسے اندر ہی رہنے دو، اسے اندر ہی رہنے دو۔'' سیورڈلوف نے ہم دونوں کی طرف دیکھا اور بولا ''میرا بھی یہی خیال ہے۔''

دوسرا واقعہ جو زیادہ اہم ہے، اس کا تعلق کمانڈر کو گولی مارنے اور کمساری کی طرف سے اس رجمنٹ کو محاذ سے واپس بلانے کے متعلق ہے جس نے اسلحہ کے زور پر وولگا میں سٹیمر پر قبضہ کر کے اسے نجنی۔ نفگوروڈ لے جانے کی تیاری کر لی تھی یہ واقعہ میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں۔ وہ رجمنٹ سمولی نسک میں میری فوجی حکمت عملی کے ان مخالفوں نے تیار کی تھی جو بعد میں اس کے زبردست حمایتی بن گئے تھے۔ لیکن اس وقت وہ لوگ بڑی بلند آواز میں احتجاج کر رہے تھے۔ میری درخواست پر مرکزی کمیٹی کی طرف سے تشکیل دیا جانے والا کمشن اس بات پر پوری طرح متفق تھا کہ فوجی حکام نے جو اقدام کیا تھا، بالکل درست تھا۔ صورتحال اسی کی متقاضی تھی۔ مگر افواہیں پھیلتی جاری رہیں۔ متعدد بار مجھے محسوس ہوا کہ ان کا ذریعہ پولٹ بورو ہی ہوسکتا تھا۔ لیکن میرے پاس تحقیق اور سازش کو بے نقاب کرنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے بس ایک پولٹ بورو کی میٹنگ میں کہا کہ اگر سیوی یازسک میں بے رحمانہ اقدام نہ کیا گیا تو اس وقت ہم یہ میٹنگ منعقد نہ کر رہے ہوتے۔ ''بالکل ٹھیک ہے۔'' لینن نے کہا اور اسی وقت سرخ سپاہی سے ان

کاغذ پر لکھنا شروع کر دیا جس پر عوامی کمسار کی سوویٹ کی مہر لی ہوئی تھی۔ لینن کی زیر صدارت ہونے والی میٹنگ ایک دم رک گئی۔ دو منٹ بعد اس نے وہ کاغذ میرے حوالے کر دی۔ لینن نے لکھا تھا:

’’میں تمہاری بات کرتا ہوں اور آئندہ بھی کرتا رہوں گا۔‘‘ خانہ جنگی اور بحران کے اس زمانے میں بعض فیصلے غلط بھی ہو سکتے تھے، لیکن مستقبل کیلئے میں جو فیصلہ ضروری سمجھتا، لینن آنکھیں بند کر کے اس پر دستخط کر دیتا۔ اور یہ ایسے فیصلے تھے جن پر زندگی یا موت کا انحصار ہوتا تھا ایک آدمی کے دوسرے آدمی پر اعتماد کی اس سے بڑی کیا مثال ہو سکتی تھی۔ ان غیر معمولی الفاظ کو تحریر کرنے کا خیال اسے فقط اس لیے آیا تھا کہ اسے معلوم تھا کہ کہاں سازش ہو رہی تھی اور اسے موقع پر پوری طاقت سے کچل دینا بہت ضروری تھا۔ وہ ایسے لفظ لکھنے کا خطرہ اسی صورت میں مول لے سکتا تھا جب اسے یقین تھا کہ میں اس سے غداری یا طاقت کا غلط استعمال نہیں کروں گا اور اس اعتماد کا اظہار اس نے چند سطروں میں کر دیا تھا۔ بے حیثیت لوگ ایسی دستاویز اپنی کسی نجی جائیداد میں کہاں سے تلاش کریں گے۔ سٹالن کے ریکارڈ روم میں اگر کوئی چیز ہو سکتی ہے تو وہ لینن کی ’’وصیت‘‘ ہے جسے سٹالن نے پارٹی سے چھپا لیا تھا۔ وصیت میں سٹالن کو ایک غیر وفادار آدمی اور اقتدار کو غلط استعمال کرنے والا لکھا گیا تھا۔ لینن نے مجھے جو لامحدود اختیارات دے رکھے تھے ان کا موازنہ ذرا لینن کے اس وولف* پاسپورٹ سے کریں جو اس نے سٹالن کو جاری کیا تھا۔ ہم دونوں کی طرف اس کا کیا رویہ تھا، اس پاسپورٹ سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے۔

مہر والے کاغذ پر لینن نے جو تحریر لکھی، وہ یہ تھی۔

آر، ایس، ایف، ایس، آر،

عوامی کمساروں کی سوویٹ کا چیئرمین

کریملن ---- ماسکو

جولائی ---- 1919ء

کامریڈ

کامریڈ ٹراٹسکی کے آرڈر کی سخت نوعیت کو سمجھتے ہوئے میں اسکی درستگی کا مکمل طور پر قائل ہوں۔ جس مقصد کیلئے یہ حکم جاری کیا گیا ہے، یہی اس کی کامیابی کی دلیل ہے۔ میں اس کی مکمل اور غیر مشروط تصدیق کرتا ہوں

---

* زار کے زمانے میں ''وولف پاسپورٹ'' کا مطلب مقامی زبان میں ''عارضی سرٹیفکیٹ'' تھا جو مجرموں کو پاسپورٹ کی جگہ جاری کیا جاتا تھا۔اس کی وجہ سے وہ اچھوت بن جاتے اور ایک جگہ زیادہ عرصہ نہ ٹھہر سکتے تھے۔(مترجم)

لینن کی علالت

کمیونسٹ انٹرنیشنل کی دوسری کانگریس سے پہلے 1920ء کے موسم بہار میں میں نے پہلی بار رفعت لی اور ماسکو کے مضافات میں دو ماہ گزارے جن میں میں اپنا علاج کراتا رہا۔اب میں اپنی صحت کو زیادہ سنجیدگی سے لینے لگا تھا اسی عرصے میں اس مینی فیسٹو پر بھی کام کرتا رہا جو اگلے سال کمیونسٹ انٹرنیشنل کے پروگرام کا متبادل ثابت ہوا۔میری قسمت میں آرام نہیں لکھا تھا۔سیر وتفریح مجھے آج کی طرح اس وقت بھی کوئی آرام مہیا نہیں کرتی تھی۔البتہ شکار میں دلچسپی میرے ذہن کو کسی زخم پر مرہم کا کام دیتی تھی۔

مئی 1922ء کی ایک اتوار کو میں جال لے کر مچھلیاں پکڑنے دریائے ماسکو کی آبنائے میں چلا گیا۔بارش ہو رہی تھی جس کے سبب گھاس گیلی تھی۔میں پھسل گیا اور اپنے پاؤں کا ایک پٹھا تڑوا بیٹھا۔چوٹ سنجیدہ نوعیت کی نہیں تھی۔مجھے چند روز بستر میں گزارنے پڑے۔تیسرے دن بخارن مجھے ملنے آیا۔

''تم بھی بستر میں لیٹ گئے ہو؟''اس نے مزاج پرسی کرتے ہوئے افسوس سے پوچھا۔

''اور کون بستر میں لیٹا ہے؟''

''لینن سخت بیمار ہے۔اسے دل کا دورہ پڑا ہے۔وہ نہ بول نہ چلا سکتا ہے۔ڈاکٹروں کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔''

لینن اپنی صحت میں بڑی دلچسپی لیتا تھا۔وہ اکثر کسی مہاجر کے یہ لفظ دہراتا رہتا تھا۔''بوڑھے مر جائیں گے اور جوان ہتھیار ڈال دیں گے۔''

''ہم میں سے کتنے ایسے ہیں جو جانتے ہیں کہ یورپ میں کیا ہو رہا ہے اور عالمی مزدور تحریک کس

حال میں ہے؟ جب تک ہم انقلاب کو چلاتے رہیں گے۔'' وہ اکثر کہا کرتا ''ہماری پارٹی کے بالائی طبقے کے تجربے کی جگہ کوئی اور نہیں لے سکتا۔'' لینن مضبوط صحت کا مالک تھا جو انقلاب کے ناقابل تباہ ستونوں میں سے ایک تھی۔ وہ ہمیشہ سرگرم، چوکنا اور معتدل مزاج دکھائی دیتا۔ بس کبھی کبھی تشویش میں مبتلا ہو جاتا۔ کمیونسٹ انٹرنیشنل کی پہلی کانگریس کے موقع پر وہ مجھے پہلی دفعہ تھکا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے لہجے کی ناہمواری اور بیمار آدمی جیسی مسکراہٹ نے مجھے حیران کر دیا۔ میں اسے متعدد بار بتا چکا تھا کہ وہ کیوں چھوٹی چھوٹی باتوں پر اپنی جان ہلکان کر رہا تھا۔ وہ مجھ سے متفق ہو جاتا مگر کہتا کہ ایسا کیے بغیر وہ رہ نہیں سکتا تھا۔ وہ اپنے دردِ سر کا ذکر بڑے سرسری انداز میں کرتا اور دو یا تین ہفتے کے آرام کے بعد ٹھیک ہو جاتا۔ یوں لگتا جیسے لینن کبھی ختم نہیں ہوگا۔

1921ء کے اختتام پر اس کی حالت زیادہ خراب ہوگئی۔ 7 دسمبر کو اس نے پولٹ بیورو کے ارکان کے نام یہ نوٹ بھجوایا۔ ''میں آج میٹنگ میں شمولیت اختیار نہیں کر سکتا۔ تھوڑا کام اور زیادہ آرام کرنے کے باوجود میرا جگ رتا بڑھتا جا رہا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ میں اس قابل نہیں کہ پارٹی کانفرنس یا سوویت کانگریس میں کوئی رپورٹ پیش کر سکوں۔'' مگر وہاں سے بھی سرکاری اور پارٹی کی رفتار کا جائزہ لیتا رہتا۔ ،اس وقت جنیوا کانفرنس کی تیاریاں جاری تھیں۔ 23 جنوری 1922ء کو لینن نے پولٹ بیورو کے ارکان کو لکھا:

''مجھے ابھی ابھی چچرن کے دو خط ملے ہیں (20 اور 20 جنوری) اس نے لکھا ہے کہ کیا آئین میں چھوٹی موٹی تبدیلیاں کر کے طفیلی قسم کے لوگوں کیلئے سوویٹوں میں نمائندگی کی کوئی جگہ نکل سکتی ہے؟ ایسا امریکیوں کو خوش کرنے کی خاطر کیا جائے گا۔ چچرن کی یہ تجویز بتاتی ہے کہ اسے فوراً ہسپتال بھیجنے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں تاخیر پر اتفاق میرے رائے میں ایک بڑی قباحت ہوگی۔،، اس نوٹ کے ہر لفظ میں طنز کے ساتھ جو سیاسی بے رحمی چھپی ہوئی ہے وہ لینن کی بڑی خاصیت تھی۔

اس کی صحت برابر خراب ہوتی گئی۔ مارچ میں اسے دردِ سر کی زیادہ شکایت رہنے لگی۔ ڈاکٹروں کو اس کی کوئی جسمانی وجہ نظر نہیں آتی تھی۔ وہ اسے ماسکو کے قریب گاؤں میں مسلسل آرام کی ہدایت کرتے رہے۔ وہیں اسے مئی کے آغاز میں دل کا پہلا دورہ پڑا۔ میرے پاس بخارن کے آنے سے دو دن پہلے وہ بیمار ہو گیا تھا۔ لیکن مجھے اس کے بارے میں کچھ نہ بتایا گیا؟ اس وقت تو میں لینن کے کسی شعبے کی زد میں

نہیں تھا۔''ہم تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتے تھے۔'' بخارن نے مجھے بتایا۔''ہم دیکھ رہے تھے کہ اس کی بیماری کیا صورت اختیار کرتی ہے۔'' بخارن کسی دوسرے کی زبان بول رہا تھا۔اسے جیسا کہا گیا،اس نے مجھ سے کہہ دیا۔ان دنوں بخارن میرے ساتھ جڑا ہوا تھا،نصف جذباتی نصف بچگانہ انداز میں۔پھر وہ میرے بستر پر بیٹھ کر اپنے ہاتھوں سے مجھے دباتے ہوئے بڑبڑانے لگا۔''میرے درخواست ہے کہ اپنا دھیان رکھو۔کہیں تم بیمار نے ہو جانا۔دو آدمیوں کی موت کا سوچ کر میں تھرا جاتا ہوں----لینن اور تم۔'' میں نے اسے پیار سے تھپتھپایا۔وہ مجھے لینن کی علالت کا زیادہ اثر لینے سے منع کر رہا تھا۔صدمہ بہت بڑا تھا۔یوں لگتا تھا جیسے انقلاب بذات خود اپنا سانس روکے ہوئے تھا۔

ایس، آئی،سیدوا اپنے نوٹس میں لکھتی ہے۔''لینن کی علالت کی ابتدائی افواہیں سرگوشیوں میں تھیں۔کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ لینن بیمار پڑ سکتا تھا۔وہ دوسروں کی صحت کو بڑے غور سے دیکھتا مگر خود بیماریوں کا عادی ہو چکا تھا۔تقریباً تمام پرانے انقلابی دل کے کسی نہ کسی مرض میں مبتلا تھے۔ایسا مسلسل دباؤ کی وجہ سے تھا۔ڈاکٹر کہا کرتے تھے۔''سب کی موٹریں رک رک کر چل رہی ہیں۔''

''پروفیسر گوتیئر نے ایک دفعہ لیوڈیوی ڈووچ سے کہا تھا۔''فقط دو دل ٹھک طرح کام کر رہے ہیں۔ایک لینن کا اور ایک تمہارا۔ایسے دلوں کے ساتھ تو سو سال تک زندہ رہا جا سکتا ہے۔''غیر ملکی طبی ماہرین نے بھی تصدیق کر دی تھی کہ انہوں نے ماسکو میں جتنے دلوں کا معائنہ کیا تھا،ان میں لینن اور ٹراٹسکی کے دل غیر معمولی طور پر بہتر کام کر رہے تھے۔جب لینن کی علالت کی خبر پھیلی تو یوں لگا جیسے انقلاب بذات خود بیمار پڑ گیا تھا۔کیا لینن بولنے اور چلنے کی صلاحیت سے محروم ہو گیا تھا۔میں یہ یقین کیے بغیر نہ رہ سکی کہ وہ اپنی علالت پر قابو پا کر دوبارہ چلنے اور بولنے کے قابل ہو جائے گا۔'' ساری پارٹی کے یہی جذبات تھے۔

مجھے لینن کی بیماری کی خبر تیسرے دن ملی۔میں اس کی علالت کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔لیکن ایسا ہو بھی سکتا تھا۔جو میرے مخالف بننے کی تیاریوں میں مصروف تھے'اور سٹالن ان میں سب سے آگے تھا، وقت حاصل کرنے کی فکر میں تھے۔لینن کی علالت اس نوعیت کی تھی کہ کسی لمحے بھی کسی الم ناک انجام سے دوچار ہو سکتی تھی۔پھر قیادت کا نازک مسئلہ اٹھ کھڑا ہونا تھا۔میرے مخالف تیاریوں کیلئے ایک دن کا وقت بھی بہت سمجھتے تھے۔وہ چھپ کر ملتے اور کوئی راستہ نکالنے میں لگے رہتے۔میرے خلاف سہ فریقی

مخالف (سٹالن، زینوشیف اور کامینیف) کا منصوبہ پہلے ہی بن چکا تھا۔لیکن لینن صحت یاب ہونا شروع ہو گیا۔اس کی بے پناہ قوت رادی اس کے کام آئی۔ دماغ جس کی طرف خون کی گردش کم ہوگئی تھی اور جس کے سبب لینن نے بولنے اور سننے کی صلاحیت کھودی تھی، ایک دم درس طور پر کام کرنے لگا۔

مئی کے آخر میں میں مچھلی کے شکار کیلئے ایک ایسی جگہ چلا گیا جو ماسکو سے 80 ورسٹ دور تھی۔ وہاں ایک سینٹی ٹوریم تھا جس کا نام لینن کے نام پر رکھا گیا تھا۔ وہاں سینٹی ٹوریم میں داخل لڑکے میرے ساتھ جھیل میں گھومتے اور لینن کی صحت کے متعلق سوال پوچھتے رہے انہوں نے مجھے جنگلی پودوں کے گلدستے کے ساتھ لینن کیلئے ایک خط بھی دیا۔ لینن ابھی لکھنے کے قابل نہیں ہوا تھا۔ اس نے اپنے سیکریٹری کے ذریعے لڑکوں کے نام چند سطریں لکھوائیں۔''ولادیمیر ایلیچ نے مجھ سے کہا ہے کہ میں ان کی طرف سے آپ کیلئے سینٹی ٹوریم میں تحفہ لے کر جاؤں۔انہوں نے آپ کے خط اور پھولوں کے تحفے کا شکریہ ادا کیا۔ انہیں آپ کی دعوت پر نہ آسکنے کا افسوس ہے۔ انہیں اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ آپ کی صحبت میں انہوں نے زیادہ تیزی سے صحت یاب ہونا تھا۔''

جولائی میں لینن دوبارہ اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا۔ وہ اکتوبر سے پہلے سرکاری فرائض انجام دینے کے قابل نہ ہوسکا مگر ہر چیز پر آنکھ رکھے ہوئے تھا۔ صحت یاب ہونے کے ایام میں دوسری اشیا کے علاوہ وہ سوشلسٹ انقلابیوں کے مقدمے کی کارروائی پر بھی توجہ دیتا رہا۔ سوشلسٹ انقلابیوں نے ولودورسکی اور یورٹسکی کو ہلاک کرنے کے علاوہ لینن کو زخمی کرنے اور میری ٹرین کو دو دفعہ دھماکے سے اڑانے کی کوشش کی تھی۔ یہ سب کچھ نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ہم اپنی آنکھیں انقلاب کو درپیش خطرے سے بند رکھ کر دشمن کو اجازت نہیں دے سکتے تھے کہ وہ ایک ایک کر کے ہماری پارٹی کے سرکردہ لوگوں کو ہلاک کرتا جائے۔

نہ ہی اچھے اور نہ ہی برے دنوں کے ہمارے انسانی ہمدردی رکھنے والے دوست ہمیں بار بار بتاتے رہتے کہ کس کے خلاف کاروائی کا حق ہمیں ضرور حاصل تھا مگر کسی گرفتار دشمن کو گولی مار دینا ذاتی دماغ کی حدود سے تجاوز کرنا تھا۔ وہ ہمیں فراک دلی کا مظاہرہ کرنے کی تلقین کرتے رہتے۔ کلارا ژتکن اور دوسرے یورپی کمیونسٹ جو ابھی تک لینن اور مجھ سے مختلف سوچتے تھے، ان کے خیال میں ہمیں زیر مقدمہ لوگوں کو معاف کر دینا چاہیے تھا مجرموں کیلئے قیدی کافی تھا۔ یہ بڑا سادہ حل تھا۔ لیکن انقلاب کے دنوں میں انفرادی پاداش کے سوال نے خاص اہمیت اختیار کر لی تھی جس کے سامنے انسانی ہمدردیاں بے کار ثابت

ہونی تھیں۔ اسی وقت مسئلہ حقیقی طاقت پر قبضہ کرنے کا تھا جو زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔ انقلاب بھی اسی کا نام ہے۔ ان لوگوں کیلئے قید کی کیا حیثیت تھی جو یہ امید لگائے تھے کہ وہ دو ایک ہفتوں میں برسر اقتدار لوگوں کو قید یا قتل کر کے خود اقتدار پر قبضہ کر لیں گے۔ پھر تو انسانی ہمدردی کے نقطہ نظر سے جنگ کی طرح انقلاب کی مذمت بھی ضروری ہے۔ اس سے ذرا آگے بڑھ جائیں تو پوری انسانی تاریخ قابل مذمت ہے۔ شخصیت کے خیال نے انقلابات سے جنم لیا ہے۔ یہ عمل ابھی پوری طرح مکمل نہیں ہوا۔ شخصیت کے خیال کو حقیقت میں بدلنے اور عوام کی ناپختہ شخصیت کے تصور کو ختم کرنے اور ایسے تاریخی عمل کے ذریعے ایک بلند سطح پر لانے کیلئے ابھی انقلابات کے ایک سلسلے کی ضرورت ہے۔ عمومی فلسفے کے نقطہ نظر سے یہ نظریہ اچھا ہے کہ بڑا، میں نہیں جانتا، اور میں اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے یہ جاننے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ یہی وہ راہ ہے جس پر چل کر انسانیت یہاں تک پہنچی ہے۔

یہ مصروفیات انقلابی دہشت کو ''جائز'' قرار دینے کی کوشش نہیں ہیں۔ ایسا کرنا الزام تراشنے والوں لو اہمیت دینے کے برابر ہوگا۔ لیکن وہ کون لوگ ہیں؟ عالمی قتل عام کو منظّم کرنے والے؟ اپنی دعوتوں کے بعد سگار کے دھویں کی خوش گوار فضا میں ''گم نام سپاہیوں'' کی تعریف کرنیوالے؟ یہ ٹھنڈے دماغوں والے جو اس وقت جنگ کرتے ہیں جب جنگ کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ یہ قابل نفرت بہروپئے۔ لائیڈ جارج، ولسن، پونکرئے -- جو اپنے جرائم اور ہوہن زولرن کے جرائم کے عوض جرمن بچوں کو بھوکا مارنا چاہتے ہیں؟ یہ انگریز قدامت پسند یا فرانسیسی جمہوریت پسند جنہوں نے ایک مضفوظ فاصلے سے روس میں خانہ جنگی کی آگ بھڑکائی ارخون سے منافع کمایا۔ یہ سلسلہ ختم ہوئے بغیر چلتا رہے گا۔ میرے لیے سوال کسی چیز کو فلسفیانہ طور پر جائز قرار دینے کا نہیں بلکہ سیاسی وضاحت کا ہے۔ انقلاب فقط انقلاب ہوتا ہے کیونکہ یہ زندگی اور موت کے تمام تضادات مٹا دیتا ہے۔ کیا یہ بات قابل فہم ہے کہ ہر نصف صدی کے بعد انسانی لاشوں کے ڈھیر پر الساس-سورین کی خودمختاری کا مسئلہ حل کرنے والے پارلیمنٹ میں تقریروں سے یہ مسئلہ حل کر لیں گے؟ بہر حال ابھی تک کسی نے ہمیں یہ نہیں بتایا کہ یہ کیسے حل ہوگا۔ ہم لوہے اور بارود سے پرانی چٹانوں کی مزاحمت ختم کر رہے ہیں۔ جب ہمارے دشمن مہذب اور جمہوری قوموں س مانگی ہوئی رائفلوں سے ہم پر گولی چلاتے ہیں تو پھر ہمیں بھی انہیں اسی لہجے میں جواب دینا پڑتا ہے برزرڈ شا غیر جانب داری سے دونوں جانب اپنی داڑھی ہلاتا رہا مگر کسی نے بھی اس کے واعظانہ دلائل

کی پروانہ کی۔

1922ء کے موسم گرما میں سوشلسٹ انقلابیوں کی سزاؤں کا مسئلہ زیادہ اہمیت اختیار کر گیا۔اس مسئلے کا تعلق ایک ایسی پارٹی کے راہنماؤں سے تھا جس نے ہمارے پہلو بہ پہلو زار حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھائے تھے مگر اب اکتوبر انلاب کے بعد وہی ہتھیار ہمارے خلاف استعمال کرنے لگی تھی۔ سوشلسٹ انقلابیوں کو چھوڑ کر ہماری طرف آنے والوں نے بتایا کہ دہشت گردی کے فعل انفرادی سطح پر نہیں ہوتے تھے، جیسا کہ ہمارا خیال تھا یہ ساری پارٹی کا کام تھا۔مگر کسی قتل کی ذمہ داری کوئی قبول نہیں کرتا تھا۔عدالت نے سزائے موت تو دے دینی تھی۔مگر اس کے بعد دہشت گردی کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو جانا تھا۔سزائے موت کو قید میں بدل دینا بھی دہشت گردی کی حوصلہ افزائی کے برابر تھا کیونکہ یہ لوگ سوویٹ روس پر یقین ہیں رکھتے تھے۔سزاؤں کا انحصار اس بات پر تھا کہ یہ لوگ اپنی دہشت گردی جاری رکھیں گے کہ نہیں دوسرے لفظوں میں انہیں فی الحال قیدی ہی بنا کر رکھا جائے۔

لینن کی صحت یابی کے بعد میری اس سے پہلی ملاقات سوشلسٹ انقلابیوں کے مقدمے کی کاروائی کے دوران میں ہوئی ۔میرے لیے بڑے اطمینان کی بات تھی کہ وہ ایک دم میری یجویز سے متفق ہو گیا۔''تم ٹھیک کہتے ہو۔کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔''اس کی صحت یابی اس کیلئے بڑی خوشی کا باعث تھی۔ مگر اندر کہیں کوئی ڈر بیٹھا ہوا تھا۔اس نے قدرے پریشانی سے کہا''میں ابھی بول اور لکھ نہیں سکتا۔یہ کام مجھے نئے سرے سے کرنا ہوگا۔''پھر وہ آنکھیں اٹھا کر سوالیہ انداز میں میری طرف دیکھنے لگا۔

اکتوبر میں لینن سرکاری طور پر کام کرنے لگا۔اس نے پولٹ بورو اور عوامی کمسار کی سوویٹ کی صدارت کی۔نومبر میں وہ اپنی رگوں پر زور دے کر تقریریں کرتا رہا۔اس نے غیر محسوس طریقے سے جان لیا تھا کہ اس کی علالت کے ایام میں کوئی سازش تیار کی گئی تھی۔ابھی سازشی کھل کر سامنے نہیں آئے تھے۔لیکن جس طرح وہ زیر زمین بارودی سرنگیں بچھا رہے تھے اس کا پتا چلا رہا تھا۔کہ انہیں جب موقع ملتا میری مخالفت پر اتر آتے۔جیسے وہ آزاد ہونے کے مشق کر رہے تھے اور بڑی احتیاط سے اس کا مظاہرہ کرنا چاہتے تھے۔کام میں زیادہ مصروف ہونے کے باوجود لینن نے فکرمندی اور تشویش کے ساتھ ان تبدیلیوں کو دیکھا جو اس کی غیر حاضری کے ایام میں وقوع پذیر ہوئی تھیں۔مگر وہ صورتحال کو خراب کرنے کے ڈر سے خاموش رہا۔پھر اس نے''تین کے ٹولے'' سے نمٹنا شروع کر دیا، مگر ایک ایک کر کے۔

میں جو درجن بھر سرکاری و غیر سرکاری متفرق کام کر رہا تھا، ان میں سے ایک مذہب کے خلاف پراپیگنڈا بھی تھا۔ موخرالذکر میں لینن کو بڑی دلچسپی تھی۔ وہ مسلسل پوچھتا رہتا کہ میں یہ کام نظر سے اوجھل نہ ہونے دوں۔ صحت یابی کے دوران لینن کو کسی طرح پتا چل گیا کہ سٹالن مذہب کے خلاف پروپیگنڈا کے محکمے کی تنظیم نو کے بہانے اسے مجھ سے دور لے جا رہا تھا اور میرے ہی خلاف استعمال کر رہا تھا۔ دیہات سے اپنے مقام صحت یابی سے لینن نے پولٹ بورو کو ایک خط لکھا جس کی بظاہر مجھے کوئی ضرورت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ وہ خط ٹراٹسکی پر میری کتاب کے بارے میں تا جس میں کتاب اور مصنف دونوں کا ذکر کیے بغیر دونوں کی تعریف کی گئی تھی۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس وقت مجھے بالکل پتا نہ چل سکا کہ یہ بھی سٹالن کی مذمت کا ایک طریقہ تھا۔ اس عرصے میں مذہب کے خلاف پراپیگنڈا کا میرا کام میرے نائب یاروسلاوسکی کے حوالے کرنے کی چال چلی جا رہی تھی۔ لینن نے اپنے فرائض سنبھالتے ہی جب اس بارے میں سنا تو وہ ایک دم غصے میں آ گیا اور پولٹ بورو کی ایک نئی میٹنگ میں مولوٹوف کو خطاب کرتے ہوئے سٹالن کو سنایا۔ ''یارو-سلا-وسکی--آپ لوگ جانتے ہیں یاروسلاوسکی کیا ہے؟ آپ سب کیوں جگ ہنسائی کا موقع فراہم کر رہے ہیں۔ وہ یہ کام کرنے کے اہل نہیں ہے۔'' لینن کو کچھ زیادہ ہی جوش آ گیا تھا۔ ویسے یاروسلاوسکی کچھ ایسا نکما آدمی نہیں تھا۔ لیکن پارٹی کی اپنی ایک سمت ہوتی ہے اس قسم کے واقعات ہوتے رہتے تھے۔

گہرائی میں جا کر دیکھنے سے نظر آئے گا کہ سٹالن جب سے لینن کے قریب ہوا تھا، خصوصاً اکتوبر انقلاب کے بعد، وہ لینن کی پس پردہ مخالفت میں کبھی کامیاب نہ ہو سکا۔ بلکہ لینن اس سے چڑ جاتا تھا۔ سٹالن کی خواہشات تو بہت زیادہ تھیں مگر اس کا دھیان اپنی فکری اور اخلاقی کم ری کی طرف نہیں جاتا تھا۔ اس نے میرے قریب ہونے کی کوشش بھی کی اور ایک مرحلے پر مجھے اس کا احساس بھی ہوا۔ لیک جنہیں وہ اپنی خوبیاں سمجھتا تھا، انہی نے مجھے اس سے پرے کر دیا۔ یعنی اس کے مفادات کی تنگ نظری، اس کی دنیاداری، اس کے نفسیاتی میک-اپ میں خرابی، اس کا صوبائی تعصب جسے مارکسزم نے بڑی سوچ بچار اور اینچ کے بعد ایک فلسفیانہ نظریے میں ڈھالنے کی کوشش کی تھی۔ اپنی سرسری باتوں کے ذریعے جو اتفاقی دکھائی دیتی تھیں، وہ میرے اندر لینن کی مخالفت کا عنصر کا کھوج لگانا چاہتا تھا۔ اسکے لئے لینن کی حاکمیت ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ جب کبھی سٹالن اس قسم کی کوئی کوشش کرتا، میں اس سے پرے ہٹ

جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ میرے ساتھ اس کا طرز سلوک سردمہر اور نفرت بھرا ہوتا جارہا تھا۔ مگر اس میں بزدلی کا عنصر بھی شامل تھا۔ وہ بڑے عیارانہ طریقے سے اپنے گرد ایسے لوگ جمع کررہا تھا جو اسی جیسے تھے، یا کسی الجھن یا مسئلے کے بغیر آرام دہ زندگی گزارنے کے خواہش مند تھے۔ یا پھر ایسے لوگ جس کسی وجہ سے لینن یا مجھ سے ناراض تھے۔ یہ تینوں اقسام عام مل جاتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ روزمرہ کے کام میں لینن کو میری بجائے سٹالن، زینوشیف اور کامینیف پر زیادہ بھروسہ کرنا پڑتا تھا۔ بعض اپنا اور دوسرے کا وقت بچانے کے حق میں تھا۔ وہ چھوٹے موٹے اختلافات پر زیادہ قوت خرچ کرنے کے خلاف تھا۔ ایک فیصلہ ہوجانے کے بعد اسے عملی لباس پہنانے کا میرا اپنا ایک نقطہ نظر اور مخصوص طریقہ کار تھا لینن یہ جانتا تھا کہ اسے عزت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اسے لئے اسے معلوم تھا کہ میں کسی کمشن وغیرہ میں کام نہیں کرسکتا تھا۔ جب اس نے اپنی ہدایات اور مرضی کے مطابق کام کرنا ہوتا تو وہ دوسرے آدمی تلاش کرتا۔ جب میرے اور اس کے درمیان اختلافات پیدا ہوجاتے تو یہ وہی وقت ہوتا جب سٹالن اور دوسرے اس کے قریب ہونے کی کوشش میں لگ جاتے۔ مثلاً جب وہ عوامی کمسار کی سوویٹ کا چیئر مین تھا تو اس نے ریکوف اور زروپا کو اپنے نائب بننے کی پیش کش کی۔ بعد میں کامینیف بھی ان میں شامل ہوگیا۔ مجھے لینن کا یہ انتخاب اچھا لگا۔ اسے فعال اور فرماں بردار نائبوں کی ضرورت تھی۔ میں اس کام کے اہل نہیں تھا۔ میں اس کا ممنوں تھا کہ اس نے مجھے کبھی ایسی کوئی پیش کش نہیں کی تھی۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اسے مجھ پر اعتماد نہیں تھا۔ دراصل ہمارے تعلقات کچھ اس نوعیت کے تھے کہ ان میں خوشامد وغیرہ کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی تھی۔ بعد میں مجھے اس کا یقین بھی ہوگیا۔ دل کے پہلے اور دوسرے دورے کے درمیانی عرصے میں لینن کی نسبت نصف کام کرنے کے قابل رہ گیا تھا۔ اس عرصے میں ان کا دوران خون اسے تنگ کرتا رہتا تھا۔ پولٹ بورو کے ایک اجلاس میں جب وہ کسی کو ایک نوٹ دینے کیلئے اٹا -- میٹنگوں کے دوران میں وہ اکثر ایسا کیا کرتا تھا -- وہ ایک جانب کو ذرا لڑکھڑا گیا۔ اس کے چہرے کا تاثر ایک دم بدل گیا۔ دل کی طرف سے اسے اس قسم کے انتباہ ملتے رہتے تھے۔ لینن بھی اپنے متعلق کسی فریب میں مبتلا نہیں تھا۔ وہ سوچتا رہتا تھا جب اس نے وہ دستاویز تیار کی جو بعد میں اس کی ''وصیت'' کہلائی۔ اس کے پہلے اور دوسرے دل کے دورے کے درمیانی وقفے میں ہم دونوں کے درمیان آئندہ کام کو چلانے کیلئے سلسلے میں ایک طویل گفتگو ہوئی۔ اس کی گفتگو کی اہمیت کے

پیش نظر میں نے اس کا ذکر دوسروں سے بھی کر دیا۔(راوسکی، آلی،اہی،سمرنوف، ریوبرازسکی اور کچھ دوسرے لوگ) میں وہ گفتگو دہرانا نہیں چاہتا تھا ورنہ یہ میرے ذہن میں مکمل طور پر اب بھی محفوظ ہے۔

بات کچھ اس طرح شروع ہوئی تھی۔محکمہ تعلیم کے اہل کاروں کی مرکزی کمیٹی نے اپنا ایک وفد اس درخواست کے ساتھ لینن کے پاس بھیجا کہ میں محکمہ تعلیم کی نگرانی اسی طرح اپنے فرائض میں شامل کرلوں جیسے ایک سال پہلے محکمہ ریلوے کو اپنی نگرانی میں لیا تھا۔لینن اس سلسلے میں میرے رائے لینا چاہتا تھا۔میں نے اسے بتایا کہ دوسرے محکموں کی طرح اس محکمے میں بھی مشکل اس کی انتظامیہ کی طرف سے پیش آئے گی۔''تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہماری نوکر شاہی بڑی ذلیل قسم کی چیز ہے۔''لینن نے میرے ذہن کو سمجھتے ہوئے کہا۔''جب میں دوبارہ کام کے قابل ہوا تو اس کا رویہ دیکھو کر حیران رہ گیا۔ان لوگوں کی ذلالت کی وجہ سے میں نہیں چاہتا کہ تم اپنے فوجی فرائض کے علاوہ یہ کام بھی کرو۔''پھر لینن بڑے جذبے کے ساتھ اپنا منصوبہ بنانے لگا۔اب وہ کام کو تھوڑا وقت دے سکتا تھا۔اس کے تین نائب تھے۔''تم انہیں جانتے ہی ہو''وہ کہنے لگا۔''کامینف بڑا چالاک سیاست دان ہے،زروپا بیمار ہے اور ریکوف ایک اچھا ناظم ہے،مگر اسے سپریم اقتصادی کونسل میں واپس جانا ہوگا۔تم میرے نائب بن جاؤ۔صورتحال ایسی ہے کہ ہمیں بڑے انقلابی اور پختہ کار لوگوں کی ضرورت ہے۔''میں نے بھی ان لوگوں کے نام گنوا دیے جو وزارت جنگ میں میرا کام مشکل بنا رہے تھے۔

''اس وقت موقع ہے۔تم انہیں تبدیل کر دو۔''لینن نے جلدی سے جواب دیا۔یہ میرا ہی جملہ تھا جو اس نے دہرایا تھا۔میں نے جواب میں کہا کہ میں فقط سرکاری نوکر شاہی کا ذکر نہیں کر رہا تھا میرا اشارا پارٹی کی نوکر شاہی کی طرف بھی تھا۔ان دونوں نوکر شاہیوں کا آپس میں تال میل تھا۔اور ان کے بعض موثر گروہوں نے پارٹی کے سکریٹریٹ پر قبضہ کر رکھا تھا۔لینن مجھے غور سے سنتا رہا۔پھر اس نے میری تجویز کو ایک ایسے لہجے میں منظور کرلیا جس کا تعلق دل کی گہرائیوں سے ہوتا ہے وہ ایسے لہجے میں اسی وقت بات کرتا جب اسے معلوم ہوتا کہ اس کا مخاطب اسے مکمل طور پر سمجھتا تھا اور وہ گفتگو کے تکلفات میں بڑے بغیر حرب مطلب سیدھا زبان پر لے آتا تھا۔لمحہ بھر سوچنے کے بعد لینن ایک دم مطلب کی بات پر آ گیا۔''تمہارا مطلب یہ ہے کہ سرکاری نوکر شاہی ہی کو نہیں بلکہ مرکزی کمیٹی کے تنظیمی بوریو کو بھی گولی کا نشانہ بنانے کی ضرورت ہے۔''میں ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔میرے لیے یہ غیر متوقع جملہ تھا۔''میرا یہی

مطلب تھا۔'' تنظیمی بوریو کا مطلب سٹالن کے آلے کا مرکز تھا۔

''بہت خوب''، لینن کوش تھا کہ ہم نے براہ راست برائی کی جڑ کا نام لے لیا تھا۔''اگر یہ بات ہے تو ہم دونوں مل کر سرکاری نوکر شاہی کے خلاف عمومی اور تنظیمی بوربو کے خلاف خصوصی محاذ بناتے ہیں۔''

''اس نیک کام میں شرکت میرے لئے ایک بڑا اعزاز ہوگا۔'' میں نے جواب دیا۔

ہم نے کچھ عرصہ بعد دوبارہ ملنے پر اتفاق کیا۔لینن نے تجویز کیا کہ میں اس سارے مسئلے پر دوبارہ غور کروں۔اس نے نوکر شاہی سے نمٹنے کیلئے مرکزی کمیٹی کے ساتھ ایک کمشن منسلک کرنے کا منصوبہ بھی تیار کیا۔ہم دونوں اس کے رکن تھے۔کمشن کا بنیادی کام نوکر شاہی اور ستالن کے فریق کی کمر توڑ کر ایسے حالات پیدا کرنے تھے کہ میں لینن کا نائب بن جاتا۔اور جیسا کہ وہ چاہتا تھا عوامی کمساروں کی سوویٹ کا جانشیں نامزد کیے جانے کے بعد لینن کی جگہ میں اس کا صدر بن جاتا۔

لینن کی اصلی ''وصیت'' یہی تھی۔اس ''وصیت'' میں لینن نے چھ آدمیوں کا ذکر کیا تھا اور ان کے متعلق ہر لفظ بہت جانچ تول اور سوچ سمجھ کر لکھا تھا۔اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ میرا کام آسان ہو جائے۔ وہ یہ سب کچھ کسی جھگڑے اور تفرقے کے بغیر کرنا چاہتا تھا۔وہ ہر ایک سے اس کا ذکر بڑے محتاط انداز میں کر کے راستہ ہموار کرتا رہتا اور یہ بھی بتا دیتا کہ اس کے بعد اس کی جگہ لینے کا سب سے زیادہ مستحق اور حق دار کون تھا۔اس سارے معاملے میں وہ سٹالن کا ذکر بڑے مختلف لہجے میں کرتا۔اس کے بعد کی وصیت میں سٹالن کا کہیں نام ونشان بھی نہیں تھا۔

زینوشیف اور کامینیف کے متعلق لینن بڑے سرسری اور عمومی لہجے میں لکھتا ہے۔ وہ لکھتا ہے ''1917ء میں ان کی اطاعت گزاری کوئی اتفاقیہ نہیں تھی۔ یہ ان کے خون میں رچی بسی تھی۔ظاہر ہے ایسے لوگ انقلاب کی راہنمائی کیسے کر سکتے ہیں۔لیکن انہیں ان کے ماضی پر برا بھلا کہنے کی کیا ضرورت ہے۔بخارن کو مارکسسٹ نہیں بلکہ ایک سلوک ماسٹر ہے بہر حال وہ ایک ہمدرد آدمی ہے۔ پاتا کوف ایک اچھا ناظم ہے مگر برا سیاست دان ہے (ممکن ہے کہ یہ دونوں کچھ سیکھ جائیں۔ان سب میں ٹراٹسکی سب سے قابل ہے۔لیکن اس میں خرابی اس کا حد سے زیادہ خود اعتماد ہونا ہے۔سٹالن بدتمیز اور غیر وفادار ہے۔ وہ پارٹی سے طاقت حاصل کر کے اس کا ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔ پارٹی کو پھوٹ سے بچانے کیلئے سٹالن کو ہٹانا ضروری ہے۔'' اصل وصیت کا یہ مواد تھا۔اس میں تقریباً سب کچھ وہی ہے جو لینن سے میری گفتگو

کے دوران زیر بحث آیا تھا۔

لینن نے سٹالن کو اس کی اصلی حالت میں اکتوبر انقلاب کے بعد ہی دیکھا تھا۔ وہ اس کی قوت ارادی اور عملی ذہن کو پسند کرتا تھا، اگر چہ اس کے ذہن کے تین حصے مکاری سے بھرے ہوئے تھے۔ لینن قدم قدم پر اس کی جہالت اس کے سیاسی افق کی تنگی اور غیر معمولی اخلاقی کھردرے پن پر طعنہ زنی کرتا رہتا تھا۔ سٹالن لینن کی مرضی کے خلاف پارٹی کے جنرل سیکریٹری کے عہد کیلئے منتخب ہوا تھا۔ لیکن لینن نے اسے کوئی کام نہیں دیا تھا۔ دل کے پہلے دورے کے بعد جب لینن دوبارہ خراب صحت کے ساتھ اپنا کام کرنے لگا تو وہ ہر وقت قیادت کے متعلق سوچتا رہتا تھا۔ میرے ساتھ اس موضوع پر بات ہوتی رہتی۔ ''وصیت نامے'' کی آخری سطور 4 جنوری کو لکھی گئیں۔ اس کے بعد دو ماہ گزر گئے۔ حالات واضح شکل اختیار کرنے لگے۔ اب لینن سٹالن کو پارٹی کی جنرل-سیکریٹری شپ کے عہدے سے ہٹانے ہی کا نہیں بلکہ اسے پارٹی سے نکالنے کی تیاری کر رہا تھا۔ پارٹی کی بارھویں کانگریس کے موقع پر لینن بیرونی تجارت کی اجارہ دری، قومی سوال، پارٹی کے اندر اقتدار کی کشمکش، محنت کشوں، کسانوں کا معائنہ اور کنٹرول کمشن جیسے سوالوں پر تیاری کر کے سٹالن پر کاری ضرب لگانا چاہتا تھا جو اس وقت نوکر شاہی کا اوتار بن بیٹھا تھا۔

لینن پارٹی کے اندر اپنے منصوبے کے مطابق اس کی از سر نو تنظیم کر سکتا تھا؟ اس وقت وہ بلا شبہ ایسا کرنے کا اہل تھا۔ اس کی مثالیں موجود تھیں۔ ایک تو بالکل تازہ مثال تھی۔ نومبر 1922ء میں جب لینن گاؤں میں صحت یاب ہو رہا تھا اور میں ماسکو سے غیر حاضر تھا، تو مرکزی کمیٹی نے متفقہ طور پر ایک ایسی قرارداد منظور کر لی جس سے بیرونی تجارت کی اجارہ داری پر نا قابل تلافی ضرب لگی۔ لینن اور میں اپنی اپنی جگہ چوکنے ہو گئے۔ پھر ہم نے ایک دوسرے کو لکھا اور اپنے عمل میں ہم آہنگی پیدا کی۔ چند ہفتوں کے بعد مرکزی کمیٹی نے جس طرح متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا تھا اسی طرح اسے نامنظور کر دیا۔ 21، دسمبر کو لینن نے بڑے فاتحانہ انداز میں مجھے لکھا۔ ''کامریڈ ٹراٹسکی! لگتا ہے کہ ہم نے گولی چلائے بغیر فقط چال چل کر محاذ پر دوبارہ قبضہ کر لیا ہے۔'' 1923ء کے آغاز میں مرکزی کمیٹی کے خلاف ہمارے مشترکہ اقدام نے کسی شبے کے بغیر ہمیں فتح سے ہم کنار کر دیا تھا۔ مجھے اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ بارھویں کانگریس کے موقع پر لینن براہ راست ''لینن اور ٹراٹسکی بلاک'' کو سامنے لے آتا تو سٹالن کی نوکر شاہی کے خلاف کامیاب ہو

سکتا تھا۔ یہ کامیابی کس قدر دیر پا ہوتی، اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اس کا فیصلہ ملک میں بعض معروضی حالات نے کرنا تھا جن میں محنت کش طبقہ اور پارٹی بذات خود شامل تھے۔ لینن کی بیوی نے 1927ء میں کہا تھا کہ اگر لینن اب تک زندہ ہوتا تو سٹالن کے کسی قید خانے میں ہوتا۔ میرا خیال ہے اس نے صحیح کہا تھا۔ بات سٹالن کی نہیں ان طاقتوں کی تھی جنہیں سالن جانے بغیر بے خبری میں تقویت پہنچا رہا تھا۔ 23-1922ء میں بھی ممکن تھا کہ ان طاقتوں پر کھلا حملہ کر کے بڑی پوزیشنوں پر قبضہ کر لیا جاتا۔ یہ فریق، اکتوبر انقلاب کے غیر قانونی وارثوں اور بالشویکوں میں بے حیثیت لوگوں پر مشتمل تھا۔ مگر بڑی رکاوٹ لینن کی صحت تھی۔ امید تھی کہ وہ پہلے دورے کی طرح دوسرے دورے کے بعد بھی اٹھ کھڑا ہوگا اور بارھویں کانگریس میں اسی طرح حصہ لے گا جیسے اس نے گیارھویں کانگریس میں لیا تھا۔ اسے خود بھی یہی امید تھی۔ ڈاکٹر بھی اسے حوصلہ دلاتے رہتے تھے مگر ذرا بیٹھی ہوئی آواز میں۔ اس وقت تک سرکاری پارٹی اور پارٹی نوکر شاہی کے خلاف ''لینن-ٹراٹسکی بلاک'' کی خبر فقط لینن اور مجھ تک محدود تھی مگر پولٹ بورو کے ممبروں کو ہلکا سا شک ضرور تھا۔ قومی سوال اور ''وصیت'' کے متعلق لینن کے خطوط کا کسی کو کوئی پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں تھے۔ اگر میں ان کا کھوج لگانے کی کوشش کرتا تو وہ سمجھا جاتا کہ میں پارٹی اور ملک میں لینن کی جگہ لینے کا خواہش مند تھا۔ میرے لئے یہ تصور ہی لرزا دینے والا تھا۔ اس کشمکش میں اگر میں جیت بھی جاتا تو پارٹی کا اس قدر نقصان ہونا تھا کہ یہ جیت بے معنی ہو جاتی اور اس کی بڑی تکلیف دہ قیمت ادا کرنی پڑتی۔ ہمارے تمام منصوبوں اور اندازوں میں ایک ++ بے یقینی کا عنصر شامل تھا اور وہ تھا لینن کی جسمانی حالت۔ کیا وہ اب بھی اپنے خیالات بیان کرنے کے قابل تھا؟ کیا اس کے پاس وقت تھا؟ کیا پارٹی یہ سمجھ سکے گی کہ لینن اور ٹراٹسکی کی لڑائی انقلاب کے مستقبل کیلئے تھی، نہ کہ ٹراٹسکی کو لینن کی جگہ بٹھانے کی جو خود اس وقت علیل تھا۔ پارٹی میں لینن کی غیر معمولی حیثیت کے پیش نظر اس کی جسمانی حالت کا غیر یقینی پن' پوری پارٹی کا غیر یقینی پن بن گیا تھا۔ یہ غیر یقینی صورتحال طویل ہو جا رہی تھی، اور اس طوالت سے بے حیثیت لوگ فائدہ اٹھا رہے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ سٹالن پارٹی کا جنرل سیکریٹری تھا۔ لینن کی عدم موجودگی میں وہ حکومتی مشینری کا مکمل طور پر کرتا دھرتا بن گیا تھا

مارچ 1923ء کا آغاز تھا۔ لینن محکمہ انصاف کی بڑی عمارت کے ایک کمرے میں لیٹا ہوا تھا۔ اسے دل کا دوسرا دورہ کسی وقت بھی پڑ سکتا تھا کیونکہ چھوٹے چھوٹے دورے اس کی نشان دہی کر رہے

تھے۔ کمر درد کے سبب میں نے سابق عمارت کیولرسکی میں چند ہفتے بستر میں گزار دیے۔ اسی عمارت میں ہم دونوں کے اپارٹمنٹ تھے جن کے درمیان کریملن کا بڑا صحن تھا۔ ہمیں بستر سے اٹھ کر ٹیلی فون تک بھی جانے کی اجازت نہیں تھی۔ ڈاکٹروں نے لینن کو فون پر بات کرنے سے سختی سے منع کر رکھا تھا۔ اس کے دونوں سیکریٹری فوجی ہفا اور گلاسر ہمارے درمیان بطور افسر کام کر رہے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ولادیمیر ایلچ سٹالن کی طرف سے پارٹی کی آئندہ کانگریس کی تیاری پر بڑا پریشان تھا۔ جارجیا میں اس نے اپنے فریق کو مضبوط کر لیا تھا۔ ''ولادیمیر ایلچ پارٹی کی کانگریس میں سٹالن کے خلاف بم چلانے کی تیاری کر رہا تھا۔'' یہ فوجی ہفا کا جملہ تھا۔ لفظ بم'' لینن ہی کا تھا فوجی ہفا کا نہیں تھا۔ ''ولادیمیر ایلچ کہتے ہیں کہ آپ جارجیا کا کیس اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ پھر ان میں اعتماد آ جائے گا۔'' 5 مارچ کو لینن نے مجھے مندرجہ ذیل نوٹ لکھوایا:

''ڈیئر کامریڈ ٹراٹسکی! میری خواہش ہے کہ آپ پارٹی کی مرکزی کمیٹی میں جارجیا کے معاملے کا دفاع کریں۔ اس وقت یہ معاملہ سٹالن اور ڈزرزنسکی کے ہاتھوں میں ہے۔ مجھے دونوں کی غیر جانب داری پر اعتبار نہیں ہے۔ بلکہ صورتحال اس کے برعکس ہے۔ اگر آپ یہ معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیں گے تو مجھے سکون آ جائے گا۔ اگر آپ کسی وجہ سے ایسا نہیں کر سکتے تو کیس کی فائل مجھے واپس کر دیں۔ میں اسے آپ کی طرف سے انکار سمجھوں گا۔ بہترین خواہشات کے ساتھ۔ لینن۔''

میں نے پوچھا کہ معاملہ اس قدر نازک کیوں ہو گیا تھا۔ معلوم ہوا کہ سٹالن نے لینن کے اعتماد کو دھوکہ دیا تھا۔ لینن کی موجودگی میں مرکزی کمیٹی کے علم کے بغیر مرکزی کمیٹی کے نام پر ہی سٹالن نے ڈزرزنسکی اور آرزونی کیدا کی ملی بھگت سے جارجیا میں اپنے فریق کے ذریعے حکومت پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ چونکہ لینن بیماری کے سبب دوسرے کامریڈوں سے مل نہیں سکتا تھا، لہٰذا سٹالن نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے اسے غلط اطلاعات فراہم کرنی شروع کر دی تھیں۔ سٹالن نے اپنے سیکریٹری سے کہا کہ وہ جارجیا کے معاملے پر تمام مواد جمع کریں تا کہ وہ کھلم کھلا ایک بیان جاری کر سکے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ کس چیز نے لینن کو زیادہ صدمہ پہنچایا تھا--- سٹالن کی ذاتی نافرمانی یا قومی سوال پر اس کی سخت اور نوکرشاہی جیسی پالیسی نے؟ میرا خیال ہے ان دونوں نے ہی۔ سٹالن کو معلوم تھا کہ لینن اس کی مخالفت کی تیاری کر رہا تھا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ لینن کانگریس میں بولنے کے قابل نہیں ہوگا۔ لینن اسی بات پر زیادہ فکر

مند تھا۔اس کے سیکریٹری اسے کہتے رہے کہ وہ زینوشیف اور کامینیف سے بات کرے۔لیکن لینن ہاتھ کے اشارے سے انہیں پرے کر دیتا۔اسے معلوم تھا کہ اگر اس نے فرائض منصبی ادا کرنے بند کر دیے تو وہ دونوں بھی سٹالن سے مل کر میرے خلاف محاذ بنالیں گے اور یوں لینن کو دھوکہ دے جائیں گے۔''جارجیا کے سوال پر تمہیں ٹراٹسکی کے رویے کا پتا ہے؟''لینن نے ان سے پوچھا ہے۔''ابتدائی میٹنگ میں وہ آپ کے نقطہ نظر سے اتفاق کرتے تھے۔'' گلاسر نے جواب دیا۔جو میٹنگ میں بطور سیکریٹری کام کررہا تھا۔

''تمہیں یقین ہے؟''

''ٹراٹسکی قومی سوال پر آپ کا ساتھ نہ دینے پر آرڈزونی کرزا،وورشیلوف اور کالینن کو ملامت کر رہے تھے۔'' گلاسر نے کہا۔

''اس کی تصدیق کر کے آؤ۔''

اگلے دن میرے گھر پر مرکزی کمیٹی کے اجلاس میں گلاسر نے مجھے ایک نوٹ دیا جس پر میرے گذشتہ دن کی تقریر کا اقتباس درج تھا۔''میں نے درست لکھا تھا؟''اس نے پوچھا۔

''تمہیں اسے لکھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟''میں نے پوچھا۔

''ولادیمیر ایلیچ کیلئے۔''اس نے جواب دیا۔

''ہاں یہ بالکل ٹھیک ہے۔''میں نے کہا۔

اس عرصے میں سٹالن ہماری خط وکتابت کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔اس کے باوجود مجھے سارے معاملے کی خبر نہیں تھی۔

''آپ کی تقریر پڑھ کر ولادیمیر ایلیچ خود کو بہتر محسوس کرنے لگے تھے۔'' گلاسر نے بتایا۔''اب بات مختلف ہوگئی ہے۔انہوں نے مجھے ہدایت کی ہے کہ میں سارا مواد آپ کے حوالے کر دوں۔بارھویں کانگریس کیلئے اس سے ایک بڑا اچھا بم تیار ہوگا۔''لینن کی نیت مجھ پر صاف ظاہر ہوگئی۔سٹالن کی پالیسی کو سامنے رکھ کر وہ بارھویں کانگریس میں انکشاف کرنا چاہتا تھا کہ کس طرح سٹالن پرولتاریہ کی آمریت کو نوکر شاہی کی حکومت میں بدل رہا تھا۔

''کامینیف کل پارٹی کانگریس کیلئے جارجیا جا رہا ہے۔''میں نے فوجی ہفا کو بتایا۔''میں اسے لینن

کے تیار کردہ کاغذات کے متعلق بتاؤں گی تا کہ وہ جارجیا میں ان کے مطابق عمل کرے۔ میں ولادیمیرایلیچ سے بھی پوچھ لیتی ہوں۔''

پندرہ منٹ بعد وہ بھاگی بھاگی واپس آئی۔اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔

''کسی صورت میں نہیں۔میں کامینیف کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔''

آخر کیوں؟''

ولادیمیرایلیچ کہتے ہیں کہ کامینیف پر ہر چیز فوراً سٹالن کو دکھادے گا۔اور سٹالن ایک فضول سا معاہدہ کر کے ہمیں دھوکہ دے جائے گا۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ حالات اس قدر خراب ہو چکے ہیں کہ ہم صحیح ہونے کے باوجود سٹالن سے مصالحت نہیں کر سکتے۔''

''جی ہاں انہیں سٹالن پر بالکل اعتبار نہیں ہے اور وہ پارٹی میں اس کے خلاف کھل کر آنا چاہتے ہیں۔وہ بم تیار کر رہے ہیں۔''

اس گفتگو کے ایک گھنٹے بعد فوتی ہفالینن کی طرف سے ایک نوٹ میرے پاس لے کر آئی جو ایک پرانے انقلابی مدوانی اور جارجیا میں سٹالن کی پالیسی کے دوسرے مخالفوں کے نام تھا۔لینن نے انہیں لکھا تھا۔''میں آپ کا معاملہ بڑے غور سے دیکھ رہا ہوں۔سٹالن اور اس کے ٹولے کے بڑھتے ہوئے حوصلے میرے لئے باعث تکلیف ہیں۔میں تمہارے لیے نوٹس اور تقریر تیار کر رہا ہوں۔''اس نوٹ کی ایک کاپی میرے علاوہ کامینیف کے نام بھی تھی۔جو میرے لئے حیرانی کی بات تھی۔

''کیا ولادیمیرایلیچ نے اپنا ذہن بدل لیا ہے؟''میں نے پوچھا

''جی ہاں- ان کی حالت ہر گھڑی خراب ہو رہی ہے۔ڈاکٹروں کی یقین دہانی پر مت جائیں۔اب تو انہیں بولنے میں بھی دقت پیش آ رہی ہے........ جارجیا کا مسئلہ انہیں بری طرح تنگ کر رہا ہے۔انہیں ڈر ہے کہ وہ اس پر بولنے سے پہلے ہی گر پڑیں گے۔یہ میرے حوالے کرتے وقت انہوں نے کہا تھا۔''اس سے پہلے کہ بہت دیر ہو جائے میں اس مسئلے کو وقت سے قبل ہی نمٹا دینا مناسب سمجھتا ہوں۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں کامینیف سے بات کروں۔''

''جی ہاں۔''

''اس سے کہو کہ مجھے ملے۔''

کامینیف ایک گھنٹے بعد آ گیا۔ وہ بڑے سکون میں تھا۔ سٹالن' زینوشیف اور کامینیف --ان تینوں کا ٹولہ بن چکا تھا۔ ان کے نیزوں کے منہ میری طرف تھے۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ پارٹی سے حمایت حاصل کرنے کے بعد جانشین کا اعلان کر دیا جائے۔ لیکن لینن کا ارسال کردہ نوٹ اس کے منصوبے کو یوں کاٹ رہا تھا جیسے چاقو مکھن میں اتر جاتا ہے۔ کامینیف کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے' اور اس کے بلا تکلیف میرے سامنے اس کا اعتراف بھی کر لیا۔ میں نے اسے لینن کی دستاویز پڑھنے کو دی۔ کامینیف ایک تجربہ کار سیاست دان تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ لینن کے سامنے فقط جارجیا ہی کا نہیں، پارٹی میں سٹالن کے کردار کا مسئلہ بھی تھا۔ کامینیف نے مجھے کچھ اور حقائق بھی بائے۔ وہ ابھی ابھی سٹالن کے نام اپنے سٹیو گرافر کو ایک نوٹ لکھوایا ہے جس میں اس نے سٹالن سے قطع تعلقی کا اعلان کر دیا ہے۔'' اس کی فوری وجہ کوئی نیم ذاتی قسم کی بات تھی۔ سٹالن اس کوشش میں تھا کہ لینن کو ہر قسم کی اطلاع سے علیحدہ رکھا جائے اور اس سلسلے میں اس نے نادی زیدہ سے بدتمیزی بھی کی تھی۔ پھر وہ کہنے لگی۔'' آپ ولادیمیر کو جانتے ہیں۔ اگر اس نے سٹالن کو سیاسی طور پر ختم کرنے کا فیصلہ نہ کیا ہو تو اس سے کبھی تعلقات ختم نہ کرتا۔'' کامینیف کا چہرہ زرد تھا اور وہ گھبرایا ہوا بھی تھا۔ اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین سرک رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے اور کس سمت جائے۔ اسے میرے غیر دوستانہ رویے کا بھی خوف تھا۔

میں نے اسے صورتحال کے بارے میں اپنی رائے سے مطلع کیا اور کہا۔'' بعض لوگ خیال خطرے کی وجہ سے اصلی خطرے میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ لوگوں کو صاف صاف بتا دو کہ تم پارٹی میں کسی قسم کی تبدیلی کے حق میں نہیں ہو۔ میں صورتحال کو جوں کا توں رکھنا چاہتا ہوں۔ اگر لینن کانگریس سے پہلے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل ہو گیا، جس کے بدقسمتی سے بہت کم امکانات ہیں، تو پھر ہم صورت حال کو از سرنو بحث لے آئیں گے۔ میں سٹالن کو ہٹانے ارڈزونیکدہ کو پارٹی سے نکالنے اور ڈرزرزسکی کو ٹرانسپوٹ کے محکمے سے تبدیل کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔ لیکن میں اصولی طور پر لینن سے متفق ہوں۔ میں قومی سوال پر پالیسی میں انقلابی تبدیلی چاہتا ہوں' جارجیا میں سٹالن کے مخالفوں پر تشدد کے خلاف ہون، پارٹی

کے اندر بھی مخالفوں پر انتظامی تشدد اور دباؤ کے خلاف ہوں۔ صنعتی معمالات میں ایک محکم پالیسی اور مرکز میں بلند سطح پر دیانت دارانہ تعاون کا حامی ہوں۔ قومی سوال پر سٹالن کی قرارداد کاغذ کا ایک بے پرزہ ہے۔ اس میں بڑی قمویتوں کے احتجاج اور مزاحمت میں کوئی فرق روانہیں رکھا گیا۔ میں نے قرر داد میں اپنی ترمیم سٹالن کو بجھوائی تھی تا کہ اسے انقلابی تبدیلی کی ضرور ہے۔ اس کے علاوہ اسے نادی زیدہ سے فوری طور پر معافی مانگنے اور اپنے رویے میں تبدیلی پیدا کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ اسے آپے سے باہر نہیں ہو جانا چاہیے۔ سازش کے بجائے دیانت دارانہ تعاون بہت ضروری ہے۔'' پھر میں نے کامینیف سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''جب تم تفلس میں کانگریس میں شرکت کیلئے جاؤ تو وہاں قومیت کے سوال پر جارجیا میں لینن کے حمایتوں کی مدد سے سٹالن کی پالیسی کو بالکل بدل دینے کی کوشش کرنا۔''

کامینیف نے سکھ کا سانس لیا۔ اس نے میری تمام تجاویز قبول کر لیں۔ اسے بس ایک ہی ڈر تھا کہ سٹالن اس سے بدتمیزی کرے گا۔ ''وہ بڑا بدتمیز اور بے رحم ہے۔''

''میرا خیال ہے وہ ایسا نہیں کرے گا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اس کے پاس اب کوئی متبادل نہیں ہے۔'' رات گئے کامینیف نے مجھے بتایا کہ وہ سٹالن سے ملا تھا اور اس نے تمام تجاویز قبول کر لی تھیں۔ لینن کی بیوی کو سٹالن کا معافی نامہ پہلے ہی مل چکا تھا مگر وہ اسے لینن کو دکھانے سے ڈرتی تھی کیونکہ لینن کی حالت زیادہ خراب ہو رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ کامینیف کا لہجہ اس لہجے سے مختلف تھا جب وہ چند گھنٹے پہلے مجھ سے بات کر کے گیا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس کی وجہ لینن کی زیادہ نازک حالت تھی۔ تفلس جاتے ہوئے یا وہاں پہنچنے کے فوراً بعد کامینیف کو سٹالن کا تار ملا کہ لینن پر فالج کا دوبارہ حملہ ہوا تھا اور وہ بولنے یا لکھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ تفلس کانفرنس میں کامینیف نے لینن کی پالیسی کے خلاف سٹالن کی پالیسی کی حمایت جاری رکھی۔ غداری کے پائیدار مسالے نے تین کے ٹولے کو ایک حقیقت کا روپ دے دیا تھا۔

لینن فقط سٹالن پر حملہ آور نہیں ہوا تھا۔ اس کے حملے کی زد میں سٹالن کا پورا سٹاف تھا جس میں اس کے دو نائب اور ڈزونی کرزا اور زروزسکی بھی شامل تھے۔ جارجیا کے مسئلہ پر خط و کتابت میں دونوں کا ذکر تسلسل سے موجود ہے۔ ڈزرزنسکی بڑے دھما کہ خیز مزاج کا آدمی تھا۔ وہ ہر وقت اشتعال کی حالت میں رہتا۔ چھوٹے چھوٹے معاملات بحث کے دوران میں بھی وہ مشتعل ہو جاتا، اس کے نتھنے پھڑ پھڑانے

لگتے آنکھیں شعلہ فشاں ہو جاتیں اور آواز تناؤ کے سبب پھٹنے لگتی۔ اس عصابی دباؤ کے باوجود وہ آرام نہیں کرتا تھا۔ وہ ہر وقت اسی مزاج میں چلتا پھرتا اور کام کرتا رہتا۔ لینن نے ایک دفعہ اسے ایک منہ زور گھوڑے سے مثال دی تھی۔ ڈزرزنسکی کو پاگل پن کی حد تک اپنے کام سے محبت تھی۔ کسی ذاتی غرض کے بغیر وہ اس میں کھویا رہتا تھا۔

ذررزنسکی کی اپنی کوئی قطعی رائے نہیں تھی۔ اس نے خود کو کبھی سیاست دان نہیں سمجھا تھا، خاص طور پر جب تک لینن زندہ تھا۔ متعدد مواقع پر وہ مجھ سے کہتا رہتا تھا۔ ''میں کوئی ایسا بڑا انقلابی نہیں ہوں۔ مگر سیاست دان یا راہنما قسم کی چیز ہرگز نہیں ہوں۔'' یہ اس کی عاجزی نہیں بلکہ اپنے متعلق درست تجزیہ تھا۔ سیاسی معاملات میں اسے دوسروں کی راہنمائی کی ضرورت پڑتی تھی۔ وہ کئی برس روسا لکشمبرگ کے ساتھ کام کرتا اور پولش حب الوطنی کے خلاف لڑتا رہا تھا۔ اس وقت وہ بالشویکوں کے بھی خلاف تھا۔ پھر 1917ء میں وہ بالشویکوں کی طرف آ گیا۔ لینن نے بہت خوش ہو کر مجھ سے کہا تھا۔ ''اب پرانی لڑائی کے سب نشان مٹ گئے ہیں۔'' انقلاب کے ابتدائی دو تین برسوں میں ڈزرزنسکی میرے ساتھ جڑا رہا تھا۔ پھر وہ سٹالن کا حمایتی بن گیا۔ اپنے معاشی کام میں وہ اپنے جذبات کی وساطت سے کام نکال لیتا۔ وہ لوگوں کو درخواست کرتا رہتا، ان کے آگے ہاتھ جوڑ دیتا اور جذباتی تقریر کر کے انہیں پاؤں پر کھڑا کر دیتا۔ اقتصادی ترقی کے بارے میں اس کا کوئی واضح نظریہ نہیں تھا۔ وہ سٹالن کی غلطیوں میں برابر کا شریک تھا اور بڑی گرم جوشی سے ان کا دفاع کرتا تھا۔ وہ ایک مجمع میں اپنے مخالفوں کی مذمت کرتے ہوئے جوش خطابت ہی میں فوت ہو گیا تھا۔

سٹالن کا دوسرا اتحادی اورڈزونی کدزا تھا۔ کاکیشیا کے معاملے میں اس کے نوکر شاہی جیسے ذہنی تکبر کے باعث لینن اسے پارٹی سے نکال دینے کے حق میں تھا۔ یہاں میں نے لینن کی مخالفت کی۔ لینن نے اپنے سیکریٹری کے ذریعے مجھے جواب بھجوایا۔ ''کم ازکم دو سال کیلئے۔'' کیا لینن سوچ سکتا تھا کہ وہی آدمی اس کنٹرول کمشن کا سربراہ بن جائے گا جسے لینن سٹالن کی نوکر شاہی کے خلاف لڑنے کی خاطر تشکیل دینا چاہتا تھا۔ اس کمشن نے پارٹی کا ضمیر کہلوانا تھا۔

عمومی سیاسی مقاصد کے علاوہ لینن نے جو تحریک شروع کی تھی، اس کا مقصد لینن کے صحت یاب ہو جانے کی صورت میں میرا اس کے ساتھ کام کرنے ،اور بیماری کی تاب نہ لا سکنے کی حالت میں مجھے اپنا

جانشین بنانے کیلئے سازگار حالات پیدا کرنے تھے۔لیکن یہ تحریک جو اپنے انجام تک نہ پہنچ سکی،اس کا الٹا نتیجہ برآمد ہوا۔لینن نے سٹالن اور اس کے اتحادیوں کے خلاد اعلان جنگ تو کر دیا مگر اس کی خبر فقط ان لوگوں کو ہوئی جو اس جنگ میں براہ راست شریک تھے۔حد یہ ہے کہ پارٹی کو بھی پتا نہ چل سکا۔سٹالن ٹولہ زیادہ محتاط اور چوکنا ہو گیا۔وہ آپس میں زیادہ جڑ گئے۔غیر یقینی صورتحال جاری رہی۔سٹالن سرکاری مشینری کے سر پر جم کر کھڑا ہو گیا۔وہ تیز رفتاری سے جعلی تقرریاں کرنے میں لگا رہا۔جہاں یہ ٹولہ اصولی طور پر کمزور ہوتا،مجھ سے ڈرنے لگتا۔یہ مجھ سے نجات حاصل کرنے کی فکر میں تھا۔وہ حکومتی اور پارٹی مشین کے کل پرزے زیادہ زور سے کسنے لگے۔بہت بعد 1925ء میں پارٹی میں تشدد پر میری تنقید کے جواب میں بخارن نے کہا۔''ہمارے یہاں جمہوریت نہیں ہے۔ہم تم سے ڈرتے ہیں''

''بہتر ہوگا کہ ڈرنا بنا کر دو''میں نے مشورے کے طور پر کہا۔''آؤ ہم مناسب طور پر مل کر کام کریں۔''لیکن میرا مشورہ بیکار ثابت ہوا۔

1923ء کا سال بالشویک پارٹی کے خاموش مگر ہیجان بھرے زوال کا سال تھا۔لینن اپنی خوف ناک بیماری سے لڑنے میں مصروف تھا۔تین کا ٹولہ پارٹی پر قبضہ کرنے میں لگا ہوا تھا۔فضا میں بڑا تناؤ تھا۔موسم خزاں میں یہ تناؤ ایک ''بحث''میں بدل گیا۔انقلاب کا دوسرا باب شروع ہو گیا۔یعنی ٹراٹسکی ازم کے خلاف جنگ۔اصل میں یہ لینن کی نظریاتی وراثت کے خلاف جنگ تھی۔

کم رتبہ لوگوں کی سازش

1923ء کے ابتدائی ایام تھے۔اور بارھویں کانگریس کے انعقاد کا دن قریب آ رہا تھا۔کانگریس میں لینن کی شمولیت کی کوئی امید نہیں رہی تھی۔مسئلہ یہ درپیش تھا کہ تعارفی سیاسی رپورٹ کون پیش کرے گا۔پولٹ بورو کے اجلاس میں سٹالن نے کہا۔''ٹراٹسکی رپورٹ پیش کریں گے۔''کالینن اور ریکوف نے فوراً سٹالن کی تائید کر دی۔کامینیف نے بھی تائید کی مگر اپنی مرضی کے خلاف۔مجھے اس پر اعتراض تھا۔میں نے کہا۔

''ایک بیمار آدمی کی جگہ لینا مجھے کچھ اچھا محسوس نہیں ہوتا۔بہتر ہوگا کہ اس دفعہ تعارفی سیاسی رپورٹ کے بغیر ہی کام چلا لیا جائے۔ایجنڈے کے مطابق جس نے کو کہنا ہے' کہتا جائے۔اور پھر معاشی

مسائل پر ہمارے درمیان اختلافات بھی موجود ہیں۔''

''مجھے کوئی اختلاف دکھائی نہیں دیتا'' سٹالن نے کہا۔

''تمام مسائل پر پولٹ بورو نے آپ کی تجاویز منظور کر لی ہیں۔'' کالینن نے کہا۔

زینوثیف ان دنوں کاکیشیا میں چھٹیاں گزار رہا تھا۔ تعارفی رپورٹ کا مسئلہ غیر حل شدہ رہ گیا۔ بہر حال میں صنعت پر رپورٹ پیش کرنے پر متفق ہو گیا۔

سٹالن جانتا تھا کہ لینن کی طرف سے ایک طوفان اسے گھیرے میں لینے والا تھا۔ وہ میرے ساتھ تعلقات ٹھیک کرنے کی کوشش میں تھا۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا کہ لینن کے بعد مرکزی کمیٹی کے سب سے زیادہ با اثر اور مقبول رکن کو تعارفی رپورٹ پیش کرنی چاہیے۔ اس کا اشارہ میری طرف تھا۔ پارٹی کو بھی یہی امید تھی اور وہ بھی یہی چاہتی تھی۔ دوستی کی اس کوشش میں وہ اپنی دشمنی کو اور بھی بے نقاب کر رہا تھا۔ اس کے ارادے صاف ظاہر تھے۔

زینوثیف کاکیشیا سے جلدی واپس آ گیا۔ اس وقت میرے عقب میں ہر فریق کی اپنی اپنی کانفرنس مسلسل جاری تھی زینوثیف کا مطالبہ تھا کہ تعارفی رپورٹ وہ پیش کرے گا۔ کامینیف ان ''پرانے بالشویکوں'' سے جنہیں پارٹی چھوڑے دس پندرہ برس ہو چکے تھے، پوچھ رہا تھا۔ ''کیا ہم فرد واحد کو ملک اور پارٹی چلانے کا اختیار دے سکتے ہیں؟'' کچھ میرے ماضی کو کریدا اور لینن سے میرے اختلافات کا ڈھنڈورا پیٹا جانے لگا۔ زینوثیف اس کام میں ماہر ہو چکا تھا۔ اس عرصے میں لینن کا حالت زیادہ خراب ہو گئی۔ اب کسی کو کوئی خطرہ نہیں رہا تھا۔ لہٰذا ٹولے نے فیصلہ کیا کہ تعارفی رپورٹ زینوثیف ہی پڑھے گا۔ انہوں نے ہر قسم کی تیاری کر کے پولٹ بورو میں یہ اقدام اٹھایا تھا۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ ہر چیز عبوری انتظام کے پردے میں کی جا رہی تھی۔ کہیں کوئی اختلاف رائے دکھائی نہیں دے رہا تا۔ مگر ٹولے کی پالیسی میں کہیں کوئی ہم آہنگی نظر نہیں آ رہی تھی۔ صنعت پر میرے خیالات کو کسی بحث کے بغیر قبول کر لیا گیا۔ لیکن جب ٹولے کو یقین ہو گیا کہ لینن کے کام پر واپس آنے کے کوئی امکانات نہیں تھے تو وہ ایک دم پلٹا کھا گیا۔ وہ کانگریس کو اس قدر پر امن طریقے سے چلتا کیسے دیکھ سکتا تھا۔ پارٹی کے بالائی حصے میں اسے میری مخالفت خدشہ تھا۔ کانگریس کے آخری مرحلے میں کامینیف نے کسانوں سے متعلق میری قرارداد میں ایک ترمیم پیش کر دی حالانکہ قرارداد پہلے ہی منظور ہو چکی تھی۔ ویسے بھی اس ترمیم کی کوئی سیاسی نظریاتی

اہمیت نہیں تھی۔ لیکن یہ مجھ پر بہتان تراشی کیلئے اشتعال دلانے کا ایک بہانہ تھی۔ سٹالن سے کامینیف کی۔ قطع تعلقی کے تین برس بعد اس نے خود مجھے بتایا کہ کس طرح بطور تفریح بہتان تراشی کو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت یار کیا گیا تھا۔ اور اس کا کوئی خاص مقصد نہیں تھا۔

سیاست میں تجریدی اخلاقی معیار سے کام چلانا بڑی گھٹیا بات سمجھی جاتی ہے۔ سیاسی اخلاقیات بذات خود سیاست کی پیداوار ہے اور یہ سیاست میں چل بھی جاتی ہے۔ فقط وہ سیاست جس نے کوئی بڑا تاریخی کام انجام دینا ہوتا ہے اسکی اخلاقیات بہت بلند ہوتی ہے۔ اس کے برعکس نچلے درجے کی سیاست کی اخلاقایت گھٹیا درجے ہی کی رہتی ہے۔ جیسا کہ ہر کوئی جانتا ہے، وفگارو نے سیاست اور سازش میں تمیز کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ پارلیمانی نظام شروع ہونے سے پہلے کی بات ہے۔ جب بورژوا جمہوریت کے اخلاق پسندوں نے انقلابی آمریت میں بھی خراب سیاسی اخلاقیات تلاش کرنے کی کوشش کی تو ان کی اس حرکت پر افسوس کے اظہار کے سوا کیا کیا جا سکتا تھا۔ آج کے پارلیمانی نظام کے نمائندوں کا ایک سال ہی کا اخلاقی ریکارڈ دیکھ لیا جائے تو ان کا سب کچھا چھٹا سامنے آ جائے گا۔ جب حب الوطنی کے متعلق پارلیمان میں کوئی قرارداد پیش کی جانے لگے تو اس وقت کیمرہ ارکان پارلیمان کے صدر کے قریب رکھنے کے بجائے کسی خفیہ جگہ رکھ کر ان کا جوش و جذبہ دیکھنا چاہیے۔ بینک کاروں اور صنعت کاروں کے دفاتر، اداتی عملے کے نجی کمروں، وزرا کے سرکاری دفتروں کے مناظر دکھانے کے علاوہ کیمرے کی آنکھ کو سیاسی راہنماؤں کی خفیہ خط و کتابت بھی دکھائی چاہیے۔ یہ مطالبہ کرنا بالکل بجا ہوگا کہ انقلابی آمریت اور جمہوری نظام پر ایک جیسی سیاسی اخلاقایت کا نفاذ بے حد ضروری ہے۔ آمریت کے طریقہ کار اور ہتھیاروں کے تیز دھار کنارے مراہم کا بھی تقاضا کرتے رہتے ہیں۔ گندے جوتے سے ڈرنے کی کوئی بتا نہیں۔ لیکن ایک گندہ استرا بڑا خطرناک ہوتا ہے تین کا ٹولہ جو طریقہ کار استعمال کر رہا تھا وہ میری نظر میں سیاسی پھسلن کی ایک واضح علامت تھی۔

سازشیوں کو سب سے بڑی مشکل یہ پیش آ رہی تھی کہ وہ میرے خلاف کھلم کھلا عوام کے سامنے آنے کی جرات نہیں رکھتے تھے۔ محنت کش لوگ زینوثیف اور کامینیف کو جانتے تھے اور انہیں سننے کو بھی تیار تھے۔ لیکن عوام کے ذہنوں میں ان دونوں کا 1917ء کا طرز سلوک ابھی تک تازہ تھا۔ پارٹی میں دونوں کی کوئی اخلاقی جگہ نہیں تھی۔ سٹالن پرانے بالشویکوں کے تنگ حلقے سے باہر ایک گم نام ہستی تھی۔ میرے

بعض دوست مجھ سے کہا کرتے تھے۔ ''یہ لوگ کبھی تمہارے خلاف کھل کر سامنے نہیں آئیں گے۔ لوگوں کے ذہنوں میں تمہارا نام لینن کے نام کے ساتھ ناقابل علیحدگی طور پر جڑا ہوا ہے۔ ان کے آہنوں سے اکتوبر انقلاب، سرخ فوج اور خانہ جنگی کو نکالنا مشکل ہے۔'' مگر میں اس سے اتفاق نہیں کرتا تھا۔ سیاست میں، خصوصاً انقلابی سیاست میں، مقبول بام بڑا اہم بلکہ بہت بڑا کردار ادا کرتے ہیں اس کے باوجود ان کا کردار فیصلہ کن نہیں ہوتا۔ آخری تجزیے کے طور پر انسانی تقدیر کا فیصلہ عوام کے اندر گہرائی میں اترنے پر ہی ہوتا ہے۔ انقلاب کی اٹھتی ہوئی لہر کے دنوں میں بالشویکوں کے خلاف دشنام طرازی ان کے استحکام کا باعث بن گئی۔ لیکن جب انقلاب کی لہر واپس مڑی تو بالشویکوں کے خلاف رجعت پسندوں کی باتیں رجعت پسندوں کی فتح بن گئیں۔

عالمی اور ملکی سطح پر معروضی حالات میرے دشمنوں کی مدد کر رہے تھے۔ لیکن ان کا کام اس قدر آسان بھی نہیں تھا۔ لوگوں کے ذہنوں میں ان دنوں کی یاد ابھی تازہ تھی جو انہوں نے لینن اور ٹراٹسکی کے ساتھ گزارے تھے۔ ان کے ذہنوں سے ان دنوں کی یاد مٹانے کیلئے ایک بڑا زاویہ معکوس بنانے کی ضرورت تھی۔ ایک دم نہیں بلکہ مختلف مرحلوں میں۔ ایسا کرنے کیلئے انقلاب کی بڑی ہستیوں کے خلاف چند گھٹیا مثالیں تلاش کرنی ضروری تھیں۔

دل کے پہلے دورے کے بعد جب لینن نے دوبارہ کام کرنا شروع کر دیا تو 14 اکتوبر 1922 کو رادک نے ''پراودا'' میں لکھا۔ ''اگر کامریڈ لینن اپنے پختہ ارادے کے سبب انقلاب کی دلیل ہے تو کامریڈ ٹراٹسکی ہی وہ منہ زور ارادہ ہے جسے دلیل نے لگام دے رکھی ہے۔ ٹراٹسکی کی تقریر وہ گھنٹی ہے جو لوگوں کو کام کی طرف بلاتی ہے۔ اس گھنٹی کی ساری اہمیت، سارے معانی اور اس کے ساتھ ہمارے کام کے سارے معانی بھی گذشتہ چند برسوں میں صاف دکھائی دے رہے ہیں۔'' یہ درست ہے کہ رادک کا ذاتی جذبہ اور جوش و خروش ایک مشہور چیز تھی۔ وہ ایک کے بعد دوسری عمدہ بات کہنے کا اہل تھا۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ سطریں پارٹی کے مرکزی اخبار میں شائع ہوئیں جب کہ لینن ابھی زندہ تھا اور یہ کسی کے کان پر گراں نہیں گزری تھیں۔

1923ء میں تین ٹولے کی سازش سے لونا چرسکی وہ پہلا شخص تھا جس نے زینوشیف کی عزت میں اضافہ کرنے کی کوشش کی۔ اس نے یہ اہتمام کیسے کیا؟ اس نے زینوشیف کے خاکے میں لکھا ہے۔ ''لینن

ٹراٹسکی ہمارے عہدے کی سب سے زیدہ مقبول ہستیاں تھیں، بلکہ ساری دنیا کی۔ زینوثیف اس کے سامنے ذرا دبتا تھا۔لینن اور ٹراٹسکی کو ہم لوگوں میں سے سب سے زیادہ ذہین سمجھا جاتا تھا۔وہ غیر متنازع راہنما تھے۔انقلاب کے زمانے میں وہ جس طرح ابھر کر سامنے آئے،اس پر کسی کو حیرت نہیں تھی۔''

ان جملوں کا حوالہ دینے کی مجھے اس لیے ضرورت پیش آئی کہ اگر کل کو مجھے کسی عدالت میں لے جایا جائے تو انہیں وہاں پیش کرسکوں۔ایک تیسرے گواہ یاروسلاوسکی کے جملے درج کرنے کو میرا دل نہیں چاہ رہا جس کی تعریفیں مجھ پر اس کے بہتانوں سے زیادہ ہیں۔یہ شخص آج کل پارٹی کے ایک بے حد اہم عہدے پر تعینات ہے۔اسی سے پتا چلتا ہے کہ پارٹی کتنے بڑے زوال کا شکار ہوگئی ہے۔یاروسلاوسکی نے یہ عہدہ صرف مجھ پر بہتان تراشیوں کی وساطت سے حاصل کیا ہے۔پارٹی کے ایک بددیانت سرکاری مورخ کی حیثیت سے اس نے ماضی کو ٹراٹسکی کی لینن کے خلاف ایک مسلسل جدوجہد سے تعبیر کیا ہے۔میرے متعلق لکھا گیا ہے کہ میں کسانوں کی بالکل پرواہ نہیں کرتا تھا اور انہیں کم تر حیثیت کا سمجھتا تھا۔ لیکن فروری 1923ء میں جب یاروسلاوسکی کو لینن اور میرے تعلقات کے علاوہ کسانوں کے متعلق میرے نظریات اعلم بھی ہو چکا تھا تو اس ہے ایک طویل مضمون میں میری ادبی خدمات (1900-1902ء) کا اعتراف کرتے ہوئے میرے ماضی کے متعلق کچھ اس طرح لکھا ہے۔''ایک ادیب کی حیثیت سے کامریڈ ٹراٹسکی کے شاندار کام نے اس کیلئے ''پمفلٹوں کا شہزادہ'' کا عالمی نام حاصل کیا ہے۔یہ خطاب اسے برطانوی ادیب برنرڈ شا نے دیا ہے جو گذشتہ چوتھائی صدی سے اس کے کام کو دیکھ رہا ہے۔اس نے یقیناً ٹراٹسکی کے ادبی جوہر کی چمک کو پالیا ہوگا۔''اسی قسم کی کچھ اور باتیں بھی ہیں۔ مثلاً''بہت سے قارئین نے ٹراٹسکی کی جوانی کی تصویر کو متعدد بار شائع ہوتے ہوئے دیکھا ہوگا۔اس وقت بھی اس کی کشادہ پیشانی کے نیچے خیالات اور تصورات کا ایک ایسا طوفانی بہاؤ دکھائی دیتا تھا جو کامریڈ ٹراٹسکی کو تاریخ کی شاہرہ سے دھکیل کر ذرا پرے لے جاتا تھا۔یہ بہاؤ اسے یا تو کسی چوراہے پر کھڑا کردیتا یا سب کچھ توڑ کر اسے نیا راستہ بنانے پر مجبور کردیتا۔نیا راستہ بنانے کی جدوجہد میں ہم اپنے سامنے ایک ایسا آدمی دیکھتے جس نے انقلاب کیلئے اپنی زندگی وقف کردی تھی--ایک پختہ راہنما اور مقرر جس کی زبان لوہے کی طرح تیز اور لچک دار ہے جو اپنے مخالفوں کو کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔''

''اس نے سائبیریا کے باشندوں کے اندر ولولے کی ایک لہر دوڑا دی۔''یاروسلاوسکی کچھ زیادہ ہی

جذبات کی رو میں بہہ جاتا ہے۔'' یہ مضامین اخبارات میں پڑھنے کے بعد وہ لوگ بڑی بے صبری سے انہیں کتاب کی شکل میں دیکھنے کا انتظار کرنے لگے۔ بہت کم لوگ اپنے مصنف سے واقف ہوتے ہیں۔ اور جو ٹراٹسکی کو جانتے تھے، ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ انقلابی فوج اور دنیا کے عظیم ترین انقلاب کا راہنما بن کر ابھرے گا۔'' کسانوں کو نظر انداز کرنے کا مجھ پر جو الزام تھا، اس کی سیاہی یاروسلاوسکی اپنے ہاتھ سے خود ہی پونچھ دیتا ہے۔ اس کے متعلق وہ کچھ اس طرح رقم طراز ہے:

''ٹراٹسکی سائبیریا کے کسی دیہات میں وہاں کی زندگی کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیلات جانے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ سب سے پہلے وہ اس گاؤں کی انتظامی مشینری کو دیکھتا۔ اس نے سلسلہ وار مضامین میں اس مشینری کی شاندار خاصیتیں بیان کی ہیں۔'' آگے چل کر وہ مزید لکھتا ہے۔''ٹراٹسکی چاروں طرف گاؤں ہی گاؤں تھا۔ گاؤں کی ضروریات اور اس کی تاریک حالت پر اس کا دل دکھتا تھا۔ وہاں قانون کی عمل داری نہیں تھی۔'' یاروسلاوسکی کا مطالبہ ہے کہ دیہی زندگی پر میرے مضامین نصابی کتب میں شامل ہونے چاہیں ور یہ فروری 1923ء ہے جس میں مجھے کسانوں پر توجہ نہ دینے کا پہلی مرتبہ طعنہ دیا جاتا ہے۔ لیکن یاروسلاوسکی تو اس وقت خود سائبیریا میں تھا۔ شاید اسے نئے ''لینن ازم'' کے متعلق ابھی کوئی اطلاع نہ ملی ہو۔

میں جس آخری مثال کا حوالہ دینا چاہوں گا اس کا تعلق سٹالن سے ہے۔ انقلاب کی پہلی سالگرہ پر سٹالن نے ایک مضمون لکھا جس میں اشاروں کنایوں سے مجھے ہدف بنایا گیا تھا۔ اکتوبر شورش کے متعلق بات کرتے وقت یاد رکھنا چاہیے کہ لینن اس وقت فن لینڈ میں روپوش تھا۔ کامینیف، زینوئیف، ریکوف اور کالینن شورش کے خلاف تھے۔ سٹالن کو اس وقت کوئی نہیں جانتا تھا۔ لہذا پارٹی نے انقلاب کو میرے ہی نام سے منسوب کر دیا۔ مگر انقلاب کی پہلی سالگرہ کے موقع پر سٹالن نے مرکزی کمیٹی کی قیادت کو میرے خلاف بھڑکا کر یہ تاثر زائل کرنے کی کوشش کی۔ اس کے باوجود اسے اپنی بات کو قابل قبول بنانے کیلئے یہ لکھنا پڑا۔

شورش کو منظم کرنے کا سارا عملی کام پیٹروگراڈ سوویٹ کے چیئرمین ٹراٹسکی کی زیر ہدایت انجام پایا۔ بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ پارٹی کامریڈ ٹراٹسکی کی بے حد مشکور ہے کہ اس نے فوج کو سوویٹ کی طرف لانے اور فوجی انقلابی کونسل کے کام کو احسن طریقے سے منظم کرنے میں کمال مہارت سے کام لیا۔''

اگر سٹالن نے یہ الفاظ استعمال کیے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت وہ کوئی دوسرے الفاظ استعمال کر ہی نہیں سکتا تھا۔ پھر عوام کے سامنے یہ لفظ کہنے کیلئے اسے برسوں کی بے حیا بے لگامی درکار تھی۔ ''کامریڈ ٹراٹسکی نے نہ تو پارٹی اور نہ ہی اکتوبر انقلاب میں کوئی خاص کردار ادا کیا۔'' جب اسے اپنی زبان کے تضاد کے بارے میں پوچھا گیا تو وہ زیادہ بدتمیزی پر اتر آیا۔

یہ ٹولہ کسی طرح بھی خم ٹھوک کر میرے سامنے کھڑا ہونے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ یہ لینن ہی کو میری سامنے لا سکتا تھا لیکن اس کیلئے ضروری تھا کہ لینن اس ٹولے کی مخالفت سے ہاتھ کھینچ لیتا۔ دوسرے لفظوں میں اسے اپنی کامیابی کیلئے لینن کی سخت علالت یا کسی تبصرے میں اس کی لاش رکھنے کی ضرورت تھی۔ مگر یہ بھی کافی نہیں تھا۔ تحریک کے دوران میں جدوجہد کے حلقے سے میرا باہر ہو جانا بھی ضروری تھا اور یہ 1923ء کے موسم خزاں میں ہو گیا۔

میں یہاں فلسفہ تاریخ کی بات نہیں کر رہا بلکہ ان واقعات کا ذکر کر رہا ہوں جو تاریخ کے پس منظر میں میری زندگی سے بندھے ہوئے ہیں۔ لیکن میں اس بات پر غور کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ تاریخ کے قوانین حادثاتی طور پر کس طرح کسی شخص پر مہربان ثابت ہو سکتے ہیں۔ حیاتیات کی زبان میں کہا جا سکتا ہے کہ حادثات بعض اوقات کس طرح کسی تاریخی عمل کو مکمل کر کے اسے قانون کا درجہ عطا کر دیتے ہیں۔ اس طرح وہ شعوری انسانی سرگرمی جنم لے لیتی ہے جو حادثات کے عمل کا نتیجہ بن جاتی ہے۔

کہانی کے اس موڑ پر میں اپنے دوست ایوان وسیلی وچ اے زیف کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں جو دریائے دبنا کے کنارے پر واقع کولوشینو نامی گاؤں میں رہتا تھا۔ اس علاقے کو وادی زوبولوتی کہتے ہیں۔ یعنی دلدلوں سے پرے کا علاقہ یہاں شکار کی بہتات ہے۔ یہاں دریائے دبنا کا پانی وسیع علاقے میں پھیلا ہوا ہے۔ جس کے سبب تقریباً چالیس کلومیٹر کے رقبے میں دلدلیں، جھیلیں، بگلے اور ہر قسم کے دوسرے موسمی پرندے بڑی تعداد میں آتے ہیں۔ یہاں تک پہنچنے کیلئے ایک چھوٹا اور تنگ کچا راستہ ہے جو نہ جانے کتنی صدیوں سے چھوٹی چوبی گاڑیوں (ڈینگی) نے چلتے رہنے سے بنا رکھا ہے۔ شکار کی خاص جگہ پر پہنچنے کیلئے ہم دونوں کو کولوشینو سے نصف شب کو رخصت ہونا پڑتا تھا۔ ہر قدم پر کوئی چھوٹا سا جانور اپنی دھڑکتی ہوئی چھاتی اوپر اٹھا لیتا اور میں ڈر جایا کرتا۔ ایوان وسیلی وچ نے مجھے شکار کے پہلے موقع پر ہی کہا تھا کہ بے دھڑک ہو کر چلو۔ اس کا کہنا تھا کہ لوگوں کو جھیل میں ڈوبتے ہوئے دیکھا تو ہے مگر ابھی تک

کبھی کوئی دلدل میں پھنس کر سراہ نہیں تھا۔

ڈینگی اس قدر ہلکی اور جھٹکے دیتی ہے کہ اس میں پشت کے بل بے حرکت لیٹ جانا زیادہ محفوظ ہوتا ہے خاص طور پر جب ہوا چل رہی ہو۔ کشتی ران اپنی حفاظت کیلئے عموماً گھٹنوں پر کھڑے رہتے ہیں۔ ایوان وسیلی وچ لنگڑا ہونے کے سبب کھڑا رہتا ہے۔ وہ اس علاقے میں مرغابیوں کا بادشاہ ہے۔ کسی دوسرے شکار میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ مرغابی کو اس کی آواز اور پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سے ایک دم پہچان جاتا ہے۔ وہ چلتی کشتی میں پانی پر تیرتے ہوئے پروں کو دیکھ کر کہنے لگتا ہے۔

''کشتی چینو کی طرف چلتے ہیں۔ وہاں مرغابیاں شام کو آرام کر رہی ہوں گی۔''

''تم کیسے جانتے ہو؟''

''پانی پر تیرتے پروں کو دیکھو۔ یہ ابھی پوری طرح نہیں بھیگے۔ یہ بالکل تازہ پر ہیں۔ مرغابیاں شام کو اڑ رہی ہوں گی۔ گش چینو کے سوا ان کے آرام کی کوئی اور جگہ نہیں ہے۔''

جہاں دوسرے شکاری ایک یا دو مرغابیاں شکار کرتے، ایوان اور میں پانچ یا آٹھ مرغابیاں مار کر لاتے۔ یہ ہماری مہارت کی علامت تھی۔ زندگی میں ایسا ہوتا ہے۔ ایوان وسیلی وچ سرکنڈوں میں چھپ کر مرغابی کی اتنی صحیح آواز نکالتا کہ مرغابیاں خود بخود اس کی طرف کھنچی چلی آتیں۔ پھر وہ اس قدر قریب آ جاتیں کہ ان پر گولی چلاتے ہوئے شرم آنے لگتی۔ ایوان کو لمحے لمحے کی خبر ہوتی۔ ''اب تیار ہو جاؤ'' وہ میرے کان میں سرگوشی کرتا۔ ''مرغابی سیدھی تمہاری طرف آ رہی ہے۔'' پھر مجھے دور سرکنڈوں میں پر ملتے ہوئے دکھائی دیتے۔ مجھے پتا نہ چلتا کہ وہ مرغابی ہے۔ ایسے اسرار ایوان وسیلی وچ پر ہی کھلتے تھے۔ وہ بڑا ماہر شکاری ہے۔ مرغابی واقعی میری طرف آ رہی ہوتی۔ پھر وہ دوبارہ سرگوشی کر کے کہتا۔ ''اگر میں نے اس فاصلے سے بھی نشانہ خطا کر دیا تو پھر تمہارے پیدا ہونے کا کوئی فائدہ نہیں۔''

جنگ سے پہلے ایوان وسیلی وچ زے زیف ایک سوتی کپڑے کی فیکٹری میں کام کرتا تھا اب وہ سردیوں میں ماسکو جاتا ہے اور وہاں کسی بجلی گھر میں بطور فائر مین کام کرتا ہے۔ انقلاب کے بعد کے زمانے میں ملک بھر میں ہر جگہ جنگ جاری تھی۔ جنگل اور بیلے جل رہے تھے۔ کھیت خالی پڑے تھے اور مرغابیوں نے پرواز کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اس وقت زے زیف کے دل میں نئی حکومت کے متعلق بڑے شک وشبہات تھے۔ لیکن 1920ء کے بعد مرغابیاں اس کے علاقے میں دوبارہ آنا شروع ہو گئیں، اور وہ بھی

بڑی تعداد میں۔تب ایوان وسیلی وچ نے سوویٹ اقتدار کو پوری طرح تسلیم کرلیا۔

یہاں سے دوکلومیٹر دور چراغ کی بتی بنانے والی ایک سوویٹ فیکٹری تھی جو ایک سال تک چلی۔ اس کا ڈائریکٹر میری فوجی ٹرین کا سابق ڈرائیور تھا۔زے زیف کی بیوی اور بیٹی اس فیکٹری میں کام کر کے تقریباً تین روبل ماہوار کماتی تھیں۔ یہ ان کیلئے بہت بڑی کمائی تھی۔ پھر فیکٹری سارے علاقے کو بتیاں سپلائی کر کے بند ہوگئی اور مرغابیوں کا شکار کنبے کی روزی کا دوبارہ وسیلہ بن گیا

ایک دفعہ یوم مئی کے موقع پر ایوان وسیلی وچ نے خود کو ماسکو کے ایک بڑے تھیٹر کے سٹیج پر اعزازی مہمانوں کے درمیان بیٹھے ہوئے پایا۔ وہ پہلی قطار میں اپنی لنگڑی ٹانگ چھپائے بڑے رعب اور دبدبے سے بیٹھا میری رپورٹ سن رہا تھا۔ اسے مورالوف یہاں لایا تھا۔ ہم دونوں اکٹھے شکار کی خوشیاں اور غم برداشت کرتے تھے۔ ایوان وسیلی وچ میری رپورٹ پر بڑا خوش ہوا۔ اس نے اپنے گاؤں واپس جا کر ہر ایک کو رپورٹ کے بارے میں بتایا۔ اس سے ہم تینوں کی دوستی زیادہ پکی ہوگئی۔ یہاں یہ بتا تا چلوں کہ ماسکو کے گردنواح کے سارے شکاری خراب ہو چکے ہیں۔ وہ دروغ گو اور شیخی خورے بن گئے ہیں۔ ایوان وسیلی وچ ان سے بالکل مختلف ہے۔ اس میں بھی تک بڑی سادگی ہے۔ اس کی قوت مشاہدہ تیز اور اس میں ایک دبدبہ ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ دلی طور پر کاروباری نہیں بلکہ ایک فن کار شکاری ہے۔

ایک دفعہ لینن بھی اس کے ساتھ شکار کھیلنے گیا۔ ایوان وسیلی وچ نے مجھے وہ جگہ بڑے اشتیاق سے دکھائی جہاں لینن ایک چوبی شیڈ میں گھاس پر لیٹا رہا تھا۔ لینن شکار کا بڑا شوقین تھا مگر اسے اس کیلئے وقت ہی نہیں ملتا تھا۔ جب کبھی موقع مل جاتا تو وہ اس قدر جوش میں آجاتا کہ خود پر سے کنٹرول کھو بیٹھتا حالانکہ وہ خود پر قابو رکھنے میں بڑا ماہر تھا۔ جیسے ایک اچھا حکمت عمل ساز شطرنج کا ایک خراب کھلاڑی ہوتا ہے، اسی طرح ایک عمدہ سیاسی نشانہ باز شکارگاہ میں ایک اوسط درجے کا نشانہ باز ثابت ہوتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ لینن نے کس قدر تاسف کے ساتھ مجھ سے اس واقعہ کا ذکر کیا تھا۔ جب وہ فقط بیس قدموں کے فاصلے سے ایک لومڑی کو نشانہ نہیں بنا سکا تھا۔ میرا دل اس کیلئے ہمدردی سے بھر گیا۔

لینن اور میں اکٹھے کبھی شکار پر نہیں گئے تھے اگرچہ ہم متعدد دفعہ یہ منصوبہ بنا چکے تھے۔ لینن کبھی کبھی ہواخوری کیلئے ماسکو کے گردنواح میں نکل جاتا۔ مگر میں تو اپنی ٹرین اور اس کے سٹاف سے جڑ کر رہ گیا تھا۔ شکاری بندوق ہاتھ میں پکڑنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ خانہ جنگی کے ختم ہو جانے کے بعد بھی غیر

متوقع طور پر کچھ ایسا ہو جاتا کہ ہم اپنا وعدہ پورا نہ کر سکتے۔ پھر لینن کی صحت خراب ہونے لگی۔ بستر کا ہو جانے سے ذرا پہلے لینن اور میں نے صوبہ تور میں دریائے شوشا پر ایک دوسرے سے ملنے کا وعدہ کیا۔لیکن لینن کی گاڑی ایک جگہ دلدل میں دھنس گئی۔ میں دیر تک بے سود انتظار کرتا رہا۔ دل کے پہلے دورے سے صحت یاب ہونے کے بعد اسے پھر شکار کا شوق چرایا۔آخر ڈاکٹروں نے اس شرط پر اس کی بات مان لی کہ وہ خود کو زیادہ تھکائے گا نہیں۔ کسی زرعی کانفرنس میں لینن نے مورالوف سے کہا۔

''تم اور ٹراٹسکی شکار کھیلنے جاتے رہتے ہونا؟''

''کبھی کبھی۔''

''اور ٹھیک ٹھاک شکار کھیل لیتے ہو؟''

''ہاں، کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔''

''کبھی مجھے بھی ساتھ لے چلو۔ لے جاؤ گے نا؟''

''مگر آپ کو اس کی اجازت ہے؟'' مورالوف نے محتاط ہو کر پوچھا۔''

''ہاں ہاں'' کیوں نہیں۔ مجھے اجازت ہے۔ مجھے لے جاؤ گے؟''

''میں کیسے انکار کر سکتا ہوں۔''

''میں تمہیں فون کروں گا۔فون کروں نا؟''

''میں فون کا منتظر رہوں گا۔''

لیکن اسے لینن کا فون نہ آیا۔اس دوران میں لینن کو دل کے دوسرے دورے کا فون آ گیا۔اور پھر موت کا۔

اصل موضوع سے یہ انحراف یہ بتانے کیلئے تھا کہ کس طرح اکتوبر 1923ء کا ایک اتوار میں نے زابولوتے میں سرکنڈوں کے اندر ایک ڈ ینگی میں گزارا۔ وہ ہلکے کہرے میں لپٹی ہوئی رات تھی۔ میں لمبے بوٹوں کے ساتھ خیمے میں بیٹھا رہا۔صبح ہوتے ہی کہرا چھٹ گیا اور پھسلن کم ہو گئی۔ایک کھلی جگہ پر گاڑی میری منتظر تھی۔ گاڑی کو شوفر ڈیوی ڈوف جو خانہ جنگی کا سارا عرصہ میرے ساتھ رہا تھا، یہ جاننے کو بے چین تھا کہ میں نے کتنا شکار کیا تھا۔ڈ ینگی سے گاڑی تک کا فاصلہ کوئی ایک سو قدم ہوگا۔لیکن جونہی ڈ ینگی سے اتر کر میں دلدل نما زمین خر آیا تو ٹھنڈے پانی نے میرے پاؤں جکڑ لیے۔ گاڑی تک آتے

آتے میرے پاؤں برف بن چکے تھے۔ڈیوی ڈوف کے پاس بیٹھ کرمیں بوٹ اتارے اورگاڑی کے ہیٹر پر پاؤں گرم کرنے لگا۔لیکن سردی اپنا کام دکھا چکی تھی۔ مجھے بستر پر لیٹنا پڑ گیا۔انفلوئنزااور بخار نے آلیا۔ ڈاکٹروں نے مجھے بستر سے اٹھنے سے منع کر دیا۔ پھرخزاں اور جاڑہ بستر ہی میں گذرا یعنی جب 1923ء میں ''ٹراٹسکی ازم'' پر بحث ہورہی تھی تو میں بستر میں استراحت کے مزے لے رہا تھا۔انقلاب اور جنگ کو تو پیشگی دیکھا جاسکتا ہےمگرخزاں میں مرغابیوں کے شکار کےنتائج کو پہلے دیکھ لینا ناممکن تھا۔

لینن گورکی میں لیٹا ہوا تھا۔میں کریملن میں بستر پر دراز تھا۔گھٹیالوگ اپنی سازش کے حلقے کووسیع کر رہے تھے۔ پہلے وہ محتاط تھے اورتعریفوں کی شکل میں زہر کی بڑی بڑی خوراکیں پلا رہے تھے۔ زینوشیف جوان میں سب سے زیادہ بے صبرا تھا، وہ بھی اپنی بہتان تراشی میں قدرے محتاط ہوگیا تھا۔''کامریڈ ٹراٹسکی کی حیثیت اوران کی خدمات کا کس کوعلم نہیں۔''وہ 15 دسمبر 1923ءکوپیٹروگراف میں پارٹی کانگریس کے موقع پر کہہ رہا تھا۔''یہ بات شک وشبہ سے بالاتر ہے۔لیکن غلطی آخرغلطی ہوتی ہے۔جب کبھی میں غلطی کرتا ہوں تو پارٹی مجھے بخشتی نہیں۔''وہ اسی قسم کی دوسری باتیں کرتا رہا۔وہ بزدلانہ مگرقدرے تیز لہجے میں بات کرتا رہا۔جوسازشیوں کی ایک خاصیت ہوتی ہے۔ایسےلوگ زمین پر اچھی طرح قدم جمانے اورمورچے کومضبوط کرنے کے بعدزیادہ جرات دکھانے لگتے ہیں۔

نئے راہنماؤں کا آگے لانے اور پرانے لوگوں کو پیچھے ہٹانے کیلئے ایک نئے منظرنامے کا تاروپور تیار کیا گیا۔ایک اعزازی پریزیڈم تشکیل دینے کی خاطر نئے قانون وضع کیے ئے۔اکتوبر کے بعد یہ یہ روایت بن گئی تھی کہ لینن اور مجھے پارٹی اورسرکاری میٹنگوں کیلئے اعزازی پریزیڈم میں چن لیا جاتا تھا۔ لینن اورٹراٹسکی کے نام روزمرہ کی تقریروں، مضامین اورنظموں وغیرہ میں عموماًاکٹھے دکھائی دیتے تھے۔مگر اب یہ دونوں نام ایک دوسرے سے جدا کرنے ضروری ہوگئے تھے، میکانکی طور پر ہی سہی تا کہ انہیں بعد میں سیاسی طور پرایک دوسرے کے خلاف کھڑا کیا جاسکے۔اب پریزیڈم میں پولٹ بورو کے تمام ارکان شامل کر لیے گئے تھے۔ پھرانہیں کسی میٹنگ میں حروف تہجی کے لحاظ سے جگہ دی جاتی۔بعد میں نئے راہنماؤں کے آں ے سے یہ تکلیف بھی ختم کر دیا گیا۔اب زینوشیف پہلی جگہ کا مستحق قرار دے دیا گیا۔ پھر پریذیڈم ٹراٹسکی کے بغیر دکھائی دینے لگا۔ مجھے پریزیڈم میں نہ دیکھ کر حاضرین شور مچا دیتے جس پر صدرکووضاحت کرنی پڑتی کہ میرانام غلطی سے رہ گیا تھا۔اخباری خبریں اس موضوع پرخاموشی اختیار کیے

ہوئے تھیں۔ پھر بتدریج پہلی جگہ سٹالن نے لینی شروع کر دی۔ اگر سٹالن کو معلوم نہ ہوتا کہ اس نے حاضرین سے کیا کہنا تھا تو یہ کمی اخبارات اپنی طرف سے پوری کر دیتے۔ اعزازی پریزیڈیم کے نام پر لوگوں کا مستقبل بنایا اور تباہ کیا جانے لگا۔ لیکن کہا یہ جاتا تھا کہ ''لیڈر بننے'' کا جو فیشن چل پڑا تھا یہ اقدام اس کے خلاف تھا۔ جنوری 1924ء میں ماسکو کانگریس کے موقع پر پریوبرازنسکی نے ان چھوٹے اور کم رتبہ لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''ہاں ٹھیک ہے۔'' ہم ''لیڈر بننے'' کے فیشن کے خلاف ہیں۔ لیکن ہم ایک بڑے لیڈر کی جگہ چھوٹے چھوٹے قد کے لیڈروں کو سامنے لانے کے بھی خلاف ہیں۔''

''وہ بڑے سخت دن تھے۔'' میری بیوی اپنی یادداشتوں میں لکھتی ہے۔ ''لیوڈیوی ڈووچ ایک طرف اور پولٹ بیورو کے سارے ارکان دوسری طرف تھے۔ اس کی علالت کی وجہ سے پولٹ بیورو کے اجلاس ہمارے اپارٹمنٹ میں ہوتے تھے۔ میں ملحقہ بیڈروم میں بیٹھی سب کی تقریریں سنتی رہتی۔ لیو پوری دل جمعی سے بولتا اپنی ہر تقریر کے ساتھ وہ اپنی کچھ طاقت زائل کر رہا تھا۔ اتنی حدت اور گرم جوشی ہوتی تھی اس کی تقریر میں۔ لیو کی تقریر کے جواب میں مجھے بڑی ٹھنڈی اور بے مزہ تقریریں سننا پڑتیں۔ مگر میٹنگ سے پہلے ہی ہر چیز کا فیصلہ ہو چکا ہوتا تھا۔ پھر لیو کو جوش میں آنے کی کیا ضرورت تھی؟ ایسی ہر میٹنگ کے بعد ایل-ڈی کا بخار زیادہ تیز ہو جاتا۔ وہ پسینے میں شرابور ہوتا اور لباس اتار کر سیدھا اپنے بیڈروم میں چلا جاتا۔ اس کے کپڑوں کو سکھانا پڑتا، جیسے وہ بارش میں بھیگ کر آیا تھا۔ ان دنوں میٹنگیں تواتر سے ایل-ڈی کے کمرے میں منعقد ہو رہی جس سے اس کے کمرے کا قالین بالکل تباہ ہو کر رہ گیا تھا۔ اس پر اتنے داغ پڑ گئے تھے کہ رات کو مجھے وہ ایک چیتے کی طرح دکھائی دیتا۔ دن کے وقت منعقد ہونی والی میٹنگیں میرے لئے ایک ڈراونا خواب بن گئیں۔ کھلے میدان میں آنے سے پہلے اندر کی لڑائی کی نوعیت عجب قسم کی تھی۔''

بعد میں جب زینوشیف اور کامینیف کی سٹالن سے لڑائی ہوگئی تو اس لڑائی کا خفیہ راز بھی اسی سازش میں حصہ لینے والوں نے کھولا۔ یہ ایک بہت بڑی سازش تھی۔ سات ارکان نے اپنا ایک علیحدہ خفیہ پولٹ بیورو بنا لیا تھا۔ اس میں پولٹ بیورو کے تمام سرکاری ارکان شامل تھے ماسوائے میرے اس میں کوبی شیف بھی شامل تھا جب ان دنوں سپریم معاشی کونسل کا چیئرمین تھا۔ تمام فیصلے میٹنگ سے پہلے ہی کر لئے جاتے اور ان کا انکشاف نہ کرنے کی قسم کھائی جاتی۔ وہ ایک دوسرے کے خلاف نہ ہونے کا وعدہ کرتے اور اکٹھے

ہو کر مجھ پر حملہ آور ہونے کے مواقع تلاش کرتے رہتے۔ بعض دوسری مقامی تنظیمیں بھی ماسکو کے اس ٹولے سے وابستہ ہوگئی تھیں۔ انہوں نے آپس کے رابطے کیلئے خاص کوڈ رکھے ہوئے تھے۔ پارٹی کے خلاف یہ ایک بڑا منظم غیر قانونی گروہ تھا اور یہ فقط ایک آدمی کے خلاف کام کر رہا تھا۔ ذمہ دار محنت کشوں کو پارٹی اور حکومت میں بتدریج لانے ایک ہی کسوٹی تھی یعنی ٹراٹسکی کی مخالفت۔ لینن کی طویل علالت کے دوران میں یہ کام بے تکان طریقے سے پوشیدہ طور پر کیا جاتا رہا تاکہ لینن کی صحت یابی کی صورت میں پلوں کے نیچے رکھا ہوا دھماکہ خیز مواد برقرار رہ سکے۔ سازش ایک دوسرے سے اشاروں میں باتیں کرتے۔ اچھی تقریروں کے امیدواروں کو معلوم ہوتا کہ ان سے کیا امید رکھی جاتی تھی جو یہ اندازہ کر لیتے، ایک دم سیڑھی کے بالائی ڈنڈے پر پہنچ جاتے۔ اسی جنگ میں ایک خاص قسم کا سرکاری طبقہ پیدا کیا گیا جو بعد میں شرمناک طور پر ''ٹراٹسکی کے مخالفین'' کہلایا۔ لینن کی موت نے سازشیوں کو کھل کھیلنے کا موقعہ فراہم کر دیا اور وہ ننگے ہو کر سامنے آ گئے۔ ذلالت کی انتہا یہ ہوگئی تھی کہ کیسی کو کیسی فیکٹری کے ڈائریکٹر مقامی پارٹی کے سیکریٹری کی دیہی مجلس عاملہ کے چیئرمین یا ٹائپسٹ کا عہدہ بھی ٹراٹسکی ازم کی مخالفت کئے بغیر حاصل نہیں ہوتا تھا۔

پارٹی کے جو ارکان اس سازش کے خلاف آواز بلند کرتے انہیں غدار اور کئی دوسرے اس قسم کے القابات سے نوازا جاتا جن اخلاق باختہ لوگوں کو پانچ سال پہلے کان پکڑ کر نکال دیا گیا تھا انہیں اب پھر ٹراٹسکی کی مخالفت کے نام پر پارٹی میں دوبارہ لایا جا رہا تھا۔ 1923ء کے اختتام سے پہلے کمیونسٹ انٹرنیشنل کی پارٹیوں میں یہ کام جاری تھا۔ بعض لیڈروں کو نکال دیا جاتا اور ان کی جگہ دوسروں کو رکھ لیا جاتا۔ کسوٹی صرف یہ تھی کہ کوئی کتنا ٹراٹسکی کے خلاف تھا۔ اچھے آدمی نہیں بلکہ اپنی پسند کے لوگوں کو منتخب کیا جاتا۔ اس طرح قابل اور ذہین لوگوں کی جگہ اوسط ذہن کے لوگ پارٹی اور سرکاری عہدوں پر آنے لگے۔ سٹالن بھی اسی طرح ایک اوسط درجے کے آدمی سے اوپر آیا تھا۔

لینن کی وفات

مجھ سے پوچھا جاتا اور اب بھی پوچھا جاتا ہے۔ ''تم اقتدار سے کیسے محروم ہوئے؟'' بہت سی صورتوں میں یہ سوال بڑا سادہ اور معصوم لگتا ہے۔ جیسے کوئی سیال یا مادی چیز ہاتھ سے پھسل گئی ہو۔ پانی یا

کوئی کتاب ہاتھ سے نکل گئے ہوں۔ بات یہ ہے کہ طاقت ایک آنی جانی چیز ہے۔ اسے کسی مرحلے پر کھونا بھی ہوتا ہے۔ پرامن طریقے سے یا دوسری طرح۔ یعنی انقلابی حلقے میں نظریات کے انحطاط کی وجہ سے، یا پھر عوام کا انقلابی مزاج بدل جانے سے۔ یہ دونوں چیزیں بیک وقت بھی ہوسکتی ہیں۔ زیرزمین سے اوپر آنے والے پارٹی کے بڑے راہنما انقلابی شعور سے سرشار تھے۔ انقلاب کے ابتدائی ایام کے راہنماؤں کے نظریات بڑے واضح تھے۔ انہوں نے ان نظریات کو بڑی کامیابی سے عملی لباس پہنایا تھا۔ اسی چیز نے انہیں پارٹی راہنما اور پارٹی کی وساطت سے محنت کشوں اور پھر ملک کا راہنما بنایا تھا۔ اس طرح اقتدار بعض عمدہ لوگوں کے ہاتھ میں آ گیا۔ لیکن ان کے نظریات پارٹی کے دوسرے درجے کے راہنماؤں میں اپنی اہمیت کھونے لگے۔ یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے بعد میں ملکی اقتدار پر قبضہ کرلیا تھا۔

ملک کے اندر بھی بعض مرحلے ایسی شکل اختیار کررہے تھے جنہیں عمومی طور پر رجعتی مرحلوں کا نام دیا جاسکتا تھا جو بتدریج مختلف درجوں میں محنت کش طبقے تک بھی پہنچ گئے، اور پھر پارٹی کے اندر بھی سرایت کرگئے۔ حکمران ٹولے نے اپنے ذاتی مقاصد وضع کرلیے اور انقلاب کو ان کے تابع کرلیا۔ پھر اس ٹولے اور ان روشن خیال لوگوں کے درمیان ایک تفریق پیدا ہوگئی جو اپنی تاریخ بصیرت کے سبب حکمران ٹولے کی کوتاہ بینی سے پرے دیکھنے کی اہلیت رکھتے تھے۔ اس تفریق کی ابتدائی نوعیت سیاسی کے بجائے نفسیاتی تھی۔ گذار ہوا کل ابھی تک ذہنوں میں تازہ تھا۔ اکتوبر کے نعرے ابھی تک یادوں سے محو نہیں ہوئے تھے۔ پہلے عہد کے راہنماؤں کی حاکمیت ابھی تک مضبوط تھی۔ لیکن روایتی شکل کے پردے میں ایک مختلف نفسیات پل رہی تھی۔ بین الاقوامی امکانات مدہم پڑنے لگے تھے۔ لوگ روزمرہ کے امور میں کھب گئے تھے۔ نئے طریقے پرانے مقاصد کی بجا آوری کے بجائے نئے مقاصد پیدا کر کے ایک نئی نفسیات کو جنم دے رہے تھے۔ بہت سے لوگ عارضی صورت حال کو قطعی منزل سمجھنے لگے جس سے بالکل نئے حالات وضع ہونے لگے۔

آخری تجزیے میں دیکھا گیا ہے کہ انقلابی لوگ بھی گوشت پوست میں عام لوگوں جیسے ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں یقینی طور پر بعض ایسی ذاتی خوبیاں ہوتی ہیں جو تاریخی عمل کو اس قابل بناتی ہیں کہ انہیں عام لوگوں سے علیحدہ کردیں۔ یعنی ایک دوسرے سے رفاقت، نظریاتی کام، ایک مقصد کے لئے جدوجہد، اجتماعی ڈسپلن، خطرے کا مل کر مقابلہ کرنا ___ یہی عناصر جب یکجا ہو جاتے ہیں کہ ایک انقلاب کی تخلیق

کرتے ہیں ___ بالشویکوں اور منشویکوں میں یہی بنیادی فرق تھا۔ ایک تجربہ کار آنکھ ایک دم بالشویک کو منشویک سے فوراً ظاہری طور پر الگ کر دے گی۔ ممکن ہے کبھی اس میں چھوٹی غلطی ہو جائے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایک بالشویک ہر لحاظ سے ایک بالشویک ہی ہوتا ہے۔ اپنے لہو اور گوشت میں ایک فلسفیانہ نقطہ نظر جذب کرنا، اسے اپنے شعور میں اتارنا اور دنیوی حسیات سے اس کا رابطہ قائم کرنا ___ یہ صلاحیتیں ہر ایک کے نصیب میں نہیں ہوتیں۔ محنت کش طبقے میں ایسے لوگ مل جاتے ہیں جو نازک وقت میں ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ پارٹی اور حکومتی عہدوں پر ایسے انقلابی مل جائیں گے جن کا تعلق عوام سے ہے۔ مگر وہ عرصہ دراز سے عوام سے کٹے ہوئے ہیں اور اب اپنی حیثیت کی وجہ سے خود کو ایک دوسرے طبقے کے افراد سمجھتے ہیں۔ ان کا طبقاتی شعور ختم ہو چکا ہوتا ہے۔ اسی سبب وہ انقلابی عمل کو نظریات کی روشنی میں دیکھنے کے اہل نہیں رہتے۔ نفسیات کی کئی غیر محفوظ سطحیں ہوتی ہیں جو حالات میں تبدیلی کے ساتھ ہی خارجی اور بیرونی نظریات کی زد میں آ جاتی ہیں۔ زیرزمین جدوجہد، شورش اور خانہ جنگی کے ایام میں ایسے لوگ پارٹی کے سپائی تھے جو انقلابی سوچ کے مالک تھے اور پارٹی کی تال پر رقص کرتے تھے۔ لیکن جب تناؤ گھٹ جاتا تو انقلاب کے یہ عارضی خانہ بدوش دوبارہ معمول زندگی کی طرف آ جاتے۔ ان میں سرکاری آسودگی کا رجحان عود کر آتا۔

میں اکثر انفرادی طور پر کالینن، روشیلوو، سٹالن اور ریکوف کی باتیں سنتا اور سوچتا رہتا کہ ایسی باتیں ان کے ذہن میں کہاں سے آتی تھیں۔ ان سے کیا فائدہ برآمد ہو سکتا تھا؟ جب کبھی میں کسی اجلاس میں شرکت کے لئے آتا اور لوگوں کو ٹولیوں کی شکل میں باتیں کرتے دیکھتا تو مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ خاموش ہو جاتے۔ ان کی باتیں نہ تو میرے اور نہ ہی پارٹی کے اصولوں کے خلاف ہوتی تھیں۔ لیکن ان کے رویے میں ایک قسم کی اخلاقی ڈھیل، اطمینانیت اور چھوٹا پن نظر آتا تھا۔ وہ نئے رجحانات کا ایک دوسرے سے اظہار کرتے رہتے۔ ان کی باتوں میں گپ بازی کا عنصر زیادہ ہوتا۔ وہ لینن اور میری موجودگی میں نہیں بلکہ اپنی گفتگو کی ناموزونیت کا ایک دوسرے سے بھی ذکر کرتے رہتے۔ متعدد بار ایسا ہوا کہ جب لینن کی موجودگی میں سٹالن کوئی بے ہودہ قسم کی بات کرتا تو لینن کاغذات پر سے سر اٹھا کر جائزہ لینے لگتا کہ سٹالن کی بات کا کس کس نے برا منایا تھا۔ پھر ہم بھی کچھ کہے بغیر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر دیتے۔

نئے حکمرانوں میں اس قسم کی ''تفریح'' عام ہوتی جا رہی تھی۔ اگر میں اس میں حصہ نہیں لیتا تھا تو

اس کی کوئی اخلاقی وجہ نہیں تھی۔ مجھے ایسی باتیں پسند ہی نہیں تھیں۔ میں ان سے بیزار ہو جاتا تھا۔ایک دوسرے کے گھر جانا، رقص وسرود کی محفلوں میں شرکت کرنا، شراب کی محفلوں میں دادعیش دینا اور غیر حاضر لوگوں کے پرخچے اڑانا___ میرے لئے ان سے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ نیا حکمران طبقہ سمجھتا تھا کہ میں ان کی طرز زندگی کے لائق نہیں تھا۔انہوں نے مجھے اپنی طرف لانے کی کوشش بھی نہ کی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ مجھے دیکھ کر چپ ہو جاتے او بڑی ناگواری اور بے شرمی سے میری طرف دیکھنے لگتے۔میرے یہ اقتدار سے ہاتھ دھو بیٹھنے کی یقینی وجوہات ہیں۔

میں معاملے کو اس کی سماجی بنیاد سے ہٹ کر صرف اس کے نفسیاتی پہلو تک محدود رکھ رہا ہوں۔یعنی ایک انقلابی سماج کے بدن میں تغیرات کیسے وقوع پذیر ہوئے۔آخری تجزیے میں یہی وہ تبدیلیاں تھیں جو فیصلہ کن ثابت ہوئیں۔حقیقی زندگی میں انکا نفسیاتی ردعمل کارگر ثابت ہوتا ہے اور اسی سے عموماً پالا پڑتا ہے۔داخلی واقعات کے بالائی حصے میں غیر محسوس طور پر تبدیلی پیدا کر رہے تھے اور دونا قابل مصالحت رویوں کو عوام کے سامنے کھول رہے تھے۔ یہ بتانا ضروری ہے کہ نئے مزاج عرصہ دراز تک اور ابھی تک روایتی طریقوں ہی میں لپٹے ہوئے ہیں۔اس سے یہ تعین کرنا اور بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ اس عمل سے عوام کی زندگیوں میں کیا تبدیلی پیدا ہوئی۔پھر وہی انقلاب دشمن سازش جو اٹھارویں صدی کے اختتام پر انقلاب فرانس سے پہلے کے عرصے میں ظاہر ہوئی تھی، ایک ہی ضرب سے یہاں بھی سامنے آ گئی اور اس نے ایک خونی انجام کی شکل اختیار کر لی۔ ہمارے ''تھرمیڈور'' تو عرصے سے تیار بیٹھے تھے۔گلوٹینس نے وقتی طور پر ساز باز کی شکل اختیار کر لی۔ ماضی کو غلط ثابت کرنا حکومتی پارٹی کے ہاتھ میں ایک نظریاتی ہتھیار کے طور پر آ گیا۔لینن کی علالت اور اس امید نے کہ وہ صحت یاب ہو کر پارٹی قیادت سنبھال لے گا، غیر یقینی صورتحال کو طویل کر دیا جو فقط ایک وقفے کے ساتھ دو برس تک جاری رہی۔اگر انقلاب کا دھارا اوپر کی سمت جار ہا ہوتا تو اس تاخیر سے مخالفوں نے فائدہ اٹھانا تھا۔لیکن انقلاب بین الاقوامی سطح پر ایک کے بعد دوسری شکست سے دوچار ہورہا تھا،لیکن انقلاب بین الاقوامی سطح پر ایک کے بعد دوسری شکست سے دوچار ہورہا تھا،اور لینن کی علالت سے پیدا ہونے والی تاخیر قومی اصلاح پسندی کی صورت اختیار کر کے سٹالن کی نوکر شاہی کو میرے اور میرے دوستوں کے خلاف مستحکم کر رہی تھی۔

مستقل انقلاب کے نظریے کے خلاف ردعمل اسی قسم کے مادی، منافقانہ اور احمقانہ حالا نے پیدا

کیا۔ شراب کی بوتل پر گپ بازی کرتے وقت یا کسی رقص گاہ سے واپس آتے وقت ایک شرابی افسر دوسرے شرابی افسر سے کہتا۔ ''وہ تو مستقل انقلاب کے سوا کسی اور چیز کے بارے میں سوچتا ہی نہیں۔'' مجھ پر غیر مہذب، خود پرست اور بد دماغ ہونے کے الزام لگتے رہتے۔ ''سارا وقت انقلاب کے لئے ہی نہیں کچھ اپنے لیے بھی رکھنا چاہیے۔'' اس جملے کو کچھ اس طرح بدل دیا گیا۔ ''مستقل انقلاب مردہ باد۔'' مارکسزم کے نظریے کی ساخت کے خلاف بغاوت کو ''ٹراٹسکی ازم'' کے خلاف جدوجہد میں بدل دیا گیا۔ پھر اس نعرے کے تحت بالشویکوں نے مادی فوائد کی طرف توجہ دینی شروع کر دی۔ میرے اقتدار سے محروم ہونے کی یہی وجہ تھی، اور اس نقصان نے موجودہ شکل اختیار کر لی۔

میں بتا چکا ہوں کہ لینن بستر مرگ سے سٹالن اور اس کے اتحادیوں ڈزرزنسکی اور آرڈزنکی زے پر ضرب لگانے کی تیاری کر رہا تھا۔ ڈزرزنسکی کے متعلق لینن کی بڑی اچھی رائے تھی۔ اختلاف اس وقت پیدا ہوا جب ڈزرزنسکی کو یہ گمان ہو گیا کہ لینن اسے معاشی پالیسی چلانے کا اہل نہیں سمجھتا تھا۔ اسی وجہ سے وہ سٹالن سے مل گیا اور لینن اس سے انتقام لینے پر اتر آیا۔ جہاں تک آروزنکی زے کا تعلق ہے، اس نے گورنر جنرل کی حیثیت سے بڑی نااہلی کا ثبوت دیا تھا۔ لینن نے جارجیا کے بالشویکوں کو سٹالن، ڈزرزنسکی اور اردزنکی زے کے خلاف اپنی مکمل حمایت کے سلسلے میں بودو مدیوانی کو خط لکھا تھا۔ لینن کی موت کے بعد ڈزرزنسکی کو سپریم اقتصادی کونسل کا سربراہ بنا دیا گیا۔ دوسرے لفظوں میں تمام ریاستی صنعتیں اس کی تحویل میں دے دی گئیں۔ آردزنکی زے جسے لینن پارٹی سے نکالنے پر تلا ہوا تھا، مرکزی کنٹرول کمیشن کا سربراہ بن گیا۔ سٹالن جو لینن کی مرضی کے خلاف پارٹی کا جنرل سیکریٹری بن گیا تھا، جنرل سیکریٹری کے عہدے پر ہی رہا مگر اسے لامحدود سرکاری اختیارات دے دیے گئے۔ بودو مدیوانی جس کی حمایت لینن نے کی تھی وہ تو آج کل تبولسک کی جیل میں قید ہے۔ انہیں خطوط پر دوبارہ گروہ بندی پارٹی اور انٹرنیشنل کی شاخوں میں بھی کر دی گئی ہے۔ یہ چھوٹے لوگ لینن سے نظریات ہی میں الگ نہیں تھے، انہوں نے پارٹی تنظیم میں بڑی تبدیلیاں لا کر لینن کی محنت پر پانی پھیر دیا ہے۔

21 جنوری 1924 کو لینن فوت ہو گیا۔ موت نے اسے جسمانی اور روحانی اذیت سے نجات دلا دی۔ مکمل ہوش و حواس میں ہونے کے باوجود اپنی قوت گویائی کھو جانے پر یقیناً وہ خود کو بڑا بے بس محسوس کرتا ہوگا۔ وہ ڈاکٹروں کی جھوٹی تسلیوں سے تنگ آ چکا تھا۔ قوت گویائی موجودگی میں وہ ڈاکٹروں

سے پوچھتا رہتا اور اپنے غیر متوقع سوالوں سے انہیں پریشان کرتا رہتا۔ پھر وہ خود طبی کتابیں پڑھنے لگتا۔ وہ اپنے مرض کی نوعیت جاننا چاہتا تھا۔ اسے صرف ڈاکٹر فیدور الیگز ینڈ گوئٹر پر اعتماد تھا۔ وہ ایک اچھا فزیشن ہونے کے علاوہ ایک اچھا انسان بھی تھا۔ لینن اور اس کی بیوی سے اس کے ذاتی تعلقات تھے۔ جب لینن کسی دوسرے ڈاکٹر کو اپنے پاس نہ آنے دیتا تو گوئٹر ہی اس کے پاس ہوتا۔ انقلاب کے سارے عرصہ میں گوئٹر کے میرے کنبے سے بھی قریبی مراسم تھے۔ وہ ولادیمیر ایلچ کے متعلق بڑی قابل اعتماد رپورٹیں دیتا جس پر بھروسہ کرکے ہم سرکاری بلیٹن جاری کرتے رہتے۔

میں گوئٹر سے پوچھتا رہتا کہ کیا صحت یاب ہونے کی صورت میں لینن اپنے ہوش وحواس قابل اور ذہانت قائم رکھ سکے گا؟ اس کا جواب کچھ یوں ہوتا: وہ جلدی تھک جایا کرے گا، کام ٹھیک طرح سے نہیں کر سکے گا۔ چاق و چوبند رہے گا۔ دل کے پہلے اور دوسرے دورے کے درمیانی عرصے میں یہ پیشین گوئیاں درست ثابت ہوئیں۔ پولٹ بیورو کے اجلاس کے آخر پر وہ بے حد تھکا ہوا لگتا۔ اس کے چہرے کی رگیں کھنچ جاتیں۔ آنکھوں کی چمک ماند پڑ جاتی، کشادہ پیشانی سکڑ جاتی اور کندھے نیچے کی طرف جھک جاتے۔ یہ ساری کیفیت بیان کرنے کے لئے ایک لفظ مناسب ہے۔ یعنی تھکاوٹ۔ اس وقت وہ مجھے ایک ختم ہوتا ہوا آدمی نظر آتا۔ لیکن رات کو ایک اچھی نیند کے بعد اس کے سوچنے کی وقت بحال ہو جاتی۔ دونوں دوروں کے درمیانی وقفے میں لکھے ہوئے اس کے مضامین اس کے گواہ تھے۔ مواد ہی تھا۔ لیکن تحریر میں روانی کم رہی تھی۔ دوسرے دورے کے بعد بھی گوئٹر امید سے ناامید نہیں ہوا تھا۔ مگر اب اس کی رپورٹوں میں یاس در آئی تھی۔ علالت بڑھتی رہی۔ فطرت کی طاقتیں کسی رحم یا ظلم کے بغیر اپنا کام دکھا رہی تھی اور لینن کو بے حرکتی کی طرف لے جا رہی تھی۔ جہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ لیکن لینن ایک اپاہج کی زندگی بسر کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ ہم نے اس کے صحت یاب ہونے کی امیدیں ترک نہیں کی تھیں۔

اس دوران میں میری اپنی ناسازی طبع طوالت پکڑتی گئی۔ میری بیوی این۔ آئی۔ سیدوفا لکھتی ہے۔ ''ڈاکٹروں کے کہنے پر ایل، ڈی کو دیہات میں لے جایا گیا۔ وہاں ڈاکٹر گوئٹر اسے دیکھنے آتا رہا۔ اسے سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ ہم لوگوں سے اظہار ہمدردی کیسے کرے۔ ایل، ڈی کی بیماری نے اسے اچانک آ لیا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اور متفکر تھا۔ پھر اس نے کہا کہ ایل، ڈی کو سخم لے جانا ضروری ہوگا۔ آخر یہی فیصلہ ہوا۔ فاصلہ بے حد طویل تھا، برف باری نے

اسے مزید لمبا کر دیا۔ لیکن اس سفر نے اس کی صحت پر اچھا اثر ڈالا۔ جوں جوں وہ ماسکو سے دور ہوتا گیا، اس کی صحت میں سدھار آتا گیا۔ اس کے باوجود مجھے اندر سے محسوس ہوتا کہ میں ایک بے حد بیمار آدمی کے ساتھ جا رہی تھی۔ غیر یقینی کی کیفیت آپ کا امتحان لیتی رہتی ہے۔ سخم میں کس قسم کی زندگی ہوگی، وہاں دوست ہوں گے کہ دشمن؟ کچھ معلوم نہیں تھا۔''

سخم جاتے ہوئے ہم 21 جنوری کو تفلس پہنچے۔ میں بخار کی حالت میں اپنی بیوی کے ساتھ ٹرین کے ایک ڈبے میں بیٹھا تھا۔ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ میرا وفا شعار اسسٹنٹ سیئر مسکس تھا جو میرے ساتھ سخم جا رہا تھا۔ وہ اندر داخل ہوا جس انداز میں وہ ڈبے میں داخل ہوا اور کاغذ کا ایک پرزہ میرے ہاتھ میں تھمایا میں سمجھ گیا کہ کسی مصیبت کا کا نزول ہو رہا تھا۔ یہ سٹالن کی طرف سے تار تھا جس میں مجھے لینن کی موت کی اطلاع دی گئی تھی۔ میں نے وہ کاغذ اپنی بیوی کو پکڑا دیا۔ اس نے پہلے ہی اس غم ناک خبر کا اندازہ کر لیا تھا۔

تفلس کے حکام کو بھی اسی نوعیت کا ایک تار مل چکا تھا۔ لینن کی موت کی خبر پھیلتی جا رہی تھی۔ میں بذریعہ تار کریملن سے رابطہ قائم کیا۔ میرے پوچھنے پر مجھے بتایا گیا۔ کہ تجہیز و تکفین ہفتے کے دن ہوگی۔ آپ کا شامل ہونا مشکل ہوگا۔ بہتر ہوگا کہ آپ اپنا علاج جاری رکھیں۔'' میرے لئے کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ جنازہ ہفتے کے بجائے اتوار کو اٹھایا گیا۔ میں ماسکو آسانی سے بروقت پہنچ سکتا تھا۔ جنازے کی تاریخ کے متعلق بھی مجھے دھوکے میں رکھا گیا۔ سازشیوں کا خیال تھا کہ میں تجہیز و تکفین کی تاریخ پر زیادہ توجہ نہیں دوں گا۔ بعد میں وہ کوئی نہ کوئی عذر پیش کر دیں گے۔ لینن کی پہلی علالت کی خبر بھی مجھے تیسرے دن بعد دی گئی تھی۔ انہوں نے اسی قسم کا وطیرہ بنا لیا تھا۔ وہ وقت حاصل کرنا چاہتے تھے۔

تفلس کے کامریڈوں کا مطالبہ تھا کہ میں لینن کی موت پر فوراً کچھ لکھوں۔ لیکن میں بالکل تنہا رہنا چاہتا تھا۔ مجھ میں قلم اٹھانے کی ہمت نہیں تھی۔ ماسکو سے آنے والے تار کے الفاظ میرے ذہن میں گونج رہے تھے۔ لوگ ٹرین کے باہر کھڑے میرا باہر آنے کا انتظار کرتے رہے۔ وہ اپنی جگہ صحیح تھے۔ ٹرین نصف گھنٹہ لیٹ ہوگئی۔ پھر میں نے یہ الوادعی سطریں لکھیں۔ ''لینن چلا گیا۔ لینن اب نہیں رہا'' میرے ہاتھ کے لکھے ہوئے چند صفحات تار کے ذریعے اخبارات کو بھجوا دیے گئے۔

میری بیوی لکھتی ہے۔ ''ہم بری حالت میں سخم پہنچے۔ ہم یہ جگہ پہلی دفعہ دیکھ رہے تھے۔ اکاسیہ ہر

طرف کھلا ہوا تھا اور بکثرت تھا۔ یہ جنوری تھا۔ ماسکو میں سخت سردی تھی۔ سخم میں لوگوں نے بڑے تپاک سے ہمارا استقبال کیا۔ ریسٹ ہاؤس کے کھانے کے کمرے کی دیوار پر دو تصویریں آویزاں تھیں۔ ایک لینن کی اور دوسری ایل، ڈی کی۔ ہمارا دل چاہا کہ دوسری تصویر کو وہاں سے ہٹا دیں مگر وہ مناسب وقت نہیں تھا۔''

سخم میں میں سارا دن بالکونی میں سمندر کی طرف منہ کیے لیٹا رہتا۔ جنوری ہونے کے باوجود دھوپ چمکیلی اور گرم تھی۔ بالکونی اور روشن سمندر کے درمیان کھجور کے بڑے بڑے درخت تھے۔ مسلسل بخار کی حالت میں لینن کی موت کا خیال میرے ذہن پر سوار رہنے لگا۔ پھر میرے ذہن میں میری زندگی کے سارے مرحلے گردش کرنے لگے۔ لینن سے میری ملاقات، ہمارے اختلافات، ہمارے مباحثے، ہماری دوستی کی تجدید، ہمارا مل کر کام کرنا۔ ذاتی واقعات ایک واضح خواب کی صورت آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے۔ پھر ان کے نقوش زیادہ روشن ہوتے گئے۔ وہ ''چیلے زیادہ صاف صورت میں دکھائی دینے لگے۔ جو معمولی باتوں پر تو ایک دم سر تسلیم خم کر دیتے مگر اہم معاملات پر اڑ جاتے۔ سمندری ہوا کو سانسوں کے ذریعے اپنے اندر اتارتے ہوئے میں نے فیصلہ کر لیا کہ ان کم حیثیت لوگوں کا ڈٹ کر مقابلہ کروں گا۔

27، جنوری کو سمندر اور کھجور کے درختوں پر نیلے آسمان کے نیچے ایک مکمل خاموش طاری تھی۔ اچانک توپ کے گولوں نے اسے چھلنی کر دیا۔ سمندر کے ساحل پر کہیں گولے داغے جا رہے تھے۔ ماسکو میں دفن کیے جانے والے اپنے رہنما کو سخم اپنا الوداعی سلام پیش کر رہا تھا۔ مجھے اس کا اور اس کی اتنے برسوں کی جیون ساتھی کا خیال آنے لگا جو اس وقت دنیا بھر سے تہنیت کے پیغام وصول کر رہی ہوگی۔ اپنے شوہر کو دفن کرتے وقت وہ لاکھوں آدمیوں کے ہجوم میں خود کو کس قدر تنہا محسوس کرتی ہوگی۔ لوگ بھی دکھی ہوں گے مگر اس جتنا نہیں۔ میں نادی زیدہ کونستان تی نوفنا کروپسکایا کے متعلق سوچنے لگا۔ میں سخم سے اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ لیکن ایسا کرنے کی خود میں ہمت نہیں پا رہا تھا۔ جو کچھ ہو گیا تھا الفاظ اسے بیان کرنے سے قاصر تھے۔ بس رسمی بن کر رہ جانے تھے۔ چند روز بعد مجھے نادی زیدہ کا خط ملا۔ مجھے بے حد اطمینان کا احساس ہوا اس نے لکھا تھا۔

''پیارے لیوڈیوی ڈووچ:

میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ اپنی موت سے کوئی ایک ماہ پہلے ولادیمیر ایلیچ آپ کی کتاب کا وہ

حصہ پڑھ رہے تھے۔ جہاں آپ نے مارکس اور لینن کا موازنہ کیا ہے۔ وہ مجھ سے کہنے لگے کہ میں وہ حصہ انہیں بار بار پڑھ کر سناتی جاؤں۔ وہ بڑے غور سے سنتے رہے۔ پھر خود اسے پڑھنے لگے۔ ایک اور بات بھی میں آپ کو بتانا چاہوں گی۔ جب آپ سائبیریا سے لندن آئے تھے تو اس وقت سے لے کر ان کی موت تک، لینن کا رویہ آپ کی طرف بالکل تبدیل نہیں ہوا تھا۔ لیوڈیویڈووچ! میں آپ کی صحت کے لئے دعا گو ہوں اور خیالوں میں ہی آپ کو چوم رہی ہوں۔''

این___ کروپسکایا

مذکورہ کتاب میں میں نے لینن کا مارکس سے موازنہ کیا تھا۔ میں مارکس کی طرف لینن کے رویے سے باخبر تھا۔ یہ رویہ ایک شاگرد کا اپنے استاد کی طرف محبت اور تنظیم سے بھرا ہوا رویہ تھا اور اس میں ایک فاصلہ بھی برقرار تھا۔ پھر یہ رشتہ وقت گزرنے کے ساتھ نظریاتی رشتے میں بدل گیا۔ میں نے اپنی کتاب میں روایتی فاصلے کو ختم کر دیا تھا۔ مارکس اور لینن ایک دوسرے سے اس قدر قریب ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے کتنے مختلف تھے۔ میرے لئے وہ دونوں انسان کی روحانی طاقت کی دو ناقابل عبور چوٹیاں تھیں۔ مجھے خوشی اس بات کی تھی کہ لینن نے وفات پانے سے پہلے میری وہ تحریر پڑھ لی تھی، اور وہ بھی جذباتی ہو کر۔ میرے لئے لینن کو مارکس کے ساتھ کھڑا کر دینا انسانی شخصیت کی انتہائی بلندی تھی۔

میں بے حد جذباتی ہو کر کروپسکایا کا خط بار بار پڑھ رہا تھا۔ اس نے لینن سے میرے تعلقات کی دو بڑی حدیں اپنے سامنے رکھی تھیں۔ 1902 میں میرا سائبیریا سے فرار ہو کر آنا اور لندن میں لینن کو اس بستر سے صبح سویرے جگانا۔ پھر دسمبر 1923 میں میری ایک تحریر کو بار بار سننا اور خود پڑھنا۔ ان دو حدوں کے درمیان دو عشرے گزر گئے تھے۔ ان میں ہمارا مل کر کام کرنا، پر حریفانہ کشمکش اور پھر ایک بلند تاریخی سطح پر دوبارہ مل کر کام میں لگ جانا۔ ہیگل کی اصطلاح میں مثبت۔ اب کروپسکایا نے ثابت کر دیا تھا کہ میری طرف لینن کا رویہ وہی لندن میں دوستانہ اور ہمدردی بھرا رویہ رہا تھا۔ مگر اب اس رویے کی تاریخی سطح زیادہ بلند تھی۔ کروپسکایا کا یہ مختصر خط لینن کی طرف میرے رویے کے سلسلے میں متعلق تاریخ کے فیصلے میں بڑی اہمیت رکھتا تھا۔

میں اپنی بیوی کی یادداشتوں سے پھر ایک تحریر نقل کر رہا ہوں ''برف باری کے باعث تاخیر سے

پہنچنے والے اخبارات میں یادگاری تقریروں، تہنیتی پیغامات اور مضامین کا سلسلہ جاری تھا۔ ہمارے احباب کو توقع تھی کہ ایل، ڈی مختصر عرصے کے لئے ماسکو آکر پھر واپس جا سکتا تھا۔ سٹالن کا تار ایسا کرنے میں کسی رکاوٹ کا باعث نہیں تھا۔

''سخم میں میرے بیٹے کا خط آیا اسے لینن کی موت پر سخت صدمہ پہنچا تھا۔ نمونیے میں مبتلا اور 104 کا بخار ہونے کے باوجود وہ اپنے قدرے کم گرم لباس میں لینن کو آخری ہدیہ عقیدت پیش کرنے ستونوں والے ہال میں گیا۔ اسے ہماری آمد کا بڑی بےصبری سے انتظار تھا۔ اس کے خط سے اس کی تلخ مایوسی اور ایک حد تک ہماری مذمت صاف ظاہر تھی۔''

محکمہ جنگ میں بعض ردوبدل کے لئے مرکزی کمیٹی کا ایک وفد مجھ سے مشورہ کرنے آیا جو ٹومسکی، فرونزے، یتھا کوف اور گسیف پر مشتمل تھا۔ یہ بڑی بیہودہ بات تھی۔ میری عدم موجودگی میں محکمہ جنگ میں کئی قسم کی تبدیلیاں وقوع پذیر ہو چکی تھیں۔ یہ وفد بس ایک رسمی کاروائی پوری کرنے آیا تھا۔

محکمہ جنگ میں پہلی چوٹ سکلیانسکی پر پڑی۔ وہ سٹالن کے انتقام کا اس لئے نشانہ بن گیا کہ تسارتسن کی پسپائیوں سے پہلے وہ جنوبی محاذ پر نا کام ہوا تھا۔ اور لوو میں اس نے مہم بازی کا مظاہرہ کیا تھا۔ سازش نے بچھو کی طرح اپنا سر اٹھا لیا۔ سکلیانسکی کے بعد محکمہ جنگ سے مجھے اکھاڑنے کے لئے چند ماہ پہلے انچل چت نامی ایک سازشی کو محکمہ جنگ پر نافذ کیا گیا تھا۔ سکلیانسکی کو ہٹا کر اس کی جگہ فرونزے کو لگا دیا گیا جو یوکرائن میں فوجوں کی کمان کر رہا تھا۔ فرونزے ایک سنجیدہ شخص تھا۔ سائبیریا میں سخت قید کاٹنے کے سبب پارٹی کے اندر اس کی عزت سکلیانسکی کی نسبت زیادہ تھی۔ اس کے علاوہ اس نے جنگ کے دوران قیادت کی غیر متنازعہ صلاحیت کا مظاہرہ کیا تھا۔ لیکن بطور فوجی منتظم وہ سکلیانسکی سے کہیں کم تر تھا۔ وہ الٹے سیدھے اور تجریدی نوعیت کے منصوبے بناتا رہتا۔ وہ دوسرے کی شخصیت کا اندازہ کرنے میں بھی کمزور تھا۔ اس کے علاوہ وہ ماہرین، خاص طور پر دوسرے درجے کے ماہرین کے زیر اثر آ جاتا تھا۔

بہتر ہوگا کہ میں سکلیانسکی کی کہانی ختم کر دوں۔ سٹالن نے حسب عادت اپنی بدتمیزی سے کام لیتے ہوئے اسے معاشیات کا کام سونپ دیا۔ دزرزنسکی نے انچل چت سے جو جی، پی، یو میں اس کا نائب تھا، چھٹکارا حاصل کرنے پر سکھ کا سانس لیا۔ اسے سکلیانسکی کی شکل میں ایک بہترین منتظم مل گیا جسے اس نے کپڑے کے ٹرسٹ میں متعین کر دیا۔ سکلیانسکی چارو ناچار اپنے نئے کام میں جت گیا۔ چند ماہ بعد وہ

امریکہ جانے اور مطالعاتی دورہ کرنے اور مشینری وغیرہ خریدنے چلا گیا۔ جانے سے پہلے وہ مجھے ملنے اور مشورہ طلب کرنے آیا۔ اس نے خانہ جنگی کے دنوں میں میرے ساتھ مل کر کام کیا تھا۔ ہماری گفتگو زیادہ تر محکمہ جنگ اور فوجی امور تک محدود رہتی۔ کوئی اور موضوع زیر بحث لانے کا ہمارے پاس وقت ہی نہ ہوتا۔ لینن کی علالت کے بعد بے حیثیت لوگوں نے محکمہ جنگ میں سازشیں شروع کر دیں تو میں پارٹی معاملات پر کسی سے خاص طور پر فوج کے لوگوں سے بات کرنے سے گریز کرنے لگا۔ صورت حال بڑی غیر یقینی بن گئی، اختلافات سامنے آنے شروع ہو گئے۔ اور فوج میں کئی تفرقوں کے سبب خطرے جنم لینے لگے۔ بعد میں میں خود بیمار پڑ گیا۔ 1925 کے موسم سرما میں جب محکمہ جنگ سے میرا کوئی تعلق نہیں رہا تھا تو سکلیانسکی سے میری ایک ملاقات ہوئی۔ ہم نے تقریباً ہر موضوع پر گفتگو کی۔

''مجھے ذرا بتائیں کہ سٹالن کیا چیز ہے۔'' سکلیانسکی نے پوچھا۔

سکلیانسکی بذات خود سٹالن کو بخوبی جانتا تھا۔ وہ سٹالن کے متعلق میری رائے لینا اور اس کی کامیابی کا راز جاننا چاہتا تھا۔ میں لمحہ بھر کے لئے سوچ میں پڑ گیا۔

''سٹالن پارٹی کے اندر معمولی ورکر کی بہترین مثال ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

سٹالن کی یہ تعریف پہلی بار اپنے پورے نفسیاتی اور سماجی حوالے سے میرے ذہن میں آئی تھی۔ میرے جواب نے سکلیانسکی کے چہرے پر ایسے تاثرات پیدا کر دیئے جیسے اسے کسی بڑی بات کا پتہ چل گیا تھا۔

''یہ کس قدر حیرت کی بات ہے کہ ایک گھٹیا اور نیچ پن پارٹی کے اندر کس قدر تیزی سے اپنے جگہ بنا رہا ہے۔'' اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''اور سٹالن اس کا سربراہ ہے۔ لیکن یہ سب کچھ ہوا کیسے؟''

''یہ انقلاب کے پہلے چند برسوں کے سماجی اور نفسیاتی دباؤ کا ردعمل ہے۔ ایک کامیاب ردانقلاب اپنے بڑے آدمی خود پیدا کرتا ہے۔ لیکن ایسے تخلیق کردہ لوگ اپنی ناک سے آگے نہیں دیکھ سکتے۔ ان کا سیاسی اندھا پن کولہو کے اس بیل جیسا ہوتا ہے جس کی آنکھیں ڈھانپ دی جاتی ہیں اور وہ سمجھتا ہے کہ اس نے لمبا فاصلہ کر لیا ہے۔ ایک کھلی آنکھ والا بیل ایسا کام نہیں کر سکتا۔''

اس گفتگو کے دوران میں پہلی دفعہ انقلاب دشمنوں کا مسئلہ اپنی پوری وضاحت کے ساتھ میرے

سامنے آیا۔ بلکہ یہ مسئلہ ایک طبعی یقین میں بدل گیا۔ میں نے سکلیانسکی سے وعدہ کیا کہ اس کی امریکہ سے واپسی پر ہم اس موضوع پر مزید بات کریں گے۔ چند ہفتوں بعد مجھے اطلاع ملی کہ سکلیانسکی کو امریکہ کی کسی جھیل میں کشتی رانی کے دوران میں ڈبو دیا گیا تھا۔ زندگی اپنی بے رحم ایجادات میں لامحدود ہے۔

سکلیانسکی کی نعش ماسکو لائی گئی۔ ہر ایک کا خیال تھا کہ اسے ریڈ سکوائر میں دفنایا جائے گا جو انقلاب کا مندر بن چکا تھا۔ لیکن مرکزی کمیٹی کے سیکریٹریٹ نے سکلیانسکی کو ماسکو سے باہر دفن کرنے کا فیصلہ کیا۔ سکلیانسکی کی مجھ سے آخری ملاقات پر نظر رکھی گئی تھی جو اسے بڑی مہنگی پڑی۔ یہ نفرت اس کی تجہیز وتکفین میں بھی روا رکھی گئی۔ سکلیانسکی کو چھوٹا ظاہر کرنا اس قیادت کے خلاف جنگ کا ایک حصہ تھا جس نے خانہ جنگی میں کامیابی حاصل کی تھی۔ میرا خیال نہیں کہ زندہ سکلیانسکی اس بارے میں کبھی سوچتا کہ اس نے کہاں دفن ہونے کیلئے جگہ منتخب کرنی تھی۔ لیکن مرکزی کمیٹی کا فیصلہ ایک ذاتی اور سیاسی کمینگی تھا۔ اپنی نفرت کو ایک طرف رکھتے ہوئے میں مولوٹوف کو فون کیا۔ مگر فیصلہ بدلا نہ گیا۔ تاریخ نے اس سلسلے میں ابھی اپنا فیصلہ محفوظ رکھا ہوا ہے۔

1924 کے موسم خزاں میں میرا بخار پھر تیز ہو گیا۔ اس وقت تک اور گرم بحث چھڑ چکی تھی جسے ایک منصوبے کے تحت بالائی سطح سے نافذ کیا گیا تھا۔ نام نہاد ''بحث'' کے لئے لینن گراڈ، ماسکو اور صوبوں میں سینکڑوں کی تعداد میں خفیہ قسم کی کانفرنسوں کا بندوبست کیا گیا۔ اس بحث کا نشانہ کوئی اور نہیں بلکہ صرف میری ذات تھی۔ جب خفیہ تیاریاں مکمل ہو گئیں تو ''پراودا'' کے ایک اشارے پر بیک وقت تمام پلیٹ فارموں سے ٹراٹسکی ازم کے خلاف پٹاخے پھوٹنے لگے۔ اخبارات مضامین سے بھر گئے۔ یہ اپنی قسم کا ایک دلکش منظر تھا۔ بہتان تراشی تھی کہ کوئی آتش فشاں پھوٹ پڑا تھا۔ پارٹی کے ارکان کی اکثریت حیرت زدہ رہ گئی۔ میں بخار کی حالت میں بستر میں تھا اور خاموش تھا۔ اخبارات اور مقرر ٹراٹسکی ازم کو بے نقاب کر رہے تھے حالانکہ انہیں خود معلوم نہیں تھا کہ ٹراٹسکی ازم کیا چیز تھی۔ ماضی کی مثالیں تلاش کر کے ان پر دھواں دھار تقریریں کی جاتیں، حقائق کو جھٹلایا جاتا اور بات کا بتنگڑ بنانیکی کوشش کی جاتی۔ یا یوں ظاہر کیا جا رہا تھا جیسے یہ کل کی باتیں تھیں۔ کیا ہو رہا تھا، کسی کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اگر یہ سب سچ تھا تو یقیناً لینن کے علم میں ہوتا۔ بڑی بات یہ تھی کہ اکتوبر انقلاب کیسے آ گیا تھا؟ انقلاب کے بعد کیا خانہ جنگی نہیں ہوئی تھی؟ کیا ٹراٹسکی نے لینن کے ساتھ مل کر کمیونسٹ انٹرنیشنل کو نہیں بنایا تھا؟ کیا ہر جگہ لینن کے ساتھ ٹراٹسکی کی

تصویر دکھائی نہیں دیتی تھی؟ لیکن بہتانوں اور الزام تراشیوں کا دھارا بہتا رہا اور لوگوں کے شعور میں دھنستا رہا۔

لینن کو ایک انقلابی رہنما کی جگہ ایک دیوتا بنا دیا گیا۔ میرے احتجاج کے باوجود ریڈ سکوائر میں ایک مقبرہ تیار کر دیا گیا۔ یہ انقلابی شعور کی توہین تھی۔ لینن کے بارے میں لکھی جانے والی کتابیں ایک اسی قسم کے دوسرے مقبرے میں رکھی جانے لگیں۔ اس کے نظریات سے اقتباسات لے کر ان کا مقدس آیات کی طرح ورد کیا جانے لگا۔ اس کی لاش کو ممی کی شکل دے کر ایک زندہ لینن بنا کر ٹرٹسکی کے خلاف استعمال کیا جانے لگا۔ حیران تھے، ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا تھا۔ پھر دروغ پر مبنی اس ساری تحریک کو سیاسی بنا دیا گیا۔ اس نے عوام کو مایوس غم زدہ اور بے حوصلہ کر دیا۔ پارٹی دم سادھ کر بیٹھ گئی۔ ایک ایسی حکومت قائم ہو گئی جس نے پارٹی پر نوکر شاہی مسلط کر دی۔ دوسرے لفظوں میں پارٹی ختم ہو کر رہ گئی۔

صبح کو اخبارات مجھے بستر ہی میں دیے جاتے۔ میں ان کے مضامین پر سرسری نظر ڈالتا۔ میں ان کے لکھنے والوں کو خوب جانتا تھا۔ ان کے خیالات سے واقف تھا اور سمجھتا تھا کہ وہ اندر سے کیا کہنا چاہتے تھے اور ان سے حکماً کیا کہلوایا جا رہا ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جو پہلے ہی انقلاب سے نڈھال ہو چکے تھے۔ ان میں بعض تنگ نظر جنوبی تھے جنہوں نے خود کو فریب میں مبتلا کر رکھا تھا۔ بعض نوجوان مستقبل بنانے کی فکر میں تھے اور اپنی قدر و منزلت بڑھانے کی جلدی میں تھے۔ ہر کوئی ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی فکر میں ایک دوسرے کو کاٹ رہا تھا۔ اخبارات میں بہتان تراشیوں کی بہتات جاری رہی۔ یہ چیختے چنگھاڑتے رہے اور اپنے تضادات میں غرق رہے۔ بہتان تراشی کی کامیابی اس کا اپنا شور غوغا تھا۔

این، آئی، سیڈوفا لکھتی ہے۔ ''ایل، ڈی پر بیماری کا دوسرا حملہ اور اس کے خلاف ایذا رسانی کی تحریک ایک ساتھ شروع ہوئے ایذا رسانی کی تحریک تو ایسی تھی جیسے اس پر کسی اور بیماری نے حملہ کر دیا تھا۔ ''پراودا'' کے صفحات تو دروغ گوئی کی ایک ختم نہ ہونے والی سطر تھے۔ ایل' ڈی چپ رہتا۔ لیکن اس چپ کی اسے کتنی بڑی قیمت ادا کرنی پڑی۔ اس کے احباب اسے دن اور اکثر رات کو بھی ملنے آتے رہتے۔ ان میں سے کوئی اس سے پوچھتا کہ کیا اس نے اس دن کا اخبار پڑھا تھا؟ وہ جواب دیتا کہ اس نے اخبار پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ اور یہ سچ بھی تھا۔ وہ اخبارات لیتا، بالائی منزل پر آتا اور ان پر ایک نظر ڈال کر رکھ دیتا۔ اسے ایک ہی نظر میں پتا چل جاتا کہ ان میں کیا تھا۔ ہر روز خانساموں نے ایک ہی قسم کا کھانا بنایا ہوتا تھا۔

ایسا کھانا کب تک حلق سے نیچے اتارا جا سکتا تھا۔ اگر ایل، ڈی نے جواب دینا ہوتا تو انہیں پڑھنے کی زحمت گوارا کی جاسکتی تھی۔ مگر وہ چپ رہا۔ اعصابی دباؤ کے سبب اس کا نمونیا جاری رہا۔ وہ پیلا اور کمزور ہوگیا تھا۔ ہم گھر میں اس کی ایذا رسانی کی بات نہیں کرتے تھے۔ مگر اس کے سوا اور کوئی موضوع بھی نہیں تھا۔ جب میں وزارت تعلیم میں کام کرنے جاتی تو میں ہی جانتی تھی کہ میرا کیا حال ہوتا تھا۔ یہ دودھاری تلوار پر چلنے کے مترادف ہوتا۔ لیکن کبھی کسی نے کوئی ناخوشگوار بات نہیں کی تھی۔ حکمران ٹولے کی خاموشی کے پہلو بہ پہلو میرے بہت سے رفیق کار مجھ سے ہمدردی کا اظہار کرتے۔ پارٹی کی زندگی دو حصوں میں بٹ گئی تھی۔ ایک پوشیدہ زندگی اور ایک دکھاوے کی زندگی۔ ان دونوں زندگیوں میں بہت بڑا تضاد تھا۔ بہت کم بہادر لوگ اپنے دل اور ذہن کی بات زبان پر لانے کی جرات کرتے تھے۔''

اس زمانے میں لینن کے خلاف چدزے کو لکھا ہوا میرا ایک خط شائع کیا گیا۔ یہ واقعہ جس کا تعلق اپریل 1913 سے ہے، اس طرح وقوع پذیر ہوا کہ سرکاری بالشویک اخبار جو اس وقت سینٹ پیٹرز برگ سے شائع ہوتا تھا، اس نے میری کتاب ''پراودا___ ایک مزدور اخبار'' کا نام چرا لیا۔ اس سے ایک تلخی پیدا ہوگئی جو جلاوطنوں کی زندگیوں میں ایک عام بات تھی۔ چدزے جو اس وقت بالشویکوں اور منشویکوں کے مابین ثالث بنا ہوا تھا، میں نے اسے ایک خط لکھا جس میں بالشویکوں میں میں نے بالشویکوں کے مرکز اور لینن کے خلاف غصے کا اظہار کیا تھا۔ ممکن تھا میں دو یا تین ہفتوں بعد اپنے کہے پر نظر ثانی کر لیتا جو بعد میں میرے لیے حیرت کا سبب بن جاتی۔ لیکن اس خط کی اپنی ہی ایک قسمت تھی۔ یہ خط راستے میں پولیس کے ہتھے چڑھ گیا۔ اکتوبر انقلاب تک یہ پولیس کے ریکارڈ روم میں رہا۔ پھر اسے کمیونسٹ پارٹی کے شعبہ تاریخ میں رکھ دیا گیا۔ لینن کو اس خط کی خبر تھی۔ ہم دونوں کے لئے یہ ایک بھولی بسری بات بن چکی تھی۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ بیرونی جلاوطنی کے زمانے میں بہت سے خطوط لکھے گئے تھے۔ 1924 میں یہ بے رتبہ اور چھوٹے لوگ میرے اس خط کو نکال کر پارٹی کے سامنے لے آئے۔ پارٹی میں اس وقت تین چوتھائی نئے لوگ آ چکے تھے۔ خط باہر لانے کا وقت لینن کی موت کے فوراً بعد کا منتخب کیا گیا۔ یہ دہرا وار تھا۔ ایک تو لینن ان لوگوں کا منہ توڑنے کو موجود نہیں تھا۔ دوسری طرف عوام غم کی حالت میں تھے۔ ماضی کو دھیان میں لائے بغیر جب لوگوں نے لینن کے خلاف ٹراٹسکی کے جملے پڑھے تو وہ سکتے میں آ گئے۔ یہ جملے بارہ برس پہلے لکھے گئے تھے۔ لیکن وقت کی کون پرواہ کرتا ہے۔ جملوں کو سیاق و سباق سے الگ کر کے پیش کیا گیا۔

چدزے کے نام میرے خط کو جس طرح استعمال کیا گیا وہ عالمی تاریخ کے سب سے بڑے فراڈوں میں شمار ہوتا ہے۔ سٹالن اور اس کے چیلوں نے جو سیاسی جعل سازی کی، اس کے سامنے ڈرے فس کیس میں فرانسیسی رجعت پسندوں کی جعلی دستاویزت مات کھا جاتی ہیں۔

بہتان تاریخی مانگ کے تحت طاقت بن جاتا ہے۔ عوام کے سماجی تعلقات یا ان کے سیاسی مزاجوں میں کوئی فرق آ جائے تو اس صورت میں بہتانوں کی مارکیٹ پھولنے پھلنے لگتی ہے۔ لیکن مجھے پر لگائے گئے بہتان کا تجزیہ ضروری تھا۔ صاحب فراش ہونے کے سبب میرے پاس اس کے لئے خاصا وقت تھا۔ ٹراٹسکی نے کس طرح کسانوں کا جوش وخروش تباہ کر دیا؟ یہ ایک ایسا الزام ہے جو رجعت پسند زراعت کار، کرسچن سوشلسٹ اور فاشسٹ۔ سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں پر خاص طور پر لگاتے ہیں۔ یہ کیسے ہوا کہ مارکس کے مستقل انقلاب کے نظریے کو توڑ مروڑ کر ایک اپنا ہی سوشلزم تعمیر کرنے کی شیخی ماری گئی؟ وہ کون لوگ ہیں جو اس قسم کی رجعت پسندانہ بے ہودگی کا مطالبہ کرتے ہیں؟ اور آخر میں نظریاتی سطح کیسے اس قدر گر گئی؟ اتنی بڑی سیاسی حماقت کہاں سے آ گئی؟ میں بستر میں لیٹا اپنے پرانے مضامیں دیکھ رہا تھا۔ میری نظر 1909 میں تحریر کردہ ان سطور پر پڑ گئی۔ وہ سٹولیپن کی رجعتی حکومت کا عروج کا زمانہ تھا۔

''جب تاریخی ترقی کا خط اوپر کی طرف جا رہا ہوتا ہے تو عوام کی سوچ زیادہ گہری، جرات پسندانہ اور دیانت دار ہو جاتی ہے۔ وہ حقائق کو ایک دم اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اور انہیں عمومیت دھاگے میں باندھ دیتی ہے۔ لیکن سیاسی زاویہ معکوس بنتا ہے تو پھر عوام کی سوچ حماقت کا شکار ہو جاتی ہے۔ سیاسی عمومیت اپنا نشان چھوڑے بغیر ہوا میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ اور بے ہودگی دانت نکال کر ہنسنے لگتی ہے۔ پھر یہ میدان کو کھلا پا کر من مانی کرنے لگتی ہے۔ اس کا بہترین ہتھیار بہتان تراشی ہوتا ہے۔''

میں خود سے کہتا رہتا ہوں کہ ہم ایک رجعتی دور سے گزر رہے ہیں۔ سماج کے طبقات میں ایک سیاسی تبدیلی جاری ہے۔ اس کے ساتھ طبقاتی شعور بھی تغیر پذیر ہے۔ ایک بڑی جدوجہد کے بعد اب اس کو لپیٹا جا رہا ہے۔ یہ عمل کب تک جاری رہے گا؟ یہ اپنے نقطہ آغاز کی طرف یقیناً نہیں جائے گا۔ لیکن یہ بھی پیشگی نہیں بتایا جا سکتا کہ یہ خط کس طرف جائے گا۔ داخلی طاقتوں کی جدوجہد اس کا فیصلہ کرے گی۔ پہلے تو یہ دیکھنا ہے کہ ہو کیا رہا ہے۔ گہرے مگر باریک رجعتی عمل سطح پر آ رہے ہیں۔ ان کا بڑا مقصد اکتوبر انقلاب کے شعور، اس کی زندہ ہستیوں، نعروں اور نظریات کو عوامی ذہن سے محو نہیں تو کمزور کرنا ضرور ہے۔

جو کچھ ہو رہا ہے سب اسی لئے ہو رہا ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنے اندر دبک جانے کی ضرورت نہیں۔ نہ ہی یہ محسوس کرنے کی ضرورت ہے کہ ہم تاریخ کے دائرے سے باہر ہو گئے ہیں۔ جو کچھ ہو رہا ہے اسے سمجھ لینا نصف فتح کے برابر ہے۔

پارٹی کے اندر جہد و جہد کا آخری زمانہ

جنوری 1925 میں مجھے وزارت جنگ سے فارغ کر دیا گیا۔ فیصلہ سوچ سمجھ کر لیا گیا تھا۔ یہ چھوٹے لوگ ڈرتے تھے کہ فوج سے میرا تعلق رہنے کی صورت میں کہیں خانہ جنگی نہ چھڑ جائے۔ میں نے اپنی وزارت کسی اعتراض کے بغیر بلکہ سکھ کے سانس کے ساتھ چھوڑ دی۔ فوج سے میرے تعلق کے بارے میں ان کم رتبہ لوگوں کے اپنے ہی من گھڑت خوف تھے جن پر انہوں نے یقین کرنا شروع کر دیا تھا۔ 1921 سے میں نے ذاتی طور پر دوسرے کاموں میں دلچسپی لینی شروع کر کر دی تھی۔ جنگ ختم ہو چکی تھی۔ فوج کی نفری پچاس لاکھ سپاہیوں سے کم کر کے چھ لاکھ کر دی گئی تھی۔ فوج کے اندر نوکر شاہی در آئی تھی۔ سب سے اہم ملک کے معاشی مسائل تھے۔ جنگ ختم ہونے کے بعد ان مسائل نے فوجی مسائل کی نسبت مجھے اپنی طرف زیادہ متوجہ کیا تھا۔

مئی 1925 میں مجھے تین ذمہ داریاں سونپ دی گئیں۔ مجھے مراعات کمیشن کا چیئرمین، بجلی، فنی بورڈ کا سربراہ اور صنعت کے سائنسی، فنی بورڈ کا چیئرمین بنا دیا گیا۔ ان تینوں پوسٹوں کا آپس میں کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ عہدے مجھے پوچھے بغیر اور بعض خاص وجوہات کی بنا پر دیے گئے تھے۔ یعنی مجھے پارٹی سے الگ کرنے، روزمرہ کے کام میں الجھانے اور مجھ پر نگاہ رکھنے کے لئے۔ میں نئی انتظامیہ کے ساتھ دیانت داری سے کام کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ یہ تینوں محکمے میرے لئے نئے تھے۔ میں سر سے پاؤں تک اپنے کاموں میں ڈوب گیا۔ میں فنی سائنسی بورڈ میں خاص طور پر زیادہ دلچسپی لیتا تھا جسے سوویٹ روس میں صنعت کے مرکزی کردار کے سبب وسیع پیمانے پر ترقی دی جا رہی تھی۔ میں لیبارٹریوں میں جاتا، وہاں تجربات ہوتے دیکھتا اور تجربہ کار سائنس دان ان کی جو وضاحت پیش کرتے اسے غور سے سنتا رہتا۔ اپنے فالتو وقت میں سائنس کی کتابیں پڑھتا رہتا۔ یوں میں خود کو ناظم اور نصف طالب علم محسوس کرنے لگا۔ میں

نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں طبیعیات اور ریاضی کے مضامین پڑھنے کا کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ میں سیاست سے چھٹی لے کر فطری سائنس اور ٹیکنالوجی کے مسائل پر توجہ دے رہا تھا۔ بجلی کے بورڈ کا چیئر مین ہونے کی حیثیت سے میں بجلی گھروں دورے کرتا رہتا۔ میں ڈینیپر گیا جہاں ایک بہت بڑا پانی سے چلنے والا بجلی گھر زیر تعمیر تھا۔ اس کی تعمیر کے دوران میں میں نے امریکی اور جرمن ماہرین کی خدمات حاصل کیں تاکہ نقص یا کمی نہ رہ جائے۔ میں نے اپنے نئے معاشی کام کو نئی معاشی ضروریات کے مطابق ڈھالا اور انہیں سوشلزم کی بنیادی ضروریات کے ساتھ جوڑ دیا۔ میں دنیا سے الگ ہو کر خود کفیل ہونے کی پالیسی کے خلاف تھا۔ میں سوویٹ اور عالمی معیشت کا موازنہ کرتے رہنے کے حق میں تھا۔ عالمی منڈی کے پیش نظر ایسا کرنا ہماری ضرورت تھی۔ اس طرح درآمد اور برآمد کا جائزہ بھی پیش نظر رہنا تھا۔ ''ایک ملک میں سوشلزم'' کے رجعتی نظریے کو عالمی پیداواری طاقتوں کے سامنے لانے سے اس نظریے کی خامیاں سامنے آجاتی تھیں۔

میں اپنے نئے فرائض پر مبنی رپورٹیں سامنے رکھ کر کتابیں اور کتابچے لکھتا رہا۔ میرے مخالفوں نے اس میدان میں میرا مقابلہ کرنے کی پروانہ کی۔ وہ اس خیال سے مطمئن ہو گئے کہ ٹراٹسکی نے اپنے لیے نئی دلچسپیاں ڈھونڈ لی تھیں۔ مگر سرخ فوج کی تعمیر کی طرح اب انہیں بجلی گھروں کی تعمیر اور سائنسی اداروں میں ترقی بھی پریشان کرنے لگی تھی۔ سٹالن کے آلہ کار مجھ پر نظر رکھنے لگے۔ یہاں بھی انہیں ہر کام کے پیچھے کوئی سازش دکھائی دینے لگی۔ اگر یہ کہوں کہ ٹراٹسکی ازم دکھائی دینے لگا تو زیادہ مناسب ہوگا۔ میں عملی طور پر ناممکن حالات میں کام کر رہا تھا۔ یہ کہنا ہرگز مبالغہ آرائی نہیں ہوگی کہ سٹالن اور مولوٹوف میرے کام میں رخنہ ڈالنے اور اسے ناکام بنانے میں لگے رہتے۔ میرے ماتحت اداروں میں کام کرنے والوں کو اپنے مستقبل کی فکر پڑ گئی۔

میرے سیاسی کام کرنے کی کوشش کو عملی طور پر ناکام بنا دیا گیا۔ مگر یہ لوگ جو کچھ کر رہے تھے۔ اس سے خود ہی خوف زدہ بھی تھے۔ کل کے بہتان ان کے سروں پر سوار تھے۔ وہ ان میں اضافے کے درپے تھے۔ میں بجلی گھروں کے بورڈ اور فنی سائنس کے اداروں سے فراغت پانے پر مصر تھا۔ رعایتی کمیشن کے امور میں یہ لوگ مداخلت نہیں کر سکتے تھے کیونکہ اس کے فیصلے پولٹ بیورو کرتا تھا۔

اس عرصے میں پارٹی معاملات کو نئے بحران نے آن لیا تھا۔ جدوجہد کے ابتدائی دور میں میری

مخالفت کے لئے تین کا ٹولہ قائم ہوا تھا۔لیکن تینوں کے اندر بھی اتحاد نہیں تھا۔نظریاتی اور سیاسی طور پر زینوشیف اور کامینیف سٹالن سے بہت بہتر تھے۔لیکن ان میں کردار نام کی شے کی کمی تھی۔ان کا بین الاقوامی تناظر سٹالن سے بہت وسیع تھا۔یہ تناظر انہوں نے جلاوطنی میں لینن کے ساتھ رہ کر حاصل کیا تھا۔ لیکن اس سے انہیں فائدے کے بجائے نقصان ہوا۔اب سیاسی رجحان خود کفیل قومی ترقی اور حب الوطنی کی طرف جا رہا تھا۔ہم دشمن کو اپنی ''ٹوپیوں کے نیچے'' دفن کر دیں گے۔یہ نئی سوشلسٹ زبان بن گئی تھی۔ جب زینوشیف اور کامینیف نے بین الاقوامی نقطۂ نظر کی حمایت کرنا شروع کر دی تو نوکر شاہی نے ان پر بھی ''ٹراٹسکی ازم کا لیبل چسپاں کر دیا۔اس پر وہ نوکر شاہی کی ''محبت'' حاصل کرنے کی خاطر میرے زیادہ خلاف ہو گئے۔مگر ان کی کوشش بے کار ثابت ہوئی۔نوکر شاہی سٹالن ہی کو اپنا گرو مانتی تھی۔زینوشیف اور کامینیف جلد ہی سٹالن کے مخالفوں کی صف میں کھڑے ہو گئے۔جب انہوں نے یہ معاملہ مرکزی کمیٹی میں لانے کی کوشش کی تو انہیں معلوم ہوا کہ وہاں سٹالن کی اکثریت تھی۔

کامینیف کو ماسکو کا سرکاری راہنما سمجھا جاتا تھا۔لیکن جب 1923 میں ماسکو پارٹی کے ارکان کی بڑی تعداد نے کامینیف کے بجائے اس کے مخالفوں کا ساتھ دے دیا تو کامینیف اور اس کے کمیونسٹ دوست چپ ہو گئے۔سٹالن سے پہلی ہی مخالفت میں کامینیف نے خود کو اکیلا پایا۔لینن☆ گراڈ میں صورتحال مختلف تھی۔یہاں زینوشیف کے حامیوں کی اکثریت تھی۔مگر اب ان کی بھی باری آ گئی۔

☆جنگ کے ایام میں سینٹ پیٹرز برگ کا نام پیٹرو گراڈ رکھ دیا گیا تھا۔بعد میں یہ لینن گراڈ کہلانے لگا۔(مترجم)

مگر اب ان کی بھی باری آ گئی۔لینن گراڈ کے محنت کش یہاں کے امیر کسانوں سے جنہیں کولاک کہا جاتا تھا،متاثر ہو کر ایک ملک میں سوشلزم کی پالیسی کے حق میں ہو گئے۔نوکر شاہی کی مخالفت کے ساتھ محنت کش طبقہ بھی زینوشیف کے مخالف ہو گیا۔اس طرح ایک نیا حزب مخالف وجود میں آ گیا۔کروپسکایا اس کے پہلے اراکین میں سے ایک تھی۔حیرت کی بات یہ تھی کہ زینوشیف اور کامینیف بھی اب ''ٹراٹسکی ازم'' کی بات کرنے لگے تھے اور لوگ انہیں سنتے بھی تھے۔زینوشیف اور کامینیف سے ہمارے تعلقات میں یقیناً ایک تضاد تھا۔ ہمارے بہت سے لوگ ان کے خلاف تھے۔بعض لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ زینوشیف اور کامینیف کے بجائے سٹالن سے اتحاد زیادہ بہتر تھا۔میرا ایک پرانا دوست مرا چکووسکی جو خانہ

جنگی کے دوران میں ایک بہترین انقلابی اور کمانڈ ثابت ہوا تھا، ہر دو پر لعنت کے حق میں تھا۔ اس کا کہنا تھا۔ ''سٹالن دھوکہ دے گا اور زینوشیف موقع آنے پر غائب ہو جائے گا'' لیکن ایسی باتوں کا فیصلہ سیاسی تناظر کو سامنے رکھ کر کرنا پڑتا ہے۔ زینوشیف اور کامینیف اب کھلم کھلا کہہ رہے تھے۔ کہ 1923 میں ''ٹراٹسکی ازم'' کی جدوجہد بالکل درست تھی۔ انہوں نے ہمارے موقف کے بنیادی اصول تسلیم کر لیے تھے۔ ایسے حالات میں ان دونوں کے ساتھ اتحاد نہ کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ جب کہ لینن گراڈ کے لاکھوں انقلابی محنت کش ان کے ساتھ تھے۔

گذشتہ تین برس سے میں کامینیف سے سرکاری میٹنگوں کے سوا ذاتی طور پر کبھی نہیں ملا تھا۔ میری اس سے ذاتی ملاقات اس کے جارجیا کے دورے پر اس رات ہوئی تھی جب اس نے لینن اور میرے موقف کی حمایت کا وعدہ کیا تھا، مگر لینن کی نازک حالت دیکھ کر وہ دوبارہ سٹالن سے مل گیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی کامینیف نے بلند آواز میں کہا۔ ''آپ کا اور زینوشیف کا ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جانا بڑی بات ہے۔ اب پارٹی کو صحیح معنوں میں مرکزی کمیٹی مل گئی۔'' میں ایسی نوکر شاہانہ جائیت پر ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔ کامینیف نے صورتحال کا غلط اندازہ کیا تھا۔ میں نے اس کے جذبات کا خیال کیے بغیر اس طرف اشارہ بھی کر دیا۔ انقلابی مدوجزر جو 1923 کے اختتام پر دوبارہ شروع ہوا تھا، یعنی جرمنی میں انقلابی تحریک کی ناکامی کے بعد، اس نے بین الاقوامی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ روس میں اکتوبر انقلاب کے خلاف ردعمل بھرپور طریقے سے جاری تھا۔ پارٹی بذات خود دائیں جانب جا رہی تھی۔ ان حالات میں یہ سوچنا کہ ہم اکٹھے ہو جائیں گے تو فتح ایک پکے ہوئے پھل کی طرح ہماری جھولی میں گر جائے گی، ایک بچگانہ سوچ تھی۔ ''ہمیں مستقبل کو نظر میں رکھنا ہو گا'' میں زینوشیف اور کامینیف سے بار بار کہتا رہتا۔ ''ہمیں ایک طویل اور سنجیدہ جدوجہد کے لئے تیاری کی ضرورت ہے۔ میرے نئے اتحادیوں نے اس وقت میری بات بڑی بہادری سے قبول کر لی۔ مگر وہ زیادہ عرصہ ثابت قدم نہ رہ سکے۔ وہ لمحہ بہ لمحہ پیچھے ہٹتے جا رہے تھے۔ مراچکوسکی نے ان کی شخصیتوں کا صحیح تجزیہ کیا تھا۔ زینوشیف چپکے سے سرک گیا۔ مگر اس کے حمایتیوں نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ بہرحال اس کے دوہرے چہرے نے ''ٹراٹسکی ازم'' پر دوہرا زخم لگا دیا۔

1926 کے موسم بہار میں میری بیوی اور میں برلن چلے گئے۔ ماسکو کے ڈاکٹروں نے مجھے مسلسل بخار رہنے پر فرائض منصبی میں کمی کی خاطر باہر جا کر طبی معائنہ کرانے کا مشورہ دیا۔ میں بھی اس صورتحال

سے نکلنے کے لئے فکر مند تھا کیونکہ متعدد فیصلہ کن لمحات میں بخار مجھے پکڑ لیتا اور میرے دشمنوں کا اتحادی بن جاتا۔ میرے باہر جانے کا معاملہ پولٹ بیورو میں پیش کیا گیا جس کا خیال تھا کہ اسے ملنے والی اطلاعات کے پیش نظر میرا باہر جانا سیاسی صورتحال کے باعث انتہائی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ بہرحال اس نے آخری فیصلہ مجھ پر چھوڑ دیا۔ پولٹ بورو نے جی، پی، یو کی وہ رپورٹ بھی مجھے دکھائی جس کی روشنی میں میرا بیرونی دورہ ناقابل پذیرائی سمجھا گیا تھا۔ پولٹ بیورو ڈرتا تھا کہ بیرون ملک مجھے کوئی ناخوشگوار حادثہ پیش آجانے کی صورت میں ساری ذمہ داری پارٹی پر عائد ہو جاتی تھی۔ ترکی میں میری جلاوطنی کا خیال ابھی تک سٹالن کی پولیس مین جیسی کھوپڑی میں نمودار نہیں ہوا تھا۔ ممکن تھا کہ پولٹ بیورہ کو یہ بھی تشویش ہو کہ میں باہر سٹالن کے مخالفوں کو مضبوط کرنے جا رہا تھا۔ بہرحال میں نے احباب سے مشورے کے بعد باہر جانے کا فیصلہ کر لیا۔

جرمن سفارت خانے کی طرف سے کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ اپریل کے وسط میں اپنی بیوی کے ہمراہ کرزنیکو کے نام پر بنے ہوئے سفارتی پاسپورٹ پر میں باہر چلا گیا۔ کرزنیکو یوکرائن کے محکمہ تعلیم میں تنظیمی بورڈ کا رکن تھا۔ میرا سیکریٹری سیرسک، میری ٹرین کا سابقہ کمانڈر اور جی، پی، یو کا ایک نمائندہ میرے ساتھ تھے۔ میں زینوشیف اور کامینیف سے جذباتی انداز میں رخصت ہوا۔ اس وقت انہیں سٹالن سے دشمنی مول لینے کے امکانات بڑے معدوم دکھائی دیے تھے۔

جنگ سے پہلے کے دنوں میں میں ہوہن رولرن کی حکومت کے برلن سے بخوبی واقف تھا۔ اس وقت برلن کی اپنی ایک خاص خصوصیت تھی جو اگرچہ خوشگوار تو نہیں تھی مگر دوسروں کو اپنی طرف متوجہ ضرور کرتی تھی۔ اب برلن بدل گیا تھا۔ اب اس میں کوئی خاص بات دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ یا پھر مجھے دکھائی نہیں دیتی تھی۔ جیسے شہر میڈیکل آپریشن کے بعد کسی طویل اور سنجیدہ بیماری سے صحت یاب ہو رہا تھا۔ افراط زر اب نہیں تھا مگر اس کے آثار باقی تھے۔ سڑکوں پر، دکانوں میں اور پیدل چلنے والے لوگوں کے چہروں پر ایک ایسی مفلسی، اور بے صبری دکھائی دے رہی تھی جس کے اندر دوبارہ ابھرنے کی خواہش موجود ہوتی ہے۔ جنگ میں شکست اور ورسیلز معاہدے کی زنجیروں اور غربت نے جرمنوں کی نفاست کو نگل لیا تھا۔ جنگ سے تباہ حال سڑکیں، برآمدے اور سٹور دوبارہ بحال کیے جا رہے تھے۔ سڑکوں کو ریل پیل اور لوگوں کے چہروں کے تاثرات کسی پوشیدہ المیے اور ہلاکت کی نشان دہی کرتے تھے۔ جیسے کہہ رہے

ہوں۔'' کیا کیا جا سکتا ہے۔ زندگی ایک جبر مسلسل ہے۔ لیکن ہم ہر شے نئے سرے سے شروع کریں گے۔''

چند ہفتوں تک میں برلن کے ایک پرائیویٹ کلینک میں زیر معائنہ رہا۔ بخار نہ اترنے کی پراسرار بیماری کے کھوج میں میں ڈاکٹروں کے درمیان شٹل کاک بنا رہا۔ آخر میں گلے کے ایک ماہر ڈاکٹر کی تشخیص تھی کہ میرے بخار کی وجہ میرے گلے کے غدود تھے جنہیں نکال دینا ضروری تھا۔ دوسرا میڈیکل عملہ اس کی تشخیص سے متفق میں کچھ ہچکچاہٹ محسوس کر رہا تھا۔ پھر آپریشن بھی پیچیدہ نوعیت کا تھا۔ لیکن ڈاکٹر نے جس کی پشت پر جنگ کا تجربہ تھا، ایک حقارت سے ہرا اندیشے کو پرے کر دیا۔ اس نے کہا کہ گلے کے غدود نکالنا اتنا ہی آسان تھا جیسے مونچھیں صاف کر دینا۔ مجھے اس سے متفق ہونا پڑا۔

لیکن برلن میں گذرا ہوا وقت، خصوصاً کلینک میں، بے کار ثابت نہ ہوا۔ جرمن اخبارات میں میں دوبارہ نظر آنے لگا، جن سے اگست 1914 کے بعد میرا قطع تعلق ہو گیا تھا۔ مجھے روزانہ درجنوں اخبارات اور دوسرا شائع شدہ مواد پڑھنے کو ملتا جسے پڑھ کر میں وہیں کمرے میں پھینک دیتا۔ ڈاکٹروں کو اخبارات کے فرش پر سے چل کر مجھ تک آنا پڑتا۔ مجھے پہلی دفعہ جرمن سیاست کے ہر قسم کے رنگ دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ مجھے تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس میں کوئی بھی غیر متوقع چیز نہیں تھی۔ جرمن جمہوریہ کا فوجی الیے کو جنم دینا، ریپبلکنوں کا ورسیلز معاہدے کی بری ضرورت کی پیداوار ہونا، سوشل ڈیموکریٹوں کا نومبر انقلاب کی بربادی کا ذمہ دار ہونا جس کا گلا انہوں نے خود گھونٹا تھا، ہینڈ برگ جمہوری صدر بن جانا ___ یہ سب کچھ ایسے ہی ہوا تھا جیسے میں نے سوچا تھا۔ لیکن ان سے کو اتنے قریب سے دیکھنا بڑا سبق آموز تھا۔

یکم مئی کو میں اور میری بیوی ایک گاڑی میں شہر کا چکر لگانے نکل پڑے۔ ہم یوم مئی کے جلوس جلسے دیکھتے اور وہاں تقریریں سنتے رہے۔ ہجوم میں گھل مل گئے۔ میں نے ان سے زیادہ پرشکوہ یوم مئی کے جلوس دیکھے تھے۔ لیکن ہجوم میں اس طرح آزادانہ گھومنے پھرنے اور کسی کی نظر میں نہ آئے کا موقع بہت دیر بعد ملا تھا۔ جیسے میں اس بے نام ہجوم کا ایک حصہ بن گیا تھا۔ فقط ایک دفعہ میرے ساتھیوں نے محتاط لہجے میں کہا۔ ''وہ دیکھیں، وہاں آپ کی تصویریں فروخت ہو رہی ہیں۔'' لیکن ان تصویروں سے یوکرائن کے محکمہ تعلیم کے فنی بورڈ کے رکن کزمنکو کو کوئی شناخت نہیں کر سکتا تھا جس کے پاسپورٹ پر میں جرمنی میں آیا تھا۔ اگر یہ سطور کاونٹ ویسٹارپ، ہلفرڈنگ، ڈنگ، ہرمن، سٹریسی مان (جواب فوت ہو چکا ہے) کاؤنٹ

ریونیٹ لویا جرمنی میں میرے داخلے کی مخالفت کرنے والے کسی بھی شخص کی نظروں سے گزریں تو میں انہیں بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں وہاں کسی شرپسندی کی نیت سے نہیں بلکہ چند روز اپنے علاج کے لئے گیا تھا۔

ہم شہر سے باہر ''شراب میلے'' میں بھی گئے۔ یہاں لوگوں کا بے پناہ ہجوم تھا۔ وہاں دھوپ تھی، شراب تھی۔ اس کے باوجود لوگوں کی خوشیوں کے موڑ پر پچھلے برسوں کی تباہی کے سیاہ سائے چھائے ہوئے تھے۔ انہیں بغور دیکھنے سے پتا چلتا تھا جیسے وہ کسی بیماری سے صحت یاب ہو رہے تھے۔ وہ ایک بڑی قیمت پر اپنی خوش مزاجی قائم رکھے ہوئے تھے۔ ہم نے چند گھنٹے اس ہجوم میں گزارے۔ اسے دیکھتے رہے، لوگوں سے باتیں کرتے رہے، کاغذوں کی پلیٹوں میں کھانا کھاتے رہے اور بیئر پیتے رہے جس کا مزہ ہم 1917 سے تقریباً بھول چکے تھے۔

میں اپنے آپریشن سے تیزی سے صحت یاب ہو رہا تھا۔ ہم واپس جانے کی تاریخ کا سوچ رہے تھے۔ اس موقع پر ایک چیز اس قدر غیر متوقع طور پر وقوع پذیر ہوئی کہ میں آج تک یہ معمہ حل نہیں کر سکا۔ متوقع روانگی سے کوئی ایک ہفتہ پہلے کلینک کے برآمدے میں دو ایسے آدمی نمودار ہوئے جو خود کو چھپانے کے باوجود چھپا نہ سکے۔ ان کا تعلق پولیس کے محکمے سے لگتا تھا۔ کمرے کی کھڑکی سے صحن میں نظر دوڑانے پر مجھے چھ عدد مزید ایسے شخص دکھائی دیے جو ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باجود ایک ہی جیسے تھے۔ میں نے کرسٹنسکی کی توجہ اس طرف مبذول کرائی۔ چند منٹ بعد ایک اسٹنٹ ڈاکٹر نے بڑی ہیجانی کیفیت میں میرے دروازے پر دستک دی اور بتایا کہ میری جان کو خطرہ ہو سکتا تھا۔ ''میرا خیال ہے کہ پولیس کی طرف سے تو نہیں؟'' میں نے ان تمام ایجنٹوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔ ڈاکٹر کا خیال تھا کہ پولیس مجھے حملے کی کوشش سے بچانے آئی تھی۔ دو یا تین منٹ بعد ایک پولیس انسپکٹر کمرے میں داخل ہوا اور اس نے سنسکی کو بتایا کہ پولیس کو میری جان کے خطرے کی اطلاع ملی تھی۔ اسی لیے اس نے غیر معمولی حفاظتی ذرائع اختیار کیے تھے۔ سارا کلینک ایک دم جیسے کسی تیاری میں مصروف ہو گیا۔ نرسیں ایک دوسرے کو اور مریضوں کو بتانے لگیں کہ کلینک میں ٹراٹسکی زیر علاج تھا جس کی وجہ سے اس عمارت پر کسی وقت بھی دستی بموں سے حملہ سکتا تھا۔ ایسا ماحول کسی علاج گاہ کے لئے بمشکل موزوں تھا۔ میں نے وہاں سے نکلنے اور کرسٹنسکی کے ہمراہ سوویٹ سفارت خانے جانے کا انتظام کر لیا۔ کلینک کے سامنے والی

سڑک پر پولیس کا پہرہ تھا۔ میرے آگے پیچھے پولیس کی گاڑیاں تھیں۔

اس واقعہ کا سرکاری بیان کچھ اس قسم کا تھا: ایک جرمن شاہ پرست جو کسی سازش کے منکشف ہونے پر پکڑا گیا تھا، اس نے عدالت میں بتایا کہ روسی سفید رجعت پرستوں کے ایک گارڈ کو یہ معلوم ہونے پر کہ ٹراٹسکی برلن میں تھا، اس پر حملہ آور ہونے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ جرمن سفارت کاری جس کے ذریعے میرا یہ دورہ ترتیب پایا تھا، اس نے دانستہ طور پر پولیس کو مطلع نہیں کیا تھا چونکہ اس میں بذات خود بہت سارے شاہ پرست موجود تھے۔ پولیس نے گرفتار شدہ پرست کے بیان پر کچھ زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ مگر وہ جاننا چاہتی تھی کہ واقعی ٹراٹسکی کلینک میں موجود تھا۔ پولیس کو حیرت اس بات کی تھی کہ شاہ کا بیان درست ثابت ہوا تھا۔ ڈاکٹروں سے بھی پوچھ گچھ ہوئی۔ مجھے بیک وقت دو انتباہ ملے تھے۔ ایک اسٹنٹ ڈاکٹر کی طرف سے اور دوسرا پولیس کی طرف سے۔ کیا واقعی میری زندگی لینے کا کوئی منصوبہ تھا؟' کیا واقعی پولیس کو گرفتار شدہ شاہ پرست سے میری موجودگی کا پتا چلا تھا؟' یہ ایسے سوال ہیں جن کا جواب میں آج بھی نہیں دے سکتا۔

میرا خیال ہے کہ معاملہ بڑا سیدھا سادہ تھا۔ سفارتی حلقہ میری آمد کو ''راز'' نہ رکھ سکا۔ کسی طرح پولیس کو اس کی خبر ہوگئی۔ اسے اعتماد میں نہ لیے جانے پر دکھ ہوا اور اس نے میرے مخالفوں پر ثابت کر دیا کہ اس کی مدد کے بغیر میرے گلے کے غدود دور نہیں کیے جا سکتے تھے۔ بہرحال جو بات بھی تھی، کلینک کو تہہ و بالا کر دیا گیا اور مجھے بھاگ کر روسی سفارت خانے میں پناہ لینی پڑی۔ اس واقعے کی ہلکی سی بھنک جرمن پریس کو بھی پڑ گئی۔ لیکن اخبارات پر کوئی بھی یقین کرنے کو تیار نہ ہوا کہ میں برلن ٹراٹسکی موجود تھا۔

برلن میں میرے قیام کے دوران یورپ میں بعض اہم واقعات نمودار ہوئے۔ برطانیہ میں عام ہڑتال اور پولینڈ میں پلسڈسکی کی فوجی بغاوت ___ ان دونوں واقعات نے روس کے حکمرانوں سے میرے اختلاف رائے کو سچ کر دکھایا اور ہماری جدوجہد کی صحیح سمت میں پیش قدمی کو ظاہر کر دیا۔ یہاں اس موضوع پر چند سطریں لکھنی مناسب ہوں گی۔

سٹالن، بخارن اور شروع میں زینوثیف نے اپنی پالیسی کو سوویٹ ٹریڈ یونینوں اور برطانیہ کی ٹریڈ یونینوں کی جنرل کونسل کے سفارتی حلقوں میں بڑا کامیاب محسوس کیا اور اسے اپنی ایک بڑی فتح سے منسوب کر دیا۔ اپنی صوبائی تنگ نظری کے سبب سٹالن سمجھ بیٹھا کہ مشکل لمحوں میں پرسل اور ٹریڈ یونینوں

کے دوسرے راہنما برطانوی بورژوازی کے مقابلے میں سوویٹ جمہوریہ حمایت کریں گے۔ جہاں تک برطانوی ٹریڈ یونینوں کے راہنماؤں کا تعلق تھا ان کا خیال تھا اور یہ خیال ایک حد تک درست بھی تھا کہ برطانوی سرمایہ داری میں بحران اور عوام میں بڑھتی ہوئی بے اطمینانیت کے باعث ان کے لئے سوویٹ ٹریڈ یونینوں کے راہنماؤں سے کھلی دوستی رکھنا مشکل تھا۔ دونوں طرفیں اصل بات پر آنے کے بجائے اضافی قسم کی باتیں کرتی رہتیں۔ بڑے واقعات گلی سڑی پالیسیوں کو کوڑا گھروں میں پھینک دیتے ہیں۔ مئی 1926 میں برطانیہ کی عام ہڑتال برطانوی زندگی ہی میں نہیں بلکہ ہماری پارٹی کی زندگی میں بھی ایک بڑا واقعہ ثابت ہوئی۔

جنگ کے بعد برطانیہ کی قسمت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ عالمی حیثیت میں اس کی جوہری تبدیلی نے اس کی داخلی زندگی میں کارفرما طاقتوں کے باہمی تعلقات میں بھی تغیر پیدا کر دیا۔ صاف ظاہر تھا کہ اگر یورپ بشمول برطانیہ، نے کسی ایک مقررہ عرصے تک سماجی توازن برقرار رکھنا تھا تو برطانیہ کو بھی یہ توازن برقرار رکھنے کے لئے اپنے اندر سنجیدہ قسم کے ردوبدل کی ضرورت تھی۔ میرا خیال تھا۔ کہ برطانیہ میں کوئلے کی صنعت سے عام ہڑتالوں کا سلسلہ شروع ہوگا۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ محنت کش طبقے کی پرانی تنظیموں اور اس کے نئے تاریخی فرائض کے درمیان تضادات مستقبل قریب میں ظاہر ہونے شروع ہو جائیں گے۔ 1926 کے جاڑوں اور موسم بہار میں جب میں کوہ قاف میں تھا تو میں نے اس موضوع پر ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام تھا ''برطانیہ کدھر جا رہا ہے۔'' کتاب میں بنیادی طور پر پولٹ بیورہ کی اس سرکاری امید پر تبصرہ کیا گیا تھا کہ کمیونزم کس طرح برطانوی لیبر پارٹی اور ٹریڈ یونینوں کے اندر غیر محسوس طریقے سے سرایت کرتا جائے گا۔ کسی غیر ضروری پیچیدگی اور اپنے دشمنوں کی غیر ضروری تنقید سے بچنے کے لئے میں نے کتاب کا مسودہ پولٹ بیورہ کو بھجوا دیا۔ چونکہ میں نے برطانیہ میں متوقع حالات کا ذکر کیا تھا لہٰذا پولٹ بیورہ کے کسی رکن نے مسودے پر اظہار خیال کی ضرورت محسوس نہ کی۔ کتاب سنسر سے بحفاظت گزر کر میری توقع کے مطابق وقت پر شائع ہوگئی۔ کچھ عرصہ بعد یہ برطانیہ میں بھی شائع ہوگئی۔ برطانوی سوشلزم کے سرکاری راہنماؤں نے میری پیشن گوئی کو دیوانے کی بڑ سمجھا اور کہا کہ ایک غیر ملکی جو برطانیہ کے حالات سے بے خبر تھا، روسی عام ہڑتال کو کس طرح برطانوی زمین پر درآمد کر سکتا تھا۔ دوسرے درجنوں بلکہ سینکڑوں برطانوی راہنماؤں کا بھی یہی خیال تھا جس میں میکڈونلڈ بھی شامل تھا جو

معمولی نوعیت کی سیاست میں بلاشبہ اول درجے کے انعام کا مستحق تھا۔ چند ماہ میں کوئلے کی کانوں کی ہڑتال عام ہڑتال میں بدل گئی۔ مجھے اپنی پیش گوئی کی تصدیق کی اتنی جلدی توقع نہیں تھی۔ اگر برطانوی اصلاح پسندوں کے خود ساختہ اندازوں کے برعکس مارکس کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی تھی تو عام ہڑتال کے دوران میں جنرل قونصل کے طرز سلوک نے سٹالن کی ان امیدوں کو دھڑام سے گرا دینا تھا جو اس نے پرسل سے لگا رکھی تھیں۔ میں کلینک میں بستر پر لیٹا برطانوی عام ہڑتال اور خصوصاً عوام اور ان کے راہنماؤں کے مابین تعلق کے بارے میں اطاعات حاصل کرتا رہا۔ جس چیز سے میری گردن تن گئی وہ ''پراودا'' میں ایک مضمون تھا جس کے مصنف نے مضمون میں اپنے فکری دیوالیہ پن کو چھپانے کی کوشش کی تھی۔ ایسا فقط حقائق کو مسخ کر کے ہی کیا جا سکتا تھا۔ عوام کو دھوکہ دینے سے زیادہ کسی انقلابی کے ذہنی انحطاط کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔

ماسکو واپس آنے پر میں نے اپنی حکومت سے برطانوی جنرل قونصل سے سرکاری سطح پر قطع تعلق کا مطالبہ کر دیا۔ زینوشیف ناگزیر ہیر پھیر کے بعد میرا طرفدار بن گیا۔ راڈک ہمارے مخالف تھا۔ سٹالن اپنے ٹولے سے چمٹا رہا۔ برطانوی ٹریڈ یونینوں کے راہنما اپنے داخلی بحران کے اختتام تک انتظار کرتے رہے۔ پھر انہوں نے اپنے فراغ دل مگر کند ذہن اتحادی کو لات ماردی۔

عین اسی وقت پولینڈ میں بھی اتنی ہی اہمیت کے واقعات رونما ہو رہے تھے۔ کسی راستے کی تلاش میں پیٹی بورژوازی بغاوت پر اتر آئی اور اس نے پلسڈسکی کو اپنی ڈھال پر رکھ لیا۔ کمیونسٹ پارٹی کے راہنما ورسکی نے دیکھا کہ پرولتاریہ اور کسانوں کی جمہوری آمریت اس کی آنکھوں کے سامنے قائم ہو رہی تھی۔ اس نے کمونسٹ پارٹی کو پلسڈسکی کی حمایت کے لئے کہا۔ میں روسکی کو طویل عرصے سے جانتا تھا۔ جب روز الگسمبرگ زندہ تھی تو وہ انقلابیوں کی صف میں اپنی جگہ قائم رکھنے میں کامیاب رہا تھا۔ اکیلا رہ جانے پر اسے یہ جگہ کرنی پڑ گئی۔ 1924 میں بڑی ہچکچاہٹ کے بعد اس نے اعلان کیا کہ وہ ''ٹراٹسکی ازم'' کی مصیبت کو سمجھ گیا تھا۔ یعنی جمہوری آمریت کے قیام کے لئے کسانوں کو ''کم اہمیت'' دینا۔ سٹالن کی تابعداری کرنے پر انعام کے طور پر اسے دوبارہ راہنما بنا دیا گیا۔ پھر وہ اپنے پروں کو کسی دوسری جگہ اڑ کر جانے کے لئے بے صبری سے پھڑ پھڑانے لگا۔ مئی 1926 میں اسے موقع مل گیا۔ پارٹی کو بدنام کرنے اور اس کے جھنڈے کو گندہ کرنے کے لئے۔ مگر وہ سزا سے بچ گیا۔ سٹالن کی مشینری نے اسے پولش عوام

کے غم وغصہ سے بچالیا۔

1926 میں پارٹی کی جدوجہد میں شدت آ گئی۔خزاں میں حزب مخالف مقامی پارٹیوں کے جلسوں میں کھلم کھلا حملے کرنے لگا۔سرکاری آلہ زیادہ تیزی سے جواب دینے پر اتر آیا۔نظریات کی جنگ نے سرکاری جنگ کی شکل اختیار کر لی۔حزب مخالف کی میٹنگوں اور جلسہ گاہوں کے سامنے ہارن اور ہر قسم کی نعرہ بازی اور شور شرابا کیا جانے لگا۔حکمران ٹولہ دھمکیوں اور غنڈہ گردی پر اتر آیا۔پارٹی کے ارکان کو حزب مخالف کی بات سننے ہی نہیں دی جاتی تھی۔ارکان بھی پارٹی میں پھوٹ یا کسی بڑی تباہی کے ڈر سے چپ رہتے۔ناچار حزب مخالف کو پسپائی اختیار کرنی پڑتی۔16 اکتوبر کو ہم نے یہ اعلان جاری کیا کہ اگرچہ ہم پارٹی کے اندر رہ کر اپنے جائزہ حقوق کی جنگ کو ضروری سمجھتے ہیں لیکن ایسی حرکتوں کی مذمت کرتے ہیں جس سے پارٹی میں پھوٹ پڑ جائے۔یہ اعلان حکومتی آلے کے لئے نہیں بلکہ پارٹی کی ارکان کے لئے جاری کیا گیا تھا۔یہ ہماری طرف سے پارٹی میں رہنے اور اس کی خدمت کرنے کی خواہش کا اظہار تھا۔اس پر معاہدہ ہو جانے کے دوسرے دن ہی سٹالن کے حواریوں نے اسے توڑ دیا۔اس کے باوجود 27-1926 کی سردیوں میں ہمیں اس قدر سانس لینے کا موقع مل گیا کہ ہم متعدد سوالوں کا نظریاتی بنیاد پر تجزیہ کر سکتے۔

1927 کے آغاز میں زینوثیف ہتھیار ڈالنے کو تیار ہو گیا، مگر فوری طور پر نہیں، آہستہ آہستہ۔پھر چین کے اندر متزلزل کر دینے والے واقعات رونما ہونے لگے۔سٹالن کی پالیسی کا مجرمانہ کردار سیدھا میرے منہ پر آ کر لگا۔زینوثیف اور اس کے پیروکاروں نے وقتی طور پر ہتھیار ڈالنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

چین میں کم رتبہ لوگوں کی قیادت نے بالشویک ازم کی تمام روایات کو پیروں تلے کچل دیا۔کمیونسٹ پارٹی کو مجبور کیا گیا کہ وہ کومن تانگ بورژوا پارٹی میں شمولیت اختیار کرلے اور اس کے فوجی ڈسپلن کے تابع ہو جائے۔سوویٹوں کی تشکیل ممنوع قرار دے دی گئی۔کمیونسٹوں سے کہا گیا کہ وہ زرعی انقلاب کو قابو میں رکھیں اور بورژوازی کی اجازت کے بغیر محنت کشوں کو مسلح نہ کریں۔جب چیانگ کائی شک نے شنگھائی کے مزدوروں کو کچلا تھا اور طاقت فوج کے ہاتھوں میں دے دی تھی تو اس سے بہت پہلے ہم نے اس کی پیش گوئی کر دی تھی۔میں 1925 ہی سے کومن تانگ سے کمیونسٹوں کو واپس بلا لینے کا مطالبہ کر رہا تھا۔سٹالن اور بخارن کی پالیسی نے انقلاب ہی کو نقصان نہیں پہنچایا تھا، بلکہ حکومتی آلے کی مدد چیانگ کائی

شک کی ردانقلاب کی کوشش کو ہماری تنقید سے بھی بچایا تھا۔اپریل 1927 میں دارلعوام میں پارٹی میٹنگ کے دوران میں سٹالن ابھی چیانگ کائی شیک سے اتحاد کی پالیسی کا دفاع کررہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ اس پر اعتماد کیا جائے۔ پانچ یا چھ دن بعد چیانگ کائی شیک نے شنگھائی کے محنت کشوں اور کمیونسٹ پارٹی کو خون میں نہلا دیا۔

مختصر عرصے میں ہماری طاقت میں خاصا ہوا تھا۔لیکن حکومتی اقتدار سے ہم جس دھاگے میں بندھے ہوئے تھے، اسے چیانگ کائی شیک کے واقعہ نے کاٹ دیا تھا۔ سٹالن کو اب شنگھائی کے محنت کشوں کو کچلنے میں چیانگ کائی شیک کو مدد دینے سے پہلے پارٹی کے اندر مخالفین کو کچلنے کی ضرورت تھی۔ مخالفین کی ریڑھ کی ہڈی پرانے انقلابیوں کا ایک گروہ تھا۔مگر ہم اکیلے نہیں تھے۔نئی نسل کے لاکھوں انقلابی ہمارے گرد جمع ہو چکے تھے۔ یہ سب اکتوبر انقلاب سے متاثر تھے۔انہوں نے خانہ جنگی میں حصہ لیا تھا۔ یہ سٹالن کی مرکزی کمیٹی کے سامنے دیوار بن گئے۔وہ مارکس کے نظریات کو سمجھ کر انقلاب کو کندھا دینا سیکھ چکے تھے۔ایسے ہزاروں نوجوان سٹالن کے قید خانے اور جلاوطنی میں اپنے سیاسی تجربے کی روشنی میں انقلاب کے نظریے کا مطالعہ کرنے میں مصروف تھے۔

حزب مخالف کھلی آنکھوں سے آخری مقابلے کے لئے تیار تھا۔ہم جان گئے تھے۔کہ ہم اپنے نظریات کو نئی نسل کی ملکیت سفارتی ذرائع یا گریز کی پالیسی سے نہیں بلکہ نتائج کی پرواہ کیے بغیر کھلی جدوجہد کے ذریعے بنا سکتے تھے۔ہم آخری جنگ کے لئے تیار ہو گئے۔

انسانی تاریخ میں مادی طاقتوں نے ہمیشہ اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ کردار ترقی پسندانہ کم اور رجعتی زیادہ ہوتا ہے۔اس کا انحصار اس بات پر بات ہے کہ یہ طاقتیں کون استعمال کررہا ہے اور کسی مقصد کے لئے کررہا ہے لیکن یہ یقین کر لینا حماقت ہے کہ یہ طاقتیں تمام مسائل حل اور تمام رکاوٹیں دور کرسکتی ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ ترقی پسندانہ تاریخی رجحانات کو وقتی طور پر آگے بڑھنے سے روک لیا جائے لیکن ترقی پسندانہ خیالات کو ہمیشہ کے لئے آگے بڑھنے سے روکا نہیں جاسکتا۔اس لئے جب جنگ بڑے اصولوں کی ہوتو انقلابی ایک ہی اصول پر عمل پیرا ہوتے ہیں، اور وہ ہے: مقابلہ کرو اور طاقت پر قبضہ کرلو۔

جوں جوں 1927 کے آخر میں پندھویں پارٹی کانگریس کا وقت نزدیک آرہا تھا پارٹی محسوس کرنے لگی کہ یہ تاریخ کے کسی دوراہے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ پارٹی کے رکن چوکنے ہو گئے۔حکومتی تشدد

کے باوجود پارٹی کارکنوں میں حزب مخالف کی بات سننے کی خواہش تھی۔ مگر ایسا غیر قانونی طور پر ہوسکتا تھا۔ اس کے لئے ہزاروں خفیہ میٹنگیں ماسکو، لینن گراڈ اور مختلف اضلاع میں منعقد کی جانے لگیں جن میں لاکھوں کارکن شریک ہورہے تھے۔ میں ایک دن میں چار چار میٹنگوں میں شرکت کرتا۔ یہ عموماً کسی کے گھر پر ہوتیں جو دو کمروں پر مشتمل ہوتا۔ دونوں کمرے سامعین سے بھر جاتے۔ مقرر دونوں کمروں کے درمیانی دوراز ے میں کھڑا ہوکر تقریر کرتا۔ شرکاء فرش پر بیٹھے ہوتے۔ جگہ کی کمی کے سبب بحث اور سوالات وغیرہ کھڑے ہوکر کیے جاتے۔ یوں بھی ہوتا کہ کبھی کنٹرول کمیشن کے اہلکار وہاں پہنچ جاتے اور وہ مجمعے کو منتشر ہونے کو کہتے۔ انہیں بھی بحث میں شرکت کی دعوت دی جاتی۔ اگر وہ گڑبڑ کرتے تو انہیں باہر نکال دیا جاتا۔ ماسکو اور لینن گراڈ میں ایسے جلسوں میں تقریباً بیس ہزار پارٹی ورکروں نے شرکت کی۔ یہ تعداد بڑھتی جارہی تھی۔ ہم نے بڑی ہوشیاری سے فنی ہائی سکول میں ایک میٹنگ کا انتظام کیا۔ ہم نے سکول پر اندر سے قبضہ کرلیا۔ تقریباً دو ہزار سامعین ہال میں جمع ہوگئے۔ بہت سے لوگ باہر سڑک پر کھڑے تھے۔ جلسے میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش ناکام ثابت ہوئی۔ کامینیف اور میں دو گھنٹوں تک تقریر کرتے رہے۔ آخر مرکزی کمیٹی نے طاقت کے استعمال سے حاضرین کو منتشر کرنے کی دھمکی دے دی۔ اس کے لئے جی، پی، یو نے فوج سے دستے طلب کرلیے تھے۔ سٹالن خون خرابہ چاہتا تھا۔ ہم نے وقت طور پر جلسہ ختم کرنے اعلان کردیا۔ لیکن 7 نومبر تک مظاہرے جاری رہے۔

اکتوبر 1927 میں مرکزی مجلس عاملہ نے لینن گراڈ میں اپنا اجلاس منعقد کیا۔ اس موقع پر حکومت کی طرف سے ایک بڑے مظاہرے کا انتظام کیا گیا۔ لیکن ان دیکھے حالات کے باعث مظاہرے نے غیر متوقع طور پر دوسری شکل اختیار کرلی۔ زینوثیف، میں اور حزب مخالف کے بعض دوسرے راہنما مظاہرے کے شرکاء کی تعداد اور موڈ دیکھنے کے لئے ایک گاڑی میں شہر کا چکر لگارہے تھے۔ اپنے دورے کے آخر میں ہم ''دوردمحل'' کے پاس پہنچے جہاں الگ الگ ٹرکوں پر مجلس عاملہ کیارکان کے لئے پلیٹ فارم بنایا گیا تھا۔ ہماری گاڑی پولیس کی ایک صف کے سامنے رک گئی۔ آگے جانے کا راستہ نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ ہم اس صورت سے نکلنے کے متعلق سوچتے، پولیس دستے کا انچارج جلدی سے ہماری گاڑی کی طرف آیا اور ہمیں سٹیج تک لے جانے کی پیش کش کی۔ اس سے پہلے کہ ہم اپنی ہچکچاہٹ پر قابو پاسکتے، پولیس ہماری گاڑی کے سامنے دورویہ ہمارے لئے راستہ بنا کر کھڑی ہوگئی تا کہ ہم سٹیج تک جاسکیں جو ابھی تک خالی تھا۔ جب

ہم سٹیج پر آئے تو عوام کا سارا موڈ ایک دم بدل گیا۔ وہ دوسرے ٹرکوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ہمارے ٹرک کی طرف بھاگنے لگے۔ آنکھ جھپکتے ہی ہزاروں لوگ ہمارے سٹیج کے گرد جمع ہو گئے۔ محنت کش اور سپاہی پل بھر کو ہمارے سٹیج کے سامنے کھڑے ہوتے، ہاتھ ہلاتے، نعرے لگاتے اور پھر عقب سے آنے والے لوگوں کے دباؤں سے آگے بڑھ جاتے۔ جب کم رتبہ لوگوں کو صورتحال کا پتا چلا تو انہوں نے امن وامان قائم کرنے کی خاطر پولیس کا ایک دوسرا دستہ بھیج دیا۔ وہ بھی ہجوم میں شامل ہو گیا۔ پھر حکمران ٹولے کے ہزاروں ایجنٹ ہجوم کے اندر داخل ہو گئے۔ وہ ہمارے خلاف نعرہ بازی کرنے لگے۔ لیکن ان کی کمزور آوازیں ہجوم کے نعروں میں ڈوب گئیں۔ جوں جوں صورتحال طول پکڑتی گئی، مظاہرے کے منتظمین کی مشکلات میں اضافہ ہوتا گیا۔ آخر مجلس عاملہ کے ارکان یہ دیکھ کر کہ ان کے ٹرک کے سامنے تو ساری جگہ خالی پڑی تھی اور سننے والا کوئی نہیں تھا تو وہ بھی اپنے ٹرک سے اتر کر ہمارے ٹرک کی طرف آ گئے۔ ان کا یہ جرات مندانہ اقدام بھی صورتحال نہ بچا سکا۔ ہجوم ہمارے نام لے کر نعرے لگاتے رہے۔ افسوس کی بات تو یہ تھی کہ ان ناموں میں حکومتی ٹولے کے کسی راہنما کا نام شامل نہیں تھا۔

زینوشیف یہ صورتحال دیکھ کر ایک دم پرامید ہو گیا۔ مگر میں اس کے جذبات میں شرکت نہ کر سکا۔ لینن گراڈ کے شہریوں نے حزب اختلاف کے راہنماؤں سے بڑے افلاطونی انداز میں اپنی محبت کا اظہار کیا تھا۔ مگر وہ ہمیں حکمران ٹولے کے غیض وغضب سے بچا لیتے ان میں اتنی سکت نہیں تھی۔ یہاں بھی میں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں تھا۔ دوسری طرف یہ مظاہرہ حکمران ٹولے کو یہ اشارہ دے رہا تھا کہ وہ حزب مخالف کا کام تمام کرنے میں تاخیر سے کام نہ لے تاکہ عوام ٹھنڈے ہو کر بیٹھ جائیں۔

دوسرا سنگ میل ماسکو میں اکتوبر انقلاب کی دسویں سالگرہ تھی۔ جلسے جلسوں کو منظم کرنے والے وہ لوگ تھے جو اکتوبر انقلاب سے پہلے ایک طرف کھڑے تھے یا جو گھروں میں بیٹھے دیکھ رہے تھے کہ کیا تماشا ہو رہا تھا۔ جب انقلاب فتح سے ہمکنار ہو گیا تو وہ اپنی چھتری کی عافیت سے نکل کر انقلاب کے جلوس میں شامل ہو گئے۔ میں کسی تلخی کے بغیر بلکہ ایک مزے کے ساتھ ایسے مسخرے لوگوں کے مضامین پڑھ اور حرکتیں دیکھ رہا تھا جو اب مجھے اکتوبر انقلاب سے غداری کا مرتکب ٹھہرا رہے تھے۔ جب آپ تاریخی عمل اصولوں کو سمجھ رہے اور یہ دیکھ رہے ہوں کہ آپ کے مخالفوں کو کون سے ان دیکھے ہاتھ نچا رہے ہیں تو پھر کمینگی اور خباثت کے فعل کی آپ کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رہتی۔

حزب مخالف نے اپنے بینروں اورنعروں کے ساتھ جلوس میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ یہ نعرے پارٹی کے خلاف نہیں تھے۔ مثلاً بینروں پر لکھا تھا۔''لینن کی وصیت پوری کی جائے۔''''نوکرشاہی مردہ باد'' ''موقع پرستی مردہ باد''''پارٹی میں پھوٹ روکی جائے''''پارٹی کو متحد کیا جائے۔'' سٹالن آج یہی نعرے دائیں بازو کے خلاف استعمال کر رہا ہے۔ انہیں نعروں پر مشتمل بینر 7 ،نومبر کو حزب مخالف کے ورکروں کے ہاتھوں سے چھینے گئے اوران کے ساتھ برا سلوک روا رکھا گیا۔ سرکاری راہنماؤں نے لینن گراڈ کے مظاہروں سے سبق حاصل کر کے اس دفعہ زیادہ سخت انتظامات کر رکھے تھے۔ عوام کے اندر بے چینی کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ وہ بے چین ذہنوں کے ساتھ جلوس میں حصہ لے رہے تھے۔ حیرت زدہ اور بے چین عوام کے سامنے دو فریق تھے۔ ایک حزب مخالف اور دوسرا حکومتی آلہ۔ ٹراٹسکی ازم کے مخالف، بدنام زمانہ غیر انقلابی اور ماسکو کی گلیوں میں مارے مارے پھرنے والے فاشسٹ ___ یہ تمام عناصر حکومتی آلے سے مل گئے تھے۔ ایک پولیس والے نے مجھے خبردار کرنے کے بجائے میری کار پر گولی چلادی۔ مگر اس کے ہاتھ کے پیچھے کوئی دوسرا ہاتھ کام کر رہا تھا۔ فائر بریگیڈ کا ایک شرابی اہلکار بھاگتا ہوا آیا اور میری گاڑی کی سکرین سے ٹکرا گیا۔ ماسکو کی سڑکوں پر وقوع پذیر ہونے والے یہ سارے واقعات انقلاب دشمنوں کی ایک ریہرسل تھے۔

اسی قسم کا ایک جلوس لینن گراڈ میں بھی نکلا۔ زینوشیف اور راڈک جو اس میں شرکت کے لئے تھے، انہیں تحفظ دینے کے بہانے پکڑ کر جلوس کے عرصے تک ایک عمارت میں بند کر دیا گیا۔ زینوشیف نے اسی دن ہمیں ماسکو سے لکھا۔''تمام اطلاعات اشارہ کر رہی ہیں کہ یہ مظاہرہ ہمارے حق میں جائے گا۔ آپ لوگ بتائیں آپ کے ساتھ کیا ہوا؟ کارکنوں سے رابطے جاری ہیں۔ (خفیہ طور پر) ہمارے حق میں تبدیلی کے زبردست امکانات ہیں۔ ہمارا یہاں سے جانے کا ابھی کوئی ارادہ نہیں۔'' زینوشیف کی طرف سے جرات کا یہ آخری مظاہرہ تھا۔ اگلے دن وہ ماسکو آ کر ہتھیار ڈال دینے کی ضرورت پر لیکچر دے رہا تھا۔

16 ،نومبر کو جوفے نے خودکشی کر لی۔ اس سے ہماری جدوجہد کو زبردست دھچکا لگا۔ جوفے ایک بیمار آدمی تھا۔ اسے جاپان سے بڑی نازک حالت میں لایا گیا تھا جہاں وہ روسی سفیر تھا۔ اس کی تعیناتی میں بڑی رکاوٹیں ڈالی گئی تھیں۔ اگرچہ جاپان میں اس کا قیام بڑا مختصر تھا مگر یہ کسی طرح بھی سودمند ثابت نہ ہوا۔ جوفے چیف رعائتی کمشن میں میرا ڈپٹی رہا تھا۔ کام کا سارا بوجھ اسی پر ہوتا تھا۔ پارٹی میں بحران اس

پر بری طرح اثر انداز ہو رہا تھا۔ جو چیز اسے سب سے زیادہ پریشان کرتی تھی۔ وہ غداری تھی۔ وہ خود کو پارٹی کی جدوجہد میں غرق کر دینا چاہتا تھا۔ مگر اس کی صحت کے پیش نظر میں اسے روک لیتا۔ جوفے مستقل انقلاب کے نظریے کا زبردست حامی تھا۔ اسے ان لوگوں پر بے حد غصہ آتا جو اس نظریے کا پھل تو کھا رہے تھے مگر مستقبل میں کیا ہونے والا تھا اس پر نظر نہیں رکھتے تھے۔ جوفے نے ایک بار مجھے لینن سے اپنی گفتگو کے متعلق بتایا جو دونوں میں 1919 میں ہوئی تھی، اگر میں سال کے بارے غلطی پر نہیں ہوں۔ لینن نے اس سے کہا تھا۔ ''ہاں، ٹراٹسکی درست معلوم ہوتا ہے۔'' جوفے اس گفتگو کو شائع کرانا چاہتا تھا مگر میں اسے روک دیتا۔ اس پر مصیبت کا جو پہاڑ ٹوٹ پڑنا تھا مجھے اس کا انداز تھا۔ وہ بڑا مستقل مزاج آدمی تھا۔ ظاہری طور پر جس قدر نرم تھا، اندر سے اتنا ہی سخت جان تھا۔ ارادے کا بے حد پکا۔ ہر نئی جہالت اور سیاسی غداری کے بعد وہ غصے کی حالت میں منہ لٹکائے میرے پاس آجاتا اور کہتا۔ ''میں اسے لوگوں کے پاس لے جاؤں گا۔'' میں اس سے کہتا کہ ایسا کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ پارٹی کی نئی نسل کی تعلیم نو ضروری تھی۔ اسی طرح ہم آگے بڑھ سکیں گے۔

جوفے بیرون ملک اپنا علاج مکمل نہ کرا سکا۔ اس کی جسمانی حالت روز بروز خراب ہوتی گئی۔ موسم خزاں میں اس نے کام کرنا بند کر دیا۔ پھر وہ بستر پر لیٹ گیا۔ اس کے احباب نے اسے باہر بھیجنے کا سوال دوبارہ اٹھایا، مگر مرکزی کمیٹی نے صاف انکار کر دیا۔ سٹالن کے چیلے اس دفعہ حزب مخالف کو کسی اور طرف ہی بھیجنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ مرکزی کمیٹی اور بعد میں پارٹی سے میرے اخراج نے جوفے کو ایک بڑے صدمے سے دو چار کر دیا۔ اپنی جسمانی لاچارگی کے سبب وہ اپنے ذاتی اور سیاسی غصے ہی میں جلتا رہتا۔ وہ کسی غلطی کے بغیر جان گیا تھا کہ انقلاب داؤ لگ چکا تھا۔ لڑنا اب اس کے بس میں نہیں تھا، اور لڑائی کے بغیر زندگی بے کار تھی۔ یہی اس نے آخری نتیجہ اخذ کیا تھا۔

اس وقت تک میں کریملن سے نقل مکانی کر کے اپنے دوست بیلو بورڈوف کے گھر آ چکا تھا جو ابھی تک وزارت داخلہ کا انچارج تھا، مگر وہ جہاں جاتا جی، پی، یو کے ایجنٹ اس کے تعاقب میں ہوتے۔ بیلو بوروڈوف ان دنوں اپنے صوبے یورال میں گیا ہوا تھا جہاں وہ محنت کشوں کو حکمران ٹولے کے خلاف جدوجہد پر تیار کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ میں نے جوفے کو اس کے اپارٹمنٹ پر اس کا حال پوچھنے کے لئے فون کیا۔ اس نے خود فون اٹھایا جو اس کے بستر کے پاس پڑا تھا۔ اس کے لہجے میں

خبردار کر دینے والی کوئی چیز تھی۔اس نے خود فون اٹھایا جو اس کے بستر کے پاس پڑا تھا۔اس کے لہجے میں خبردار کر دینے والی کوئی چیز تھی۔اس نے مجھے اپنے پاس آنے کو کہا۔میں کسی وجہ سے فوری طور پر جا نہ سکا۔ ان طوفانی دنوں میں کامریڈ مجھے ملنے بیلو بوروڈوف کے گھر آتے اور اہم معاملات پر بات چیت کرتے رہتے تھے۔کوئی گھنٹے دو گھنٹے بعد ایک غیر مانوس آواز نے مجھے فون پر بتایا۔''اوڈلف ابراموویچ نے خود کو گولی مار لی ہے۔اس کے بستر کے پاس میز پر آپ کے لئے ایک خط رکھا ہے۔'' بیلو بوروڈوف کے گھر پر ہر وقت چند فوجی ڈیوٹی پر موجود رہتے اور جہاں میں جاتا میرے ساتھ لگے رہتے۔ہم فوراً جوفے کے گھر چل پڑے۔دروازے پر دستک دینے پر کوئی دروازے کے اندر سے ہمارے نام پوچھتا رہا۔پھر اس نے کچھ تاخیر سے دروازہ کھول دیا۔اندر پراسرار طور پر کچھ ہو رہا تھا۔میں نے دیکھا کہ اڈولف ابراموویچ کا پر سکون اور ملائم چہرہ خون میں لت پت پڑا تھا۔جی،پی،یو کا ایک رکن ''بی'' جوفے کے میز پاس کھڑا تھا۔ میز سے خط غائب ہو چکا تھا۔میں نے اس کی فوری واپسی کا مطالبہ کیا۔''بی'' بڑبڑایا کہ کوئی خط تھا ہی نہیں۔اس کی آواز بتاتی تھی کہ وہ جھوٹ بول رہا تھا۔چند منٹ میں شہر کے کونے کونے سے دوست وہاں پہنچنے لگے۔انہیں ہر طرف سے مخالفوں نے گھیر لیا تھا۔رات تک ہزاروں سوگوار آ چکے تھے۔خط کی چوری کی خبر سارے شہر میں پھیل گئی۔غیر ملکی اخباری نمائندے اپنے اخبارات کو خبر بھیجنے لگے۔اب خط کو چھپانا مشکل ہو گیا تھا۔آخر میں خط کی نقل راکوسکی کے حوالے کر دی گئی۔اصل خط کی جگہ اس کی نقل کیوں دی گئی، یہ وضاحت میرے لئے ناممکن ہے۔جوفے کو اپنے بارے میں میرے رویے کا علم تھا۔اسے مجھ پر بے حد اعتماد تھا جس کے باعث مجھے یہ حق حاصل تھا کہ میں اس کے خط سے جو سطر چاہتا، نکال دیتا۔خط کو چھپانے میں ناکامی پر دشمنوں نے ان سطروں کی تشہیر شروع کر دی حالانکہ وہ عوام کے لئے نہیں تھیں۔

جوفے نے اسی مقصد کے لئے جان دی جس کے لئے اس نے اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی۔جس ہاتھ سے اس نے اپنی کنپٹی پر پستول رکھ کر گولی چلائی تھی، اسی ہاتھ میں سے اس نے نصف گھنٹہ پہلے میرے لئے ایک مشورہ تحریر کیا تھا۔

''لیوڈیوی ڈووچ!

ہم دونوں عشروں سے رفیق کار رہے ہیں اور مجھے تمہاری دوستی پر فخر ہے۔یہی بات مجھے یہ بتانے کا حق دیتی ہے کہ تم کہاں غلطی پر ہو۔جس راستے پر تم گامزن ہو مجھے اس کے سیدھے ہونے پر کبھی شک نہیں

تھا۔تم جانتے ہو کہ مستقل انقلاب کے دنوں سے یعنی گذشتہ بیس برس سے میں نے تمہارا ساتھ دیا ہے۔ میں ہمیشہ سے جانتا تھا کہ تمہارے اندر لینن کی بعض خوبیاں ہیں۔یعنی اس کا غیر خم ارارادہ، اس کا ہار نہ ماننا، اس امید پر اپنے خیال کے مطابق راہ راست پر اکیلے ہی چلتے جانا کہ آگے چل کر لوگ آن ملیں گے، مگر اپنے راستے کے درست ہونے پر مکمل یقین ہونا۔سیاسی طور پر تم بالکل راستی پر ہو۔1905 سے میں تمہیں متعدد دفعہ بتا چکا ہوں کہ لینن نے تسلیم کیا تھا کہ سیاسی طور پر وہ نہیں بلکہ تم زیادہ درست تھے۔مرنے سے پہلے کوئی جھوٹ نہیں بولتا۔میں اب پھر دہرا رہا ہوں کہ ایک مبالغہ آمیز قیمت کے بدلے کسی معاہدے یا مصالحت کے عوض اپنی راستی مت کھو دینا۔سیاسی طور پر تم بالکل راستی پر ہو، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔پارٹی کو کسی دن اس بات کا احساس ہوگا اور تاریخ بھی اسے تسلیم کرے گی۔اگر آج کوئی تمہارا ساتھ چھوڑ جاتا ہے اور تمہاری امید کے مطابق لوگ تمہارے ساتھ نہیں آتے تو ہمت مت ہارنا۔تم راستی پر ہو، اور راستی کی فتح ہوتی ہے کسی غلط بات کے آگے سر نہ جھکانا۔راہ راست پر چلتے جانا اور مصالحت کو رد کر دینا۔لینن کی فتوحات کا راز یہی تھی۔میں نے تمہیں متعدد بار یہ بات بتانی چاہی۔لیکن اب آخری سلام کے طور پر ایسا کرنے کی خود میں ہمت پا رہا ہوں۔''

جوفے کی تجہیز وتکفین کا ایسا وقت رکھا گیا کہ ماسکو کے محنت کش اس میں حصہ نہ لے سکیں۔اس کے باوجود اس کے جنازے میں دس لاکھ لوگ شریک ہوئے اور یہ ایک طرح کا حزب مخالف کا جلوس بن گیا۔ اس اثنا میں سٹالن کا فریق یہ مسئلہ کانگریس میں لانے کی تیاری کرنے لگا کہ پارٹی میں تفریق پڑ چکی تھی۔ مقامی کونسلوں کے نام نہاد انتخابات جن کے ذریعے کانگریس میں وفد بھیجے جانے تھے، وقت سے پہلے ہی کرا لئے گئے جن میں ڈھنڈ وچیوں اور فاشسٹوں کو جلسے جلوس خراب کرنے کے لئے منتخب کر لیا تھا۔ پندرھویں کانگریس کی جس طرح تیاریاں کی گئیں اس سے زیادہ توہین آمیز کوئی بات نہیں ہو سکتی تھی۔ زینوشیف اور اس کے حواریوں کو یہ اندازہ کرنے میں ذرا مشکل پیش نہ آئی کہ اکتوبر انقلا کی دسویں سالگرہ پر ماسکو اور لینن گراڈ میں حزب مخالف نے اپنی طاقت کا جو مظاہرہ کیا تھا کانگریس میں اس کی مذمت کی جائے گی۔زینوشیف اور اس کے حواریوں کو یہی تشویش لگی تھی کہ وقت سے پہلے معافی مانگ لی جائے۔ سٹالن اور اس کی نوکر شاہی کو یہ سمجھنے میں غلطی نہیں ہوتی تھی کہ زینوشیف اور اس کے حواری نہیں بلکہ حزب مخالف کا وہ بڑا گروہ ان کا اصل دشمن تھا جس کا تعلق مجھ سے تھا۔انہوں نے پندرھویں کانگریس کے موقع

پر مجھ سے قطع تعلق کا اعلان کر کے سٹالن سے مراعات نہ سہی معافی تو حاصل کر لینی تھی۔ وہ اپنی کوتاہ نظری سے یہ نہ دیکھ سکے کہ دوہری غداری سے انہوں نے اپنی سیاسی موت خود خرید لی تھی۔ انہوں نے ہمارے پشت میں چھرا گھونپ کر ہمیں وقتی طور پر کمزور کر دیا لیکن وہ اپنی سیاسی موت خود مر گئے۔

پندرھویں کانگریس میں پورے کا پورا حزب مخالف پارٹی سے نکال دیا اور نکالے جانے والوں کو جی، پی، یو کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا۔

جلاوطنی

وسطی ایشیا میں اپنی جلاوطنی کی داستان میں اپنی بیوی کی زبانی سنانا چاہوں گا۔

''16 جنوری 1928 ساری صبح سامان باندھنے میں گزر گئی۔ مجھے بخار تھا جس کی وجہ سے میرا سر چکرا رہا تھا۔ میں جسمانی کمزوری محسوس کمزور محسوس کر رہی تھی۔ کریملن سے لایا ہوا سامان میرے آس پاس بکھرا پڑا تھا جس میں سے کچھ ساتھ لے جانا تھا۔ فرنیچر، صندوق، کپڑے کتابیں ___ پھر احباب اور ملاقاتوں کا ہجوم تھا جو ہمیں الوادع کہنے آ رہے تھے۔ ہمارا ڈاکٹر دوست ایف، اے، گوئٹر مجھے زکام اور نزلے کے سبب روانگی ملتوی کرنے کو کہہ رہا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ ہمارا سفر کس نوعیت کا تھا اور اسے ملتوی کرنے کا کیا مطلب تھا۔ مجھے امید تھی کہ میں ٹرین میں ٹھیک ہو جاؤں گی کیونکہ یہاں گھر پر جو حالات تھے، ان میں میرا بہتر ہونا مشکل تھا۔ ایسے چہرے ہماری آنکھوں کے سامنے سے گزر رہے تھے جنہیں میں پہلی مرتبہ دیکھ تھی۔ بغل گیر ہونا، مصافحہ کرنا، ہمدردی کے جذبات اور نیک خواہشات ___ یہ سب جاری تھا۔

لوگ پھول، کتابیں، مٹھائی، گرم کپڑے لا رہے تھے۔ مگر اب مصروف اور تناؤ بھرے دن ختم ہو رہے تھے۔ ہمارا سامان ریلوے سٹیشن دیا گیا تھا۔ احباب وہاں پہنچ چکے تھے۔ ہم کھانے کے کمرے میں بیٹھے جانے کو تیار تھے اور جی، پی، یو کے ایجنٹوں کا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے نو ہو رہے تھے۔ پھر دس بج گئے۔ یہ تو گاڑی کی روانگی کا وقت تھا۔ کیا ہو گیا تھا؟ روانگی موقوف تو نہیں ہو گئی تھی؟ پھر فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ جی، پی، یو ہمیں مطلع کرتا ہے کہ ان جانی وجوہات کے باعث ہماری روانگی ملتوی کر دی گئی تھی۔ مگر کتنے عرصے کے لیے؟ ایل، ڈی پوچھتا ہے۔ دو دن کے لئے۔ جواب ملتا ہے۔

اب ہمیں پرسوں جانا ہوگا۔

احباب ریلوے سٹیشن سے واپس آ رہے ہیں۔ راووسکی اور دوسرے احباب۔ معلوم ہوا کہ سٹیشن پر بہت بڑا مظاہرہ ہوا تھا۔ عوام ''ٹراٹسکی زندہ باد'' کے نعرے لگا رہے تھے۔ لیکن ٹراٹسکی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ کہاں تھا؟ ہمارے لئے مخصوص ڈبے کے گرد بے پناہ ہجوم تھا۔ لوگوں نے ڈبے کی چھت پر ٹراٹسکی کا ایک بڑا پورٹریٹ لگا دیا تھا۔ اس پر الوداعی نعرے تحریر تھے۔ ٹرین ایک جھٹکے کے ساتھ اپنی جگہ سے ہلی اور پھر ٹھہر گئی۔ مظاہرین گاڑی کے سامنے کھڑے ہو گئے تھے۔ انہوں نے ڈبوں سے چمٹ کر گاڑی کو روک لیا تھا۔ وہ ٹراٹسکی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ افواہ پھیل گئی کہ جی، پی، یو کے آدمی ٹراٹسکی کو خفیہ طور پر اس کے ڈبے میں لے گئے تھے اور ٹراٹسکی کو لوگوں کے سامنے آنے سے روک رہے تھے جو اسے دیکھنے اور الوادع کہنے سٹیشن پر جمع تھے۔ ریلوے سٹیشن پر لوگوں کا جوش اور ولولہ دیدنی تھا۔ لوگوں کا پولیس اور جی پی یو کی ایجنٹوں سے تصادم ہوا۔ دونوں طرف سے جانی نقصان ہوا تھا۔ گرفتاریاں ہوئی تھیں۔ پولیس اور جی پی یو کے اہلکار لوگوں کو ٹرین کے سامنے آنے سے روک رہے تھے۔ گاڑی کو ڈیڑھ گھنٹے تک روکے رکھا گیا۔ کچھ عرصہ بعد ہمارا سامان واپس آ گیا۔ پھر احباب کے فون آنے لگے۔ وہ بتا رہے تھے کہ سٹیشن پر کیا ہوا تھا۔ نصف رات کے بعد ہمیں سونے کا موقع ملا۔

''گذشتہ دنوں کی دوڑ بھاگ کے بعد ہم گیارہ بجے تک سوئے رہے۔ کوئی فون نہ آیا۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ ہماری بڑی بہو اپنے کام پر چلی گئی۔ اب روانگی کے لئے دو دن پڑے تھے۔ ابھی ناشتہ ختم کیا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ ہیلو بورودوفا کی بیوی کا فون تھا۔ پھر جوفے کی بیوی کا فون آ گیا۔ پھر ایک فون، اس کے بعد سارا اپارٹمنٹ جی، پی، یو کے سفید کپڑوں والے آدمیوں سے بھر گیا۔ ایل، ڈی کو ایک آرڈر دیکھایا گیا جس کے تحت اسے گرفتار کر کے الما تا لے جایا جا رہا تھا۔ مگر ان دو دنوں کا کیا ہوا جب ہماری روانگی ہونی تھی؟ ایک اور دھوکہ۔ شاید اگلی روانگی پر مظاہرے سے بچاؤ کے لئے ایسا کیا گیا تھا۔ فون مسلسل بج رہا تھا۔ اب اس کے پاس جی، پی، یو کا ایک ایجنٹ کھڑا تھا جو ہمیں فون سننے سے روک رہا تھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ ہم بیلو بورودوف کو یہ بتانے میں کامیاب ہو گئے کہ ہمارا گھر پولیس سے بھرا ہوا تھا اور ہمیں زبردستی کہیں لے جایا جا رہا تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ یہ سب بخارن کا کیا دھرا تھا۔ سٹالن کے چیلے سے یہ امید کی جا سکتی تھی۔

''ایجنٹ بھی بظاہر جذباتی دکھائی دیتے تھے۔ ایل، ڈی نے اس طرح جانے سے انکار کر دیا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر وہ صورتحال کو واضح کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ پولٹ بیورو ایل، ڈی کی جلاوطنی کو ایسی شکل دے رہا تھا جیسے یہ رضامندانہ تھی۔ پارٹی کارکنوں کو بھی یہی بتایا جا رہا تھا۔ حقیقت کو سامنے لانا ضروری تھا۔ مگر اس طریقے سے کہ کوئی ہنگامہ وغیرہ نہ ہو۔ ایل، ڈی کے اسی فیصلے نے مخالفین کو قوت استعمال کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ہم دو مہمانوں کے ساتھ ایک کمرے میں بند ہو گئے اور بند دروازوں کے اندر ہی سے جی، پی یو، کے آدمیوں سے مذاکرات ہونے لگے۔ ایجنٹوں کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں۔ وہ اپنے افسروں سے فون پر بات کرتے اور انہیں صورتحال سے آگاہ کرتے۔ آخر حکم پر عمل درآمد کے لئے دروازہ توڑ کر کمرے میں داخل ہونے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس عرصے میں ایل، ڈی حزب مخالف کے لوگوں کو اگلے اقدام کے بارے میں بتاتا رہا۔ دروزہ بند رہا۔ پھر ہتھوڑے کی آواز آئی۔ دروازہ ٹوٹ گیا اور وردی میں ملبوس ایک آدمی اندر داخل ہوا۔ ''مجھے گولی مار دیں، کامریڈ ٹراٹسکی مجھے گولی ماردیں۔'' وہ ایک سابقہ افسر تھا جو ایل، ڈی کے ساتھ محاذوں پر دورے پر جایا کرتا تھا۔ ''یہ کیا بکواس ہے، کسکسن۔'' ایل، ڈی نے تحمل سے کہا۔ ''تمہیں گولی مارنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم اپنا کام کرو۔'' پھر دوسرے ایجنٹ بھی گھبراہٹ اور ہیجانی حالت میں اندر داخل ہو گئے۔ ایل، ڈی کے پیروں میں سلیپر تھے۔ انہوں نے اس کے جوتے ڈھونڈ کر اسے پہنائے۔ پھر انہوں نے اسے فرکوٹ اور ٹوپی پہنائی۔ ایل، ڈی نے جانے سے انکار کر دیا۔ وہ اسے بازوؤں میں اٹھا کر چل پڑے۔ ہم بھی پیچھے چل پڑے۔ میں پھسل پڑی اور میرے عقب میں دروازہ بند ہو گیا۔ پھر مجھے ہلچل اور شور کی آواز سنائی دی۔ میں نے چیخ کر ان آدمیوں سے کہا کہ وہ میرے بیٹوں کو چھوڑ دیں۔ بڑے بیٹے نے ہمارے ساتھ جلاوطنی میں رہنا تھا۔ دوروازہ کھلا اور میرے بیٹے اندر آ گئے۔ ان کے ساتھ مہمان خواتین بھی تھیں، بیلولو بورودوفا اور جوفے کی بیویاں___ سروزا انہیں اپنی طاقت کے بل پر اندر لایا تھا۔ سیڑھیاں اترتے وقت میرا دوسرا بیٹا لودوا تمام اپارٹمنٹوں کی گھنٹیاں بجاتا اور چلاتا رہا۔ ''وہ کامریڈ ٹراٹسکی کو لے جا رہے ہیں۔ اس عمارت میں باعزت اور معتبر روسی رہتے تھے۔ ہم سب کو ایک ہی گاڑی میں ٹھونس دیا گیا۔ سروزا کی ٹانگیں مشکل سے اندر آئیں۔ بیلولو بورودوافا بھی ہمارے ساتھ تھا۔

گاڑی ماسکو کی سڑکوں پر چلتی رہی۔ خون جما دینے والی سردی تھی۔ سروزا نے ٹوپی نہیں پہنی ہوئی

تھی۔اسے اس کا وقت ہی نہیں ملا تھا۔کسی کے پاس دستانے بھی نہیں تھے۔کوئی سفری بیگ یا دستی تھیلا بھی نہیں تھا۔سب خالی ہاتھ تھے۔ہمیں تازان کے ریلوے سٹیشن نہیں بلکہ کسی دوسری طرف لے جایا جا رہا تھا۔بعد میں کھلا کہ ہم یاروسلوف ریلوے سٹیشن کی طرف جا رہے تھے۔سروزا نے اس ارادے سے گاڑی سے باہر چھلانگ لگانے کی کوشش کی کہ وہ اپنے بھائی کی بیوی کو اس کے دفتر میں جا کر بتا آئے کہ وہ لوگ ہمیں لے جا رہے تھے۔سپاہی نے اسے بازو سے پکڑ کر ایل،ڈی سے درخواست کی وہ بیٹے کو ایسی حرکت کرنے سے روکیں۔ہم سٹیشن پر پہنچ گئے جو بالکل خالی پڑا تھا۔سپاہیوں نے ابھی تک ایل ڈی کو بازوؤں میں اٹھایا ہوا تھا۔لوفا ریلوے کے محنت کشوں کو دیکھ کر چلانے لگا۔''وہ کامریڈ ٹراٹسکی کو لے جا رہے ہیں۔'' ایک سپاہی جو کبھی ایل، ڈی کے ساتھ شکار پر جایا کرتا تھا، وہ لوفا کو گردن سے پکڑ کر چلایا۔ ''کپڑے! چپ ہو جاؤ۔'' سروزا نے اس نے منہ پر مکا جڑ دیا۔ہمیں ڈبے میں بٹھا دیا گیا۔سپاہی ڈبے کی چاروں طرف اور دروازے میں کھڑے تھے۔دوسرے ڈبوں میں جی، پی، یو کے آدمی تھے۔ہم کہاں جا رہے تھے؟ کسی کو کچھ پتا نہیں تھا۔ہمارا سامان ابھی آیا نہیں تھا کہ انجن ہمارا اکیلا ڈبہ لے کر چل پڑا۔دوپہر کے دو بجے تھے۔پھر ہمیں معلوم ہوا کہ ہمیں ایک گمنام سے سٹیشن پر لے جایا جا رہا تھا۔وہاں ہمارے ڈبے کو ماسکو سے قازان جانے والی ٹرین کے ساتھ جوڑ دیا جائے گا۔ہماری آخری منزل الما تا تھی۔پانچ بجے ہم نے سروزا اور بیلو بورودوفا کو الوادع کہا جنہوں نے ماسکو واپس جانا تھا۔

''ہمارا سفر جاری رہا۔مجھے بخار تھا۔ایل، ڈی خوش مزاجی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔صورتحال نے ایک واضح شکل اختیار کر لی تھی۔دھند چھٹ گئی تھی۔ہمارے ساتھ جانے والا سرکاری عملہ مہذب اور ہمدرد تھا۔ہمیں بتایا گیا کہ ہمارا سامان دوسری ٹرین سے آ رہا تھا جو ہمیں فرونزے میں مل جائے گا۔یہاں ہمارا ریلوے کا سفر ختم ہو جانا تھا۔یعنی نویں دن۔ہم نے نہ تو کپڑے بدلے تھے اور نہ ہی ہمارے پاس کوئی کتاب تھی۔میرے دونوں سیکریٹریوں سرمسک اور پزنانسکی نے کس پیار سے ہماری کتابیں چن چن کر رکھی تھیں۔اسی پیار سے سرمسک نے ایل، ڈی کا لکھنے کا سامان رکھا تھا۔وہ ایل، ڈی کے ذوق سے بخوبی واقف تھا۔اس نے ایل، ڈی کے سٹینوگرافر اور سیکریٹری کی حیثیت سے اس کے ساتھ متعدد دورے کیے تھے۔اب ہمیں ایک ایسا سفر درپیش تھا جس میں ہمارے کتاب، قلم، کاغذ کچھ بھی نہیں تھا۔ماسکو سے روانہ ہونے سے پہلے سروزا ہمارے لیے ترکمانستان پر لکھی ہوئی سمرونوف، تان شان نسکی جو ایک سائنس دان

تھا، کی کتاب لایا تھا تاکہ ہم اس کا مطالعہ کر کے اپنی مستقبل کی جائے رہائش کا اندازہ کر سکیں جس کے بارے میں ہم بہت تھوڑا جانتے تھے۔ لیکن وہ کتاب دوسرے سامان کے ساتھ ماسکو ہی میں رہ گئی تھی۔ اب ہم گاڑی میں خالی ہاتھ بیٹھے تھے، جیسے شہر ہی کے ایک حصے سے دوسرے حصے میں جا رہے ہوں۔ رات کو ہم ہاتھوں کو سرہانہ بنا کر سر اس پر ٹکا دیتے۔ ڈبے کے نیم وا دروازے پر ایک سنتری پہرے پر موجود رہتا۔

''آنے والے زمانے میں ہمارے لیے نہ جانے کیا کچھ رکھا ہوا تھا؟ ہمارا سفر کہاں ختم ہوگا؟ ہماری جلاوطنی کیسی ہوگی؟ ہمارے حالات کیسے ہوں گے؟ آغاز تو کچھ اتنا اچھا نہیں تھا۔ اس کے باوجود ہم پر سکون تھے۔ ٹرین ہموار رفتار سے چلتی رہی۔ ہم اس کی سیٹوں پر لیٹے رہے۔ ادھ کھلا دروازہ ہمیں یاد دلاتا رہا کہ ہم قیدی تھے۔ ہم گذشتہ دنوں کی حیرانیوں، غیر یقینیوں اور تناؤ سے تھک کر اب آرام کر رہے تھے۔ ہر شے خاموش تھی۔ پہرے دار بھی چپ چاپ کھڑا تھا۔ میری طبعیت ناساز تھی۔ ایل، ڈی مجھے پر سکون کرنے کی خاطر اپنی طرف سے ہر کوشش کر رہا تھا مگر اس کے پاس اپنی خوش مزاجی میرے اندر سرایت کرنے کے سوا اور کیا تھا۔ وہ ہر چیز سے بے نیاز ہو کر مزے کے موڈ میں تھا۔ لوفا ساتھ والے ڈبے میں تھا۔ ماسکو میں اس نے خود کو حزب مخالف کے کام میں پوری طرح گم کر رکھا تھا۔ اب وہ ہمارا دکھ ہلکا کرنے ہمارے ساتھ تھا۔ اسے اپنی بیوی کو بھی الوادع کہنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ باہر کی دنیا سے ہمارے تعلق کا وہی وسیلہ رہ گیا تھا۔ اب ڈبے میں تقریباً اندھیرا تھا۔ مدھم روشنیاں دروازے میں جل رہی تھیں۔ ہمارا سفر مشرق کی طرف جاری تھا۔

''جوں جوں ہم ماسکو سے دور ہو رہے تھے، سرکاری عملہ زیادہ خوش اسلوبی سے پیش آنے لگا تھا۔ سمارا پہنچنے پر وہ ہمارے لیے زیر جامے، صابن، ٹوتھ پیسٹ اور ٹوتھ برش خرید کر لے آیا۔ ہمارا کھانا سٹیشن کے ریسٹورنٹ سے آیا۔ ایل، ڈی جو اپنے کھانے کے متعلق بڑا محتاط تھا، اب بلا امتیاز ہر شے کھائے جا رہا تھا۔ لوفا اور مجھ سے گپیں لگا رہا تھا۔ میں حیرت اور تشویش سے اسے دیکھ رہی تھی۔ سمارا میں جو چیزیں خریدی گئی تھیں، ان کے خاص نام رکھے گئے۔ تولیے کا نام سن زنگی (جو اس وقت جی، پی یو کا سربراہ تھا) جرابوں کا نام یا گودا (من زنگی کا ڈپٹی) اور اسی طرح دوسری اشیا کے نام رکھے گئے۔ چیزوں کو ان ناموں سے پکارنے پر ہمیں خوشی ہوتی تھی۔ برف باری کے سبب ٹرین سست رفتار ہو گئی تھی۔ ہم ہر روز وسطی ایشیا

کہ گہرائی میں داخل ہو رہے تھے۔

''ماسکو چھوڑنے سے پہلے ایل، ڈی نے اپنے دونوں نائب ساتھ لے جانے کی اجازت طلب کی تھی جو نامظور ہوگئی تھی۔ لہٰذا اب سرمسک ار پزنانسکی آزادانہ حیثیت سے ہماری ٹرین میں سفر کر رہے تھے۔ ہماری پہلی روانگی کے وقت وہ غلطی سے ایک دوسرے ڈبے میں بیٹھ گئے تھے۔ باہر مظاہرے ہو رہے تھے۔ مگر وہ اپنی جگہ پر بیٹھے رہے۔ ان کا خیال تھا کہ ہم اس گاڑی میں سوار ہو چکے تھے۔ بعد میں انہیں معلوم ہوا کہ ہمیں تو سٹیشن پر جانے ہی روک دیا گیا تھا۔ وہ آریز کے سٹیشن پر اتر کر ہمارا انتظار کرنے لگے۔ جب ہماری گاڑی وہاں پہنچتی تو وہ ہمارے منتظر تھے۔ لوفا جسے گھومنے پھرنے کی آزادی تھی، اس نے انہیں دیکھ لیا۔ ہمیں بھی انہیں دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ اس منظر کا حال میرے بیٹے کی زبان سے سنیں۔

''صبح ہوتے ہی میں گاڑی سے اتر کر سٹیشن کی طرف ان کا مریڈوں کی تلاش میں چل پڑا جن کے متعلق ہم بڑے متفکر تھے۔ وہاں وہ کھانے کے کمرے میں بیٹھے شطرنج کھیل رہے تھے۔ میری خوشی ناقابل بیان تھی۔ میں نے انہیں اشارے سے سمجھایا کہ میرے نزدیک نہ آئیں۔ مجھے کھانے کے کمرے میں دیکھ کر جاسوسوں کی سرگرمیوں بڑھ گئیں۔ میں یہ خوش خبری دینے ڈبے کی طرف تیز تیز قدموں چل پڑا۔ اس دریافت پر سب کو بڑی خوشی ہوئی۔ اب ایل، ڈی کے لئے ان سے ناراض رہنا مشکل ہوگیا تھا۔ بات یہ تھی کہ دونوں نے اس کی ہدایت کی خلاف ورزی کی تھی۔ اب دونوں کو سفر جاری رکھنے کے لئے کہا گیا۔ مگر وہ وہاں سٹیشن پر ہمارا انتظار کر کے غیر ضروری خطرہ مول لے رہے تھے۔ ایل، ڈی سے مشورے کے بعد میں نے ایک خط لکھا جو میں اندھیرے کی آڑ میں ان کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔ خط میں انہیں یہ ہدایت دی گئی تھی: پزانسکی ہم سے الگ ہوکر فوراً تاشقند چلا جائے۔ اور وہاں ہماری دوسری ہدایت کا انتظار کرے۔ سرمسک ہمیں ملے بغیر الماتا چلا جائے۔ میں سرسری طور پر گزرتے ہوئے سرمسک سے یہ کہنے میں کامیاب ہوگیا کہ وہ مجھے سٹیشن کی عمارت کے عقب میں اندھیرے کونے میں ملے۔ اس کی جگہ پزنانسکی وہاں آ گیا۔ پہلے تو ایک دوسرے کو دیکھ نہ سکنے کے سبب پریشان ہوگئے۔ مگر ملنے پر ہم اتنی جلدی بول رہے تھے کہ ایک دوسرے کی بات کاٹے جا رہے تھے۔ میں نے اس سے کہا۔ ''دروازے توڑ دو اور اسلحہ اندر لے کر جانا تھا۔ میرے پاس وضاحت کا وقت نہیں تھا۔ ہم پکڑے جانے کے خوف کا شکار

تھے۔ ہماری ملاقات بے سود ثابت ہوئی۔''

''آریز کے سٹیشن پر بااعتماد دوستوں کے مل جانے سے ہمارا سفر اطمینان سے طے ہونے لگا۔ اندر سے ہم خوش بھی تھے۔ دسویں دن ہمیں ہمارا سامان مل گیا۔ میں نے جلدی سے سمز ونوف، تران شانسکی کی کتاب نکالی اور جلدی سے الماتا کا محل وقوع دیکھا، وہاں کی آبادی معلوم کی، سیبوں کے باغات کی جانکاری حاصل کی اور یہ جان بڑی خوشی ہوئی کہ اس کے گردونواح میں بہت سی شکارگاہیں بھی تھیں۔ پھر ایل، ڈی نے اپنے لکھنے کا سامان نکالا۔ ہم صبح سویرے فرونزے (پشپک) پہنچ گئے۔ یہ آخری ریلوے سٹیشن تھا۔ ڈبے سے باہر بدن کو کاٹنے والا کہرا تھا۔ سورج کی شاعین سفاف برف پر اس طرح پڑ رہی تھیں کہ آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ ہمیں بڑے بوٹ اور بھیڑ کی کھال کی ٹوپیاں دے دی گئیں۔ کپڑوں کے بوجھ تلے میرے لئے سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔ اس کے باوجود سردی بدن کو کاٹ رہی تھی۔ ہماری بس سڑک پر بڑی آہستگی سے چل رہی تھی۔ اس کے ٹائروں کے نیچے برف چیخ رہی تھی۔ ہماری بس سڑک پر بڑی آہستگی سے چل رہی تھی۔ اس کے ٹائروں کے نیچے برف چیخ رہی تھی۔ سرد ہوا ہمارے چہروں پر تھپیڑے مار رہی تھی۔ تیس کلومیٹر چلنے کے بعد ہم رک گئے۔ اب اندھیرا چھا گیا تھا اور ہم برف سے بھرے ایک صحرا کے وسط میں تھے۔ دو سپاہی حفاظتی عملہ دس بارہ سپاہیوں پر مشتمل تھا) ہمارے پاس آئے اور بتایا کہ رات گزارنے کی جگہ کوئی ایسی اچھی نہیں تھی۔ ہم بمشکل بس سے اترے اور اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے قدموں کے ساتھ ڈاک خانے کے دروازے پر پہنچے اور اندر داخل ہو کر اپنی ٹوپیاں اتار دیں جس سے قدرے سکون محسوس ہوا۔ لیکن کمرے کو گرم رکھنے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ کھڑکیوں پر برف جمی ہوئی تھی۔ ایک کونے میں ایک بڑا روسی چولھا تھا، مگر افسوس وہ بھی برف کی طرح سرد تھا۔ ہم چائے اور تھوڑا بہت کھانے سے خود کو گرم رکھنے کی کوشش میں لگے رہے۔ پھر ہم ڈاک خانے کی عمارت میں موجود کوسک خاتون سے باتیں کرنے لگے۔ ایل، ڈی اس سے کئی طرح کے سوال اور شکار کے بارے میں پوچھتا رہا۔ اس کے جوابات سے ہمارے تجسس میں اضافہ ہو رہا تھا۔ بڑی بات یہ تھی کہ ہمیں خود بھی پتا نہیں تھا۔ کہ ہمارے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ پھر ہم سونے کی تیاری میں لگ گئے۔ حفاظتی عملے نے قریب ہی کہیں پناہ ڈھونڈ لی تھی۔ لوفا ایک بنچ پر دراز ہو گیا۔ ایل، ڈی اور میں ایک بڑے میز پر بھیڑ کی کھالوں کے بستر پر لیٹ گئے۔ جب ہم سب نیچی چھت کے نیچے آرام سے لیٹ گئے تو ایک دم میری ہنسی چھوٹ

پڑی۔ ''یہ جگہ کریملن کے اپارٹمنٹ سے کس قدر مختلف ہے۔'' میں نے کہا۔ ایل، ڈی اور لوفا بھی میرے ساتھ ہنسنے لگے۔

صبح ہوتے ہی ہم دوبارہ اپنے سفر پر چل پڑے۔ اب ہمارے سامنے سفر کا سب سے مشکل حصہ تھا۔ ہم نے کردے پہاڑوں کا سلسلہ عبور کیا۔ سردی سے بدن کٹ رہا تھا۔ کپڑوں کا بوجھ یوں نا قابل برداشت تھا۔ جیسے ہم پر کوئی دیوار گر پڑی تھی۔ اگلی منزل پر چائے کے لئے رکے تو ہم گاڑی کے شوفر اور جی، پی، یو کے ایجنٹوں سے باتیں کرنے لگے۔ یہ لوگ ہمیں ملنے الما تا سے آئے تھے۔ باتوں کے دوران میں مستقبل کی اجنبی اور بے نام زندگی ہم پر کھلنے لگی۔ گاڑی کے لئے راستہ بڑا مشکل تھا۔ لیکن ڈرائیور بڑی مہارت سے گاڑی چلاتا رہا۔ وہ سڑک کو بخوبی جانتا تھا اور خود کو واڈکا سے گرم کیے ہوئے تھا۔ رات پڑنے پر کہرا زیادہ ہوگیا۔ اب ہر شے کا انحصار ڈرائیور پر تھا۔ وہ واڈکا کے نشے میں حکمرانوں اور ان کے ہتھکنڈوں پر برسنا شروع ہوگیا۔ الما تا سے آئے ہوئے اہلکار اس کی منت سماجت کرنے لگے کہ وہ انہیں بحفاظت ان کے گھروں تک پہنچا دے۔ رات کے تین بجے بس ایک جگہ گھپ اندھیرے میں رک گئی۔ ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے تھے۔ مگر کہاں؟ معلوم ہوا کہ ہم گوگول سٹریٹ میں ''ہوٹل ڈیزی سا'' کے سامنے کھڑے تھے۔ یہ گوگول کے زمانے کی ہوٹل نما عمارت تھی۔ اس میں ہمیں دو کمرے دے دیے گئے۔ ملحقہ کمروں میں حفاظتی عملہ اور جی، پی، یو کے ایجنٹ ٹھہر گئے۔ لوفا نے سامان کی پڑتال کی تو معلوم ہوا کہ کپڑوں اور کتابوں کے دو صندوق راستے میں برف میں کہیں کھو گئے تھے۔ ان میں چین اور ہندوستان کے متعلق کتابیں اور نقشے تھے۔ لکھنے کا سارا سامان بھی انہیں میں تھا۔ پندرہ آدمیوں کی آنکھیں سامان پر تھیں۔ اس کے باوجود اس کا ایک حصہ گم ہوگیا تھا۔

''لوفا صبح کو ارد گرد کا جائزہ لینے نکلا۔ وہ جلد ہی شہر کی حدود اربعہ سے واقف ہوگیا۔ سب سے پہلے وہ تار گھر دیکھ کر آیا جو مستقبل میں ہماری زندگی کا محور ٹھہرنا تھا۔ اس نے سٹیشنری کا دکان تلاش کی جہاں سے کاغذ، قلم، اور لکھنے کا باقی سامان خریدنا تھا۔ اسی طرح دودھ، مکھن اور ڈبل روٹی کی خریداری کے لئے ایک بیکری ڈھونڈ لی گئی۔ پہلے چند روز، ایل، ڈی اور میں کمرے سے باہر نہ نکلے۔ بعد میں ہم شام کے وقت ہلکی پھلکی سیر کے لئے نکل جاتے۔ بیرونی دنیا سے ہمارا سارا رشتہ ہمارے بیٹے کی وساطت سے قائم تھا۔

''ہمارے لئے کھانا ایک قریب جگہ سے آتا۔ لوفا سارا دن مصروف رہتا۔ ہم بے صبری سے اس کے منتظر رہتے۔ وہ اخبار خرید کر لے آتا جس سے ہمیں شہر کی زندگی کے بارے میں کچھ معلوم ہوتا رہتا۔ ہم جاننا چاہتے تھے۔ کہ کیا سرمسک الما تا پہنچ گیا تھا۔ اپنی آمد کی چوتھی صبح برآمدے میں ہمیں ایک مانوس آواز سنائی دی۔ یہ آواز ہمیں کس قدر پیاری تھی۔ ہم دروازے کے عقب سے سرمسک کی آواز اور قدموں کی مانوس چاپ سنتے رہے۔ اس کے آنے سے ہمارے سامنے متعدد نئے امکانات کھل گئے۔ اسے ہمارے سامنے والا کمرہ مل گیا۔ میں کمرے میں سے نکل کر برآمدے میں آئی۔ اس نے دور ہی سے جھک کر مجھے سلام کیا۔ ہم ابھی اس سے بات کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ بس خاموشی سے ایک دوسرے کے قرب کا لطف اٹھاتے رہے۔ اگلے دن ہم نے چوری چھپے اسے اپنے کمرے میں بلا لیا اور ہم پر جو کچھ گزری تھی اس کا حال اسے جلدی جلدی بتایا اور مستقبل کا منصوبہ بنایا۔ مگر وہ منصوبہ بڑا مختصر ثابت ہوا۔ اسی رات دس بجے ڈرامے کا ڈراپ سین ہو گیا۔ ہوٹل میں بے حد خاموشی تھی۔ ایل، ڈی اور میں کمرے میں بیٹھے تھے۔ کمرے کا دروازہ ادھ کھلا تھا کیونکہ ہیٹر نے کمرے کو زیادہ ہی گرم کر دیا تھا۔ لوفا اپنے کمرے میں تھا۔ ہال میں ربڑ کے بوٹوں کی نرم اور محتاط آواز سنائی دی۔ ہم اسے غور سے سننے لگے۔ (بعد میں معلوم ہوا کہ لوفا بھی اپنے کمرے میں اس آواز کو سن رہا تھا) وہ آ رہے ہیں۔ میرے ذہن میں ایک دم آیا۔ ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے کوئی سرمسک کے کمرے میں دستک دیئے بغیر داخل ہو گیا اور اس کے کہنے لگا۔ ''جلدی کرو۔'' پھر سرمسک کی آواز آئی۔ ''مجھے کم از کم بوٹ تو پہن لینے دو۔'' ظاہر ہے وہ سیلپروں میں ہوگا۔ پھر وہی نرم اور بے آواز قدم۔ اس کے بعد ایک گہری خاموشی۔ بعد میں ہوٹل کا چوکیدار آیا اور اس نے سرمسک کا کمرہ مقفل کر دیا۔ اس کے بعد ہم نے اسے کبھی نہ دیکھا۔ اسے چند ہفتے الما تا میں جی، پی، یو کی عمارت کے تہ خانے میں دوسرے مجرموں کے ساتھ نیم فاقہ کشی کی حالت میں رکھا گیا۔ پھر اسے ماسکو منتقل کر دیا گیا جہاں اسے پچیس کوپک روزانہ گزارے کے لئے دیے جاتے۔ ان سے تو وہ ایک روٹی بھی نہیں خرید سکتا تھا۔ بزنانسکی کو بھی انہیں دنوں تاشقند میں گرفتار کر کے ماسکو لے جایا گیا۔ تین ماہ بعد ہمیں دونوں کی خبر ملی کہ وہ جلاوطنی کی حالت میں کس جگہ تھے۔ جب انہیں مشرق کی طرف لے جایا جا رہا تھا تو محض حسن اتفاق سے دونوں کو ٹرین کے ایک ڈبے میں آمنے سامنے والی سیٹوں پر بٹھا دیا گیا۔ ایک عرصہ جدا رہنے کے بعد وہ تھوڑی دیر کے لئے دوبارہ ملے۔ مگر زندگی بھر بچھڑ جانے کے لئے۔ پھر انہیں جلاوطن کر کے

مختلف جگہوں پر بھیج دیا گیا۔

''اس طرح ایل، ڈی اپنے نائبوں کے بغیر رہ گیا۔ انہیں ایل، ڈی سے وفادار رہنے کی سخت سزا ملی تھی۔ شریف النفس گلازمان کو 1924 کے ابتدا میں خودکشی پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ سرمسک اور پوزنانسکی جلاوطن ہو گئے تھے۔ محنتی اور خاموش طبع بوتوف کو گرفتار کر کے جھوٹا بیان دینے پر مجبور کیا گیا۔ اسے جیل کے ہسپتال میں بھوک ہڑتال پر مجبور کر دیا گیا جس کے نتیجے میں اس کی موت واقع ہو گئی۔ ایل، ڈی کے سیکریٹریٹ کے یہی لوگ تھے جنہیں ایل، ڈی کے دشمن تمام مصیبتوں اور برائیوں کی جڑ سمجھتے تھے ان کا خیال تھا کہ انہوں نے ای، ڈی کو الماتا میں بھیج کر بالکل بے بس کر دیا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر وہ وہاں مر بھی جائے تو کسی کو اس کی موت کا کب پتا چلنا تھا۔ لیکن ایل، ڈی نے ہتھیار نہیں پھینکے تھے۔ ہم تینوں نے وہاں اپنا ایک حلقہ بنا لیا۔ باہر کی دنیا سے رابطے کا کام میرے بیٹے نے سنبھال لیا۔ وہ خط وکتابت کا انچارج بن گیا۔ ایل، ڈی مذاق میں اسے کبھی وزیرِ خارجہ اور کبھی وزیرِ ڈاک خانہ جات کہتا۔ جلد ہی ہماری خط وکتابت میں تیزی آ گئی جس سے لوفا کا بوجھ بڑھ گیا۔ وہ اپنے باپ کا محافظ بھی تھا۔ وہ لائبریری جاتا اور باپ کے لئے کتابوں سے تحقیقی مواد اکٹھا کر کے لاتا۔ ایل، ڈی کے لئے سٹیشنری وغیرہ بھی وہی خریدتا۔ مقامی حکام سے ہر قسم کے مذاکرات وہی کرتا۔ شکار کے پروگراموں کو بھی وہی ترتیب دیتا۔ بندوقوں اور کتوں کا دھیان رکھتا۔ بڑی بات یہ تھی کہ اس نے معاشی جغرافیہ اور مختلف زبانوں کا مطالعہ بھی شروع کر رکھا تھا۔

''ہماری آمد کے چند ہفتوں بعد ایل، ڈی کا فنی اور سیاسی کام دوبارہ اپنے عروج پر تھا۔ لوفا ایک ٹائپسٹ لڑکی ڈھونڈ لایا۔ جی، پی، یو نے اسے تنگ تو نہ کیا مگر یہ ہدایت ضرور کی کہ وہ جو کچھ ٹائپ کرے انہیں بتاتی رہا کرے۔ اس نوجوان لڑکی کی رپورٹس ان کے لئے یقیناً مزے دار ہوں گی۔ بچاری ٹراٹسکی ازم کے بارے میں کسی کو کیا بتا سکتی تھی۔

الماتا میں ایک چیز بڑی خوبصورت تھی، اور وہ یہاں کی برف تھی۔ بے حد سفید شفاف اور خشک۔ لوگ کم ہی باہر نکلتے تھے لہٰذا اس کی تازگی ساری سردیوں میں قائم رہتی۔ موسم بہار آتے ہی یہ برف پوست کے سرخ پھولوں کے لئے جگہ خالی کر دیتی۔ جیسے ایک بہت بڑا سرخ قالین بچھ گیا ہو۔ میدان دور دور تک سرخ رنگ سے دمکنے لگتے۔ گرمیوں میں سیبوں کے درخت پھل سے بھر جاتے۔ الماتا کے سرخ اور بڑے

بڑے سیب۔ قصبے میں کوئی مرکزی واٹر ورکس نہیں تھا۔ روشنی کا انتظار اور پختہ سڑکیں بھی نہیں تھیں۔ بازار کے وسطی علاقے میں کرغی لوگ اپنی دکانوں کے سامنے کیچڑ کے پاس بیٹھے دھوپ تاپتے اور اپنے جسموں سے کیڑے وغیرہ اتارتے رہتے۔ ملیریا عام تھا۔ گرمیوں میں مچھروں اور پاگل کتوں کی بھرمار ہو جاتی۔ اخبارات کی رپورٹوں کے مطابق اس علاقے میں کوڑھ کے متعدد مریض دیکھنے میں آئے تھے۔

''ان سب باتوں کے باوجود ہماری گرمیاں بہت اچھی گزریں۔ ہم نے پھل پیدا کرنے والے ایک کسان سے پہاڑیوں کے اوپر ایک دیہی گھر کرائے پر لے لیا جس کا رخ برف پوش پہاڑوں کی طرف تھا۔ یہ پہاڑ تیان، شان پہاڑی سلسلے کا ایک حصہ ہیں۔ ہم کسان کے ساتھ پھلوں کو پکتے ہوئے دیکھتے اور پھر انہیں درختوں سے اتارنے میں اس کی مدد کرتے۔ اس کسان کا پھلوں کا باغ تغیر و تبدل کا ایک شاہکار تھا۔ شروع میں درختوں پر سفید پھول آتے، پھر درخت پھل سے بھر جاتے اور ان کی شاخیں جھک جاتیں۔ بعد میں سارا پھل اشجار کے نیچے تنکوں کی چٹائیوں یا موٹے قالینوں پر بچھا دیا جاتا۔ بوجھ سے نجات پانے کے بعد درخت دوبارہ تن کر کھڑے ہو جاتے۔ سیبوں اور ناشپاتیوں کی خوشبو سے باغ بھرا رہتا۔ شہد کی مکھیاں بھنبھاتی رہتیں۔ ہم پھل جمع کرنے میں مصروف رہتے۔

''پھلوں کے اس باغ میں ایک چھوٹے سے دیہی گھر میں جون اور جولائی میں ہمارا کام اپنے عروج پر تھا۔ ٹائپ رائٹر جوان دنوں ایک نئی چیز تھی، دن رات کٹ کٹ کرتا رہتا۔ ایل، ڈی کمیونسٹ انٹرنیشنل کے ایک پروگرام پر تنقید لکھ رہا تھا۔ وہ کاغذ پر تصحیح کر کے دوبارہ ٹائپ کے لئے دے دیتا۔ ڈاک بڑھ گئی تھی۔ ہر روز تقریباً پندرہ خطوط آتے۔ ان میں ہر قسم کی باتیں پوچھی جاتیں۔ ایل، ڈی کی صحت کے متعلق تشویش کا اظہار بھی ہوتا۔ کبھی کسی مسئلے یا سوال پر رائے طلب کی جاتی۔ کبھی کسی مضمون پر تنقید کا مطالبہ کیا جاتا۔ بڑے عالمی مسائل کے ساتھ چھوٹے چھوٹے مقامی معاملے ملا دیے جاتے جن کی واقعی وہاں اہمیت تھی۔ سسنووسکی کے خط ہمیشہ کی طرح بڑے جذباتی اور تلخی سے بھرے ہوتے۔ راکووسکی کے خط کسی نہ کسی موضوع پر ہوتے جن کی نقلیں بنوا کر دوسروں کو بھیجی جاتیں۔ نیچی چھت والے کمرے کے اندر میز خطوط، اخباری تراشوں، کاغذات اور مسودوں سے بھرا رہتا۔ لوفا سارا دن خطوط کو ٹائپ کرانے، ان کی غلطیاں لگانے اور پھر انہیں ڈاک کے سپرد کرنے میں لگا رہتا کتابوں سے مختلف حوالہ جات تلاش کرنے کا کام بھی اسی کے سپرد تھا۔ ڈاک خانے سے خطوط وغیرہ لانے کی ذمہ داری ایک اپاہج آدمی کی تھی

جو گھوڑے پر بیٹھ کر یہ فرض انجام دیتا۔ شام کے وقت ایل، ڈی بندوق اور کتے کے ساتھ شکار پر نکل جاتا۔ کبھی میں اور کبھی لوفا اس کے ساتھ ہوتے۔ ہم کبوتر، پہاڑی مرغے اور تیتر وغیرہ مار کر لاتے۔ ملیریے کے باقاعدہ حملوں کے ساتھ دوسرے کام بھی جاری تھے۔

الماتا میں ایک سال یونہی گزر گیا۔ یہ چین کی سرحد پر تائیاں، شان پہاڑوں کے سلسلے کے قدموں میں زلزلوں اور سیلابوں کی زد میں رہنے والا شہر تھا۔ یہاں سے ریلوے سٹیشن 250 کلومیٹر اور ماسکو چار ہزار کلومیٹر دور تھا۔ بعض دوست چوری چھپے ہمیں ملتے رہتے، اس کے باوجود ہم لوگوں سے ملنے سے گریز کرتے کیونکہ جو بھی ہمیں ملتے رہتے، اس کے باوجود ہم لوگوں سے ملنے سے گریز کرتے رہتے کیونکہ جو بھی ہمیں ملنے کی کوشش کرتا اس کا برا حشر کر دیا جاتا۔''

ان حالات کا مذکورہ بالا تبصرہ میری بیوی کی طرف سے تھا۔ اب میں اس زمانے کی خط و کتابت کے بعض اقتباسات کا اضافہ اس میں اپنی طرف سے کروں گا۔ 28 فروری کو یہاں اپنی آمد کے فوری بعد میں نے چند جلاوطن دوستوں کو مندرجہ ذیل خط لکھا۔

قازقستان کی حکومت کا صدر مقام بنانے کے پیش نظر اس شہر کے تمام مکانوں کو رجسٹر کیا جا رہا ہے۔ ہوٹل میں تین ہفتوں کے قیام کے بعد ماسکو کو بار بار کی یاددہانیوں کے بعد بڑی مشکل سے ہمیں مکان دیا گیا ہے۔ اسے گھر بنانے کے لئے فرنیچر کے علاوہ ہمیں اور بہت کچھ خریدنا پڑے گا۔ یہ ساری ذمہ داری میری بیوی اور بیٹے پر آن پڑی ہے۔ جب تک چولہا گرم نہیں ہوتا گھر کی تعمیر کیسے مکمل سمجھی جا سکتی ہے۔

میں اپنا زیادہ وقت ایشیا کے جغرافیے، اس کی معاشیات، تاریخ اور اسی قسم کے دوسرے موضوعات پر خرچ کرتا ہوں۔ بیرونی اخبارات کی کمی بری طرح محسوس ہوتی ہے۔ میں مختلف جگہوں سے اخبارات منگوانے کے لئے لکھ رہا ہوں، خواہ یہ پرانے ہوں۔ یہاں ڈاک مشکل سے ملتی ہے اور اکثر گم ہو جاتی ہے۔

ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کا کردار سمجھنا بڑا مشکل ہے۔ وہاں کی محنت کش اور کسان پارٹیوں کی رپورٹیں اخباروں میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ان کے نام ہی چوکنا دینے والے ہیں۔ ایک زمانے میں کومن تانگ کو بھی مزدور کسان پارٹی سمجھا جاتا تھا۔ کیا یہ ماضی کا اعادہ نہیں ہے؟

اینگلو، امریکی تکبر اور مکاری ابھر کر سامنے آ گئی ہے۔ اب سٹالن اور بخارن کو بھی پتا چل گیا ہے کہ مشکل کہاں پیش آنی ہے۔ ہمارے اخبارات صورتحال کو بڑے تساہل سے لے رہے ہیں۔ لیکن بتدریج بڑھتا ہوا اینگلو۔امریکی تکبر یقیناً ایک اور جنگ کی طرف لے جائے گا۔ اس میں شک نہیں کہ اس عمل میں متعدد موڑ آئیں گے۔ جنگ بڑی خطرناک چیز ہوگی۔ امن کے لئے ایک سے زیادہ مساعی کی ضرورت ہے۔ لیکن دیکھا جائے تو حالات ایک خونی انجام کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

یہاں آتے ہوئے راستے میں میں نے پہلی دفعہ مارکس کا پمفلٹ ''ہر ووگٹ'' پڑھا۔ کارل ووگٹ کے ایک جن بہتانوں اور الزاموں کی تردید کی خاطر مارکس کو تقریباً دوسو صفحات پر مشتمل کتاب لکھنی پڑی جس میں اس نے واقعاتی شہادتوں، تجزیوں کے علاوہ دوسری دستاویزات کے حوالے دیے ہیں۔ اگر ہم انہیں خطوط پر سٹالن کے بہتانوں کا جواب دینے لگیں تو ہمیں ہزاروں صفحات کی ضرورت ہوگی۔

اپریل میں میں اپنے غم اور خوشیاں شکار کے شوق میں ڈبوتا رہا۔

موسم بہار سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لئے میں اور میرا بیٹا دریائے ایلی پر گئے۔ اس دفعہ ہم خیمے اور دوسرا سامان ساتھ لے گئے تاکہ ہمیں مقامی چٹائی نما بستروں پر سونا نہ پڑے۔ لیکن برف باری دوبارہ شروع ہو جانے سے موسم سخت سرد ہو گیا۔ بڑی مشکل پیش آئی۔ رات کو درجہ حرارت نقطہ انجماد سے چودہ درجے نیچے چلا جاتا۔ اس کے باوجود ہم نو دنوں تک کسی مکان میں منتقل ہونے کے بجائے خیمے ہی میں رہے۔ گرم کپڑوں کی وجہ سے ہم نمونیے سے محفوظ رہے۔ رات کو ہمارے بوٹ جم جاتے۔ پھر چولہے پر انہیں گرم کرنا پڑتا۔ پہلے چند روز ہم دلدل میں شکار کھیلتے رہے۔ پھر جھیل کی طرف آ گئے۔ ہم نے ایک چھوٹی سی پہاڑی پر خیمہ نصب کر لیا جہاں میں دن میں بارہ سے چودہ گھنٹے گزارتا۔ لیکن لوفا سرکنڈوں کے اندر درختوں کے نیچے شکار میں مصروف رہتا۔

برے موسم اور پرندوں کے باقاعدہ نہ آنے کی وجہ سے شکار زیادہ پرلطف ثابت نہ ہوا۔ ہم فقط چالیس مرغابیاں اور بطخیں شکار کر سکے۔ لیکن اتنے دن گھر سے باہر رہنا، کھلی فضا میں سانس لینا، اپنا ہاتھ سے گوشت پکانا، ایک ہی لباس میں گزارہ کرنا، گھوڑے سے دریا میں گرنا (صرف اس وقت مجھے گرم دھوپ میں کپڑے بدلنے پڑے) ایک چھوٹی سی شہتیر نما کشتی پر سارا وقت پانی اور سرکنڈوں میں گھومتے رہنا___ ایسے تجربے روز روز نہیں ہوتے۔ میں نمونیے کے کسی آثار کے بغیر صحیح حالت میں گھر واپس

آ گیا۔لیکن گھر آنے کے دوسرے دن ہی میں نمونیے کے کسی آثار کے بغیر صحیح حالت میں گھر واپس آ گیا۔ لیکن گھر آنے کے دوسرے دن ہی نمونیے کا شکار ہو گیا اور ایک ہفتے تک بستر میں لیٹا رہا۔

اب راکووسکی کے ذریعے ماسکو اور استراخان سے اخبارات آنے لگے تھے۔آج ہی اس کا ایک خط ملا ہے۔وہ مارکس، اینگلز ادارے کے لئے سینٹ سائمن ازم پر ایک مضمون لکھ رہا ہے۔اس کے علاوہ وہ اپنی یادداشتیں بھی مرتب کر رہا ہے۔ہر وہ شخص جو راکووسکی کی زندگی کے بارے میں کچھ نہ کچھ جانتا تھا، اس کے لئے یہ یادداشتیں غضب کی چیز ہوں گی۔

''24 مئی کو میں نے پر یوبرازنسکی کو خط لکھا۔جو اپنے نظریات میں کچھ اکھڑا اکھڑا اور متزلزل دکھائی دے رہا تھا۔''

تمہارا مضمون ملنے پر میں نے اس کے متعلق کسی کو ایک لفظ بھی نہیں لکھا۔ایک دن پہلے مجھے کلپا شووو سے یہ تار ملا ہے۔''پروبرازنسکی کی تجاویز مجھے بالکل پسند نہیں۔میں انہیں رد کرتا ہوں۔فوری جواب دو۔'' کل ہی اسبورودوف کا ایک تار ملا ہے۔اس نے بھی پروبرازنسکی کی تجاویز رد کر دی ہیں۔کل راکو بووسکی کا خط آیا ہے اس نے تمہاری سٹالن کی برطانوی طرز کی بائیں جانب کی پولیسی کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔بیلوبورودوف اور ویلسین تینوف کے خط بھی آئے ہیں۔انہون نے بتایا ہے کہ انہیں ماسکو سے راڈک کا خراب موڈ میں لکھا ہوا خط بھی ملا ہے۔وہ بڑے پریشان ہیں۔اگر راڈک کے خط میں وہی کچھ لکھا ہے جو وہ بتا رہے ہیں تو پھر میں ان سے اتفاق کرتا ہوں۔میں کسی کو شک کی گنجائش دینے کے حق میں ہرگز نہیں۔

''شکار سے واپس آنے کے بعد میں گھر سے بالکل نہیں نکلا ہوں۔صبح آٹھ بجے سے رات دس بجے تک اپنی کتاب پر کام کر رہا ہوں۔اب میں چند روز آرام کروں گا۔اس دفعہ شکار کے لیے نہیں۔سروزا اور اس کی بیوی نتالیہ ایوانوا یہاں آئے ہوئے ہیں۔اس دفعہ دریائے اٹلی پر مچھلی کے شکار کے لئے جائیں گے۔تمہیں بعد میں اس کی داستان لکھ بھیجوں گا۔''

''تمہیں معلوم ہے فرانسیسی انتخابات میں کیا ہوا؟ مجھے کچھ پتا نہیں ہے۔''پراودا'' نے گذشتہ انتخابات میں منتخب ہونے والے ارکان کی فہرست اور اعداد وشمار کی طرح اس دفعہ نومنتخب ارکان کے اعداد وشمار مہیا نہیں کیے۔اس سے کیسے معلوم ہوا کہ کمیونسٹ ارکان کا تناسب تبدیل ہوا ہے کہ نہیں۔میں

دوسرے بیرونی اخبارات سے معلوم کر کے تمہیں بتاؤں گا۔''

16 مئی کو میں نے میخائل اوکدزافا کو مندرجہ ذیل خط لکھا۔ وہ جارجیا کا بہت پرانا بالشویک ہے۔

''سٹالن کی نئی پالیسی بلاشبہ ہمارے نقطہ نظر کے قریب ہے۔ سیاست میں ''کیا'' نہیں بلکہ ''کیسے'' اور ''کون'' فیصلہ کن ہوتے ہیں۔ انقلاب کی تقدیر کا فیصلہ کرنے کے لئے ابھی بڑی جنگ لڑی جانی ہے۔

''میں متعدد دفعہ وضاحت کر چکا ہوں کہ جب حکمران ترقی کی کوشش میں معکوس زاویہ بنا لیتے ہیں تو اس زاویے کے خم کو غیر شکستہ نہیں سمجھ لینا چاہیے۔ زاویہ معکوس کسی خلا میں تو نہیں بن جاتا۔ اس کا تعلق طبقاتی معاشرے کے گہرے داخلی تضادات سے ہوتا ہے۔ اس صورت میں پارٹی ایک ٹھوس اکائی کی حالت میں نہیں رہتی۔ یہ سیاسی خام مواد میں بدل جاتی ہے۔ پھر دائیں اور بائیں جانب سے طبقاتی دباؤ کے تحت اختلافات کی چھان بین ناگریز ہو جاتی ہے۔ گذشتہ عرصہ میں پارٹی معاملات میں جو اہم واقعات رونما ہوئے ہیں اور جن کا خمیازہ ہم بھگت رہے ہیں، وہ مستقبل کے واقعات کو کوئی شکل دینے والے ہیں۔ جیسے کسی اوپرا کے ابتدائی میوزک سے پتا چل جاتا ہے کہ اوپرا کس قسم کا ہوگا۔ چیزیں جس طرح وقوع پذیر ہو رہی ہیں انہوں نے مجھے یقین دلا دیا ہے کہ ہم پہلے بھی اور اب بھی راستی پر ہیں۔ اس وقت ہمارا رویہ یہ ہونا چاہیے کہ ہم اعصابی دباؤ میں نہ آئیں، خود کو اور دوسروں کو غیر ضروری طور پر پریشان نہ کریں، صورتحال کو بغور دیکھتے رہیں اور منتظر رہیں اور ذاتیات کی سطح سے اوپر اٹھ کر اپنے سیاسی نقطہ نظر کو چھوٹے موٹے اختلافات سے دور رکھیں۔''

9، جون کو میری بیٹی نینا جو میری زبردست حمایتی تھی، ماسکو میں وفات پا گئی۔ وہ چھبیس برس کی تھی۔ میری جلاوطنی سے کچھ عرصہ پہلے اس کے شوہر کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ وہ حزب مخالف کے ساتھ مل کر کام کرتی رہی حتیٰ کہ بیمار پڑ گئی۔ اسے تپ دق وہ گئی جو چند ہفتوں میں خطرناک شکل اختیار کر گئی۔ ہسپتال سے لکھا ہوا اس کا خط مجھے 73 دنوں میں اس کی موت کے بعد ملا۔

راکووسکی نے 16 جون کو مجھے تار بھیجا جس میں لکھا تھا۔ ''نینا کی خطرناک بیماری کے متعلق تمہارا خط مجھے کل ملا۔ میں نے ماسکو میں الیگزینڈرا جارجیانہ (راکووسکی کی بیوی) کو تار بھیجا ہے۔ آج اخبار سے معلوم ہوا ہے کہ نینا کی مختصر انقلابی زندگی کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ میں تمہارے اس دکھ میں پوری طرح تمہارے ساتھ ہوں۔ ہمارے درمیان اتنا بڑا فاصلہ حائل ہے کہ تمہارے پاس نہ آسکنے کا مجھے بے حد رنج

ہے۔ میں تہ دل سے تمہارے غم میں شریک ہوں۔''

دو ہفتے بعد راکووسکی کا خط آیا۔

''پیارے دوست: نینا کے الم انجام کا مجھے بے حد دکھ ہے۔تم ایک مدت سے ایک مارکسی انقلابی کی صلیب اٹھائے پھر رہے ہو۔لیکن اب پہلی دفعہ تمہیں یہ احساس ہوا ہوگا کہ ایک باپ کا دکھ ہوتا ہے۔ میں دل کی گہرائیوں سے تمہارے ساتھ ہوں۔ مجھے دکھ ہے کہ میں اس وقت تمہارے پاس نہیں ہوں۔ سروزا نے تمہیں بتایا ہوگا کہ تمہارے بعد ماسکو میں تمہارے دوستوں کے ساتھ کیسا شرم ناک سلوک کیا گیا۔ میں تمہاری روانگی کے نصف گھنٹے بعد تمہارے گھر پر آتا تھا۔تمہارے ڈرائنگ روم میں مارالوف کے ہمراہ کامریڈ خواتین کا ایک گروپ بیٹھا ہوا تھا۔

''راکووسکی کون ہے؟'' کسی نے پوچھا۔

''میں ہوں۔کیا بات ہے؟''

''میرے پیچھے پیچھے آئیں۔''

ہم ہال میں چھوٹے کمرے میں آ گئے۔مگر دروازے پر پہنچنے سے کسی نے حکم دیا۔''ہاتھ اوپر اٹھالو۔'' پھر میری جامہ تلاشی لے کر مجھے گرفتار کرلیا گیا۔ پانچ بجے مجھے رہا کر دیا گیا۔ میرے بعد مارالوف کے ساتھ بھی یہی سلوک روا رکھا گیا۔ وہ رات دس بجے رہا ہوا۔''ان کے دماغ خراب ہو گئے ہیں۔'' میں نے اپنے آپ سے کہا۔ ہمارے ہی کامریڈ ہمارے ساتھ یہ سلوک کر رہے تھے۔ غصے کی بجائے شرمندہ ہو رہا تھا۔''

میں نے 14 جولائی کو راکووسکی کو خط لکھا۔

''پیارے کرسچن جارجی زی وچ! ایک طویل عرصہ ہوا میں تمہیں اور دوسرے احباب کو خط نہیں لکھ سکا۔ میں بس دوسری نوعیت کا تحریری مواد بھیجتا رہا ہوں۔ دریائے اٹلی کے شکار سے واپسی پر نینا کی خطرناک حالت کی خبر ملی۔ پھر ہم دیہی مکان میں منتقل ہو گئے۔ چند روز بعد اس کی موت کی خبر وہیں ملی۔ اس خبر کا مجھ پر کیا اثر ہوا ہوگا،تم بخوبی سمجھ سکتے ہو۔لیکن کیا کیا جا سکتا تھا۔ مجھے چھٹی کمیونسٹ انٹرنیشنل کانگریس کے لئے دستاویزات تیار کرنے کی جلدی تھی۔ کام بڑا مشکل تھا۔لیکن اس کی تکمیل نے میرے زخموں پر مرہم رکھ دیا اور ہم اپنے مشکل وقت سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔

''ہم پورا جولائی کا مہینہ یہاں زنسکا (ٹراٹسکی کی بڑی بیٹی) کے منتظر رہے۔مگر افسوس ہم اس سے ملنے سے محروم رہے۔ڈاکٹر گوئٹز کا کہنا تھا کہ اسے فوری طور پر تپ دق کے سینی ٹوریم میں داخل کرنے کی ضرورت تھی۔اس کے اندر مدت سے تپ دق کے جراثیم پل رہے تھے۔نینا کی تیمارداری کے تین ماہ نے اس کی صحت کو سخت نقصان پہنچایا تھا۔''

''اب کانگریس کے کام پر بات ہو جائے۔کانگریس کے پروگرام میں جن سوالات اور امور پر ہمیں سرکاری راہنماؤں سے اختلاف ہے، ہم نے ان پر قائم رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔اس سلسلے میں میں نے 175 صفحات پر مشتمل ایک کتاب تیار کی ہے۔اس میں میں نے اپنے لوگوں کے پچھلے ان پانچ برسوں کے اجتماعی کام کا جائزہ لیا ہے جب لینن پارٹی قیادت سے سبکدوش ہو گیا تھا او پارٹی نا اہل لوگوں کے ہاتھ میں آ گئی تھی۔

''کانگریس میں ہم نے کیا کہنا ہے، اس کے متعلق مجھے درجنوں خط اور تار آ چکے ہیں۔ووٹوں کا حساب ابھی لگایا جا سکا۔ایک اندازے کے مطابق ایک سو میں سے فقط تین ووٹ پر یو براز نسکی کے نظریاتی مضمون کے حق میں ہوں گے۔

اس بات کا عین امکان ہے کہ سٹالن کا ٹولہ بخارن اور ریکوف کی مدد سے آخری کوشش کے طور پر کانگریس میں پارٹی اتحاد کو دکھاوے کے طور پر قائم رکھنے کی کوشش کرے۔بخارن اور ریکوف اس سلسلے میں دلال کے فرائض انجام دیں گے۔لیکن یہی کوشش اس ٹولے میں اختلافات کا باعث بھی بن سکتی ہے کیونکہ کانگریس کے اگلے دن ہی ''آگے کیا کرنا ہے'' کا سوال اپنے پورے ننگے پن کے ساتھ سامنے آ جائے گا۔اس کا وہ کیا جواب دیں گے؟ 1923 میں جرمنی میں انقلابی صورتحال ہاتھ سے نکل جانے کے بعد ہم 5-1924 کی الٹرا___لفٹ کی بھول بھلیوں میں پھنس کر رہ گئے تھے۔دراصل زینوشیف کی الٹرالفٹ کی پالیسی کا خمیر دائیں بازو ہی سے اٹھا تھا۔یعنی صنعت کاروں کے خلاف جدوجہد، رادیچ، لافولیٹی کرسٹرٹرن اور کومن تانگ سے رومانوی نوعیت کا پیار ومحبت۔جب الٹرالفٹ کی پالیسی کا سرپاش پاش ہو گیا تو اسی دائیں بازو کے خمیر سے دائیں بازو کی پالیسی نے جنم لے لیا۔اس کا اعادہ آگے چل کر ایک بڑی سطح پر بھی ہو سکتا ہے۔یعنی ایک نیا الٹرالفٹ کا عہد اسی پرانی موقع پرستی کی بنیاد پر۔لیکن زیریں سطح پر کام کرنے والی معاشی طاقتیں اس الٹرالیفٹ کے راجحان کو توڑ مروڑ کر یقیناً دائیں جانب لے

جائیں گی۔‘‘

اگست میں میں نے بعض کامریڈوں کو لکھا:

’’آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہماری پارٹی میں جو واقعات نمودار ہو رہے ہیں یورپی امریکی اخبارات ان پر کوئی تبصرہ نہیں کر رہے۔ اس سے شبہ پڑتا ہے کہ ایسا کوئی تبصرہ ’’نئی پالیسی‘‘ کے لئے موزوں نہیں ہے۔ اب میں ایک ایسی بات کہنے لگا ہوں جو کوئی تخمینہ نہیں، بلکہ پریس سے حاصل کیا ہوا ایک بڑا ثبوت ہے۔ کامریڈ اینڈری چن نے مجھے امریکی اخبار ’’نیشن‘‘ کا ایک تراشہ بھیجا ہے جو فروری کے کسی شمارے سے لیا گیا ہے۔ تازہ ترین واقعات کا اقتباس دینے کے بعد بائیں بازو کا یہ اہم اخبار لکھتا ہے:

’’سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ روس میں بالشویک پروگرام کے تسلسل کو کسی نے قائم رکھا ہوا ہے؟ اور کون اس پروگرام کی مخالفت کر رہا ہے؟ امریکی قارئین کا خیال ہے کہ لینن اور ٹراٹسکی نے اس پروگرام کو جاری رکھا ہوا ہے۔ ہماری یہاں کے قدامت پرست پریس اور سیاست دانوں نے بھی نتیجہ اخذ کیا ہے۔ اسی باعث ’’نیویارک ٹائمز‘‘ نے سال نو پر اس بات پر خوشی کا اظہار کیا تھا کہ ٹراٹسکی کو کمیونسٹ پارٹی سے بڑی کامیابی کے ساتھ نکال دیا گیا ہے۔ اخبار کے خیال میں یہی وہ عنصر تھا جو روسی اور مغربی تہذیب کے ملاپ اور نظریات میں سب سے بڑی رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ متعدد معزز مغربی اخبارات نے بھی اسی قسم کے تبصرے کیے ہیں۔ سر آسٹن چمبر لین کو جنیوا کانفرنس کے دوران میں یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ برطانیہ اور روس کے درمیان اب تک کوئی بات چیت محض اس لیے نہیں ہوسکی کہ ابھی تک ٹراٹسکی کو کسی دیوار کے ساتھ کھڑا کر کے گولی کیوں نہیں ماری گئی۔ اب وہ ٹراٹسکی کے دیس نکالے پر بڑا خوش ہوگا۔ بہر حال یورپ کے سارے رجعتی ترجمان ایک بات پر تو متفق ہیں کہ سٹالن نہیں بلکہ ٹراٹسکی ان کا دشمن ہے۔‘‘ (نیشن، یکم فروری 1928) اس سے زیادہ کوئی اخبار کیا لکھ سکتا تھا۔‘‘

اپنے بیٹے کی نوٹ بک سے کچھ اعداد و شمار درج کر رہا ہوں۔

اپریل سے اکتوبر 1928 تک کے عرصے میں ہم نے کوئی آٹھ سو سیاسی خط ارسال کیے جن میں بعض خاصے طویل بھی تھے۔ ساڑھے پانچ سو تار بھیجے۔ ہمیں کوئی ایک ہزار مختصر اور طویل دونوں نوعیت کے خط ملے۔ سات سو تار ملے جو انفرادی اور لوگوں کے گروپوں کی طرف سے آئے تھے۔ یہ سارے خط اور تار دوسرے جلاوطن لوگوں سے تعلق رکھتے تھے۔ باہر سے آنے والے خطوط اور تاروں کی تعداد الگ

تھی۔ ماسکو سے بھی آٹھ یا نو خفیہ خط آئے۔ یہ خاص لوگوں کی وساطت سے ہم تک پہنچے تھے۔ اسی طریقے سے ہم نے بھی اتنی ہی تعداد میں خط ماسکو بھیجے تھے۔ خفیہ خط وکتابت ہمیں ماسکو کے حالات سے باخبر رکھتی اور ہم اہم واقعات پر اپنے تبصرے ارسال کرتے رہتے تھے۔

خزاں کے اختتام پر میری صحت بہت خراب ہوگئی۔ ماسکو میں افواہیں پھیل گئی، میٹنگوں میں سوالات پوچھے جانے لگے۔ سرکاری رپورٹیں میری صحت کو بہترین قرار دیتیں۔ 20 ستمبر کو میری بیوی نے مندرجہ ذیل تاریگلانوف کو بھیجا جو اس وقت ماسکو پارٹی کا سیکریٹری تھا۔

''آپ نے ماسکو کمیٹی کی ایک بڑی میٹنگ میں تقریر کے دوران میں میرے شوہر کی جعلی علالت کا تذکرہ کیا ہے۔ کامریڈوں کی تشویش اور احتجاج پر آپ نے بڑے ہتک آمیز لہجے میں کہا۔''اب وہ ایسے ہتھکنڈوں پر اتر آیا ہے۔'' آپ نے کن اطلاعات کی بنیاد پر پارٹی، کارکنوں اور دنیا کو بتایا ہے کہ ایل، ڈی کی علالت کی رپورٹ غلط ہے؟ آپ دراصل پارٹی کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ مرکزی کمیٹی کے ریکارڈ روم میں ایل، ڈی کے علالت کے متعلق بہترین ڈاکٹروں کی رپورٹیں موجود ہیں۔ ڈاکٹروں نے ولادیمیر ایلیچ کی ہدایت پر ایل، ڈی کا ایک مرتبہ نہیں، متعدد بار طبی معائنہ کیا تھا۔ وہ بھی ایل، ڈی کی صحت کے متعلق متفکر تھے۔ لینن کی وفات کے بعد ڈاکٹروں نے تصدیق کردی ہے کہ ایل، ڈی کی بڑی آنت میں زخم اور اسے گٹھیا ہوگیا ہے۔ آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ ایل، ڈی کو کئی برس تک مسلسل بخار رہا تھا جس سے نجات پانے کے لئے اس نے برلن کے ایک کلینک میں اپنا آپریشن بھی کرایا تھا۔ اس کے باوجود اس کا بخار نہیں اترا تھا۔ بڑی آنت میں زخم اور گٹھیا ایسی بیماریاں ہیں جن کا علاج الما تا میں نہیں ہوسکتا۔ وقت گزرنے کے ساتھ یہ بڑھتی جاتی ہیں۔ درست علاج اور مناسب دیکھ بھال ہی سے صحت برقرار رکھی جاسکتی ہے۔ یہ دونوں چیزیں یہاں میسر نہیں ہیں۔ مناسب دیکھ بھال اور درست علاج اس کے لئے ضروری ہیں، یہ آپ کو وزیر صحت سیماسکو ہی بتاسکتا ہے جو ولادیمیر ایلیچ کے حکم پر متعدد بار ایل، ڈی کا طبی معائنہ کرتا رہا تھا۔ یہاں آکر ایل، ڈی ملیرے میں بھی مبتلا رہتا ہے جس کے سبب اس کی دونوں بیماریاں بڑھ گئی ہیں۔ اسے دردسر کی شکایت بھی رہنے لگی ہے۔ جتنا عرصہ وہ تندوست رہتا ہے اس سے زیادہ عرصہ بیماری میں گزر جاتا ہے۔ میں آپ کو صحیح صورتحال بتا رہی ہوں۔ آپ لوگوں نے ایل، ڈی پر دفعہ 58 کا اطلاق کر کے اسے انقلاب دشمنی کے جرم میں جلاوطن کردیا ہے۔ اگر آپ اسے یہ کہہ کر فرائض سے سبکدوش کردیتے کہ اس

کی صحت فرائض کی بجا آوری کی اجازت نہیں دیتی تو بات سمجھ میں آسکتی تھی۔ پارٹی ورکر بھی ایک حد تک مطمئن ہو جاتے۔ ٹراٹسکی کی بیماری نے آپ لوگوں کے حق میں جانا تھا۔ اس سے لکھنے لکھانے کا کام بھی نہیں ہونا تھا۔ مگر آپ لوگ تو اس کی علالت سے منکر ہو رہے ہیں۔ کالینن، مولوٹوف نے بھی کچھ اسی قسم کے بیانات جاری کیے ہیں۔ اب جب کہ عوام آپ سے پوچھ رہے ہیں اور آپ جواب دینے سے کترا رہے ہیں، اس سے محنت کشوں اور عوام کو یقین ہوتا جا رہا ہے کہ ٹراٹسکی پر پہلے سے عائد شدہ سیاسی الزامات سب کے سب غلط تھے۔ اب وہ ایل، ڈی کی صحت کو درست قرار دینے کے جھوٹ پر بھی یقین نہیں لائیں گے۔

این، آئی، سیدوفا ٹراٹسکایا

ملک بدری

اکتوبر میں ہمارے حالات میں ایک زبردست تبدیلی رونما ہوئی۔ ہمارے سیاسی اور ذاتی احباب کے علاوہ ماسکو میں ہمارے عزیز و اقارب سے بھی ہمارا رابطہ اچانک منقطع کر دیا گیا۔ کوئی خط، کوئی تار ہم تک پہنچنا بند ہو گیا۔ اپنے خاص ذرائع سے ہمیں معلوم ہوا کہ ماسکو کے تار گھر میں ہمارے لئے سینکڑوں تار جمع تھے، خاص طور پر اکتوبر انقلاب کی سالگرہ کے موقع پر ہمارے گرد دائرہ سے تنگ تر کیا جا رہا تھا۔

1928 کے دوران میں تشدد کے باوجود حکومت کی مخالفت میں بے پناہ اضافہ ہو رہا تھا، خصوصاً صنعتی علاقوں میں تشدد اور دباؤ کی بڑی وجہ بھی حکومت کی مخالفت تھی۔ جلاوطنوں کی باہمی خط و کتابت بند کر دی گئی تھی۔ ہم مزید سخت اقدام کے متوقع تھے۔ یہ کچھ ایسا غلط بھی ثابت نہ ہوا۔

16 دسمبر کو جی، پی، یو کا ایک نمائندہ ماسکو سے میرے پاس آیا اور اپنے ادارے کی طرف سے مجھے ایک الٹی میٹم دیا کہ میں فوری طور پر حزب مخالف کو ہدایات دینی بند کر دوں۔ اگر میں نے ایسا نہ کیا تو مجھے ''سیاسی زندگی سے الگ کرنے کے'' اقدامات کیے جائیں گے۔ اس وقت تک میری ملک بدری کا سوال زیر بحث نہیں آیا تھا۔ میرے خلاف جو بھی قدم اٹھایا جانا تھا، میرے خیال میں اس کا تعلق پارٹی کی داخلی سیاست سے تھا۔ میں نے الٹی میٹم کا جواب پارٹی کی مرکزی کمیٹی اور کمیونسٹ انٹرنیشنل کے پریذیڈیم کے

نام دیا۔ میں اپنے خط کے بڑے نکات یہاں درج کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

’’آج 16 دسمبر کو جی، پی، یو کا ایک نمائندہ جس کا نام وولنسکی تھا، اپنے ارادے کی طرف سے میرے پاس آیا اور اس نے زبانی طور پر مجھے جو الٹی میٹم دیا اسے میں ذیل میں نقل کر رہا ہوں۔

’’آپ کے ہمدردوں کا سیاسی کام ملک بھر میں انقلاب دشمن کردار اختیار کرتا جا رہا ہے (اس نے حرف بہ حرف یہی کہا تھا) الما تا میں رہ کر آپ کو اس کام کے مواقع حاصل ہیں۔ اس صورتحال کے پیش نظر جی، پی، یو آپ سے اپنی سیاسی سرگرمیاں قطعی طور پر ختم کرنے کا وعدہ مانگتا ہے۔ انکار کی صورت میں جی، پی، یو کو اختیار حاصل ہوگا کہ وہ آپ کے حالات کو بدل کر آپ کو سیاسی زندگی سے مکمل طور پر الگ کر دے۔ اس سلسلے میں آپ کی جائے رہائش کو تبدیل کرنے کو سوال بھی زیر بحث آ سکتا ہے۔‘‘

میں نے جی، پی، یو کے نمائندے کے مطلع کیا کہ اگر وہ مجھے جی، پی، یو کی طرف سے تحریری الٹی میٹم دیتا تو میں بھی اس کا تحریری جواب دے دیتا۔ میں ماضی کے تجربات کی روشنی میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ میری طرف سے کسی زبانی جواب کو توڑ مروڑ کر روسی عوام اور باقی دنیا کو گمراہ کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

جی، پی، یو کی طرف سے کسی بھی اقدام کو نظر انداز کرتے ہوئے، کیونکہ اس ادارے کی اپنی کوئی آزادانہ حیثیت نہیں ہے اور یہ صرف سٹالن کے حواری کا کردار ادا کر رہا ہے، میں آل یونین کمیونسٹ پارٹی اور کمیونسٹ انٹرنیشنل کی مجلس عاملہ کی خدمت میں مندرجہ ذیل نکات پیش کرنا چاہتا ہوں۔

سیاسی سرگرمیوں کو ترک کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ میں بین الاقوامی پرولتاریہ کے مفادات کی جدوجہد سے الگ ہو جاؤں۔ یہ جدوجہد میں نے گذشتہ 32 برس سے اپنی باشعور زندگی کے آغاز سے شروع کر رکھی ہے۔ میری سیاسی سرگرمی کو وہ لوگ ’’انقلاب دشمن‘‘ کہہ رہے ہیں جن پر میں بین الاقوامی پرولتاریہ کے روبرو یہ الزامات لگا رہا ہوں کہ وہ مارکس اور لینن کی تعلیمات کے بنیادی اصولوں کی خلاف ورزی کر رہے ہیں، عالمی انقلاب کے تاریخی مفادات کے خلاف چل رہے ہیں، اکتوبر انقلاب کی روایات کو مٹی میں ملا رہے ہیں اور لاشعور طور پر انقلاب دشمنوں کا ایک ٹولہ تیار کرنے میں مصروف ہیں۔

سیاسی سرگرمی سے علیحدہ ہو جانے کا یہ مطلب ہوگا کہ میں کمیونسٹ پارٹی کی موجودہ اندھی قیادت کے خلاف جدوجہد بند کر دوں جو سوشلسٹ کام میں معروضی مشکلات پیدا کر کے اپنی موقع پرستانہ نااہلیت

کے سبب تاریخی سطح پر پرولتاریہ کی پالیسی کو آگے بڑھانے میں ناکام ثابت ہو چکی ہے۔

کیا میں پارٹی کی ایک ایسی حکومت کے خلاف اپنی جدوجہد ترک کردوں جو پرولتاریہ کے جواں ہمت راہنما اور پیش رووٴں پر دشمن طبقات کے بڑھتے ہوئے دباوٴ کو مجرمانہ خاموشی سے دیکھ رہی ہے؟ اس کا مطلب یہ ہوا کہ موقع پرست معاشی پالیسی کو چپ چاپ برداشت کرلیا جائے جو پرولتاریہ کی آمریت کی بنیاد ہلا رہی ہے، ان کی مادی اور ثقافتی ترقی کو مسخ کر رہی ہے اور اس کے ساتھ ہی محنت کشوں اور کسانوں کے اعتماد پر کاری ضرب لگانے پر تلی بیٹھی ہے۔ یہ اعتماد جو سوویٹ اقتدار کی بنیاد ہے۔

پارٹی کا، لینن فریق 1923 سے سخت دباوٴ میں ہے۔ یعنی جرمن انقلاب کے بے مثال انہدام کے وقت سے۔ اس کے بعد موقع پرست قیادت کی بدولت روسی اور بین الاقوامی پرولتاریہ مسلسل شکستوں سے دوچار ہو رہی ہے۔

نظریاتی استدلال اور سیاسی تجربہ بتاتا ہے کہ تاریخی پسپائی یا ردعمل کا زمانہ گزر جانے کے بعد بورژوازی انقلاب بھی آگے کی سمت جست لگاتا ہے۔ ہم گذشتہ چھ برس سے روس میں اکتوبر انقلاب کے خلاف ردعمل کے حالات میں رہ رہے ہیں اور اس طرح انقلاب کے خلاف بھی آگے کی سمت جست لگاتا ہے۔ ہم گذشتہ چھ برس سے روس میں اکتوبر انقلاب کے خلاف ردعمل کے حالات میں رہ رہے ہیں اور اس طرح انقلاب دشمنوں کے لئے راستہ صاف کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ اس کی بڑی مثال پارٹی کے اندر بائیں بازو کو تشدد کا نشانہ بنایا جانا ہے۔

پارٹی کے اندر سٹالن ٹولے کی طرف سے انقلاب دشمنوں کے خلاف اگر تھوڑی بہت مزاحمت ہو رہی ہے تو وہ فقط حزب مخالف کے اپنے ہی نظریاتی دغا بازوں کی وجہ سے ہے۔ تخلیقی طور پر یہ ٹولہ بانجھ ہے۔ بائیں بازو کے خلاف لڑائی نے اسے غیر مستحکم کر دیا ہے۔ اس کی عملی پالسی جھوٹی، تضادات کی ماری ہوئی اور غیر معتبر ہونے کے سبب ریڑھ کی ہڈی سے محروم ہے۔ دائیں بازو کی طرف سے خطرے کا شور محض بکواس ہے۔ یہ شور لینن سے وابستہ بالشویکوں کو ختم کرنے کے لئے ایک پردے کا کام کر رہا ہے۔ عالمی بورژوازی اور عالمی منشویک ازم بھی اس جنگ میں برابر کے شریک ہیں۔ منصف جان چکے ہیں کہ ''تاریخی راست بازی'' آج لینن کی طرف ہے۔

اگر پارٹی پالیسی اس وقت کوتاہ نظر، بزدل اور نااہل نوکر شاہی کے ہاتھ میں نہ ہوتی تو انقلاب کی

بارھویں سالگرہ کے موقع پر محنت کش طبقے کی حیثیت یقیناً زیادہ بہتر ہوتی، ہمارا دفاع زیادہ اچھے ہاتھوں میں ہوتا اور کمیونسٹ انٹرنیشنل دغا باز اور زر پرست سوشل ڈیموکریسی کے مقابل میں زیادہ بلند سطح پر کھڑا ہوتا۔

ظاہری طاقت کے باوجود سٹالن کی ناقابل علاج کمزوری یہ حقیقت ہے کہ اسے معلوم ہی نہیں ہے کہ اس نے کرنا کیا ہے۔ یہ دشمن طبقات کے حکم بجالا رہا ہے۔ کسی پارٹی پر اس سے بڑی تاریخی لعنت کیا ہوگی کہ وہ انقلاب کو کامیابی سے ہم کنار کر کے اس کی اہمیت سے بے خبر ہو جائے۔

حزب مخالف کی ظاہری کمزوری کے باوجود اس کی سب سے بڑی طاقت اس حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ اس نے عالمی تاریخی عمل کی نبض پر اپنی انگلی رکھی ہوئی ہے۔ یہ عالمی طاقت کے اصولوں کو سمجھتا ہے، آنے والے دنوں کو دیکھ رہا ہے۔ اور ان کے لئے تیاری میں لگا ہوا ہے۔ سیاسی سرگرمی سے کنارہ کشی کا مطلب آنے والے کل کی تیاری کش ہو جانا ہے۔

میرے حالات زندگی کو تبدیل کر دینا اور مجھے سیاسی سرگرمی سے محروم کر دینا بڑی مضحکہ خیز بات ہے۔ اس وقت میں ماسکو سے چار ہزار کلومیٹر دور، ریلوے سٹیشن سے اڑھائی سو کلومیٹر پرے اور چین سے ملحقہ مغربی صحرا کے کنارے ایک صوبے میں پڑا ہوں۔ یہاں ملیریے، کوڑھ اور طاعون کا دور دورہ ہے۔ اس سے زیادہ میرے حالات زندگی میں کیا تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے مجھے زندگی اور سیاسی سرگرمی سے کاٹنے کی سٹالن ٹولے کی کچھ حسرتیں ابھی باقی ہیں۔ ماسکو کے کسی اخبار کو یہاں پہنچنے میں دس دن سے ایک ماہ تک کا عرصہ لگتا ہے۔ خطوط جی، پی، یو کی فائل اور مرکزی کمیٹی کے سیکریٹریٹ میں دو ماہ آرام کرنے کے بعد مجھ تک پہنچتے ہیں۔

خانہ جنگی کے زمانے میں میرے ساتھ کام کرنے والے میرے دونائبوں سرمکس اور بزانسکی کو جنہوں نے جلاوطنی کے دنوں میں میرے ساتھ رضا کارانہ طور پر رہنے کی کوشش کی، یہاں پہنچتے ہی گرفتار کر کے دوسرے مجرموں کے ساتھ جیل میں ڈال دیا گیا۔ پھر انہیں ملک کے شمالی حصے میں جلاوطنی کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا گیا۔ میری بیٹی جو بستر مرگ پر پڑی تھی۔ اور جسے پارٹی کے کام سے نکال دیا گیا تھا، اس کا خط ماسکو کے ہسپتال سے مجھ تک پہنچنے میں 73 دن لگے تا کہ میرا جواب آنے تک وہ زندہ نہ رہے۔ میری دوسری بیٹی کی المناک بیماری کے متعلق ایک خط، جسے پارٹی سے نکال کر بے روزگار کر دیا گیا

تھا، ماسکو سے 43 دن کی روانگی کے بعد ایک ماہ پہلے مجھے ملا۔ میری صحت کے متعلق تشویش کے تار اور خط اپنی منزل تک پہنچتے ہی نہیں۔

ہزاروں بالشویک، لیننسٹ جنہوں نے اکتوبر انقلاب اور عالمی پرولتاریہ کے لئے بیش قیمت خدمات انجام دی ہیں، اب ان لوگوں کے ہاتھوں قید اور جلاوطنی کی سختیاں برداشت کر رہے ہیں جن کا انقلاب میں کوئی حصہ ہی نہیں ہے۔

سٹالن کا ٹولہ جس بے ہودگی اور بے حیائی سے حزب مخالف کے خلاف ظلم وتشدد پر اترا ہوا ہے، لینن اپنی زندگی میں اس کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ یہ ٹولہ جی، پی، یو کی ملی بھگت سے اس کوشش میں مصروف ہے کہ پرولتاریہ کی آمریت کے دشمنوں سے حزب مخالف کا کوئی نہ کوئی تعلق جوڑ دے۔ وہ ایسا کرنا بہت ضروری سمجھتا ہے۔ میرا قریبی رفیق جارجی وسیلائی وچ بوٹوف جو خانہ جنگی کے سارے عرصے میں انقلابی کونسل کے سیکریٹریٹ کا انچارج تھا، اسے اب گرفتار کر کے ناقابل برداشت حالات میں رکھا جا رہا تھا، اس پر تشدد کر کے اسے جھوٹا بیان دینے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ نتیجتاً وہ جیل میں بھوک ہڑتال کرنے پر مجبور ہو گیا۔ وہ پچاس دن بھوک ہڑتال پر رہا اور اس نے اسی حالت میں اپنی جان دے دی۔ اکتوبر انقلاب سے وفاداری کے اظہار پر بہترین بالشویکوں پر جسمانی اور ذہنی تشدد کی انتہا کر دی گئی ہے۔ یہ حالت ہے اور جی، پی، یو کا کہنا ہے کہ وہ حزب مخالف، خصوصاً میری سیاسی سرگرمیوں کے راستے میں کوئی رخنہ نہیں ڈال رہا۔

میرے حالات زندگی میں تبدیلی پیدا کرنے کے اس سے زیادہ اور کیا معانی ہو سکتے ہیں کہ مجھے جلاوطنی سے قید میں ڈال دیا جائے۔ یہ فیصلہ میرے لیے کسی قسم کی حیرت کا باعث نہیں ہوگا۔ یہ فیصلہ تو 1924 ہی میں کر لیا گیا تھا جسے اب بتدریج عملی لباس پہنایا جا رہا ہے تا کہ پارٹی غیر محسوس طریقے سے سٹالن کے طریقہ کار سے واقف ہوتی جائے۔ جس کی بے ہودگی اور غیر وفاداری اب نوکر شاہی کی بد دیانتی کی شکل میں سامنے آ گئی ہے۔

یوں لگتا ہے جیسے میں نے اس الٹی میٹم کو بہت پہلے دیکھ لیا تھا۔ اسی کے پیش نظر ہم نے چھٹی کانگریس کے اعلان میں کہا تھا۔ میں یہ اعلان حرف بہ حرف درج کر رہا ہوں۔ ''کسی انقلابی سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ اپنی سیاسی سرگرمیاں ترک کر دے، ایک احمقانہ بات ہوگی اور کوئی پاگل ہی اس قسم کا وعدہ دے

سکتا ہے۔''

ہر کوئی اپنی اپنی بساط کے مطابق کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہے۔آپ پرولتاریہ کے خلاف کارفرما طاقتوں کی پالیسیاں چلاتے رہیں۔ ہم اپنے فرائض پہنچانتے ہیں۔ ہم انہیں زندگی کے اختتام تک نبھاتے جائیں گے۔''

ایل ٹراٹسکی

16 دسمبر1928،الماتا

یہ خط لکھنے کے ایک ماہ تک کوئی ہلچل نہ ہوئی۔ ماسکو سے خفیہ رابطے کے سوا باہر کی دنیا سے ہمارا ہر قسم کا تعلق ختم ہو گیا۔جنوری میں ہمیں فقط ماسکو کے اخبارات ملتے رہے۔ وہ دائیں بازو کے خلاف جس قدر زیادہ لکھتے، ہمارا یقین بڑھتا جاتا کہ بائیں بازو کے خلاف کاروائی کا آغاز ہونے والا تھا۔ سٹالن کا یہی طریقہ کار ہے۔

جی، پی، یو کا کارندہ وولنسکی مزید ہدایات کے انتظار میں الماتا ہی میں بیٹھا ہوا تھا۔ 20 جنوری کو وہ جی، پی، یو کے دوسرے بہت سے اہل کاروں کے ہمراہ میرے دروازے پر نمودار ہوا۔انہوں نے مجھے جی، پی، یو کی 18 جنوری 1929 کو منعقد ہونے والی میٹنگ کی کاروائی کا ایک اقتباس دیا۔لکھا تھا:

جب اس فیصلے کو قبول کرنے کے سلسلے میں مجھے ایک کاغذ دیا گیا تو میں نے اس پر لکھ دیا۔''جی، پی، یو کا مجرمانہ اور غیر قانونی فیصلہ مجھے 20 جنوری 1929 کو مل گیا ہے۔ٹراٹسکی''

میں نے اس فیصلے کو اس لئے مجرمانہ لکھا کہ اس میں مجھ پر دانستہ طور پر مسلح جدوجہد کے ذریعے حکومت کا تختہ الٹنے کا الزام عائد کیا گیا تھا مجھے ملک بدر کرنے کی یہ ایک انتہائی فضول حرکت تھی۔ اکتوبر انقلاب اور سوویت اقتدار کی تعمیر کرنے والوں کی طرف سے اگر کوئی ایسی حرکت کی جاتی تو یہ ہاتھوں سے بنائی ہوئی عمارت کو خود گرانے کے مترادف ہوتی جو ملک کے لئے ایک بڑی تباہی کی صورت بن جاتی۔ اس سے بڑا جھوٹ کیا ہو سکتا تھا۔ سوویٹ حکومت پر ہمارا مکمل یقین ہے۔ ہم تو داخلی اصلاح کے حق میں ہیں۔

جب میں نے پوچھا کہ مجھے کہاں ملک بدر کیا جائے گا تو جواب ملا کہ یورپی روس میں جی، پی، یو کا ایک کارندہ مجھے ملے گا اور وہی اس کے بارے میں بتائے گا۔ اگلا سارا دن پھر سے سامان باندھنے میں

گزر گیا جس میں زیادہ تر کتابیں اور مسودے تھے۔ یہاں میں بتا تا چلوں کہ جب جی، پی، یو کا کارندہ آیا تو اس کا میری طرف رویہ بہت اچھا تھا۔

22 جنوری کی صبح کو میں، میری بیوی اور میرا بیٹا حفاظتی عملے کے ہمراہ دوبارہ ایک نئے سفر پر چل پڑے۔ ہماری بس برف سے ڈھکی ہوئی راہ پر کرد کے پہاڑوں کے سلسلے سے گزر رہی تھی۔ چوٹی پر پہنچے تو بھاری باری برف اور تیز ہوا نے ہمیں اپنی زد میں لے لیا۔ طاقت ور ٹریکٹر جو بس کو عقب سے دھکا لگا رہا تھا، خود برف میں پوری طرح پھنس گیا۔ اس کے ساتھ ہماری بس بھی۔ برف کے طوفان میں سات آدمی برف میں جم کر مرنے کی تیاری کرنے لگے۔ ہمیں برف پر پھلنے والی گاڑیوں میں منتقل کر دیا گیا۔ جنہوں نے سات گھنٹے میں بڑی مشکل سے تیس کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا۔ راستے میں ہمیں ترکستان، سائبیرین ریلوے تعمیر کرنے کے لئے سامان لے جاتے ہوئے بہت سے ٹرک ملے۔ سب کے سب برف میں دھنسے ہوئے تھے۔ ان میں سے کچھ سامان گھوڑا گاڑیاں پر بھی لے جایا جا رہا تھا۔ کوچوانوں نے گاڑیوں میں سے اپنے گھوڑے کھول کر انہیں اپنے ساتھ لے جا کر ایک قریبی کوغستانی کیمپ میں پناہ لے رکھی تھی۔

پہاڑ کی دوسری طرف ایک گاڑی کھڑی ہے۔ ہم اس میں سوار ہو جاتے ہیں۔ وہ ہمیں پسپک کے ریلوے سٹیشن تک لے آتی ہے۔ یہاں ہمیں دوبارہ ایک ڈبے میں سوار کرا دیا جاتا ہے۔ راستے میں ہمیں جو اخبار ملتا ہے اس میں حزب اختلاف کے راہنماؤں کو ملک بدر کرنے کے لئے رائے عامہ طلب کی گئی ہے۔ دوران سفر ہی میں ہمیں بذریعہ تار مطلع کیا جاتا ہے کہ ہمیں قسطنطنیہ بھیجا جا رہا ہے۔ میں ماسکو میں اپنے کنبے کے دو افراد سے ملاقات کا مطالبہ کرتا ہوں، یعنی اپنے دوسرے بیٹے اور اس کی بیوی سے۔ انہیں سٹیشن پر لایا جاتا ہے۔ جی، پی، یو کا نیا کارندہ بالانوف مجھے قسطنطنیہ جانے اور وہاں رہنے کے فوائد سے آگاہ کرتا ہے۔ میں ان فوائد سے فائدہ اٹھانے سے قطعی طور پر انکار کر دیتا ہوں۔ بالانوف بذریعہ تار ماسکو بات کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ وہاں پہلے ہی ہر چیز طے ہو چکی ہے۔ میں رضا کارانہ طور پر چلا جاؤں تو بہتر ہوگا۔

ہماری ٹرین اپنی مقررہ سمت سے ہٹ کر آہستہ آہستہ ایک دوسری ریلوے لائن پر چلنے لگتی ہے۔ پھر وہ ایک چھوٹے سے سٹیشن پر پہنچ کر سٹیشن سے ذرا ہٹ کر لکڑی کے دو بڑے بلاکوں کے درمیان کھڑی ہو جاتی ہے۔ دن گزرتے جا رہے ہیں۔ ٹرین کے گرد کھانے کے خالی ڈبوں کا ڈھیر بڑھتا جا رہا ہے، کوؤں

اور گدھوں کو خوراک کی وافر مقدار مل جاتی ہے۔ایک بڑی تنہائی ہمارے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ یہاں خرگوش دکھائی نہیں دیتے۔خزاں میں ایک متعدی بیماری نے ان کا صفایا کر دیا ہے۔ایک لومڑی چوری چھپے ٹرین تک آ جاتی ہے۔انجن ہر روز ایک ڈبے کے ساتھ ایک بڑے سٹیشن پر جاتا ہےاور وہاں سے ہمارے لئے کھانا اوراخبارات لے کرآتا ہے۔چیلیں اور گدھ ہمارے ڈبے کے گرد منڈلاتے رہتے ہیں۔ہم اناطول فرانس اور کلوچی وسکی کی لکھی ہوئی تاریخ روس کی دہرائی میں مشغول رہتے ہیں۔استراتی کو میں نے پہلی بار پڑھا ہے۔سردی درجہ انجماد سے 53 درجے (فارن ہیٹ) نیچے چلی گئی ہے۔ ہمارا انجن ٹھنڈا ہونے کے خطرے سے بچنے کے لئے آگے پیچھے حرکت کرتا رہتا ہے۔ریڈیو سٹیشن ہمارا اتا پتا معلوم کرتے رہتے ہیں۔ہم ان پر کوئی توجہ نہیں دیتے اور شطرنج کھیلتے رہتے ہیں۔توجہ دینے کا فائدہ کیا کہ جب ہم انہیں کچھ بتا ہی نہیں سکتے۔ہم یہاں رات کے وقت لائے گئے تھےاور ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ ہم کہاں ہیں۔

ہمارے بارہ دن اور بارہ راتیں اسی حال میں گزر گئے۔اخبارات سے ہمیں معلوم ہوا کہ سینکڑوں گرفتاریاں ہوئی تھیں۔ان میں ڈیڑھ سو ٹراٹسکائیٹ بھی شامل تھے۔گرفتار ہونے والوں میں کوتارازے بھی شامل تھا جو جارجیا عوامی کمسار کی سوویٹ کا سابق چیئر مین تھا۔مدی ایوانی بھی تھا جو پیرس میں سوویٹ روس کا تجارتی اتاشی تھا۔اس کے علاوہ ہمارا بہترین ادبی نقاد وورنسکی اور متعدد دوسرے لوگ تھے جن میں زیادہ ترا کتوبر انقلاب سے تعلق رکھتے تھے۔

8 فروری کو بالانوف نے بتایا۔''ہماری حکومت کی تمام مساعی کے باوجود جرمن حکومت آپ کو جرمنی میں داخل ہونے کی اجازت دینے پر تیار نہیں ہے۔اب مجھے آخری حکم ملا ہے کہ میں آپ کو قسطنطنیہ پہنچا دوں۔''

''میں وہاں اپنی مرضی سے نہیں جاؤں گا اور ترکی کی سرحد پر یہ کہہ بھی دوں گا۔''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔آپ کو ترکی کے اندر داخل کر دیا جائے گا۔''

''تم لوگوں نے ترکی پولیس سے کوئی ساز باز کی ہے؟''

اس نے میری بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔''ہمیں حکم بجالانے کے لئے کہا گیا ہے۔''

بارہ دن ایک ہی جگہ کھڑے رہنے کے بعد گاڑی پھر حرکت میں آ گئی۔حفاظتی عملے میں مزید اضافہ

ہو گیا۔ پسپک میں گاڑی میں بیٹھنے کے بعد ہمیں تھوڑی دیر کو بھی ڈبے سے باہر نہیں آنے دیا گیا تھا۔ اب ہم پوری تیز رفتاری سے جنوب کی طرف جا رہے تھے۔ گاڑی پانی اور ایندھن لینے چھوٹے سٹیشنوں پر رکتی رہی۔ یہ حفاظتی اقدامات جنوری 1928 میں ماسکو میں میرے حق میں ہونے والے مظاہرے کو مدنظر رکھ کر کیے گئے تھے۔ دوران سفر جو اخبارات ملتے رہتے ان سے ٹراٹسکائٹ کے خلاف کیے جانے والے اقدامات کے متعلق اطلاعات ملتی رہتیں۔ پارٹی کی بالائی سطح پر میری ملک بدری کے سوال پر خاصا تناؤ تھا۔ سٹالن ٹولہ جلدی میں تھا اور اس جلدی کی وجوہات بھی تھیں۔ اس نے سیاسی ہی نہیں علمی رکاوٹوں پر بھی قابو پانا تھا۔ اوڈیسہ سے ہمیں لینن نامی سٹیمر نے لے کر جانا تھا۔ مگر وہ برف میں پھنس گیا اور تمام کوششوں کے باوجود نکالا نہ جا سکا۔ ماسکو کام کو جلد از جلد مکمل کرنے کی ہدایات دے رہا تھا۔ دس فروری کی رات کو ہماری ٹرین اوڈیسہ پہنچی۔ میں ڈبے کی کھڑکی سے مانوس جگہوں کو دیکھتا رہا۔ میں نے اپنی سکول کی زندگی کے سات برس اس شہر میں گزارے تھے۔ ہماری ٹرین کو سیدھا سٹیمر تک لے جایا گیا۔ سخت سردی تھی۔ رات زیادہ گزر جانے کے باوجود سٹیمر کو جی، پی، یو کے لوگوں نے پوری طرح گھیرا ہوا تھا۔ یہاں میں نے اپنے چھوٹے بیٹے اور اس کی بیوی کو الوداع کر دیا۔ وہ گذشتہ دو ہفتوں سے ہماری قید میں برابر کے شریک تھے۔ گاڑی کی کھڑکی سے میں نے ایک بار پھر ہمارے لئے منتظر سٹیمر پر نگاہ ڈالی اور مجھے مارچ 1917 کے زمانے کا وہ سٹیمر یاد آ گیا جس نے نیویارک سے ہمیں روس لے جانا تھا اور جس کو ہالی فیکس کے مقام پر روک لیا گیا تھا۔ پھر مسافروں کے ہجوم کے سامنے مجھے کندھوں پر زبردستی اٹھا کر جہاز سے باہر لے جایا گیا تھا۔ اس وقت بھی ہمارے کنبے کے لوگ اتنے ہی تھے۔ مگر وہ بارہ برس پہلے کی بات تھی۔

ایلیچ نامی سٹیمر جس پر کوئی مسافر نہیں تھا، رات کے ایک بجے روانہ ہوا۔ ساٹھ میل تک برف توڑنے والا جہاز ہمارے آگے راستہ بناتا رہا۔ تیز برفانی ہوا جو دیر سے چل رہی تھی، اس نے ہمیں اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ 12 فروری کو ہم خلیج باسفورس میں داخل ہوئے۔ ترکی پولیس جو بویوکدہری کی بندرگاہ سے سٹیمر میں سوار ہوئی تھی، اسے پڑتال کے بعد ہمارے اور جی، پی، یو کے لوگوں کے سوا کوئی دوسرا مسافر جہاز پر دکھائی نہ دیا۔ میں نے جمہوریہ ترکی کے صدر کمال اتاترک پاشا کے نام یہ پیغام ارسال کیا۔

"جناب والا! قسطنطنیہ کے دروازے پر میں آپ کو یہ اطلاع دینے کا اعزاز حاصل کر رہا ہوں کہ میں ترکی کی سرحدوں پر اپنی مرضی سے نہیں آیا۔ مجھے زبردستی یہاں تک لایا گیا ہے۔ جناب صدر! میری

دراخوشت ہے کہ میرے جذبات کوملحوظ خاطر رکھ کر میرا اسلام قبول فرمایا جائے____

ایل، ٹراٹسکی

12فروری1929

یہ بیان ثمرآور ثابت نہ ہوا۔ سٹیمر بندرگاہ میں داخل ہوگیا۔ بائیس دنوں میں چھ ہزار کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے ہم قسطنطنیہ پہنچ گئے۔

ویزے کے بغیر سیارہ

ہم قسطنطنیہ پہنچ گئے۔ شروع میں روسی نصلیٹ کی عمارت میں ٹھہرے۔ پھر اپنا اپارٹمنٹ لے لیا۔

اس زمانے کے ابتدائی حصے کے متعلق میری بیوی کچھ اس طرح رقم طراز ہے۔

''قسطنطنیہ میں رہائش اختیار کرنے کے سلسلے میں چھوٹے موٹے واقعات بیان کرنا وقت ضائع کرنا ہوگا۔ فقط ایک واقعے پر اکتفا کروں گی۔ ہم اوڈیسہ جاتے ہوئے ابھی ٹرین ہی میں تھے۔ جی، پی، یو کا کارندہ بولانوف ہمارے لیے غیر ضروری اور فضول قسم کے انتظامات میں مصروف تھا۔ ایل، ڈی نے اس سے کہا۔ ''بہتر ہوگا کہ تم سرمکس اور پزنانسکی کو میرے ساتھ جانے دو۔ وہ میری دیکھ بھال کر لیں گے۔

''بولانوف نے اسی وقت ماسکو سے پوچھ لیا۔ اگلے سٹیشن پر بولانوف نے بتایا کہ جی، پی، یو یعنی پولٹ بیورو اس تجویز سے متفق تھا۔ ایل، ڈی سے ہنس کر کہا۔ ''تم پھر ہمیں دھوکہ دو گے۔''

''پھر آپ مجھے جلاد کہہ لیں۔'' بولانوف نے ایک دکھ کے ساتھ کہا۔

''میں تمہیں کس لئے بے عزت کروں؟'' ایل، ڈی نے جواب دیا۔ ''میرے مخاطب تم نہیں، سٹالن ہے۔ وہ ہمیں دھوکہ دے گا۔''

''قسطنطنیہ پہنچنے پر ایل، ڈی نے سرمکس اور پزنانسکی کے بارے میں پوچھا۔ چند روز بعد قونصلیٹ کا ایک اہلکار ماسکو سے پیغام لایا کہ ان دونوں کو رہا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بعد میں بھی ہم اسی قسم کے تجربات سے دوچار ہوتے رہے۔

قسطنطنیہ پہنچنے پر اخبارات ہماری تقدیر کے متعلق کئی قسم کی افواہوں سے بھرے نظر آتے۔ پریس ہر

قسم کی اطلاعات کے متعلق اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ ہوائیں بہت سے بیج زمین پر گرا دیتی ہیں۔ کوئی نہ کوئی تو اگ ہی پڑتا ہے۔ پریس بھی اسی طرح اپنا کام کرتی ہے۔ وہ کوئی افواہ پکڑ کر اس کا پتنگڑ بناتی رہتی ہے، سچی بات سامنے آنے سے پہلے ہزاروں خبریں اپنی موت آپ مر جاتی ہیں۔ بعض دفعہ تو اس میں کئی برس لگ جاتے ہیں۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ سچائی کو چہرہ دکھانے کا کبھی وقت ہی نہیں ملتا۔

کبھی کبھی حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ انسان میں جھوٹ بولنے کی صلاحیت کس قدر ہوتی ہے۔ میں کسی کی توہین کی نیت سے ایسا نہیں کہہ رہا، بلکہ فقط ایک حقیقت بیان کرنے کی خاطر یہ کہہ رہا ہوں، دروغ گوئی کی خواہش اور عادت ہماری زندگیوں کے تضادات کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ کہ اخبارات کبھی کبھی سچی بات بھی لکھ دیتے ہیں۔ میرا مقصد صحافیوں کی دل آزادی نہیں ہے مگر وہ بھی دوسرے لوگوں سے زیادہ مختلف نہیں ہوتے۔

زولا نے فرانسیسی اخبارات کو دو گروہوں میں تقسیم کیا تھا۔ ایک کاروباری دوسرے کرپشن سے پاک۔ موخر الذکر اخبارات کے متعلق بھی گاہے بگاہے خود کو بیچ دیتے ہیں مگر بہت زیادہ قیمت پر۔ یہ بات عام اخبارات کے متعلق تو یقین سے کہی جا سکتی ہے مگر زرد صحافت تو کسی ہچکچاہٹ اور پیچھے دیکھے بغیر بلا خوف وخطرے جھوٹ بولتی ہے۔ ''دی ٹائمز'' اور لی ٹیمس'' جیسے اخبار سچ ضرور بولتے ہیں مگر بے موقع۔ جب اس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ایسا وہ اس لیے کرتے ہیں کہ ضرورت پڑنے پر رائے عامہ کو دھوکہ دیا جا سکے۔

''ٹائمز'' نے رپورٹ شائع کی کہ میں قسطنطنیہ سٹالن کی ملی بھگت سے مشرق قریب ے ممالک کو فتح کرنے کا ئی فوجی منصوبہ تیار کرنے کی غرض سے آیا تھا۔ سٹالن سے میری چھ سالہ لڑائی کو اس نے ایک ایسا ڈرامہ قرار دیا جس میں کرداروں کا پہلے تعین ہو چکا تھا۔ ''اس پر کون یقین لائے گا۔؟'' بعض امید پرست پوچھ سکتے ہیں۔ مگر وہ غلطی پر ہیں۔ بہت سے لوگ کر لیں گے۔ ممکن ہے چرچل یقین نہ کرے مگر کلینس یقین کرے گا، خواہ آدھا یقین ہی کرے۔ سرمایہ دارانہ جمہوریت کا طریقہ کار یہی ہوتا ہے اور وہ اسی طرح چلتی رہتی ہے۔ مگر یہ گزر جانے والے لمحات ہوتے ہیں۔ کلینس کا ذکر ابھی کچھ دیر بعد کریں گے۔

قسطنطنیہ آنے کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد برلن کے ایک اخبار میں جرمنی کی قومی اسمبلی کی دسویں سالگرہ کے موقع پر قومی اسمبلی کے صدر لوبے کی ایک تقریر شائع ہوئی۔ تقریر کے آخری الفاظ یہ تھے۔ ممکن

ہے کہ ہم کبھی مسٹر ٹراٹسکی کو سیاسی پناہ کا جمہوری حق دے دیں۔'' (زبردست تالیاں)

لوبے کے یہ الفاظ میرے لئے بڑی حیرت کا باعث تھے۔ کیونکہ اس سے پہلے جرمنی میں میرے داخلے کے بارے میں جتنی کاروائی ہوئی تھی، وہ میرے خلاف گئی تھی، سوویٹ حکومت کے ایجنٹوں کے بھی اسی قسم کے بیانات تھے۔ 15 فروری کو میں نے میرے ساتھ آنے والے جی، پی، یو کے نمائندے کو قسطنطنیہ بلایا اور اس سے کہا۔ ''میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مجھے غلط اطلاع دی گئی تھی۔ لوبے نے چھ فروری کو تقریر کی تھی۔ ہم اوڈیسہ سے ترکی کے لئے دس فروری کو روانہ ہوئے تھے۔ اس وقت تک ماسکو میں لوبے کی تقریر کی خبر پہنچ چکی ہوگی۔ میں نے اس سے کہا کہ لوبے کی تقریر کی بنیاد پر سوویٹ حکومت جرمن حکومت سے درخواست کرے کہ وہ مجھے ویزا جاری کر دے۔ اس طرح سٹالن نے میرے جرمنی میں داخلے کے سلسلے میں جو فضول بحث چھیڑ رکھی ہے، ختم ہو جائے گی۔'' دو دن بعد جی، پی، یو کا نمائندہ میرے لئے یہ جواب لے کر آیا۔ ''جرمن حکومت فروری کے آغاز ہی میں آپ کے ویزے کی درخواست رد کر چکی ہے۔ ایک نئی درخواست بے کار ثابت ہوگی۔ لوبے کی تقریر غیر ذمہ دارانہ تھی۔ اگر آپ تصدیق کرنا چاہتے ہیں تو ویزے کے لئے درخواست دے کر دیکھ لیں۔''

مجھے اس پر یقین نہ آیا۔ جی، پی، یو کے کارندوں کے بجائے جرمن قومی اسمبلی کا صدر اپنی حکومت کی پوزیشن کو بہتر طور پر سمجھتا تھا۔ میں نے اس دن لوبے کو تار ارسال کیا کہ اس کے بیان کی روشنی میں میں نے جرمن قونصلیٹ میں ویزے کی درخواست جمع کرا دی تھی۔ شر پسند اخباروں نے پھر یہ خبر لگا دی کہ انقلابی آمریت پر یقین رکھنے والا شخص ایک جمہوری ملک میں سیاسی پناہ ڈھونڈ رہا تھا۔ بعض نے یہ بھی لکھا کہ یہ سبق مجھ پر جمہوریت کے فوائد کھول دے گا۔ میرے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ یہ سبق سیکھنے کا انتظار کرتا۔

جمہوری حقوق کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ سیاسی پناہ فقط ان لوگوں کو دی جائے جو پناہ دینے والے ملک کے سیاسی نقطہ نظر سے متفق ہوتے ہیں۔ ترکی نے ایسا نہیں کیا تھا۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ جس حکومت نے کس کو جلاوطن کیا ہوتا ہے اس سے پوچھ کر کوئی ملک اس جلاوطن کو سیاسی پناہ دے۔ کوئی حکومت اپنے مخالفوں کو (کاغذات میں یہی لکھا ہے) بھی سیاسی پناہ دے سکتی ہے بشرطیکہ وہ اس ملک کے قوانین کا احترام کریں۔ میں نے اگر جرمنی میں داخل ہونا تھا تو سوشل ڈیموکریسی کے ایک مخالف کی

حیثیت سے ہونا تھا۔قسطنطنیہ میں موجود سوشل ڈیموکریسی کے ترجمان اخباروں کو انٹرویو دیتے وقت میں نے زیادہ تر اسی بات کی وضاحت کی تھی۔اس انٹرویو کی چند باتیں درج ذیل ہیں۔

''اس وقت جب کہ میں جرمنی میں داخل ہونے کے لئے ویزے کی درخواست جمع کرا رہا ہوں جہاں سوشل ڈیموکریٹوں کی حکومت ہے، میں سوشل ڈیموکریسی کے بارے میں اپنے رویے کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں جس میں ابھی تک کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی ہے۔سوشل ڈیموکریسی کے بارے میں میرا رویہ آج بھی وہی ہے جو پہلے تھا۔اس علاوہ سٹالن کے مرکزیت پسند ٹولے کے خلاف میری جدوجہد سوشل ڈیموکریسی کے خلاف جدوجہد ہی کا ایک حصہ ہے۔یہاں ہمارے درمیان کسی قسم کا کوئی ابہام نہیں ہونا چاہیے۔''

بعض اخبارات جرمنی میں داخل ہونے کے لئے میری درخواست کو جمہوریت کے متعلق میرے رویے میں کسی تضاد کو تلاش کر رہے ہیں۔مگر اس میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ہم انتشار پسندوں کی طرح جمہوریت سے منکر نہیں ہیں۔جمہوریت سے پہلے جو طرز حکومت تھا، جمہوریت یقیناً اس سے بہتر ہے۔لیکن یہ حرف آخر نہیں ہے۔اسے سوشلسٹ طرز حکومت کے لئے جگہ چھوڑنی ہوگی۔انجام کار پرولتاریہ کی آمریت ہی سوشلسٹ معاشرے میں پل کا کام انجام دے گی۔

تمام سرمایہ دار ممالک میں کمیونسٹ پارلیمانی جدوجہد میں حصہ لیتے ہیں۔سیاسی پناہ حاصل کرنے کے حق اور پریس کی آزادی کے حق کو استعمال کرنے میں کوئی فرق نہیں ہے۔''

میرے علم کے مطابق میرا یہ انٹرویو کہیں بھی شائع نہ ہوا اور اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے۔اس عرصے میں سوشل ڈیموکریٹ اخبارات میں مجھے سیاسی پناہ دینے کے سلسلے میں میرے حق پر زور دیا جانے لگا۔ایک سوشل ڈیموکریٹک وکیل ڈاکٹر کے۔روزن فیلڈ نے اپنے طور پر جرمنی میں میرے داخلے کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے عدالتی کاروائی شروع کر دی۔ابتدا میں اس اسے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔چند روز بعد مجھے اس کی طرف سے ایک تار موصول ہوا جس میں اس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں جرمنی آنے پر اپنے قیام کے دوران میں خود پر کتنی پابندیاں عائد رکھ سکوں گا۔میں نے اسے جواب دیا۔

''میرا ارادہ برلن سے باہر کسی بالکل الگ تھلگ جگہ پر رہنے کا ہے۔کسی عوامی جلسے میں شرکت نہیں کروں گا اور جرمن قوانین کے تحت اپنے ادبی کام میں مصروف رہوں گا۔''

اب سوال سیاسی پناہ کے حق کا نہیں بلکہ جرمنی میں غیر معمولی مستسنیات کی بنا پر رہائش اختیار کرنے کا پیدا ہو گیا تھا۔ میرے مخالف جمہوریت کا جو سبق مجھے دینا چاہتے تھے وہ بڑی محدود نوعیت کا تھا۔ لیکن بات یہیں ختم نہ ہوئی۔ چند روز بعد مجھ سے مزید سوالات پوچھے گئے۔ کیا میں جرمنی میں اپنے علاج کی خاطر آنا چاہتا تھا؟ میں نے جواباً کہا۔ ''مجھے کم از کم اپنے علاج کے عرصے تک کے لئے جرمنی میں ٹھہرنے کی اجازت دی جائے۔''

اس طرح سیاسی پناہ کا حق علاج کے حق میں تبدیل ہو گیا۔ میں نے متعدد نامور ڈاکٹروں کے نام گنوا دیے ماضی میں میں جن کے زیر علاج رہا تھا۔ مجھے اب ان کی زیادہ ضرورت تھی۔

ایسٹر کے قریب جرمن اخبارات میں ایک نئی خبر شائع ہوئی۔ سرکاری حلقوں کی رائے میں ٹراٹسکی اتنا بیمار نہیں تھا کہ اسے فوری طور پر جرمن ڈاکٹروں کی ضرورت پیش آجاتی۔ 31 مارچ کو میں نے ڈاکٹر روزن فیلڈ کو تار بھیجا۔ ''پریس کی رپورٹ کے مطابق میری صحت اتنی خراب نہیں ہے کے مجھے ایک دم ویزے کی ضرورت پڑ جائے۔ میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا واقعی لوبے نے مجھے سیاسی پناہ دینے کی بات کی تھی یا جرمنی میں میرے کفن دفن کی؟ میں کسی بھی طبی کمیشن سے اپنا جسمانی معائنہ کرانے کو تیار ہوں اور علاج کرانے کے بعد جرمنی سے فوراً چلا جاؤں گا۔''

اس طرح چند ہفتوں میں تین بار جمہوری اصول کا سر قلم کیا گیا۔ سب سے پہلے سیاسی پناہ کے حق کو عارضی رہائش کے حق تک محدود کر دیا گیا۔ پھر یہ حق میں اور علاج کے دوران موت کی صورت کفن دفن کے حق میں بدل دیا گیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں مرنے کے بعد یا لاش کی شکل میں جمہوریت کے فوائد سے فیض یاب ہو سکتا تھا۔

میرے تار کا کوئی جواب نہ آیا۔ چند روز انتظار کرنے کے بعد میں نے دوبارہ برلن تار بھیجا۔ ''کیا میں جواب نہ آنے کو انکار سمجھوں؟'' اس کے بعد 12، اپریل کو یعنی دو ماہ بعد جواب آیا کہ جرمن حکومت نے مجھے ویزا دینے سے افسوس کے ساتھ انکار کر دیا تھا۔ اب قومی اسمبلی کے صدر لوبے کو تار بھجوانے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا۔ میں نے اسے لکھا ''سیاسی پناہ کے جمہوری حق میں افسوس کے لئے کہیں جگہ نہیں بنتی۔ ٹراٹسکی کے لئے'' یورپ میں ''جمہوری ویزا'' حاصل کرنے کی یہ ایک مختصر مگر یادگار قسم کی تاریخ ہے۔''

اگر مجھے جرمنی میں سیاسی پناہ مل جاتی تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ اس سے مارکس کے طبقاتی ریاست کے نظریے کی نفی ہو جاتی تھی۔ کوئی بھی جمہوری حکومت اپنے بڑے بڑے اصول سماج کے زیادہ بڑے طبقے سے کشید کرتی ہے اور ان اصولوں میں داخلی منطق کی بدولت سیاسی پناہ کا حق بھی شامل ہوتا ہے۔ ایک پرولتاری انقلابی کو پناہ دینے سے بورژوا جمہوریت کے کردار کی نفی نہیں ہوتی تھی۔ بہر حال اس سلسلے میں بحث کی گنجائش نہیں رہتی۔ جرمنی میں سوشل ڈیموکریٹوں نے واقعی سیاسی پناہ کا کوئی حق نہیں رکھا ہوگا۔

16، دسمبر کو سٹالن نے جی، پی، یو کے ذریعے مجھے تجویز بھجوائی کہ میں سیاسی سرگرمیوں سے کنارہ کش ہو جاؤں۔ جب پریس میں میری سیاسی پناہ کا سوال زیر بحث تھا تو جرمنوں نے بھی اسی قسم کا مطالبہ کیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ سٹالن کی طرح ملر اور سٹر سیسیمان مان کی حکومت بھی میرے نظریات کو خطرناک اور نقصان دہ سمجھتی تھی۔ دونوں حکومتیں پرولتاری انقلاب کے مفادات کے تحفظ کی خاطر ایسا کر رہی تھیں۔ دوسری طرف چیمبر لین، کاونٹ ویس ٹارپ اور اسی نوعیت کے دوسرے لوگ سرمایہ دارانہ نظام کے تحفظ کے نام پر مجھے ویزا جاری نہ کرنے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ ہرمان ملر کی حکومت نے دونوں کی بات مان کر اپنے دائیں اور بائیں بازوؤں کے میلغوں کو مطمئن کر دیا۔ اس طرح انقلابی مارکسزم کے خلاف سوشل ڈیموکریٹ حکومت متحدہ بین الاقوامی محاذ کے درمیان بطور رابطہ فرائض انجام دینے لگی۔ ایسے کسی متحدہ محاذ کے متعلق کمیونسٹ مینی فسٹو میں پہلے ہی سے یہ سطور درج ہیں۔ ''اس بھوت (کمیونزم) کے خلاف یورپ کی تمام طاقتیں اکٹھی ہو جائیں گی۔ یورپ اور زار بھی، فرانسیسی انقلابی اور جرمن پولیس مین بھی، نام مختلف ہیں مگر ان کا کام ایک ہی ہے۔ آج صرف اتنا ہوا ہے کہ جرمن پولیس مین کا کردار سوشل ڈیموکریٹوں نے سنبھال لیا ہے۔ مگر صورتحال میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ بنیادی طور پر وہ اسی چیز کی حفاظت کر رہے ہیں جسے ہوہن زولرن کی پولیس نما حکومت تحفظ مہیا کرتی رہی تھی۔ جمہوری ملک جن وجوہ کی بنیاد پر ویزا دینے سے انکار کرتے ہیں وہ مختلف ہیں۔ یہاں میں ناروے کی مثال دینا چاہوں گا۔ سب سے پہلے ناروے کی حکومت نے میرے تحفظ کا سوال اٹھایا۔ مجھے کبھی خیال نہیں آیا تھا کہ اوسلو میں میرے اتنے ہمدرد دوست بھی ہو سکتے ہیں۔ جرمن، فرانسیسی، برطانوی اور دوسری جمہوری حکومتوں کی طرح ناروے کی جمہوری حکومت بھی سیاسی پناہ دینے کے حق مین ہے۔ جیسا کہ ہو کوئی جانتا ہے اس حق کی

بین الاقوامی حیثیت ہے۔ لیکن ناروے کی حکومت مجھ سے یہ چاہتی تھی کہ میں اسے یہ یقین دلاؤں کہ ناروے آنے کے بعد میری جان کو کوئی خطرہ تو نہیں ہوگا۔ یعنی اسے میرے تحفظ کا تردد تو نہیں کرنا پڑے گا۔ پھر وہ میری خاطر مدارت کو تیار تھی۔

ناورے میں میرے دوست میرے لئے ویزا حاصل کرنے میں مصروف تھے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے ناروے کے وزیراعظم کو اپنی خفیہ پولیس کے چیف سے بات کرنے کی ضرورت تھی جسے نہ جانے کن وجوہ کی بنیاد پر ایک جمہوری نظام میں اس قدر اہمیت حاصل تھی۔ پولیس چیف نے یہ بہترین تجویز پیش کی کہ اگر ٹراٹسکی کے دشمن اسے ناروے کی سرحدوں سے پرے ہی ختم کر دیں تو کتنی اچھی بات ہوگی۔ اگرچہ اس نے ان الفاظ میں بات نہیں کی تھی مگر اس کے کہنے کا مطلب یہی تھا۔ ناروے کے وزیر انصاف نے اپنی پارلیمان کو بتایا کہ ٹراٹسکی کے تحفظ پر جس قدر رقم خرچ ہوگی، ناروے کا بجٹ اس کا متحمل نہیں ہو سکے گا۔ نتیجہ یہ نکالا گیا کہ جس شخص کو سب سے زیادہ سیاسی پناہ کی ضرورت تھی، اسے اس حق سے محروم رکھا جائے۔

فرانسیسی حکومت سب سے زیادہ چالاک ثابت ہوئی۔ اس نے اطلاع دی کہ اس کے وزیر داخلہ مالوی نے فرانس سے میرے نکالے جانے کے سلسلے میں بہت عرصہ پہلے جو حکم جاری کیا تھا وہ ابھی تک منسوخ نہیں ہوا تھا۔ جمہوریت اور سیاسی پناہ کے راستے میں اس سے بڑی اور کیا رکاوٹ ہو سکتی تھی۔ اس سے پہلے میں اسی کتاب میں بتا چکا ہوں کہ میرے فرانس سے نکالے جانے کے حکم کے باوجود فرانسیسی حکومت کس طرح اپنے افسر میری تحویل میں دینے کو تیار تھی اور کس طرح فرانسیسی ارکان پارلیمان، سفیر اور اس کا ایک وزیراعظم مجھے ملنے روس آیا تھا۔ لیکن یہ ساری کاروائی دو ایسے علاقوں میں ہو رہی تھی جن کا بظاہر آپس میں کوئی تعلق نہیں تھا۔ موجودہ صورتحال یہ تھی کہ زار کی حکومت کے کہنے پر مجھے فرانس سے نکالنے کا جو حکم جاری کیا گیا تھا اگر وہ فرانس کی وزارت داخلہ کے ریکارڈ روم میں اب موجود نہیں تھا تو مجھے وہاں سیاسی پناہ مل سکتی تھی۔ ایک مشہور مقولہ ہے کہ پولیس کا حکم نامہ ایک قطبی ستارہ ہوتا ہے جو کہیں نہ کہیں دکھائی دیتا رہتا ہے۔

بہرحال صورتحال یہ تھی کہ سیاسی پناہ کے حق کو فرانس سے دیس نکالا مل چکا تھا۔ پھر یہ حق کہاں تلاش کیا جائے۔ برطانیہ میں کوشش کر کے دیکھ لیتے ہیں۔

5، جون 1929 کو آزاد لیبر پارٹی کے راہنما مزے میکڈانلڈ نے مجھے ایک سرکاری دعوت نامہ بھیجا کہ میں لندن آ کر ان کی پارٹی کے ممبران سے خطاب کروں۔ دعوت نامے پر پارٹی کے جنزل سیکریٹری کے دستخط تھے اوراس کی عبارت یہ تھی۔ ''لیبر حکومت کی تشکیل کے بعد ہمارا خیال ہے کہ آپ کو اس مقصد کے لئے یہاں آنے میں کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔'' اس کے باوجود مشکل پیدا ہو گئی۔ مجھے میکڈانلڈ کے حمائتیوں کے سامنے تقریر کا موقع مہیا نہ کیا گیا اور نہ ہی برطانوی ڈاکٹروں سے طبی مشورے کا۔ مجھے ویزا دینے سے صاف انکار کر دیا گیا۔ ہوم سیکریٹری کلینس نے دارالعوام میں انکار کا دفاع کرتے ہوئے جمہوریت کی ایسی فلسفیانہ تشریح پیش کی جو چارلس دوم کے کسی وزیر کے لئے بڑی سودمند ثابت ہوسکتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ کسی جلاوطن کی طرف سے سیاسی پناہ کے مطالبے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسے سیاسی پناہ مہیا کر دی جائے۔ حکومت کو یہ مطالبہ رد کر دینے کا حق بھی حاصل ہوتا ہے۔ کلینس کی وضاحت ایک لحاظ سے باکمال ہے۔ اس نے ایک ہی ضرب سے نام نہاد جمہوریت کی بنیاد ہلا کر رکھ دی۔ کلینس سٹائل کا سیاسی پناہ کا حق تو زار روس کی حکومت میں بھی موجود تھا۔ جب ایران کا شہنشاہ تمام انقلابیوں کو پھانسی چڑھانے میں ناکام ہونے کے بعد اپنے پیارے ملک سے فرار ہو گیا تو نکولائس دوم نے اسے فقط سیاسی پناہ دینے پر ہی اکتفا کیا بلکہ اوڈیسہ میں اس کا آسائش سے رہنے کا بندوبست بھی کیا۔ لیکن کبھی کسی زار کو کسی آئرش انقلابی کو روس میں سیاسی پناہ لینے کا خیال نہ آیا جہاں کا دستور کلینس کے اصول کے عین مطابق تھا۔ یعنی ریاست اپنے شہری کو جو دیتی یا اس سے لیتی ہے، اسے اس پر قناعت کر لینی چاہیے۔ میسولینی نے اسی اصول پر عمل درآمد کرتے ہوئے افغانستان کے بادشاہ کو سیاسی پناہ دی تھی۔

پاکباز مسٹر کلینس کو اتنا تو معلوم ہونا چاہیے کہ سیاسی پناہ کا حق تو کلیسا بھی دیتا ہے۔ یہ حق اسے عہد عتیق سے وراثت میں ملتا چلا آ رہا ہے۔ اس زمانے میں ایک مجرم کے لئے اتنا ہی کافی ہوتا تھا کہ اگر وہ کسی گرجے کے اندر داخل ہو جاتا یا گرجے کے دروازے ہی کو چھو لیتا تو ایسا کرنے سے اسے اپنا پیچھا کرنے والوں سے نجات مل جاتی تھی۔ کلیسا کسی سیاسی پناہ گزین کو سیاسی پناہ دینا اس کا بنیادی حق سمجھتا تھا، نہ کہ اسے پادری کی مرضی پر چھوڑ دیتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ لیبر پارٹی کے ارکان اگر سوشلزم سے نہیں تو کم از کم کلیسا کی روایت سے تو ضرور آگاہ ہوں گے۔ مگر یہاں بھی مجھے مایوسی ہوئی۔

کلینس اپنے وضع کردہ ریاستی قانون اور نظریے کی پہلی سطور پر ہی کیوں رک گیا۔ یہ بڑی افسوس

ناک بات ہے۔ سیاسی پناہ تو جمہوری نظام کے ڈھانچے کا فقط کا ایک حصہ ہے۔ اور یہ حق اپنے تاریخی تناظر میں اسمبلی میں تقریر کرنے کے حق سے کسی طرح بھی مختلف نہیں ہے۔ مجھے امید ہے کہ مسٹر کلینس کسی دن اس نتیجے پر پہنچ جائے گا کہ اظہار خیال کی آزادی کا حق کسی طرح شہریوں کو ان کے خواہ جیسے بھی خیالات ہیں، ان کے اظہار سے نہیں روکتا اور نہ ہی ریاستی اصول کے مطابق انہیں اپنے سوچنے کے حق پر کسی پابندی کا سامنا ہے۔ جہاں تک ہڑتالوں کی آزادی کا تعلق ہے، برطانوی قانون اس سے پہلے ہی بخوبی واقف ہو چکا ہے۔

کلینس کی بدقسمتی یہ ہے کہ اسے لیبر پارٹی کے بعض ارکان کے قدرے مشکل سوالات کا جواب ذرا وضاحت کے ساتھ دینا پڑ گیا ہے۔ ناروے کے وزیراعظم کو بھی اس ناخوشگوار صورتحال کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ جرمن کابینہ کو اس اذیت سے محض اس لیے چھٹکارہ حاصل ہو گیا کہ پوری رجستاگ (اسمبلی) میں ایک بھی ایسا رکن نہیں تھا جو سیاسی پناہ کے حق کے سوال میں دلچسپی رکھتا تھا۔ یہ حقیقت اور بھی زیادہ اہمیت اختیار کر جاتی ہے کہ رجستاگ کے صدر نے تالیوں کی گونج میں میری سیاسی پناہ کے حق کی بات اس وقت کی جب میں نے اس کا مطالبہ ہی نہیں کیا تھا۔

اکتوبر انقلاب نے نہ تو تجریدی جمہوری اصولوں اور نہ ہی سیاسی پناہ کے متعلق کوئی اعلان کیا تھا۔ سوویت ریاست کھلم کھلا انقلابی آمریت کے اصول پر قائم کی گئی تھی۔ اس کے باوجود ینڈ رویلڈ اور دوسرے سوشل ڈیموکریٹوں کو اکتوبر انقلاب کے راہنماؤں کی زندگیوں پر حملہ کرنے والے دہشت گردوں کے دفاع کی خاطر سوویت جمہوریہ میں آنے سے روکا نہیں گیا تھا۔

موجودہ برطانوی وزرا بھی سوویت جمہوریہ میں مہمانوں کے طور پر آتے رہے ہیں۔ مجھے سب کے نام تو یاد نہیں اور نہ ہی ان کے اعدوشمار میرے پاس ہیں، مگر مسٹر اور مسز سنوڈن مجھے بخوبی یاد ہیں۔ میرا خیال ہے وہ 1920 میں روس میں آئے تھے۔ ان کا سیاح کی حیثیت سے نہیں بلکہ مہمان کے طور پر استقبال کی گیا تھا جو ان کی حیثیت سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ گرینڈ تھیٹر میں ان کے لئے ایک باکس ریزو کرایا گیا تھا۔ یہ بات مجھے ایک واقعے کے حوالے سے یاد آ گئی ہے۔ جس کا ذکر یہاں بے محل نہ ہوگا۔ میں کسی محاذ سے ماسکو واپس آیا تھا۔ میرا دھیان برطانوی مہمانوں سے کہیں دور بٹا ہوا تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ میں ان کی آمد ہی سے لاعلم تھا کیونکہ دوسری مصروفیات کی وجہ سے میں اخبار پڑھ ہی نہیں سکا تھا۔ جس

استقبالیہ کمیٹی نے مسٹراور مسز اسنوڈن، اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو بر ٹرینڈ رسل اور مسٹر اور مسز ولیم اور دوسرے مہمانوں کا استقبال کیا تھا، اس کا سربراہ لوزووسکی تھا۔ اس نے مجھے بھی اس تھیٹر میں آنے کے لئے کہہ دیا جہاں مہمانوں نے جانا تھا۔ میں نے معذرت کی کوشش کی مگر لوزووسکی کا کہنا تھا کہ پولٹ بیورو نے اسے پورے اختیارات دے رکھے تھے اور یہ میرا فرض تھا کہ میں اس تقریب میں شرکت کر کے ڈسپلن کا مظاہرہ کرتا۔ مجھے چاروناچار جانا پڑا۔ باکس میں کوئی ایک درجن برطانوی مہمان تھے۔ تھیٹر ہال تماشائیوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس وقت ہم ہر محاذ پر فتوحات حاصل کر رہے تھے۔ جس سے لوگ بڑے جذبے اور جوش میں تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر تالیاں بجا رہے تھے۔ برطانوی مہمانوں نے مجھے گھیر رکھا تھا۔ وہ بھی تالیاں بجانے لگے۔ ان میں سنوڈن بھی شامل تھا۔ آج وہ یقیناً اپنی اس حرکت پر تھوڑا بہت شرمندہ ہوگا۔ مگر اسے بھولا ہرگز نہیں ہوگا۔ میرے لیے بھی یہ واقعہ بھلانا مشکل ہے۔ بات یہ ہے کہ لیبر پارٹی کے راہنماؤں سے میری ''محبت'' ایک غلطی ہی نہیں بلکہ ایک فاش سیاسی غلطی تھی۔ مہمانوں سے فارغ ہو کر میں سیدھا لینن کے پاس گیا۔ وہ پریشان تھا۔ اس نے پوچھا ''تم مہمانوں کے ساتھ باکس میں کیوں بیٹھے تھے؟'' میں نے اسے بتایا کہ میں نے لوزووسکی کی ہدایت پر ایسا کیا تھا۔ مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ مہمان کون لوگ تھے۔ لینن کو لوزووسکی پر سخت غصہ آیا۔ میں بھی اپنی اس غلطی پر خود کو ایک عرصے تک معاف نہ کر سکا۔

ایک برطانوی وزیر متعدد بار ماسکو آیا، سوویٹ جمہوریہ میں گھومتا پھرتا رہا، کوہ قاف گیا اور مجھے ملنے آیا۔ وہ مسٹر لانس بری تھے۔ ہماری آخری ملاقات کسلووڈسک میں ہوئی تھی۔ مجھے تھوڑی دیر کے لئے ریسٹ ہاؤس آنے کے لئے کہا گیا جہاں ہماری پارٹی کے چند ارکان اور غیر ملکی مہمان ٹھہرے ہوئے تھے۔ ایک بڑے میز کے گرد خاص تعداد میں لوگ جمع تھے۔ اوسط درجے کا کھانا چل رہا تھا۔ لانس بری مہمان خصوصی تھا۔ میری آمد پر اس نے شراب کا جام میری طرف بڑھاتے ہوئے خوش مزاجی سے کہا۔ ''ایک اچھے خوش طبع آدمی کی صحت کے لئے۔'' کوہ قاف میں لانس بری کے میرے بارے میں یہ جذبات تھے۔ ممکن ہے آج وہ سب کچھ بھول گیا ہو۔ ویزے کی درخواست دیتے وقت میں نے سنوڈن اور لانس بری کو وہ خاطر مدارت یاد دلائیں جو سوویٹ جمہوریہ اور میری طرف سے انہیں پیش کی گئیں تھی۔ مگر ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ یہ سچ ہے کہ سیاست میں یادداشت کی وہی اہمیت ہے جو جمہوریت میں اصول پرستی کی۔

مئی 1929 کے آغاز میں مسٹر اور مسز سڈنی ویب بڑی نوازش فرما کر مجھے ملنے آئے۔ہم لیبر پارٹی کے اقتدار میں آنے کے امکانات پر بات کرتے رہے۔میں نے یونہی سرسری طور پر کہا کہ مسٹر میکڈ انلڈ کی حکومت تشکیل پانے پر میں ویزے کی درخواست دینے کے بارے میں سوچوں گا۔مسٹر ویب کا خیال تھا کہ متوقع حکومت اس قدر مضبوط نہیں ہوگی کہ میری درخواست پر اکیلی فیصلہ کر سکے۔اسے آزاد خیال اراکین کو بھی اپنے ساتھ ملانا پڑے گا۔میں نے جواب دیا کہ جو حکومت اپنے کسی فعل کا دفاع نہیں کر سکتی،اسے اقتدار میں رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہونا چاہیے۔ہمارے ناقابل مصالحت اختلافات کو کسی نئے امتحان کی ضرورت نہیں تھی۔ویب اقتدار میں آ گیا۔میں نے ویزے کا مطالبہ کر دیا میکڈ انلڈ حکومت نے انکار کر دیا۔وجہ یہ نہیں تھی کہ اس کے ارکان اسمبلی نے اسے ایسا کرنے کو کہا تھا۔لیبر ارکان کے احتجاج کے باوجود مجھے ویزا دینے سے انکار کر دیا گیا تھا۔مسٹر ویب میرے مطالبے کا پیشگی اندازہ نہیں کر سکا تھا۔ یہ بتانا ضروری ہے کہ وہ اس وقت ابھی لارڈ پاس فیلڈ نہیں بنا تھا۔

ان میں سے بعض ارکان کو میں ذاتی طور پر جانتا تھا۔دوسرے ارکان کا قیاس کر سکتا تھا۔میرا خیال ہے میں نے ان کے بارے میں صحیح اندازہ کیا تھا۔وہ لیبر پارٹی کی خودرو پیداوار سے تعلق رکھتے ہیں، خاص طور پر مابعد جنگ کی آزاد خیالی کی سیاسی تھکاوٹ کی وجہ سے۔لیبر پارٹی میں پچیس یا تیس سال پہلے جو تھوڑی بہت نظریاتی بالیدگی تھی،موجودہ لوگ اس سے سراسر محروم تھے۔وہ بس عام سیاسی روٹین کے عادی تھے اور اپنا کام نکلوانا جانتے تھے۔وہ بنیادی طور پر پیٹی بورژوا سوچ کے مالک تھے۔ان میں اتنا بھی سیاسی شعور نہیں تھا جس قدر برطانیہ کی کوئلے کی کانوں میں کام کرنے والے محنت کشوں میں ہوتا ہے۔ان کی بڑی کوشش یہی ہے کہ وہ عدالتوں اور بڑے سرمایہ داروں کی نظر میں نہ آئیں۔اب جب کہ وہ برسر اقتدار ہیں،انہیں اپنی کمزوریوں کا علم ہے۔ان میں پرانے سیاست دانوں والی کوئی خوبی نہیں ہے۔جن کی صلاحیت اور فکری بالیدگی ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتی رہتی تھی۔ان میں تو وہ چیز بھی نہیں ہے جو ان کی اصل طاقت بن سکے۔یعنی عوام پر اعتماد کر کے اپنے قدموں پر کھڑا ہو جانا۔یہ تو اپنے عوام ہی سے خوف زدہ ہیں جو انہیں اس مقام تک لائے ہیں۔اقتدار میں آنے کے بعد وہ پرانے حکمران طبقے کو یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ وہ ایک طرح کے انقلابی ہیں۔خدا ایسا نہ کرے۔وہ تو اب بھی مذہب، بادشاہ دار لخواص اور القابات عطا کرنے والے نظام کے پہلے کی طرح ہی وفادار ہیں۔یعنی فقط نجی ملکیت ہی کے حق

میں نہیں بلکہ قرون وسطیٰ کی تمام خرابیوں اور بے ہودگیوں کے علم بردار بھی ہیں۔کسی انقلابی کو ویزا دینے سے انکار کر کے وہ خود کو بڑا معتبر سمجھنے لگے ہیں۔ میں خوش ہوں کہ میں نے انہیں یہ موقع مہیا کیا۔ مجھے یقین ہے وہ جلد ہی کسی بڑی آزمائش میں پڑ جائیں گے۔فطرت کی طرح سیاست میں بھی کوئی چیز رائیگاں نہیں جاتی۔دونوں میں معافی کی گنجائش کم ہی ہوتی ہے۔

مجھے ویزا جاری کرنے کے سلسلے میں مسٹر کلینس کی اپنے پولیس چیف سے کیا بات چیت ہوئی ہوگی اسے تصور میں لانا کوئی ایسا مشکل نہیں ہے۔ میں جان سکتا ہوں اس نے میرے معاملے میں کسی عزم کا اظہار نہ کرتے ہوئے سیاست دان ہونے کا کوئی ثبوت نہیں دیا ہوگا۔لہٰذا پولیس چیف نے اسے ایک ایسا فیصلہ کرنے پر بڑی آسانی سے مائل کر لیا ہوگا جسے تمام قدامت پسند اخبارات نے اگلے دن خوب سراہنا تھا۔ایسا ہی ہوا۔اخباروں نے یہ فیصلہ سراہا ہی نہیں بلکہ تعریفوں کے پل بھی باندھ دیے۔میرا مذاق اڑایا گیا۔افسوس تو یہ ہے کہ پریس نے ان لوگوں کے جذبات کا خیال بھی نہ رکھا جو ویزا جاری کرنے کے حق میں تھے۔کون نہیں جانتا کہ ''ڈیلی ایکسپریس'' دنیا کا ایک معتبر اخبار ہے۔لیکن اس نے بھی لیبر حکومت کے اس فیصلے کی تعریف کی جس کی بدولت میکڈانلڈ ایک انقلابی کی تنقید سے محفوظ ہوگیا تھا۔

کیا ایسے لوگوں سے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ ایک نئے انسانی معاشرے کی بنیاد رکھ سکیں گے؟ ہرگز نہیں۔یہ تو پرانے فرسودہ معاشرے کی باقیات ہیں۔مجھے اعتراف کرنا پڑے گا کہ یورپی جمہوریتوں سے سیاسی پناہ کے لئے ویزا طلب کرنے کے دوران میں متعدد پرلطف لمحے بھی آئے۔کبھی یوں محسوس ہوتا جیسے میں جمہوریت کے اصولوں کے مرکزی خیال پر ایک ایکٹ کا کوئی مزاحیہ ڈراما دیکھ رہا تھا۔اس کا نام تھا ''ویزے کے بغیر یورپ''۔امریکہ کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔امریکہ طاقت ور ہی نہیں ایک خوفناک ملک بھی ہے۔ہورو نے مچھلی کے شکار کا ذکر کرتے وقت اس شغل کی جمہوری فطرت کا ذکر بھی کیا ہے۔اگر ایسا ہے، اگرچہ مجھے اس میں شک ہے، تو اس کا یہ مطلب ہے کہ جمہوریت کے چند نام لیوا ابھی تک امریکہ میں زندہ ہیں۔وہاں بھی ایک مدت سے سیاسی پناہ کا حق حاصل نہیں ہے۔اس طرح تو ڈرامے کا نام ''یورپ اور امریکہ ویزے کے بغیر'' ہونا چاہیے۔لیکن ان دونوں براعظموں کا باقی تین براعظموں پر بھی تسلط ہے۔لہٰذا اس ڈرامے کا یہ نام موزوں رہے گا ''ویزے کے بغیر سیارہ۔''

ہر طرف سے کہا جا رہا ہے کہ جمہوریت پر میرا عدم یقین میرا سب سے بڑا گناہ ہے۔اس موضوع

پر بے شمار مضامیں اور کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔لیکن جب میں کہتا ہوں کہ مجھے جمہوریت کے مقاصد پر ایک مختصر سا لیکچر پلا دیا جائے تو کوئی بھی اس پر راضی نہیں ہوتا۔کوئی اس طرف نہیں آتا۔پھر میں کیسے یقین کو لوں کہ سب سے زیادہ اہم سوال، یعنی امیر اور غیر کے درمیان کشمکش، جمہوریت کی زیادہ پرستش کرنے سے حل ہو جائے گا؟

لیکن کیا انقلابی آمریت سے وابستہ مقاصد پورے ہو گئے ہیں؟ مجھ سے اکثر یہ سوال پوچھا جاتا ہے۔اس کا جواب اکتوبر انقلاب کے تجربے پر ایک نگاہ ڈالنے اور اس کے مستقبل کا تجزیہ کرنے ہی سے دیا جا سکتا ہے۔ایک سوانح عمری میں اس کی گنجائش نہیں نکل سکتی۔اس سوال کا جواب میں ایک علیحدہ کتاب میں دے رہا ہوں جو میں نے وسطی ایشیا ہی میں لکھنی شروع کر دی تھی۔لیکن میں اپنی زندگی کی کہانی یہ وضاحت کیے بغیر ختم نہیں کروں گا کہ میں کس لیے اپنے مقررہ راستے پر اتنی ثابت قدمی سے چل رہا ہوں۔

جو کچھ اب تک وقوع پذیر ہو چکا ہے اور بڑھاپے کی طرف گام زن میری نسل کے حافظے میں نقش اور پختہ ہو چکا ہے اس کا خلاصہ کچھ اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے: گذشتہ چند عشروں کے دوران میں، یعنی گذشتہ صدی کے اختتام اور موجودہ صدی کے آغاز میں یورپی آبادی صنعت کے شعبے میں بڑی منظم ہوئی ہے۔معاشرے کے سارے پہلوؤں پر محنت کی پیداواری قوت کا بڑا تسلط رہا ہے۔اس کے زبردست نتائج برآمد ہوئے جس نے لوگوں کے سامنے نئے امکانات کے دروازے کھول دیے۔مگر افسوس یہ راستہ جنگ کی طرف نکل گیا۔یہ درست ہے کہ جنگ کی وساطت سے انسانیت نے خود کو یقین دلا لیا کہ وہ زوال کی طرف نہیں جا رہی تھی، اگرچہ یہ ایک بے روح قسم کا فلسفہ تھا۔اس کے برعکس وہ بہادری، جرات اور پیش قدمی کے جذبے بھرپور آگے کی سمت چھلانگ لگا رہی تھی۔اس جنگ کے ذریعے اسے اپنی فنی طاقت کا قابل رشک احساس بھی ہوا۔یوں لگا جیسے ایک شخص جس کی سانس کی نالیاں بالکل درست تھیں، آئینے کے سامنے چاقوں سے اپنا حلق خود کاٹ رہا تھا۔

1914-18 کی جنگ کے بعد اعلان کیا گیا کہ گذشتہ چار برس میں جو زخم لگائے گئے تھے اب انہیں مندمل کرنا انسان کا سب سے بڑا اخلاقی فریضہ تھا۔صنعت کو اس کے قدموں پر دوبارہ کھڑا کرنے کی جدوجہد شروع ہو گئی۔وہی ہاتھ اس کی تعمیر نو میں لگ گئے جنہوں نے اسے تباہی سے ہم کنار کیا تھا۔جرمنی

میں حکومت کی تبدیلی کے بعد وہی لوگ اپنے ملک کو دوبارہ بنانے میں مصروف ہو گئے جو اس کی تباہی میں دوسرے یا تیسرے نمبر پر تھے۔ جرمنی میں بس اتنی سی تبدیلی رونما ہوئی تھی۔

جنگ نے ایک پوری نسل کا صفایا کر دیا۔ یہ ایک ایسا خلا تھا جس نے نئی نسل کو یہ سوچنے کا موقع نہ دیا کہ وہ بھی قدرے بلند تاریخی سطح پر وہی کچھ کرنے لگی تھی جو اس سے پہلے کی نسل کر چکی تھی، مگر جس کے زیادہ تکلیف دہ نتائج برآمد ہونے تھے۔

بالشویکوں کی قیادت میں روس کے محنت کش طبقے نے زندگی کی تعمیر نو کی ایک ایسی کوشش شروع کی جس کے ذریعے انسانیت کو پاگل پن کے دورے پڑے اور الٹے قدموں چلنے کے امکانات کم ہو جانے تھے تا کہ ایک بلند سطح پر ثقافت کی تعمیر ہو سکے۔ اکتوبر انقلاب کا یہی مقصد تھا۔ وہ مسئلہ یقیناً ابھی تک حل نہیں ہوا جو اسے درپیش تھا اور جو اپنے حل کے لئے متعدد عشروں کا متقاضی ہے۔ لیکن اکتوبر انقلاب کو مجموعی طور پر انسانیت کی نئی تاریخ کا ایک نقطہ آغاز تصور کر لینا چاہیے۔

تیس سالہ جنگ کے اختتام پر جرمن اصلاح پسندی یہ تو جان گئی ہو گی کہ یہ سارا فعل پاگل خانے سے بھاگ ہوئے لوگوں کا تھا۔ ایک حد تک یہ بالکل درست بھی ہے۔ یورپ کے انسانوں نے قرون وسطیٰ کی بادشاہت سے نجات حاصل کی تھی۔ اصلاح پسندی اپنے ساتھ جو بے شمار اموات لائی، ان کے بغیر جدید جرمنی، انگلینڈ، امریکہ اور دوسری جدید دنیا کی تعمیر ناممکن تھی۔ مگر ان اموات کی کون پروا کرتا ہے۔ یہی وہ شہید تھے۔ جو انسانیت کو منزل بہ منزل آگے کی سمت لے گئے۔

انقلاب فرانس کے متعلق بھی یہی بات کہی جا سکتی ہے۔ تنگ نظر اور رجعتی شیخی خور فلسفی تینے نے یہ بات کہہ کر جیسے کوئی بہت بری دریافت کی تھی کہ لوئس ہشتم کو تختہ دار پر چڑھانے کے چند سال بعد فرانسیسی پرانی حکومت کے مقابلے میں نئے عہد حکومت میں زیادہ غریب اور دکھیا ہو گئے۔ اصل بات یہ ہے کہ انقلاب جیسے عظیم واقعات کو چند برسوں کی روشنی میں نہیں دیکھا جا سکتا۔ انقلاب کے بغیر نئے فرانس کا تصور محال تھا۔ تینے کو یاد رکھنا چاہیے تھا کہ جس انقلاب کی وہ برائی کر رہا تھا، اگر وہ برپا نہ ہوا ہوتو وہ کسی ٹھیکیدار کے پاس بطور کلرک حساب کتاب کرنے میں قلم گھسا رہا ہوتا۔ اسی انقلاب نے اس کے لئے نیا راستہ کھولا تھا۔

اکتوبر انقلاب کو ایک دوسرے تاریخی تناظر میں بھی دیکھنا ضروری ہے۔ یہ کوئی کند ذہن اور احمق

ہی کہہ سکتا ہے کہ بارہ برس میں انقلاب نے عوام کو نہ امن اور نہ ہی خوش حالی دی ہے۔ اگر جرمن اصلاح پسندی اور انقلاب فرانس کو مدنظر رکھا جائے جو بورژوا سماج کے ارتقا کے دو مختلف مرحلے ہیں اور ان کے درمیان تقریباً تین سو برس کا فاصلہ ہے، تو اس حقیقت کا ادراک کر کے حیرت ہونی چاہیے کہ روس جو انقلاب کے بعد بارہ برس تک باقی دنیا سے کٹا رہا اور پس ماندگی کی حالت میں تھا، کیسے اپنے عوام کا معیار زندگی کم از کم اس سطح پر تو لے آیا جو جنگ کے آغاز کے دنوں میں تھا۔ یہ اپنی نوعیت کا ایک معجزہ ہے۔ لیکن اکتوبر انقلاب کی اہمیت بس اتنی ہی نہیں ہے۔ انقلاب ایک نیا سماجی تجربہ ہے۔ ایک ایسا تجربہ جو بار بار نئے تغیرات سے گذر کر اپنی بنیادیں ازسرنو تعمیر کرتا رہے گا۔ اور نئی فنی دریافتوں کی روشنی میں نت کردار اپنا تا رہے گا۔ چند عشروں یا صدیوں کے بعد نیا سوشل آڈر اکتوبر انقلاب کو ویسے ہی دیکھے گا جیسے آج بورژوا نظام جرمن اصلاح پسندی یا انقلاب فرانس کو دیکھ رہا تھا۔ یہ بات اس قدر واضح ہے کہ تاریخ کے پروفیسر حضرات اسے سمجھ تو جائیں گے، مگر انہیں اس میں ایک عرصہ لگے گا۔

لیکن تمہارا کیا بنے گا۔ یہ سوال مجھ سے اکثر پوچھا جاتا ہے۔ اس میں تجسس کے ساتھ طنز بھی شامل ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں میں موجودہ کتاب میں جو کچھ کہہ چکا ہوں اس میں اضافے کی بہت کم گنجائش ہے۔ میں تاریخی عمل کو ذاتی تقدیر کے پیمانے سے نہیں ناپتا۔ اس کے برعکس اپنی تقدیر کا معروضی تجزیہ کرتا رہتا ہوں اور داخلی طور پر زندہ رہتا ہوں۔ دونوں کا تعلق اٹوٹ طور پر سماجی ترقی سے ہے۔

میں جس ''المیے'' کا شکار ہو چکا ہوں اس کے متعلق اخبارات میں خبریں بڑے مزے لے کر پڑھتا رہتا ہوں۔ ذاتی المیے کا میرے نزدیک کوئی تصور نہیں ہے۔ میں تو انقلاب کے دو ابواب کی تبدیلی کو جانتا ہوں۔ ایک امریکی اخبار نے میرے مضمون کے ساتھ اپنا یہ تبصرہ بھی شائع کیا کہ اس قدر تکالیف برداشت کرنے کے باوجود مصنف کا طرز استدلال بڑا واضح ہے۔ جب میری استدلال کی طاقت اور میرے کسی عہدے کے درمیان یا میرے ذہنی توازن اور موجودہ صورتحال کے مابین کوئی تعلق جوڑا جاتا ہے تو مجھے اس پر بڑی حیرت ہوتی ہے۔ میں اس فعل کو لاعلمی پر مبنی قرار دیتا ہوں کیونکہ میں نے یہ فرق کبھی روا نہیں رکھا تھا۔ جیل میں ایک کتاب یا ہاتھ میں قلم کے ساتھ مجھے اتنا ہی اطمینان محسوس ہوتا تھا جتنا انقلاب کے ایک بڑے مجمعے کے سامنے تقریر کرتے وقت۔ اقتدار میں کسی قسم کا فخر محسوس کرنے کے بجائے میں اسے ایک بوجھ محسوس کرتا تھا۔ یہاں کسی کے اچھے الفاظ کا حوالہ دینا زیادہ مناسب ہوگا۔

26 جنوری 1917 کو روزا لکسمبرگ نے جیل سے اپنی ایک خاتون دوست کو خط لکھا۔ ''روزمرہ کے دھندوں میں کھوئے رہنا میری سمجھ سے باہر کی بات ہے۔ ذرا گوئٹے کی طرف دیکھو۔ وہ کیسے پرسکون احساس برتری کے ساتھ مادی چیزوں سے بلند ہوتا تھا۔ ذرا سوچو اسے کن حالات سے گزرنا پڑا۔ انقلاب فرانس نزدیک سے دیکھنے پر بڑا بے معنی اور خونی ڈراما لگتا ہے۔ 1793 سے 1815 تک کا درمیانی عرصہ جنگوں کا ایک تسلسل تھا۔ میں یہ نہیں کہتی کہ تم بھی گوئٹے کی طرح شاعری کرو۔ لیکن اس کی دلچسپیوں کی ہمہ گیری، اس کی داخلی آہنگی ___ یہ چیزیں انسان اپنے پیدا اندر پیدا کر سکتا ہے، یا پیدا کرنے کی کوشش کر سکتا ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ گوئٹے سیاسی آدمی نہیں تھا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک بہادر آدمی عام باتوں سے بلند ہوتا ہے۔ اور اسے بلند رہنے کی کوشش کرتے رہنا چاہیے ورنہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں اپنی ناک ڈبوئے رکھے گا۔''

بڑی عمدہ بات ہے۔ میں نے اس کی یہ تحریر کل ہی پڑھی ہے۔ جس نے مجھے اس کے زیادہ قریب کر دیا ہے، مجھے اس پر پیار آنے لگا ہے۔

سوشلزم کا روبن کروسو پروڈھن اپنے نظریات، کردار اور عالمی نقطہ نظر کے لحاظ سے مجھے ہمیشہ ایک اجنبی لگا۔ لیکن وہ جنگ جو تھا، اس میں ایک روحانی قسم کی بیزاری تھی۔ جو اسے سرکاری رائے عامہ سے نفرت پر مجبور کر دیتی تھی۔ اس کے اندر کثیر الاطراف تجسس کی ایک کبھی نہ بجھنے والی آگ تھی جس نے اسے اس کی ہم عصر زندگی کے تمام نشیب و فراز سے ہمیشہ بلند رکھا۔

26 اپریل 1852 کو پروڈھن نے جیل سے اپنے ایک دوست کو خط لکھا:

''تحریک بے قاعدہ اور بے ڈھنگی چال چل رہی ہے مگر بلاشبہ اس کا رجحان مسلسل حرکت کی طرف ہے۔ ہر حکومت انقلاب کے خلاف جو کارروائی بھی کرتی ہے، بعد میں قابل نفرت نہیں رہتی۔ یہ بادلوں کی طرح گریز پا ہوتی ہے۔ مجھے یہ نظارہ دیکھنے میں بڑا لطف آتا ہے۔ میں انقلاب کے ہر رنگ سے آشنا ہوں اور عالم ہستی میں تغیر و تبدل کا مشاہدہ کرتا رہتا ہوں جیسے بدلتے ہوئے منظروں کی وضاحت کسی بالائی مقام پر ہوتی رہتی ہے۔ جو چیز دوسروں کو دباتی ہے، مجھے اتنا ہی ابھارتی ہے، میرے اندر ولولہ پیدا کرتی ہے، مجھے استحکام بخشتی ہے۔ پھر میں کیسے تقدیر کا شکوہ اور لوگوں کی شکایت کروں اور انہیں برا بھلا کہوں؟ تقدیر ___ اس لفظ پر مجھے ہنسی آتی ہے۔ جہاں تک لوگوں کا تعلق ہے، وہ اتنے لاعلم اور مجبور ہوتے ہیں کہ مجھے ان پر ذرا غصہ نہیں آتا۔''

قدرے الہامی ہونے کے باوجود یہ بڑے شاندار الفاظ ہیں۔ میں ان سے پوری طرح متفق ہوں۔